وَمَنْ يُؤتَ الحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْراً کَثِیراً
البقرة (۲٦۹)

جسے حکمت و دانائی عطا ہوئی اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

پانچویں جلد

فارسی ادب (سوم)

(۱۷۰۷ء - ۱۹۷۱ء)

مدیرانِ خصوصی: سید فیاض محمود و سید وزیر الحسن عابدی

معاون: ڈاکٹر عبدالغنی

پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

طبع اول : فروری ۱۹۷۲ء
تعداد : ایک ہزار
طابع : پنجاب یونیورسٹی
ناشر : گروپ کیپٹن سید فیاض محمود
مطبع : زرین آرٹ پریس ریلوے روڈ ۔ لاہور

پاکستان وہند

کی

اسلامی تہذیب

کے

نام

پہلی جلد	مقدمہ	مصنف	سید فیاض محمود
دوسری جلد	(عربی ادب ۷۱۲ء - ۱۹۷۱ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر عبدالقیوم
تیسری جلد	(فارسی ادب ۱۰۰۰ء - ۱۵۲۶ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر وحید مرزا
چوتھی جلد	(فارسی ادب ۱۵۲۶ء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی
پانچویں جلد	(فارسی ادب ۱۷۰۷ء - ۱۹۷۱ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر وزیر الحسن عابدی
چھٹی جلد	(اردو ادب ابتداء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر وحید قریشی
ساتویں جلد	(اردو ادب ۱۷۰۷ء - ۱۸۰۳ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر سید وقار عظیم
آٹھویں جلد	(اردو ادب ۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷ء)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
نویں جلد	(اردو ادب ۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر عبادت بریلوی
دسویں جلد	(اردو ادب ۱۹۱۴ء - ۱۹۷۱ء)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
گیارھویں جلد	(بنگالی ادب ۔ اول)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
بارھویں جلد	(بنگالی ادب ۔ دوم)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
تیرھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان ۔ اول)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
چودھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان ۔ دوم)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
پندرھویں جلد	(علاقائی ادبیات ہند)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
سولھویں جلد	(خلاصہ جملہ جلد ہائے ادبیات در انگریزی)	مؤلف	سید فیاض محمود

تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

پانچویں جلد ۔ فارسی ادب (سوم) (۱۷۰۷ء - ۱۹۷۱ء)

فہرستِ مضامین

حصہ دوم ۳۲۱ - ۶۹۰

(۱۸۵۷ء - ۱۹۷۱ء)

پیش لفظ

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائرِ زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے اس برِصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔ ادب سے مُراد یہاں ان خیالات وجذباتِ عالیہ کا مؤثر اظہار ہے جن سے قلب و نظر کی جِلا ہوتی ہے اور جن سے انسانی زندگی بامعنی بنتی ہے۔ ایسے خیالات و تصوّرات جہاں ہمیں ادراک کی منتہیات کا راستہ دکھاتے ہیں وہاں رُوحانی تسکین کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارے ایّام بھی روشن ہوتے ہیں اور ہمارے لمحات بامُراد۔ ادب میں مذہب، تصوّف، فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، شاعری، افسانے، انشائیات، مکتوبات، ہر چیز شامل ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جس جس زبان میں برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنے رنج و مسرت، اپنی فکر و نظر، اپنی اُمنگوں اور عزائم کو متجسّم کیا ہے، ان کے شاہپاروں اور ان کے مصنّفین سے اپنے ہم وطنوں اور باہر کی دُنیا کو رُوشناس کرایا جائے۔ تاکہ ہم پہچان سکیں کہ ہماری زندگی کس قسم کی تہذیب و ثقافت پر استوار ہے اور ہمیں اس بات کا مستقل احساس ہو جائے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، ایک ہی ثقافتی رشتہ میں منسلک ہیں اور ایک ہی تہذیبی روایت کے علمبردار ہیں۔

محمد علاء الدین صدیقی

(پروفیسر علاء الدین صدیقی مدیر اعلیٰ)

تعارف

مسلمانوں کو اس برِصغیر میں آئے ہوئے سوا تیرہ سو سال ہو چکے ہیں یہ اس لئے درست ہے کہ مکران ۷۱۲ء میں فتح ہو گیا تھا۔ اس طویل عرصے کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ دور جو سلطان محمود غزنوی کی فتوحات پر ختم ہوا۔ یہ کوئی پونے چار سو سال کی مدت ہے۔ اس عرصے میں برصغیر کے شمال مغربی علاقوں پر عربی زبان و ادب اور عربی تہذیب و تمدن کا تسلط رہا۔ دوسرا دور کوئی پانچ سو سال کا ہے، جو غزنوی عہد اور "عہدِ سلاطین" پر مشتمل ہے۔ اس دور میں برصغیر "دار الاسلام" کہلایا اور تہذیبی طور پر ملت اسلامیہ کی عالمی وحدت کا رکن رہا۔ پانچ سو سالوں کے اس دور میں، جس کا آغاز محمود غزنوی کے ورود سے ہوتا ہے، فارسی ادب کا رواج ہوا اور فارسی زبان اظہار کا ذریعہ رہی۔ ویسے مغربی پاکستان کی سرزمین میں فارسی زبان اس عہد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی۔ بلکہ ملتان کے علاقے میں عام تکلمی زبان کی حیثیت[1] حاصل کر چکی تھی۔ پھر تیسرا دور مغلیہ عہد ہے، جو ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس میں ملت اسلامیانِ پاکستان و ہند نئے تہذیبی اثرات سے روشناس ہوئی اور معاشرے میں فکری مد و جزر کارفرما رہا۔ اس دور میں افکار اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، اور اگرچہ اعتقادات میں ایک حد تک تزلزل کے آثار نمایاں ہونے لگے، لیکن تخریب اور انتشار کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پوری مدت میں فارسی

---

[1] دیکھئے، چوتھی صدی ہجری کے ابن حامد اندلسی کی تالیف "طبقات الاسلام"

کی ادبی اقدار ہماری تہذیبی زندگی کا محرک اور غالب عنصر ہیں۔ اس کے بعد مغربی تہذیب، اس کے اصولِ زندگی اور اس کے معاشی، سماجی اور معاشرتی افکار کی اشاعت ہوئی۔ چونکہ یہ دور نشر و اشاعت کا دور ہے، اور اس میں بعض وسائل فراہم ہونے سے تعلیم عوام تک پھیل گئی، اس لیے خیالات میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ اس ذہنی انقلاب نے کئی نئی صورتیں اختیار کیں اور اس کے نتائج آجکل ہماری خانگی، اجتماعی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ گذشتہ تین چار سو سال کی مدت میں اردو، بنگلہ اور دیگر زبانوں اور بولیوں کا علاقائی ادب بھی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ حسنِ اظہار کا وصف پیدا کر چکا ہے۔

ادب میں معاشرتی اور تعلیمی عوامل منعکس ہوتے ہیں۔ زندگی کے تقاضے اظہار، احتجاج، طنز، شکایت، دعا یا الحاح کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس تاریخ ادبیات کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے، تاکہ زندگی کے ہر رخ، قلبِ انسانی کی ہر کیفیت، روحِ کائنات کے ہر پرتو میں ہم آہنگی نظر آئے اور مسلمانانِ برصغیر کی پوری زندگی اور ان کی تہذیب کا جامع عکس، ملی وحدت کا مکمل ثبوت، ہر اس زبان اور اس کے ادب میں یقین آفریں انداز میں پیش ہو، جو یہاں بولی جاتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہم جس تہذیبی ورثے کے مالک ہیں، وہ کتنا پائیدار ہے اور اس میں کتنی توانائی اور استقامت موجود ہے۔

اس تاریخ کی تدوین میں دو تین باتیں خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہیں۔ اول یہ کہ کسی قوم کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا پوری طرح اور ہمدردانہ انداز سے محاسبہ نہ کیا جائے۔ اس لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ عربی، فارسی، ترکی، اردو، بنگلہ، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلتی، شینا، بروشسکی، کھوار، ہندکو، سرائیکی، بلوچی اور براہوی، غرض ہر اس زبان کے معاشرتی اور فکری پس منظر کی نشاندھی کی جائے، جو پاکستان میں بولی گئی ہے یا بولی جاتی ہے، اور جو ادبی تخلیقات اس ماحول سے ابھرتی ہیں، خواہ وہ ضرب الامثال ہوں یا لوک کہانیاں، گیت ہوں یا لوریاں، ان میں رزم، تصوف، فکر اور عمیق جذبات کی ترجمانی ہو یا محض

تفضیح طبع کا سامان ، سبھی کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ سے کر اپنی قوم کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے ۔ چنانچہ ہم نے زندگی کے ہر پہلو ، زبان کے ہر انداز اور فکر کی ہر جہت کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ تاریخ کامل طور پر اور صحیح معنوں میں ہماری ثقافت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔

علاقائی ادبیات میں خاص طور پر لوک ادب کا مقام بہت بلند ہے ۔ اور ہم نے اسے ادب عالیہ کا ایک رکن تصور کیا ہے ، اس لئے کہ ہر قوم کی ادبی تاریخ میں ، لوک ادب ایک معنی خیز کردار ادا کرتا ہے ۔ اکثر لوگوں کی زندگیاں اسی ادب کی اقدار سے متاثر ہوتی ہیں ، اور اسی کے کردار علامت بن کر اُن کے محرک بنتے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز پیش کرتے ہیں ۔ اس لئے ادبی تاریخ میں اس کا ذکر ضروری ہے ۔

یہی حال ان مصنفین کا ہے ، جو عام طور پر دوسرے درجے کے ، یا بالفاظِ دیگر چھوٹے مصنف شمار ہوتے ہیں ۔ یہ تو بدیہی امر ہے کہ کسی قوم کی رفعتِ فکر اور اسکی جذباتی بلندی صرف انہی مصنفین کے کلام یا تصانیف میں نظر آئے گی ، جن کی نگاہ وسعت ، بلندی اور گہرائی کے لحاظ سے روزمرہ کے تجربات کے حدود میں مقید نہ ہو ، اس لئے کہ چھوٹے شاعر یا افسانہ نگار یا ناول نویس یا نثر لکھنے والے اپنے اپنے تجربے اور فنّی کوشش کے دائرے میں محدود اور محصور ہوتے ہیں ۔ مگر یہاں یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ اس دائرے سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ، جن سے عام لوگوں کی زندگی عبارت ہوتی ہے ، زیادہ توجہ سے قلم بند کرتے ہیں ۔ ان کی نظر وسیع نہیں ہوتی مگر وہ روزمرہ کے تقاضوں اور زندگی کے عام مشاغل اور قلبی واردات کے سطحی تاثرات کو صاف طور پر بیان کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ ان کے ہاں عام زندگی کی عکاسی عظیم شعراء یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے ۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیبی تاریخ مرتب کرتے وقت ان چھوٹے اہلِ قلم کی تخلیقات کا جائزہ لینا بھی اسی قدر ضروری ہوتا ہے جتنا ادبی عظماء کا ۔ چنانچہ اس تاریخ میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ یہ تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند کی پوری ادبی زندگی کی ترجمان بن گئی ہے ۔

مذکورہ مطالب کے حصول کے لئے ہر ادب کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو سامنے لایا گیا ہے، تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں کے تاثرات اور خیالاتِ عالیہ کی ہم عکاسی کر رہے ہیں، وہ اپنی اجتماعی زندگی کن ضوابط، کن پابندیوں اور کن اصولوں کے تحت بسر کرتے تھے۔ اس بنا پر اس تاریخ ادبیات کو دراصل ملّتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تہذیبی تاریخ تصوّر کرنا چاہیئے۔

سید فیاض محمود

گروپ کیپٹن سیّد فیاض محمود
مدیر عمومی

حصّہ اوّل

(۱۷۰۷ء - ۱۸۵۷ء)

پہلا باب

پس منظر

(۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء)

سیاسی پس منظر

انچاس سالوں کی حکومت کے بعد ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر فوت ہوئے تو ان کی عمر بانوے سال تھی اور وہ آخری وقت تک امور سلطنت سے پوری طرح آگاہ رہے اور دربار میں آ کر حکم احکام صادر کرتے رہے ۔ ہندوؤں کا ملی ٌ اور سیاسی احیاء جو بھگتی تحریک (پندرھویں صدی) کے وقت سے شروع ہؤا تھا اور جسے اکبر کی حکمت عملی کی وجہ سے تقویت حاصل ہوئی اور جس کو جہانگیر یا شاہجہان نہ دبا سکے ، اس شہنشاہ کے زمانے میں بہت زور پکڑ گیا ۔ چنانچہ جاٹوں ، ست نامیوں ، راجپوتوں ، سکھوں اور مرہٹوں اور ان کی دیکھا دیکھی پٹھانوں نے بھی اس عہد میں فتنہ و فساد برپا کیا ۔ اورنگ زیب کی آہنی گرفت کی وجہ سے ان سب کو ناکامی ہوئی اور جب یہ شہنشاہ راہئی ملک بقا ہؤا ، اس وقت کئی سالوں سے ملک میں کوئی بد امنی نہ تھی ۔ مرہٹے رفتہ رفتہ قابو میں آ چکے تھے اور اگر اورنگ زیب کے جانشین اسی عزم و تدبر ، اخلاقی عظمت اور سیاسی حکمت کے مالک ہوتے تو برِ صغیر میں انتشار پیدا نہ ہوتا ۔

اپنے دورِ حکومت میں اورنگ زیب نے عوام کی خوشحالی کے لئے ملک کا نظم و نسق ایسے اصولوں پر چلایا جن کی بنیاد عدل و انصاف اور بہبودیٔ خلائق پر تھی ۔ شہنشاہ کی سالگرہ پر بڑا اسراف ہوتا تھا ، اسے یکسر ختم کر دیا ، معاشرے کی تطہیر کے لئے اس نے شراب نوشی ممنوع قرار دی ، بھنگ کی کاشت روک دی ، جؤا بند کر دیا ، بدکاری کا احتساب کیا ۔ دربار کی اصلاح کے لئے اس نے گویّوں کو دربار سے رخصت کر دیا اور ملک الشعرائی کا عہدہ ختم کیا یعنی فضول قصیدہ گوئی روک دی ۔

اس قسم کی اصلاحات سے پتا چلتا ہے کہ عہدِ عالمگیری ، معاشی ، اخلاق اور فکری اصلاح کا دور تھا ۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ، احکامِ شریعت کا اجراء اور

تعلیم کی اشاعت پر زور یہ تمام باتیں اس دورِ اصلاح کی نشاندہی کرتی ہیں ۔ اورنگ زیب کے اس قسم کے فرامین کی وجہ سے معاشرہ کا عام رجحان اصلاح کی طرف ہوگیا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں قصیدہ گوئی ختم ہو جاتی ہے اور غزل ، مثنوی ، رباعی کا رواج بڑھ جاتا ہے اور سابقہ ادوار کے خلاف حافظ کی بجائے رومی کی طرف توجہ زیادہ ہو جاتی ہے ۔ مثنویٔ معنوی کی شرحیں لکھی جاتی ہیں ۔ اس طرح ذہن و ذوق میں انقلاب رونما ہوتا ہے اور فکری لحاظ سے ادبی تخلیقات کا معیار بلند ہو جاتا ہے ۔ عوام ان باتوں سے بھی مطمئن ہوئے اور ساتھ ہی شہنشاہ کے طویل اور باوقار عہدِ حکمرانی کے باعث مغل شہنشاہوں کی عظمت کے نقوش لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئے اور حکمران خاندان کے ساتھ جذبۂ وفاداری بڑھ گیا ۔

عالمگیر کی وفات کا لوگوں پر اثر

برصغیر کے مسلمان اورنگ زیب عالمگیر کو ایک بطلِ جلیل کی حیثیت سے دیکھتے تھے ۔ اس لئے جب ۲۱ فروری ۱۷۰۷ء کو ان کا انتقال ہوا ، اس وقت بقول[1] مصنفِ جنگ نامہ :

> ''در اردوئے معلی قیامت قائم شد و روز رستخیز در دیدۂ مردم نمودار گشت ۔''

اور جب جنازہ اٹھا تو صاحب مآثر عالمگیری کے بیان کے مطابق[2] :

> ''خلائق از دیدن آن وضع نامرغوب دود از آنہا برآمد ۔ طوفانہای گریہ جوش زد ۔''

حکمران اور انسان کی حیثیت سے اورنگ زیب کی صفاتِ عالیہ کا شدید احساس ہی اس گریہ و زاری کا موجب تھا ۔ اسی موقع پر جعفر نارنولی کی زبان سے جو فریاد نکلی[3] اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

جہاں تاریک شد بے نور ذاتش — نفس تاریک شد چون دود آتش
فلک از ایمنی بر خلق در بست — کمر ہائے جبال الارض بشکست

---

(۱) نعمت خان عالی ، جنگ نامہ ، ص ۷ ۔
(۲) ساقی ، مستعد خان ، مآثر عالمگیری ، ص ۵۲۲ ۔
(۳) میر جعفر زٹلی ، کلیات ۔

دریغا عدل و دین بی او دولیم است　　عروسِ سلطنت بی او ستیم است
دریغا رونقِ باغِ جہان رفت　　دریغا آبروی میر و خان رفت

جنگِ تخت نشینی

اورنگ زیب خود تجربہ کر چکا تھا کہ جنگِ تخت نشینی کس قدر ہولناک اور تباہ کن ہوتی ہے ، اس لئے اپنے بعد جدال و قتال کو روکنے کے لئے اس نے اپنے تینوں بیٹوں کے درمیان سلطنت تقسیم کر دی ۔ کام بخش کو لکھا کہ دیکھنا مسلمانوں کا ناحق قتل نہ ہو ۔ شاہ عالم کو تحریر کیا کہ خلقِ خدا کے کشت و خون کا باعث نہ بننا ۔ پھر بھی دل میں خطرہ تھا ، اس لئے کہا :

''آنچہ بنظر می آید طرفہ ہنگامہ بپا شدنیست''

چنانچہ اورنگ زیب کی وفات کی خبر سنتے ہی اعظم شاہ نے احمد نگر میں اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کی ۔ شاہ عالم جمرود میں تھا ، تیزی سے اکبر آباد پہنچ گیا اور قلعے پر قابض ہو گیا ۔ اس نے کوشش کی کہ باپ کی تقسیم کے علاوہ اعظم شاہ مزید دو صوبے لے لے اور خاموش ہو جائے تاکہ خون ریزی نہ ہو ۔ مگر اعظم شاہ نے جواب دیا : تقسیم غیر منصفانہ ہے ، اب تلوار ہی فیصلہ کرے گی :

''دو بادشاہ در اقلیمی نگنجند''

جاجو کے مقام پر لڑائی ہوئی ۔ اعظم شاہ اور اس کے دو بیٹے مارے گئے ۔ کام بخش نے بھی قسمت آزمائی کی مگر حیدر آباد کے قریب شکست کھا گیا اور ۱۷۰۸ء میں مر گیا ۔

بہادر شاہ

شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تاج و تخت کا مالک بنا ۔ وہ فیاض ، نیک طبع اور عالم انسان تھا ۔ اس کے امراء بڑے تجربہ کار تھے ، اس لئے مجموعی طور پر ذوالفقار خان کے مشورے پر بہادر شاہ نے ساہو کو اپنے زیر سایہ سلطان کا لقب دے کر مرہٹوں کا فرمانروا تسلیم کر لیا ۔ بندہ بہادر کی قیادت میں سکھوں نے شورش بپا کی اور قتل و غارت کرتے ہوئے دہلی تک پہنچ گئے ۔ شہنشاہ ان کی سرکوبی کے لئے نکلا ۔ سکھوں کو شکست ہوئی اور بندہ بہادر پہاڑی علاقے کی طرف بھاگ گیا ۔ بہادر شاہ لاہور میں تھا کہ ۱۷۱۲ء میں اچانک بیمار ہو کر فوت ہو گیا ۔

جہاندار شاہ

لاہور کے قریب بہادر شاہ کے بیٹوں کے درمیان جنگِ تخت نشینی ہوئی ۔ جہاندار شاہ ذوالفقار خان کی مدد سے فاتح رہا ۔ اس کا عہد بالکل مختصر تھا ۔ اس کے بھتیجے فرخ سیر ابن عظیم الشان نے حسن علی خان اور حسین علی خان سادات بارہہ کی مدد سے ۱۳ جنوری ۱۷۱۳ء کو اسے شکست دے کر تخت پر قبضہ کر لیا ۔ لیکن اس مختصر عرصے میں بھی مشہور موسیقار تان سین کی اولاد میں سے اپنی محبوبہ لعل کنور کی وجہ سے اس نے اس طرح دادِ عیش دی کہ بقول خافی خان[1] :

''چناں بازار رود و سرود قوم قوالان و کلاونت و ڈھاڈھی گرم گردید
کہ نزدیک بود قاضی قرابہ کش و مفتی پیالہ نوش گردد . . . .
اعتبار خالہ زادان و دیگر صاحب کمالان و علما از میان برخاست ۔''

فرخ سیر

اس شہنشاہ نے بندہ بہادر کے فتنے کا استیصال کیا مگر اس کے عہد میں بہت جلد تورانی ایرانی نزاع کا اثر ملکی سیاسیات میں واضح طور پر نگاہوں کے سامنے آ گیا ۔ اس نے تورانی امراء کی وجہ سے نہیں بلکہ سادات بارہہ کی امداد سے سلطنت حاصل کی تھی ، اس لیے جملہ اختیارات سادات بارہہ کے قبضے میں چلے گئے ۔ اور تو اور وزیر سلطنت حسن علی خان کے دیوان رتن چند[2] کے سامنے خود شہنشاہ بے بس تھا ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی وصیت[3] میں سادات بارہہ کے متعلق کہا تھا کہ انہیں اعلیٰ مناصب نہ دینا ۔ کیونکہ :

''شریکِ غالب بلکہ طالبِ ملک اند''

مگر فرخ سیر نے اس وصیت پر عمل نہ کیا ۔ سادات بارہہ امور سلطنت میں جا بجا دست اندازی کرتے تھے ۔ اس لئے فرخ سیر کے ان کے ساتھ تعلقات بگڑتے چلے گئے ۔

---

(۱) خافی خان ، منتخب اللباب ، حصہ دوم ، صفحات ۶۸۷ - ۶۹۰ ۔
(۲) خافی خان ، منتخب اللباب ، حصہ دوم ، صفحات ۷۷۳ - ۷۷۶ ۔
(۳) محمد اکرام ، وحید قریشی ، دربار ملی ، ص ۲۹۳ ، منقول از حکام عالمگیری ، صفحات ۱۳ تا ۱۶ ۔

انجام کار سید برادران نے ۱۷۱۹ء میں اسے بڑی رسوائی کے ساتھ تخت سے اتار دیا ۔ قید میں ڈال کر پہلے اسے اندھا کیا اور پھر مروا ڈالا ۔

محمد شاہ

فرخ سیر کے بعد سید برادران نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا مگر دونوں سل اور دق کے مریض تھے ، چند ماہ میں چل بسے ۔ چنانچہ ستمبر ۱۷۱۹ء میں شاہزادہ روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا گیا ۔ سید برادران نے اسے بھی بے دست و پا کر دیا ۔ خافی خان لکھتا ہے[1] :

> ''انتظام سلطنت خاندان تیموریہ از میان برخاستہ بود ۔ کبیر و صغیر ہر قوم بسبب تسلط ہر دو برادر و اختیار رتن چند در کل امور ملکی و مالی کہ سوائے مردم بارہہ و قوم بقال را نوازش نمی نمودند ، متنفر بودند و شرفائی ہر دیار بخواری و بے اعتباری زیست می نمودند ۔''

محمد شاہ نے نظام الملک سے خط و کتابت کی ۔ باقی تورانی امراء بھی سادات بارہہ کے مخالف تھے ۔ محمد شاہ کے ساتھ دکن جاتے ہوئے حسین علی خان تورہ کے مقام پر ایک مغل امیر زادے کے ہاتھوں قتل ہو گیا ۔ اس کے بھائی سید عبد اللہ قطب الملک نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر ناکام ہوا اور ایک سال بعد فوت ہو گیا ۔

افسوس یہ ہے کہ سید برادران سے خلاصی پانے کے بعد محمد شاہ نے عیش و عشرت شروع کر دی ۔ ۱۷۲۲ء میں نظام الملک کو قلمدان وزارت دیا ۔ وہ اورنگ زیب کی طرح مرکزیت کا قائل تھا اور سلطنت کی بقا کے لئے ترکی ، تورانی احساسات پر زور دیتا تھا ۔ مگر دربار کے حالات کی وجہ سے مایوس ہو کر ۱۷۲۳ء میں نظام الملک دکن چلا گیا جہاں ۱۷۲۴ء میں اس نے آزاد سلطنت قائم کرلی ۔ یہ سال اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں اودھ کا صوبے دار سعادت خان برہان الملک بھی نیم آزاد ہوگیا ۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ ادھر حملہ آور ہوا ۔ دہلی پہنچ کر اس نے معمولی سی بات پر قتل عام کیا ۔ آنند رام مخلص قتل و غارت کی جو چشم دید تفصیلات بیان کرتا ہے ، انہیں

---

(۱) خافی خان ، منتخب اللباب ، حصہ دوم ، ص ۹۰۲ ۔

پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ نادر شاہ واپس گیا تو بے پناہ دولت کے ساتھ تخت طاؤس بھی ساتھ لے گیا اور کشمیر اور ٹھٹھہ کے علاوہ دریائے سندھ کے مغربہ کا علاقہ بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا ۔ نادر شاہ کے چلے جانے کے بعد علی وردی خان بنگال میں نیم خود مختار ہو گیا ۔ اس لڑائی میں مغل افواج کے ایرانی النسل امرائے عساکر اور خصوصیت سے برہان الملک ، نواب وزیر اودھ نے مغل شہنشاہ سے کوئی وفاداری کا ثبوت نہ دیا ۔ بلکہ الٹا برہان الملک نادر شاہ کو دہلی لے جانے کا موجب بنا ۔

جب نادر شاہ ۱۷۴۷ء میں مارا گیا تو احمد شاہ ابدالی نے قندھار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۔ لاہور کا صوبیدار شاہنواز تھا ، اس کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی اس طرف حملہ آور ہوا ، اور لاہور کو خوب لوٹا ۔ وہ دہلی کی طرف بھی بڑھا مگر شہزادہ احمد شاہ نے سرہند کے مقام پر اسے شکست دی ۔ اپریل ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ نے وفات پائی ۔

احمد شاہ

احمد شاہ ابدالی کو شکست دے کر مغل افواج نے ثابت کیا تھا کہ ہندوستانیوں میں ابھی تک دم خم ہے ۔ مگر تاجپوشی کے بعد احمد شاہ نے محلاتی زندگی کی دلچسپیوں کو مرکزِ توجہ بنایا اور صفدر جنگ نواب وزیر اودھ نے شہنشاہ کی منظوری حاصل کیے بغیر احکامات صادر کرنے شروع کر دیے ۔ دربار سازشوں کا گہوارہ بن گیا ۔ احمد شاہ نے نظام الملک کے پوتے غازی الدین عمادالملک کو وزیر اعظم بنایا تو دہلی میں صفدر جنگ اور عماد الملک کے درمیان لڑائی ہوئی اور عماد الملک نے اپنی مدد کے لئے مرہٹوں کو بلا لیا ۔ اب دہلی میں تباہی مچنی شروع ہو گئی ۔ انتشار اور خلفشار دیکھ کر ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو معزول کر دیا گیا اور اس کی بجائے پچپن سالہ عزیز الدین ابن جہاندار شاہ کو عالمگیر ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا گیا ۔ اس دوران پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کے حملے جاری رہے ۔

عالمگیر ثانی

یہ شہنشاہ نیک دل ، عبادت گزار اور مطالعے کا شوقین تھا ۔ لیکن شخصی حکومتوں میں سہم جوئی ، تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے ۔ ان صفات سے وہ عاری تھا ۔ اس لئے اپنے وزیر امدادالملک کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کے رہ گیا ۔ احمد شاہ ابدالی نے مغلانی بیگم کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کر رکھا تھا ۔ امداد الملک

نے اسے قید کر کے آدینہ بیگ خان کو صوبیدار مقرر کر دیا ۔ اس لئے غصے میں آ کر احمد شاہ ابدالی حملہ آور ہؤا ۔ آدینہ بیگ خان بھاگ گیا مگر احمد شاہ ابدالی یلغار کرتا دہلی تک پہنچ گیا (۱۷۵۷ء) ، جہاں اس نے قتل و غارت کی انتہا کر دی ۔ واپسی پر اس نے نجیب الدولہ روہیلہ کو وزیر مقرر کرایا ۔ اب نجیب الدولہ اور عماد الملک کی آپس میں ٹھن گئی ۔ مرہٹے بھی تاخت و تاراج کرتے ہوئے لاہور تک پہنچ گئے ۔ نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی سے خط و کتابت کی ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اسے خطوط لکھے ۔ چنانچہ ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی آیا اور مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پہنچ گیا ۔ اس کے بعد دہلی افغانوں اور مرہٹوں کے درمیان میدانِ کارزار بن گیا ۔ ۱۷۵۹ء میں عماد الملک نے عالمگیر ثانی کو قتل کرا دیا اور محی الملت کو تخت پر بٹھایا مگر عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہزادہ علی گوہر نے پٹنہ کے نواح میں بمقام کھتولی شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر کے اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا ۔

شاہ عالم ثانی

شہنشاہ بننے کے بعد شاہ عالم ثانی ۱۲ سال تک دہلی نہ آیا اور انگریزوں کی بنگال میں دست اندازی کے خلاف سیاسی اور جنگی کارروائیوں میں مصروف رہا ۔ اس دوران میں بڑے اہم واقعات ہوئے ۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں شکست دی اور ان کی بہت بڑی فوج کو تباہ کر دیا ۔ اس کے دس پندرہ سال بعد تک مرہٹے سر نہ اٹھا سکے ۔ انگریز ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے معرکے میں شکست دے چکے تھے ۔ ۱۷۶۴ء میں انہوں نے میر قاسم اور شجاع الدولہ کے ساتھ شاہ عالم کو بکسر کے مقام پر شکست دی اور ۱۷۶۵ء میں اس سے ۲۵ لاکھ روپے سالانہ کے عوض بنگال ، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی حاصل کر لی ۔ اس کے بعد شاہ عالم الہ آباد میں مقیم ہو گیا اور اس لئے نجیب الدولہ کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کر دیا ۔ ۱۷۷۲ء میں نجیب الدولہ کی وفات پر وہ دہلی آ گیا اور مرزا نجف خان کو ذوالفقار الدولہ کا خطاب دے کر وزیر مقرر کر دیا ۔ ذوالفقار الدولہ نے ۱۷۸۲ء تک وزارت کی اور مغل بادشاہت کا وقار قائم رکھا ۔ اس کے بعد شاہ عالم نے مادھو جی سندھیا کا سہارا لیا ۔ وہ راجپوتوں سے لڑنے کے لیے گیا تو نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر قبضہ کر کے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو اندھا کر دیا ۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو شہید کرنے

کے بعد انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے اور ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کر لیا اور شاہ عالم انگریزوں کا پنشنر بن کے رہ گیا ۔ ۱۸۰۶ء میں اس نے وفات پائی ۔

بہادر شاہ ظفر

شاہ عالم ثانی کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا ۔ وہ بھی انگریزوں کا پنشنر تھا ۔ ۱۸۳۷ء میں اس کے وفات پانے پر بہادر شاہ ظفر شہنشاہ بنا ۔

برصغیر کے اصل حاکم اب انگریز تھے ۔ ۱۸۱۸ء میں آخری جنگ لڑنے کے بعد مرہٹوں کی طاقت کمزور ہو گئی تھی ۔ ابدالیوں کے خاتمے کے بعد پنجاب میں مہاراجا رنجیت سنگھ کی حکمرانی (۱۷۹۸ء) شروع ہوگئی اور وہ سرحد بلکہ کشمیر پر بھی قابض ہوگیا ۔ سکھا گردی شروع ہونے پر مسلمانوں نے جس جہاد کا آغاز کیا اس کے قائد سید احمد بریلوی[ؒ] تھے مگر ۱۸۳۱ء میں سکھوں نے بالا کوٹ کے مقام پر سید احمد[ؒ] اور شاہ اسمٰعیل[ؒ] کو شکست دے کر مجاہدین کی کمر توڑ ڈالی ۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا ۔ اب سکھوں اور انگریزوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی ۔ انجام کار کئی لڑائیوں کے بعد ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزوں نے فتح کر لیا ۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ بھی فتح ہو چکا تھا ۔ اودھ کی بادشاہت کا ۱۸۵۶ء میں خاتمہ ہوا ۔

یہ تمام واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے اس لئے بددلی عام ہو گئی ۔ جب راجوں کے لاولد مرنے پر ستارا ، جھانسی اور ناگپور کی ریاستیں ضبط ہوئیں تو ہندو بڑے ناراض ہوئے ۔ لاولد پیشوا کو بھی انگریزوں نے کوئی متبنّی نہ بنانے دیا ۔ بعض اور اسباب بھی تھے اس لئے ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی ہوئی مگر انگریز فاتح رہے ۔ بہادر شاہ ظفر کو قید کرکے رنگون بھیج دیا گیا اور اس طرح ہند کے تیموریوں کی سلطنت ختم ہوگئی ۔

معاشرتی اور تہذیبی پس منظر

اورنگ زیب عالمگیر اور معاشرہ

تیموری خانوادے میں اورنگ زیب عالمگیر علم و عمل کا آخری پیکر تھا ۔ اس نے اپنے ذاتی نمونے سے جفاکشی ، خاراشگافی اور اسلامی تعلیمات کے مطابق سادہ زندگی کے اسالیب کو رواج دینا چاہا اور اسلامی احساسات و عقائد پر زور دیا ۔ اکبر اور دارا شکوہ نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس کی وجہ سے آزاد فکری کو تقویت ہوئی اور ہندویت نے ابھرنے کی کوشش کی ۔ لیکن اورنگ زیب نے اس خطرے کو بروقت بھانپ لیا اور اپنے بے پناہ عزم سے اس کا سدباب کر دیا ۔

اورنگ زیب کی وجہ سے ایرانیت کے مقابلے میں تورانی اسلوبِ زندگی کا احیاء ہؤا ۔ ایرانیت لطافت اور جذبہ و خیال کی ترجمان تھی اور تورانیت کے عناصر صلابت ، صراحت پسندی ، دوٹوک پن اور سادگی کے تھے ۔ ان دونوں میں وہی فرق تھا جو محض تخیل میں جینے اور عملی زندگی بسر کرنے میں ہوتا ہے ۔ مغل دربار میں فنونِ لطیفہ کی جس انداز سے سرپرستی ہو رہی تھی اس کی وجہ سے لطافت اور جذبہ و خیال میں تو اضافہ ہو رہا تھا ، لیکن سادگی ، سخت کوشی ، صلابت اور مہم جوئی کی طرف توجہ نہیں تھی ۔ اورنگ زیب نے اسی لئے ان فنون کی سرپرستی ترک کر دی ۔

تخریب کے دو خاص اسباب

ایک مردم شناس شہنشاہ کی حیثیت سے اورنگ زیب مختلف اقوام کی صفات سے بخوبی آگاہ تھا اور حسب ضرورت ان سے کام لیتا تھا ۔ ایرانیوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ اچھے متصدی ہوتے ہیں اور جنگ میں بڑی ثابت قدمی دکھاتے ہیں ۔ تورانیوں کے متعلق اس کی رائے تھی کہ بے جگری سے حملہ آور ہوتے ہیں ۔ اگرچہ ایرانیوں اور تورانیوں کے درمیان رقابت شروع سے چلی آتی تھی لیکن باجبروت شہنشاہوں کی وجہ سے دونوں گروہ تاج و تخت کے وفادار رہے ۔ مگر اورنگ زیب کے بعد ایرانی اور تورانی امراء کے درمیان نزاع روز بروز بڑھتا چلا گیا جس نے انجام کار علانیہ جنگ کی صورت اختیار کر لی اور مغلیہ سلطنت کو سخت کمزور کر ڈالا ۔

تخریب کا دوسرا سبب مغلوں میں تخت نشینی کے لیے کسی مقررہ قاعدے کا نہ ہونا تھا ۔ ہر تاجدار کی وفات پر تخت نشینی کی جنگ چھڑ جاتی تھی اور انتشار ، بد نظمی اور معاشی تباہی[1] کا دور دورہ شروع ہو جاتا تھا ۔ بلند تر مقاصد کی بجائے شخصی اور گروہی مقاصد ابھر آئے ۔ مخلص اور اہلِ نظر امراء اس صورت حال کے مقابلے کی تاب نہ لا کر شعر و ادب سے دل بہلانے لگے ، حتیٰ کہ مغل شہنشاہوں نے بھی اس دور میں

---

(۱) اس ضمن میں ملا مہشتی کی مثنوی 'آشوب ہندوستان' کا مطالعہ سودمند رہے گا ۔ اس نے جنگ تخت نشینی کے متعلق یہ مثنوی لکھی ہے ۔ اور اس جنگ کی وجہ سے جو معاشی بدحالی اور تباہی ہوئی اس کی بابت لکھا ہے :

ہزاراں فتادند بے روزگار　　عزیزاں بہ گوشہ خوار و زار
بہر سرحد از غارت رہزناں　　بہ تجار نے نام ماند و نہ ناں

شعر گوئی اور تصنیف کو وقت گزاری کا ذریعہ بنا لیا ۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی نے 'منتخب عزیزی' تصنیف کی ۔ شاہ عالم ثانی اردو اور فارسی کا صاحب دیوان شاعر تھا ۔ اُردو میں ایک قصہ 'عجائب القصص' بھی لکھا ۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر نے بھی اُردو کا ایک دیوان چھوڑا ہے ۔

ایرانی تورانی نزاع اور پے در پے تخت نشینی کی لڑائیوں کا مجموعی طور پر ایک اثر یہ بھی ہؤا کہ وہ اقدار جو صدیوں کی تہذیب کا خلاصہ تھیں ، بری طرح مجروح ہوئیں ۔ جہاندار شاہ لڑائی میں بھی طوائف اور سازندے ساتھ لے کر جاتا تھا ۔ محمد شاہ نے طاؤس و رباب کو فروغ دیا ۔ ان حالات کی وجہ سے جہاں مرکزی حکومت میں انتشار پیدا ہوا ، وہاں فوجی نظام اور ذرائع معاش میں بھی ابتری پیدا ہوئی ۔ شرفا تنگ حال ہوتے چلے گئے اور اخلاقی اقدار اور تہذیبی فضائل کو سخت دھچکا لگا ۔

محمد شاہ کی دہلی اور ان کے اسالیب حیات

محمد شاہ کے عہد کی دہلی تموّل ، حسن و رعنائی ، رقص و سرود اور عیش و نشاط کے حیرت انگیز مناظر دکھاتی ہے ۔ ان کو دیکھنے کے لئے نواب درگاہ قلی خان کی تصنیف 'مرقع دہلی' اور 'دیوان فائز' کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔ درگاہ قلی خان حملۂ نادری (۱۷۳۹ء) کے وقت نظام الملک کے ساتھ حیدر آباد دکن سے آیا تھا اور نواب صدرالدین محمد خان بہادر فائز دہلوی شاہجہان کے مشہور و معروف نواب علی مردان خان کی اولاد سے تھا ۔ نواب فائز نے دس فصلوں پر مشتمل ایک مثنوی شہر آشوب لکھی ۔

ان مصادر کو سامنے رکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ویسے تو دہلی کی چمک دمک خیرہ کن تھی مگر معاشرہ زندگی بخش صفات سے عاری ہوتا جا رہا تھا ۔ حصولِ منصب کے لئے ہر ایک کی دوڑ دھوپ ، دستار و قبا اور طرۂ زرتار کی محبت ، امراء کے بے معنی مشاغل ، علم و فضل اور مطالعہ سے بے اعتنائی ، تمام معاشرے کی زرپرستی ، رنگین صحبتیں اور فواحش ، عوام و خواص کی سفلہ طبعی اور تنگ مزاجی ، ان تمام باتوں کی داستان ہم پڑھتے ہیں تو عبرت پیدا ہوتی ہے ۔ بقول فائز ''بزم میں تیغ زنی کرنے والے'' رزم سے عورتوں کی طرح بھاگ جاتے تھے اور حصول علم کا نتیجہ ''خسران مبین'' کے بغیر کچھ نہ تھا ۔

پاکستان و ہند کی اسلامی تہذیب کے اس دور نے جن اسالیب حیات کو فروغ دیا ، ان کا ذکر کرنا ضروری ہے ۔ اورنگ زیب ایسے سخت جان شہنشاہ کو اگر مرہٹوں کے مغلوب کرنے میں اتنی دیر لگی تو اس کی وجہ اس کے عسکریوں کی تن آسانی ، عیش کوشی اور سپاہیانہ زندگی سے جلو تہی بھی تھی ۔ ان کے مقابلے میں مرہٹے جفا کش تھے اور گوریلا جنگ کی مشق کرتے تھے ۔ آزاد بلگرامی لکھتا ہے[۱] :

''مردم غنیم محنت بر خود گوارا کردہ مشق جنگ قزاق می کنند . . .
و فراغت شعاران اسلام در آرام طلبی افتادہ اند ۔''

اورنگ زیب کی وفات کے چند سال بعد رود و سرود کا بازار جس طرح گرم ہوا ، اس کے متعلق خافی خاں کا بیان درج کیا جا چکا ہے ۔ محمد شاہ کے زمانے میں رکیک نفاستیں اس قدر بڑھ گئیں کہ عورتوں کی طرح خوبصورت لباس پہن کر مرد نزاکت سے کام لیتے تھے ۔ گفتگو میں انہی کی طرح رس اور لوچ پیدا کرتے تھے ۔ نواب فائز دہلوی کہتے ہیں[۲] :

مشق حرف و گفتگو چون زن کنند	رخت چون نسوان ہمہ در تن کنند
جامہ ہا چسپیدہ بر تن ہمچو پوست	ہم نمودار از درونش موبموست

امور زندگی میں عورتوں کا غلبہ تھا ۔ زنانہ بازاروں اور مینا بازاروں کا عام رواج تھا ۔ ان کا حال ارادت خان واضح اور میرزا خلیل معاصر مصنفین[۳] کی زبانی سنیے ۔ سرتاسر نزاکت ، لفاست اور جذبات انگیزی کا بیان ہے ۔ نوخطوں سے رغبت کے ثبوت بھی ملتے ہیں ۔ دیپ چند[۴] کے مینا بازار سے دو ایک عنوانات کا درج کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا :

''احوال صراف زادۂ سیمین رخ ، گل فروش لالہ رو ، حلوائی زادہ شکرین لب ۔''

علاوہ بریں اس دور میں کاروبار سلطنت میں عورتوں کا غلبہ تھا ۔ جہاندار شاہ کی لال کنور ، محمد شاہ کے عہد میں کوکی بادشاہ اور اس کے بعد اودہم بائی کے نام ثبوت کے لئے کافی ہیں ۔

---

(۱) آزاد بلگرامی ، خزانۂ عامرہ ، ص ۹۴ ۔
(۲) نواب فائز دہلوی کے دیوان فارسی کا مخطوطہ ڈاکٹر وحید قریشی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے ۔
(۳) ارادت خان واضح ، مینا بازار ، مطبع محمدی ، ۱۲۵۹ھ ۔
(۴) دیپ چند ، مینا بازار ، مخطوطہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ۔

اسالیبِ حیات کے سلسلے میں دو ایک اور باتیں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ابتدا میں میرزائیت کی اصطلاح مثبت اقدار کی ترجمان تھی اور اس سے شجاعت، جوانمردی اور سخت جانی مراد لی جاتی تھیں۔ اسی لیے مان سنگھ جیسے راجپوت جرنیل میرزا کہلانے پر فخر کرتے تھے، لیکن اس دور میں یہ اصطلاح تہذیب و شائستگی کے انفعالی رنگ کے معنی دے رہی تھی، جس سے تن آسانی، تجمّل اور آسائش کا عام میلان، وضع میں طمطراق اور نفاست کا خیال، آداب و تکلّف، تخیّل پسندی اور عملی جدوجہد سے فرار مراد لیا جاتا تھا۔ لوگ عجائب پسند بن چکے تھے۔ مصنّفوں کو بھی عجیب کا لفظ مرغوب تھا۔ چنانچہ کئی کتابوں کے نام ایسے ہی رکھے گئے۔ مثلاً آنند رام مخلص کی 'بدائع وقائع'۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چونکا دینے والے حالات زندگی کو دیکھ کر لوگ صرف تعجب یا حیرت کے اظہار پر قناعت کر لیتے تھے۔ اسی بے علمی کا نتیجہ تھا کہ ادب و فن برائے تفریح و مسرت انگیزی کے نظریے کو فروغ حاصل ہوا۔ مشاعروں میں شدید دلچسپی کا اظہار ہونے لگا۔ شاہ گلشن (م ۱۷۲۸ء) کے علاوہ میرزا گرامی (م ۱۷۴۳ء) کے دہلی میں مشاعرے مشہور ہیں۔ اسی طرح تحفۃ الہند (تصنیف ۱۸۵۰ء) میں لاہور کے مشاعروں کے متعلق لکھا ہے[1] :

"شعرائے شیرین زبان و طبقہ طبقہ مردم سخندان از اہلِ ایران و توران و ہندوستان در مسجد وزیر خان مجتمع گشتہ ہنگامۂ سخندانی گرم می داشتند۔"

داستان نگاری اور داستان گوئی[2] کا ذوق بڑھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ معاشرہ زندگی سے فرار چاہتا تھا۔

میرزا محمد ظہیر الدین علی بخش اظفری گورگانی عرف میرزا کلان (م ۱۸۱۸ء/۱۲۳۴ھ) جو لڑکی کی طرف سے جہاندار شاہ کی اولاد میں سے تھا، 'مرغوب الفواد'[3] میں اس تنزل اور ادبار کا سبب مغل شہزادوں اور تیموری بادشاہوں میں ترکی حسیّات کی افسوسناک کمی بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب تک ترکی روایات سے وابستگی قائم رہی، اقبال بھی قائم رہا۔ اس کے خیال کے مطابق ترکی زبان کا ترک کر دینا بھی مغلیہ سلطنت کے ضعف کا سبب بنا۔

---

(۱) بھولا ناتھ، تحفۃ الہند، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، برگ ۴۲۔
(۲) ایضاً، برگ ۴۔
(۳) اظفری، مرغوب الفواد، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، بابت ماہ اگست ۱۹۳۵ء۔

وہ اپنے استاد میر کرم علی کا قول نقل کرتا ہے کہ ''ترکی زبان چابک سلطنت ہندوستان است'' اور بصد افسوس کہتا ہے :

''زبان ترکی بعد از شنقار فرمودن محمد شاہ از شاہجہان آباد مفقود گردید چنانچہ زبان زد خاص و عام شد کہ بر محمد شاہ ترکی تمام شد ۔''

مغلوں کے آخری دور کی تہذیبی زندگی

اس ضمن میں پہلے ضوابط و قواعد سلطنت پر طائرانہ نگاہ ڈال لینا ضروری ہے ۔ مناصب بیستی سے شروع ہوتے تھے اور ہفت ہزاری پر ختم ہوتے تھے ۔ پان صدی سے کمتر مناصب کے ساتھ سوار نہیں ہؤا کرتے تھے اور یہ بھی لازم نہیں تھا کہ سوار منصب ذات کے برابر ہوں ۔ سوار منصب سے کمتر تو ہوتے تھے مگر زیادہ نہیں ۔ اسی دور میں سب سے پہلے شاہ عالم بہادر شاہ نے اسد خان کو ہشت ہزار سوار کا منصب دیا ۔ پھر جب محمد شاہ کا زمانہ آیا تو اس نے نظام الملک کو نُہ ہزار ذات اور نُہ ہزار سوار کا منصب دیا ۔ علم ہزار سوار سے شروع ہو جاتا تھا اور نقارہ دو ہزار سوار سے ۔ دستور اعظم ، دیوان تن ، میر بخشی ، خانساماں ، میر آتش وزراء تھے ۔ اورنگ زیب کے زمانے سے عام طور پر دستور اعظم کو معزول نہیں کیا جاتا تھا ۔ وہ مہات خلافت اور اسرار سلطنت سے آگاہ ہوتا تھا ، اس لئے اس کی ذلت گوارا نہیں کی جاتی تھی ۔ شاہزادوں اور ان کے بیٹوں کو جنھیں 'سلاطین' کہا جاتا تھا ، ہفت ہزاری سے کمتر منصب نہیں ملتا تھا ۔ انہیں سی ، چہل ، پنجاہ ہزاری بلکہ اس سے بھی زیادہ مناصب ملتے تھے ۔ ان کے لئے درباری لباس پر سامنے کی طرف سورج مکھی پھول مخصوص تھا ، دربار شاہی میں بیٹھنے کی اجازت تھی ۔ امراء اپنے پائے کے مطابق کھڑے رہتے تھے ۔ بادشاہ ، شہزادوں اور سلاطین کے خیموں کا رنگ سرخ ہوتا تھا ۔ شاہی خیمہ 'دولت خانہ' کہلاتا تھا ۔ امراء کو پایۂ تخت کے قریب شکار کھیلنے اور شاہی باغوں میں سیر کرنے کی اجازت نہ تھی ۔ ان کا لباس بھی مخصوص تھا ۔ امراء کو جاگیریں ملتی تھیں جو اقطاع کہلاتی تھیں ۔ خزانۂ شاہی میں ''خالصۂ شریفہ'' کے محاصل داخل ہوتے تھے ۔ شاہزادوں اور سلاطین کی تنخواہ تنبول کہلاتی تھی اور اس میں سے جو کچھ بیگمات کو ملتا تھا ''برگ بھلا'' کہلاتا تھا[1] ۔

---

(۱) ان تمام مطالب کے لئے مرآۃ الاصطلاح قلمی نسخہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، مصنفہ آنند رام مخلص ، برگ ۱۴ تا ۱۹ دیکھئے ۔ نیز تحفۃ الہند ، از بھولا ناتھ ، قلمی ۔

اس تہذیبی پس منظر کو سمجھنے کے لئے اس دور کی رسوم اور تقریبات کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ شادی بیاہ اور بچوں کی ولادت کی تقریبات دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں ۔ رقص و سرود اور چراغاں کا اہتمام ہوتا تھا ۔ عیش و عشرت کے دلدادہ امراء خوب بزم آرائی کرتے تھے[1] ۔ معلوم ہوتا ہے ہندوؤں میں ستی کی رسم ابھی باقی تھی ۔ آنند رام مخلص ایک کھتری بھگوان نرائن عمر ۳۵ سال کے مرنے پر اس کی بیوی کے ستی ہونے کا ذکر کرتا[2] ہے ۔ ہندو اور مسلمان بسنت کی تقریبات اپنے اپنے اندازے[3] کے مطابق مناتے تھے ۔ اسی طرح رویت ہلال کے موقع پر مسلمان قدمگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو جاتے تھے اور مختلف مزارات پر حاضری دیتے تھے ۔ ان مقدس تقریبات پر بھی ، درگاہ قلی خان کہتے ہیں ، زائروں میں :

> ''پری پیکران نازنین شیشہ خانۂ حوصلۂ تماشائیاں را بسنگ می زنند و
> عقل مصلحت بین را فرسنگ بفرسنگ می برد ۔''

مسلمان ایک ہفتے تک بسنت مناتے تھے اور سال بھر کے لئے عیش و نشاط کا ذخیرہ جمع کر لیتے تھے ۔ درگاہ قلی خان یازدہم میرن کا بھی اسی انداز سے ذکر کرتے ہیں ۔ البتہ دوازدہم ربیع الاول (بارہ وفات) کے سلسلہ میں بتاتے ہیں کہ عرب سرائے میں درود و سلام کی محفل منعقد ہوتی تھی ۔ اس کے بعد وہ کسل پورہ اور ناگل کی تقریبات میں جس ہوس پرستی کا ذکر کرتے ہیں ، اسے بیان نہ کرنا بہتر ہے ۔ ان تمام مواقع پر چاندنی چوک اور چوک سعداللہ خان میں دولت و ثروت اور مال تجارت کی جو خیرہ کن نمائش ہوتی تھی وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ امراء سر پر کھڑکیدار چیرہ باندھا کرتے تھے اور ہاتھ میں مطلاً اور منقوش چوب کھندی رکھا کرتے تھے[4] ۔

جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے ، ان کی طرف عہدِ عالمگیری کی نسبت اب زیادہ توجہ ہوئی ۔ موسیقی ، مصوری ، نقاشی کا کام جاری رہا ۔ البتہ فنِ تعمیر کا کوئی یادگار کارنامہ انجام نہ پا سکا ۔ شعر و شاعری بھی ہوتی رہی ۔ باغبانی کا شوق عام تھا ۔ آنند رام مخلص

---

(۱) درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ، مطبوعہ بمعہ مقدمہ سید مظفر حسین ، صفحات ۲۸ ، ۲۹ ۔

(۲) آنند رام مخلص ، چمنستان ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۷ء ، ص ۳۲ ۔

(۳) مرقع دہلی ، ص ۴ ۔

(۴) آنند رام مخلص ، چمنستان ، مطبوعہ نولکشور ، نومبر ۱۸۷۷ء ، ص ۳۴ ، ۳۵

متعدد درختوں کا نام لیتے ہیں اور بیسیوں پھول گنواتے[1] ہیں جو باغات کی زیب و زینت کے لئے بوئے جاتے تھے - صرف گل لالہ کی ۴۴ قسمیں شمار کی ہیں - 'آئین اکبری' مذکور نے بہت سے مزید پھولوں اور پھلوں کا نام بھی لیا ہے - اور انہوں نے سرد اور گرم تمام علاقوں کے پھلوں کا ذکر کیا ہے -

اس دور کے صوبائی دربار

اس مرحلے پر ہمیں دہلی سے باہر کے صوبائی درباروں پر بھی نگاہ ڈال لینی چاہئے - اودھ میں پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ تہذیب و ثقافت کے مرکز بنے - نوابانِ اودھ بعد میں شاہانِ اودھ کہلانے لگے اور اگرچہ انہوں نے اپنے سامنے مغل تہذیب و ثقافت کا نمونہ رکھا ، لیکن اس میں انہوں نے اپنی افتادِ طبع اور اپنے حالات کے مطابق تبدیلیاں بھی کیں - پہلے جدید عمارات سے فیض آباد کی تزئین ہوئی ، بعد میں لکھنؤ کی شان دوبالا ہو گئی - علماء ، شعراء ، ادباء اور اہلِ فن نے اس طرف کا رخ کیا ، جہاں کھلے دل سے ان کی سرپرستی ہوئی - زندگی کے ظواہر زیادہ دلچسپی کا موجب تھے - اسی لئے تکلفات بڑھے اور ہر شعبۂ حیات پر چھا گئے - حتیٰ کہ مجلسی آداب سیکھنے کے لئے طوائف کے پاس جانا معمول تھا - موسیقی میں بڑی ترقی ہوئی - واجد علی شاہ خود بڑے موسیقار تھے اور لے داری میں انہیں وہ کمال حاصل تھا کہ کوئی اعلیٰ درجے کا کامل فن گویّا بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا - ان سے پہلے نواب آصف الدولہ کے زمانے میں فارسی زبان میں موسیقی کے متعلق ایک کتاب 'اصول النغمات الآصفیہ' لکھی گئی . جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس فن پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں[2] - لکھنؤ میں فارسی زبان و ادب اور شعر و سخن کو میرزا قتیل کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا -

اودھ کے حکمران شیعہ عقائد رکھتے تھے - ان کے اختیارات کم ہوئے تو انہوں نے مذہبی تقشّف بڑھا لیا اور بعض عجیب و غریب رسوم شروع کر دیں - منشی عبد الاحد رابط (م ۱۸۵۱ء) جو نصیر الدین حیدر شاہ اودھ (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۷ء) کے عہد میں لکھنؤ میں سررشتہ دار تھا ، فارسی زبان میں اپنی تصنیف 'وقائع دلپذیر' میں بادشاہ کے

---

(۱) آنند رام مخلص ، چمنستان ، مطبوعہ نولکشور ، نومبر ۱۸۷۷ء ، ص ۳۵ ، ۵۲ -
(۲) یہ مولانا عبدالحلیم شرر کی رائے ہے -

متعلق لکھتا[1] ہے :

”و ہر گاہ روز ولادت کدام امام فرخندہ رسیدے مثل زنان باردار
خود را بدرد زہ و طلق و مخاص از راہ تصنع مبتلا ساختے ۔“

اسی طرح اچھوتیوں کی عجیب و غریب رسوم تھیں جو آئمہ اطہار کی فرضی بیویاں ہوتی تھیں ۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ کی طبیعت میں زنانہ مزاجی اس حد تک پیدا ہو گئی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں کا لباس پہنتے ۔ یہ نسوانیت معاشرہ میں بھی پھیلی اور شعراء نے بھی اس کا اثر قبول کیا ۔ اردو زبان میں ریختی اسی کی یادگار ہے ۔ ان باتوں سے پتا چلتا ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک قسم کی فرار پسندانہ رومانیت سے لذت حاصل کی جاتی تھی ۔ اسی راہ سے معاشرہ میں مختلف قسم کے توہمات بھی داخل ہو گئے ۔ لکھنؤ کی مجلسی زندگی کے بعض مثبت پہلوؤں کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ اہلِ علم کے یک جا ہونے کی وجہ سے کتب خانے قائم ہوئے ۔ ایک روایت کے مطابق عہد آصف الدولہ میں شاہی کتب خانے میں تقریباً تین لاکھ[2] کتابیں موجود تھیں ۔ واجد علی شاہ کے ذاتی کتب خانے میں اگرچہ کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن تمام کی تمام مطلّا اور مذہّب تھیں ۔

اودھ کے ان درباروں کے مقابلے میں فرخ آباد کو اوّلیت کا مقام حاصل ہے ، جو نواب محمد خاں بنگش (م - ۱۷۴۳ء) کی داد و دہش کے باعث ارباب علم و فن کا مرجع[3] بن گیا تھا ۔ احمد خاں بنگش (م - ۱۷۷۱ء) کے زمانے میں ملکی حالات سے مجبور ہو کر فیض آباد اور لکھنؤ جا بسنے والے اکثر نامی گرامی خاندان پہلے فرخ آباد آتے تھے ۔ مشرق کی طرف بنگالہ کے آباد اور خوشحال صوبے میں مرشد قلی خان نے مقصود آباد کو اپنا مستقر بنایا اور اس کا مرشد آباد نام رکھا ۔ شہر نے سرعت سے ترقی کی اور بقول کلائیو وسعت ، آبادی اور دولت کے لحاظ سے لندن کا جواب بن گیا ۔ سینکڑوں مسجدیں تھیں ، پرتجمل ایوان چہل ستون فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ تھا ۔ شہر میں ہر فن کے ماہر تھے ۔ جو

---

(۱) وقائع دلپذیر (ترجمہ) مطبوعہ کراچی ، ص ٦ ۔
(۲) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے ، ص ۲۹۹ ۔
(۳) مفتی ولی اللہ ، عہد بنگش ، کراچی ١٩٦٥ء ، ص ۲۲۱ تا ۵۲۵ ۔

کچھ دہلی میں تھا ، وہاں بھی موجود تھا ۔ گویا مغلوں نے اپنی پسند کا ایک اور شہر آباد کر لیا تھا جہاں ان کی تہذیب و ثقافت اپنا رنگ دکھا رہی تھی ۔ دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے بھی ایک آزاد ریاست قائم کر لی ۔ وہاں اورنگ آباد علما و فضلاء کا ملجا و ماویٰ تھا ۔ ادھر سندھ میں ٹھٹھہ کا مقام شروع ہی سے مغلوں کی مجلسی زندگی کے ایک اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا تھا لیکن اس دور میں ٹھٹہ کی حالت ابتر ہو گئی تھی ۔ ان حالات کو دیکھ کر عطا نتوی نے ایک شہر آشوب لکھی ۔ اس کا ایک شعر ہے :

نہ از محاسبہ و نہ از مواخذہ پاک   چگونہ زندگی و عافیت ، چشان مردن

ہندو عصبیت کی نمود

جلال الدین اکبر کے زمانے میں ہندوؤں کے علوم کی طرف میلان بڑھا تھا ۔ اس میلان کو داراشکوہ کی وجہ سے بھی تقویت حاصل ہوئی ۔ موجودہ دور میں بھی اس کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ نواز نے محمد شاہ کے زمانے میں 'شکنتلا' کا ترجمہ کیا ۔ رضی الدین احمد الہندی السورتی نے 'تحفۃ الہند' کے نام سے ہندو علوم و فنون پر کتاب لکھی ۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے ہندویات کی طرف توجہ کی ۔ اس سلسلے میں ان کے 'تذکرہ سرو آزاد' کی فصل ثانی ''در ذکر قافیہ سنجان ہندی'' پیش کی جا سکتی ہے ۔ جہاں تک خود ہندو مصنفین کا تعلق ہے ، ان کے دل میں اپنے ہندو ہونے کا احساس عصبیت کی حد تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے ۔ سجان رائے کی 'خلاصۃ التواریخ' کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ مصنف کے دل میں اپنے ہندو ہونے کا زبردست[1] احساس موجود ہے ۔ اسی طرح شفیق اورنگ آبادی اپنی تصنیف 'بساط الغنائم' میں مرہٹوں کی صاف طرفداری کرتا ہے ۔

احساسات و اعتقادات

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات کے ۷۸ سال بعد ۱۷۰۳ء میں شاہ ولی اللہ دہلی میں پیدا ہوئے ۔ شاہ صاحب نے اپنی آنکھوں سے ایرانی تورانی نزاع کی صورت میں شیعہ سنی مناقشات دیکھے ۔ نادر شاہ ، مرہٹوں ، سکھوں اور احمد شاہ ابدالی کی وجہ سے ملکی حالات کی ابتری کا مشاہدہ کیا ۔ اپنے گرد و پیش تن آسانی اور عشرت کوشی کے مناظر دیکھے ۔

---

(۱) ڈاکٹر سید عبداللہ ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ، ص ۱۱۱ ۔

نیز تصوف کو ابتذال کا شکار ہوتے دیکھا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر اور باہر ہر لحاظ سے انہیں خطرات نظر آئے ۔ شاہ ولی اللہ نے ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر احیائے اسلام کے لیے ایک جامع لائحۂ عمل تیارکیا ، شیعہ سنی اختلافات کو مٹانے کی کوشش کی ۔ حنفی اور شافعی فقہ میں مسلکِ اعتدال کی تبلیغ کی ۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں مطابقت کی راہ دکھائی ۔ مسلمانوں کو ملی خطرات سے آگاہ کیا ، انہیں عرب اور قرآن کی طرف رجعت کی دعوت دی ۔ مذہب کو کلیتہً عقل کے تابع کیے بغیر آپ نے دینی عقائد میں عقلی بنیاد پیش کی تاکہ اس کی وجہ سے اعتقادات پختہ تر ہو جائیں ۔ آپ نے اپنے روحانی تجربات کی روشنی میں مروجہ تصوف کا تزکیہ کیا اور قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اس کتاب مقدس کو عام فہم بنا دیا ۔

جہاں تک عملی سیاسیات کا تعلق ہے ، شاہ صاحب اسلام کی سربلندی کے لیے ایک مضبوط مرکزی حکومت کو لازمی قرار دیتے تھے اور اس غرض کے لیے جہاد پر زور دیتے تھے ۔ آپ معاشی اصلاحات کے بھی حامی تھے ۔ بغور دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ شاہ صاحب ''فکّ کل نظام'' کی صدا بلند کر کے ایک تنومند ، صالح اور جدید اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے ۔ اس طرح آپ اپنے عہد کے احساسات و اعتقادات کے مکمل ترجمان کے طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں ۔ آپ ۱۷۶۳ء میں وفات پا گئے اور آپ کے بعد آپ کے فرزند شاہ عبدالعزیز نے اس کام کو جاری رکھا ۔ آپ کے جذبۂ جہاد کے مظہر آپ کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید (ش - ۱۸۳۱ء) بنے ۔

دیگر اہل قلم کی تحریرات بھی اس عہد کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں ۔ میرزا بیدل (م - ۱۷۲۰ء) نے لال کنور اور سید برادران کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں کو دیکھا اور اپنے احساسات کو دو شہر آشوب مخمسات میں بیان کیا ۔ اہل زمانہ کو انہوں نے متنبّہ کیا کہ دور بے غیرت تا دیر قائم نہیں رہ سکتا ۔ محمد شاہ کے زمانے میں مغل معاشرہ کے المناک حالات کو جس دردِ دل کے ساتھ نواب فائز دہلوی نے بیان کیا ہے ، اس کا ذکر ہو چکا ہے ۔ جب ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم ثانی کو اندھا کیا گیا تو انہوں نے ایک بڑی زہرہ گداز شہر آشوب غزل کہی جو مسلمانان برصغیر کی درد مندی کا کلاسیکی بیان تصور کی جا سکتی ہے ۔ اس زمانے میں حاتم ، میر ، سودا ، نظیر وغیرہ شعرائے اردو موجود تھے ۔ انہوں نے بھی شہر آشوب لکھ کر مجلسی زندگی کے انحطاط کے نقشے کھینچے ۔

علاوہ بریں اس دور میں کئی عبرت نامے[1] لکھے گئے جو ہمہ گیر احساس عبرت کا اظہار کرتے ہیں ۔

اس دور میں دینی ، فکری اور سیاسی نہضت

حکومت مغلیہ کے زوال و انحطاط ، عام امراء کی تعیش کوشی اور اسی دور میں انگریزوں کے روز افزوں تسلط کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اسلامیانِ ہند اپنی توانائی کھو چکے تھے ، لیکن جب معاشرے کی مجموعی زندگی پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ دور دراصل ان کی دینی ، فکری اور سیاسی نہضت کا دور ہے ۔ اس کے آغاز میں ہم حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (۱۶۵۰ء - ۱۷۲۹ء) کو مدرسۂ خانم بازار دہلی میں احیائے دین کی کوششوں میں مصروف دیکھتے ہیں ۔ یہیں سے تصوف کی وہ عوامی تحریک شروع ہوئی جو بالآخر تمام برِصغیر میں پھیل گئی اور جس کی بدولت پنجاب میں بھی مہار شریف ، تونسہ شریف ، سیال شریف ، جلال پور شریف اور گولڑہ کے علاوہ متعدد دیگر مقامات پر اربابِ چشت کی خانقاہیں قائم ہو گئیں ۔ شاہ عبدالرحیم (۱۶۴۴ء-۱۷۱۸ء) کا دہلی میں مدرسۂ رحیمیہ بھی اسی دور کے آغاز میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے ۔ اس مدرسے میں احسان و سلوک کے علاوہ علم ظاہر پر زور دیا جاتا تھا اور یہیں سے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک زبردست انقلابی تحریک شروع ہوئی ۔ حضرت شاہ ولی اللہ (م - ۱۷۶۳ء) شاہ عبدالرحیم کے فرزند تھے اور اسی مدرسے کے تعلیم یافتہ تھے ۔ آپ کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' اس دور کے مسلمانوں کی فکری نہضت کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔ مسلمانوں کے دینی اور فکری احیاء میں آپ کے فرزند شاہ عبدالعزیز (م - ۱۸۲۳ء) شاہ رفیع الدین (م - ۱۸۱۸ء) اور شاہ عبدالقادر (م - ۱۸۱۵ء) بھی اسی طرح حصہ لیتے نظر آتے ہیں ۔ نیز یہی وہ دور ہے جس میں ملا نظام الدین (م - ۱۷۴۸ء) کا مشہور درس نظامیہ شروع ہوتا ہے ۔

گذشتہ صفحات میں سیاسی پس منظر اور احساسات و اعتقادات کا ذکر کرتے ہوئے سیاسی استقلال اور آزادی کے لیے اسلامیان ہند کی مساعی کی طرف اشارات کیے گئے ہیں ۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں جہاں مغلوں کی شہنشاہیت کو زوال آ رہا تھا ، وہاں ہمیں نظام الملک اول (م - ۱۷۴۸ء) ، نجیب الدولہ (م - ۱۷۷۱ء) اور نجف خان

---

(۱) مثلاً عبرت نامہ از خیر الدین محمد الہ آبادی ، عبرت نامہ از مرزا محمد بن معتمد خان ، عبرت نامۂ قاسم ، عبرت نامۂ کامراج ۔

(م - ۱۷۸۲ء) ایسے اولوالعزم مدبر بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ شاہی وقار قائم رکھا ۔ ایسے امراء کا اچانک معاشرے میں پیدا ہو جانا ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان اپنا سیاسی استقلال بدستور برقرار رکھنا چاہتے تھے ۔ مسلمانوں کے سیاسی تفوق کو قائم رکھنے کے لیے شاہ ولی اللہ نے بھی کوشش کی ۔ آپ نے ایک طرف نجیب الدولہ اور دوسری طرف احمد شاہ ابدالی سے خط و کتابت[1] کی اور انھیں بڑی شد و مد کے ساتھ کہا کہ جہاد کر کے مسلمانوں کو اغیار کے غلبے سے نجات دلائیں ۔ حضرت شاہ فخرالدین دہلوی (۱۷۱۷ء - ۱۷۸۵ء) کا تعلق زیادہ تر عوام کی اصلاحِ نفس کے ساتھ تھا ، لیکن انھوں نے بھی شاہ عالم کو لکھا[2] :

> ''پس اول مقدم آنست کہ آں صاحب بذات خود مستعد محنت کشی و ملک گیری می شوند ۔''

بنگال میں اسلامی عظمت کے بقا کے لیے مرشد قلی خان اور علی وردی خان کی جد و جہد یاد رکھنے کے قابل ہے ۔ ان کے بعد سراج الدولہ (م - ۱۷۵۷ء) کے جذبۂ حرّیت نے بنگال میں انگریزوں کو للکارا ۔ جنوب میں ہم حیدر علی (۱۷۸۲ء) کو مخالف طاقتوں سے نبرد آزما دیکھتے ہیں ۔ اس کے بعد سلطان ٹیپو نے اسی جذبۂ حریت کے ماتحت سرفروشی اور جانبازی کا شاندار مظاہرہ کیا (۱۷۹۹ء) ۔ سیاسی استقلال کے لیے اسی تڑپ کے باعث تحریک مجاہدین شروع ہوئی جس کے نامور مجاہد سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید ہیں جنھوں نے ۱۸۳۱ء میں بالا کوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش کیا ۔ علاوہ بریں مسلمانوں کے یہی جذبات تھے جو بعد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئے ۔ ۱۸۵۷ء سے بعد کا زمانہ یہاں زیر بحث نہیں لایا جا سکتا لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ مسلمانوں نے تحریکِ عدم تعاون کی شکل میں انگریزوں کی مزاحمت پھر بھی جاری رکھی اور اپنی سیاسی آزادی کے لئے لگاتار کوشاں رہے ۔

ان تمام حقائق کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے فوراً بعد یہاں کے مسلمانوں کے اذہان اور قلوب میں ایک عظیم تحریک پیدا ہوئی ، جو ان کی فطری توانائی اور زندہ رہنے کی زبردست آرزو کا بیّن ثبوت ہے ۔ اسی

---

(۱) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ، صفحات ۵۲ ، ۵۹ ، ۶۰ ، ۶۱ ۔
(۲) مناقبِ فخریہ ، صفحات ۳۵ ، ۳۶ ۔

تحریک کی وجہ سے مسلمانان پاکستان و ہند کے درمیان ، اٹھارھویں صدی عیسوی میں ، بڑے بڑے عالی دماغ اور باہمت انسان نمودار ہوئے جس کی بنا پر پاکستان و ہند میں اسے ہم بجا طور پر عظیم انسانوں کی صدی کہہ سکتے ہیں ۔ اس دور کی یہ حقیقت پس منظر کے طور پر ضرور ذہن میں موجود رہنی چاہئے ۔

اس زمانے کا نظام تعلیم اور اس میں فارسی زبان و ادب کی اہمیت

جہاں تک عربی علوم کا تعلق ہے ، اس دور میں معروف درس نظامیہ کا رواج رہا ۔ ہمیں یہاں اس کی تفصیلات درج کرنے کی ضرورت نہیں ۔ البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کی بعض خامیاں فارسی زبان و ادب کے نصاب کی وجہ سے از خود دور ہوگئی تھیں ۔ درس نظامیہ میں اخلاق و تصوف اور شعر فہمی کی رعایت نہیں کی گئی تھی ۔ اس کمی کو فارسی زبان کا ادب و شعر پورا کرتا تھا ۔ عربی اور فارسی کے نصاب ساتھ ساتھ مسجدوں اور مکتبوں میں پڑھائے جاتے تھے ۔ جہاں عربی زبان میں صرف ، نحو ، حکمت ، کلام ، فقہ اور تفسیر کا درس دیا جاتا تھا ، وہاں فارسی زبان میں 'پند نامہ' ، 'کریما' ، 'بوستان' ، 'یوسف زلیخا' ، 'اخلاق محسنی' ، 'اخلاق ناصری' وغیرہ کتابیں درساً پڑھائی جاتی تھیں ۔ فارسی کے نصاب تعلیم میں ابتدائی اور ثانوی مدارج کا لحاظ رکھا جاتا تھا ۔ ابتدائی تعلیم میں بول چال ، خط و کتابت اور اخلاق حکایات کی طرف توجہ دی جاتی تھی ۔ 'مامقیان' ، 'دستورالصبیان' ، اور 'نصاب الصبیان' جیسی کتابیں بھی شامل نصاب تھیں ۔ ثانوی تعلیم کے نصاب میں 'انشائے خلیفہ مادھو رام' ، سہ نثر ظہوری' ، 'پنج رقعہ' ، 'بہار دانش' ، 'انوار سہیلی' ، 'سکندر نامہ' اور 'شاہنامہ' شامل ہوتے تھے ۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ ثانوی درجے کے فارغ التحصیل طلبا اچھے منشی بن جائیں جن کی سرکاری محکموں میں ہر جگہ کھپت تھی ۔ مسلمان اور ہندو یہ نصاب مکمل کیا کرتے تھے ۔

مگر یہ نصاب اوسط درجے کے منشیوں کا تھا ۔ جو ذہین اور طبّاع طالب علم صاحب کمال بننا چاہتے تھے اور ساتھ ہی اس بات کی آرزو بھی رکھتے تھے کہ مغلوں کے اعلیٰ طبقات میں رائج معاشرتی اقدار سے اچھی طرح آشنا ہو جائیں ، وہ ایک ایسا نصاب مکمل کیا کرتے تھے جسے متخصصین کا نصاب کہنا درست ہے ۔ وہ انشا اور ترسل میں اس معیار کو ہدف نظر بناتے تھے جو انہیں شاہی دربار کے علاوہ امرائے کبار کے درباروں میں عزت کا مقام دلا سکتا تھا ۔ ان کا مقصود دیوان اور دستور بننا ہوتا تھا ۔

نثر نگاری کے جملہ اسالیب پر قدرت حاصل کرنے کے علاوہ وہ اساتذہ کے کلام پر بھی حاوی ہوتے تھے تا کہ ضرورت کے وقت شستہ مذاق شعری کا اظہار کر سکیں ۔ اس غرض کے لیے جو نصاب ضروری سمجھا جاتا تھا اس کی تفصیلات[1] 'چار چمن' اور 'خلاصۃ المکاتیب' سے حاصل ہوتی ہیں ۔ متقدمین کے دواوین اور ان کی مثنویوں کا ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جاتا تھا ۔ اسی طرح متاخرین کے کلام کو بھی غور و خوض کے ساتھ پڑھا جاتا تھا ۔ تواریخ سلف جن میں 'حبیب السیر' ، 'روضۃ الصفا' ، 'روضۃ السلاطین' ، 'تاریخ گزیدہ' اور 'تاریخ طبری' ، 'ظفر نامہ' اور 'اکبر نامہ' جیسی تصانیف شامل تھیں ، پڑھنا ضروری ہوتا تھا ۔ 'انشا' ، 'سیاق' ، 'وقائع نگاری' ، 'خوشخطی' ، 'شاعری' ، 'تاریخ' اور 'ادب' جہاں فضیلت کے نشانات تھے وہاں معاش کے لیے بھی ضروری تھے اور ان سے اخلاق اور روحانی فوائد بھی حاصل ہوتے تھے اس لئے ان کی تحصیل و تکمیل کی جاتی تھی ۔ عربی علوم کی نسبت فارسی زبان و ادب زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتے تھے ، لیکن محمد شاہ کے زمانے میں یہ علمی اور ادبی اقدار بھی پامال ہوگئیں ۔ نواب فائز دہلوی کہتے ہیں کہ ہر طرف ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں لیکن کوئی خریدار نہیں ۔ مکتب ہیں لیکن خالی پڑے ہیں ۔ ان زوال پذیر حالات کے زیر نظر دینی سطح پر شاہ ولی اللہ نے عربی کی ترویج پر زور دیتے ہوئے فرمایا :

''عربیت نسب و عربیت لسان ہر دو فخر ما ست ۔ سعید از ما کسی است کہ بہ لسان عرب و صرف و نحو و کتب ادب مناسبت پیدا کند ۔''

لیکن تاریخ اب ایک اور کروٹ لے رہی تھی ۔ شاہ ولی اللہ ۱۷۶۳ء میں فوت ہوئے ۔ انگریز نواب سراج الدولہ کو ۱۷۵۷ء میں شکست دے چکے تھے ۔ گویا پلاسی کے میدان میں پرانے تمدن اور معاشرت نے جدید حالات کے سامنے سپر ڈال دی تھی ۔ انگریزوں نے شروع شروع میں کام چلانے کے لیے مشرقی علوم کی حوصلہ افزائی کی ۔ ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی بنیاد رکھی گئی جس کا مقصد مشرقی علوم میں تحقیق و تدقیق تھا ۔ فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) ، آگرہ کالج (۱۸۲۲ء) اور دہلی کالج (۱۸۲۷ء) کھلے جن میں دیگر زبانوں کے علاوہ فارسی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی ، لیکن ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے

---

(۱) چار چمن ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، برگ ۶۲ تا ۶۵ ۔ خلاصۃ المکاتیب ، ایضاً برگ ۳ ۔

نے تعلیمی پالیسی کا رخ تبدیل کردیا اور ۱۸۴۴ء میں فارسی دفتری زبان کی حیثیت سے ختم کر دی گئی ۔ دہلی میں غالب (م - ۱۸۶۹ء) جیسا فارسی کا نغز گو شاعر موجود تھا مگر فارسی اب حاکم قوم کی زبان نہیں تھی ۔

زبان و ادب کے مسئلے

برصغیر کی زبانوں کے الفاظ کا فارسی میں استعمال ، جسے استعمالِ ہند کہا جاتا ہے ، یہاں غزنوی دور سے شروع ہو گیا تھا جس کی مثالیں مسعود سعد سلمان کے کلام میں موجود ہیں ۔ لیکن اب اس دور میں جب کہ مزید سات سو سال گزر چکے تھے اور فارسی یہاں کی علمی ، ادبی اور مجلسی زبان بن چکی تھی ، "استعمالِ ہند" نسبتاً زیادہ ہو چکا تھا ۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایرانیوں کی ادھر آمد و رفت بھی بتدریج کم ہو گئی تھی جس کی بنا پر اہل ایران کے محاورہ اور زبان میں جو تازہ تبدیلیاں ہوئیں ان سے یہاں کے فارسی دان آشنا نہ ہو سکے ۔ علاوہ بریں اسی دور میں خود ایران میں پہلے کے سے عظیم شعراء اور ادباء نظر نہیں آتے ۔ اگر وہاں کی تخلیقات حسب سابق مہتم بالشان ہوتیں تو برّصغیر کے لوگوں کا استفاضہ بھی برابر جاری رہتا ۔

استعمالِ ہند کے علاوہ طرزِ اظہار کا بھی فرق تھا ۔ عہدِ عالمگیری کے اوائل میں یہاں جلال اسیر (م - ۱۶۴۹ء) کا بڑا اثر تھا ۔ بعد میں شوکت بخاری (م - ۱۶۹۵ء) اور طاہر وحید (م - ۱۷۰۸ء) کے کلام کو رواج حاصل ہوا ۔ یہ شعراء طرز جدید کے مالک تھے جس کا آغاز فغانی شیرازی (م - ۱۵۱۹ء) نے کیا تھا اور جس میں نازک خیالی ، مضمون آفرینی اور خیال بندی کا زیادہ دخل تھا ۔ البتہ ایک بات ضرور ہے : فغانی رند مشرب تھے اور لاابالی مزاج رکھتے تھے ۔ ان کی شخصیت کا یہ وصف ذوق و شوق اور جوش کلام کی صورت میں ان کے اشعار میں موجود ہے ۔ لیکن ان کے بعض متبعین خیال بافی کے اس قدر دلدادہ ہو گئے کہ جذبہ تقریباً مفقود ہو کے رہ گیا ۔ جلال اسیر اور شوکت بخاری تو برّصغیر سے باہر کے شاعر ہیں ، مقامی شعراء میں میاں ناصر علی سرہندی (م - ۱۶۹۷ء) اس لحاظ سے ممتاز ہیں ۔ غنی کشمیری (م - ۱۶۶۹ء) ، غنیمت کنجاہی (م - ۱۶۸۸ء) اور میرزا بیدل (م - ۱۷۲۰ء) نے بھی اسی طرز کی پیروی کی ۔ عہد عالمگیری کے دوسرے درجے کے شعراء ، مثلاً محمد سعید اشرف ، میر معز فطرت موسوی ، محمد افضل سرخوش وغیرہ بھی کم و بیش اسی طرز کا اتباع کرتے نظر آتے ہیں ۔

سبکِ ہندی

فارسی زبان و ادب کا یہ مسئلہ ہمیں سبک ہندی کے موضوع تک لے آیا ہے ۔ اس موضوع کو زیادہ پھیلانے کی ضرورت نہیں ۔ اس سبک کے عنصر خیال بافی ، مضمون آفرینی ، مدعا پر بیان کو ترجیح ، وضاحت کے مقابلے میں دور کے پرپیچ اور بعیدالفہم مضامین ، مبالغہ و اغراق اور رعایت لفظی کو اولین اہمیت دینا بیان کئے جاتے ہیں ۔ ایران جدید کے مصنف علی اکبر شہابی اپنی کتاب 'روابط ادبی ہند و ایران' میں سبک ہندی کو ہندی ایجاد قرار دیتے ہیں ۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ اس کی خصوصیت اغراق اور تصنّع قرار دیتے ہیں ۔ لیکن ان کی یہ تشریح قابل قبول نہیں ۔ ظہیر فاریابی عہد سلاجقہ کے شاعر ہیں ۔ وہ اپنے ممدوح کے متعلق کہتے ہیں :

'نہ کرسیِ ، فلک نہد اندیشہ زیر پا   تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلان دہد

یہاں اغراق ہی اغراق ہے ، جذبات کا نام و نشان نہیں ، اس لئے اس لحاظ سے تنہا برِ صغیر کے فارسی گو شعراء کو مطعون کرنا مناسب نہیں ، کیونکہ مذکورہ بالا عناصر کئی اور ایرانی شعراء میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ شعرالعجم جلد سوم میں سبک ہندی کی اس منفی تنقید میں مولانا شبلی نعمانی بھی شامل ہو جاتے ہیں ، جو درست نہیں ۔

جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے ، سبک ہندی کی بیان کردہ خصوصیات ایرانی شاعری میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ خاقانی ، انوری ، کمال اسمٰعیل ، ظہیر فاریابی ، جلال اسیر ، شوکت بخاری ان تمام کے ہاں یہ چیزیں موجود ہیں ۔ بنابریں سراج الدین علی خان آرزو (م ۔ ۱۷۵۵ء) کی یہ رائے کہ خیال ہندی ہندوستان کی ایجاد نہیں ، اس کی ابتدا کرنے والے ایرانی ہی تھے ، بالکل درست ہے ۔ نیز علی اکبر شہابی ایسے تنقید نگاروں کی رائے خالی از تعصب بھی نہیں ۔ شہابی سبک ہندی کے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں[1] :

> "بہترین نامی کہ بدین طرز بیان میتوان داد ، خیال ہندی است ۔ عرفی و نظیری از خیال ہندی امتیاز یافتہ ۔"

اگر ناصر علی سرہندی پر اکتفا کیا جاتا تو بحث صرف علمی سطح پر رہتی ۔ جب عرفی اور نظیری کو بھی شامل کر لیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب و شعر کے جملہ محاسن سے انکار کیا جا رہا ہے ۔

---

(۱) علی اکبر شہابی ، روابط ادبی ایران و ہند ، ص ۹۰ ۔

ایران جدید کے نامور تنقید نگار ملک الشعراء بہار اور آقائے سعید نفیسی سبک ہندی کی مثبت حیثیت کے معترف ہیں ۔ وہ اسے اسلوبِ شعر گوئی کی تکمیل یافتہ[1] صورت قرار دیتے ہیں ۔ برصغیر میں یہ اسلوب امیر خسرو کے زمانے سے چلا آتا ہے ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مثالیہ کا استعمال کلیم اور صائب نے کیا جو عہد شاہجہانی کے شاعر ہیں ۔ لیکن امیر خسرو کا قصیدہ 'دریائے ابرار' تمام کا تمام اسی صنعت کا حامل ہے ۔ میرزا بیدل کا قصیدہ سواد اعظم بھی اسی صنعت میں ہے اور امیر خسرو کے قصیدے کا جواب ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ اسالیبِ بیان ارتقاء پذیر تھے جو بقول ملک الشعراء بہار اور آقائے سعید نفیسی بتدریج سبک ہندی کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچے ۔ مغلیہ دور میں اس طرز کو تازہ گوئی بھی کہا جاتا تھا اور اس کا ایک عنصر نہایت ہی لطیف احساس حسن تھا جو غنی کشمیری ، ناصر علی سرہندی ، غنیمت کنجاہی اور بیدل کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے ۔ یہ احساس حسنِ فکر اور اسلوب دونوں میں نمودار ہوا ۔ اس کی پیداوار حسین تراکیب کا وافر ذخیرہ بھی ہے ۔ پھر مثالیہ کے ذریعے جس مؤثر طریقے سے حقائق و معارف بیان ہوئے ، وہ قابل داد ہے ۔ علاوہ بریں اعلیٰ درجے کی شاعری میں اگر افکار عالیہ کی بہتات ہوتی ہے تو امیر خسرو ، فیضی ، عرفی ، نظیری ، بیدل اور غالب نے ایسے افکار اس وفور سے پیش کئے کہ ان کی نظیر کم ملے گی ۔ عہد عالمگیری سبک ہندی کی تکمیل کا زمانہ ہے ، بعد میں ایہام گوئی شروع ہوگئی جس کا آغاز میرزا عبدالغنی بیگ قبول (م - ۱۷۲۶ء) سے ہوا ۔ اس لفظی بازیگری کا خاتمہ میرزا غالب نے کیا ۔

زیر بحث دور میں مشاعروں کا بڑا رواج ہوا جن کی ابتدا فغانی شیرازی[2] کے زمانے سے ہوئی تھی ۔ ان سے پہلے شعراء بطور خود اساتذہ کی غزلوں پر غزل کہتے تھے لیکن ان کے زمانے میں طرح دے دیا جاتا تھا اور کسی صاحب ذوق امیر کے مکان پر شعراء اپنی غزلیں باری باری پڑھتے تھے ۔ اس طرح اصلاح و تنقید کا دروازہ کھل گیا اور شاعری نے ترقی کی ۔ برصغیر میں بھی مشاعروں کے ذریعے مسابقت اور حریف پیشگی کا معیار بلند ہوا ۔ میرزا بیدل کے مزار پر سال بسال مشاعرہ منعقد ہوتا تھا ۔ دہلی کے امراء کے ہاں بھی تقریب پیدا ہو جاتی تھی ۔ اسی طرح لاہور کی مسجد وزیر خاں کے مشاعرے مشہور ہیں ۔ لیکن یہ تقریبات ہنگامہ آرائی کی نذر ہو جاتی تھیں ۔ اس ضمن میں میرزا عبدالغنی بیگ کے

---

(۱) شاہکار ہائے نثر فارسی معاصر ، صفحات ۵۵ ، ۷۲ ، ۷۳ ۔

(۲) شبلی نعمانی ، شعر العجم ، حصہ سوم ، ص ۱۵ ۔

لڑنکے میرزا گرامی (م - ۱۷۴۳ء) کا نام لیا جا سکتا ہے، جن کے بیسیوں شاگرد مشاعروں میں شامل ہوکر ہلڑ بازی کیا کرتے تھے - ہاں متین اور باکمال اساتذہ کی وجہ سے شاگردوں کی یہ گروہ بندی زبان و ادب کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی - یہ در اصل تخلیقی قوتوں کا مجلسی اظہار تھا - میرزا بیدل ، خان آرزو ، شاہ آفرین لاہوری اور میرزا غالب دہلوی کے تلامذہ نے جو استفاضہ کیا وہ اس دور کی ادبی تاریخ کا ذہن افروز باب ہے -

اس دور کے فارسی ادب کے دیگر خصائص

اس دور میں اعلیٰ درجے کے فارسی گو شاعر کم نظر آتے ہیں - میرزا بیدل (م - ۱۷۲۰ء) نے اپنی عمر کا ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ عہد عالمگیری میں گذارا اس لئے انہیں اس دور میں شمار نہیں کیا جا سکتا - شیخ محمد علی حزین (م - ۱۷۶۶ء) بے شک بلند پایہ شاعر ہیں مگر پختہ عمر کے تھے کہ ایران سے برصغیر میں وارد ہوئے اور اگرچہ بتیس (۳۲) سال یہاں گزارے مگر اس ماحول کو اپنا نہ سکے - اس دور کے بلند پایہ شاعر صحیح معنوں میں میرزا غالب (م - ۱۸۶۹ء) ہیں ، جو اسی سرزمین سے اٹھے ، اپنے معاشرے کے تمام پہلودار افکار کو اپنے مزاجِ شعری میں سموبا اور اپنی غزلیات اور مثنویات میں اسرار کائنات بڑی خوبی اور دلپذیر آہنگ سے بیان کئے -

اس دور کا اعلیٰ درجے کا شعری سرمایہ اتنا زیادہ نہ سہی مگر نثری سرمایہ ہر لحاظ سے عظیم ہے - مختلف علوم و فنون میں کتابیں لکھی گئیں جن میں سے بعض سارے فارسی ادب میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں - محمد ساقی مستعد خان جس نے 'مآثر عالمگیری' لکھی ، ۱۷۲۳ء میں فوت ہوا - خوافی خان نے 'منتخب اللباب' بھی اسی دور میں تصنیف کی - تاریخ کی ان اہم کتابوں کے علاوہ 'فرحت الناظرین' (۱ - ۱۷۷۰ء) جیسی مفید کتاب بھی لکھی گئی جو ایک عمومی تاریخ ہے - میر علی شیر قانع تتوی نے 'تحفة الکرام' تین جلدوں میں مکمل کی جو سندھ کی عمومی تاریخ ہے - اس فن کی بیسیوں اور کتابیں اس دور میں تالیف ہوئیں - ان تمام میں مورخین کا نقطۂ نگاہ مغلوں کے دورِ عروج والا نہیں - ان میں اہل قلم نے بادشاہوں کی نسبت عوام کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے - صوبائی تاریخوں کے علاوہ سفر نامے بھی لکھے گئے - جغرافیہ نویسی کی طرف بھی توجہ ہوئی - تذکرہ نگاری کے فن کو بڑا عروج حاصل ہوا - شعراء ، اولیاء ، امراء اور ادباء کے تذکرے بڑی تعداد میں تصنیف ہوئے - شعرا کے تذکروں کی طرف التفات کی ایک وجہ یہ بھی ہے

نثر کہ اس زمانے میں یہ احساس عام ہو گیا تھا کہ فصحائے ایران برصغیر کے فارسی گو شاعروں کو تسلیم نہیں کرتے ، اس لئے ان کے نام اور کام کو محفوظ کرنے کے لئے تذکرے ضروری ہیں ۔ 'سرو آزاد' ، 'خزانۂ عامرہ' ، 'مجمع النفائس' ، 'تذکرۂ حسینی' ، 'نشتر عشق' ، 'عقد ثریا' وغیرہ تذکرے[1] ہر لحاظ سے بڑے اہم ہیں ۔ اسی طرح 'سیاق' ، 'انشاء' ، 'بیان و بلاغت' ، 'لغت نگاری' ، 'داستان نگاری' ، 'موسیقی' ، 'خطاطی' ، 'تعمیر' وغیرہ فنون پر بھی عمدہ کتابیں تصنیف ہوئیں ۔ اسی عہد میں 'سراج اللغات' ، 'بہار عجم' ، 'جامع اللغات' ، 'غیاث اللغات' وغیرہ لغت کی کتابیں بھی مرتب ہوئیں جن پر اہل ہند کو بجا طور پر ناز ہے ۔

اس دور کے فارسی ادب کا ایک اور پہلو خاص توجہ کا مستحق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی فارسی تصانیف کی کثرت ہے ۔ یہ تصانیف نظم اور نثر دونوں میں ہیں اور ہر فن سے تعلق رکھتی ہیں ۔ زبان کے معیار سے کمتر ہونے کے باوجود ان کی تاریخی ، سوانحی یا فنی حیثیت مسلّم ہے ۔ لیکن زبان کے اعتبار سے بھی بعض کا معیار بلند ہے ، اس سلسلہ میں آنند رام مخلص کی 'مرآۃ الاصطلاح' ، 'چمنستان' ، 'بدائع وقائع' پیش کی جا سکتی ہیں ۔ مخلص کی شاعری بھی تعریف کے قابل ہے ۔ لغت کی مشہور کتاب 'بہار عجم' کا مصنف ٹیک چند بہار (م - ۱۷۸۲ء) ہے ۔ سیالکوٹی مل وارستہ کی ''مصطلحات الشعراء' بھی بڑی قابل قدر تصنیف ہے ۔ 'تذکرۂ سفینۂ خوشگو' مصنفہ بندرا بن داس خوشگو (و - ۱۷۵۶ء) کا پایہ بھی بڑا بلند ہے ۔ ہندوؤں میں بعض نامور منشی گزرے ہیں ۔ مثلاً 'انشائے مادھو رام' درسی کتابوں میں شامل رہی ہے ۔ علوم فارسیہ کی شاخ سیاق ، جس کا تعلق مالی امور سے تھا ، ہندوؤں میں بڑی مقبول تھی ۔ اس کے متعلق انہوں نے کتابیں بھی تالیف کیں ۔

علاوہ بریں لاہور ، ملتان اور سندھ میں فارسی کا رواج غزنوی عہد سے تھا ۔ بنگال اور دکن کی طرف بعد کے ادوار میں ہو گیا ۔ لیکن اس دور میں جب ادھر اُدھر صوبوں میں خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں تو نئے درباروں نے بھی فارسی کے اقتدار کو قائم رکھا ۔ اگرچہ اردو زبان کی طرف توجہ زیادہ تھی ، لیکن فیض آباد اور لکھنو میں فارسی کی قدر و قیمت میں فرق نہ پڑا ۔ میرزا قتیل نے لکھنو ہی میں اپنی اُستادی کا سکہ جمایا بلکہ ترکی

---

(۱) یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس دور میں شعرائے اردو کے تذکرے بھی فارسی زبان میں تصنیف ہوئے ۔

فرہنگوں کو رواج دینے میں بھی دلچسپی لی ۔ فرخ آباد کی افغان ریاست میں فارسی نظم و نثر کو جو فروغ حاصل ہوا اس کا سرسری جائزہ لینے کے لئے عہد بنگش کی سیاسی ، علمی اور ثقافتی تاریخ مؤلفہ ولی اللہ فرخ آبادی کا مطالعہ کافی ہے ۔ نوابان مرشد آباد بھی شعراء کے قدر دان تھے ۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں مرزا ظہور علی خلیق وہاں گئے اور ان کی بڑی قدر ہوئی ۔ نظام الملک آصف جاہ والیٔ دکن خود فارسی کے شاعر تھے ۔ اس کے جانشین شعرائے فارسی کی برابر سرپرستی کرتے رہے ۔ اس ضمن میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ علاوہ بریں کشمیر اور سندھ شروع ہی سے فارسی زبان کے مرکز رہے تھے ۔ اس دور میں بھی قند فارسی کی حلاوت وہاں شعراء ، ادباء اور فضلاء کے کام و ذہن کو لذت بخشتی رہی ۔

ان صوبائی مراکز کے علاوہ اور مقامات بھی تھے جہاں فارسی کا رواج تھا ۔ مرہٹواڑے میں بھی اس کا استعمال ہوتا رہا ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دور سلطنت خداداد میسور (۱۷۶۱ء - ۱۷۹۹ء) میں فارسی زبان کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان دونوں اچھی طرح فارسی جانتے تھے ۔ ٹیپو سلطان تو فارسی میں شعر بھی کہہ لیتا تھا ۔ 'تحفۃ المجاہدین' ، 'وقائع منازل' اور 'احکام نامہ' میں اس کے اشعار ملتے ہیں ۔ اس کے فرامین اور مکتوبات اور لکھوائے ہوئے کتبے فارسی میں ہیں ۔ قصائد فارسی اس کی تعریف میں لکھے گئے ۔ ایک مدحیہ شعر ہے :

خدیو جہانگیر کشور کشا   کہ تیغش ظفر را بود متّکا

سلطان مؤرخ میر حسین کرمانی نے سلطان کی وفات کے بعد تاریخ میسور 'نشان حیدری' کے نام سے فارسی میں تصنیف کی ۔ اسی طرح[1] ملا فیروز کی مثنوی 'جارج نامہ' فارسی میں ہے ۔ جس میں حیدر علی کی جنگوں کا ذکر ہے ۔ میسور کی تعریف میں ملا فیروز کا یہ شعر کیسا فصیح ہے :

ہمایوں کشورے فرخ زمینے   طرب را مرزبومے ، دل نشینے

ادھر کلکتے میں انگریزوں نے اپنا صدر مقام قائم کیا ۔ انہوں نے بھی فورٹ ولیم کالج اور مدرسۂ عالیہ میں فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا ۔ اس طرح وہاں اچھے پائے کے

(۱) ان تمام مطالب کے لئے دیکھئے ، محمود بنگلوری ، تاریخ سلطنت خداداد ۔

فارسی دانوں کا اجتماع ہوگیا ۔ مشاعرے شروع ہوئے جن میں ۱۸۲۸ء میں میرزا غالب نے بھی شرکت کی ۔ اسی طرح پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو تمام سرکاری کاروبار فارسی زبان میں ہوتا تھا اور فقیر عزیز الدین ایسے فارسی کے فاضل مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر تھے ۔

اس دور کے لسانی مسئلے

استعمالِ ہند کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے ۔ ہندوستانی زبان کے مفرد الفاظ ، ہندوستانی ترکیبیں اور جملے نیز ہندوستانی محاورات بصورت ترجمہ یہاں کی مروجہ فارسی میں شامل ہو گئے تھے ۔ بعض فارسی الفاظ کا خاص مفہوم بھی بدل گیا تھا ۔ سبک ہندی میں خیال آفرینی کا جو رواج تھا وہ بھی اہل ایران کو کھٹکتا تھا ۔ یہ حالات تھے کہ ۱۷۴۳ء میں شیخ محمد علی حزین وارد ہوئے ، انہیں اپنی شاعری اور زبان دانی پر ناز تھا ۔ وہ یہاں کے فارسی دانوں کے تلفظ اور لب و لہجہ کی وجہ سے چونک اٹھے ۔ یہاں تو تورانی اثرات کا غلبہ تھا ۔ یہاں کے تقریباً تمام ادیب اور شاعر ناصر علی سرہندی اور بیدل کے مداح تھے ، مگر شیخ صاحب کے نزدیک ان کی نظم و نثر سرمایہ تضحیک تھی ۔ شعرائے فارسی انہیں اپنا کلام سناتے وہ تو انہیں ''پوچ گو'' کہہ کر نوازتے ۔

اس طرح شیخ صاحب کی آمد سے یہاں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا ۔ ایرانی عنصر ان کی حمایت کرتا تھا اور تورانی لوگ ناراض تھے ۔ امیر خسرو سے لے کر میرزا بیدل تک بڑے بڑے شعراء نے یہاں روایات قائم کی تھیں ، جن کا احترام یہاں کے فارسی دان حضرات کے دلوں میں پایا جاتا تھا ۔ یہ روایات یہاں کے مخصوص تمدن اور تاریخی حالات کی پیداوار تھیں ۔ اہل ایران ان کی معنویت کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے ۔ ان کا اصرار تھا کہ فقط ایرانی شاعروں اور ادیبوں کا استعمال ہی سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اب جب دونوں طرف جذبات کی یہ کیفیت تھی ، شیخ محمد علی حزین نے اپنا دیوان مرتب کیا ، جس پر خان آرزو نے اعتراضات کئے ۔ ان کا جواب شیخ صاحب موصوف نے دیا ۔ اس طرح جواب در جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ دونوں طرف سے اور لوگ بھی اس بحث میں شامل ہو گئے اور علمی ادبی اہمیت کی تحریرات کا ایک وسیع ذخیرہ[1] جمع ہو گیا ۔

---

(۱) پس منظر کے طور پر یہاں لسانی اہمیت مذکور ہوئی ہے ۔ واقعات کی تفصیل اگلے باب میں دیکھیے ۔

اس سارے ہنگامے کا جائزہ لیا جائے تو شیخ محمد علی حزین کی حیثیت ایک مدعی کی نظر آتی ہے جس کا دعویٰ تھا کہ اہل ہند نے فارسی زبان کو بگاڑ دیا ہے ۔ اہل ہند کی طرف سے مدعا علیہ کے طور پر شیخ سراج الدین علی خان آگے بڑھے ۔ ان کے جواب کا ماحصل یہ تھا کہ اہل ہند نے تو الٹا فارسی زبان کو سنوارنے میں مدد دی ہے اور اس کی ثروت میں ہر لحاظ سے اضافہ کیا ہے ۔ چونکہ ہم تاریخ ادبیات پاکستان و ہند مرتب کر رہے ہیں اور ہمارا مؤقف یہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت دنیائے اسلام کے لئے بڑی گراں قدر معنویت رکھتی ہے ، لہٰذا ہم اس بات کو نسبتاً تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔

دور شاہ جہانی تھا جب ۱۶۳۱ء/۱۰۴۱ھ میں حاجی محمد جان قدسی برصغیر میں وارد ہوئے ۔ ان کے ایک قصیدے[1] پر ملا شیدا نے اعتراضات کئے ۔ ہندی ہونے کے سبب اسالیب ہندی سے انہیں لگاؤ تھا ۔ ایرانی ادیب ان کے اعتراضات سن کر سخت برہم ہوئے ۔ جلالائے طباطبائی نے انہیں خط لکھا[2] اور غصے کے عالم میں انہیں بے سروپا ، مایۂ سودا ، مہادیو ، گوسالہ پرست ، مدعی بے خرد وغیرہ کہا اور ساتھ ہی لکھا :

> ''اے عزیز! این نہ دوہرہ و دھرپت است کہ در مصارف آن فصل بیجا و بے جا توانی کرد و این نہ لغت سنسکرت و زبان گوالیار[3] است کہ باوجود عدم پنڈت دران نیز تصرف توانی نمود ۔ این لہجۂ دری از زبان پارسی است از افواہ پارسی زبانان باید آموخت و چراغ سخندانی از مشکٰوۃ اندیشۂ اینان باید افروخت ۔ از مطالعۂ فرہنگ ہا تنہا فارسی دان نتوان شد و از تبع دواوین قدما از پیش قدمان این وادی نتوان گشت ۔''

غور فرمائیے شاہ جہانی عہد میں طباطبائی بھی شیخ محمد علی حزین کی طرح فارسی زبانان ہند پر برس رہے ہیں ، ان کے تصرفات کو بے جا خیال کرتے ہیں اور اکتسابی طور پر ان کے فارسی سیکھنے پر معترض ہیں ۔ کہتے ہیں : فارسی ان سے سیکھو جن کی مادری زبان ہو ،

---

(۱) آزاد بلگرامی ، سرو آزاد ، ص ۸۲ ۔

(۲) دربار ملی ، صفحات ۲۸۲ ، ۲۸۵ ۔

(۳) یہ بات قابل غور ہے کہ شیدا اور خان آرزو دونوں کا تعلق اکبر آباد اور گوالیار سے ہے ۔

اس سلسلے میں عرفی کو بھی مورد طعن بناتے ہیں :

''مولانا عرفی شیرازی می گفتہ کہ ملا ! پارسی از انوری و خاقانی آموختہ ایم و شما از بہرہ زالان مسکین ، و ندانستہ کہ انوری و خاقانی نیز ازینان سخن آموزی کردہ اند ۔''

یہ خط ہندی ایرانی نزاع کے سلسلے میں ایرانی نقطۂ نگاہ کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے اور کلاسیکی حیثیت کا مالک ہے ۔

طباطبائی نے مولانا عرفی کا جو کلمہ نقل کیا ہے اس میں خان آرزو کے جواب کا ایک حصہ مضمر ہے ۔ عرفی خود ایرانی تھے ۔ ماں کی گود میں روزمرہ فارسی سیکھنے کی قدر و قیمت سے اچھی طرح آشنا تھے ۔ اس کے باوجود کہتے ہیں کہ شاعری کی شستہ اور رُفتہ زبان اور فن شعر گوئی اساتذۂ قدیم کے دواوین کے مطالعے کے بغیر سیکھنا محال ہے ۔ خان آرزو بھی یہی کہتے ہیں کہ بر صغیر کے فارسی جاننے والوں نے صدہا سال سے انوری اور خاقانی جیسے اساتذہ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے ۔ صرف تحقیق و تدقیق پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شعر گوئی اور نثر نویسی کے فنون سیکھے ہیں ، نظم و نثر لکھنے پر قدرت حاصل کی ہے ، اعلیٰ درجے کی تصنیفات فارسی زبان میں پیش کرتے رہے ہیں ، مکاتبت و مراسلت کے لئے اسے استعمال کیا ہے ، گفتگو اسی میں کی ہے ، علمی زبان یہی رہی ہے ، سرکاری اور مجلسی تمام کام اسی کے ذریعے انجام دیے ہیں ۔ اس لئے اب یہ اہل ہند کی اپنی زبان ہے اور اس پر ان کا اتنا ہی حق ہے جتنا اہل ایران کا ۔ 'مثمر' میں لکھتے ہیں[1] کہ بر صغیر کے علماء اور فضلاء بھی ایرانیوں کی طرح فارسی زبان کے استاد ہیں کیونکہ :

''این بہ سبب توغّل و کثرت ورزش و تصحیح و تفصیح زبان فارسی داخل زمرۂ فارسیان شدہ اند ۔''

'مثمر' فارسی زبان کے قواعد پر بلند پایہ کتاب ہے ۔ خان آرزو نے اس کے علاوہ 'چراغ ہدایت' ، 'سراج اللغات' اور 'نوادر الالفاظ' میں بھی ہند کے فارسی گو اصحاب کی حمایت علمی استدلال کے ساتھ کی ۔ لغات کے علاوہ اپنی شروح اور تذکروں میں بھی وہ

---

(۱) خان آرزو ، مثمر ، قلمی ، مقبوضہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، برگ ۱ع ۔

یہی کہتے رہے کہ ہند کے بلند پایہ فارسی لکھنے والے ایرانی فارسی نگاروں سے کسی طرح کم نہیں ۔

اہلِ ایران کو اہلِ ہند کے فارسی میں تصرفات پر اعتراض تھا ۔ خان آرزو نے اس کا یہ جواب دیا کہ تصرفات کا جواز خود اہل ایران کے ہاں بھی موجود ہے ۔ تفریس کے ذریعے عربی کے کتنے الفاظ پر تصرف کا یہ عمل ہوا ہے ۔ ہاں بھونڈے تصرفات ذوق سلیم کبھی برداشت نہیں کر سکتا ۔ طباطبائی کے خط میں طنز کے طور پر مہادیو ، گوسالہ پرست ، دوہرہ ، دھرپت اور سنسکرت کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ شیخ محمد علی حزین کی آمد سے ایک صدی پہلے بھی ہندوستانی فارسی میں ہندی الفاظ اور محاورہ کی آمیزش پر اہل ایران چیں بہ چیں ہوئے تھے ۔ خان آرزو نے اس اعتراض کا جو جواب دیا اس پر برصغیر کے فارسی دان بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں ۔ خان موصوف نے کہا کہ سنسکرت اور فارسی ہم اصل زبانیں ہیں ۔ ان میں ظاہری اور معنوی وحدت کے آثار موجود ہیں ۔ انہوں نے اس نزاع کے سبب توافق کے اصول کو دریافت کر لیا ۔ اس اصول کی حقیقت وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں[1] :

''آن اشتراک یک لفظ است در دو زبان یا زیادہ ، مثلاً فارسی و عربی ، فارسی و ہندی ، عربی و ہندی وغیرہ ۔''

دیکھیے لغت کا تنقیدی مطالعہ ہمارے ہاں اٹھارھویں صدی عیسوی میں شروع ہو گیا تھا ، حالانکہ ایران میں اس کا آغاز ابھی تک نہیں ہوا تھا ۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اپنے مجموعۂ مقالات 'مباحث' میں لکھتے ہیں[2] کہ خان آرزو کی یہ تحقیق فارسی کی لسانیاتی جستجو کا ایک شاندار باب ہے ۔ خود خان آرزو کو تقابلی فقہ اللغہ کی اس دریافت پر ناز تھا ۔ کہتے ہیں[3] :

''حق آنست کہ تا الیوم ہیچ کس بہ دریافت توافق زبان ہندی و فارسی با آنہمہ کثرت اہل لغت چہ فارسی و چہ ہندی و دیگر محققان این فن مہتدی نہ شدہ اند الا فقیر آرزو ۔''

---

(۱) خان آرزو ، مثمر ، قلمی ، مقبوضہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، برگ ۷۳ ۔
(۲) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ، مباحث ، ص ۸۴ ۔
(۳) خان آرزو ، مثمر ، قلمی ، برگ ۹۳ ۔

نوافق لسانین اور ہندی (سنسکرت) و فارسی کی ابتدائی وحدت کے زیر نظر خان آرزو تصرف ہند کو مخل فصاحت نہیں سمجھتے تھے ۔ خان آرزو توافق کی مختلف اقسام کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ لیکن وہ خالص لسانی بحث ہے ، اس کا تعلق ہس منظر سے کوئی نہیں ۔ ہمیں اس بات سے غرض ہے کہ اسی انکشاف نے لسانی تحقیق کا دروازہ کھول دیا ۔ فن لغت نگاری میں ترقی ہوئی اور علم اسرار اللسان اور فقہ اللغہ کو فروغ حاصل ہؤا ۔

بعد میں میرزا قتیل (م - ۱۸۲۴ء) نے 'نہرالفصاحت' وغیرہ میں بجا طور پر ایرانی اور تورانی محاورے کا ذکر چھیڑا اور رائے دی کہ :

''برائے مقلد شعر فارسی ایران و توران ہر دو سند است ۔''

لیکن چونکہ ہندوستان میں تورانی لہجہ اور محاورہ زیادہ رائج تھا ، میرزا قتیل نے اسے جاری رکھنے کی ہدایت کی :

''پس بر روزمرہ نویس واجب است کہ روانی در عبارت پیدا کند و بعد تحصیل روزمرہ ایران و اہل زبان یا دانندۂ زبان بہ کسب روزمرہ کہ رواج یافتۂ ہند است در مکاتبب جاری دارد ۔''

میرزا قتیل کی اسی قسم کی تحریرات کا اثر تھا کہ جب ۱۸۲۸ء میں میرزا غالب کلکتے میں تھے تو ان کے کلام پر لسانی اعتبار سے اعتراضات ہوئے ۔ میرزا غالب ایرانی محاورے کے موید تھے ۔ ۱۸۶۲ء میں جب میرزا غالب نے 'قاطع برہان' کے نام سے 'برہان قاطع' پر اپنے اعتراضات طبع کرائے تو ان کی بڑی مخالفت ہوئی ۔ اس موقع پر بھی ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا ۔ 'قاطع برہان' کے جواب میں لوگوں نے کئی کتابیں لکھ ڈالیں ۔ 'محرق قاطع' ، 'قاطع قاطع' ، 'مؤید برہان' ، 'ساطع برہان' وغیرہ رسالے اور کتابیں اسی قبیل کی ہیں ۔ 'مؤید برہان' کے مقابلے میں میرزا نے ایک رسالہ 'تیغ تیز' بھی لکھا ۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی رائے ہے کہ اس سارے نزاع میں میرزا غالب کا وجدان درست رہا لیکن اس کی تائید میں ان کا استدلال غلط تھا ۔ مگر قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خان عرشی کہتے ہیں کہ بیشتر اعتراضات بھی میرزا کی عدم واقفیت اور کم علمی پر مبنی ہیں ۔ بہرحال خان آرزو سے لےکر میرزا غالب تک ایرانی ہندی نزاع کے باعث علم لغت کے متعلق بڑا قیمتی لٹریچر جمع ہو گیا ۔

میرزا غالب کے دعاوی کے باوجود اہل نظر جانتے ہیں کہ وہ دراصل سبک ہندی کے پیروکار ہیں جس ہر انداز بیان کی نسبت فکر کا غلبہ ہے ۔ ساتھ ہی جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے ، انہوں نے بےشک شیخ محمد علی حزین کی پیروی کی لیکن ظہوری ، نظیری ، عرفی ، صائب اور بیدل کے اسالیب کی چھاپ بھی ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے ۔ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلوب و افکار کے اعتبار سے اگر غالب ہند کے ان اساتذۂ شعر کے متبع نہ ہوتے تو وہ غالب نہ ہوتے ۔ غالب کے ہاں فکر اور بیان کے اسی حسین امتزاج نے اقبال کا کام آسان بنا دیا اور بیسویں صدی عیسوی میں ''شاعر مشرق'' اس قابل ہوگیا کہ مشرق و مغرب کے حکماء اور اکابر کے افکار کو دلنشین مگر جاندار اور مؤثر اسلوب میں بیان کر سکے ۔

دوسرا باب

(الف) شعرائے فارسی (ماسوائے غالب)

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے جو دور شروع ہؤا اور جنگ آزادی کے بعد (۱۸۵۷ء) بہادر شاہ ظفر کی معزولی پر ختم ہؤا وہ اگرچہ سیاسی لحاظ سے بتدریج عدم استحکام کا منظر پیش کرتا ہے لیکن فارسی شاعری، کے اعتبار سے بڑا بارآور ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی آمد (۱۰۰۰ء) کے زمانے سے فارسی شعر و ادب نے اس برِصغیر میں جو اثرات پھیلانے شروع کئے تھے ان کے ثمرات اس ڈیڑھ صدی میں بڑی کثرت سے سامنے آتے ہیں۔ امیر خسرو، عرفی، نظیری اور دیگر اساتذۂ پاک و ہند نے جو شعری روایات پیدا کی تھیں وہ یہاں کے ارباب شعر و ادب کے مزاج میں رس بس گئی تھیں۔ ان میں اساتذۂ قدیم مثلاً رومی، سعدی اور حافظ کی روایات بھی شامل تھیں۔ برِصغیر کے طول و عرض میں مختلف درسگاہیں تھیں جن میں ان اساتذہ کا کلام پڑھایا جاتا تھا۔ فارسی بدستور حکمرانوں کی زبان تھی۔ تمام دفتری کارروائی اسی میں ہوتی تھی۔ انگریز بھی آئے تو فارسی کا عام رواج دیکھ کر بڑی مدت تک اسی کو دفتری زبان کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اس لئے اس ڈیڑھ صدی میں فارسی زبان کا عام چرچا رہا۔ برِصغیر کے گوشے گوشے میں فارسی گو صاحب دیوان شعراء موجود تھے۔ اس دور کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اگر بیدل (م- ۱۷۲۰ء) ایسا نابغۂ روزگار اس کے آغاز میں زندہ تھا تو اس کے اختتام پر غالب (م- ۱۸۶۹ء) ایسا نادرۂ زمان شاعر موجود تھا جو اپنے دیوان فارسی کے متعلق دعویٰ کرتا ہے:

گر ذوق سخن بدہر آئین بودے　　　　دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر این فن سخن دین بودے　　　　آن دین را ایزدی کتاب این بودے

یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ جہاں تک اصنافِ سخن کا تعلق ہے اورنگ زیب عالمگیر کے برسراقتدار آنے کے بعد قصیدہ گوئی کے لئے کوئی میدان نہیں رہ گیا تھا۔ اورنگ زیب کا تقشف ہر طرف سرایت کر چکا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی (م- ۱۶۲۴ء)

اور آپ کے خلفاء نے بالخصوص اور چشتی اور قادری سلسلوں کے بزرگوں نے بالعموم اس دور میں ہر طرف فقر اور درویشی سے لگاؤ پیدا کر دیا تھا ۔ روحانیت کی طرف رجحان اس دور کا امتیازی وصف ہے ۔ آفرین لاہوری (م ۔ ۱۷۴۱ء) کے متعلق عبدالحکیم حاکم[1] کا بیان ہے کہ قناعت اور توکل کی بنا پر ''در گوشۂ انزوا فاقہ ہا می کشید و از خانہ بیرون نمی آمد ۔'' قصیدہ گوئی کی طرف کوئی خاص توجہ نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے ۔ حزین (م ۔ ۱۷۶۶ء) اور بعد میں غالب نے قصائد لکھے ، لیکن نہ تو ماضی کی طرح عظیم الشان ممدوح باقی رہ گئے تھے اور نہ مدح گوئی زر و مال حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتی تھی ۔ اس لئے شعراء دیگر اصنافِ سخن کی طرف زیادہ متوجہ رہے ۔ بیدل نے بجا طور پر کہا تھا :

بیدل گہر نظم کسی راست کہ امروز　　　در بحرِ غزل زورقِ اندیشہ دواند

غزل کو اس دور میں بڑا فروغ حاصل ہؤا ۔ مثنوی اور رباعی کا بھی وافر سرمایہ ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ مقطّعات ، مخمّسات ، تاریخ گوئی وغیرہ کا بھی رواج رہا ۔

لیکن اس دور کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ہمیں سرسری طور پر عہد عالمگیری کے ان شعراء کا ذکر کر دینا چاہئے جو اس عہد کے آغاز میں فوت ہوئے یا اس عہد میں بھی فن کی خدمت کرتے نظر آتے ہیں ۔

عہدِ عالمگیری کے چند شعراء

اسلوبِ شعر گوئی کے لحاظ سے عہدِ عالمگیری تازہ گوئی کا دور ہے ۔ شعراء کو معانیٔ تازہ کی تلاش رہتی تھی اور وہ ان مضامین کو زیادہ تر معنوی صنعتوں مثلاً حسنِ تعلیل اور تمثیلی اسلوب کے ذریعے بیان کیا کرتے تھے ۔ یہ تلاش معانی خیال آفرینی کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھی ۔ میرزا جلال اسیر (م ۔ ۱۶۴۰ء) نے اس لحاظ سے دورِ شاہجہانی میں بڑا نام پایا تھا ۔ ان کا اتباع ہوتا رہا ۔ مثلاً محمد ہاشم تسلیم[2] جو شیرازی الاصل ہیں ، ان کے متبع تھے ۔ وہ عہدِ عالمگیری میں اس طرف آئے مگر تاریخ وفات معلوم نہیں ۔ نازک خیالی ، معانیٔ تازہ اور فکر لطیف کی بنا پر معزالدین موسوی[3] خان فطرت (م ۔ ۱۶۹۰ء)

---

(۱) تذکرۂ مردم دیدہ ، ص ۲۰ ۔

(۲) عربی و فارسی مخطوطوں کی فہرست بانکی پور ، جلد سوم ، ص ۲ - ۱۷۱ ۔

(۳) تذکرۂ نتائج الافکار ، ص ۵۸ - ۱۶۵۲ ۔

بھی اپنے عہد کے اسلوب شعری کی نمائندگی کرتے ہیں ، رضوی سادات میں سے تھے ، علوم عقلیہ اور نقلیہ میں کمال حاصل تھا ۔ ان کے فضائل و کمالات اور بلند نسبی کی بنا پر شہنشاہ عالمگیر نے ان کی شادی شاہ نواز صفوی کی لڑکی سے کرا دی تھی ۔ اسی طرح میر محمد زمان[1] راسخ (م ۔ ۱۶۹۵ء) بھی والا نژاد سید تھے ۔ شہزادہ محمد اعظم کی سرکار میں ہفت صدی منصب پر ملازم تھے ۔ تازہ گو شاعر تھے اور فکر رسا رکھتے تھے ۔ معانیٔ تازہ فصاحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے ۔ ان کی ایک مثنوی حیدرآباد دکن کے مطبع اختر میں چھپی تھی ۔ ڈاکٹر ریو لکھتے ہیں کہ غنیمت کنجاہی اور ارادت خان واضح ان کے شاگرد تھے ۔

عاقل خان رازی اور ناصر علی سرہندی (ہر دو ، م ۔ ۱۶۹۶ء) اواخر عہدِ عالمگیری کے شاعر ہیں ۔ ان کا ذکر سابقہ جلد میں ہو چکا ہے ۔ اسی طرح نعمت خان عالی (م ۔ ۱۷۱۵ء) اور میرزا بیدل (م ۔ ۱۷۲۰ء) کا ذکر بھی سابقہ جلد میں کیا جا چکا ہے ۔ یہاں ان کی بابت از سر نو کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا ۔ البتہ میرزا بیدل کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان کی قوتِ تخلیق زندگی کے آخری لمحات تک پوری طرح بروئے کار رہی اور چونکہ بالخصوص عہد جہاندار شاہ (۱۲-۱۷۱۳ء) میں معاشرے کی اخلاق حالت اچھی نہ رہی تھی انہوں نے دو نہایت ہی پرزور شہر آشوب مخمست لکھیں جن میں اہلِ زمانہ کا شد و مد کے ساتھ شکوہ کیا ۔ عہدِ عالمگیری کے دو اور[2] شاعر محمد سعید اعجاز (م ۔ ۱۷۰۵ء) اور امتیاز خان خالص (م ۔ ۱۷۱۰ء) بھی شعر کہتے نظر آتے ہیں ۔ اول الذکر صاحب دیوان ہیں ۔ اپنے عہد کے دوسرے تازہ گو شعراء کی طرح خوش خیالی اور نازک بندی کی داد دیتے ہیں ۔ اور امتیاز خان خالص کی یہ خوبی ہے کہ وہ حسنِ تعلیل کا اہتمام کرتے ہوئے بھی اپنے جذبات و کیفیات کو بڑی تازگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ مثلاً :

مرا ای باغبان از داغ دل برگ و نوا باشد
چمن از تو ، گل از تو ، بلبل از تو ، لالہ زار از من

اس دور کے ایک کشمیری شاعر کا بھی ذکر ضروری ہے ۔ ان کا نام داراب جویا[3]

---

(۱) سرو آزاد ، ص ۱۲۸ ، کلمات الشعراء ، ص ۲م ۔ ڈاکٹر ریو ، ص ۷۰۰ب ، ص ۹۳۸ الف ۔
(۲) کلمات الشعراء ، ص ۶ ، نتائج الافکار ، ص ۵۶ و ۲۲۰ ۔
(۳) دیوان جویا ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۵۹ء ، تذکرۂ مجمع النفائس ، ص ۸۲ ب ۔

ہے - ۱۷۰۶ء میں فوت ہوئے - اکثر میرزا صائب کا تتبع کرتے تھے لیکن کہیں کہیں میر معز فطرت کی روش بھی اختیار کر لیتے تھے - کشمیر کے تقریباً تمام شعراء ان کے شاگرد تھے - غزل ، قصیدہ ، مثنوی خوب کہتے تھے - نواب فاضل خان کی فرمائش پر انہوں نے کشمیر کی تعریف میں مثنوی 'حسنِ معنی' لکھی جس کے صرف دو شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

تعالی اللہ زہے گلزار کشمیر — کہ در وی غنچہ ای ہم نیست دلگیر
درین گلشن کہ باد آباد جاوید — لطافت را مجسم می توان دید

احساس اور بیان کی لطافت اسی طرح تمام مثنوی کی جان ہے اور اس زمانے کی یادگار ہے جب کشمیر واقعی جنت نظیر تھا اور شاعران خوش نوا آزاد فضا میں آزادی کے گیت گاتے تھے۔

عہدِ عالمگیری کے شعراء کا ذکر ہم میر جعفر[1] زٹلی پر ختم کریں گے جو فرخ سیر کے حکم سے ۱۷۱۳ء میں قتل ہوئے - مواخذہ اس بات پر ہؤا تھا کہ اس بالغ نظر شاعر نے یہ سکہ کیوں کہا :

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر — پادشاہ پشہ کش فرخ سیر

۱۷۱۹ء میں فرخ سیر بادشاہ گر سید برادران کی بدولت جس مظلومیت سے قتل ہؤا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میر جعفر زٹلی نے اس شہنشاہ کو اگر پشہ کش کہا تھا تو درست کہا تھا - میر صاحب موصوف اپنے معاشرے کی المناک حالت کا دل میں شدید احساس رکھتے تھے اور بڑی بیباکی کے ساتھ اس کا ذکر اپنے خاص انداز میں کر دیتے تھے - ان کے اشعار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ۱۷۳۹ء میں شہنشاہ محمد شاہ کے زمانے میں درگاہ قلی خان نے 'مرقع دہلی' لکھ کر جو کوائف بیان کئے وہ صرف مشتے نمونہ از خروارے کا مصداق تھے - میر جعفر زٹلی کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ وہ بڑے فاضل ، صاحب نظر اور باضمیر انسان تھے اور جہاں خوبی نظر آتی تھی اس کا ذکر بڑی متانت اور جزالت کے ساتھ کیا کرتے تھے - مثلاً اورنگ زیب عالمگیر کا سکہ انہوں نے اس طرح کہا :

سکہ زد در جہان چو بدر منیر — شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اس کا مقابلہ فرخ سیر والے سکے سے کیجیے - اسی طرح اورنگ زیب کی وفات پر انہوں نے

---

(۱) تذکرۂ روز روشن ، ص ۱۶۸ و زٹلی نامہ۔

نہایت ہی دلگداز مرثیہ لکھا جو فنی لحاظ سے بھی بلند مقام رکھتا ہے ۔ تین شعر سنیے :

دریغا وائے وائے وائے وائے ۔۔۔ شہنشاہے عجب گیتی پناہے
بتقوی و ریاضت با کمالے ۔۔۔ بتدبیر و شجاعت بے مثالے
بصورت خضر و در سیرت ملک بود ۔۔۔ بعظمت خاک پایش بر فلک بود

اورنگ زیب کی رحلت سے جو صورت حالات پیدا ہوئی ، اس کی پیش بینی کرکے میر جعفر زٹلی کے قلم نے اسے کس خوبی سے بیان کیا ہے :

دریغا رونق باغ جہان رفت ۔۔۔ دریغا آبروئے میر و خان رفت

میر صاحب کا دیوان دوبار مطبع مہدی دہلی (۱۸۶۷ء و ۱۸۷۲ء) میں چھپ چکا ہے ۔ اس کا نام انہوں نے خود 'زٹل نامہ' رکھا تھا ۔ اس میں فارسی ، اُردو ، ہندوی تینوں زبانوں کا ملغوبہ ملتا ہے ۔ اس کے بالکل عریان قسم کے عنوانات اُس زمانے کے معاشرے کی بخوبی عکاسی کرتے ہیں ۔ میر صاحب نے جن لوگوں کی ہجو کہی ہے ، درست نظر آتی ہے ۔ وہ لوگ کس قدر بہادر اور دلیر تھے ؟ . . . اس کا ذکر انہوں نے اپنی مثنوی 'در بیانِ دلاوری' میں کیا ہے ۔ دو شعر درج کئے جاتے ہیں :

من آن رستم وقت روئین تنم ۔۔۔ کہ دہ پاپڑ از دست خود بشکنم
کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر ۔۔۔ بر آرم دمار از سر مور پیر

حالانکہ اسی جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کی شجاعت اور استقامت طبع کا اعتراف اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کیا تھا :

درین پیر سالی و ضعف بدن ۔۔۔ مچائی دھاچوکڑی در دکن
بر آورد عسکر بصد دھوم دھام ۔۔۔ کہ ہل چل پڑی بر سر صبح و شام
زہے شاہ شاہان کہ گاہ وغا ۔۔۔ نہ ہلّد نہ ٹلّد نہ جنبد ز جا

خالص لسانی اعتبار سے یہ دونوں اقتباسات اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ میر جعفر زٹلی کے زمانے میں عربی ، فارسی ، پنجابی اور ہندی الفاظ کی آمیزش جاری تھی اور فارسی زبان سے سروکار رکھنے والے لوگ اسے قبول کر رہے تھے ۔ اُردو کی بلوغت کا زمانہ یہی ہے ۔

اس دور میں شاعری کی بعض آوازیں

اس ڈیڑھ صدی (۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء) پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو شروع سے لے کر اختتام تک ایک آواز بار بار سنائی دیتی ہے اور وہ میرزا بیدل عظیم آبادی کی آواز ہے۔ اعلیٰ درجے کے صوفی ہونے کے علاوہ بیدل اپنے علم و فضل کی وجہ سے بھی ممتاز تھے۔ ان کی فطرت میں وہ جرأت و ہمت تھی جو تورانی نژاد مغلوں کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ اس لئے حال و قال اور سیرت و کردار نے ان کے کلام کو ایسا لب و لہجہ اور تفکر عطا کر دیا تھا جس میں شوکت اور زندگی پائی جاتی تھی۔ ان کی مخصوص طویل بحرین، ان کی معنی پروراور حسن و توانائی سے لبریز ترکیبیں اور پھر ان کی جرأت فکری، یہ سب عناصر مل کر ان کی آواز کو ہمہ گیر اور تہ دار بنا دیتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد طویل عرصے تک ہر سال ان کے مزار پر عرس کی تقریبات جس دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں، اس نے ان کی آواز کی گونج مدھم نہ پڑنے دی۔ غلام ہمدانی مصحفی نے ۱۷۸۵ء میں لکھا کہ بیدل کا مزار ویرانی کا شکار ہوچکا ہے۔ یہ سخت ابتری کا زمانہ تھا۔ دہلی اجڑ چکی تھی۔ شاہ عالم ثانی (م - ۱۸۰۶ء) کا عہد تھا۔ عرس بیدل کی تقریبات ختم ہو چکی تھیں۔ لیکن بہت جلد میرزا اسد اللہ خان غالب (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء) نے پھر سازِ بیدل کو اس آہنگ سے چھیڑا کہ ہمارے ادب میں اب اس کی حیثیت کلاسیکی ہو چکی ہے۔

علی حزیں

اس دور میں ایک اور آواز سنائی دیتی ہے اور وہ شیخ محمد علی حزین (م- ۱۷۶۶ء) کی آواز ہے۔ ایران کے بزرگ زادے تھے۔ نادر شاہ ایرانی سے خوف زدہ ہو کر ۱۷۳۴ء میں برِ صغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے۔ دہلی میں تھے تو نادر شاہ خونریزی کی تمام روایات کے ساتھ ۱۷۳۹ء میں یہاں بھی پہنچ گیا۔ وہ ان کے خلاف دل میں ذاتی عناد بھی رکھتا تھا۔ اس لئے حزین والہ داغستانی مصنفِ 'ریاض الشعراء' کے گھر میں چھپے رہے۔ انہوں نے محاورۂ ایران اور سبک شیرازی و اصفہانی کی آواز بلند کی۔ جذبات کے راست اظہار اور قدمائے ایران کے اسالیب کو پھر سے رواج دینا چاہا۔ تازہ گو شعراء کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا یہ فقرہ بڑی شہرت رکھتا ہے:

> "از نظم ناصر علی و نثر بیدل ہیچ بفہمم نمی آید۔ اگر بہ ایران می رفتم
> برائے ریشخند یاران رہ آوردے ازین خوبتر نبود۔"

باوجویکہ میاں ناصر علی سرہندی کے قدرداں بڑی تعداد میں موجود تھے اور بیدل کے تو سینکڑوں شاگرد تھے جن میں سے بعض فنونِ شعر میں مہارت تامہ رکھتے تھے، حزیں فارسی گویان پاک و ہند پر اکثر و بیشتر بے محل اعتراضات افسوسناک طریقے سے کرتے چلے گئے ۔ اس بات سے ان کی بدمزاجی مترشح ہوتی ہے ۔ بزرگ زادے تھے اور صفوی حکمرانوں کے جدِ اعلیٰ انہیں کے گھرانے کے فیض یافتہ تھے ۔ ادب و شعر میں بلند مقام رکھنے کے علاوہ علومِ عقلی میں استعدادِ کامل رکھتے تھے ۔ ایران میں وزیر بھی رہ چکے تھے ۔ ان باتوں کے زیر نظر شاہجہان آباد میں ان کی بے حد قدر و منزلت تھی ۔ خوش گو لکھتا ہے :

''امروز اہل ایران جناب او را بمرشدی می پرستند ۔''

اس لئے حزیں کی آواز نے گونج پیدا کر دی ۔ لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ تازہ گو شعراء کی روایات کو کس قدر رسوخ حاصل ہو چکا ہے اور کتنی طویل صدیوں کے اثرات نے اور کتنے بڑے اساتذہ نے مل کر انہیں استحکام عطا کیا ہے ۔ انہیں خیال نہیں تھا کہ یہ روایات اس تہذیب و ثقافت کی پیداوار ہیں جس کی تخلیق مسلمانوں کے ہاتھوں اس خطۂ ارض میں ہوئی ، وہ خطۂ ارض جو اب مسلمانوں کو سمرقند و بخارا اور شیراز و اصفہان سے کم عزیز نہیں تھا ۔ انہیں ان اعلیٰ درجے کی نظموں کا بھی علم نہیں تھا جو یہاں کے فارسی گو شعراء نے بڑی محبت پرور لے میں پنجاب ، لاہور ، دہلی اور بنگال وغیرہ کے متعلق لکھی تھیں ۔ یہ سارا ادبی اور شعری سرمایہ بڑا معنی خیز ، روح پرور اور دلنواز تھا ۔ اس کی تحقیر صحیح معنوں میں اسلامیانِ پاک و ہند کی تحقیر تھی ۔ اس لئے قدرتی طور پر حزیں کی آواز کا شدید ردِ عمل ہوا ۔ یہ ردِ عمل بھی کلاسیکی حیثیت رکھتا ہے ، جس کا ذکر بعد میں آ رہا ہے ۔ حزیں کے مقابلے میں جو تحریک پیدا ہوئی اس کے علمبردار سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۷۵۶ع) تھے ، جنہوں نے فارسی گویانِ پاک و ہند کی حمایت بڑے فاضلانہ انداز میں کرکے برِّ صغیر کے شعری اسلوب اور اس کی ادبی روایات کو تقویت بخشی ۔

حزیں ۱۷۳۴ء میں یہاں وارد ہوئے تھے اور ۱۷۶۶ء میں بنارس میں فوت ہوئے ۔ یعنی عمر کے بتیس سال آپ نے یہاں گزارے ۔ لوگوں نے انہیں عزت و احترام سے دیکھا ۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ خود مغل شہزادوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ۔ محمد شاہ شہنشاہ نے انہیں قلمدانِ وزارت بھی پیش کیا ۔ بنارس سے جو آپ کو وابستگی تھی

اس شعر سے عیاں ہے :

از بنارس نروم معبد عام است اینجا ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

لیکن اہل ہند کی اس نیاز مندی اور بنارس کی اس تعریف کے باوجود شیخ صاحب کو برّصغیر سے تعلق خاطر پیدا نہ ہو سکا ۔ 'تذکرۂ احوال'، غزلیات، رباعیات اور مقطعات میں انہوں نے برابر شکایت کی ہے ۔ دوسری باتوں کے علاوہ ہند کو ''جگر خوار'' تک کہہ ڈالا ہے ۔ ان کے فطری عُجب و غرور کے علاوہ اس نفرت میں شاید اس مخالفت کا بھی دخل تھا جو ان کی یہاں ہوئی ۔ کہتے ہیں :

از ظلمت ہند سفلہ انگیز مترس در تیرگی شب ای سحر خیز مترس
ہرگز باکی ز خصمیٔ ہند مدار نامرد نہ ای ز حملۂ حمز مترس

کلیات حزین مطبع نولکشور میں دو بار (۱۸۷۶ء ، ۱۸۹۳ء) طبع ہؤا ۔ اس میں 'تاریخ احوال' (نثر)، قصائد ، دیوان ، متفرقات ، رباعیات ، مثنویات ، دیباچۂ مطمح الانظار ، فرہنگ نامہ ، مثنوی 'تذکرۃ العاشقین' کا فاتحہ و خاتمہ ، مقطعات اور تذکرہ شامل ہیں ۔ تاریخ احوال میں اپنے ۱۷۴۱ء تک کے حالات قلمبند کئے ہیں ۔ قصائد میں آئمہ اطہار کی تعریف ہے ۔ مثنویاں مختصر ہیں اور زیادہ تر اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں ۔ قصیدوں اور مثنویوں دونوں میں عارفانہ اور مفکرانہ مطالب بھی ہیں ۔ مقطعات زیادہ تر ذاتی نوعیت کے ہیں ۔ تذکرہ شعراء کے حالات پر مشتمل ہے ۔ اس میں برّصغیر کے صرف دو شاعروں ملا محمد سعید اشرف اور مرزا معز فطرت موسوی خان کا ذکر کیا گیا ہے ۔ سرافراز خان خٹک نے ان کی بہت سی اور تصنیفات کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ہر علم کے متعلق حزین نے ایک آدھ کتاب تصنیف کی تھی ۔

لیکن شیخ صاحب کا حقیقی کارنامہ ان کا دیوان غزلیات ہے جس کا تتبع غالب ایسے بلند پایہ شاعر کے لئے بھی موجب فخر تھا ۔ شیخ صاحب نے کافی سیاحت کی تھی ۔ استعمال ہند کی مخالفت کے علاوہ اہل کشمیر کی مذمت کرنے پر بھی ان کے خلاف جذبات بھڑکے تھے ۔ تلخ و شیریں تجربات زندگی کے باعث ان کے سینے میں گونا گوں جذبات موجود تھے ۔ اعلیٰ درجے کے عالم ہونے کے علاوہ صوفی منش اور عرفان دوست بھی تھے ۔ ان تمام تجارب اور بصائر و حکم کا اظہار جب انہوں نے اصفہان و شیراز کی شیریں زبان میں ایک بے تصنّع انداز میں کیا تو فارسی غزل گوئی کو ایک نیا دلکش اسلوب مل گیا

جس سے اہل ہند بے خبر ہو چکے تھے ۔ انہوں نے سعدی اور حافظ کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ استعارے کا استعمال صرف حسب ضرورت کیا ۔ مجاز و حقیقت کے امتزاج کے علاوہ ایک بے ساختہ برجستہ انداز میں سچے جذبات کی ترجمانی کرکے شعر میں تاثیر پیدا کی ۔ قدرتی زبان ، بے تکلف اظہار اور عام انسانی جذبات کی ترجمانی سے جس میں عارفانہ رنگ کی آمیزش ہے ، ان کے کلام میں امتیازی شان پیدا ہوگئی ہے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

کجا ست طائر قدس آشیانہ کہ زند ز شاخ سدرہ صفیرے بہ ہمزبانی ما
بآن دستے کہ می در ساغر جمشید می ریزی بوصل قطرۂ خوش کن دل ساغر سفالاترا
جز یار ہیچ کس سر بازار عشق نیست یوسف بہ نیوہ ہای خریدار آمدہ
گل داغی ز باغ زندگانی نیست در دست تہی کف می روی زاہد کہ گل چیدن نمی دانی

حزین کی غزل گوئی ان کی اپنی داستان ہے یا زیادہ سے زیادہ ان کے اشعار سے ایرانی تہذیب کے متعلق معلومات اخذ کی جا سکتی ہیں ۔ انہوں نے پاک و ہند کی تہذیب کی ترجمانی یا عکاسی نہیں کی ۔ البتہ اہل ہند کا جب وہ ذکر کرتے ہیں تو دو ایک باتوں کا پتا ضرور چلتا ہے ۔ ایک تو ضمناً یہ مترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ اور امراء یہاں شعراء کی سرپرستی کرتے تھے ۔ مثلاً شیخ صاحب کے یہ دو شعر پڑھے جائیں تو ان کے منفی جذبے اور خیال کو خارج کر کے جو نتیجہ نکلتا ہے وہی ہے جو ہم نے اخذ کیا ہے :

یکے از عقل زند لاف کہ بایست گرفت دامن عاطفت شاہ عطا بخش و وزیر
آن یکے می دہدم پند کہ در ہند مجوی کام بے تربیت قدر شناسان امیر

دوسرے مغل بادشاہوں نے یہاں جو طبقۂ امراء قائم کیا تھا شیخ صاحب اس کی بوالہوسی اور ”بے بنیاد“ دعوئ نجابت و بزرگی کا ذکر کرتے ہیں :

ہر شب پرہ آفتاب زاد است ہر مسخرہ از تبار کبار

اور فرماتے ہیں ”لوگ بلا تأمل سید بن جاتے ہیں اور ہندوؤں کی اولاد سے ہونے کے باوجود قریشی کہلاتے ہیں اور یہ نہ کر سکیں تو کم از کم مغل شہزادہ بننا ان کے لیے قطعاً دشوار نہیں ہوتا ۔“ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مغل معاسرہ ان ایام میں بغیر کسی استحقاق کے عزت اور دولت حاصل کرنا چاہتا تھا ۔

اب ہم خان آرزو کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ شیخ محمد علی حزین اور ان کو یک جا کئے بغیر ایک دوسرے کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

سراج الدین علی خان آرزو

سراج الدین علی خان آرزو[1] اکبر آباد میں ۱۶۸۷ء میں پیدا ہوئے ۔ آبا و اجداد کا وطن گوالیار تھا ۔ ماں کی طرف سے نسب شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری تک پہنچتا ہے اور والد کی طرف سے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے ہمشیرہ زادہ شیخ کمال الدین تک ۔ علوم متداولہ بڑی محنت اور مستعدی سے سیکھے ۔ پختہ گو شاعر تھے ۔ معانی ، بیان ، لغت اور مصطلحات یعنی محاورات میں انہوں نے بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ۔ 'مجمع النفائس' ان کے تذکرے کا نام ہے جس میں ڈیڑھ ہزار سے زائد شعراء کا ذکر ہے ۔ کچھ عرصہ گوالیار میں شاہی خدمات انجام دیتے رہے ۔ شاہجہان آباد میں آنند رام مخلص کے ذریعے دربار سے استعداد خاں کا لقب اور ہفت صدی منصب ملا ۔ نواب رشید خان سالار جنگ ۱۷۵۵ء میں خان آرزو کو لکھنؤ لے گئے اور نواب شجاع الدولہ سے تین سو ماہوار تنخواہ مقرر کرائی ۔ وہیں ۱۷۵۶ء میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی ۔ انہوں نے مثنویاں بھی لکھیں اور غزلیات ، قصائد اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل دیوان بھی چھوڑا ۔ ان کا ایک پورا دیوان[2] بابا فغانی شیرازی کے دیوان کے جواب میں ہے ۔ نمونۂ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

ہلاک حسن تو پیرانہ سر شدم گوئی	برائے جورِ تو بیرورد روزگار مرا
ہر دم ای شمع برنگ دگرش می سوزی	پرِ پروانہ کند جلوۂ طاؤس اینجا
آبِ آئینہ کسی را نکند تر داماں	مشربی پاک تر از مشربِ حیرانی نیست

ان اشعار میں جذبات کا بےساختہ بیان کم ہے ، مبالغہ اور خیال بافی زیادہ ہے ۔

فارسی ادب کی تاریخ میں خانِ آرزو کی شہرت اس کردار سے بھی وابستہ ہے ، جو انہوں نے ہندی ایرانی نزاع کے سلسلے میں ادا کیا ۔ اس نزاع کا آغاز دراصل ابتدا ہی میں

---

(۱) سرو آزاد ، ص ، ۲۲۷ ۔ مردم دیدہ ، ص ، ۴۸ ، ۵۶ ۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک ، ص ، ۳۲۳ تا ۳۳۷ ۔

(۲) قلمی نسخہ مملوکہ سید وزیر الحسن عابدی ، سمن آباد لاہور ۔

ہو گیا تھا ۔ اہل ایران کے لیے یہ تسلیم کرنا دشوار تھا کہ اس برصغیر کا کوئی فارسی گو صحیح معنوں میں زبان دان ہو سکتا ہے ۔ امیر خسرو ایسے جامع کمالات کے 'خمسۂ نظامی' کا جواب لکھنے پر ایک ایرانی شاعر نے کہا ہے :

غلط افتاد خسرو را ز خامی　　　که سکبا پخت در دیگِ نظامی

فیضی اور عرفی کی نوک جھونک میں بھی اسی ایرانی ہندی نزاع کا دخل تھا ۔ خود پسندی کے لحاظ سے اگرچہ عرفی اور حزین برابر تھے ، مگر حزین کے اظہارِ نفرت و حقارت میں ابتذال بھی آ جاتا تھا ۔ جب شیخ صاحب ایران میں وزیر تھے تو بادشاہ کی موجودگی میں نادر شاہ کو قرمساق کہا تھا ۔ اس ابتذال کا اظہار انہوں نے یہاں بار بار بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کیا ۔ انہوں نے اہلِ کشمیر کی جو ہجو کہی تھی اس کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے :

شرح قومی شنو از من که ندارند نسب
ادب و شرم و حیا عیب ازیشان بحساب
ہمہ حمامی و دلاک بود اعلایش
ما بقیِ دلہ و ساد و دگر ارباب طرب

زیرک کشمیری نے اس قطعے کا جواب[1] اتنی ہی تلخی کے ساتھ تحریر کیا ۔ فارسی گویانِ ہند کو شیخ صاحب نے کبھی ''زاغانِ ہند'' کہا اور کبھی ''پوچ گویانِ ہند'' ۔ خان آرزو کو ''حرامزادۂ اکبر آباد'' کہا اور ان کے معتقدین کو ''کاسہ لیس'' ۔ نورالدین واقف کے ایک شعر کو سن کر کہا :

''در تمام ولایت گردیدم ، شعر دمدار آکنون شنیدم ۔''

ناصر علی اور بیدل کے متعلق ان کی جو رائے تھی وہ پہلے درج کی جا چکی ہے ۔ یہ سب کچھ خان آرزو کے لیے ناقابلِ برداشت تھا ۔ ان کا سرمایۂ حیات وہی عقیدت تھی جو انہیں فارسی گویانِ ہند سے تھی ۔ اس لئے انہوں نے اپنی ساری قابلیت اور فنی مہارت اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کر دی کہ اہل ہند کی زبان دانی کا پایہ کسی لحاظ سے کم نہیں ۔ 'تذکرۂ حسینی[2]' اور مجموعۂ نغز[3]' میں اس نزاع کی اصل کی طرف خاص اشارات ملتے ہیں ۔

---

(۱) تذکرۂ روز روشن ، ص ، ۳۳۱ تا ۳۳۳ ۔
(۲) تذکرۂ حسینی ، ص ، ۱۰۵ ۔
(۳) مجموعۂ نغز ۔

جب شیخ محمد علی حزین نے دیوان مرتب کیا تو خان آرزو نے اس کے پانسو اشعار لے کر ان پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ ناقص اور نامربوط ہیں اور زبان اساتذہ کے محاورے کے خلاف ہے - اس کتاب کا نام انہوں نے 'تنبیہ الغافلین' رکھا - انہوں نے نرم لہجہ اختیار کیا - دیکھیے :

''بسبب قصور ذهن بمعانیٔ آن نرسیده و فائز بمقاصد آن نگردیده - ترددے و اغلاقے رو داده - ناچار در تحریر را بروی قلم مشوش رقم خود کشاد -''[1]

اور ساتھ ہی شیخ صاحب سے درخواست کی کہ حل اشکال میں اسعانت فرمائیں - شیخ صاحب نے اس کے جواب میں کتاب 'رجم الشیاطین' تصنیف فرمائی جو نایاب ہے - 'نگارستان فارس'[2] میں مولانا محمد حسین آزاد اس کا حوالہ دیتے ہیں اور 'خان آرزو' کے متعلق شیخ صاحب کے یہ الفاظ درج کرتے ہیں[2] :

''یکی از جرگۂ حرامزادگانِ اکبرآباد -''

شیخ صاحب کے جواب کا لبِ لباب یہ تھا کہ زمانے کے ساتھ ساتھ زبان بدلتی رہتی ہے اس لئے اساتذہ کی تقلید لازمی نہیں - اشعار 'حزین' پر انتقاد کے سلسلے میں خان آرزو نے ایک چھوٹا سا رسالہ 'احقاقِ حق' بھی تصنیف کیا - یہ بھی نایاب ہے -

استعمالِ ہند اور جدید ایرانی محاورے کے سلسلے میں یہ نہایت ہی اہم بحث تھی - اس میں بڑے بڑے زباندان حصہ لیتے نظر آتے ہیں - خوشگو ، وارستہ ، آزاد بلگرامی ، عبدالحکیم حاکم ، میر محسن اکبر آبادی ، مرزا لطف علی ، امام بخش صہبائی اور محمد حسین آزاد ان تمام نے اس میں کسی نہ کسی حد تک حصہ لیا - وارستہ نے اس سلسلے میں ایک کتاب 'جواب شاف' لکھی - اس میں وہ شیخ حزین کی ایرانیت سے مرعوب نظر آتے ہیں - آزاد بلگرامی کہتے ہیں کہ صرف چند مقامات پر وارستہ نے خوب جواب دیا ہے اور بعض مقامات پر کامیاب نہیں ہو سکا - وہ اعتراف کرتے ہیں کہ خان آرزو کے بعض اعتراضات درست ہیں - عبدالحکیم حاکم کہتا ہے - ''در بعضی مواضعی گرفت بجاست -'' جہاں تک میرزا غالب کا تعلق ہے وہ صرف اساتذۂ ایران کو سند مانتے تھے -

---

(۱) تنبیہ الغافلین ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، ص ، ۳۲ ب -

(۲) نگارستان فارس ، طبع لاہور -

اس بحث میں سب سے بڑھ چڑھ کر امام بخش صہبائی (م - ۱۸۳۲ء) نے حصہ لیا - وہ غیر جانب داری کا دعوی لے کر اٹھے تھے مگر دراصل شیخ محمد علی حزین کے طرف دار نکلے - ۱۸۵۰ء میں انہوں نے 'تنبیہ الغافلین' کے مقابلے میں 'قول فیصل' لکھی - اکثر مقامات پر شیخ صاحب کی تائید میں اساتذہ کے اشعار پیش کیے اور جہاں توجیہ پیس نہ کر سکے وہاں سپر ڈال دی - ''سپرمی افگند'' صہبائی کے اپنے الفاظ ہیں - اس کے بعد انہوں نے خان آرزو کے رسالہ 'احقاقِ حق' کے جواب میں 'اعلاء الحق' تصنیف کی - اس میں بھی ان کا طریق کار یہی رہا - ہاں 'اعلاء الحق' کا لب و لہجہ نہایت درشت اور تلخ ہے - دیگر باتوں کے علاوہ خان آرزو کو ''معرکہ ساز لاف'' کہا ہے - جہاں جواب نہیں بن پڑا اس رسالے میں بھی سپر انداختہ نظر آتے ہیں - خان آرزو نے حزین کے ایک شعر پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں ''نظر پیش کسی کشادن'' محاورے میں غرابت ہے - اس کے جواب میں صہبائی[۱] لکھتے ہیں :

''بنظر فقیر صہبائی نیامدہ - ولی استعمال حزین ہم سند است چون استعمال انوری و خاقانی و اساتذہ دیگر -''

ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ حزین خود اپنی سند ہیں اور ہم اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ زبان تبدیل ہوتی رہتی ہے ، نئے تقاضوں کی بنا پر سابقہ محاورہ قائم نہیں رہتا اور اس میں تجدد پیدا ہو جاتا ہے ، لیکن شیخ محمد علی حزین زبان کے ارتقاء میں زمانے کے اثرات کے تو قائل ہیں مگر مختلف جغرافیائی اور معاشرتی ماحول کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں - امریکہ کی انگریزی انگلستان کی انگریزی سے بہت مختلف صورت اختیار کر چکی ہے - تلفظ اور محاورے میں فرق پیدا ہو چکا ہے - لیکن امریکہ والوں کی زبان پھر بھی انگریزی کہلاتی ہے - کابل کی فارسی موجودہ ایرانی سے مختلف ہے مگر کوئی ایرانی ادیب اس پر اعتراض نہیں کرتا - جغرافیائی ماحول اور معاشرے کا فرق زبان میں فرق پیدا کر دیتا ہے - لسانیات کے ماہرین اس حقیقت کو تسلیم کر کے لسانی اختلافات کی عالمانہ رنگ میں توجیہ کرتے ہیں - بنابریں خان آرزو نے اگر

---

(۱) کلیات صہبائی ، مطبوعہ نولکشور پریس ، ص ۷۰ - قول فیصل ، مطبوعہ کان پور ، ۱۲۷۸ھ -

استعمالِ ہند کی حمایت میں قلم اٹھایا تو یہ ان کی دیدہ وری کا ثبوت ہے - برّصغیر کے مخصوص معاشرے نے فکر اور بیان کے سانچے تبدیل کر دیے تھے اور ان سانچوں کو لے کر بڑے نامور شعراء پیدا ہوئے جن پر ہمیں بجا طور پر ناز ہے - ہم تو مرزا غالب کو بھی انہی سانچوں کا سنکار سمجھتے ہیں - ان کا کلام سبکِ ہندی کی ایک عمدہ مثال ہے اور اسی نے ان کے کلام کو معنویت ، گہرائی اور نکتہ رسی کے عناصر عطا کئے ہیں -

شیخ محمد علی حزین نے جو معاندانہ روش اختیار کی اس نے برّصغیر میں فارسی زبان کے رواج کو نقصان پہنچایا - ہند کے فارسی گو شعراء نے کہا جب مزاولت کے باوجود ہم فارسی زبان میں مہارت حاصل نہیں کر سکتے تو کیوں نہ اُردو زبان میں شعر کہیں جو ہماری اپنی زبان ہے اور جس پر کوئی غیر معترض نہیں ہو سکتا :

خان آرزو دوسرے درجے کے شاعر تھے - ان کے بعد اب ہم عام شعراء کا ذکر کرتے ہیں - جہاں تک ممکن ہو سکے گا ، زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے گا -

شاہ فقیر اللہ آفرین[1]

نسباً جویہ گوجر تھے (سید ہونے کی روایت بھی ہے) - لاہور کے محلہ بخارائی میں سکونت پذیر رہے - جیّد عالم ہونے کے علاوہ علم رمل بھی جانتے تھے - درویش مشرب تھے - امراء سے استغناء کا اظہار کرتے مگر فقراء اور غرباء سے تواضع سے پیش آتے تھے - ان کی خوش خلقی اور خوش مشربی کا ہر ایک معترف تھا - قناعت اور توکل کا یہ عالم تھا کہ گوشۂ الزوا میں فاقے کرتے مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے - بیس سال کے تھے کہ سعداللہ خان علامی کا بیٹا نواب حفیظ اللہ خان ناظم صوبہ بن کر آیا - اس کے سامنے انہوں نے اپنے شعر پڑھے جو بڑے مقبول ہوئے - ایک بار پھر ان کی مجلس میں جانے کا اتفاق ہؤا - شاہ صاحب نے ایک غزل پڑھی جس کا مقطع یہ تھا :

آفرین تا دل ما گرد تعلق افشاند   مشت خاکی بسر مردم دنیا کردیم

---

(۱) مردم دیدہ ، ص ۱۷ تا ۲۲ - سرو آزاد ، ص ۶ - ۲۰۵ - سفینۂ خوشگو ، ۲۳۸ - خزانۂ عامرہ ، ص ۲۸

نواب صاحب کو ناگوار گذرا ۔ لاہور کا صوبیدار عبدالصمد خان اور ان کا بیٹا زکریا خان شاہ صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے ۔ ایک بار نواب عبدالصمد خان نے بڑی کوشش سے اپنے پاس بلوایا ، تعظیم و تکریم کی ، مسند کے نزدیک جگہ دی اور ایک روپیہ یومیہ مقرر کیا ۔

شعر و شاعری سے بڑی رغبت تھی ۔ 'مثنوی معنوی' کے ماہر تھے اور اس کا درس دیا کرتے تھے ۔ بچپنے میں والد کے ساتھ شیخ ناصر علی سرہندی سے ملاقات کی ۔ شیخ صاحب نے انہیں اپنی مثنوی دی ۔ شیخ صاحب کا طرز سخن گوئی انہیں بڑا پسند تھا ۔ میرزا بیدل عظیم آبادی ان کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے :

حجاب عشقم نداد رخصت سوال بوس از دهان تنگش
ازو نمی آید این مروت زمن نمی آید این تقاضا

شعراء کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے ۔ خان آرزو کے ساتھ بھی راہ و رسم تھی اور نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہتا تھا ۔ اساتذۂ سلف کا نام ہمیشہ عزت سے لیتے تھے ۔ اور انہیں اپنا استاد اور مرشد تسلیم کرتے تھے ۔ لاہور میں ان کے بہت سے شاگرد تھے ۔ مسجد وزیر خاں کے صحن میں مشاعرے ہوتے تھے اور ان میں آپ کی حیثیت استاد اور مصلح صحن کی ہوتی تھی ۔ حاکم لاہوری سے بڑی ملاقاتیں رہتی تھیں ۔ اسی چوراسی سال کی عمر میں ۱۷۹۰ء میں لاہور میں وفات پائی اور اپنے گھر میں دفن ہوئے ۔

اصناف سخن کے لحاظ سے آفرین کے کلام میں غزلیات ، مثنویات ، ترکیب بند اور ترجیع بند سب شامل ہیں ۔ کچھ تضمینیں بھی ہیں ۔ آپ کی ایک مثنوی کا نام 'انبانِ معرفت' ہے جو نایاب ہے اور بقول آزاد بلگرامی اس طرح شروع ہوتی ہے :

اے مغنی بہ وضوی تجرید   صبح شد صبح نماز توحید

آپ کی باقی مثنویوں کے نام 'ابجد فکر' ، 'راز و نیاز' ، یعنی 'ہیر و رانجھا' اور 'فکر عبث' ہیں ۔ 'ہیر رانجھا' کو چھوڑ کر باقی مثنویاں تصوف اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ان پر مثنویٔ معنوی کا اثر موجود ہے ۔ مثنوی "ہیر رانجھا" میں بڑا سوز و درد ہے اور جہاں ہیر اپنی وفاداری کا حلف اٹھاتی ہے ، وہ بند پڑھنے کے قابل ہے ۔

چونکہ آفرین کو ناصر علی سرہندی کا انداز سخن گوئی بڑا پسند تھا اس لیے ان کی

غزلیات میں خیال آفرینی کا عنصر نمایاں ہے ۔ انہوں نے میرزا صائب اصفہانی کا بھی اتباع کیا ، اس لیے ان کے کلام میں مثالیہ عنصر بھی پایا جاتا ہے ۔ مجموعی لحاظ سے وہ بڑے خوش بیان اور تازہ خیال تھے اور ان کی غزلیات میں تنوّع ، تازگی اور طرز جدید کے نقوش ملتے ہیں ۔ مضامین زیادہ تر متصوفانہ ہیں ۔ کلیات پروفیسر غلام ربانی عزیز کی ادارت میں ، پنجابی اکادمی لاہور نے طبع کرایا ہے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

اشک شادی پردۂ دیدار شد در عین وصل ‏ لشکر اطفال زور آورد و بر دیوار ریخت

ستم بر زیردستان مرد سرکش را خطر دارد ‏ فلک را شیوۂ عاجزکشی زیر و زبر دارد

ندانستم بہ پیری نفس بد کردار تر گردد ‏ قد خم این سبق را باعثِ تکرار پیدا شد

بجز فکر محقق کس نمی فہمد کلامم را ‏ فصوص عشقم و لمعات شوقم ، گلشن رازم

قزلباش خان امید[1]

اصل نام محمد رضا تھا ۔ ہمدان کے رہنے والے تھے ۔ آغاز جوانی میں اصفہان آئے اور دبیر الممالک طاہر وحید سے نسبت تلمّذ قائم کی ۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آئے اور منصب عطا ہوا ۔ اورنگ زیب کے میر بخشی ذوالفقار خان بہادر نصرت جنگ کے ساتھ ان کی بڑی رفاقت تھی ۔ شاہ عالم کے عہد میں قزلباش خان کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۔ جہاندار شاہ کے عہد میں بہ تقریب ملازمت برہان پور گئے ، اور پھر انقلابات زمانہ کی وجہ سے مختلف حیثیتوں سے دکن ہی میں رہے ۔ ۱۷۲۷ء میں نظام الملک آصف جاہ کو دہلی بلایا گیا تو قزلباش خان بھی ساتھ آئے ۔ بھوپال کے سفر میں بھی آپ ہم رکاب تھے ۔ بھوپال سے واپسی پر شاہجہان آباد ٹھہرگئے اور وہیں وفات پائی ۔ 'سرو آزاد' میں تاریخ وفات ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) درج ہے اور ''جاں دادہ قزلباش خان'' سے تاریخ نکالی گئی ہے ۔ 'مردم دیدہ' میں تاریخ ۱۱۶۰ھ دی گئی ہے اور مصرع تاریخ ''آہ از قزلباش خان امید'' ہے ۔

قزلباش خان بڑے منصف مزاج امیر تھے ۔ زندگی مجردانہ بسر کی ۔ خان آرزو لکھتے ہیں کہ ایسے اخلاق حسنہ اور اوصاف پسندیدہ والے آدمی کم ملتے ہیں ۔ خان آرزو کے ساتھ بڑی شفقت اور اخلاق سے پیش آتے تھے ۔ لوگوں نے کہا : آرزو حزین کے محاورے پر اعتراض کرتا ہے ۔ انہوں نے جواب دیا کہ آرزو کی زباندانی میں شک نہیں ۔ اعتراض

---

(۱) مردم دیدہ ص ۴۷ ، ۴۸ ۔ سرو آزاد ، ص ۲۱۰ ۔ نتائج الافکار ص ، ۶۵ - ۶۳ ۔

بلا وجہ نہ ہوگا ۔ عبدالحکیم حاکم اور آزاد بلگرامی بھی ان سے ۱۷۳۹ء میں ملے تھے ۔ دونوں ان کی گرم جوشی اور خوش خلقی کے مداح ہیں ۔

قزلباش خان ہندوستان کی اکثر چیزوں کی داد دیتے تھے ۔ ہندی زبان کو خوب سمجھتے تھے اور ہندی میں شعر کہتے تھے ۔ ہندی موسیقی کے بھی ماہر تھے ۔ بڑے رنگین مزاج اور رنگین مشرب آدمی تھے ۔ اس کے باوجود دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ استغناء سے پیش آتے تھے ۔ کہتے ہیں :

مان چون ہما بہ خلق نداریم احتیاج   چون سایہ دولت است غلام سیاہ ما

صاحبِ دیوان تھے ۔ ان کے دیوان کے قلمی نسخے بانکی پور لائبریری اور پنجاب[1] یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں ۔ ان میں غزلیات ، مفردات ، رباعیات اور مخمسات ہیں ۔ اگرچہ اپنے آپ کو طاہر وحید کا شاگرد بتاتے تھے لیکن خان آرزو لکھتے ہیں کہ ان کا اسلوب قدماء میں سلمان ساوجی سے ملتا ہے ۔ صاحبِ درد و ذوق تھے ۔ الفاظ کی رعایت سے معنی پیدا کرنا ان کا محبوب اسلوب تھا ، لیکن ان کا شعر جذبے سے بھی خالی نہیں ہوتا نمونہ ملاحظہ ہو :

ہمچو بلبل ہمیشہ نالانیم   این بود منصب ہزاری ما
پیش آن غارت گر جان دل ندارد قیمتے   راہزن کی قدر داند گوہر دزدیدہ را
حسن گفتار ازان قامت رعناست مرا   فیض این مرتبہ از عالم بالاست مرا
دلم ز دوری یاران رفتہ می نالد   گذشتہ قافلہ و نالۂ جرس باقیست

میر شمس الدین فقیر[2]

۱۷۰۳ء میں شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے ۔ خاندان بنی عباس میں سے تھے ۔ ماں کی طرف سے سید زادے تھے ۔ آپ کا شمار بزرگان عصر میں ہوتا تھا ۔ اپنے عہد کے علماء سے کسبِ کمالات کیا ۔ معانی ، بیان ، بدیع اور عروض و قوافی کے فنون میں منتخبینِ روزگاہ میں سے تھے ۔ فارسی شعر گوئی میں فکر رسا کے مالک تھے ۔ تخلص پہلے مفتون تھا ،

---

(۱) مجموعۂ شیرانی ، نمبر ۱۷۸۲/۳۸۰۳ ۔
(۲) مخزن نکات ، ص ۳ - ۸۲ ۔ نتائج الافکار ، ۸ - ۵۴۷ ، گلشن بیخار ، ص ۲۱۳ ۔ تذکرہ نویسی فارسی در پاک و ہند ، ص ۲۹۶ ۔

بعد میں فقیر اختیار کر لیا ۔ ان کے علم و فضل اور فصاحت بیان سے متأثر ہو کر نواب سعادت خان نے ان کی شاگردی اختیار کی ۔ مزاج میں استغناء تھا اسی لئے نواب صاحب نے جب نوکری کی تکلیف کے بغیر ایک سو بیس روپے ماہوار مقرر کئے تو لینے پر بمشکل راضی ہوئے ۔

شہر کے امراء اور اکابر مثلاً علی قلی خان ظفر جنگ داغستانی اور نواب عماد الملک آپ کی تعظیم و تکریم کرتے تھے ۔ ۱۷۳۲ء کے قریب سیاحت دکن کے لئے گئے ، پانچ سال بعد ۱۷۳۷ء میں قزلباش خان امید کے ساتھ واپس شاہجہان آباد آئے اور اگرچہ ابھی عمر ۴۳ سال تھی علایق دنیا ترک کر کے لباس فقر پہن لیا اور اکبر آباد میں گوشہ نشین ہو گئے ۔ آخری عمر میں اورنگ آباد اور سورت کے رستے حج پر گئے ۔ واپسی پر جہاز غرق ہو گیا اور میر صاحب بھی سمندر کی موجوں کی نذر ہو گئے ۔ یہ ۱۷۶۹ء کا ماجرا ہے ۔

آپ کا دیوان بانکی پور لائبریری میں محفوظ ہے ۔ اس میں غزلیات اور رباعیات شامل ہیں ۔ آپ نے حسب ذیل چھ مثنویاں تصنیف کیں :

'تصویر محبت' ، 'رام چند کا قصہ محبت' ، 'مثنوی سانحہ کربلا' ۔

'مثنوی عشق والہ و سلطان' ، 'نواب سادات خان کے محل کی تعریف میں مثنوی' ۔

'در مکنون' ، 'قصہ دختر قیصر روم' ، 'شمس الضحیٰ' ، در منقبت ائمہ ۔

ایک تصنیف 'تحفۃ الشباب' بھی ہے ۔ فن بلاغت میں آپ کی 'حدایق البلاغت' آج تک مشہور ہے ۔ اس کے علاوہ علوم بلاغت پر ان کے دو مختصر[1] رسائل بھی ہیں ۔

خان آرزو لکھتے ہیں کہ میر صاحب غزل میں بابا فغانی کا تتبع کرتے تھے ۔ اس کے باوجود آپ کا اسلوب بیان صریح ، سادہ اور صاف ہے ۔ کلام میں جذبات کی گرمی بھی ہے ۔ مثلاً :

نیستم آگاہ ز تاراج پریرویان چہ رفت
این قدر از خود خبر دارم کہ دل در سینہ نیست

---

(۱) قلمی نسخے مملوکہ سید وزیر الحسن عابدی ، سمن آباد ، لاہور ۔

گرہ از زلف مشکین وا نکردی کاش میکردی
ز سر این فتنہ را برپا نکردی کاش میکردی
مرحبا باد صبا بوی خوشی آوردی
مگر از ساحتِ گلزارِ حجاز آمدہ ای

بعض مقاطع میں اپنے تخلص سے معنی آفرینی کرتے ہیں :

بخاکدان جہان گنج بےنیازی را کسی نیافتہ غیر از فقیر خانہ خراب

اپنے معاشرے پر بھی نگاہ ہے ۔ مثلاً کمزور اور بے کس لوگوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کے طور پر کہتے ہیں :

گفتی دگر ستم بہ ضعیفان نمی کنم دودیکہ شد بلند ز مشتِ گیاہ کیست

لیکن بہ حیثیت شاعر میر شمس الدین فقیر کی اصل عظمت ان کی مثنویات میں پنہاں ہے ۔ زمانے کی روح ان مثنویوں میں موجود ہے اور اپنے زمانے کے معمولات کی صحیح طور پر نمائندگی کرتے ہیں ۔ رام چندر کا عشق مقامی موضوعات سے وابستگی کا اظہار ہے ۔ اس زمانے میں محبت کا ذکر کرتے ہوئے عورتوں کا برملا نام آ جاتا تھا ۔ مثنوی 'والہ و سلطان' اس روایت کی بہترین مثال ہے ۔ ان ایام میں مسلمان مجاہدین اور ابطال کا رومانی تصور داستانوں میں پیش کیا جاتا تھا ۔ یہ رنگ میر صاحب کی مثنوی 'در مکنون' میں موجود ہے ۔ مثنوی 'والہ و سلطان' واقعاتی مثنوی بھی ہے ۔ نواب سادات خان کے محل کے متعلق مثنوی بھی اسی قسم کی ہے ۔ ان کی مثنویوں کی یہ حیثیتیں میر صاحب کو اپنے عہد میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں ۔

والہ داغستانی[۱]

علی قلی خان نام ، نسباً عباسی ہیں ۔ اجداد داغستان کے سلاطین تھے اور ان کے والد محمد علی خان ایران کے سپہ سالار تھے ۔ ۱۲ ۱۷ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے ۔ چار سال کے تھے کہ والد فوت ہو گئے ۔ مکتب میں پڑھتے تھے کہ اپنی دخترِ عم خدیجہ

---

(۱) مردم دیدہ ، ص ۱۰۰ ، ۹۸ ۔ تذکرہ نویسی در ہند و پاک ، ص ۲۹۶ تا ۳۰۲ اسٹوری : جلد اول حصہ دوم ، ص ۸۳۲ دیوان والہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۸۰۵/۴/۱۷۸۴ ۔

سلطان سے محبت ہو گئی - اس سے منسوب بھی ہوئے - جوان ہونے پر شادی نہ ہو سکی کیونکہ ان کی والدہ شادی کی رسم ادا کرنے کے لئے فوری طور پر تیار نہ ہوئیں اور اس دوران میں ایک شخص کرم داد افغان نے اس سے جبراً نکاح کر لیا - بعد میں کرم داد قتل ہوا اور نادر شاہ خدیجہ سلطان کو بلا نکاح اپنے تصرف میں لے آیا -

خدیجہ سلطان کی طرف سے مایوس ہو کر علی قلی خان والہ ہندوستان چلا آیا - محمد علی حزین بھی ان کے ساتھ تھے - قابلیت اور والا نسبی کی بنا پر برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری کے ذریعے محمد شاہ نے چار ہزار پیادہ اور دو ہزار سوار کا منصب دیا - احمد شاہ نے شش ہزاری منصب کر دیا اور خان زمان ظفر جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا - عالمگیر ثانی کے عہد (۱۷۵۴ء - ۱۷۵۹ء) میں ہفت ہزاری امیر بن گئے - خدیجہ سلطان کی محبت میں بیتاب رہتے تھے - وہ بھی خط لکھتی رہتی تھی - خدیجہ کو بلوانے کے لئے والہ نے میرزا شریف کو بھیجا - وہ کربلا کے رستے روانہ ہوئی مگر راہ میں فوت ہو گئی - میر شمس الدین فقیر نے والہ اور سلطان کی محبت کے متعلق مثنوی لکھی جس کا ذکر ہو چکا ہے - علی قلی والہ مزاج کے تند تھے مگر ویسے بڑے خوش کلام ، خوش صحبت اور خوش باش آدمی تھے - اسی لئے مقروض رہتے تھے - ۱۷۵۶ء میں شاہجہان آباد میں فوت ہوئے - ان کی ایک لڑکی گنا بیگم تھی جو اردو کی شاعرہ ہوئی -

خوشگو انہیں شیخ علی حزین کا متبع بتاتا ہے - خان آرزو کا قول ہے کہ بابا فغانی کا اتباع کرتے تھے لیکن جو چاشنی والہ کے کلام میں موجود ہے فغانی کے اشعار میں نہیں - شعر کہنے میں زود گو تھے - اشعار درد اور لذت سے بھرے ہوئے ہیں - اہل اللہ سے عقیدت تھی اور ان کے ملفوظات کا مطالعہ کرکے وہ توحید حقیقی تک پہنچ گئے تھے - دیوان ۱۷۴۴ء میں شمس الدین فقیر نے مرتب کیا تھا جو تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے - اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مجموعۂ شیرانی میں بھی موجود ہے - نمونۂ کلام :

جلوہ بہ گلستان مدہ قامت دلفریب را — دشمن سرو و گل مکن قمری و عندلیب را

کوتاہ شد فسانۂ عمر دراز خضر — ہر جا حدیث آن سر زلف دراز رفت

خدیجہ سلطان کے متعلق ان کے شعر درج کئے جاتے ہیں جو شاعر کی خود نوشت

سوانحعمری معلوم ہوتے ہیں :

من بیادش گشته ام خاموش در ہندوستان　　با رقیبان می کند او در شفاہان اختلاط
فریاد کسان بود ز بیگانه و من　　از دختر عم خویش دارم فریاد

علی قلی واله نے ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ میں ایک تذکرہ 'ریاض الشعراء' کے نام سے لکھا جس کا تفصیلی ذکر ''تذکرہ نویسی' فارسی در ہند و پاکستان'' میں موجود ہے ۔

غلام علی آزاد بلگرامی[1]

جن علماء اور فضلاء پر اسلامیان ہند کو بجا طور پر ناز ہے ان میں سے ایک میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں ۔ عام طور پر آنہیں ایک بے مثال تذکرہ نگار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے ، لیکن عربی شاعری میں بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے ۔ جس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ آپ نے عربی میں قصائد کہے وہ اس برِ صغیر کے عربی گو حضرات میں کم نظر آتی ہے ۔ اسی لئے آپ کو حسّان الہند کہا گیا ہے ۔ اور اس بات میں بھی ذرہ برابر شک نہیں کہ ان کا کلامِ فارسی حسن بیان ، پختگیِ ذوق اور معنی پروری کے لحاظ سے بہت بلند پائے کا ہے ۔

آپ بلگرام کے مردم خیز قصبے میں ۱۷۰۴ء میں پیدا ہوئے ۔ خاندان علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھا ۔ درسی کتب میر طفیل محمد بلگرامی کے درس میں پڑھیں ۔ میر عبدالجلیل بلگرامی ان کے نانا تھے ۔ ان سے لغت ، حدیث ، سیرت نبوی ؐ اور فنون ادب کی تعلیم حاصل کی ۔ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت ہوئے ۔ ۱۷۳۷ء میں حج کو گئے اور ۱۷۳۹ء میں واپس ہوئے ۔ مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی سے صحیح بخاری پڑھی اور صحاح ستہ کی اجازت حاصل کی ۔ وہاں آپ نے اور بھی فوائد علمی حاصل کئے اور آپ کے قصائد عربی کو بڑا سراہا گیا ۔

واپسی پر آپ اورنگ آباد دکن میں ٹھہر گئے ۔ وہاں سے سرنگاپٹم ، برہان پور ارکاٹ اور حیدر آباد کی سیر کی ۔ حج پر جانے سے پہلے اله آباد ، شاہجہان آباد ، لاہور اور بھکر بھی گئے تھے ۔ اس سفر کے دوران میں کئی فارسی گو شعراء سے ملاقات کا موقع

---

(۱) مردم دیدہ ، ص ، ۳۴ تا ۳۶ ۔ سرو آزاد ، ص ، ۲۹۱ تا ۳۰۷ ۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ، ۲۵۵ تا ۲۷۱ ۔

ملا - دکن کے صوبیدار تعظیم اور توقیر سے پیش آتے تھے - آخری عمر میں اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے - بڑی شان کے ساتھ رہتے تھے - نظام دوبار ملاقات کے لئے حاضر ہوا - ۱۶۸۰ء میں وہاں شاہ برہان الدینؒ غریب کے مزار کے قریب زمین خرید کر قبر بنوائی - ۱۷۸۶ء کو وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے - اورنگ زیب عالمگیر کی قبر بھی وہیں ہے - آپ کے علم و فضل کی اتنی شہرت تھی کہ والدین بچوں کو ان کی قبر پر لے جاتے اور کہتے کہ اپنے لبوں سے کھانڈ کے دانے مزار سے اٹھائیں تاکہ ان کی برکت سے علم حاصل ہو -

بڑی خوبیوں کے مالک تھے - اخلاق میں بزرگانہ شان تھی - لوگوں کے ساتھ خلق، تواضع اور کشادہ پیشانی سے پیش آتے - غرباء اور فقراء کی کھلے دل سے خدمت کرتے - خدا پرستی ان کا شعارِ زندگی تھا - اسی لئے آپ کے کلام میں اخلاقِ عالیہ، بلند حوصلگی اور محبتِ الٰہی کا ذکر کثرت سے ہے -

آپ کی تصنیفات بڑی قابل قدر ہیں - آپ کے تینوں تذکرے 'ید بیضا'، 'سرو آزاد' اور 'خزانۂ عامرہ' اہل تحقیق کی نگاہ میں بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں - آپ نے ان میں چشم دید تاریخی واقعات کو بڑے اہتمامِ صحت کے ساتھ قلمبند کیا ہے - عربی کے متعدد دیوان ہیں - فارسی کی دو مثنویاں بھی تصنیف کیں - آپ کا دیوانِ فارسی دو جلدوں میں حیدرآباد دکن میں چھپا تھا - ان کے علاوہ بھی عربی اور فارسی میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں - 'خزانۂ عامرہ' میں آپ نے اردو کے بعض الفاظ فارسی نثر میں استعمال کئے ہیں -

آپ سبک ہندی کے شاعر ہیں مگر کلام میں خیال بافی نہیں - صائب اور بیدل کی طرح آپ کو صنعتِ تمثیل سے بڑا شغف ہے اور ذو معنی مضامین بڑے لطف سے نظم کرتے ہیں - مثلاً :

خبر رساند عزیزے غرور یار نماند بگفتمش کہ دوست است گفت خط آمد

صنعتِ تضاد بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں :

خانہ ہا سوختی و این مردم خانہ آباد گفتہ اند ترا

تلمیحات اور تشبیہات میں بھی دلکشی پیدا کرتے ہیں - حقائق کی طرف برابر نگاہ رہتی

ہے - غزلوں میں روانی اور جوش ہے - تین مزید اشعار ملاحظہ فرمائیے :

نقش و نگار دنیا سیر بہشت دارد　　اما چو پای طاؤس انجام زشت دارد

روز قیامت ہر کسے در دست دارد نامہ　　من نیز حاضر می شوم تصویر جانان در بغل

باز خورشید صفت جلوہ طراز آمدہ ای　　چشم بد دور کہ خوش ذرہ نواز آمدہ ای

نور العین واقف[1] لاہوری

بٹالہ (بھارت ، ضلع امرتسر) میں پیدا ہوئے - محمد شاہ کے عہد تک اس شہر کا عہدۂ قضا آپ کے خاندان میں رہا - والد کا نام قاضی امانت اللہ تھا - علوم رسمی کی تکمیل کے بعد شعرگوئی شروع کی - علی محمد تجرد کی وساطت سے خان آرزو سے اصلاح لیتے رہے - میر محمد معصوم وجدان ، بندرابن داس خوش‌گو اور فقیر اللہ آفرین سے بھی آپ نے اصلاح لی - عبدالحکیم حاکم سے اتحاد قلبی تھا - ان کے ساتھ سفر حج کے لئے روانہ ہوئے مگر کثرت عوارض کے باعث سورت میں ٹھہر گئے - جب عبدالحکیم حاکم لوٹے تو دونوں پہلے اورنگ آباد گئے اور میر غلام علی آزاد سے ملاقات کی - اورنگ آباد سے چلے تو رستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا - وہاں سے خط میں یہ شعر لکھ کر آزاد بلگرامی سے درخواست کی کہ مالی امداد کریں :

چشم حیران و دل بیتاب با ما ماندہ است　　عینکے و پارۂ سیماب با ما ماندہ است

میر صاحب نے ہنڈوی کے ذریعے رقم بھیجی - لکھنؤ پہنچے تو زاد راہ حاصل کرنے کے لئے ایک مثنوی صبغۃ اللہ خان نواب شجاع الدولہ کے میر سامان کو پیش کی - کابل بھی گئے کیونکہ کلام سے متاثر ہو کر احمد شاہ ابدالی نے بلایا تھا - بٹالہ میں ۱۷۸۱ء کو فوت ہوئے - ان کی بیعت سلسلۂ چشتیہ میں تھی - بڑے پرہیزگار تھے اور سنت نبوی ؐ کی متابعت دل و جان سے کرتے تھے - کم اختلاط ، غنی دل اور بے نیاز تھے - کم سخن تھے ، گفتار میں نرمی اور طبیعت میں ہمواری تھی - دوستی کا بڑا پاس کرتے تھے -

آپ کا دیوان پنجابی اکیڈمی نے ۱۹۶۲ء میں طبع کرایا ہے - اس میں غزلیات ، مذکورہ بالا مثنوی ، ایک مخمس ، رباعیات اور ان کا مشہور ترجیع بند شامل ہیں - ترجیع بند

---

(۱) مردم دیدہ ، ص ۱۱۴ تا ۱۱۵ - سفینۂ خوش گو ، ص ۱۸۶ ؛ روز روشن ، ص ۸۶۸ تا ۸۸۵ - دیوان واقف لاہوری -

بہت فصیح ہے اور اس کا لہجہ بڑا پُر درد ہے :

بشتاب کہ می رود جوانی	دریاب کہ رفت زندگانی
حال من ناتوان خراب است	تعمیرم کن کہ می توانی
لب تشنۂ بر تو می دہم جان	اے چشمۂ آب زندگانی

غزل کے آپ پختہ مشق شاعر تھے ۔ عبدالحکیم حاکم انہیں پنجاب کا میر شمس الدین فقیر کہتا ہے ۔ کلام میں محاورہ بندی ، بیان کی برجستگی ، زبان کی شستگی اور ردیف کے لانے میں خاص اہتمام پایا جاتا ہے ۔ معنی آفرینی کے علاوہ ایسی تشبیہات بھی ملتی ہیں جو فطرت اور واقعات سے لی گئی ہیں :

خوش قامتے بچشم ترم جا گرفتہ است	سروے عجب بدین لب جو جا گرفتہ است
بر سرِ کویش گزارے داشتم نگذاشتہ	با دلِ دیوانہ کارے داشتم نگذاشتہ
قدت دیدم قیامت را شنیدم	شنیدہ کے بود مانند دیدہ

قمرالدین منت[1]

مشہدی الاصل اور جعفری سادات میں سے ہیں ۔ سید ناصر الدین کے اخلاف سے ہیں جن کا مزار سونی پت میں ہے ۔ سونی پت میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی ۔ تفسیر و حدیث شاہ عبدالعزیز دہلوی سے پڑھی ۔ ان سے سلسلۂ قرابت بھی تھا ۔ مولانا محمد فخر الدین دہلویؒ سے بیعت کی ۔ ۱۷۷۷ء میں لکھنؤ گئے اور شیعہ مذہب اختیار کیا ۔ نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ ، حیدر بیگ خاں نائب الریاست اور راجہ مکیت رائے دیوان کی تعریف میں قصائد لکھے ۔ مرشد آباد گئے اور نواب صاحب کی تعریف میں قصیدہ کہا ۔ کلکتہ میں وارن ہیسٹنگز کا قصیدہ مدحیہ لکھا اور خطاب ملک الشعرائی حاصل کیا ۔ حیدرآباد پہنچے اور نواب نظام الملک آصف جاہ کی مدح سرائی کی ۔ دس ہزار روپے صلہ ملا ۔ وہاں سے لکھنؤ آئے ۔ راجہ مکیت رائے ان کے اخراجات کے کفیل بنے ۔ کچھ عرصہ بعد کلکتہ گئے اور وہیں ۱۷۹۳ء میں فوت ہوئے ۔

آپ فارسی کے علاوہ اردو کے بھی شاعر تھے ۔ نظم و نثر میں مہارت تھی ۔ صاحبِ

---

(۱) روز روشن ، ص ، ۷۶۸ تا ۷۷۱ ۔ نتائج الافکار ، ص ، ۶۸۷ تا ۶۸۹ ۔ پنجابی قصے فارسی زبان میں ، ص ، ۷۱ تا ۸۱ ۔

دیوان تھے۔ 'گلستان' کے مقابلے میں 'شکرستان' لکھی اور 'بوستان' کے مقابلے میں 'چمنستان'۔ مولانا اہلی کی 'سحر حلال' کے مقابلے میں 'معجز الکمال' تصنیف کی۔ قصہ' عشق ہیر و رانجھن فارسی میں نظم کیا۔ اس رومان کو انہوں نے مختصر لیکن دلآویز انداز میں نظم کیا ہے۔ زبان میں حلاوت اور فکر و بیان میں گہرائی ہے۔ مثلاً پنجاب کی توصیف میں کہتے ہیں :

ترنم ساز نرم آشنائی	بدین قانون کند آتش نوائی
کہ زیر چرخ گردانست نایاب	زمین عشق خیزے ہمچو پنجاب
در او جز اشک و آہ مبتلا نیست	دیارے را چنیں آب و ہوا نیست

'چمنستان' میں خود کہتے ہیں کہ قصائد کے علاوہ انہوں نے متعدد مثنویاں، غزلیات اور رباعیات لکھیں۔ ان کا کلام صرف تذکروں میں ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے غزل گوئی میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکے۔ دیکھیے :

کرد سوزِ سینہ خاکستر دلِ دیوانہ را	سوخت آخر آتشِ این خانہ صاحب خانہ را
می فتد از ضعف صد جانا بعاشق می رسد	ناتوان باشد نگاہ نرگس بیمار او

علوم بلاغت میں بھی ان کی ایک کتاب 'تہذیب الکلام' کے نام سے ہے جس کا قلمی نسخہ ڈاکٹر سید اظہر علی کلیکشن میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔

فاخر مکیں[1]

نام محمد فاخر ہے۔ دہلی میں ولادت ہوئی۔ والد کا نام آقا محمد اشرف تھا۔ دہلی میں تعلیم حاصل کی اور رشد و تمیز کو پہنچے۔ فن شعر گوئی میں فتوت حسین خان کشمیری اور آقا عظیما اکسیر اصفہانی کے شاگرد ہیں۔ کافی مدت تک دہلی میں ہنگامہ' سخن سنجی گرم رکھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہونے لگے تو ۱۷۵۹ء میں لکھنؤ چلے گئے اور باقی زندگی شیخ معز الدین کے ہاں بڑی عزت اور وقار سے گزاری۔ ایک بار شیخ محمد علی حزین سے ملاقات کے لئے بنارس بھی گئے تھے۔ جب عبدالحکیم حاکم اور نور العین واقف لکھنؤ آئے تو وہ بھی ان سے ملے۔ جن دنوں شاہ عالم شہنشاہ دہلی الہ آباد میں قیام پذیر تھے، انہوں نے اپنی چند غزلیں فاخر مکین کو بھیجیں اور طلب فرمایا۔

---

(۱) روز روشن، ص ۶۱۱ تا ۶۲۷ - مردم دیدہ، ص ۱۸۶ -

دربار شاہی میں باریاب ہوئے اور حضور شاہی میں نشست کا اعزاز عطا ہوا تو فی البدیہہ یہ رباعی کہی :

در خدمت شاہِ عالم و عالمیان ‏ ‏ ‏ ‏ بنشست اگر مکین مزن طعنہ برآن
ناچار فتد ز خاکساری سایہ ‏ ‏ ‏ ‏ بر خاک بہ پیشِ آفتابِ تابان

"آفتاب تابان" شہنشاہ کے تخلص کی رعایت سے کہا ۔ لکھنؤ میں ۲۱ مارچ ۱۸۰۶ء کو فوت ہوئے ۔ چونکہ نشۂ فقر سے سرشار تھے تأہل اختیار نہ کیا تھا ۔

شعر گوئی میں عالی دماغ تھے ۔ اساتذۂ قدیم کا اتباع کرتے تھے ۔ امیر خسرو کی مشہور غزل کا نہایت ہی کامیاب جواب لکھا ۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

رقیبان گوش بر آواز و آو در ناز و من ترسان
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم
فغان بر لب ، طپش در دل ، قلق در بر ، اجل برسر
بلاھا بیتو نازل بود شب جائیکہ من بودم

ان کی غزل اسی طرح چاشنی سے لبریز ہوتی ہے ۔

میرزا محمد حسن[1] قتیل لاہوری

آبائی وطن لاہور تھا ۔ والد کا نام درگاہی مل تھا ۔ یہ اپنے متعلقین کے ساتھ فیض آباد چلے گئے تھے ۔ قتیل شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے اور شیعہ مذہب اختیار کیا ۔ چونکہ بچپنے سے موزوں طبع تھے ، اُستاد کی تجویز پر قتیل تخلص اختیار کیا ۔ عربی علوم اور فارسی نظم و نثر پر بھی عبور حاصل کیا ۔ شاہجہان آباد سے کالپی گئے اور عمادالملک کی صحبت میں کچھ وقت فارغ البالی سے گذارا ۔ اس کے بعد لکھنؤ گئے اور باقی زندگی وہیں بسر کی ۔ ۱۸۲۳ء میں وفات پائی ۔ لکھنؤ میں قتیل کے شاگرد بہت تھے ۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے اساتذہ میں ہوتا تھا ۔

جیسا کہ ان کی تصنیف 'چار شربت' سے ظاہر ہے ، فن انشاء میں اُنہیں مہارت حاصل

---

(۱) سرو آزاد ، ص ۱۹۰ ۔ شمع انجمن ، ص ۳۹۳ ۔ تذکرۂ شعرائے کشمیر ، میرزا اصلح ، ص ۲۹۲ تا ۳۱۳ ۔

تھی - فارسی نثر میں ان کی دوسری تالیفات بھی ہیں - دیوان کے علاوہ ان کا ایک ترکیب بند بھی ہے - دونوں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مجموعۂ شیرانی میں موجود ہیں - غزل سرائی میں ان کا کلام پختہ اور رنگین ہے - مگر تازہ‌گوئی کے معیار پر پورے نہیں آترتے اس لئے کہ ''فکر نو'' کہیں نظر نہیں آتی - نمونۂ کلام :

آخرِ عہدِ جوانی شد نصیبم وصل یار
می بجامم ریخت ساقی چون بہار از دست رفت
کن بر سر تابوتم یک جلوہ برعنائی
ای در لبِ لعلِ تو اعجاز مسیحائی

ان کی اُستادی کا غلغلہ وفات کے بعد بھی قائم رہا - اُنہیں وفات پائے چار سال ہوئے تھے کہ میرزا غالب مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں ۱۸۲۸ء میں کلکتہ گئے - میرزا غالب کی غزل پر شاگردان قتیل نے اعتراض کیا - غالباً اُنہوں نے نورالعین واقف کا بھی حوالہ دیا ہوگا - میرزا غالب کا مسلک زبان کے معاملے میں اساتذۂ قدیم اور شعرائے ایران کا اتّباع تھا ، چنانچہ اُنہوں نے اپنی مثنوی بادِ مخالف میں کہا :

آنکہ طی کردہ این مواقف را　　　چہ شناسد قتیل و واقف را

دیگر قابلِ ذکر شعراء

ان کا ذکر بھی زمانی ترتیب کے مطابق ہوگا مگر اختصار کے ساتھ - ہم نے دیکھا ہے کہ بیدل کے بعد اور غالب سے پہلے کوئی شاعر فکری عظمت کا مالک نظر نہیں آتا لیکن ان شعراء کے پختہ مشق ہونے میں کلام نہیں - شاعرانہ فکر کی کمی کو خان آرزو اور آزاد بلگرامی ایسے شعراء کا علم و فضل پورا کرتا ہے - فقیراللہ آفرین اور قمرالدین منت نے یہ جدّت کی کہ مقامی موضوعات پر مثنویاں لکھیں - استعمال ہند بھی قائم رہا - جن شعراء کا اب ذکر ہو رہا ہے وہ بھی کم و بیش اپنے عہد کی انہی خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں -

عبدالغنی بیگ قبول (م - ۱۷۲۶ء)

کشمیر کے متوطن اور داراب جویا کے شاگرد تھے - دہلی چلے آئے اور متعدد امراء

سے توسل رہا ۔ ان کے بیسیوں شاگرد تھے ۔ اس دور میں صنعت ایہام کو رواج دینے والوں میں مقبول اور ممتاز ہیں ۔ فرماتے ہیں :

با گوزِ شتر بود مقابل　　شعر یکہ نباشدش "دو محمل"

ان کے اشعار مضبوط اور متین ہیں ۔ صرف اسی مقطع سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

درپیٔ ترتیب دیوانے چرا باشی قبول　　میتوان چون آفتاب از مطلعے مشہور شد

احمد یار خان[1] یکتا (م - ۱۷۴۳ء)

خوشاب کے رہنے والے تھے اور مغل برلاس تھے ۔ فنون لطیفہ سے خاص مناسبت تھی ۔ روحانی کمالات بھی حاصل کئے ۔ ٹھٹھہ کے صوبیدار اور غزنی کے فوجدار بھی رہے ۔ اُنہوں نے بھی ہیر اور رانجھا کا قصّہ فارسی میں نظم کیا ۔ جو بڑا مقبول ہوا ۔ غزل کے بھی اُستاد تھے ۔ ان کے کلام میں جدّتِ بیان نظر آتی ہے ، مثلاً :

چہ پرسی از سروسامان من عمریست چون کاکل
سیہ بختم ، پریشان روزگارم ، خانہ بردوشم

مُلاّ ساطع کشمیری[2] (م - ۱۷۴۷ء)

مُلاّ ساطع کشمیری بھی میرزا داراب بیگ جویا کے شاگرد تھے ۔ کچھ عرصہ شاہجہان آباد میں رہے اور پھر کشمیر چلے گئے ۔ شاگرد ہونے کے علاوہ رنگین نثر بھی لکھتے تھے ۔ 'گلشن اسلام' نثر میں مرتّب کی ۔ 'برہان قاطع' کا انتخاب 'حجت ساطع' کے نام سے تیار کیا ۔ ایک مثنوی 'جنگ فیلان' بکمال لطافت موزوں کرکے شہنشاہ محمد شاہ کو پیش کی ۔ ان کے شاگرد صاحب کمال بنے ۔ اشعار خالی از لطف نہیں :

طبیبا کی رود سوز درونِ من بدرمانے
تبے در استخوان دارم ، چو آتش در نیستانے

میر محمد علی رائج[3] (م - ۱۷۴۷ء)

میر محمد علی رائج سیالکوٹ کے رہنے والے تھے ۔ اپنے والد میر دوست محمد صالح سے

---

(۱) سرو آزاد ، ص ۱۹۹ ۔ سفینۂ خوشگو ، ص ۱۹۹ ۔ نتائج الافکار ، ص ۷۸۹ ۔
(۲) سفینۂ خوشگو ، ص۲۳۶ ۔ روز روشن ، ص ۱ ، ۳۴۰ ، سفینۂ ہندی ، ص ۱۰۶ ۔
(۳) سرو آزاد ، ۲۰۴ ، خزانۂ عامرہ ، ۲۵۴ ، مردم دیدہ ۷۶ ۔

اکتساب علوم کیا۔ وطن میں چند دیہات کے مالک تھے۔ بڑے آزاد مشرب اور خوش صحبت انسان تھے۔ ناصر علی سرہندی، میرزا بیدل، شاہ فقیر اللہ آفرین اور دیگر معاصر شعراء کے ہم طرح تھے۔ پختہ مشق شاعر تھے اور صاحب فکر و معنیٔ بلند۔ اس شعر پر غور فرمائیے:

یا رب چہ ساز مطرب بزم ازل نواخت　　　　کز گوشہا ہنوز صدا کم نمی شود

گرامی کشمیری[1] (م - ۱۷۴۳ء)

گرامی، میرزا عبدالغنی بیگ قبول کے بیٹے تھے اور شاگرد بھی۔ دہلی میں ولادت ہوئی۔ بڑے ملند، مشرب آدمی تھے۔ ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر وضع کے لوگوں کے ساتھ گھل مل جاتے۔ آزاد رو نوجوان طبقے میں ان کے کوئی پانچ سو شاگرد تھے۔ مشاعروں میں جاتے تو پچاس کے قریب شاگرد ساتھ ہوتے اور کلام سامعہ شگاف بلند آواز سے سناتے۔ شیخ محمد علی حزین صرف انہی کے سامنے دم بخود ہوتے۔ صنعت ایہام کے استعمال کو آخری حدود تک لے گئے۔ ان کا یہ شعر ان کی قلندرانہ زندگی کا ترجمان ہے:

ز طوف کعبہ و بتخانہ معشوق است منظورم
بہر سنگے کہ کردم سجدہ از بہر خدا کردم

مظہر جان جاناں[2] (م - ۱۷۷۷ء)

نام اورنگ زیب عالمگیر نے رکھا تھا۔ تیس برس کی عمر تک ظاہری اور باطنی تعلیم حاصل کی۔ ہزاروں آپ کے مرید تھے۔ ان کا مسلک نقشبندی تھا اور شریعت کی پابندی پورے اہتمام سے کرتے تھے۔ شہادت کسی نامعلوم شخص کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کا مزاج، وضع قطع، طور طریقے، لطافت اور نفاست کی آئینہ داری کرتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے دیوان فارسی کا مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ آپ نے ایہام گوئی ترک کرکے بے تکلف بیان اور صاف اور شستہ زبان اختیار کی۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

گرفتم نی ز گل رنگی، نہ بوئی از چمن بردم
ہمین سوز جگر چون شعلہ با خود در کفن بردم

---

(۱) میرزا اصلح، تذکرۂ شعرائے کشمیر، ص ۳۳۲ تا ۳۴۰، سرو آزاد، ۱۹۸۔
(۲) سرو آزاد، ص ۲۳۱، نتائج الافکار، ۶۷۳۔

میر محمد رفیع سودا[1] (م - ۱۷۸۱ء)

اردو کے با کمال شاعر تھے - فارسی میں بھی مشق سخن کی مگر جب ان کا کلام سن کر شیخ محمد علی حزین نے کہا ''در پوچ گویان ہند بد نیستی'' تو فارسی شاعری سے بد دل ہوگئے - لیکن کہتے ہیں آخری عمر میں فارسی گوئی کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی تھی - ان کا یہ شعر لطف طبع کی دلیل ہے :

رنگین تر است قصہ دل خون شدن ز گل ۔۔۔ لیکن بپاسِ خاطرِ دلبر نگفتہ ام

خواجہ میر درد[2] (م - ۱۷۸۴ء)

آپ حسینی سید تھے اور خواجہ ناصر عندلیب کے فرزند - والد صاحب سے قرآن ، حدیث ، فقہ ، تفسیر اور تصوف میں تعلیم حاصل کی - 'مثنوی شریف' مفتی دولت سے پڑھی جو بڑے بزرگ تھے - فارسی کے لیے خان آرزو کی صحبت اختیار کی - والد کی وفات پر سجادہ نشین ہوئے - عبادت گذار ، خلیق ، آزاد طبع اور خود دار تھے - اردو کے مشہور شاعر ہیں - نظم و نثر پر قدرت حاصل تھی - دیوان فارسی کا مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اور مطبع انصاری ، دہلی میں چھپ بھی چکا ہے - درد نے اپنا جو عملی تصوف اپنی مختصر فارسی کتاب 'واردات[3]' میں اور اپنا فلسفہ تصوف 'واردات' کی ضخیم فارسی شرح 'علم الکتاب[4]' میں بیان کیا ہے وہ ان کی فارسی شاعری اور اردو شاعری میں فنی تخلیق بن کر سامنے آیا ہے - 'واردات' اور 'علم الکتاب' کے علاوہ تصوف میں درد کے یہ فارسی رسائل[5] بھی ہیں : نالہ درد ، آہِ سرد ، دردِ دل ، شمعِ محفل - 'واردات' میں ہر وارد کا مفہوم آخر میں رباعی میں نظم کیا ہے - رسائل میں بھی نثر کے ضمن میں رباعیات ، قطعات اور ابیات درج کی ہیں - ان کی 'واردات' 'لمعات عراق' اور 'لوائح جامی' کے تتبع میں

---

(۱) تذکرۂ ہندی ، ص ۱۲۵ ، سودا ، شیخ چاند ، ص ۳۱۶ تا ۳۲۰ -

(۲) نتائج الافکار ، ص ۲۵۳ ، دیوان درد ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ، تذکرۂ ہندی ، ص ۹۲ -

(۳) مملوکہ سید وزیر الحسن عابدی -

(۴) مطبوعہ مطبع انصاری ، دہلی ، ۱۹۱۰ء -

(۵) مطبع شاہجہانی ، بھوپال ۱۳۱۰ھ -

ہے۔ زیادہ تر فقر و تصوف کا ذکر ہے۔ زبان صاف ہے اور جذبہ کی آمیزش کے باعث پرتاثیر :

دوستی کردم و ندانستم　　　دشمنی بود دوستداریہا

شاہ عالم آفتاب[1] (م - ۱۸۰۶ء)

جہاندار شاہ کے پوتے تھے - ۱۷۶۰ء میں تخت نشین ہوئے - ۱۷۸۸ء میں انہیں غلام قادر روہیلے نے اندھا کر دیا تھا - دیوانِ فارسی، 'نادرات شاہی' اور اردو میں 'عجائب القصص' ان کی تصنیفات ہیں - اندھا ہونے پر انہوں نے ایک نہایت ہی درد انگیز نظم لکھی - دو شعر یہ ہیں :

آفتاب فلک رفعت شاہی بودم　　　زرد در شام زوال آہ سیہ کاری ما
چشم ما کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد　　　تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما

ان کے کلام میں حسرت، خلش اور پریشانی اور انجام کار غم کا تدریجی تسلط نظر آتا ہے - ان کی شاعری جذبات کی شاعری ہے - انداز بیان سادہ اور موثر ہے :

گرچہ اوراق زمین و آسمان یکجا کنم　　　کی توان املا نمودن حالِ زارِ خویشتن

میر محمد تقی میر[2] (م - ۱۸۱۰ء)

اردو کے بےنظیر شاعر ہیں - فارسی میں بھی دو ہزار شعر کا دیوان چھوڑا - کلام میں درد و سوز ہے :

گفتم آن آتش سوزان سر طور چہ شد　　　دل اشارت بجگر کرد کہ اینجا افتاد

غلام ہمدانی مصحفی[3] (م - ۱۸۲۴ء)

اردو کے پُر گو شاعر تھے - فارسی میں بھی شعر کہتے تھے - ان کے دیوان کا مخطوطہ

---

(۱) نادرات شاہی، بہ تصحیح امتیاز علی خان عرشی، مطبوعہ رام پور، ۱۹۴۴ء -
دیوان آفتاب، مائکرو فلم، مملوکہ ڈاکٹر وحید قریشی -
جارج کین، سلطنت مغلیہ کا زوال (انگریزی) جلد چہارم، ص ۳۰۲، ۳۰۴ -
(۲) نتائج الافکار، ص ۶۸۶، گلشن بیخار، ۲۹۲ -
(۳) دیوان مصحفی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، گلشن بےخار، ص ۲۵۲ - تذکرۂ ہندی ۲۴۷ -

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ کلام کا کوئی خاص رنگ نہیں :

من نہ آنم کہ بہ ترک غم جانان گویم   می زدم دم ز وفا تا نفسے می آید

حکیم مومن خان مومن[1] (م - ۱۸۵۲ء)

طبیبوں کے معزز گھرانے کے فرد تھے ۔ دہلی کے محلہ کوچہ چیلاں میں ان کا مکان تھا ۔ شاہ عبدالعزیز سے بھی درس لیا لیکن فقہ ، حدیث ، منطق اور معانی کی تکمیل شاہ عبدالقادر سے کی ۔ طب والد اور چچاؤں سے پڑھی اور فارسی کے لیے عبداللہ خان علوی کے شاگرد ہوئے ۔ شاعری کا فطری ذوق تھا ۔ اردو کے نامور شاعر ہیں ۔ دیوان فارسی ان کے شاگرد حکیم احسن اللہ خان دہلوی کے اہتمام سے ان کے کلیات فارسی میں شامل ہو کر ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں طبع ہوا ۔ حضرت سید احمد شہید دہلویؒ سے بیعت تھی ۔ انگریزوں کے تسلط کے خلاف تھے :

این عیسویان بہ لب رساندند   جانِ من و جان آفرینش

ابو ظفر بہادر شاہ کے متعلق کہا :

بے کس درین زمان شدہ سلطان ابو ظفر

میرزا غالب کے دوست تھے ۔ ان کی وفات کا غالب کو سخت صدمہ ہوا تھا ۔ شاعری کا موضوع عشقِ مجازی ہے ۔ فلسفے اور تصوف کے مضامین خال خال ہیں :

پژمردہ گل بفرش تو دیدم درین چہ بحث   بوئے گل از رقیب شمیدم درین چہ بحث

نواب محمد مصطفٰی خان[2] شیفتہ ، حسرتی (م - ۱۸۶۹ء)

اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے ۔ ان کا دیوان فارسی لاہور میں ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا ۔ کلیات جس میں فارسی دیوان کے علاوہ فارسی رقعات بھی ہیں ، نظامی بدایونی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا ۔ بڑے عبادت گذار اور عارف مشرب تھے ۔ حج بھی کیا ۔ حکیم مومن خان مومن کے شاگرد تھے ۔ مومن کی وفات کے بعد میرزا غالب سے بھی استفادہ کیا ۔ بہت سخن فہم تھے ۔ اردو کی نسبت ان کی فارسی شاعری کا

---

(۱) دیوان مومن ، مطبوعہ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء ، گلشن بیخار ، ص ۲۷۵ ۔
(۲) دیوان حسرتی ، مطبوعہ ۱۸۸۷ء ، گلشن بیخار ۱۶۰ ۔

بلند نظر آتا ہے ۔ اس میں اساتذہ کی طرح پختگی اور فصاحت بیان موجود ہے :

با دوعلی بساز نہ با قیس اے جنون — دیوانگی ز مردم فرزانہ خوشتر ست
پنہان نکردم از تو کہ بیمار کیستم — باری تو ہم بگو کہ مسیحای کیستی

اس دور میں مثنوی گوئی

اس دور میں اس صنف کی طرف بڑی توجہ ہوئی ۔ اس کا آغاز بیدل کی 'مثنوی عرفان' سے ہوا جو ۱۷۱۲ء میں مکمل ہوئی ۔ اس کا موضوع تعمیر آدم تھا ۔ اس دور کے اختتام پر میرزا غالب مثنویات لکھتے نظر آتے ہیں جن کے موضوعات میں تنوّع ہے ۔ اور جن میں ان کا پہودار فکر بڑی آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ۔ بیدل اور غالب کے درمیان اور بہت سے شعراء نے قابل قدر مثنویات تصنیف کیں ۔ مقامی موضوعات سے بیش از بیش دلچسپی کا اظہار کیا گیا ۔ شعراء کے تصورات میں وطن کی ثقافت رچی ہوئی ہے اور جذبات و احساسات کے اظہار میں بے ساختگی ہے ۔ عارفانہ مثنویاں بھی ملتی ہیں اور واقعاتی اور تاریخی بھی ۔ ہم صرف اجمالی جائزہ لیں گے ۔

'مثنوی معنوی' کی طرف اس دور میں خاصی توجہ ہوئی ۔ محمد افضل سرخوش (م ۔ ۱۷۱۴ء) نے مثنوی ''نور علیٰ نورؔ'' اس کے اتباع میں لکھی ۔ آغاز اس شعر سے کیا :

شیشہ از قلقل حکایت می کند — غمزۂ ساقی روایت می کند

یہ مثنوی ناپید ہے ۔ شاہ فقیر اللہ آفریں 'مثنوی معنوی' پر کامل عبور رکھتے تھے اور باقاعدہ درس دیا کرتے تھے ۔ عبدالحکیم حاکم کو بھی اس کے مطالعے کا بڑا شوق تھا ۔ میرزا غالب نے ابو ظفر بہادر شاہ کی فرمائش پر راز توحید بیان کرنے کے لیے 'سرمۂ بینش' کے نام سے مثنوی لکھی ، جس کا آغاز انہوں نے 'مثنوی رومی' کے افتتاحی شعر سے کیا ۔ میرزا غالب نے اس میں بنیادی فکر کو اس شعر میں بیان کیا ہے :

عاشق از خود رفت و دلبر ماند و بس — سایہ گم شد مہرِ انور ماند و بس

'مثنوی معنوی' کی مناسبت سے عارفانہ مثنویوں کا ذکر مناسب ہے ۔ محمد افضل سرخوش نے اس قسم کی ایک مثنوی 'قضا و قدر' لکھی ۔ یہ بھی گم ہو چکی ہے ۔ میرزا بیدل کی مثنوی 'عرفان' 'حدیقۂ سنائی' کی بحر میں ہے اور اس کے اشعار بھی تقریباً اسی کے برابر

ہیں ۔ مطالب کی گوناگونی ، اسلوب کی دلکشی اور حکایات کی دلچسپی کے باعث یہ فارسی زبان کی چند اہم مثنویوں میں شمار ہو سکتی ہے ۔ اس میں فلسفۂ اخلاق اور تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں ۔ انسان کے متعلق بیدل کا نظریہ اس شعر سے واضح ہے :

گرچہ واماندۂ دل خاکی   برتر از صد ہزار افلاکی

میرزا غالب نے اپنی مثنوی 'بادِ مخالف' ، اسی مثنوی 'عرفان' کی بحر میں لکھی ہے اور اس کا یہ شعر نقل کیا ہے :

عاشقے بیدلے جنون زدۂ   قدح آرزو بخون زدۂ

وہ مثنوی 'عرفان' سے اہلِ کلکتہ کے اعتراض کو دور کرنے کے لیے ''زدہ'' کے استعمال کی سند دے رہے تھے ۔

مثنوی 'عرفان' کے بعد عطا تتوی (م - ۱۷۲۷ء) کی 'ہشت بہشت' کا ذکر کیا جائے گا ۔ یہ چھوٹی چھوٹی آٹھ مثنویاں ہیں اور مختلف بحروں میں لکھی گئی ہیں ۔ ان مثنویوں میں وہ جس درد و سوز اور عجز و نیاز کے ساتھ مناجات لکھتے ہیں اس سے خواجہ عبداللہ انصاری (م - ۱۰۸۸ء) کے رسائل یاد آ جاتے ہیں جن میں اسی طرح کی مناجاتیں ہیں ۔ مثلاً عطا تتوی ایک مناجات اس طرح ختم کرتے ہیں :

قبولم نمائی بحق رسولؐ   امام رسل تاج اہل قبول
نبی امین سید الاولین   صفئی بہین قبلة الآخرین

فقیر اللہ آفرین نے بھی دو عارفانہ مثنویاں 'ابجدِ فکر' اور 'انبانِ معرفت' نظم کیں ۔ 'انبان' کا پہلا شعر پہلے درج ہو چکا ہے ۔ اس کا کوئی نسخہ معلوم نہیں ۔ پروفیسر غلام ربانی عزیز کلیات آفرین جلد دوم کا ذکر کرتے ہوئے آفرین کی تین اور مثنویوں کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ ممکن ہے ان میں 'ابجد فکر' موجود ہو ۔ شیخ محمد علی حزین (م - ۱۷۶۶ء) نے بھی 'صفیر دل' اور 'خرابات' کے نام سے دو عرفانی قسم کی مثنویاں لکھی ہیں ۔ ان میں زیادہ تر عدل و انصاف اور ترکِ جور کی ترغیب دی گئی ہے ۔ حرص و طمع کی مذمت اور قناعت کی تعریف کرتے ہیں ۔ فقر کے سلسلے میں ان کا یہ شعر معنی خیز ہے :

نہ تجرید تجریدِ تن از قباست   کہ تجرید تجریدِ نفس از ہوا ست

ان کا 'دیباچہ مطمح الانظار' بھی مثنوی کی صورت میں ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ ہویت ذات سے کائنات کا ظہور ہوا - اس موضوع کے اختتام پر میرزا غالب کی دو مثنویوں 'شانِ نبوّت و ولادت' اور 'ابر گہر بار' کا ذکر ضروری ہے - اول الذکر کا یہ شعر بڑا فکر انگیز ہے :

در کجا ہنگامۂ عالم بود　　　رحمة للعالمینے ہم بود

مثنوی 'ابر گہر بار' میں میرزا غالب روحانی کمالات کے لئے عقل و بینش کو ضروری قرار دیتے ہیں -

اب ہم پاکستان و ہند کے اپنے علاقائی موضوعات سے متعلق مثنویوں کا ذکر کریں گے - ان میں مقامی روایات اور مقامی مناظر شعراء کی طبائع پر الہامی کیفیت طاری کرتے نظر آتے ہیں - ہماری فارسی شاعری میں یہ بڑا قابلِ تعریف اضافہ تھا اور واضح ہو جاتا ہے کہ اگر تاریخی انقلابات مانع نہ ہوتے اور یہاں فارسی شاعری کی اسی طرح نشو و نما جاری رہتی تو برِصغیر یقیناً ایران کا نظیر بن جاتا - ہیر رانجھا کی رومان شاہ فقیر اللہ آفرین ، احمد یار خان یکتا اور میر قمرالدین منت کے علاوہ سندھ میں عظیم تتوی (۱۷۹۹ء) ، ضیا تتوی (۱۸۰۰ء) ، آزاد (۱۸۱۱ء) ، ولی محمد لغاری (۱۸۱۲ء) اور فقیر قادر بخش بیدل (م - ۱۸۷۲ء) نے یکے بعد دیگرے نظم کی - ان پر فرداً فرداً بحث کا یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا - اس ڈیڑھ صدی میں سسی پنوں کی داستانِ عشق کی طرف سب سے پہلے محمد افضل سرخوش متوجہ ہوئے - ان کی مثنوی کا نام 'حسن و عشق' تھا مگر افسوس ہے وہ بھی ناپید ہے - ان کے بعد منشی جوت پرکاش (۱۶۲۲ء) نے 'دستورِ عشق' ، اندر جیت منشی (۱۷۲۷ء) نے 'نامۂ عشق' ، محمد حسین شہباز (۱۸۳۵ء) نے 'وقائع پنوں' اور فرح بخش فرحت (۱۸۴۰ء) نے 'سسی پنوں' ، کے عنوانات سے اس قصے کو فارسی نظم کا جامہ پہنایا - اندرجیت کی مثنوی زیادہ رنگین ہے مثلاً سسی کو پیدا ہوتے ہی صندوق میں ڈالے جانے کے متعلق کہا ہے :

پری در شیشۂ صندوق جا کرد　　　صدف را در نفس بحر آشنا کرد

میرزا صاحباں کی داستانِ عشق کو پہلے تسکین نے ۱۷۳۲ء میں 'شمع محافل' کے نام سے نادر تشبیہات اور استعارات کے ساتھ بصورت نظم پیش کیا - ان کے بعد خیر اللہ فدا نے میرزا صاحباں کے متعلق مثنوی زیادہ سلجھے انداز میں تصنیف کی اور خاتمۂ کتاب پر

لاہور کی تنوع سے معمور زندگی کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ۔ جھنگ اور صاحبان کے حسن کے متعلق کہتے ہیں :

نازنین دختران جھنگ سیال　　جرگۂ آہواند خیل غزال
دوش بر دوش چون خرام کنند　　سرو آزاد را غلام کنند
زانمیان دختری بجلوه گری　　چون در انجم ستارۂ سحری

اس داستان سے متعلق تیسری مثنوی میر نصیر خاں (م - ۱۸۰۵ء) نے لکھی جو تالپور خاندان کے تھے اور میر واجد علی شاہ نواب اودھ کی طرح کلکتہ میں قید رہے ۔ پنجاب کی رومان سوہنی و مہینوال کو صالح (۱۸۴۱ء) اور عطا محمد زیرک (۱۸۵۹ء) نے فارسی مثنوی کا جامہ رنگین پہنایا ۔ زیرک کی مثنویِ حسنِ اسلوب اور ندرت فکر کے لحاظ سے بڑی قابلِ قدر ہے جو انہوں نے مثنوی معنوی کے اتباع میں لکھی ۔

مقامی موضوعات سے متعلق مثنویوں کے علاوہ 'روحِ وطن' ایک اور رنگ میں بیغم بیراگی (و - ۱۷۱۹ء) کی مثنوی میں بھی کارفرما نظر آتی ہے ۔ اندازِ بیان ، حکایت سے اخذِ نتائج اور تصوف اور فلسفے کی آمیزش بالکل رومی کی طرح ہے ۔ مگر بیغم کا اصل مقصد اسلامی تصوف اور ویدانت میں مطابقت[1] پیدا کرنا تھا اور یہ وہ کام ہے جس کا آغاز 'مجمع البحرین' کی تصنیف سے دارا شکوہ نے کیا تھا ۔ یہ ہندویت کی قدیم روح تھی جو برِ صغیر میں آنے والی دوسری اقوام کی انفرادیت کو ختم کرکے ہمیشہ ہندو معاشرے میں جذب کرتی رہی ہے ۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونا ہو تو بیغم کا وہ پند پڑھا جائے جو انہوں نے 'دہر' کے متعلق لکھا ۔ رسول کریمؐ نے بیشک 'لا تسبو الدهر' فرمایا تھا ، مگر اسلام نے دہریت کی تلقین نہیں کی ۔ ادھر بیغم کہتے ہیں :

پای بوس دہریان کن اے پسر　　خاک پای دہریان شو سر بسر

بحمد اللہ مسلمانوں نے بیغم کی تعلیمات کی طرف توجہ نہ دی اور توحید خالص پر عمل پیرا رہ کر اپنی علیحدہ ملت کے قیام و بقا کا وہ عمل جاری رکھا جو یہاں عربوں کے ورود سے شروع ہوا تھا ۔

---

(۱) مخطوطہ مثنوی بیغم بیراگی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، نیز ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۲۹۰ تا ۳۲۱ ۔

اب ہم واقعاتی مثنویوں کا ذکر بدستور مجملاً کرتے ہیں ۔ نعمت خان عالی (م - ۱۷۱۵ء) کی تصنیف 'حسن و عشق' کا موضوع واقعاتی ہے مگر چونکہ نثر میں ہے ، ہم اس کی مختصر مثنوی کا ایک شعر درج کرتے ہیں جو نواب زیب النساء بیگم کی خرگاہ کے متعلق ہے ۔ شہزادی کی تعریف میں عجیب لطافت خیال کے ساتھ کہا ہے :

صفاتش چون صفات کردگار است　　　که خود پنہان و لطفش آشکار است

واقعاتی نقطۂ نگاہ سے مثنوی 'والہ و سلطان'[۱] سب سے اہم ہے جو تین ہزار سے زائد اشعار میں میر شمس الدین فقیر نے بڑی درد مندی کے ساتھ ۱۷۴۶ء میں لکھی ۔ اسلوب میں تازگی ، برجستگی اور اثر انگیزی ہے ۔ میر صاحب احتشام پر بجا طور پر کہتے ہیں کہ اگر نظامی ، خسرو اور جامی زندہ ہوتے تو داد دیتے ۔ ضمناً ہندوستان کے مرجع فضل ہونے کا ذکر کیا ہے اور دہلی کے متعلق فرماتے ہیں :

دہلی کہ بہار روزگار است　　　از باغ بہشت یادگار است

اس میں والہ اور خدیجہ کے بچپنے سے لے کر آخر تک واقعات زندگی ، شاعرانہ محاسن کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں ۔ مختلف المناک حوادث کے بعد خدیجہ سلطان نے ایران سے والہ کو خط لکھا :

جز یاد تو نیست پیشۂ دل　　　زین بادہ پر است شیشۂ دل
عہدیکہ نخست با تو بستم　　　آن عہد بجاست تا کہ ہستم

میر صاحب نے والہ کی طرف سے اسی قسم کے ۱۹۷ شعروں میں جواب لکھا ہے جو مغالطے کی بنا پر دیوان والہ کے قلمی نسخے میں والہ کی تخلیق کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے ۔ اس جواب کے بعد میر صاحب دفعۃً مثنوی ختم کر دیتے ہیں ۔ اگر میر صاحب اس میں خدیجہ کی ایران سے روانگی اور کربلا میں اچانک وفات کا ذکر بھی خیال انگیز طریقے سے کر دیتے تو بہ صحیح معنوں میں بڑی شاندار المیہ مثنوی بن جاتی ۔

عبدالحکیم حاکم نے بھی اپنے سفر حج کے متعلق ۱۷۶۱ء میں واقعاتی مثنوی لکھی ۔ یہ مختصر ہے مگر جذبات محبت و عقیدت نے اسے روح پرور بنا دیا ہے ۔ گنبد خضرا کے

---

(۱) مثنوی والہ و سلطان ۔ مخطوطہ محفوظ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔
(۱) تذکرۂ مردم دیدہ ، ص ۳ تا ۱۳ ۔

دروازے کے متعلق کہتے ہیں :

درِ روضۂ پاک شاہ رسلؐ حبیب خدا مرجعِ جزو و کل
منور بانوارِ قدس آمدہ مزیّن باسرار قدس آمدہ

ایک ہزار اشعار پر مشتمل ایک اور واقعاتی مثنوی فضل عظیم کی 'شمع شبستان' ہے جو ۱۸۲۹ء میں تصنیف ہوئی اور مطبع مصطفائی دہلی سے ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی - یہ خیر آباد کی ایک حسینہ نورتن کی داستان عشق ہے - چونکہ ہندی ازاد حسینہ ہے ، پان کھاتی ہے اور رقص و سرود میں مہارت رکھتی ہے - اسلوبِ بیان میں صنائع کا اور استعارے کا استعمال نمایاں ہے :

دوید از خاطرم بیخواست بیرون بہ استقبال مضمون لفظ موزون

اس کے بعد ہم تاریخی مثنویوں کا ذکر کر کے اس عنوان کو ختم کرتے ہیں - 'سکھراج سبقت' نے سات سو اشعار پر مشتمل مثنوی 'جنگ نامہ' شاہنامۂ فردوسی کی بحر میں لکھی - اس میں امیر الامراء حسین علی خان اور داؤد خان پنی کی جنگ کا ذکر ہے جو ۱۲-۱۷۱۶ء/۱۱۲۹ھ میں ہوئی - شعر ملاحظہ ہوں :

در اقلیم و آفاق افتاد شور کہ خورشید بر ظلمت آورد زور
سپاہ از شمار کواکب فزون چو مریخ تیغ آب دادہ بخون

دوسری تاریخی مثنوی میر صوبیدار کا 'فتح نامہ' ہے جس میں کاھوڑوں کی شکست اور تالپوروں کی فتح کا ذکر کیا گیا ہے - بحر 'شاہنامے' والی ہے - ۱۸۳۸ء میں تصنیف ہوئی - میر فتح علی خان کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے :

سپہدار گردن کش و نامدار ببر افگن و نامدار سوار

ایک مثنوی واجد علی شاہ اختر کی مثنوی 'مباحثہ بین النفس و العقل' ہے جو کلکتے سے ۱۸۷۴ء میں طبع ہوئی - قید میں لکھی گئی اور 'شاہنامے' کی بحر میں ہے - ویسے تو نفس اور عقل کے درمیان مباحثے ہیں مگر ضمناً واجد علی شاہ نے اپنے اور اپنے والد اور والدہ کے حالات بیان کئے ہیں - اس طرح یہ مثنوی سوانحی مثنوی بن گئی ہے - اپنی

سلطنت کی بحالی کے لئے دعا مانگتے ہوئے کہا ہے :

رخ بے زری را زمن دور کن | بہ طبل و علم نام مشہور کن
بہ تاج و نگین مشتہر کن مرا | بدہ چتر سر را جہاں ہما

اس دور میں رباعی گوئی

اس دور میں رباعیات کا بھی وافر سرمایہ ہے لیکن ہم صرف چند شعراء کی رباعیات کا ذکر کر سکیں گے ۔ میرزا بیدل نے ساڑھے تین ہزار سے زائد رباعیات چھوڑی ہیں اور ان میں انہوں نے اسرار تصوف کے علاوہ کائنات ، انسان اور زمان کے متعلق وہ گہرے افکار بیان کئے ہیں جو ہمیشہ سے ذہن انسانی میں الجھن پیدا کرتے رہے ہیں ۔ اپنے زمانے کے واقعات کے متعلق بھی رباعیات ہیں ۔ فرخ سیر کے قتل ہونے پر انہوں نے جو رباعی کہی وہ ہر صاحب علم جانتا ہے ۔ ہم یہاں آن کی ایک حکیمانہ رباعی درج کرتے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ فکر و عمل کی بلندیوں کے باوجود انسان زمینی مخلوق رہتا ہے :

ہر چند بہ چرخ گردن افراشتہ ایم | دامان زمین زدست نگذاشتہ ایم
مانند نہالے کہ ببالد از تخم | خود را بسر آبلہ برداشتہ ایم

فقیر اللہ آفرین (م - ۱۷۴۱ء) نے بھی رباعیات کہی ہیں جن کا موضوع تصوف ہے ۔ شیخ محمد علی حزین (م - ۱۷۶۶ء) کی رباعیات ڈھائی سو کے قریب ہیں ۔ ان کا موضوع بھی حکمت و تصوف ہے ۔ نورالعین واقف لاہوری (م - ۱۷۷۶ء) نے بھی دو سو سے زائد رباعیات کہیں مگر ان میں زیادہ عمق نہیں ۔ ان میں سوانحی اور واقعاتی رباعیات خاصی ہیں ۔ اس عہد کے پرآشوب حالات کی طرف ذیل کی رباعی میں اشارہ کیا ہے :

ای در قدمت امن و امان زود بیا | ای جان جہان بجہان زود بیا
دجال وشان فتنہ برانگیختہ اند | ای مہدی آخرالزمان زود بیا

احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد ہر بار پنجاب میں سکھوں کی وجہ سے جو تباہ کاری ہوتی تھی ، غالباً اسی کا ذکر ہے ۔

میرزا بیدل کے بعد میر درد (م - ۱۷۸۴ء) کی رباعیات صحیح معنوں میں عظمتِ فکر کا مظہر ہیں اور بڑی مقبول رہی ہیں ۔ میر صاحب کی طبیعت پر توحید کا غلبہ تھا ۔ اس

لئے ان کے مطالب زیادہ تر اسی محور کے گرد گھومتے ہیں ۔ ان کے سامنے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو لوٹا اور پھر یہ شہر افغانوں اور مرہٹوں کی رزمگاہ بنا رہا ۔ نجف خان (م ۔ ۱۷۸۲ء) نے بےشک مغلیہ سلطنت کو سنبھالا دیا ، مگر دہلی کی سابقہ شہنشاہی شان و شوکت بحال نہ ہو سکی اور میر صاحب نے بصد آہ و زاری کہا :

دہلی کہ خراب کردہ اکنون دہرش　　جاری شدہ اشکہا بجای نہرش
بودست ین شہر مثل روی خوبان　　چون خط بتان بود سواد شہرس

اس صنف شعر کے آخری قابل ذکر شاعر میرزا غالب ہیں ۔ ان کی رباعیاں تعداد میں زیادہ نہیں لیکن نغز گوئی کا عمدہ نمونہ ہیں ۔ ان میں انسانی زندگی کے مسائل اچھوتے انداز سے اور حکیمانہ بصیرت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ۔ واقعاتی رباعیاں بھی ہیں اور احباب کی وفات پر بھی میرزا نے رباعیات کہیں ۔ مثلاً ۱۸۵۲ء میں حکیم مومن خان مومن کی وفات پر یہ رباعی :

شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر　　خوننابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن　　چون کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

مخمسات و مقطعات

ان دونوں اصناف کا حجم میرزا بیدل کے ہاں زیادہ ہے ۔ ان کی مخمسات میں روانی ہے ۔ بیان ویسے سادہ اور پرتاثیر ہے مگر جب افکار کی رفعت جذبے میں شدت پیدا کرتی ہے تو اس میں جلال اور شکوہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ یہ حال ان کے دو شہر آشوب مخمسات کا ہے ۔ ان کے عام جذبات و افکار متصوفانہ ہیں ، مگر ان دو مخمسات میں انہوں نے مغل معاشرے اور اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں کے حالات پر تبصرہ کیا ہے ۔ ان کے ہجوم اسپ و فیل ، قصر و طاق زرنگار ، شکوہ و جاہ باطل اور ان کی بے تمیزی اور نابکاری کو دیکھ کر کہا ہے :

دور بے غیرت ندارد امتداد سال و ماہ

آفرین لاہوری نے بھی چودہ مخمسات کہی ہیں جن میں حسن بیان اور تازگیٔ جذبات ہے ۔ تیرہ میں نو اساتذہ کی غزلیات پر تضمین کی ہے اور ایک اپنی تخلیق ہے ۔ ان میں مجاز و حقیقت دونوں کا ذکر ہے ۔ میر درد نے بھی پانچ مخمسات تصنیف کیں ، جن کا موضو

خالصتاً تصوف ہے ۔ محسن تتوی (م - ۱۷۵۹ء) کو بھی اس صنف میں کمال حاصل تھا ۔ ان کی مخمسات[1] میں حوس ہے :

سید و سرور بگو کیست بغیر از علیؑ — جان پیمبر بگو کیست بغیر از علیؑ
صاحب منبر بگو کیست بغیر از علیؑ — خواجۂ قنبر بگو کیست بغیر از علیؑ
ساقیٔ کوثر بگو کیست بغیر از علیؑ

مقطعات میں اکابر و امراء اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کا ذکر ہوتا ہے ۔ تاریخ نکالنے کے لئے بھی مقطعات لکھے جاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ اپنے عہد کی تاریخ کا قابل اعتماد ماخذ ہوتے ہیں ۔ اس عہد کے اختتام پر مومن خان مومن اور اسد اللہ خان غالب مقطعات لکھتے نظر آتے ہیں ۔ صرف ان کے عنوانات پر نگاہ دوڑائی جائے تو مومن و غالب کا زمانہ نگاہوں کے سامنے موجود ہو جاتا ہے ۔ مرزا غالب کا ذوق کی ہم چشمی کے متعلق جو قطعہ ہے اس کا مندرجہ ذیل شعر کسی غالب شناس کو نہیں بھول سکتا :

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

محمد علی حزین مقطعات میں بھی اپنی ذات کو مرکز قرار دیتے ہیں اور ایک جگہ تو برملا کہتے ہیں :

لائق مدح در زمانہ چو نیست — خویشتن را ہمی سپاس کنم

اس دور کے آغاز کی طرف نظر اٹھا کر وقائع حیدر آباد میں نعمت خان عالی کے معنی خیز مقطعات کو دیکھ لینا چاہیے جن سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی افواج کا انضباط اور اعتماد نفس (morale) کمزور پڑ گیا تھا ۔ مرہٹوں نے ایک مغل سردار فوج کو گرفتار کیا ، اس کی حالت نعمت خان عالی اس طرح بیان کرتے ہیں :

سر فوج چو شد اسیر می گفت — از علم لغت ہر چہ بد یاد
یا لیت برائے آرزو ہاست — ای کاشکہ مادرم نمی زاد

شاعری کے دبستان

دبستان لاہور

اس دبستان کے مؤسس ابو عبداللہ روز بہ نکتی ، ابو الفرج رونی اور مسعود سعد سلمان

ہیں جو غزلوی دور میں ہو گزرے ہیں ۔ ابو البرکات منیر لاہوری (م ۔ ۱۶۴۵ء) اور مولانا محمد اکرم غنیمت کنجاہی (م ۔ ۱۶۸۸ء) نے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا ۔ زیر تبصرہ دور میں نواب احمد یار خان یکتا (م ۔ ۱۷۴۳ء) ، میر محمد علی رائج سیالکوٹی (م ۔ ۱۷۳۷ء) آفرین لاہوری (م ۔ ۱۷۴۱ء) اور نورالعین واقف نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ۔ احمد یار خان یکتا کی نظم 'ہیر و رانجھا' کا اتباع سندھ میں ہوا اور اس موضوع پر کئی مثنویات لکھی گئیں ۔ نواب صاحب کا پنجاب کے متعلق قطعہ بڑا زور دار ہے ۔ مطلع ہے :

سر زمینی کہ عشق را باب است   کشورِ حسن خیز پنجاب است

مثنوی کے اسی بند میں لاہور کے متعلق ہے :

لیک لاہور مصر محبوبیست   یوسفستانِ عالم خوبیست

دبستانِ کشمیر

یہاں کے اولین والا فطرت شاعر غنی کشمیری (م ۔ ۱۶۶۹ء) ہیں ۔ ان کے بعد میرزا داراب جویا (م ۔ ۱۷۰۶ء) نے اس دستان کو فروغ دیا ۔ عبدالغنی بیگ قبول ، ملا ساطع اور گرامی کشمیری اس دور میں اس دبستان کی شہرت میں اضافہ کرتے ہیں ۔ زیرک کشمیری نے شیخ محمد علی حزین کی ہجو کشمیر کا جواب دے کر ثابت کر دیا کہ اہل کشمیر بڑے حساس واقع ہوئے ہیں ۔ دو شعر سنیے :

بے حیا آب نہ در چشم و نہ بر رو دارد   خاک او ساخت مخمر پی خجلت رب
کیست در شیطنت ای شیخ بگواستادت   کہ عزازیل بود پیش تو طفل مکتب

دبستانِ سندھ[1]

اٹھارھویں صدی عیسوی سندھ میں فارسی شاعری کا سنہری دور کہلاتی ہے ۔ محسن تتوی (م ۔ ۱۷۵۰ء) مثنوی ، قصیدہ اور غزل میں صاحبِ کمال تھے ۔ ان کا یہ شعر زبان زدِ خلائق ہے :

چند بیخواب پی بستر سنجاب شویم   دست ما بالش ما ، پہلوی ما بستر ما

ان کے بعد میر حیدر الدین ابو تراب کامل ، سید میر جان محمد ، جان اللہ شاہ سر اور

---

(۱) سدا رنگانی ، شعرائے سندھ (انگریزی) ۔

علی شیر قانع تتوی ہیں ۔ یہاں اخلاق اور تصوف کی شاعری اس صدی میں کمال کو پہنچی ۔ عظیم تتوی اور ضیاء تتوی نے ہیر رانجھا کی داستان نظم کی ۔ انیسویں صدی عیسوی میں میر کرم علی خان کرم ، غلام علی مائل اور محمد عارف صنعت نے شہرت پائی ۔

دبستانِ بنگال

بدایونی بنگال کے پہلے فارسی گو شاعر شمس الدین دبیر کا ذکر کرتے ہیں جو امیر خسرو کے معاصر تھے ۔ مغلیہ دور میں ابو البرکات منیری (م ۔ ۱۶۴۴ء) کی مثنوی ''در صفتِ بنگالہ'' لکھی گئی ۔ اٹھارھویں صدی میں بنگال میں صوفیانہ شاعری کو فروغ حاصل ہوا ۔ اس صدی کے آغاز میں مرشد آباد مرکزِ حکومت قرار پایا جو جلد فارسی ادب کا گہوارہ بن گیا اور اقدس ، مخمور اور برق فارسی گو شاعر پیدا ہوئے ۔ ایک شاعر حسن (م ۔ ۱۸۲۳ء) بھی ہیں جن کا دیوان ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ۔ انیسویں صدی کے دیگر شعرائے فارسی نساخ ، عبدی اور آزاد جہانگیر نگری ہیں ۔ آزاد نے ڈھاکہ کی تعریف میں کئی قطعات کہے ہیں ۔

شعری مسالک جن کا اس عہد میں تتبع ہوا

ہند و بیرون ہند کے کئی شعری مسلک اس دور میں ہمارے شعراء کو ورثے کے طور پر ملے اور مختلف اصناف سخن میں وہ ان کا اتباع کرتے رہے ۔ میرزا بیدل نے سعدی ، حافظ ، امیر خسرو ، سنائی ، رومی ، خاقانی ، ظہوری اور صائب کا خصوصیت کے ساتھ تتبع کیا ۔ محمد علی حزیں زیادہ تر حافظ اور سعدی کا پیروکار تھا ۔ دور عالمگیری میں خیال آفرینی کا رواج رہا ۔ اس کے اثرات بعد میں بھی نظر آتے ہیں ۔ فغانی شیرازی کا اتباع خان آرزو ، میر شمس الدین فقیر ، والہ داغستانی اور حاکم لاہوری نے کیا ۔ جلال اسیر کی پیروی نظام خان معجز ، محسن تتوی اور میرزا محمد بیرنگ نے کی ۔ ناصر علی کی طرز شاہ آفرین اور محمد صالح آشفتہ کو پسند تھی ۔ خان آرزو نے فغانی کے علاوہ سنائی ، بیدل اور زلالی خوانساری کو بھی مشق سخن کے لئے نمونہ قرار دیا ۔ اگرچہ خان آرزو نے

(۱) بدایونی ، منتخب التواریخ (ترجمہ اُردو) ، ص ۷۷ ۔ شمع انجمن ، ص ، ۳۴ ، ۴۴۴ ۔ صبح گلشن ، ص ، ۵۹ ۔ ثقافت پاکستان ، ص ۸ ۲ ۔

سبک ہندی کی ان خصوصیات کو فروغ دینے کی کوشش کی جو دور عالمگیری میں رائج تھیں اور حاکم لاہوری اور نورالعین واقف نے کسی حد تک ان کو اختیار بھی کیا مگر حزین کی پر زور مخالفت نے طبائع کا رخ سادہ اور بے تکلف انداز بیان کی طرف پھیر دیا جس کی بہترین مثال شاہ عالم آفتاب ہیں ۔ قزلباش خان امید ایرانی الاصل تھے ۔ وہیں تعلیم پائی اس نئے طاہر وحید اور سلمان ساوجی کا تتبع کرتے رہے ۔

اس دور کے اختتام پر میرزا غالب نے شعر گوئی کا آغاز طرز بیدل سے کیا لیکن مخالفت دیکھ کر انہوں نے حزین کی راہ اختیار کر لی اور عرفی ، ظہوری ، نظیری اور طالب کے انداز میں قصیدہ اور غزل لکھتے رہے ۔

اس دور کا شاعرانہ اسلوب ، زبان اور علامتیں

اس دور کے شعراء تازہ گوئی کی روایت کے وارث تھے ۔ انہوں نے کم و بیش معنی آفرینی ، خیال بافی اور حسن پروری کے رجحانات قائم رکھے ۔ صاف اور صریح اسلوب کی طرف بھی توجہ ہوئی ۔ البتہ کتابی زبان کی پیروی زیادہ کی گئی ۔ ایرانی محاورے سے بعد ہوا اور استعمال ہند کی طرف رغبت بڑھی ۔ مثلاً میر کرم علی خان (م - ۱۸۲۲ء) کے مندرجہ ذیل شعر میں لفظ برسات دیکھا جائے :

صید آہو بموسم برسات — از ہمہ صید و ہر شکار خوش است

رعایت لفظی اور ایہام کا رواج بڑھ گیا ، اغلاق اور تکلف کو کمال سخن سمجھا جانے لگا ، استعارہ بندی پر زور دیا گیا ۔ اس کے باوجود یہ بھی درست ہے کہ بیدل اور غالب ایسے با کمال شعراء نے ترکیب سازی سے ثروت زبان میں اضافہ کیا ۔ یہ ایک دور تھا جو اپنے مخصوص اسالیب کے ساتھ ختم ہوگیا ۔

میرزا بیدل نے موج و بحر ، حباب و آئینہ اور طاؤس کے استعاروں کو خاص مطالب بیان کرنے کے لیے استعمال کیا ۔ مثلاً دیگر معانی کے علاوہ حباب ان کے ہاں کھوکھلے مغل معاشرے کی علامت بھی ہے :

جہان بہ شہرت اقبال پوچ می بالد — تو ہم بہ گنبدگردون رسان پیام حباب

دوسرے شعراء نے بھی ان استعاروں کو برتا ۔ مثلاً میرزا غالب آغاز شباب میں لفظ طاؤس سے خاص رغبت کا اظہار کرتے ہیں ۔ گویا حسن طاؤس نوجوان غالب کا اپنا حسن ہے ۔

تصویر کا استعارہ بھی مختلف مطالب بیان کرتا ہؤا نظر آتا ہے۔ حالاتِ زمانہ نے تصویر کی طرح خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا ۔ غور فرمائیے :

طوطی خاموش تصویرم امید | حرف ہا دارم کہ کس نشنیدہ است
(قزلباش خان امید)

ساز تصویرم بود در پردہ عاجز نالیم | نالہ ای دارم کہ گوش ہیچکس نشنیدہ است
(واقف لاہوری)

'درد' چون طنبور تصویریم دائم بی صدا | خامشیہا زمزمہ برداز تار ساز ماست
(میر درد)

دل پژمردہ ہو چکے تھے ، طبائع پر وحشت و اندوہ کا اثر طاری تھا ، ہجوم آلام کی وجہ سے یاس و بیکسی کا عالم تھا ، ہر طرف آزار ہی آزار کی کیفیت نظر آتی تھی ۔ ان مطالب کو بھی تصویر کی علامت سے بیان کیا گیا ہے :

با مردہ دلان حرف محبت نتوان زد | در گلشن تصویر صبا را چہ کند کس
(میر روہڑی ، سندھ)

رنگ وحشت ہردم از خاطر برانگیزد غبار | می کشد ازبس جنون برلوحِ دل تصویردشت
(میر درد)

شود بہ وحشت حالم گر آشنا تصویر | چو گردِ چہرہ ز کاغذ جدا شود تصویر
(آفرین لاہوری)

نہ از آب رخ نقاش تحریر مثالم کن | ز اشک یاس وگردِ بیکسی تصویرحالم کن
(آفرین لاہوری)

بس کہ در ہر صورت آزار است دامنگیر ما | بستر بیار گردد صفحہ ی تصویر ما
(واقف لاہوری)

از شگفتنہا چہ می پرسی من دلگیر را | خندہ می آید بحالم غنچہ‌ی تصویر را
(واقف لاہوری)

ظاہر ہے تصویر کا لفظ اس دور میں بامعنی علامت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ حیرت اور انفعال کا زمانہ تھا اور تصویر ان تمام صفات کی حامل ہوتی ہے ۔

سیاسی تغیرات ، اخلاقی بحران ، اخلاقی اقدار کے تنزل اور معاشی حالات کا اظہار

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد حالات بتدریج روبہ تنزل رہے ۔ مغل شہنشاہوں کا وقار قائم رہا اور بعض امراء مثلاً نظام الملک اور نجف خان بڑے باجبروت تھے مگر آہستہ آہستہ مغل سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی ، اس لیے قدرتی طور پر معاشی اور اخلاق لحاظ سے معاسرے کی حالت میں بھی زوال رونما ہوا ۔ اس کا اظہار اشعار میں ہوا ۔ سطور بالا میں لفظ تصویر بھی معنویت لے کر ابھرا ہے ۔ مختلف شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے اس بات کو بھی مدنظر رکھا ہے کہ جہاں جہاں زمانے کی عکاسی ہوئی ہے اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے ۔ اس ضمن میں میر جعفر زٹلی کی ہزل گوئی ، نعمت خان عالی کی تضحیک روزگار اور میرزا بیدل کا اپنے معاشرے کے متعلق غم و غصہ اس المناک بحران کی علامتیں ہیں جس سے مغل معاشرہ دوچار ہو چکا تھا ۔ اس لحاظ سے شاہ عالم آفتاب کا کلام بھی بڑی معلومات بہم پہنچاتا ہے ۔ مثلاً جوانمردی کے فقدان کا رونا رویا ہے :

زن سیرتان ز حوصلہ لافند تا بکی ساقی کجاست ساغر مرد آزمائی تو

اگرچہ شاہ ولی اللہ (م - ۱۷۶۲ء) ، ان کے خاندان اور دیگر بہی خواہان ملت کی وجہ سے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر متحرک ہو چکی تھی مگر راہ نجات ابھی کہیں نظر نہیں آتی تھی ، اسی لئے شاہ عالم آفتاب نے عالم مایوسی میں کہا :

شد سیہ روی زمین از ظلمت کفر و نفاق آفتاب دین پاک احمدؐ مختار کو
تا درین ہنگامہ امداد مسلمانان کند قاتل کفار یعنی حیدر کرارؓ کو

یہ والا فطرت شہنشاہ حالات زمانہ کی وجہ سے بےبس ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اسلامیان ہند اور دین اسلام کے لئے اس کے دل میں زندگی بخش تڑپ موجود تھی ۔

(ب) ۔ میرزا اسد اللہ خان غالب

میرزا غالب کا پایہ ان عظیم القدر ایرانی شعراء سے ہرگز کم نہیں جو شاہنشاہ اکبر کے عہد سے وقتاً فوقتاً پاک و ہند آتے رہے اور یہاں پہنچ کر انھوں نے فارسی کے ایسے شہ پارے پیش کئے جن کی مثال صدیوں تک ایران میں بھی نہیں ملتی ۔ آپ اُن شاعروں میں سے تھے جن کی حیثیت معیار اور میزان کی ہوتی ہے ۔ جن سے گذرے ہوؤں کی متاع ادب

کا وزن کیا جاتا ہے اور آنے والے اپنے درجات کا صحیح اندازہ کر لیتے ہیں ۔ جس طرح قاآنی نے ایرانی شاعری میں انقلاب پیدا کیا تھا ، اسی طرح میرزا نے پاک و ہند کی فارسی شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں کہ :

''اگرچہ ایران کے انقلاب (یعنی قاآنی کی وجہ سے) کی خبر ہندوستانیوں کو نہ تھی ، لیکن خود بخود یہاں بھی انقلاب ہوا ۔ یعنی شاعروں کا مذاق ، جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سینکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا ، درست ہو چلا ۔ میرزا غالب نے فارسی شاعری کا انداز بالکل بدل دیا ۔ ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے لیکن عرفی ، طالب ، نظیری ، کلیم کی پیروی نے انھیں سنبھالا[1] ۔''

فارسی شاعری میں انقلاب کے علاوہ میرزا غالب کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اردو شاعری کو بالکل نیا اسلوب ، نئی زبان ، نئی تراکیب اور نئے افکار دئے ۔ اس وجہ سے ہر دائرۂ فکر و نظر کے حقائق کو شعروں میں ادا کرنے کی جو طبعی صلاحیتیں اردو زبان میں تھیں ، وہ مبرہن و آشکارا ہو گئیں ۔ پھر ان کی فکری ندرت کاریوں اور معجز نمائیوں میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں ، جن کی مثالیں پاک و ہند اور ایران کی سابقہ فارسی شاعری میں بہت کم ملتی ہیں اور بے شمار چیزیں ایسی بھی ہیں ، جن کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ خاصا وقت گزر جانے کے بعد ہمارے دور میں ہو سکا ۔ کیونکہ ان کا اسلوب فکر و نظر مزید ارتقا اور تجربات کی مزید وسعت کا متقاضی تھا ۔

میرزا کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے نظم و نثر کی ہر صنف سے کام لیا اور ہر صنف میں ان کا پایہ سب سے برتر نہیں تو کسی سے کمتر بھی نہ رہا ۔ فارسی اور اردو شاعری میں تو شاید بعض لوگ کچھ چیزیں ایسی کہہ بھی سکے ہوں ، جو میرزا کے کلام سے ملتی جلتی ہیں ، خواہ جزواً ہی سہی ، لیکن اردو خطوط نگاری پر تو ایک سو سال گزر جانے کے بعد بھی اب تک کوئی ایسا مجموعہ بروئے کار نہیں آیا ، جسے ''اردوی معلٰی'' اور ''عود ہندی'' سے کچھ بھی مناسبت ہو ۔ حالانکہ میرزا کے بعد مشاہیر ادب اردو کے درخشاں ستاروں کا پورا حلقہ ان سو برسوں میں جلوہ افروز ہو چکا ہے ۔

---

(۱) شعر العجم ، حصہ پنجم ، ص ۲۱ ۔

میرزا کے ان تمام کمالات کا اعتراف اہل عالم نے ۱۹۶۹ء میں آن کی صد سالہ برسی منا نر کیا - یہ تقریبات عالمی پیمانے پر منائی گئیں اور میرزا کے متعلق نظیری کا یہ قول حرفاً حرفاً درست ثابت ہؤا :

مشتری گو ردکن و دلاّل گو دریا فگن   جنس گر خوب است خواہد کرد پیدا قیمتے

خاندانی حالات

میرزا غالب نسباً سلجوق و افراسیابی ہونے کے مدعی ہیں - ان کے دادا میرزا قوقان بیگ خان مغلوں کے آخری دور میں سمرقند سے پاک و ہند آئے - ان کی شادی دہلی میں ہوئی تھی اور کئی اولادیں تھیں - بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی - ہمیں ان میں سے صرف دو بیٹوں کے نام معلوم ہیں ؛ ایک عبداللہ بیگ خان جو میرزا غالب کے والد ماجد تھے ، دوم نصراللہ بیگ خاں ، جنھوں نے بڑے بھائی کی وفات کے بعد اس کے بچوں کو اپنی آغوش عاطفت میں لے لیا تھا -

عبداللہ بیگ خان کی شادی آگرے کے رئیس خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی - خان نے کچھ عرصہ اودھ میں گزارا ، پھر حیدر آباد دکن جا کر میر نظام علی خان (نظام الملک دوم) کی فوج میں شامل ہو گئے - یہ ملازمت جاتی رہی تو عبداللہ بیگ خان آگرے چلے آئے - پھر وہ ریاست الور میں ملازم ہو گئے - وہاں ایک لڑائی میں مارے گئے (۱۸۰۲ء) - میرزا اس زمانے میں پانچ سال کے تھے - ان کی بعض تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست الور سے عبداللہ بیگ خان کے بچوں کے لئے دو گاؤں مقرر ہو گئے تھے - عبداللہ بیگ خان کے تین بچے تھے ؛ ایک بیٹی جو سب سے بڑی تھی اور چھوٹی خانم مشہور تھی ، اصل نام غالباً 'ور ہوگا - دوسرے میرزا اسد اللہ خان غالب عرف میرزا نوشہ - تیسرے یوسف خان جن کی عمر کا بیشتر حصہ دیوانگی میں گزرا اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں بمقام دہلی انتقال ہوا - ساٹھ سال کی عمر پائی -

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، نصراللہ بیگ خان نے بھتیجی اور بھتیجوں کو آغوش محبت میں لے لیا - وہ مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے صوبیدار مقرر ہو گئے تھے - جب مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑی تو انگریز جرنیل لارڈ لیک علی گڑھ کو فتح کرتا ہوا دہلی پہنچ گیا (۱۴ ستمبر ۱۸۰۳ء) - پھر دس روز کے محاصرے کے بعد

۱۸ اکتوبر ۱۸۰۳ء کو آگرہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا ۔ قیاس یہ ہے کہ نصراللہ بیگ خاں نے نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کی وساطت سے حراسگی سول کر لی ہوگی ۔ لارڈ لیک نے نصراللہ بیگ خان کو چار سو سواروں کا برگیڈیر مقرر کر دیا ۔ پھر خان نے سونک اور سونسا کے علاقے مرہٹوں سے بہ زور چھین لئے[۱] ۔ لارڈ لیک نے یہ علاقے نصراللہ بیگ خان کو تا حیات جاگیر میں دے دئے ۔ میرزا کے خاندان کا یہ انتہائی عروج تھا لیکن زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا ۔ ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ خان ہاتھی پر سیر کر رہے تھے کہ اچانک گر کر جان بحق ہو گئے ۔ نواب احمد بخش خان کی کوشش سے نصراللہ بیگ خان کے پس ماندگان کے لئے لارڈ لیک نے دس ہزار سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا (۴ ۔ مئی ۱۸۰۶ء) ۔

میرزا غالب

میرزا غالب (۲۷- دسمبر ۱۷۹۷ء) ۸- رجب ۱۲۱۲ھ کو آگرے میں پیدا ہوئے ۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی نواب احمد بخش خان کے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کی بڑی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی ۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں وہ مستقل طور پر آگرے سے دہلی منتقل ہوگئے ۔ باقی زندگی اسی شہرۂ آفاق شہر میں گزار دی جو سات آٹھ صدیوں کی اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا ۔

ایک مرتبہ پنشن کے سلسلے میں کلکتے کا سفر کیا جس میں کم و بیش دو سال صرف ہوئے ۔ پنشن کا جھگڑا نواب احمد بخش کی خود غرضی کے باعث پیدا ہوا ۔ اس نے دس ہزار کی بجائے میرزا غالب کی خاندانی پنشن پانچ ہزار روپے مقرر کرائی اور اس میں سے بھی دو ہزار روپے ایک شخص خواجہ حاجی کو دلوا دئے ۔ بھرت پور پر انگریزوں نے ۱۸۲۵ء میں جو حملہ کیا تھا اس میں غالب بھی احمد بخش خاں کے ساتھ گئے تھے ۔ پھر رام پور ، میرٹھ وغیرہ کے سوا کسی سفر کا ہمیں یقینی علم نہیں ۔ البتہ وہ ۱۸۵۳ء میں بہادر شاہ کے ساتھ حج کے لئے جانے کے بڑے آرزومند تھے ۔ حرم پاک کے علاوہ نجف اشرف جانے کا بھی بے حد شوق تھا ، جیسا کہ ان کی فارسی مثنوی ''ابر گہر بار'' سے اندازہ ہو سکتا ہے ۔ لکھنؤ میں بیٹھے ہوئے (بہ سلسلۂ سفرِ کلکتہ) بھی حرم پاک کے

---

(۱) بعد میں یہ علاقے ضلع متھرا میں شامل ہو گئے تھے ۔

علاوہ نجف اشرف کا ذکر کیا ہے :

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر　　　　عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

حالات اور واقعات

میرزا کی زندگی میں اور کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ۔ خاندانی پنشن انہیں برابر ملتی رہی ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بند ہوئی تھی لیکن تین سال کے بعد سارا روپیہ یک مشت مل گیا ۔ ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ نے انہیں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کے لئے پچاس روپے ماہوار پر مقرر کر لیا تھا ۔ حکیم احسن اللہ خان واقعات جمع کرکے لکھ دیتے تھے اور میرزا انہیں فارسی کا لباس پہنا دیتے تھے ۔ ہمایوں تک کے واقعات ''مہر نیمروز'' کے نام سے مکمل ہوگئے ۔ دوسرے حصے کا نام ''ماہ نیم ماہ'' رکھا تھا ۔ اس کی ابتدا ہی نہ ہو سکی ۔ نواب یوسف علی والیٔ رام پور نے ان کے لیے مستقل طور پر سو روپے ماہوار مقرر کر دئے تھے ۔ اس کے علاوہ بھی نواب ذاتی طور پر کچھ رقمیں بھیجتے رہتے تھے ، جنہیں میرزا ''فتوح'' قرار دیتے ہیں ۔ اور درباروں سے بھی کچھ نہ کچھ ملتا ہی رہا ۔ مثلاً ٹونک ، الور ، پٹیالہ وغیرہ ۔ لیکن میرزا کے خرچ کرنے کا طریقہ ایسا تھا کہ وہ عمر بھر قرض کی زنجیروں میں جکڑے رہے ۔ حسب بیان ''اکمل الاخبار'' ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء/۲ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو دوپہر ڈھلے اس خورشید اوج فضل و کمال کو زوال ہوا[1] اور الٰہی بخش خان معروف کے احاطے میں دفن ہوئے ۔

فارسی تعلیم اور بحث و نزاع

میرزا نے ابتدائی تعلیم آگرے کے ایک فاضل سے پائی ۔ پھر ایران کے پارسی نسل کا ایک نو مسلم فاضل ملا عبدالصمد آگرے پہنچا اور دو سال میرزا کے پاس ٹھہرا رہا[2] ۔ اس نے فارسی زبان کے وہ رموز و دقائق میرزا کے ذہن نشین کرا دئے جن کی تحصیل یہاں کی کسی درسگاہ یا کسی صاحب علم سے ممکن نہ تھی ۔ ملا عبدالصمد کی تعلیم و تربیت سے انہوں نے فارسی زبان میں بلند پایہ حاصل کر لیا تھا ۔ اس کی وجہ سے لسانی نزاع و کشمکش

---

(۱) ''اکمل الاخبار ، دہلی ۔

(۲) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرمزد عرف ملا عبدالصمد نے کچھ مدت میرزا کے ساتھ آگرہ میں گزاری اور کچھ مدت دہلی میں ۔

کے الجھیڑوں میں بھی آخری وقت تک پڑے رہے جو ''قاطع برہان'' کی اشاعت سے شروع ہو گئے تھے -

میرزا کی شاعری

میرزا کو فارسی شاعری سے فطری لگاؤ تھا - وہ خود لکھتے ہیں :

''شعر و سخن را به نهاد دمترین پیوند روحانی ست و خامه از بدو فطرت در گہر افشانی - در آغاز ریختہ گفتے و به اردو زبان غزل سرا بودے تا به پارسی زبان ذوق سخن یافتہ ، ازاں وادی عناں اندیشه برتافت -''[1]

دس گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے - پہلے اردو میں کہتے تھے - بارہ چودہ سال کے اردو اشعار کا جو مجموعہ ''نسخہٴ حمیدیہ'' اور ''نسخہٴ امروہہ'' کے ذریعے سے منظر عام پر آیا ، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور کے اردو کلام کا خاصا بڑا حصہ بھی فارسی سے زیادہ قریب ہے - تاہم اس دور میں بھی انہوں نے بعض بہترین غزلیں کہیں -

کلام کی عام حیثیت

اس کے بعد وہ فارسی کی طرف متوجہ ہوگئے ، یہاں تک کہ ابتدائی دور کے بعد انہیں اردو نہیں ، فارسی ہی کا شاعر سمجھا جاتا تھا - ۱۸۵۰ء میں قلعہٴ معلیٰ سے تعلق پیدا ہوا تو بہادر شاہ کی فرمایش پر اردو غزلیں بھی کہیں اور قصیدے بھی کہے - میرزا کے اردو کلام نظم و نثر کے مقابلے میں فارسی کلام نظم و نثر بہت زیادہ ہے - انہوں نے کہا تھا :

فارسی بین تا به بینی نقش ہاے رنگ رنگ   بگذر از مجموعہٴ اردو کہ بیرنگ من است

اردو ''بیرنگ'' تو یقینی نہیں ، بلکہ اس کی رنگ آرائیاں بھی سب سے نرالی اور انوکھی ہیں - تاہم فارسی کے ''نقشہائے رنگ رنگ'' کا معاملہ بالکل دوسرا ہے ، اگرچہ پاک و ہند میں میرزا کی شہرت کا مدار و انحصار زیادہ تر اردو شاعری اور نثر نگاری ہی پر ہے -

تصنیفات

۱- 'کلیات نظم فارسی' اس میں قطعات ، نوحہ جات ، مخمّس ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مثنویاں ، قصیدے ، غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں - غرض یہ کلیات ۱۸۶۱ء تک پورے فارسی کلام کا مجموعہ ہے - صرف حبسیہ اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا ،

---

(۱) کلیات نثر فارسی مکتوب به نام شمس الامرا حیدرآباد ، ص ۱۹۳ -

جو اس زمانے میں کہا گیا ہے ، جب میرزا ایک اتفاق سانحے کے باعث کچھ مدت کے لئے قید کر دئے گئے تھے ۔

۲. 'کلیات نثر فارسی' اس میں 'پنج آہنگ' ، 'مہر نیمروز' اور 'دستنبو' شامل ہیں ۔ 'پنج آہنگ' کا ایک حصہ میرزا کے فارسی خطوط پر مشتمل ہے ۔ ''دستنبو'' ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے ان احوال کا مرقع ہے جو میرزا کے علم میں آئے ہیں ۔

۳۔ 'قاطع برہان' یہ فارسی کی مشہور لغت 'برہان قاطع' کی بعض اصولی غلطیوں کا مرقع ہے اور اس پر ایسی رد و کد شروع ہوئی جس میں میرزا حیات مستعار کے آخری دور تک الجھے رہے ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بعض ترمیموں اور فوائد میں اضافوں کے ساتھ 'درفش کاویانی' کے نام سے چھپا تھا ۔

۴۔ 'سبد چین' کلیات کے بعد کے کہے ہوئے فارسی اشعار کا مجموعہ جو ۱۸٦۷ء میں چھپا ۔ اس میں حبسیہ بھی شامل تھا ۔

۵۔ 'باغ دودر' کلیات نظم و نثر کے بعد کی نظم و نثر کا مجموعہ جو سید وزیرالحسن عابدی نے اہتمام سے مرتب کرایا اور اس پر مفصل حواشی تحریر فرمائے ۔

٦۔ 'دیوان اُردو' ۔

۷۔ دیوان اُردو کا 'نسخۂ شیرانی' ۔

۸۔ دیوان اُردو کا 'نسخۂ حمیدیہ' ۔

۹۔ دیوان اُردو کا 'نسخۂ امروہہ' ، جس کے دو ایڈیشن چھپے ۔ ایک ہندوستان میں جو اصل نسخے کا عکس ہے مع حواشی ۔ دوسرا لاہور میں جس کے ایک صفحے پر نسخے کا عکس اور مقابل کے صفحے پر کتابت شدہ حصہ ہے ۔ یہ میرزا کے اردو کلام کا سب سے پہلا مجموعہ ہے ۔

۱۰۔ 'گل رعنا' فارسی اور اردو اشعار کا انتخاب جو میرزا نے کلکتہ میں کیا تھا (۱۸۲۸ء) ۔

۱۱۔ 'تیغ تیز' (اُردو) 'قاطع برہان' کے سلسلے کا ایک رسالہ ۔

۱۲- 'لطائف غیبی' (اردو) 'قاطع برہان' کے سلسلے کا ایک رسالہ ۔

۱۳- 'سوالات عبدالکریم' (اردو) 'قاطع برہان' کے سلسلے کا ایک رسالہ ۔

۱۴- 'نامۂ غالب' (اردو) 'قاطع برہان' کے سلسلے کا ایک رسالہ جو بعد میں 'عود ہندی' کے ساتھ شامل کر دیا گیا ۔

۱۵- 'عود ہندی' اردو مکاتیب کا پہلا مجموعہ جو میرزا کی وفات سے چار ماہ پیشتر چھپا ۔

۱۶- 'اردوی معلیٰ' اردو مکاتیب کا دوسرا مجموعہ جو میرزا کی وفات کے بعد چھپا ۔

۱۷- 'اردوی معلیٰ' حصہ اول و دوم ، جس میں مطبوعہ مکاتیب شامل تھے ۔ یہ خواجہ حالی مرحوم نے مرتب فرمایا تھا ۔

۱۸- 'مکاتیب غالب' میرزا کے وہ مکاتیب جو نوابان رام پور کو لکھے گئے اور مولانا عرشی نے بڑے اہتمام سے مرتب فرمائے ۔

۱۹- 'نادرات غالب' میرزا کے وہ مکاتیب جو منشی نبی بخش حقیر کو لکھے گئے تھے ۔

۲۰- 'متفرقات غالب' مرتبہ مسعود حسن صاحب رضوی ۔ اس مجموعے میں میرزا کے بعض فارسی مکاتیب ۔ مثنوی 'باد مخالف' کی ابتدائی صورت ، نیز ایک مثنوی اور کچھ اردو کلام بھی چھپا تھا ۔

موضوعاتِ شعر

میرزا کے فارسی سرمایۂ کلام میں وہ سب کچھ جستہ جستہ نہیں ، دستہ دستہ موجود ہے جو فارسی یا اردو یا مشرق و مغرب کی شاعری کے لئے زیبا سمجھا گیا ۔ مثلاً منظر نگاری ، نظام کائنات کے حقائق پر گفتگو ، فلسفہ ، تصوف ، اخلاق ، عشق و محبت ، وقوعہ گوئی ، حقائق حیات ، حرکت و عمل کی دعوت ، بلکہ سیاست بھی موجود ہے اور ایسی سیاست جو میرزا کے دور میں عموماً بہت بڑی جسارت سمجھی جاتی تھی ۔ ان سب کے علاوہ ان کے کلام میں ایک اور خوبی بھی موجود ہے یعنی وہ نہایت خشک مضمون کو لے لیتے ہیں اور شعر کی منزل میں پہنچ کر اس میں ایسی گلکاریاں کرتے ہیں کہ سب

کچھ بیان کر جاتے ہیں اور شریعت کے پایۂ بلند میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ یہاں مختلف عنوانوں کے ماتحت محض ایک ایک دو دو مثالیں پیش کی جائیں گی ، سب سے آخر میں میرزا کی ذات کا معاملہ ہے ۔ فارسی شاعری میں انھوں نے اپنے حالات اور اپنے جذبات و احساسات اس تفصیل سے بیان کر دیے ہیں کہ تنہا انھی سے میرزا کے خاندان ، احوال ، حیات اور مقام و کلام کی داستان مرتب کی جا سکتی ہے ۔ حقیقت ناشناس لوگ ایسے کلام کو خود ستائی یا تفاخر پر محمول کر لیتے ہیں ، جیسا کہ عرفی کے متعلق سمجھا گیا ۔ دراصل یہ ایسے احساسات ہوتے ہیں جو اپنی بلند حیثیت اور گرد و پیش کی خیرہ ذوقی کی بنا پر شاعر کے دل میں چکر لگاتے رہتے ہیں ۔ جب مناسب موقع آتا ہے ، اس طرح زبان سے اچھل پڑتے ہیں ، جس طرح دریا عالم جوش میں اپنی لہریں کناروں سے اچھال کر باہر پھینکتا رہتا ہے ۔ اس کے نمونے بھی عرض کیے جائیں گے انشاء اللہ ۔

منظرنامہ

منظر نگاری ملاحظہ فرمائیے :

در بہاران چمن از عیش نشانی دارد	برگ ہر نخل کہ بینی رگ جانی دارد
باد را راہ بہ خلوت کدۂ غنچہ چراست	گر نہ با شاہد گل راز نہانی دارد ؟
سبزہ را نامیہ انداختہ بادی در سر	بر خود از ہمسریٔ سرو گمانی دارد
گریہ ہر چند ز شادی است ولی ابر بہار	نیز چون من مژۂ اشک فشانی دارد
بر نخیزد ز رہش گرد دم قطرہ زدن	ادہم ابر کہ از برق عنانی دارد
ماہم از دشت سرائیم و گل و سبزہ و باغ	واعظ شہر گر از خلد بیانی دارد
باد چون نو سفران در دم رفتن رقصد	آب چون نکتہ وران طبع روانی دارد

آخری شعر بطور خاص توجہ کا محتاج ہے ۔ جب کوئی فرد نیا نیا سفر کے لیے نکلتا ہے تو سفر کے عادی لوگوں کے بر عکس تیزی ، چستی اور مستعدی سے چلتا ہے ۔ کبھی دوڑ کر آگے نکل جاتا ہے ۔ کبھی اطراف راہ کی چیزیں قریب سے دیکھنے کے لئے دائیں بائیں چلا جاتا ہے ۔ نو سفری کی یہی کیفیت پہلے مصرعے میں بیان کی گئی ہے ۔

تصوف

تصوف کا رنگ دیکھیے :

نی زن ز شکر و شکوه در مسلک رضا	راحت برنج و سود به نقصان برابرست
ترک وجود گیر سخن در سجود چیست	بگزر ز طاعتی که بعصیان برابرست
در دیدهٔ جریده روان یگانه بین	کثرت بخوابهای پریشان برابرست
جاروب لا بیار که این سرک فی الوجود	تا گرد فرش و سینه بایوان برابرست

ہلال عید

اسی قصیدے میں ہلال عید کی تشبیہات نظم کی ہیں ۔ ہلال عید کی تشبیہیں بہت سے شاعروں کے کلام میں ملتی ہیں ۔ مثلاً ظہیر فاریابی ، حضرت علامہ اقبالؒ ۔ میرزا کی تشبیہات بالکل نئی ہیں ۔ صرف دو اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے :

یارب جبین کیست که از بس بسجده سود	باقی بہ ابروی مہ کنعان برابرست
اندازه دان کیست که گوید ہلال عید	با ناخن بریدهٔ سلطان برابرست

عقلِ فعّال سے مکالمہ

ایک قصیدے کی تشبیب میں عقلِ فعّال سے مکالمہ شروع ہو گیا ۔ ملاحظہ فرمائیے کیسے دقیق نکتے ہیں ، مگر کس بے تکلفی سے سوال و جواب کی شکل میں مسلسل پیش کرتے جاتے ہیں اور شعر کے حسن میں کہیں کوئی فرق نہیں آتا :

گفتم : اسرار نہانی ز تو پرسش دارم
گفت : جز محرمیِ ذات که بیچون و چراست
گفتم : از کثرت و وحدت سخنی گوی به رمز
گفت : موج و کف و گرداب ہمانا دریاست
گفتم : آیا چه بود کشمکش رد و قبول
گفت: آه! از سر این رشته که در دست قضاست
گفتمش: ذره به خورشید رسد ، گفت : محال
گفتمش کوشش من در طلبش ، گفت : رواست

گفتم : آن خسرو خوبان بہ سخن گوش نہد ؟
گفت : گر گوش نہد زہرۂ گفتار کراست
گفتم : از بالش پر چارہ نہ دارد سر من
گفت : ہر سر کہ چنین است سزای سرِ پاست

اسی طرح ہر تشبیب سے نئے نئے مطالب اور نئے انداز بطور نمونہ دکھائے جا سکتے ہیں لیکن سرسری اندازے کے لئے یہی مثالیں کافی ہیں ۔

رند مشربی اور بے تکلفی

پھر مرزا غالب کی رند مشربی کسی تصریح کی محتاج نہیں ۔ کبھی قصیدے کا آغاز رندانہ بے تکلفی سے کرتے ہیں ۔ مثلاً :

عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عام است　　　می نوش کنہ بر من اگر بادہ حرام است

پھر ضمناً عجیب نکتے پیدا کرتے جاتے ہیں ۔ مثلاً :

عیدست و صلای خور و نوش ست جہان را　　　می روزہ نباشد کہ درین روز حرام است

کہتے ہیں شراب روزہ نہیں کہ عید کے روز حرام سمجھ لی جائے ۔

سفر کلکتہ کا ایک قطعہ

جب میرزا غالب کلکتے میں تھے ، تو جیسے حالات سے سابقہ پڑا ، ان کے تاثرات ''بزم آگہی کے ساقی'' کی زبان سے پیش کئے ہیں ۔ مثلاً پوچھا : مخالفوں کے بارے میں کون سی تدبیر مناسب ہوگی ؟ جواب ملا : ان سے صلح کرلو ۔ پھر پوچھا : حبِ جاہ و منصب کے باب میں کیا فرماتے ہو ؟ جواب ملا : شیطان کا بچھایا ہوا جال ہے :

گفتم : اکنون بگو کہ دہلی چیست ؟　　　گفت : جانست و این جہانش تن !
گفتمش : چیست این بنارس ؟ گفت　　　شاہدی ، مست ، محو گل چیدن !
گفتمش چون بود ، عظیم آباد ؟　　　گفت : رنگین تر از فضای چمن !
گفتمش : سلسبیل خوش باشد ؟　　　گفت : خوشتر نباشد از سوہن

''سون'' یا ''سوہن'' ندی ہے جس کی تعریف میرزا نے اور مقامات پر بھی کی ہے ، مثلاً :

خوشتر بود آب سوہن از قند و نبات
با ؔوی چہ سخن ز نیل و جیحون و فرات
این پارهٔ عالمے ؔکہ ہندش خوانند
گوئی ظلمات و سوہن است آب حیات
چو اسکندر ز نادانی ، ہلاک آب حیوانی
خوشا سوہن کہ ہر کس غوطہ زد در ؔوی تنش جان شد

انگریز حکومت کی تصویر

یہ ۱۸۲۸ء کے کلکتے کی روداد ہے ۔ اب اس قطعے کے و سوالات اور ان کے جوابات آتے ہیں ، جن کی خاطر یہ تمہیدات آراستہ ہوئیں ۔ فرماتے ہیں :

گفتم : این جا چہ شغل سود دهد ؟ گفت : از ہر کہ ہست ، ترسیدن !

(یعنی میں نے پوچھا کہ یہاں کون سا شیوہ مفید اور کارآمد ہو گا ؟ جواب ملا : جو بھی نظر آئے ، اس سے ڈرتے رہو) ۔

گفتم : این جا چہ کار باید کرد ؟ گفت : قطع نظر ز شعر و سخن !

(آخر انگریزوں کی مملکت کے مرکز میں مشرقی شعر و سخن کو کون پوچھتا تھا)

گفتم : این ماه پیکران چہ کس اند ؟ گفت : خوبان کشور لندن !
گفتم : اینان مگر دلی دارند ؟ گفت : دارند ، لیکن از آہن !
گفتم : از بہر داد آمده ام گفت : بگریز و سر بسنگ مزن !

یعنی میں نے پوچھا کہ آیا ان کے پہلو میں دل بھی ہیں ؟ کہا ہیں تو مگر لوہے کے ہیں ، جن پر کسی فریاد و فغاں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا ۔ میں نے کہا ، میں تو یہاں انصاف حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں ۔ ''بزم آ گہی'' کے ساقی نے کہا : یہاں سے بھاگ جا ، کیوں پتھر سے سر پھوڑنا چاہتا ہے ؟

میرزا غالب شاعر تھے ۔ انہیں سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ تاہم انسان ہونے کی حیثیت میں انگریزوں کے جو شیوے دیکھے اور ان کے دل پر جو اثر پڑا ، صاف صاف

بیان کر دیا ۔ آخر ۱۸۲۸ء میں انگریزوں پر اس سے زیادہ کڑی نکتہ چینی کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن اس دور میں کوئی بھی یا تو ان اشعار کو سن نہ پایا یا سمجھ نہ سکا ۔

نظیری کا ایک شعر

نظیری نے ایک غزل میں کہا تھا :

اخراج مغل خواہم و تاراج قزلباش　　کز ہند برندم بہ نشاپور فروشند

نظیری قدرشناسی کی پیاس بجھانے کے لئے خود ایران سے ہندوستان آیا ۔ یہاں اس کی انتہائی قدر و منزلت ہوئی ۔ تین ہزار بیگھے زمین دے دی گئی ۔ خانخاناں کے دربار سے گراں بہا رقمیں ملتی نہیں ۔ جہانگیر نے بھی اس پر نوازش فرمائی ۔ زرگری کا کارخانہ بھی جاری کر رکھا تھا ۔ وہ جب چاہتا نیشاپور جا سکتا تھا ۔ لیکن کہتا ہے کہ میری آرزو ہے ایران کے قزلباش ہندوستان پر حملہ کریں ۔ مغلوں کو یہاں سے نکال دیں ۔ مجھے قیدی بنا کر لے جائیں اور نیشاپور میں فروخت کر دیں ، جو اس کا وطن تھا ۔

انگریز تو شعر فہم نہ تھے ، لیکن عہد نظیری کے مغل تو شعر و سخن میں مشاق تھے ۔ تاہم ان بامروت حاکموں نے نظیری سے کوئی باز پرس نہ کی ۔ یہی سمجھا گیا کہ یہ حبِ وطن کے اظہار کا ایک شیوہ ہے ۔

قادر الکلامی

عرض کیا جا چکا ہے کہ میرزا غالب کی زندگی کا خاصا حصہ خاندان کی پنشن کے مقدمے میں صرف ہو گیا ۔ آپ سوچیں کہ بھلا پنشن کا مقدمہ بھی شعر کا موزوں موضوع بن سکتا ہے ، مگر دیکھیے میرزا غالب کے مقدمے کے کاغذات ولایت بھیجے جا رہے ہیں ۔ یہ غالباً ۱۸۳۶ء کا واقعہ ہے ۔ دہلی سے کسی کو کلکتے میں لکھ رہے ہیں اور خط ایک قطعے کی شکل میں بھیجا ہے ۔ ذرا اس کے چند شعر سنیے اور میرزا کی قادر الکلامی کا اندازہ فرمائیے ۔ توجہ کا پہلو یہ نہیں کہ اپنے مطالب کو نظم کا لباس پہنا دیا ۔ توجہ طلب یہ حقیقت ہے کہ قطعہ شاعری کا نہایت عمدہ نمونہ ہے اور موضوع کی خشکی اس میں کہیں نظر نہیں آتی :

بصدر میرود این باز پرس ، بسم اللہ　　ہمیں مراد منست و جز این مرادم نیست
تو کردی و تو کنی کارم اعتقاد اینست　　بکار سازیٔ بخت خود اعتقادم نیست

مفید مطلب من ہر کتابتی کہ بود	تو جمع کن کہ بسا زان میانہ یادم نیست
بذوق قرب زمان مراد بیابم	وگرنہ شورشِ تعجیل در نہادم نیست
بہ نیم روز بہ لندن رساندمی زورق	ولی چہ چارہ کہ فرمان بر آب و بادم نیست
بہ التفات تو صد گونہ اعتمادم ہست	ولی شتاب کہ بر عمر اعتمادم نیست

جہاز ولایت چھ مہینے میں پہنچتا تھا مگر کہا آب و باد پر چارہ ہوتا تو نیم روز میں پہنچا دیتا ۔

مٹکاف کا قصیدہ

اس طرح چارلس مٹکاف کے قصیدے میں ابتدائی شعر مدح کے تھے ۔ اس کے بعد اٹھائیس شعروں میں مقدمہ پنشن کی کیفیت بیان کر کے اپنے پانچ مطالبات کا نقشہ الگ الگ پیش کیا ، ساتھ ہی کہا :

بخشیم تازہ خطابے و برآن افزائی	خلعتے در خورِ این دولت جاوید طراز

اس قصیدے میں ایک بھی شعر ایسا نہیں جو سعریت کا اعلیٰ نمونہ نہ ہو یا اس میں کوئی جھول ہو ۔

پالتو بلی

میرزا نے ایک نظم اپنی پالتو بلی پر بھی لکھی جس کے کچھ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں ۔ کسی بھی زبان میں بلی پر ایسی پاکیزہ نظم تلاش کر دیکھیے ۔ یقین ہے آپ کامیاب نہ ہوں گے ۔

دارم بہ جہان گربہ پاکیزہ نہادے	کز بال پری زاد بود موج رم او
سر مست رود چون بہ زمین باز خرامد	از خاک دمد غنچہ ز نقش قدم او
چون صورت آئینہ ز افراط لطافت	آید بہ نظر بچہ او در شکم او
ہر شیر ژیانی کہ بہ بینی بہ نیستان	دارد سر دریوزۂ غرش ز دم او
گر جانورے مردہ بہ بیند سر راہے	از پاکی طینت نہ خورد غیر غم او
رخشندہ ادیم تنش از لطف زبانش	گوئی بہ اثر تاب سہیل است نم او
جوش گل و بالیدگی موجۂ رنگ است	دم لابہ کنان آمدن دمبدم او

در عربده چون بند زدم باز کشاید لرزد شکن طرۂ خوبان ز خم او
تا مہرہ کش صفحہ افلاک بود مہر بادا کف دست من و پشت و شکم او

پالتو جانوروں سے یہ لطیف جذباتِ محبت اور اُن کی عادات کا اس طرح گہرا مطالعہ آپ کو اور کہاں ملے گا ۔

غالب کی جامعیت

فارسی میں میرزا کے کل قصیدے بہتّر (۷۲) ہیں اور اس صنف کے شعر بھی باقی اصناف سخن سے زیادہ ہیں ۔ غزلیات کا درجہ قصائد کے بعد آتا ہے ۔ کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جن میں سے "ابر گہر بار" زیادہ طویل ہے ۔ دراصل میرزا غزوات نبوی ؐ نظم کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن صرف تمہیدات و مقدمات ہی لکھ سکے ۔ ان گیارہ مثنویوں کے علاوہ بھی ان سے چھوٹی بڑی مثنویاں منسوب ہیں ۔ قطعات اور نوحے ایک سو سے زیادہ ہیں ۔ رباعیوں کی تعداد بھی خاصی ہے ۔ پھر دوسرے اصناف سخن کے اشعار کی تعداد قابلِ توجہ ہے ۔

عرفی کو قصیدے اور غزل میں جو بلند مقام حاصل ہے ، وہ محتاجِ تشریح نہیں لیکن باقی اصناف سخن میں اس کی متاع چنداں اہم نہیں اور مثنوی کے متعلق تو عرفی کے عہد ہی میں کہہ دیا گیا تھا :

مثنویش رنگ فصاحت نہ داشت کان نمک بود و ملاحت نہ داشت

نظیری کو صرف غزل میں کمال حاصل ہے ۔ قصیدے متوسّط درجے کے ہیں ؛ جن میں سے بعض میں بار بار عرفی پر چوٹیں کی ہیں ، حالانکہ وہ بیچارا فوت ہو چکا تھا ۔ اس سے نظیری کے حوصلے اور ظرف کے متعلق دل پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا ۔ لیکن میرزا کو اللہ تعالیٰ نے نظم و نثر کی ہر صنف میں دستگاہ کامل سے نوازا تھا ۔ پاک و ہند میں ایسے ممتاز شاعر صرف تین ہیں جنہیں تمام اصناف سخن میں نشان امتیاز حاصل تھا ۔ ایک امیر خسرو ، دوسرے فیضی اور تیسرے مرزا غالب ۔

قصیدوں کی حقیقی حیثیت

قصیدے کے متعلق ایسا تصور دماغوں میں جما ہوا ہے ، گویا یہ صنف شاعروں کی

گداگری اور وابہ جوئی کا ایک ذریعہ تھی ۔ بلاشبہہ ایک اعتبار سے شاید یہ صحیح بھی ہو کہ شاعر قصیدوں کی بدولت بادشاہوں یا امیروں کے درباروں سے صلہ لیتے تھے ، لیکن شاعری کی یہ صنف کمالِ شعر گوئی کے اظہار کا بھی ایک اہم ذریعہ تھی ۔ بالخصوص قصیدوں کی تشبیب میں بلند پایہ شاعروں نے فکر و نظر کی جو معجز کاریاں دکھائیں ۔ ان کی نظیریں دوسرے اصناف میں کم ہی ملیں گی ۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے شاعروں نے قصیدے زیادہ کہے ۔ ان کی حیثیت دراصل مستقل نظموں کی تھی ، جن میں مخاطب کی مدح بھی ہوتی تھی ، لیکن شعر گوئی کے زور و جوش کی جیسی نمایش ان میں ہوتی تھی ، دوسرے اصناف میں ممکن ہی نہ تھی ۔ لہٰذا ان پر صرف مستقل نظموں ہی کی حیثیت میں نظر ڈالنی چاہیے ۔ میرزا کے دور میں بادشاہ صرف نام کے رہ گئے تھے ۔ وہ شاعروں کو کیا دے سکتے تھے ؟ ان کی حقیقی حیثیت تو خانخاناں کے برابر بھی نہ تھی جس نے نظیری کو ایک لاکھ روپیہ دے دیا تھا ۔ اس لیے میرزا کے قصیدوں کو صنفِ شعر گوئی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے ۔

ہنر ذات

پھر ایک صنف وہ بھی ہے جسے صفت ''ذاتیات'' کہنا چاہیے ، یعنی شاعر کے وہ اشعار جس میں وہ ذاتی حالات ، یا خاندانی حالات یا شاعری میں اپنے رتبے اور پایے کا ذکر کرتا ہے ۔ جن شاعروں نے ذاتیات کو ایک خاص سلیقے سے پیش کیا ، ان میں عرفی اور غالب کی حیثیت بہت بلند ہے ۔ سطح بین اسے شاعر کا فخر و غرور یا خود ستائی قرار دے کر معاملہ ختم کر دیتے ہیں ، حالانکہ اس صنف میں سلیقہ مند شاعروں نے ایسے حقائق بیان کیے ہیں جو دوسرے ذریعے سے بروئے کار ہی نہیں آ سکتے تھے ۔

آپ فرض کریں کہ ایک فرد کسی پہاڑ کی بلند چوٹی پر بیٹھا ہوا گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے اور اسے آس پاس کوئی دوسرا ہم پیشہ نظر نہیں آتا ۔ اگر اس حالت میں اس نے اپنی یگانگی کے متعلق کچھ کہہ دیا تو پریشان ہو جانے کی کون سی ضرورت ہے ؟ اس لیے عرفی یا غالب اپنی تعریف میں کچھ کہتے ہیں تو ان کے کلام کو میزان میں تولا جائے ۔ عرفی نے کہا ہے :

اما نہ بود وصفِ اضافی ہنرِ ذات	این فتویٔ ہمت بود ارباب ہمم را
مایۂ ارزندگی از گہرِ خوش گیر	تابکی این عزو ناز از اب و عم داشتن

یہی کیفیت میرزا کے ذاتیات کی ہے ۔ دیکھیے :

بلند پایہ سرا گرچہ من سخن سنجم — ولیک پیشہ آبا بہ عالم اسباب
سپہبدی بد و زافراسیاب تا پدرم — بہان طریقہ اسلاف داشتند اعقاب
دلاوران نگری تا پشنگ پشت بہ پشت — بہ پیشگاہ تو گر خویش رو شوم السباب
من آن کسم کہ بہ توقیع مبدأ فیاض — شہ قلمرو نظمم درین جہان خراب
ہمی کنم بہ قلم کار تیغ و این کاریست — شگرف و نغز و پسندیدۂ اولوالالباب

ان شعروں میں کون سی بات خلافِ حقیقت ہے ؟

پھر کہتے ہیں :

سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن — توقیع من بہ سنجر و خاقان برابر است

خاقانی کا نام یہاں اس لیے نہیں لائے کہ اس کے انداز میں قصیدے کہتے تھے ، صرف اس لیے لائے کہ خاقانی ایک مشہور شاعر تھا اور اس شعر کا قافیہ "خاقان" لا رہے تھے ۔ لفظ خاقانی کو شعری اعتبار سے خاقان کے ساتھ جو مناسبت ہے ، وہ محتاجِ تصریح نہیں ۔

سلجوقیوں کا تاج فخر

واجد علی شاہ کے ایک قصیدے میں فرمایا :

گدای ترک نژادم ز دودۂ سلجوق — فراخ تا نبود خوان نمی خورم نان را
کجاست نان کہ نہم خوان چہ ہرزہ می لایم — فشردہ ام بجگر بہر لقمہ دندان را
دلِ پر آتش و چشمِ پر آب من دارد — تنور پیر زن و ماجرای طوفان را
سوال سائل اگر رہ برد بہ پردۂ گوش — قبول تا نہ کنم تاب ناورم آن را

عظیم سلجوقیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جب تک دسترخوان پھیلا کر نہیں بچھا لیتے تھے ، کھانا نہیں کھاتے تھے ۔ سلجوقیوں کی تاریخ چند افراد دیکھیں گے میرزا غالب کا کلام جب تک دنیا میں موجود ہے ، دسترخوان کی فراخی پوری آل سلجوق کے لیے تاج فخر بنی رہے گی اور فتوحات کے مقابلے میں دسترخوان کی فراخی کو ہزار مرتبہ ترجیح حاصل ہے ۔

پُر تاثیر دعوت

پھر اپنے متعلق کہا کہ کسی سائل کی صدا پردۂ گوش سے ٹکرا جائے تو جب تک اس کا سوال پورا نہ کر لوں ، دل تڑپتا رہتا ہے اور چین نہیں پاتا ۔

واضح رہے کہ یہ محض داستان سرائی نہیں ، دعوت بھی ہے ۔ ایسی ہی دعوتیں دنیا میں زندہ رہتی ہیں ، اس لیے کہ انسانیت کی قلب کی صدا ہوتیں ہیں ۔ صرف ایسی ہی دعوتوں کے لیے قیام و ثبات مقدر ہے ۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے ''و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض'' جو چیزیں انسان کو نفع پہنچاتی ہیں ، وہ دنیا میں باقی رہتی ہیں ۔ یہ شاعری فکر و کاوش اور دماغ سوختگی سے پیدا نہیں ہوتی ۔ اللہ کی دین ہے ۔

میرزا کا اصل موضوع

میرزا کا اصل موضوع انسانیت ہے ، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست بگرد نقطہ ما دور ہفت پرکار است

کائنات پیدا کرنے کا اصل مقصد و مدعا کیا ہے ؟ انسان اور صرف انسان ۔ اسی نقطے کے گرد سات سیّاروں کی پرکاریں گھوم رہی ہیں :

ز ما گرم است این ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت مے دمد از پردۂ خاکے کہ انسان شد

لیکن پانچ چھ فٹ کی وہ متحرک انسان نما مشین انسان نہیں جس نے ہر طرف فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے ، جو وحشت کے عالم میں ہو تو ہم جنسوں کی خونریزی میں قطعاً تامل نہیں کرتا ۔ انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن جب تک وہ سیرت و کردار میں تمام مخلوق سے افضل و اشرف نہ ہوگا ، ''انسان'' کیونکر کہلا سکتا ہے ، اسی لیے کہا تھا :

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

وضع و ہیئت کے اعتبار سے انسان ہونا انسان ہونا نہیں ، انسانیت کا درجہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا ، جب تک بنیادی معنوی جوہر جلا پا کر روشنی کا سرچشمہ نہ بن جائے ۔

صحیح انسانی اوصاف

ایسے انسان کے لیے جن جن اوصاف کی ضرورت ہے ، میرزا کے کلام میں اس کی تفصیلات موجود ہیں ۔ مثلاً وہ خوددار ، بلند ہمت اور غیرت مند ہو ۔ اسے نیک و بد کی تمیز ہو ، حسن عمل کی بجلیاں اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہوں ، اسے ہم جنسوں سے پیار ہو ، اعلیٰ مقاصد کی غیر معمولی لگن کے ساتھ ان مقاصد کے لیے قربانی کا غیر معمولی ولولہ ہو ۔ وہ سراپا سعی و جہد ہو ، سخت کوش ہو ، دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کر دیا ہے اسے عقل و دانش اور سعی و کوشش سے مفید و خوشتر بنائے، نیکی اور خیر کا پیکر ہو اور بدی کی پرچھائیں سے بھی گریزاں رہے ۔

میرزا کے کلام کا مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو انسانیت کی ان اعلیٰ اوصاف کی بے شمار مثالیں ملیں گی ۔ لیکن یہاں ذیل میں چند عنوانات کے تحت محض ایک ایک دو دو مثالیں پیش کرنے کے سوا چارہ نہیں :

تو خود حدیث مفصل بخوان ازین مجمل

غیرت و خودداری

غیرت و خودداری کے متعلق فرماتے ہیں :

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جان دہم گر بہ موج افتد گمان چین پیشانی مرا

میرزا کہتے ہیں کہ میرے دلی احساسات کی کیفیت یہ ہے کہ اگر سطح دریا کی ہلکی ہلکی لہریں دیکھ کر میرے دل میں گمان پیدا ہو جائے ، یہ لہریں نہیں بلکہ دریا کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی ہیں اور وہ میرے سیراب ہونے پر خفا ہے تو میں دریا کے کنارے پیاسا جان دے دوں گا ، مگر اس کے پانی سے لب تر نہ کروں گا ۔ یہ غیرت و خودداری ، سلیم المزاج اور صحیح الفطرت انسان کی اہم خصوصیت ہے ۔

فرہاد کی جوے شیر کا واقعہ کسی توضیح کا محتاج نہیں ۔ یہ نہر پہاڑ کاٹ کر اس باغ کے لیے لائی گئی تھی جہاں خسرو پرویز نے اپنی ملکہ شیریں کے لیے عشرت گاہ بنائی تھی ۔ میرزا کہتے ہیں :

از جوے شیر و عشرت خسرو نشان نماند غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد مے زند

جوے شیر اور عشرت گاہ خسرو کا کوئی نشان باقی نہ رہا ۔ خسرو اور شیریں کے ساتھ سب

کچھ مٹ کر افسانۂ پارینہ بن گیا ۔ لیکن غیرت اب بھی فرہاد پر طعنہ زن ہے اور جب تک فرہاد کی داستان باقی ہے ، طعنہ زنی کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا ۔

بےنہایت جدوجہد

میرزا کے نزدیک انسانی جدوجہد کی انتہائی حدود معین نہیں کی جا سکتیں ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ اگر منزل مقصود کا عشق واقعی ولولہ خیز ہے تو راستے کی زحمتوں اور مشقتوں کا خیال ہی کیوں کر آ سکتا ہے ؟ اگر طبیعت سستانے کی طرف مائل ہو یا پاؤں سے کانٹا نکالنے کا خیال آ جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ منزل کے عشق میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے ۔ فرماتے ہیں :

مجو آسودگی گر مرد راہی ، کاندرین وادی چو خار از پا بر آمد پا ز داماں بر نمی آید

معاملے کی صورت ایسی ہے کہ ایک مرتبہ پاؤں تھوڑی سی آسودگی کا خوگر ہو جائے تو یقین رکھنا چاہیے کہ پھر وہ منزل طے کرنے کی مشقتیں اٹھانے پر آمادہ نہ ہوگا ۔

امن طریق اور سفر کعبہ

میرزا انسان اعلیٰ کے لیے بےنہایت جدوجہد اور لامتناہی مشقت و زحمت کے طلب گار ہیں :

چہ ذوق رہروی آن را کہ خار خارے نیست مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

اس سفر میں مزا کیا ، جس میں زحمت و مشقت نہ ہو ؟ اگر راستہ پُر امن ہو تو کعبے کے سفر میں لذت کیا آئے گی ؟ ادائے فریضہ کے سلسلے میں انسان کو جو کڑے امتحان پیش آتے ہیں ، میرزا کے نزدیک وہ خاص اہمیت رکھتے ہیں ، ان سے بیسیوں خامیاں اصلاح پاتی ہیں اور انسانیت کے اوصافِ عالیہ کو زینت ملتی ہے ۔

عشقِ حق کا پیمانہ

میرزا کو معلوم تھا کہ سر زمینِ حجاز میں کوئی دریا اور کوئی ندی نہیں ، جو سال بھر جاری رہے ۔ چنانچہ اس صورت حال سے ایک نکتہ پیدا کر لیا جو انہی سخت کوش مجاہدوں کے خیال میں آ سکتا تھا ، جنہیں قدرت نے حقیقت شناسی اور بالغ نظری کے

جوہروں سے بھی نوازا ہو ۔ فرماتے ہیں :

نہ دادہ الد بہ آن دشت راہِ دریا را　　　　عیار کعبہ روان تا ز تشنگی گیرند

کہتے ہیں حجاز جیسے پاک خطے میں مستقل دریا نہ بہانے میں خاص مصلحت کارفرما تھی کہ دیکھا جائے اللہ کے فرمانبردار بندے پیاسے اس کے مقدس گھر کی زیارت کے شوق میں کتنی تکلیفیں اور اذیتیں صبر و شکر کے ساتھ اٹھا لیتے ہیں ۔ جو سچے مسلمان اس کٹھن منزل سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں گے ، ان کا عشقِ حق کتنا پایدار و استوار ہوگا ؟ ان کے لیے کعبے کی عزت و حرمت پر کٹ مرنا کس درجہ سہل و آسان ہوگا ؟

گردم ہلاک فرۂ فرجام رہروے　　　　کاندر تلاش منزل عنقا شود ہلاک

اس شعر کی معنوی تفصیلات کا رشتہ بیان یہاں کھولنا ضروری نہیں ، تاہم ظاہر ہے کہ انسان نے اب تک ایجاد و اکتشاف میں جو حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں ، یہاں تک کہ ستاروں پر کمندیں پڑنے لگیں ، کیا وہ اسی شعر پر عمل پیرائی کا نتیجہ نہیں ؟

اپنے متعلق فرماتے ہیں :

دوزند اگر بہ فرض زمین را بہ آسمان　　　　حاشا کزین فشار بر ابرو خم افگنم

زمین کے ساتھ آسمان کو کون سی سکتا ہے ؟ بفرض محال ایسا ہو بھی تو میری قوت تحمل و برداشت کا یہ عالم ہے کہ ابرو پر شکن بھی نہ پڑے گی ۔

غم

میرزا ''غم'' کو بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ اسے وہ ''غمِ عشق'' بھی کہتے ہیں ، مگر اس سے در اصل ان کی مراد غمِ انسانیت ہے ، یعنی ہم جنسوں کے لیے دردمندی ۔ کہتے ہیں :

بے غم نہاد مرد گرامی نمی شود　　　　زنہار قدر خاطر اندوہگین شناس

میرزا غم کو اصلاحِ انسانیت کا ایک اہم وسیلہ سمجھتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ جس طرح فصل سے دانہ الگ اور بھوسا الگ کیا جاتا ہے اسی طرح غم بھی انسان کی تمام خامیوں کو ، جن کی حیثیت بھوسے کی ہے ، الگ کر کے انسانیت کو خالص بنا دیتا ہے ۔ یعنی دانے صاف کر کے ایک جگہ جمع کر دیتا ہے :

غم چو ہم در افگند زو کہ مراد می دہد　　　　دانہ ذخیرہ می کند کاہ بہ باد می دہد

پھر وہ غم و رنج اور تادیب و تعذیب کے نتائج پیش نظر رکھنے پر زور دیتے ہیں مثلاً :

با اضطراب دل ز ہر اندیشہ فارغم آسائشے است جنبش این گاہوارہ را

دل نشین مثالیں :

چرگر کہ ز زخمہ زخم بر چنگ زند پیداست کہ از بہرچہ آہنگ زند
در پردۂ ناخوشی ، خوشی پنہان است گاذر نہ زخشم جامہ بر سنگ زند

گانے والا ساز پر زخمہ لگاتا ہے تو سُر پیدا کرتا ہے ۔ اسی طرح دھوبی زور زور سے پتھر پر کپڑے مارتے ہیں تو اس غرض سے کہ ان کا میل نکل جائے اور وہ صاف ہو جائیں ، نہ اس غرض سے کہ غصے سے انہیں پھاڑ کر تار تار کر ڈالیں ۔ میرزا کے نزدیک تو عذاب دوزخ بھی ہماری طینت کی صفائی ہی کے لیے بنا ہے :

تابشوید نہاد ما از وسخ گشت گرمابہ ساز از دوزخ

حمام میں جسموں کا میل دور ہوتا ہے ۔ دوزخ کا حمام اس لیے بنایا گیا ہے کہ ہماری طینتوں کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا جائے ۔ اسی طرح میرزا کے تصور کے مطابق انسان کو زندگی میں جو سختیاں اور پریشانیاں پیش آتی ہیں ، وہ بھی تیزیٔ فکر کے لیے سنگ فسان ہیں :

تیزی فکر من از تست ز گردون چہ خطر سختی دہر شود تیغ مرا سنگ فسان

قول و عمل میں موافقت

انسان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا قول ، عمل کے عین مطابق ہو ۔ قول کی تصدیق عمل سے نہیں بلکہ عمل کی تصدیق قول سے کرے ۔ یہ کیا کہ جس شے کو اپنے نزدیک آگ سمجھتا ہے ، اسے دوسروں کے لیے پانی بتائے ؟ میرزا فرماتے ہیں :

باخرد گفتم نشان اہل معنی باز گوی گفت : گفتارے کہ باکردار پیوندش بود

میں نے عقل سے پوچھا کہ اہل حقیقت کی کوئی نشانی بتا ۔ بولی : وہ گفتار جس کا رشتہ کردار سے پیوستہ ہو ، یعنی جو لوگ اپنے قول کے مطابق عمل پیرا ہیں ، وہ اہل حقیقت ہیں ۔

بعض برائیاں

میرزا بیدردی اور 'حیب' انسانیت سے محرومی کو بہت بری چیز سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

سرابے کہ رخشد بہ ویرانہ خوشتر ز چشمے کہ پیرایۂ نم نہ دارد

تن پروری سے میرزا بیزار ہیں، کہتے ہیں:

تالیفتد ہر کہ تن پرور بود خوش بود گر دانہ نبود دام را

خودنمائی کو بہت برا سمجھتے ہیں:

در مشرب حریفان منع است خود نمائی بنگر کہ چو سکندر آلینہ نیست جم را

سکندر کے ساتھ آلینے کا افسانہ وابستہ ہے، جو خودبینی و خودنمائی کا آلہ ہے۔ لیکن جمشید کے ساتھ ایسی کسی چیز کا تعلق نہیں۔

معنویت پر نظر

میرزا معنویت کے شیدائی ہیں، ظاہریت کو بالکل بےحقیقت سمجھتے ہیں۔ مثلاً پینے کی چیز مشروب ہے۔ پیالہ یا قوت و الماس کا ہو یا مٹی کا، اس سے مشروب پر کیا اثر پڑتا ہے؟ پیا مشروب ہی جائے گا، پیالہ نہیں پیا جائے گا:

نشاط جم طلب از آسمان نہ شوکت جم قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی است

یہ ایک شعر دنیوی شان و شوکت کی بےحقیقتی کے لئے ایک ایسی دلیل ہے، جسے کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا اور شاعر کا، جو داعی بھی ہو، اصل کام یہی ہے کہ ہم جنسوں کے افکار و خیالات میں انقلاب پیدا کرے۔ یہی مضمون دوسری جگہ دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہیں:

صورتے باید کہ باشد نغز و زیبا روزگار گو بہ اکسونش مپوش و گو بہ دیبایش مپیچ

صورت اچھی ہونی چاہیے، اکسون و دیبا کے قیمتی لباس کی ضرورت نہیں۔ کسی زشت رُو اور بد وضع ہستی کو زربفت پہنا کر خوبصورت نہیں بنایا جا سکتا۔

نظامِ کائنات

نظامِ کائنات کے متعلق میرزا کے افکار بڑے دلچسپ ہیں ۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں :

آئین دھر نیست کہ کس را زیان رسد

دلیل پیش کرتے ہیں :

غرقہ بہ موجہ تاب خورد ، تشنہ ز دجلہ آب خورد
رخصت ھیچ یک نہ داد ، راحت ھیچ یک نخواست

وہی دریا ہے جس سے پیاسا پیاس بجھاتا ہے اور اسے کوئی آزار نہیں پہنچتا ۔ وہی دریا ہے ، جس کی موجوں کے بیچ و تاب میں الجھ کر آدمی غرق ہو جاتے ہیں ۔ ہم کیوں نہ سمجھیں کہ دریا کو نہ کسی کی غرقابی منظور تھی اور نہ وہ کسی کو راحت پہنچانا چاہتا تھا ۔

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج   دانا خورد دریغ کہ نادان چہ کار کرد

لنگر کو تیز ہوا نے توڑ ڈالا ۔ کشتی کو موجوں نے توڑ کر تختہ تختہ کر دیا ۔ دانشمند لوگ افسوس کا اظہار کر رہے ہیں کہ نادان ناخدا نے کیسا غلط کام کیا ۔ گویا حقیقی اسباب پر نظر رکھی جائے تو ناخدا کا کیا قصور ہے ؟ تیز و تند ہوا کے طوفان وہ نہیں لایا تھا ۔ لہروں میں تموّج کا جوش اس نے پیدا نہیں کیا تھا :

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہان   تاب اندیشہ نہ داری بہ نگاہے دریاب

میرزا کہتے ہیں کہ یہ کائنات لحظہ بہ لحظہ بدلتی جا رہی ہے ۔ مگر ہم اس تغیّر و تبدّل کا اندازہ نہیں کر سکتے :

در ہر مژہ بر ہم زدن این خلق جدید است   نظارہ سگالد کہ ہمان است و ہمان نیست

بہار کی کیفیت کا ایک دلکش نقشہ ملاحظہ فرمائیے :

در شاخ بود موج گل از جوشِ بہاران
چون بادہ بہ مینا کہ نہان است و نہان نیست

پھر اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ ایک ہی چیز کی خاصیتیں ، مختلف جنسوں کے

تعلق میں مختلف ہیں ۔ میرزا فرماتے ہیں :

آن آب کہ از خاک ہمے سبزہ دماند   در طینت آھن ہمہ زنگار بماند

پانی کھیتوں اور باغوں کے لئے بہار کا سامان ہے ۔ جاندار اس سے پیاس بجھاتے ہیں ۔ پانی کے دھارے کشتیوں اور سفینوں کے لئے قطع مراحل کا وسیلہ ہیں ۔ لیکن لوہے کے لئے وہی پانی بلکہ اس کی خفی نمی بھی زنگار کا سامان ہے جو تھوڑے ہی عرصے میں لوہے کو کھا جاتا ہے ۔

ایک عجیب خصوصیت

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بری سے بری چیز سے بھی اچھا پہلو نکال لیتے ہیں ، مثلاً :

پیش ما دوزخ جاوید بهشت است بهشت   باد آباد بهارے کہ وفا خیزد ازو
زینهار از تعب آتش جاوید مترس   خوش بهارے ست کزو بیم خزان برخیزد
بچہ گیرند عیار ہوس و عشق دگر   رسم بیداد مبادا ز جهان برخیزد

اسی زمین میں اپنے متعلق کس درد و سوز سے کہتے ہیں :

عمر ها چرخ بگردد کہ جگر سوختہ‌ٔ   چون من از دودۂ آتش نفسان برخیزد

دعوتِ عمل

میرزا کے کلام میں انسان کے لئے دعوتِ عمل کے پرتاثیر نمونے جابجا موجود ہیں ، مثلاً :

مہ و خورشید درین دائرہ بیکار نیند   تو چہ باشی کہ بخود زحمت کارے نہ دہی ؟

چاند اور سورج یقیناً اس کائنات کی اشرف و اکرم مخلوق نہیں ۔ اشرفیت کا مقام صرف انسان کو حاصل ہے ۔ میرزا کہتے ہیں کہ چاند سورج تو اپنا وظیفہ برابر انجام دے رہے ہیں ۔ وقت پر نکلتے اور وقت پر غروب ہوتے ہیں ۔ غروب بھی ان کے لئے ٹھہرنے اور آرام لینے کا پیغام نہیں ۔ پھر انسان افضل ہو کر کیوں حرکت و عمل کے وظیفے کا حق ادا نہیں کرتا ؟

آخر کار نہ پیداست کہ در تن فسرد   کلف خونے کہ بدان زینت دارے نہ دہی

انسان کے جسم میں خون کے جو چند چلو ہیں ، ان کے دوران و حرکت ہی پر اس کی زندگی کا انحصار ہے ۔ مقررہ وقت پر جا کر یہ خون بدن میں افسردہ ہو جائے گا ۔ یہ اس کی زندگی کے خاتمے کا نشان ہے ۔ میرزا کہتے ہیں ، جس خون کے لئے کسی نہ کسی وقت بہرحال افسردہ ہونا مقدر ہے ، اے اشرفیت و اکرمیت کے مدعی انسان ! تو کیوں کوئی عظیم القدر انسانی کارنامہ سر انجام دے کر اس خون کو سولی کے لئے باعث زینت نہیں بنا دیتا ؟ سچ ہے :

آن راز کہ در سینہ نہان است ، نہ وعظ است　　بر دار توان گفت بہ منبر نتوان گفت

حبِّ انسانیت

بہ ہر حال میرزا حبِّ انسانیت کا پیکر تھے ۔ ان کے سازِ شعر کا بلند ترین نغمہ حبِّ انسانیت کے سوا کچھ نہ تھا ۔ وہ خود کہتے ہیں :

ہر مطلعے کہ ریزد از خامہ ام فغانیست　　جز نغمۂ محبت سازم نوا نہ دارد

ایک جگہ فرماتے ہیں :

بحث و جدل بجائے مان ، میکدہ جوئی کالدران
کس نفس از جمل نہ زد کس سخن از فدک نخواست

انسانوں سے محبت کے شراب خانے میں جزوی اختلافات پر گفتگو کا کون سا مقام ہے ؟ وہاں تو بنیادی اور اساسی چیزیں پیش نظر رہتی ہیں ، ان کے نزدیک اساسی چیز یہ تھی کہ اختلافات سے قطع نظر انسانوں کے ساتھ بلا امتیاز مروت کریں ۔ اردو کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

”نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں ۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے ، نہ سہی ، مگر جس شہر میں رہوں ، اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے ۔“

یہی بات دیدہ ور لوگوں کی صفات گنواتے ہوئے کہی ہے :

خون خورند و جگر از غصہ بدندان گیرند　　خویش را چون بہ سرِ مائدہ تنہا بینند

اصل مدعا پر جم جائیں

وہ خود کہتے ہیں کہ اجزا میں کیوں الجھتے ہو ؟ اصل مدعا کو کیوں پیش نظر

نہیں رکھتے ؟

موجہ از دریا ، شعاع از مہر ، حیرانی چراست محو اصل مدعا باش و بہ اجزائش مپیچ
آخر از مینا بہ جاہ و پایہ افزون نیستی بندہ ساقی شو و گردن را ز ابمالش مپیچ

حقیقی غرض و غایت یہ ہے کہ عالم انسانیت اس مسلک پر لگ جائے ، جس میں سب کی بھلائی اور بہتری ہو ۔ یہ نہیں کہ مختلف گروہ باہم کشمکش میں مبتلا رہیں ۔ اس غرض و غایت کو پورا کرنے کے لئے صحیح مسلک محبت اور ہمدردی کے سوا کوئی نہیں ۔

مضمون اور اس کی بندش

میرزا غالب کے فارسی کے کلام پر اس سرسری تبصرے کو ہم زیادہ پھیلانا نہیں چاہتے لیکن میرزا کی چند مزید خصوصیات کا ذکر اجمالاً کئے بغیر یہ مکمل نہیں ہو سکتا ۔

مضمون اور اس کی بندش دو جدا گانہ چیزیں ہیں ۔ بعض اوقات ایک اعلیٰ درجے کا مضمون کسی شاعر کے دماغ میں آ جاتا ہے ، مگر وہ اسے ایسے انداز میں باندھ نہیں سکتا جس سے مضمون کے تمام پہلو جامعیت کے ساتھ سامنے آ جائیں ۔ میرزا غالب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مضمون صحیح انداز میں باندھنے کی جیسی قدرت انہیں ودیعت ہوئی ، اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں ۔ مثلاً وقوعی تبریزی کا ایک شعر ہے :

بقدر حوصلۂ من کرشمہ کن ، کاین چشم بہ نیم عشوہ جہانے بہ اضطراب آرد

فیضی کا شعر اس سے بھی بہتر ہے :

از جلوہ بیارام دمے کاین ہمہ خوبی در حوصلۂ دیدہ بہ یک بار نہ گنجد

دونوں شعر نہایت اچھے ہیں لیکن دونوں میں کھٹک کا ایک پہلو موجود ہے ۔ پہلے شعر میں "بقدر حوصلہ من کن کرشمہ" اور دوسرے شعر میں "از جلوہ بیارام دمے" عاشق کی زبان سے زیبا معلوم نہیں ہوتے ۔ انہیں عاشق کی فطرت سے قطعاً مناسبت نہیں ۔ میرزا غالب کے ہاں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ افتاد ، ہمتِ برداشت سے بہت بڑھ گئی ، مگر انہوں نے طریقِ بیان دوسرا اختیار کر لیا ۔ مثلاً :

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

یا

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خونتابہ فشاں اور

ژرف نگہی

پھر مختلف اشیا کو ان کی خصوصیات سے الگ کرکے معرّا دیکھ لینے کی ژرف نگہی کے متعلق جیسی مثالیں میرزا کے ہاں ملتی ہیں ، دوسرے شاعروں کے ہاں شاید ہی ملیں۔ مثلاً فرماتے ہیں :

از مہر جہان تاب امید نظرم نیست　　　این تشت پر از آتش سوزان بہ سرم ریز

نظامِ شمسی میں سورج کے معروف وظیفے ہیں ، جنھیں مدِ حیات مانا جاتا ہے ۔ اگر ان سے استفادے کے تمام دروازے بند ہو جائیں تو سورج کے لیے اس سے موزوں تعبیر کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ انگاروں سے بھرا ہوا ایک تشت ہے ، اور میرزا ٹھیک کہتے ہیں کہ اگر اس سے نظرِ لطف و کرم کی کوئی امید پوری نہیں ہو سکتی تو انگاروں سے بھرے ہوئے اس تشت کو میرے سر پر دے مار۔

ایک مضمون کی مختلف صورتیں

پھر بعض مضامین مختلف صورتوں میں بیان کرتے ہیں اور ہر صورت مضمون کی صحت و درستی کو زیادہ سے زیادہ پختہ و استوار بنا دیتی ہے ۔ مثلاً :

ہر رشحہ بہ اندازۂ ہر حوصلہ ریز　　　میخانۂ توفیق خم و خام نہ دارد

اردو میں کہا :

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

فارسی :

اندر آن روز کہ پرسش رود از ہرچہ گزشت　　　کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

اردو :

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جبر و اختیار

بعض اوقات نہایت اہم مسائل اس بے تکلفی سے بیان کر جاتے ہیں کہ انسان متحیّر

رہ جاتا ہے۔ مثلاً جبر و اختیار کے متعلق فرماتے ہیں :

در آنچہ من نتوانم ز اختیار چہ سود ؟
بدانچہ دوست نہ خواہد ز اختیار چہ حظ ؟

ظاہر ہے کہ انسان کی بے شمار خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جو پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ ایسے معاملات میں احتیاط و تاکید بے سود ہے۔ لیکن جو کام دائرۂ اختیار میں رکھے گئے ، ان میں نیک و بد اور حلال و حرام کا حکم جاری ہو گیا۔ یعنی جو ہم کر نہیں سکتے اس میں احتیاط لاحاصل ہے اور جو دوست کے نزدیک کرنے کے نہیں ، ان میں اختیار سے کیا فائدہ ؟

دوسری جگہ فرمایا :

دو برق فتنہ نہفتند در کف خاکے　　　بلائے جبر یکے ، رنج اختیار یکے

قدرت نے ایک کفِ خاک یعنی انسان میں آزمایش کی دو بجلیاں چھپا کر رکھ دیں۔ ان میں سے ایک کا نام بلائے جبر ہے اور دوسری کا رنج اختیار۔ غور کے لائق یہ دو لفظ ہیں جو میرزا نے جبر و اختیار کے ساتھ لگائے۔ یعنی 'بلا' اور 'رنج'۔ جبر و اختیار کی حقیقی حیثیت عامی کے نزدیک واضح کرنے کی اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے ؟

میرزا کی مثنویاں

میرزا غالب کی گیارہ مثنویاں تو فارسی کلیات میں موجود ہیں ، ان کے علاوہ بھی ان کی چند مثنویاں ہیں جو مختلف صورتوں میں طبع ہوئیں۔ تمام مثنویوں پر اس مختصر سے مقالے میں اختصاراً بھی بحث نہیں چھیڑی جا سکتی۔ ان میں سے مثنوی 'چراغ دیر' بنارس پر لکھی ہے ، جہاں کلکتہ جاتے ہوئے میرزا کچھ عرصہ قیام پذیر رہے۔ اس کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی یا اُردو کے کسی شاعر نے شاید ہی کسی شہر کے مختلف نمایاں پہلوؤں پر اس انداز کی مثنوی کہی ہو۔ اور حسن سے لطف اندوز ہونے کا جو ثبوت میرزا غالب نے اس مثنوی میں دیا ہے، شاید کسی اور شاعر نے پیش کیا ہو۔ مثنوی 'باد مخالف' کلکتہ کے ادبی ہنگامے کے سلسلے میں لکھی گئی تھی جس میں میرزا نے مختلف اعتراضات کا جواب دینے کے علاوہ یہ بتایا کہ فارسی زبان میں ان کا مسلک و مشرب کیا ہے اور فارسی کے ان چند مشہور اساتذہ کا ذکر کیا جنھیں وہ اپنے لئے زبان و تراکیب کے معاملے میں مشعل راہ سمجھتے تھے۔

سب سے بڑھ کر اہمیت ان کی مثنوی 'ابر گہر بار' کو حاصل ہے جو تمام مثنویوں میں طویل تر ہے - دراصل میرزا غالب رسول اکرم ؐ کے غزوات نظم کرنا چاہتے تھے، لیکن صرف تمہیدات ہی نظم کر سکے یعنی حمد، مناجات، نعت، معراج، منقبت، مغنی نامہ اور ساقی نامہ - قدم آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ اس کام کے لیے جس جمعیتِ خاطر اور اطمینانِ قلب کی ضرورت تھی وہ میسر نہ آ سکا - ساقی نامہ کے آخر میں میرزا فرماتے ہیں۔

زبان تازہ سازم بہ نیروئے بخت	به ذکر شهنشاه بے تاج و تخت
گذشت آن کہ دستان سرائے کہن	ز کیخسرو و رستم آرد سخن
ز فردوسیم نکتہ انگیز تر	ز مرغ سحر خوان سحر خیز تر
رقم سنج منشور یزدانیم	ز ایمانیان گویم ، ایمانیم
بہ اقبال ایمان و نیروئے دین	سخن رانم از سید المرسلین ؐ

اس مثنوی کے ہر حصے کا انداز اساتذۂ سلف سے بالکل مختلف ہے اور میرزا کے بعد بھی ایسا انداز کوئی اختیار نہ کر سکا - مناجات والے حصے میں اپنے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ کم و بیش ایک سو اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں اپنے کردار کی کوئی بھی بات ناگفتہ نہیں چھوڑی، پھر معذرت کے پہلو پیدا کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی - ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ زندگی رنج و درد کے جس آتش زار میں گذری، اس سے دل سراپا جراحت ہے - عالمِ اضطرار میں وہ بار بار حدود سے تجاوز کا قصد کرتا ہے لیکن میرزا اسے حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے - طلبِ بخشش کا یہ رنگ بھی شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ملے -

اس مثنوی کے 'معراج نامہ' اور منقبت کی بھی یہی کیفیت ہے - آخر میں عقلِ انسانی کے امکانات پر جو مغنی نامہ لکھا ہے، وہ بھی ایک منفرد چیز ہے -

شعرگوئی کے وقت کی حالت

ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ شاعروں نے شعر گوئی کے وقت کی کیفیت واضح طور پر بیان کی ہو - عرفی نے ایک جگہ کہا ہے:

از برون لب نہ دانم چون شود، لیک آگہم کز تہ دل تا لبم افسانہ در خون مے رود

یعنی جو کچھ میں کہتا ہوں، معلوم نہیں لبوں سے باہر نکل کر کیا کیفیت پیدا کرتا ہے -

اتنا جانتا ہوں کہ بات دل سے اٹھ کر لب تک آتی ہے تو خون میں ڈوبی ہوئی آتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں عرفی نے شعر گوئی کے وقت کی کیفیت بیان کی ہے۔ اس باب میں میرزا غالب کا قول بدرجہا زیادہ واضح ہے۔ فرماتے ہیں :

بینیم از گداز دل در حگر آتشے چو سیل　　غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

یعنی اے غالب اگر تو شعر گوئی کے وقت کسی طرح میرے ضمیر کے اندر پہنچ سکے تو دیکھے گا کہ دل پگھلا جا رہا ہے اور جگر میں آگ کا سیل موجزن ہے۔ یہ اس کیفیت کا ایک سرسری نقشہ ہے جو حقیقت حال سے آگاہی کے آرزو مندوں کے لئے الفاظ میں پیش کیا گیا اور تمام مجازات سے کام لیا گیا۔ جو اسے ایک محسوس صورت دینے کے لئے ضروری تھے، اور ایسے معاملات میں مجازات کے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا :

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بارگاہ الٰہی میں فریاد

پھر دیکھیے اللہ کی بارگاہ میں کس درد سے فریاد کرتے ہیں :

حیف کہ من بخون تپم وز تو سخن رود کہ تو
اشک بہ دیدہ بشمری ، نالہ بہ سینہ بنگری

آہ ! میں خون میں تڑپ رہا ہوں۔ اے باری تعالٰی! تیرے متعلق کہا جاتا ہے کہ تو آنکھوں میں آنسو گن لیتا ہے اور سینے میں نالہ دیکھ لیتا ہے۔ ''وز تو سخن رود'' غالباً اس لئے کہا کہ کہنے والے کو اس وقت تک دوسرے مصرعے کے حقائق کا ذاتی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ شعر کے یہی نازک اور دقیق پہلو ہیں جن کی نگہداشت ہر شاعر ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ ہر شاعر کو ان پہلوؤں کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ صرف خواص کا کام ہے۔

مسلسل غزلیں

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مسلسل غزلیں بہت کہیں جن میں سے ایک مسلسل غزل کے چند شعر علامہ اقبال نے ''نوائے غالب'' کے زیر عنوان ''جاوید نامہ'' میں بھی شامل کئے ہیں۔ یعنی :

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم　　قضا بہ گردش رطل گران بگردانیم

ان کی مثالیں اس مختصر تذکرے میں پیش نہیں کی جا سکتیں۔

بعض پیش گوئیاں

میرزا نے اپنے متعلق پیش گوئیاں بھی کی ہیں - مثلاً :

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج میں عندلیبِ گلشن نا آفریدہ ہوں

لیکن اس سے بدرجہا زیادہ واضح اور روشن پیشگوئی یہ ہے :

شوکتم را در عدم اوج قبولی بوده است شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواهد شدن

اس پیشگوئی کی پہلی جلوہ افروزی میرزا غالب کی وفات سے ٹھیک ایک سو سال بعد ہوئی - ہم نہیں کہہ سکتے کہ میرزا کے دو صد سالہ برسی پر کیا کچھ ہوگا - اتنا جانتے ہیں کہ جب تک روئے زمین پر فارسی اور اردو کا ادب باقی ہے ، میرزا کا کلام دونوں زبانوں میں عیدین اور نوروز کی شادمانیوں کا سامان بنا رہے گا اور اس پیشگوئی کی کارفرمائی کا سورج کبھی غروب نہ ہوگا ، ان شاء اللہ :

باد برد آن گنج باد آورد و غالب را ہنوز نالۂ الماس پاش و چشم گوہر بار ہست

(ج) تنقیدی شعور کا ارتقاء

فارسی[1] زبان برصغیر میں وارد ہوئی تو نئے جغرافیائی ، معاشرتی اور تہذیبی ماحول کی وجہ سے بعض ایسے عناصر اس کے ادب و شعر میں داخل ہونے لگ گئے جو بعد میں بہت بڑے نزاع کا موجب بنے - دولت شاہ سمرقندی (م - ۹۰۰ - ۱۴۹۴ء) نے نئے ماحول کی وجہ سے زبان و ادب میں پیدا ہونے والے تغیّرات کو کھلے دل سے تسلیم کیا تھا ، مگر معلوم ہوتا ہے بعد کے ایرانی ادیب اور تنقید نگار اس وسعتِ نگاہ کا اظہار نہ کر سکے - انہوں نے استعمالِ ہند اور سبکِ ہندی پر بیجا اعتراضات سے بھی گریز نہ کیا - ان کی یہ بات تو قابل فہم ہے کہ ایران میں مروجہ تازہ محاورے سے بے خبری یا پہلو تہی یہاں فارسی کو مردہ قرار دینے کے مترادف ہو سکتی ہے ، لیکن یہاں کے تخلیق شدہ ادب کو دو ایک مستثنیات کے بغیر یکسر بیکار تصور کرنا بالکل بعید از انصاف ہے - یہاں جو شعورِ تنقید ابھرا تھا اس کی وجہ سے برصغیر کے ادیب اور شاعر ان الفاظ کو ، جو خالصتاً ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا اصلی مفہوم ترجمے میں قائم نہیں رہ سکتا ، استعمال کر لینا جائز

---

(۱) تسلسل کے لئے دیکھیے گذشتہ جلد کا ساتواں باب -

سمجھتے تھے ۔ مثلاً پان کا بیڑہ بالکل ہندوستانی چیز ہے ۔ اس کا کوئی ترجمہ ممکن نہیں ۔ اسے اگر ہمارے شعرا نے 'بیرۂ پان' باندھا تو دنیا کے ماہر لسانیات اسے ہر طرح درست قرار دیں گے ۔ اہل ایران کو اس پر چین بہ جبین نہیں ہونا چاہیے ۔ اصطلاح میں اس کو استعمال ہند کہتے ہیں ۔ پھر یہاں کی فضا کو خیال بافی راس آئی ۔ اسی طرح یہاں ایہام گوئی پر بھی زور زیادہ ہوگیا ۔ اہل ہند دقیق معانی کو طبعاً پسند کرتے تھے ۔ اس قسم کی چیزیں اہل ایران کی طبع پر گراں گذرتی تھیں ۔ ان کی بعض باتیں درست بھی تھیں ۔ ہندی ایرانی نزاع یہاں ہولے ہولے بڑھتا چلا گیا اور بالخصوص ساخر مغل بادشاہوں کے دور میں اس میں بڑی شدت پیدا ہو گئی ۔ اس کا تعلق تنقیدی، شعور کے دو مختلف زاویوں سے ہے ، اس لئے اس کا یہاں اجمالی طور پر ذکر ضروری ہے ۔ اس نزاع کا فائدہ بھی ہوا ، اس کی وجہ سے خاص طور پر علم اللسان آگے بڑھا اور اس کے متعلق ادب کا معتدبہ ذخیرہ جمع ہوگیا ۔ اس لئے اس داستان کو سن لینا مفید رہے گا ۔

اس مناقشے کی اولیّن دستاویز[1] وہ خط ہے جو جلالائے طباطبائی نے عہدِ شاہجہانی میں مُلاّ شیدا کو لکھا تھا ۔ شیخ محمد جان قدسی مشہدِ مقدس سے ۱۶۳۱ء/۱۰۴۱ھ میں وارد ہند ہوئے ۔ ان کے ایک قصیدے پر مُلاّ شیدا نے اعتراضات کئے ، جن میں سے ایک یہ تھا کہ 'زہر آلائے' کا استعمال ، 'زہر آلود گشتہ' کے معنی میں غلط ہے ۔ جلالائے طباطبائی نے مُلاّ شیدا کو ایک طویل خط لکھا کہ فارسی محاورے میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو اسم فاعل کا معنی بھی دیتے ہیں اور اسم مفعول کا بھی ۔ ایسے الفاظ کی مثالیں بھی پیش کیں اور اکابر شعرا میں سے ایک یہ شعر بھی درج کیا ، جس میں 'زہر آلا' کا استعمال انہی معانی میں ہوا تھا :

آں پیمبر کہ برۂ بریان گفت از من مخور کہ زہر آلاست

اس خط کا وہ حصہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے جس میں طباطبائی ہند کے فارسی دانوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ محاورۂ فارسی اہل زبان سے سیکھو :

"این لہجۂ دری از زبان پارسی است ، از افواہ پارسی زبانان باید آموخت

---

(۱) معاصر حصہ پنجم ۔ بحوالہ منشورات تمناً ص ۱۶۴ تا ۱۷۰ ۔ مشمولہ کتاب 'دربار ملی' (فارسی) مطبوعہ مجلس ترقی ادب ، لاہور ۔ ۱۹۶۱ء ۔ ص ۲۸۲ تا ۲۸۵ ۔

و چراغ سخندانی از مشکٰوۂ اندیشۂ ایشان باید افروخت ۔ از مطالعۂ فرہنگ ہا تنہا فارسی زبان نتوان شد و از تتبع دواوین قدما از پیش قدمان این وادی نتوان گشت ۔"

اہل ہند پر یہ سب سے بڑا اعتراض تھا جو اہل ایران نرم یا تند و تیز لہجے میں کرتے رہے ۔ طباطبائی نے ضمناً عرفی کا ذکر بھی کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے عرفی پر بھی کوئی ایرانی فاضلِ زبان معترض ہوا اور عرفی نے بر افروختہ ہو کر جواباً کہا :

"ملا" ما پارسی از انوری و خاقانی آموختہ ایم و سہ از بہرہ زالان مسکین ۔"

طباطبائی کہتا ہے عرفی کا یہ جواب غلط ہے کیونکہ انوری اور خاقانی نے بھی فارسی زبان آغوشِ مادر ہی میں سیکھی تھی ۔ اس لئے نارہ و ورے سے آگاہی کے بغیر فارسی زبان نہیں آ سکتی ۔ یہ دو زاویہ ہائے نگاہ ہیں اور یہی دونوں اس تنازعے کی اصل ہیں ۔ صداقت ان دونوں متضاد زاویوں کے درمیان ہے ۔ اگر ہمارے شعورِ نقید نے اپنی رفتارِ ارتقاء جاری رکھنا ہے اور ہم نے اپنے اسالیب بیان کو زیادہ جاندار بنانا ہے تو سبکِ خراسانی[1] ، سبکِ عراق اور سبکِ ہندی وغیرہ کے تمام محاسن اور معائب کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنا

---

(۱) سبک خراسانی ، سبک عراق اور سبک ہندی کے درمیان امتیازات معلوم کرنے کے لئے دیکھیے مقالہ "فارسی غزل — لغت و تاریخ کی روشنی میں" از مرزا مقبول بیگ بدخشانی ۔ 'مجلہ صحیفہ' بابت جولائی ۱۹۶۲ء ۔ سبک خراسانی میں سادہ الفاظ ہوتے ہیں ۔ تشبیہات اور استعارات بھی سادہ اور فہمِ انسانی سے قریب تر ہوتے ہیں ۔ مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کا بیان ہوتا ہے ۔ مطالب میں تسلسل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ شاعر ایجاز کی بجائے اطناب پسند کرتے ہیں ۔ اس لئے رباعی ، قطعہ یا غزل کی بجائے وہ قصیدہ لکھتے ہیں ۔ اس سبک کے پیرو رودکی ، عنصری ، منوچہری ، فرخی وغیرہ تھے اور خراسان کے رہنے والے تھے ۔ سبکِ عراق کا تعلق عراقِ عجم یعنی اصفہان ، آذربائیجان اور رے سے تھا ۔ اس کے پیرو جمال الدین اصفہانی ، کمال الدین اصفہانی ، خواجو کرمانی ، سعدی اور حافظ تھے ۔ اس سبک میں فکر و تخیل کا زیادہ عنصر ہے ۔ دور از فہم تشبیہوں اور لفظی صنعت گری کے ساتھ معانی بلند ہیں ۔ مختلف قسم کی علامات سے کام لیا گیا ہے ۔ تصوف و عرفان اور فلسفہ کے مطالب ہیں ۔ عشق مجازی کے ذریعے عشق حقیقی کا بیان ہے ۔ تاثر ، جذبہ اور احساس بھی موجود ہے ۔ غزل پر توجہ زیادہ ہے ۔ جہاں تک سبک ہندی کا تعلق ہے ، اس کا ذکر دوسری جلد میں کر دیا گیا ہے ۔

ہوگا اور اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ یہاں فارسی ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پھلتی پھولتی رہے ، تو جہاں مناسب استعمال ہند کے لئے اس کی آغوش وا رہنا ہوگی وہاں ایران کے محاورۂ جدید سے بھی صحیح معنوں میں استفادہ لازمی ہوگا ۔ دوسرے الفاظ میں قدیم اور جدید دونوں کو بیک وقت نگاہ کے سامنے رکھنا ضروری ہے ۔

اہل ایران نے اس عصبیت کا اظہار شاہجہان کے زمانے سے پہلے شروع کر دیا تھا ۔ عبدالقادر بدایونی 'منتخب التواریخ'' میں لکھتا ہے کہ جب امیر خسرو نے خمسہ' نظامی کا نہایت ہی کامیاب جواب لکھا تو ان کے ایک معاصر ایرانی شاعر عبید نے کہا :

غلط افتاد خسرو را ز خامی | کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

گویا امیر خسرو اور عرفی ، جن پر فارسی ادب بجا طور پر ناز کرتا ہے ، وہ بھی اس عصبیت کا نشانہ بنے ہیں ۔ اس لیے شیدا بیچارے کا ذکر ہی بیکار ہے ۔ طباطبائی نے اپنے مذکورہ بالا خط میں غصے میں آ کر اسے ''گوسالہ پرست'' تک کہہ دیا ہے ۔

ہندی ایرانی نزاع میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب محمد شاہی دور میں شیخ محمد علی حزین ۱۷۳۳ء - ۱۷۳۴ء میں یہاں آئے ۔ انہوں نے جب یہاں کے فارسی دانوں کا لب و لہجہ سنا ، ہندی اساتذۂ فارسی کے اسالیب بیان پر غور کیا اور لوگوں کو ان پر نازاں اور مصر دیکھا تو برہم ہوئے ۔ فیضی اور ابوالفضل کی رعایت کرتے ہوئے کہا کہ زاغان ہند میں سے ان سے بہتر کوئی نہیں ۔ ناصر علی کی نظم اور بیدل کی نثر کو سامان ریشخند سے زیادہ اہمیت نہ دی ، میرزا محمد رفیع سودا کا فارسی کلام سنا تو اس طرح داد دی : ''در پوچ گویان ہند بد نیستی'' اور نور الدین واقف کا ایک شعر سنا تو جھٹ کہہ دیا : ''در تمام ولایت گردیدم شعر دمدار آکنون شنیدم''۔ شیخ صاحب کے یہ چبھتے ہوئے فقرات سن کر یہاں کے فارسی گو سخت غصے میں آئے ۔ وہ امیر خسرو ، عرفی ، نظیری ، ظہوری ، صائب ، ناصر علی سرہندی ، بیدل جیسے اساتذۂ ہند کے نام حرز جان بنائے پھرتے تھے ۔ جب لوگوں کے دلوں میں غم و غصہ کے جذبات پائے جاتے تھے ، شیخ محمد علی حزین نے یہاں اپنا دیوان مرتب کیا ۔ سراج الدین علی خاں آرزو (م - ۱۷۵۶ء) نے ان کے پانچ صد اشعار کو ناقص اور نامربوط قرار دیا اور اپنے ان اعتراضات کو 'تنبیہ الغافلین' کے نام سے

---

(۱) عبدالقادر بدایونی ، منتخب التواریخ ، جلد اول ، ص ۳ - ۲۲۲ -

مرتب کیا ۔ اس کے جواب میں شیخ محمد علی حزین نے کتاب 'رجم الشیاطین' تصنیف کی جس میں خان آرزو کو ''حرامزادۂ اکبر آباد'' کہنے سے بھی دریغ نہ کیا ۔ خان آرزو نے بعد میں اپنی تصنیف 'احقاق الحق' اور 'داد سخن' میں بھی اس سلسلے کو جاری رکھا ۔ اس نزاع میں اور بھی بہت سے زبان دان دونوں طرف سے شامل ہوئے اور 'جواب شافی'، 'قول فیصل' اور 'اعلای الحق' جیسی کتابیں لکھی گئیں لیکن ہمیں زیادہ تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ۔ شیخ حزین روزمرۂ ایران اور سعدی جیسے سلف اور صحت اسلوب کے حق میں تھے ۔ خان آرزو ہندی اسالیب فارسی کو اس زبان کا قیمتی سرمایہ قرار دیتے تھے ۔ ان تمام باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ سارا نزاع معائب سخن کے متعلق تھا ۔ اور معیار تنقید میں اس سے بڑا اضافہ ہوا ۔ اس بحث کا ایک پہلو خاص طور پر شاندار تھا ۔ خان آرزو نے اپنی کتاب 'مثمر' میں سنسکرت اور فارسی کے درمیان ہندی توافق پر زور دیا اور کہا اسی توافق کی وجہ سے استعمال ہند پر اعتراض بے معنی ہے ۔ توافق لسانین کا اصول معلوم کر کے خان آرزو نے ایک نئی جہت کا انکشاف کیا ۔ خان آرزو اس دریافت کو بجا طور پر ایک بہت بڑا کارنامہ تصور کرتے تھے ۔ کہتے ہیں[۱]

''حق آنست کہ تا الیوم ہیچ کس بہ دریافت توافق زبان ہندی و فارسی ... متہتد نہ شدہ ... الا فقیر آرزو ۔''

ظاہر ہے اس توافق کی دریافت کے باعث تنقید لسانیات اور فقہ اللغہ کا ایک نیا باب کھلا ۔

معاییر تنقید کے متعلق یہ بحث جاری رہی اور اخلاف میں میرزا محمد رفیع سودا (م - ۱۷۸۱ء) جیسے شعراء نے اردو میں شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ دی ۔ وہ فارسی میں بقول حزین 'پوچ گو' نہیں بننا چاہتے تھے ، لیکن یہ بعد کے اثرات ہیں اور ہمیں ان سے سروکار نہیں ۔ جو لوگ فارسی گو تھے وہ ان ادام میں حزین کے اعتراضات کو درخور اعتنا سمجھے بغیر ذوق و شوق کے ساتھ شعر کہتے رہے ۔ محمد شاہ کے عہد میں ایہام لفظی کو کمال سخن گوئی سمجھا جاتا تھا ۔ اس لحاظ سے میرزا عبدالغنی بیگ قبول (م - ۱۷۲۶ء) اور ان کے بیٹے میرزا گرامی (م - ۱۷۴۳ء) کو امتیاز حاصل ہے ۔

قومی اور ملی حادثے بھی زبردست مہیجات تخلیقی ثابت ہوتے ہیں ۔ ملتوں کی موت ،

---

(۱) سراج الدین علی خان آرزو ، مثمر قلمی ، برگ ۹۳ ۔

تہذیبوں کے خاتمے اور اقدارِ عالیہ کی پامالی کے باعث بھی ایسا جذبۂ تخلیقی طاری ہوتا ہے کہ عظیم نظمیں تصنیف ہو جاتی ہیں ۔ فردوسی کے دل میں ایران کی ملتِ قدیم کی تباہی کے سبب ایسا درد پیدا ہوا تھا کہ اس نے شاہنامہ جیسی لافانی نظم لکھ ڈالی ۔ انوری کی نظم اشکہائے خراسان اور سعدی کا مرثیۂ بغداد بھی قومی اور ملی سانحوں کی یادگاریں ہیں ۔ شاعر کی طبیعت میں وسیع جذبۂ غم پیدا ہوتا ہے جو اظہار چاہتا ہے اور اعلیٰ درجے کی نظموں کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ زوال کے ایام میں بڑی بڑی نظموں کے لکھے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے ۔ مغلیہ دور میں اس قسم کی سب سے پہلی نظم آشوبِ ہند لکھی گئی جو مُلا بہشتی نے شاہجہان کے بیٹوں کی باہمی مجادلت پر تصنیف کی ، مگر اس میں جذبۂ غم کی اتنی زیادہ پہنائی نظر نہیں آتی ۔ اس کے برعکس اورنگ زیب عالمگیر کی وفات پر جعفر زٹلی نے ایک مختصر سا مرثیہ لکھا مگر اس میں جذبۂ غم پھیل کر آفاق گیر بنتا نظر آتا ہے ۔ اگرچہ مغلوں کی شہنشاہیت نادر شاہ کے حملے کے باوجود محمد شاہ کی وفات تک برقرار رہی ، لیکن اس طرح نظر آتا ہے کہ فضائلِ تہذیبی بھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگ گئے تھے ۔ اس صورت حالات کو دیکھ کر میرزا عبدالقادر بیدل نے دو شہر آشوب مخمس لکھے جن میں بااقتدار طبقے کو بڑے زور سے جھنجھوڑا گیا ہے ۔ ان کو پڑھ کر دل میں یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کو لذّت پرستی اور عیش کوشی کے بحرِ عمیق میں غرق ہونے سے بچانے کے لیے آخری کوشش کی جا رہی ہے ۔ موادِ شعری گرد و پیش سے مل رہا تھا اور شاعر اپنے زخم خوردہ دل سے نالۂ جگر خراش بلند کر رہا تھا ۔ میرزا بیدل ۱۷۲۰ء میں وفات پا گئے ۔ محمد شاہ کو تخت نشین ہوئے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا ، اس لیے ان شہر آشوبوں کا تعلق عہدِ جہاندار شاہ (۱۳ - ۱۷۱۲ء) سے نظر آتا ہے ۔ لیکن محمد شاہ کے زمانے میں اخلاقی انحطاط نے زور پکڑا ، نظم و نسق بگڑنا شروع ہوا اور اقدار میں تزلزل رونما ہونے سے کاروبار میں بھی خلل پیدا ہو گیا ۔ جن قابل قدر چیزوں کی پہلے مانگ تھی ان کی طرف نظر کم اٹھتی تھی ۔ کئی امراء مفلوک الحال ہو گئے ۔ اس وقت شاہجہان کے مشہور و معروف امیر علی مردان خان کی اولاد میں سے نواب صدر الدین محمد خان فائز دہلوی (م - ۱۷۳۸ء) نے 'شہر آشوب' مثنوی ، مولٰنا روم کی 'مثنویٔ معنوی' کی بحر میں لکھی جس میں انہوں نے اس وقت کے معاشرے کی تصویر بڑے درد دل کے ساتھ کھینچی ۔ کہتے ہیں :

دردمندم ، مستمندم ، دلفگار　　دیدہ چشمم سرد و گرم روزگار

آنچہ دیدم ، صاف گفتم من ترا	نے غلط بستم بکس نے افترا

نواب فائز فارسی اور اردو کے شاعر تھے - ان کے نزدیک معیار سخن یہ تھا کہ معاسرے کے عیوب ایسے صاف ، صریح اور اثر انگیز پیرائے میں بیان کیے جائیں کہ پڑھنے والے تڑپ اٹھیں اور مائل بہ اصلاح ہو جائیں - 'وہ ایک ملّت اور اس کے ساتھ ایک ارفع اور اعلیٰ تہذیب کو تباہی سے بچانا چاہتے تھے - دور زوال نے شاعری کو ایک نیا موضوع دیا تھا ، مقصد شاعری میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی اور اسلوب بھی مختلف ہونے لگا - اس سلسلے کی آخری نظم وہ شہر آشوب غزل ہے جو مغل شہنشاہ شاہ عالم نے ۱۷۸۸ء میں اپنے اندھا ہونے پر لکھی اور جس کا مطلع یہ ہے :

صرصر حادثہ برخاست پے خواریٔ ما	داد برباد سرو برگ جہانداریٔ ما

اور دوسرا شعر یہ ہے :

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم	برد در شام زوال آہ سیہ کاریٔ ما

اکیس اشعار ہیں اور ہر شعر اس ملت اسلامیہٴ ہندیہ کا مرثیہ ہے جو برّ صغیر کی حکومت سے محروم ہو کر ختم ہو رہی تھی قابل غور امر یہ ہے کہ عہدِ اکبری میں آفاق گیر حوصلوں کی وجہ سے زندگی کے دوسرے اداروں کے علاوہ نظریہٴ سخن میں بھی تغیر رونما ہوا تھا اور حسین و جمیل فکر انگیز شاعری وجود میں آئی تھی - اب جب کہ آفاق سمٹتے چلے جا رہے تھے ، سخنوری نے ایک نیا رخ قبول کیا - اس میں فنی پختگی سے زیادہ درد مندی اور اثر انگیزی پیدا ہوئی اور نقد الشعر کا ایک اور زاویہ نگاہوں کے سامنے آیا - اگرچہ اس وقت اس کی مہتم بالشان حیثیت سے کوئی آسنا نہیں تھا لیکن اس کے مضمرات سے کام لے کر بعد میں اقبال (م - ۱۹۳۸ء) نے شعر گوئی کا وہ معیار پیس کیا جس نے ایک نیم مردہ ملت کو نئی زندگی عطا کی - تنقیدی نظریات کی رو سے یہاں جس درد انگیز رثائیہ شاعری[۱] کا ذکر ہوا ہے اسے فردوسی اور اقبال کے کلام کے ساتھ جانچنا چاہیے -

ہم نے دیکھا ہے کہ ابوالفضل ، فیضی ، خان آرزو یہ تمام اکابر برصغیر کے فارسی

---

(۱) ہمارے نزدیک انیس (م - ۱۸۷۴ء) اور دبیر (م - ۱۸۷۵ء) کی اردو میں مرثیہ گوئی بھی اس مستمند ملی فضا کی پیداوار ہے جو ہمارے دور زوال میں رونما ہوئی - البتہ ان کے ہاں جذبات میں پاکیزگی ، قدوسیت اور رفعت پیدا کر لی گئی ہے -

کے شاعروں اور انشا پردازوں کو اجتہاد کا حق دیتے تھے ۔ تقلید ان کے نزدیک زندگی کی نہیں بلکہ موت کی علامت تھی ۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ایک ہندو گھرانے میں قتیل پیدا ہوئے ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے اور محنت کرکے فارسی میں استاد کا مقام حاصل کیا ۔ ان کا سال وفات ۱۸۲۴ء ہے ۔ انھوں نے یہاں کے فارسی زبان کے شاعر اور منشی کو اپنی کتاب 'شجرۃ الامانی' میں جو نصیحت کی اسے پڑھیے :

"طالب این فن را باید کہ در محاورۂ صاحب زبانان 'دخل نکند' و
ہر چہ در کتب اینہا بیند مستعمل کند و 'خود را از مقلدان بداند' ۔"

یہ سارے فارسی گویان ہند کو مقلدِ محض بنا دینا چاہتے تھے ، حالانکہ تقلید اور تخلیق کا آپس میں بیر ہے ۔ میرزا بیدل نے اپنے لڑکے کے مرثیہ میں 'خرام کاشتن' کا محاورہ استعمال کیا تھا ۔ قتیل اسے محض اس لیے قابل اعتراض قرار دیتے ہیں کہ ایک ہندی کا وضع کردہ ہے ۔ اگر ایران یا توران کا کوئی شاعر وضع کرتا تو صحیح تھا ؟ اسے تقلید جامد نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے ۔ وہ تورانیوں کے محاورے کو بھی سند کے قابل سمجھتے ہیں ۔ 'نہر الفصاحت' میں کہتے ہیں :

"برائے مقلد شعر فارسی ایران و توران ہر دو سند است ۔"

یہاں بھی اہل ہند کے لیے 'مقلد' کا لفظ اختیار کیا ہے ۔ صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ وہ ہند کے فارسی گو شعراء کو اس سے زیادہ درجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے ۔ حالانکہ یہ لوگ فارسی کو ہر طرح اپنی زبان سمجھتے تھے ۔ یہ شاید قتیل کے نو مسلم ہونے کا نتیجہ تھا کہ وہ تحت الشعور میں اسلام کو کلیتاً بدیشی تصور کرتے تھے در آنحالیکہ برصغیر فارسی اور اسلام دونوں کا اب گھر بن چکا تھا ۔ قتیل کی 'شجرۃ الامانی' ، 'مظہر العجائب' ، 'نہر الفصاحت' ، اور 'چار شربت' کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ برصغیر کے بندگان تقلید کے لیے اپنی اصل قوم کی پرانی ذہنیت کے مطابق لسانی کلیے تجویز کر رہے ہیں جن سے یہاں کے فارسی سیکھنے والے بقدر استطاعت 'زلّہ ربائی' کر سکتے ہیں ۔ وہ اساتذہ فارسی کی کتابوں سے چن چن کر مناسباتِ شعری اور متعلقات شعری کے بنے بنائے سانچے مہیا کر رہے تھے تاکہ یہاں ان کی پیروی ہوتی رہے ۔

قتیل سے پہلے میر شمس الدین فقیر (م - ۱۷۶۹ء) نے فنِ بلاغت میں ایک نہایت

قابل قدر کتاب 'حدائق البلاغت' لکھی - فنی بحثوں کے نقطۂ نگاہ سے رشید وطواط اور شمس قیس رازی کی تصنیفات سے اسے فروتر نہیں کہا جا سکتا ، بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ میر صاحب کا ذہن زیادہ دراک ہے - اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اساتذۂ ہند کے کلامِ فارسی سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں - شعر گوئی کو وہ فن قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں :

"فن شعر از نفائسِ فنون و لطائفِ علوم است"

اسی فنی لفاست اور لطافت کو قائم رکھنے کے لئے اُنہوں نے بلاغت کو اپنا موضوع بنایا - اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی بحثوں میں کیسے پاکیزہ ذوق کا اظہار کیا ہوگا - لیکن جیسا کہ میرزا قتیل کے تذکرے سے ظاہر ہے ، اس دور میں شاعری کے میکانکی پہلو کی طرف زیادہ توجہ تھی - 'نہر الفصاحت' کا ساتواں باب (موج ہفتم) 'حدائق البلاغت' کے پہلے باب (حدیقۂ اول) سے بالکل مطابقت رکھتا ہے - دونوں علم بیان سے تعلق رکھتے ہیں - اسی طرح 'چار شربت' قتیل کے شربت اول میں بھی 'حدائق البلاغت' کے تیسرے اور چوتھے ابواب کی طرح عروض اور قوافی کا ذکر ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دور علم معانی و بیان و بدیع کی اہمیت کا دور تھا - اُنیسویں صدی عیسوی شروع ہوئی تو پاک و ہند میں فارسی ایک نیم جان زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی - زبان اُردو کا عہد شباب تھا - فارسی میں تقلیدی ذہنیت کا زیادہ رواج تھا اور تنقیدی شعور بھی تقلید کا شکار ہو چکا تھا -

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصلاح کی ضرورت سے کوئی آگاہ نہیں تھا - فارسی زبان اور اس میں تنقیدی شعور نے ابھی اپنا سفر ارتقاء جاری رکھنا تھا - ابھی برِصغیر میں غالب (م - ۱۸۶۹ء) اور اقبال (م - ۱۹۳۸ء) کا ظہور باقی تھا - اصلاح کی ضرورت اول اول میرزا مظہر جان جاناں (م - ۱۷۷۷ء) نے محسوس کی تھی - آپ سے پہلے ایہام گوئی عام تھی - جس میں ذو معنی الفاظ لائے جاتے تھے - سامع کا ذہن معنیٔ قریب کی طرف منتقل ہوتا تھا لیکن شاعر کی مراد معنیٔ بعید سے ہوتی تھی - مثلاً میر شمس الدین فقیر (م - ۱۷۶۹ء) کے مندرجۂ ذیل دو شعروں میں :

گم کردہ ام بُتے را در کوچۂ خرابات — اے خضرِ راہِ مستان بنما بمن خدا را
بخاکدانِ جہان گنج بے نیازی را — کسے نیافتہ غیر از فقیر خانہ خراب

لیکن ان شعروں میں ایہام قدرتی طور پر وارد ہؤا ہے اور مستحسن ہے ۔ مگر بہت سے شعراء صنعتِ ایہام تکلفاً لاتے تھے اور شعر چیستان بن کر جذبے سے عاری ہو جاتا تھا ۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس صنعت کا اصلی دور اب ختم ہو گیا ہے ۔ اس لئے میرزا مظہر جانجاناں نے اسے ترک کر کے صاف اور شستہ انداز اختیار کیا ۔ آپ کے بعد میرزا قتیل کے معاصر غلام ہمدانی مصحفی (م - ۱۸۲۴ء) نے اس انداز کو جاری رکھا ، اگرچہ مظہر جان جاناں کے کلام کی طرح ان کا کلام رفتہ اور شستہ نہیں ۔ بہرحال تخلیقِ شعری میں جذبہ و احساس کی ضرورت خود قتیل کے زمانے میں محسوس کر لی گئی تھی ۔ یہ فارسی شاعری کا احیائی رجحان تھا ۔ تازہ گوئی ایک نئی تحریک کے طور پر نقدالشعر کو متاثر کر رہی تھی ۔ یہ نئی تحریک میرزا غالب تک پہنچتی ہے مگر اُن کا ذکر کرنے سے پہلے ہم دو ایک اور باتوں کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں ۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اکبری دور میں تازہ گوئی محض اسلوبِ سخنگوئی تک محدود نہیں تھی بلکہ افکارِ عالیہ کو اساسی حیثیت دے کر اس نے قوم کی فکری اور نظریاتی بنیاد کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی ۔ اس طرح اس کے ذریعے قوم کی مخصوص روح ادبِ عالیہ میں منکشف ہونی شروع ہوئی ۔ جیسا کہ عرفی نے کہا تھا ، سوزِ دروں محرّکِ تخلیق تھا اور شعراء کے افکار کا بیان حسین پیرائے میں اس لئے ہوتا تھا ، کہ حقیقت کا کامل اور فطری اظہار صرف حسن کی صورت میں ممکن ہوتا ہے ۔ تازہ گوئی کے یہ انداز بیدل تک جاری رہے ۔ بیدل تک پہنچتے پہنچتے فن کے مقصد میں ادراکِ عالم ، ارتفاعِ نفس ، اصلاحِ اخلاق اور ماورائیت سے تعلق کوشی کے عناصر شامل ہو چکے تھے ۔ مظہر جان جاناں کے وقت سے جب تازہ گوئی نے ایک جدید تحریک کے طور پر تنقیدی شعور کو متاثر کرنا شروع کیا تو محولہ بالا تمام امور کو از سرِ نو ہدف بنایا گیا ۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک اور تحریک بھی کام کر رہی تھی ۔ فن کے مقصد میں مسرت انگیزی کی جہت بھی شامل کر لی گئی تھی اور اس کے لیے موضوعات پاکستان و ہند کی وطنی داستانوں سے حاصل کئے گئے ۔ ہیر رانجھا ، سسی پنوں ، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں کی داستانیں بڑے دلپذیر اسلوب کے ساتھ فارسی نظم میں بیان کی گئیں ۔ یہ مثنویاں مختلف شعراء نے تصنیف کیں ۔ ان تمام نے اپنے وطن کے مناظر کافی حد تک مقامی تشبیہات اور استعارات کے ذریعے بیان کئے اور اپنی مثنویوں میں اپنے شہروں اور یہاں کے طور طریقوں کا ذکر کیا ۔ گویا تفریحی ادب کی ہی تخلیق نہیں ہو رہی تھی بلکہ ان شعراء کا شعورِ تنقیدی انہیں کہہ رہا تھا کہ اپنی ان نظموں میں ہر لحاظ سے وطنی فضا قائم کی جائے ۔ یہ بالکل

نئی اور خوش آیند چیز تھی ۔ اس عہد کی تاریخی اور واقعاتی مثنویوں میں بھی اسی طرح مقامی موضوعات سے کام لیا گیا ۔

اس دور میں میرزا غالب سے پہلے غزل اور مثنوی کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن کی تخلیقات بھی نظر آتی ہیں لیکن تنقیدی شعور کے ارتقاء میں ان کا کوئی خاص مقام نگاہوں کے سامنے نہیں آتا ۔ اکثر و بیشتر پرانے افکار تھے جو گھسے پٹے اسالیب میں بیان ہوتے رہے ۔ البتہ نظم کو چھوڑ کر جب ہم نثر نگاری کو موضوعِ فکر بناتے ہیں تو ہمیں اس دور میں ایک بڑا پسندیدہ رجحان نظر آتا ہے ۔ 'سہ نثر ظہوری' میں صنعتوں کا جس وفور سے استعمال شروع ہؤا تھا اس نے انجام کار بالخصوص 'رقعات بیدل' میں تلازمات کی کثرت کے باعث نثر نگاری کو معمے کی صورت دے دی تھی ۔ یہ معلوم کرنا کہ بیدل کیا کہہ رہے ہیں کوہ کندن کے مترادف تھا ۔ ظاہر ہے نثر وضاحت اور صراحت کے اوصاف سے عاری ہو چکی تھی اور اس سے ابلاغ مقصود نہیں رہا تھا ۔ امیر خسرو ، ابوالفضل ، ظہوری اور بیدل نے نثر کے جن اسالیب کے نمونے چھوڑے تھے ، اٹھارھویں صدی عیسوی میں بھی ان کا اتباع ہوتا رہا ۔ لیکن جس طرح غزل گوئی میں اصلاح مظہر جانجاناں سے شروع ہوئی نثر نگاری میں بھی سلاست اور سادگی کا آغاز انہیں نے کیا ۔ نثر میں اصلاح کی یہ تحریک انیسویں صدی عیسوی میں میرزا غالب کے خطوط کے مجموعوں 'پنج آہنگ' اور 'باغ دودر' میں اپنے اثرات بڑے دلکش انداز سے دکھاتی ہے اور مراسلہ مکالمہ بن جاتا ہے ۔ مثلاً 'باغ دو در' سے ہرگوپال تفتہ کے نام ایک مکتوب کے ابتدائی چند فقرات ملاحظہ ہوں :

"اگر جان بیوفا نبودی ، گفتمی کہ جانِ من و اگر در دہر آبرو داشتمی
گفتمی کہ آبروی من ۔ چون ازینہا ہیچ نتوان گفت ناچار میگویم کہ
ہان ای تفتہ رازداری بمن میاموز ، من خود اندرین شیوہ ہمتا ندارم ۔"

لیکن میرزا غالب نے 'مہرِ نیمروز' اور 'دستنبو' میں سلاست کو اس طرح قائم رکھنا پسند نہ کیا ۔ میرزا غالب کے معاصر مومن خان مومن نے بھی اپنے خطوط میں ہلکا پھلکا اسلوب اختیار کیا ۔ اس قسم کی مستثنیات ایک خوش آیند رجحان کا ثبوت ہیں ۔ لیکن یہ کہنا بھی درست ہے کہ عام مکتوبات اور نثری تصنیفات میں اسلوب کا بوجھل پن کم و بیش بدستور موجود رہا ۔

میرزا غالب ایک آزاد منش انسان تھے ۔ ان کی فطرت بندھنوں کو برداشت نہیں کر سکتی

تھی - اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے وہ عہد اکبری کے شعراء سے مماثلت رکھتے تھے - وہ فیضی کی طرح تقلید کو خود کشی کے مترادف سمجھتے تھے ، عرفی کی طرح خوددار اور خودبین بھی تھے ، نظیری کی طرح پیش پا افتادہ باتوں سے انہیں کراہت تھی - انہی کی طرح وہ ایک نئی دنیا کے متلاشی تھے - اجتہاد ذاتی ، نئے افکار ، نئے اسالیب ان کی فطرت کو بیحد پسند تھے - وہ ایک اجتہادی شان کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور انہیں یقین کامل تھا کہ دنیا میں وہ حرف مکرر نہیں ، بلکہ اپنی نظیر آپ بن کر پیدا ہوئے ہیں - وہ بیدل کے اسی لئے معتقد تھے کہ وہ شاعرِ کبیر بھی عمر بھر اپنی فطرت کا مداح رہا اور افکار اور اسالیب میں اس نے اپنی راہ خود نکالی - جب قتیل کے شاگردوں اور صاحبِ 'برہان قاطع' کے معتقدوں نے انہیں تقلید کی سلاسل کا پابند کرنا چاہا تو انہوں نے انہیں توڑ ڈالا اور اس بات سے بے نیاز رہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ بعض غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں - اصفہان اور یزد ان کے لئے محض آزادی کی علامت تھے کیونکہ ایران اور توران کے محاورے کو تو خود قتیل سند قرار دیتا تھا - دراصل غالب ذہنی طور پر دور اکبری میں رہ کر مغلیہ دور عروج کی روایات کہال کو جاری رکھنا چاہتے تھے - اس لئے وہ ہر لحاظ سے ایک تازہ گو شاعر کہے جا سکتے ہیں - ہم جب یہ کہتے ہیں کہ مغلیہ تہذیب کے محاسن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ غالب کے فن میں جلوہ گر ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تازہ گوئی کی روایات ایک دفعہ پھر غالب کی ذات میں زندہ ہو گئیں - اس کی روح میں عظمت تھی ، ان کے افکار عظیم تھے ، اس لئے وہ مجاہدانہ شان کے ساتھ عظیم تازہ گو شعراء کی صف میں شامل ہو گئے - بظاہر یہ میرزا غالب کی قصیدہ گوئی معلوم ہوتی ہے لیکن کیا کیا جائے ان کے فن کی اور کوئی تعبیر ممکن نہیں -

ہمارے شعورِ تنقید نے میرزا غالب سے ایسی روایت پرستی سیکھی ہے جو نئے تجارب کی اجازت دیتی ہے ، ایسا نظریہ سخن حاصل کیا ہے جو گداز دل کے ساتھ اپنے اندر شوخی اندیشہ رکھتا ہے اور دیدہ وری کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے - ایسا اسلوبِ بیان اخذ کیا ہے جو کہال گویائی کے باوجود سمجھتا ہے کہ ناگفتہ اور نایافتہ بہت کچھ باقی رہ گیا - یہ ایک بہت بڑے شاعر کی علامتیں ہیں - غالب کی شخصیت صد رنگ تھی - ایک سے ایک رنگ جدا ، اور پھر اس میں تضادات بھی موجود تھے - غالب کا فن ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے - غالب نے ہمارے شعور تنقید کو یہ بھی بتایا ہے کہ اگر ایک شاعر کے فن سے آگاہی مطلوب ہے تو پہلے اس کی شخصیت کا بہ نگاہِ عمیق جائزہ لینا چاہیے - غالب

کی صد رنگ اور تضادات کو اپنے اندر بخوشی جگہ دینے والی شخصیت کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے کلام میں عقل و جنون ، وجدان و شعور ، ایمان و تشکیک اور متانت و مزاح کی بیک وقت کارفرمائی نظر آتی ہے ۔ اپنی تمام شخصی صفات کا اپنے فن میں وہ بھرپور اظہار کرتے ہیں ۔ اس لئے ہر طبیعت کا انسان ان سے خوب محظوظ ہوتا ہے ۔

وہ خیال آفرینی بھی کرتے ہیں اور حسین تراکیب کے دلدادہ ہیں ۔ ظہوری اور بیدل انہیں اس لئے بھی پسند ہیں کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں ان کا ابلاغ ایسی ہی تراکیب سے ممکن ہے ۔ معمولی موضوعات کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوتے اور جرأت مندانہ انداز کے ساتھ کہہ دیتے ہیں : 'من ہمام ،گس چرا باشم' ۔ شاعری میں وہ کسی ماوراء چیز کے قائل ہیں جس کی تعبیر وہ نوائے سروش سے کرتے ہیں ۔ وہ جن حقائق کا ادراک کرتے ہیں انہیں شعری تجربے سے گذار کر جذبات انگیز طریقے سے پیش کرتے ہیں ۔ خرد کی ان کے نزدیک وہی اہمیت ہے جو فردوسی کے نزدیک تھی ۔ کیونکہ فردوسی نے ہی کہا تھا 'توانا بود ہر کہ دانا بود' ۔ وہ فردوسی کی طرح توانائی یعنی زندگی کے شیدائی ہیں کیونکہ کشش اور جاذبیت صرف زندگی ہی میں ہوتی ہے ۔ اس لئے اس کے جدید امکانات کی طرف ان کی نگاہ ہے ۔ ان کا نظریہ' شعر مندرجہ ذیل دو اشعار کی تعبیر ہے :

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمار دلبری   در دل سنگ بنگرد رقص بتان آذری
بینیم از گداز دل در دلم آتشے چو سیل   غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

غالب کو اپنا قاری اپنے زمانے میں نہ مل سکا ۔ اپنے زمانے میں وہ اپنے آپ کو اجنبی ہی سمجھتے رہے اور کہتے رہے میری باتیں سمجھنے والا کوئی ہے تو سامنے لاؤ :

غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد   بیاورید گر اینجا بود زباندانے

یہ تھے غالب اور یہ تھا ان کا تنقیدی شعور ۔ سلطنت مغلیہ اٹھارویں صدی کے آخر میں ختم ہو گئی لیکن غالب کے فن کی صورت میں اس نے وہ چراغ ہمیشہ کے لئے روشن کر دیا جو مغلیہ دور کے شعورِ تنقید کا حاصل تھا ۔

تیسرا باب

تاریخ

تاریخ نویسی کا ذوق و شوق مسلمانوں کو ابتدائے اسلام ہی سے پیدا ہوگیا تھا جس کا سب سے بڑا محرّک وہ والہانہ محبت و عقیدت تھی جو مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھی ۔ چنانچہ تاریخی نوعیت کی جو کتابیں سب سے پہلے تصنیف ہوئیں وہ سیرت رسول کریمؐ ہی سے متعلق تھیں ، یا پھر صحابہؓ کرامؓ کی زندگی یا اسلام کے فروغ کے زمانے کی جنگوں اور فتوحات سے[1] ۔ لیکن تاریخ نگاری کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع ہوتا گیا اور مسلمانوں کا یہ شوق نہ صرف قائم رہا بلکہ اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا ۔ مسلمان جہاں جہاں بھی گئے ، تاریخ نگاری ان کا محبوب مشغلہ رہا اور تاریخ کو وہ ہمیشہ بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھتے رہے ۔ مشہور ماہرِ علمِ سیاسیات اور مؤرخ ابن خلدون نے اپنی ضخیم تاریخ کے مقدمے میں علمِ تاریخ کی دیگر علوم پر فضیلت کے بارے میں ایک مستقل فصل لکھی ہے ۔ (فضل علم التاریخ علی سائر العلوم) اور کم و بیش یہی خیال دیگر مسلمان علماء کا بھی رہا ہے ۔ عباسی دور سے عربی میں باقاعدہ تواریخ نویسی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا ۔ الطّبری ، ابن الاثیر ، المسعودی ، ابوالفداء ، ابن الخطیب ، ابن الطّقاطقا ، المقّری ، المقریزی ، ابن تغری بردی سب اسی دور کے مشہور و معروف تاریخ نگار ہیں جن میں سے کئی نے ابتدائے آفرینش سے شروع کرکے اپنے زمانے تک کے حالات کئی کئی جلدوں میں بڑی محنت و کاوش سے مرتّب کیے ہیں ۔

تاریخ نگاری کا یہ شوق عربوں کے ساتھ ایران پہنچا اور وہاں سے وسط ایشیا اور برّصغیر پاکستان و ہند میں آیا ۔ یہاں سامانی دور میں کلاسیکی فارسی کی تخلیق اور فروغ کے بعد

---

(۱) مثلاً ابن ہشام کی سیرۃ رسول اللہ صلعم ، ابن سعد کی الطبقات الکبیر اور الواقدی کی کتاب المغازی ، نیز ذرا اور بعد کے زمانے میں ابن الاثیر کی اسدالغابۃ ۔

مسلمان مؤرخین نے اپنی تصانیف فارسی زبان میں لکھنا شروع کیں ۔ برّصغیر میں بالخصوص تاریخ کی جتنی کتابیں اسلامی دور میں تصنیف ہوئیں وہ ابتدا ہی سے فارسی میں لکھی گئیں ، اور تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا دور ہوگا جس کے بارے میں ایک سے زائد مستند کتابیں موجود نہ ہوں ۔ سلطنت دہلی کے دور میں منہاج سراج کی 'طبقات ناصری' ، ضیاء الدین برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' ، خود فیروز شاہ تغلق کی اپنی تصنیف 'فتوحاتِ فیروز شاہی' ، امیر خسرو کی 'خزائن الفتوح' اور 'تغلق نامہ' ، جن کا ذکر تاریخ ادبیات فارسی کی پہلی جلد میں آ چکا ہے ، سب مشہور مآخذِ تاریخ ہیں جو آج تک متداول ہیں اور جن سے اس دور کی تاریخ کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے ۔ مغلیہ عہد حکومت میں اس ادبی و علمی تحریک کی بدولت جو سمرقند ، بخارا اور ہرات میں امیر تیمور کے زمانے سے ظہور میں آ چکی تھی ، تاریخ نگاری کے ذوق میں مزید اضافہ ہوا ۔ عطا ملک جوینی کی 'تاریخ جہان گشای' ، میر خوند کی 'روضۃ الصفا' اور خوند میر کی 'حبیب السیر' ، میرزا حیدر دوغلات کی 'تاریخ رشیدی' وغیرہ جیسی معرکۃ الآرا تاریخی تصانیف کے مطالعے نے نمونے کا کام دیا اور فارسی زبان میں تاریخ نویسی کا ایک ایسا مربوط سلسلہ شروع ہوگیا جو برّصغیر میں برطانوی حکومت کے قیام تک جاری رہا ۔ چنانچہ بابر کے عہد کے متعلق سب سے زیادہ مستند تاریخی دستاویز خود اس کا اپنا 'بابر نامہ' ہے ، جو اگرچہ ترکی میں لکھا گیا تھا لیکن زیادہ تر میرزا عبدالرحیم خانخانان کے فارسی ترجمے کی شکل میں مشہور ہوا ۔ ہمایوں کے حالات کے لیے اس کی بہن گلبدن بیگم کا 'ہمایوں نامہ' اور جوہر آفتابچی کا 'تذکرۃ الواقعات' موجود ہے ۔ اکبراعظم کے عہد کے لیے سب محقّقین ابوالفضل کے 'اکبر نامہ' اور 'آئین اکبری' اور ملا بدایونی کی 'منتخب التواریخ' سے رجوع کرتے ہیں ۔ جہانگیر کے عہد کے واقعات کے لیے خود اس کی اپنی توزک اور معتمد خان کے 'اقبالنامۂ جہانگیری' کا مطالعہ کر سکتے ہیں ۔ شاہجہان کے عہد سے متعلق عبدالحمید لاہوری کا 'بادشاہ نامہ' اور محمد صالح کنبوہ کی تاریخ 'عملِ صالح' مستند ترین مآخذ ہیں ۔ اورنگ زیب نے اپنے عہدِ حکومت میں تاریخ نگاری ، یا کم از کم درباری اور سرکاری نوعیت کی تاریخ نگاری کی ممانعت کر دی ، لیکن اس کے باوجود خوافی خان اپنی تصنیف 'منتخب اللباب' لکھنے میں مصروف رہا[1] ۔ اورعلاوہ بعض دیگر مؤرخین کے نعمت خان عالی نے 'وقائع عالمگیری' اور 'جنگ نامۂ عالمگیری' کے نام سے اس عہد کے بہت سے ، بالخصوص

---

(۱) کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تاریخ کا نصف حصہ عہدِ اورنگ زیب ہی میں لکھ چکا تھا ۔

مہم دکن سے متعلق واقعات قلم بند کیے ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ درباری قسم کی تاریخ نویسی کا سلسلہ معظم بہادر شاہ اول کے عہد تک برابر جاری رہا اور ایک حد تک اس کے جانشینوں کے زمانے تک بھی ۔

اورنگ زیب (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کے بعد کا زمانہ برصغیر میں اسلامی سلطنت کے تدریجی زوال ، تخت نشینی کے لیے جنگ و جدال اور نتیجۃً علوم و فنون سے ایک گونہ بے رخی کا دور تھا ۔ علاوہ ازیں اس دور میں ایک نئی زبان اردو کی تخلیق کی وجہ سے فارسی زبان کی طرف توجہ کم ہوتی گئی ، لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ ۱۸۵۷ء تک یہاں فارسی تاریخ نویسی کا سلسلہ نہ صرف برابر جاری رہا ، بلکہ اس میں بیش از بیش دلچسپی لی جانے لگی ، چنانچہ جتنی تاریخی کتابیں اس ڈیڑھ دو سو سال کے عرصے میں مرتب کی گئیں اتنی پہلے کسی دور میں نہ لکھی گئی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ کثیر التعداد کتابیں یکساں قدر و قیمت کی نہیں ہیں ، لیکن ان کی کثرت کی وجہ سے زمانۂ حال کے کسی ناقد کے لیے ان کا بالاستیعاب مطالعہ اور ان کی اضافی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ لگانا بہت دشوار ہے ۔ تاہم ان سے فرداً فرداً بحث کرنے سے پہلے بعض ایسی خصوصیات کا ذکر کر دینا ضروری ہے جو ان میں بہت حد تک مشترک ہیں اور سابقہ ادوار کی تصانیف کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہیں ۔

پہلی بات ، جو اس دور کی تواریخ میں نظر آتی ہے ، وہ سابقہ تصانیف کے مقابلے میں جامعیت کی کمی اور بالعموم مرکزیت کا فقدان ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں برصغیر میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ ایک حد تک 'حبیب السیر' اور 'روضۃ الصفا' کے نمونے کی تھیں اور ایک معنی میں انہیں عالمی تاریخیں کہا جا سکتا ہے ۔ ان تواریخ میں ابھی تک قدیم واقعہ نگاری کا رنگ جھلکتا ہے ، مؤرخ کی حیثیت ایک درباری وقائع نویس کی سی ہے اور اس کی تصنیف کردہ تاریخ کا مرکز بادشاہ کی ذات ہے ۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ رجحان کم ہوتا گیا ، جس کی بڑی وجہ مرکزی حکومت کی بتدریج کمزوری اور سلطنت کے مختلف صوبوں کی روز افزوں آزادی اور خود مختاری تھی ۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں بہت سی ایسی تواریخ لکھی گئیں جن کے موضوعِ بحث کا دائرہ محض کسی ایک صوبے یا صوبے کے حکمران بلکہ بعض اوقات محض ایک حاکم کے حالاتِ زندگی تک محدود ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو تاریخی کتابوں میں کافی تنوع پیدا ہوگیا اور

دوسری جانب ان کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔

اس دور کی تاریخی کتابوں کی ایک دوسری خصوصیت ان میں ایسی کتابوں کی کثرت ہے ، جو اس زمانے کے آن سیاسی حالات و واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں جو پے در پے نمودار ہوتے رہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ، اس کے بیٹوں اعظم اور معظّم میں تخت نشینی کی جنگ ، بعد از آن تخت نشینی کے لیے اسی نوعیت کی اور جنگیں ، احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے حملے ، مرہٹوں اور سکھوں کا خروج ، سید برادران[1] کی ریشہ دوانیاں اور بد عنوانیاں ، روہیلوں کی شورش ، غرض یہ کہ بیسیوں واقعات ایسے ہوتے رہے کہ جو صاحبِ بصیرت لوگوں کے لیے باعث تأسف و عبرت تھے اور جن سے متاثر ہو کر انھوں نے ایسی تواریخ مرتّب کیں جن میں یاس و قنوطیت ، بے ثباتیٔ عالم اور دنیوی جاہ و اقتدار کی بے مایگی کا احساس بہت نمایاں ہے ۔ چنانچہ ایک سے زاید تصانیف کے علاوہ ، جن کا نام ہی عبرت نامہ ہے ، کئی اور ایسی کتابیں ہیں جن کے مصنفین نے تاریخ نویسی کی غرض و غایت میں اس چیز کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً سجان رائے نے اپنی 'خلاصۃ التواریخ' کے مقدمے میں کہا ہے کہ :

مطالعۂ کتبِ تواریخ شغلی است بر منصۂ شہود انجمن دانش را چہرہ آرا و بزم خرد را پردہ کشا و چراغ خرد را روغن انداز . . . در اظہار احوال بادشاہان ماضیہ . . . جام جمشید است و آئینۂ سکندر ، در گذارش فنای عالم و عالمیان و عدم بقای جہانیان شاہدی است بدلیل واضح : قطعہ

آہ ازین منزلی کہ دربش است — کہ گزرگاہ شاہ و درویش است
نہ ازین دام می توان جستن — نہ ازین مرگ می توان رستن
آنکہ جاوید بود و ہست یکیست — تا ابد واجب الوجود یکیست

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ بے ثباتیٔ عالم کا یہ تصور ہندو مؤرخین کی کتابوں میں زیادہ نمایاں ہے جو بظاہر نظریۂ مایا سے متاثر تھے ۔[2] اس کے برخلاف ابوالفضل کے

---

(۱) سید عبداللہ اور سید حسین علی جن کا فرخ سیر اور اس کے دو جانشینوں کے زمانے میں بہت زور رہا اور جنہیں محمد شاہ کے عہد میں قتل کر دیا گیا ۔

(۲) اس دور کے تاریخ نگاروں میں ہندوؤں کی تعداد خاصی زیادہ ہے ، جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایلیٹ و ڈاؤسن کی آٹھویں جلد میں کل ۱۷ تواریخ کا ذکر ہے جن میں سے ۹ ہندوؤں کی تصنیف کردہ ہیں ۔

لزدیک ، جس نے اپنی تاریخ اس زمانے میں لکھی جب مغل سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی اور جو گویا اس کے دورِ عظمت و جلال کا نمایندہ ہے ، تاریخ ، آگہی اور دانش آموزی کا ذریعہ ، درمانِ ملال و داروئ غم ہے اور لہٰذا ''چنین معجون دلکشا ناگزیر نشاہ تعلق بود ''۔[1]

ایک تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کی بعض تواریخ بظاہر کسی خاص مقصد کے بغیر محض تفنّنِ طبع یا تفریحِ خاطر کے طور پر لکھی گئی ہیں اور جن کی تحریر کا بڑا محرّک اپنی علمیت و شایستگی اور تہذیب و ثقافت کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں ، جیسے کہ 'مرآۃ آفتاب نما' ۔ اسی طرح ان میں سے بعض تواریخ کا بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کے عجیب و غریب واقعات کو بیان کیا جائے : مثلاً بھولا ناتھ کی کتاب 'تحفۃ الہند' اور آنند رام مخلص کی 'بدائع وقائع' ۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس دور کی ابتدائی تاریخیں ، جیسے کہ 'منتخب اللباب' ، 'عالمگیر نامہ' یا 'مآثر عالمگیری' کم و بیش عام نوعیت کی ہیں اور ان کا محور بادشاہ کی ذات اور دربار شاہی ہے ، تاہم رفتہ رفتہ ایک حیثیت سے تو دائرۂ بحث وسعت اختیار کرتا گیا اور دوسری حیثیت سے تنگ ہوتا گیا ، یعنی موضوعات اور متنوّع ہوتے گئے لیکن مؤرخین کے پیش نظر پوری سلطنت یا پورا ملک نہیں رہا ، بلکہ بسا اوقات سلطنت کا صرف ایک حصہ رہ گیا ، یا تصنیف میں ایک خطۂ ملک کے حالات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور باقی خطوں کا ذکر بہت سرسری طور پر کیا گیا ہے ، جیسے مثلاً قانع کی 'تحفۃ الکرام' میں جہاں مصنف کی زیادہ تر توجہ سندھ کی تاریخ پر مرکوز ہے ۔

ایک اور خصوصیت ، جس کا ذکر کر دینا ضروری ہے ، یہ ہے کہ ان کتابوں میں اکثر تاریخی واقعات کے ذکر کے ساتھ ساتھ جغرافیائی معلومات بھی خاصی مقدار میں فراہم کر دی گئی ہیں ، جیسے کہ رضی الدین کی 'تحفۃ الہند' میں ، بلکہ کہیں کہیں تو تاریخ نے سفرنامے کی شکل اختیار کر لی ہے ، جیسے ابوطالب کی 'مسیر طالبی' اور خواجہ عبدالکریم خان کی 'بیان واقع' میں ۔ معلومات کے ماسوا اس دور کی بعض تواریخ میں آئینِ جہانداری اور نظامِ حکومت کا ایک ضابطہ یا دستور العمل بیان کرنے کی کوشش بھی

---

(۱) مقابلہ کیجیے مقدمۂ سیر المتاخرین ۔

کی گئی ہے ، مثلاً 'دستور العمل' سلاطین میں ، اور بعض میں بادشاہوں کی سیرت اور ان کے کردار کو تاریخی کہانیوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے ، جیسے مثلاً محمد غیاث پشاوری کی 'ریاض الہند' میں ۔ لیکن تقریباً ان سب تصانیف میں ملک کے معاشرتی حالات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ چنانچہ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں جس نئی طرزِ تاریخ نگاری کی ابتدا کی تھی اسے بعد کے مؤرخین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی ۔ اگرچہ کہیں کہیں ضمناً بعض ایسی معلومات ضرور مل جاتی ہیں جن سے اس زمانے کی ادبی و مجلسی زندگی کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے ۔ تاہم یہ ایک ایسی خامی ہے کہ جو مشرقی ممالک کی کم و بیش سب تاریخی کتابوں میں پائی جاتی ہے ، خواہ وہ فارسی میں لکھی گئی ہوں یا عربی اور ترکی میں ۔[۱] لیکن اس دور کی تصنیف کی ایک قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ چونکہ ان میں سے زیادہ تر کسی بادشاہ یا امیر کی جھوٹی خوشامد یا مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کے خیال سے نہیں لکھی گئیں ، اس لیے مصنفین کا نقطۂ نظر اکثر غیر متعصبانہ ہے ، اگرچہ کہیں کہیں کسی خاص شخصیت سے محبت و عقیدت کی بنا پر بطل پرستی کا شائبہ ضرور نمایاں ہوگیا ہے ۔ علاوہ ازیں گذشتہ ادوار کی تواریخ کے مقابلے میں اس زمانے کی کتابوں میں ترتیبِ زمانی کا لحاظ اور واقعات کی صحیح تاریخوں کا التزام زیادہ پایا جاتا ہے اور ان کا اسلوبِ نگارش عموماً سادہ اور سلیس ہے ، جس کا سبب یقیناً یہ نہ تھا کہ ان کے مصنفین رنگین و مرصّع انشاء نگاری سے بےبہرہ اور نا آشنا تھے ، کیونکہ ان کے دیباچوں اور مقدموں میں صنائع و بدائع کا استعمال موجود ہے ، بلکہ اصلی سبب ان کی یہ خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی تصانیف کو پڑھ سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں ۔ برِصغیر میں فارسی زبان دانی کے روز افزوں زوال کے باعث سادگیٔ اسلوب ضروری ہوگئی تھی ، کیونکہ ایسے لوگوں کی روز بروز کمی ہوتی جا رہی تھی جو مثلاً 'تاریخِ وصّاف' یا 'انشای ابوالفضل' کو آسانی سے سمجھ سکیں اور استعاروں ، کنایوں اور تلمیحوں کے ہفتخوان میں سے گذر کر گوہرِ مقصود تک پہنچنے کی استعداد رکھتے ہوں ۔ اس دور کا واحد دقیق نویس شاید نعمت خان عالی ہے جس نے اشارات و کنایات کے استعمال کو اپنے 'وقائع' میں انتہا تک پہنچا دیا ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سلیس نگاری کا ایک سبب انگریزی یا یورپی اثرات ہوں ، کیونکہ دورِ زیرِ بحث کے متاخر تاریخ نگار ، مثلاً سرسید احمد خان یا ابوطالب اصفہانی ، غیر ملکی روشِ تحریر سے بالکل بیگانہ نہ تھے ، اور یہ تو یقینی ہے کہ اس زمانے میں تواریخ انگریزوں کے ایما سے یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے

خیال سے لکھی گئیں ، جیسے مثلاً 'تاریخ ہنری' ۔

بہرحال جو تواریخ برصغیر پاکستان و ہند میں ۱۷۰۷ء کے بعد لکھی گئیں وہ شاید جامعیت اور وسعت موضوع میں تو ان کلاسیکی تواریخ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو اس سے پہلے کے دو دوروں میں تصنیف ہوئی تھیں ، لیکن افادیت و اہمیت میں ان سے چنداں کمتر پائے کی بھی نہیں ہیں ۔ ان کا دائرۂ بیان ضرور محدود ہے ، لیکن ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر کسی ایک کتاب میں جزئیات کی کمی ہے تو اس کی تلافی کسی دوسری کتاب سے ہو جاتی ہے ۔ اگر کسی ایک میں محض مرکزی حکومت سے متعلق واقعات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور صوبوں کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو کسی نہ کسی اور کتاب میں مختلف صوبوں سے متعلق معاصر واقعات کا خاص تفصیلی بیان مل جاتا ہے ، جو عمومی نوعیت کی زیادہ تر کتابوں میں نہیں مل سکتا ۔ افسوس یہ ہے کہ فارسی میں تاریخ نگاری کا یہ سلسلہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی تقریباً ختم ہو گیا ، اور ۱۸۵۷ء کے بعد جو تواریخ مرتب ہوئیں وہ فارسی میں نہیں بلکہ اردو میں لکھی گئیں ، جس کا ایک سبب تو حکومت کی جانب سے فارسی کی سرپرستی کا فی الجملہ فقدان تھا اور دوسرا اردو کی طرف ، جو اس وقت تک نہ صرف روزمرہ استعمال کی زبان بن گئی تھی بلکہ ایک شایستہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی ، لوگوں کا عام رجحان تھا ۔ پنڈت کنھیا لال نے اپنی ۱۸۵۷ء کے واقعات کی تاریخ 'محاربۂ عظیم' (سنہ تالیف ۱۸۵۹ء - ۱۸۶۰ء/۱۲۷۶ھ) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ : ''اب ایک اور امر تنقیح طلب تھا اور وہ یہ کہ یہ عروس زیبا حلیۂ فارسی محاسن سے ہو یا خلعت اردو مخلّع سے ، آخرش صلاح دوستی شعار اس پر قرار پائی کہ زیور اردو اس پردہ نشین حلۂ خفا کے واسطے بہت شائستہ اور زیبا ہے ، لہٰذا . . . بہ نظر اس کے کہ ہر ایک شائق بے تکلف اس کے مطالعے سے بہرہ ور ہو اور کسی طرح کی دقت تفہیم میں عائد نہ ہو ، اس کتاب کو زبان روزمرہ اور صاف صاف میں تحریر کرکے نام اس کا 'محاربۂ عظیم' رکھا گیا . . .'' جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس مصنف کے زمانے تک فارسی دانوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی[1] ۔

اس تمہید کے بعد ہم دور زیر بحث کی خاص خاص تواریخ اور ان کے مصنفین کا فرداً فرداً بالاختصار ذکر شروع کرتے ہیں ۔ تاہم یہ ذکر شروع کرنے سے پہلے اس قابل ستایش

(۱) کنھیا لال : محاربۂ عظیم ، نول کشور ، کانپور ، طبع ثانی ۱۸۹۶ء ، ص ۱ ۔

اور لائق قدر تاریخ ہند کا ذکر کر دینا ضروری ہے جو ایلیٹ اور ڈاؤسن نے آٹھ ضخیم جلدوں میں مرتب کی ہے اور جس میں نہ صرف ان سب بلکہ اور بہت سی دوسری تصانیف سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور ان کے مصنفین کے بارے میں مفید معلومات اور تاریخی دلچسپی کے اقتباسات کے ساتھ انگریزی ترجموں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تصنیف سے ہمارے سامنے برصغیر کی فارسی تاریخ نگاری کا ایک مکمل اور مسلسل منظر آ جاتا ہے اور متعدد ایسی کتابوں کے نام مل جاتے ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئیں اور جن کے قلمی نسخوں کا انہوں نے مختلف کتب خانوں میں کھوج لگایا ہے۔ ان کی اس محنت و کاوش کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مقالے کی تیاری میں اس بیش قیمت تصنیف سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے جس کا شکریے کے ساتھ اعتراف کرنا راقم حروف اپنا فرض سمجھتا ہے۔ البتہ اس کتاب کے مطالعے سے یہ احساس بار بار دل میں پیدا ہوتا ہے کہ مرتبین نے واقعات کا انتخاب کرتے ہوئے اپنے مخصوص نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھا ہے۔ اس ضمن میں بہت کارآمد کتاب اسٹوری کی ''ہسٹری آف پرشین لٹریچر'' ہے اور اس سے بھی جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے۔ شروع میں (حتی‌الامکان ترتیب زمانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے) ہم ان تواریخ کا ذکر کریں گے جو عالمی یا عمومی نوعیت کی ہیں (الف)۔ اور بعد ازاں ب، ج اور د کے تحت دیگر اصناف کا۔

(الف) عمومی تواریخ

(۱) 'تنقیح الاخبار' از 'ملا' محمد ماہ، ایک مختصر سی عمومی تاریخ جسے مصنف نے فرخ سیر کے عہد حکومت کے دوران میں ۱۷۰۵ - ۱۷۰۶ء/۱۱۱۷ھ میں لکھنا شروع کیا۔ یہ ۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مخطوطے انڈیا آفس کی لائبریری اور آصفیہ کتب خانے میں موجود ہیں (دیکھیے اسٹوری، ص ۱۳۵)۔

(۲) 'جنات الفردوس'[۱]: از میرزا محمد یوسفی بن رستم بن قباد۔ یہ تاریخ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور اسی مناسبت سے مصنف نے اس کا نام 'جنات الفردوس' رکھا ہے (قب خسرو: ہشت بہشت)۔ اس میں ایشیا، افریقہ اور اندلس کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخی جدولیں دی گئی ہیں اور ان حکمرانوں کی تاریخ پیدائش و وفات اور عہد حکومت کی مدتیں

---

(۱) ایلیٹ و ڈاؤسن، (ج ۸، ص ۱۳م) نے اس تاریخ کا نام ''جنان الفردوس'' لکھا ہے، اسٹوری، ص ۱۳۵ میں 'جنات' ہے۔

بھی - ہر باب کے شروع میں ایک تمہید ہے - جن ممالک کا ذکر کیا گیا ہے ان میں شام ، عرب ، ایران ، مصر ، خوارزم اور ہندوستان شامل ہیں - اسماعیلی ، اتابک ، سامانی ، غزنوی ، غوری اور مغل وغیرہ حکمرانوں کے علاوہ شرفای مکہ کی فہرستیں بھی دی گئی ہیں - یوسی نے یہ کتاب ۱۲۲۶/۱۸۱۱ء میں لکھی تھی لیکن وہ صرف چھ ابواب لکھ سکا اور کتاب نا مکمل رہ گئی - ۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء/۱۲۴۴ھ میں ایک شخص تجمل حسین نے ، جسے اس کا ایک نسخہ مسٹر مانٹیگو ٹرن بل کے کتب خانے میں مل گیا تھا ، باقی ماندہ دو باب لکھ کر اسے مکمل کیا - تاریخ کے چھٹے باب میں ہندوستان کے بادشاہوں کا سوری خاندان تک ذکر ہے ، اور بہمنی ، نظام شاہی ، عادل شاہی ، قطب شاہی ، فاروقی حکمرانوں نیز گجرات ، مالوہ ، جونپور ، بنگال ، کشمیر ، ملتان اور سندھ کے بادشاہوں کا ذکر بھی شامل ہے - ساتویں باب میں دہلی کے مغل بادشاہوں کا اور آٹھویں میں لکھنو کے نواب وزیروں کا ذکر کیا گیا ہے - مصنف نے ان جداول کی تیاری میں جن مآخذ سے کام لیا ہے وہ خود اس کے بیان کے مطابق یہ ہیں : 'السیوطی' ، 'ابن خلقان' ، 'نظام التواریخ' ، 'مطلع السعدین' ، 'روضة الصفا' ، 'حبیب السیر' ، 'طبقات اکبری' ، 'فرشتہ' ، 'تاریخ الفی' اور 'تاریخ بدایونی' - مخطوطے برٹش میوزیم اور کتب خانۂ بانکی پور میں موجود ہیں[1] -

(۳) 'تاریخ مفضلی' ، از سید مفضل خان (جس نے 'تیمور نامۂ مفضلی' بھی لکھا ہے) ایک ضخیم عمومی تاریخ (تقریباً ایک ہزار صفحات) ہے جس میں تخلیقِ عالم سے لے کر اورنگ زیب کے عہد حکومت کے سال تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں ، لیکن ایک اور نسخے کی رو سے ان واقعات کا سلسلہ فرخ سیر کے عہد تک پہنچتا ہے - یہ تاریخ سات مقالوں میں منقسم ہے جن میں سے چھٹے اور ساتویں مقالے میں ہندوستان کے بادشاہوں کا ذکر ہے - اس میں 'چچ نامہ' سے ایک اقتباس بھی شامل ہے - ایلیٹ نے شاہجہان کے عہد سے متعلق ایک اقتباس کا انگریزی ترجمہ دیا ہے - اس کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم میں موجود ہے[2] -

(۴) 'محل السلوک (مصقلة النفوس)' ، اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں لیکن وہ

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ۱۳۴ ، اور اسٹوری ، ص ۱۳۵ -
(۲) ایضاً : ج ۷ ، ص ۱۴۱ ، اور اسٹوری ، ص ۱۳۵ -

معظم بہادر شاہ اول کے متوسلین میں سے تھا ۔ کتاب کا سنہ تکمیل ۱۷۲۱ء/۱۱۳۳ھ بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں پندرہ مقالے اور ایک خاتمہ ہے ، اور تاریخی واقعات کے بیچ میں جگہ جگہ مذہبی اور صوفیانہ مباحث آ گئے ہیں ۔ ایک کسی قدر ناقص نسخہ انڈیا آفس کی لائبریری میں موجود ہے[1] ۔

(۵) 'قبچاق خانی' از قبچاق خاں المعروف بہ خواجہ قلی بیگ بلخی ابن قبچاق خاں عرف امام قلی جو جانی خانی خاندان کے والی توران سبحان قلی خاں کا قوش بیگی تھا ۔ مصنف ۱۶۹۵ء/۱۱۰۷ھ میں قید ہو کر ہندوستان آیا اور اس نے یہ تاریخ عہد فرخ سیر میں لاہور میں لکھی (۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ) ، جہاں اس زمانے میں عبدالصمد خاں گورنر تھا۔ مصنف نے اس تاریخ میں ۱۷۲۴ء - ۱۷۲۵ء/۱۱۳۷ھ - ۱۱۳۸ھ میں کچھ اضافے کئے اور اپنی موجودہ شکل میں یہ ایک تمہید (فاتحہ) ، پانچ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے ۔ 'فاتحہ' اور 'خاتمہ' میں مصنف نے اپنے بعض حالات زندگی بیان کئے ہیں ۔ قلمی نسخے باڈلین اور بعض دیگر کتب خانوں میں محفوظ ہیں[2] ۔

(٦) 'تاریخ محمد شاہی' یا 'نادر الزمانی' از خوشحال چند ابن جیون رام بن آنند رام کایستھ جو دفترِ دیوانی دہلی میں منشی کے عہدے پر مامور تھا ۔ یہ ایک عمومی تاریخ ہے لیکن اس میں ہندوستان کے حالات و واقعات کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے ۔ خوشحال چند کا والد جیون رام ، اورنگ زیب اور بہادر شاہ اول کے زمانے میں کئی عہدوں پر مامور رہا تھا ۔ وہ روح اللہ خاں اور بہرہ مند خاں کی ملازمت میں رہا اور بعد ازاں لاہور کے عرائض نویس عطاء اللہ خاں کا پیشکار مقرر ہوا ۔ وہ شاعر بھی تھا اور بہادر شاہ نے اسے انعام دے کر ۱۵۰ سواروں کا منصب بھی عطا کیا تھا ۔ خود خوشحال چند ، محمد شاہ کی ملازمت میں رہا ۔ اس نے یہ تاریخ ۱۷۳۹ - ۱۷۴۰ء/۱۱۵۲ھ میں تالیف کی ، چنانچہ اس کے نام 'نادر الزمانی' سے یہ تاریخ نکلتی ہے ، لیکن بعد ازاں اس نے اس میں مزید اضافہ کیا ۔ موجودہ شکل میں یہ تاریخ دو مقالوں پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے بعنوان مجمع الاخبار[3] کے دو حصے ہیں ۔ ان میں سے پہلے میں انبیاء و خلفاء کے حالات ہیں اور

---

(۱) اسٹوری ، ص ۱۳۵ ، ایلیٹ و ڈاؤسن میں مذکور نہیں ہے ۔
(۲) اسٹوری ، ص ۱۳٦ ، ایلیٹ نے ذکر نہیں کیا ۔
(۳) ایلیٹ ، مجمع الاخبارات ۔

دوسرے میں ہندوستان تا عہد ابراہیم لودھی کے ، جس کا عنوان 'زبدۃ الاخبار' ہے[1] - یہ بھی دو حصوں (کیفیتوں) پر مشتمل ہے - ان میں سے پہلے میں بابر سے لے کر رفیق الدولہ جہاندارشاہ کے عہد تک کے حالات (مؤرخہ ۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ) اور دوسرے میں محمد شاہ کے عہد کے حالات مندرج ہیں - آخر میں ۲۵۸ شعرا کا مختصر سا تذکرہ ہے - اس تاریخ میں بہت سی غیر متعلقہ چیزوں ، مثلاً ریاضیات ، نجوم ، رمل و فال ، علمِ عروض وغیرہ سے بھی بحث کی گئی ہے - بعض اولیاء اللہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے[2] -

(۷) 'برہان الفتوح' از محمد علی بن محمد صادق الحسینی النیشاپوری - ایک عمومی تاریخ جو تخلیقِ عالم سے شروع کی گئی ہے اور ۱۷۳۵ء - ۱۷۳۶ء/۱۱۴۸ھ میں مکمل ہوئی - یہ تاریخ اودھ کے نواب برہان الملک سعادت علی خاں کے نام سے منتسب ہے اور اسی کے زمانے میں لکھی گئی تھی ، لیکن بعد ازاں مصنف نے کچھ اضافوں کے بعد اسے از سر نو مرتب کر کے اس کا نام 'مرآۃ القفا' رکھا[3] - اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں واقعات کی تاریخیں بہت صحت سے دی گئی ہیں اور اس لئے حوالوں کے لئے بہت کارآمد ہے - کتاب میں کل ۱۸ ابواب ہیں اور ایک مقدمہ و خاتمہ - پہلے باب میں خلقِ عالم کا ذکر ہے اور طلوعِ اسلام سے پہلے انبیاء و علماء وغیرہ کے حالات بھی مندرج ہیں ، دوسرے باب میں رسول اللہ صلعم اور ان کے اصحاب رض، مہاجرین رض و انصار رض، اور تیسرے میں خلفائے بغداد و قاہرہ کے - باقی ابواب میں ہندوستان کی تاریخ ہے اور محمد شاہ کے عہد کے حالات بہت تفصیل سے دیے گئے ہیں - بادشاہوں کے علاوہ اس میں صوبوں کے حکام ، اولیاء اللہ اور علما کا بھی ذکر کیا گیا ہے - محمد علی ایک اور تاریخ 'راحت افزا' کا بھی مصنف ہے جس کا نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے - 'برہان الفتوح' کے قلمی نسخے کئی کتب خانوں مثلاً برٹش میوزیم ، برلن وغیرہ میں موجود ہیں[4] -

(۸) 'تحفۃ الکرام' ، از میر علی شیر قانع تتوی[5] - تین جلدوں میں ایک عمومی

---

(۱) ایلیٹ : زبدۃ الاخبارات -

(۲) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۰۷ ، اسٹوری ، ص ۱۳۰ -

(۳) ۱۷۵۶ء/۱۱۶۹ھ میں مرآۃ القفا صمصام الدولہ شاہنواز خان ، مصنف 'مآثرالامرا' کے نام سے منسوب کی -

(۴) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۲۵ ، و اسٹوری ، ص ۱۳۷ - ۱۳۸ -

(۵) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۱ ، ص ۳۲۷ تا ۳۵۱ (الہ آباد ایڈیشن) ، اسٹوری ، ص ۱۳۸ -

تاریخ ، تیسری جلد میں سندھ کے تاریخی حالات و واقعات بہت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور اگرچہ اس میں شروع زمانے کے حالات اتنے مفصل نہیں ہیں جیسے کہ مثلاً 'تاریخ معصومی' میں ، پھر بھی بحیثیت مجموعی اسے سندھ کی جامع ترین اور مستند ترین تاریخ کہا جا سکتا ہے ۔ اس میں مختلف اقسام کے ایسے بیانات موجود ہیں جو میر معصوم کی تاریخ میں نہیں ملتے ۔ مثلاً بعض قبائل کی اصل و نسل ، سندھ کے روایتی قصے (جن میں قصہ' سسی و پنوں بھی شامل ہے) ، متأخر حکمرانوں کے زمانے کے مشہور منصب داروں کے حالات ، پیروں اور اولیا کے احوال و کوائف ، شعراء اور خوش نویس وغیرہ ۔ تاریخ کا ابتدائی حصہ زیادہ تر 'چچ نامہ' پر مبنی ہے ۔ ایلیٹ اور زمانہ' حال کے دیگر مؤرخین نے اس سے بہت استفادہ کیا ہے ۔ ایلیٹ نے کئی اقتباسات کا انگریزی ترجمہ دیا ہے ۔ 'تحفة الکرام' تاریخی نام ہے جس سے تاریخِ آغاز ۱۷۶۷ء/۱۱۸۱ھ نکلتی ہے ۔ لیکن بظاہر کتاب کی تکمیل ۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ ہے ۔ اس تاریخ کے مخطوطات متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں اور یہ ۱۸۸۶ء - ۱۸۸۷ء/۱۳۰۴ھ میں لکھنؤ میں چھپی تھی ۔

(۹) 'جام جہان نما' ، از مظفر حسین الملقب بہ مہارت خان ابن حکیم غلام محمد خان ۔ مظفر حسین ۱۷۰۶ء/۱۱۱۸ھ میں اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوا ۔ اس نے محمد شاہ کے طبیب حکیم محمد حسین الملقب بہ بقراط خان سے طب کی تعلیم پائی اور پھر خود شاہی طبیب بن گیا ۔ چنانچہ اس نے یہ کتاب اسی حیثیت سے ۱۷۶۷ء - ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ میں شاہ عالم کے دور حکومت میں مکمل کی ۔ کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے جن میں سے پہلے میں آدابِ گفتگو اور عالم مجلس وغیرہ کا ذکر ہے ، دوسرے میں تاریخی حالات و واقعات بیان کیے ہیں ، تیسرے میں جغرافیائی عالم ، مختلف ملکوں کے مشاہیر اور ہندوستان کے شعراء کے بارے میں معلومات ہیں ، چوتھا ملائکہ ، عناصر ، حیوانات وغیرہ سے متعلق ہے اور پانچواں زباندانی ، صرف و نحو اور بلاغت و بدیع سے ۔ دوسرے حصے میں جن بادشاہوں کا ذکر ہے ، ان میں بنو امیہ ، بنو عباس ، طاہری ، صفاری ، سامانی ، غزنوی ، غوری ، سلجوق ، اتابک ، اسماعیلی ، ترک اور مغل وغیرہ شامل ہیں ۔ اس کتاب کی تاریخی قدر و قیمت ایسی زیادہ نہیں ہے ، لیکن مختلف مضامین کی شمولیت کے باعث و متنوع کافی دلچسپ ہے ۔ دراصل مصنف کا مقصد بھی یہی تھا ، چنانچہ اس نے کہا ہے کہ اس نے یہ کتاب دوستوں کے اصرار اور ان کی تفریح طبع کے لیے تالیف کی تھی ۔ (مصنف کے

آبا و اجداد میں سے کئی بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے تھے - ایلیٹ نے ان کا ذکر کیا ہے)[1] - اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے -

(۱۰) 'حدیقة الصفا' ، از یوسف علی خان بن غلام علی خان ، جو بنگال ، بہار و اڑیسہ کے صوبیدار علی ویردی خان مہابت جنگ کا متوسّل اور دوست تھا - وہ ایک اچھے خاندان سے تھا اور اس کی شادی علاء الدولہ سرفراز خان کی بیٹی سے ہوئی تھی - اس نے ۱۱۹۵/۱۷۸۱ء ہ سے کچھ پہلے وفات پائی - اس نے علی ویردی خان مہابت جنگ اور اس کے جانشین شجاع الدولہ کی ایک تاریخ بھی لکھی تھی جو 'تاریخ مہابت جنگ' کے نام سے ۱۷۶۳ء - ۱۷۶۴ء/۱۱۷۷ھ میں الہ آباد میں مکمل ہوئی - 'حدیقة الصفا' تین جلدوں میں ایک مختصر سی عمومی تاریخ ہے جس میں ظہورِ اسلام سے پہلے کے زمانے سے شروع کر کے مغلیہ دور حکومت تک کے حالات مندرج ہیں ، چنانچہ پہلی جلد میں زمانۂ قبل اسلام ، ابتدائی دورِ اسلامی (خلفا ، بنو امیہ ، بنو عباس وغیرہ) کے حالات ہیں - دوسری میں محمد شاہ تک تیموری بادشاہوں کے اور تیسری میں ہندوستان کے غیر تیموری حکمرانوں کے - آخرالذکر حالات زیادہ تر 'تاریخ فرشتہ' سے ماخوذ ہیں - کتاب کے آخر میں ایک 'خاتمہ' ہے جس میں شعراء کا تذکرہ ہے - مخطوطات آکسفورڈ ، برلن ، انڈیا آفس وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں[2] -

(۱۱) 'فرحة الناظرین' ، از محمد اسلم بن محمد حفیظ پرسروری (پسروری) - ایک پرتکلف عمومی تاریخ جو زیادہ تر برصغیر کی تاریخ پر مشتمل ہے ، لیکن موضوعات کے لحاظ سے کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے - ۱۷۷۰ء - ۱۷۷۱ء/۱۱۸۴ھ میں مکمل ہوئی - مصنف نے لکھا ہے کہ اسے یہ تاریخ لکھنے کا خیال اس زمانے میں پیدا ہوا جب وہ لکھنؤ میں تعلیم پا رہا تھا - بعد ازاں اس کی ملاقات ۱۷۶۸ء/۱۱۸۲ھ میں بمقام فیض آباد ناظم جنگ مدبّر الملک رفیع الدولہ سے ہوئی جس نے اس کی ہمت افزائی کی اور اپنے منصوبے کو مکمل کرنے کی ترغیب دی - چنانچہ اس نے مختلف سابقہ تواریخ ، جن میں مثلاً فارسی ترجمہ 'تاریخ یمینی' ، 'تاج المآثر' ، 'تاریخ بہمنی' ، 'تاریخ فرشتہ' ، 'مرآت عالم' ، 'طبقات اکبری' ، 'تاریخ فیروز شاہی' ، 'تاریخ الفی' ، 'حبیب السیر' ، 'روضة الصفا' ، 'تیمور نامہ' ، 'واقعات بابری' (بابر نامہ) وغیرہ

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۱۵۸ ببعد ، اسٹوری ، ص ۱۳۹ -

(۲) دیکھیے اسٹوری ، ص ۱۴۰ ، ایلیٹ نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا -

شامل ہیں ، کے مطالعے کے بعد یہ کتاب تیار کی ۔ یہ تاریخ ایک مقدمے اور تین جلدوں پر مشتمل ہے ۔ پہلی جلد میں خلقِ عالم کا اور دوسری میں انبیاء ، اولیاء ، رسول اللہ صلعم اور آئمہ کرام کا ذکر ہے ، تیسری میں سام بن نوح[ؑ] کے زمانے سے لے کر ہندوستان کے حکمرانوں کے حالات ہیں ، اور چوتھی میں امیر تیمور اور دہلی کے تیموری حکمرانوں کے شاہ عالم کے عہدِ حکومت کے بارھویں سال تک کے ۔ ایلیٹ و ڈاؤسن نے اس کے کئی ایسے اقتباسات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو مخصوص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں ۔ مثلاً احمد شاہ ابدالی کا حملہ[ؑ] ہند ، عالمگیر ثانی کے عہد کے واقعات ، شاہ عالم اور روہیلے پٹھان ، اودھ کے نواب ، بالخصوص برہان الملک اور نادر شاہ وغیرہ ۔ اس تاریخ کے قلمی نسخے کمیاب ہیں ، لیکن برٹش میوزیم اور پیرس کے کتب خانوں میں ایک ایک نسخہ محفوظ ہے[1] ۔

(۱۲) 'تاریخ محمدی' ، از میرزا محمد بن معتمد خان ۔ ہجرت نبوی[ؐ] سے شروع کر کے ۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ تک کی ایک عمومی تاریخ ۔ میرزا محمد ۱۶۸۷ء/۱۰۹۸ھ میں جلال آباد میں پیدا ہوا ، روح اللہ خان نے ۱۷۰۳ء میں اسے اورنگ زیب سے متعارف کروایا اور اورنگ زیب نے اسے منصب عطا کیا ۔ اس نے یہ تاریخ ۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ میں لکھنا شروع کی اور ۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ میں مکمل کی ۔ اس تصنیف کی وجہ اس نے یہ بیان کی ہے کہ اس نے بعض مشہور تواریخ ، مثلاً 'حبیب السیر' اور 'منتخب اللباب' کا مطالعہ کیا اور انہیں ناکافی پایا ، لہذا اس نے ایک نئی تاریخ لکھنے کا ارادہ کر لیا ۔ وہ کئی اور کتابوں کا بھی مصنف ہے جن میں سے 'عبرت نامہ' میں اس نے خود اپنے حالات و کوائف بیان کیے ہیں ۔ 'تاریخ محمدی' کسی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ۔ 'عبرت نامہ' اس سے بہت بہتر ہے ۔ مخطوطے انڈیا آفس کی لائبریری اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں[2] ۔

(۱۳) 'حدیقۃ الاقالیم' از مرتضٰی حسین بلگرامی المعروف بہ شیخ اللہ یار ۔ ایک نہایت قابل قدر تصنیف جس میں مفید جغرافیائی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں اور جو اسی نوعیت کی کتاب 'ہفت اقلیم' از امین رازی سے بہت بہتر ہے ۔ مصنف نے صحت و تحقیق کا بہت خیال رکھا ہے اور دہلی کے بادشاہوں کے علاوہ متعدد چھوٹے حکمران خاندانوں کے حالات بھی

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۱۶۸ ببعد ، اسٹوری ، ص ۱۴۰ ۔

(۲) دیکھیے اسٹوری ، ص ۱۴۱ ، ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۶ ، ص ۴۸۴ ۔ (الہ آباد ایڈیشن) ۔

لکھے ہیں ۔ ان میں اودھ کے نواب ، مرہٹے اور روہیلے بھی شامل ہیں ۔ مرتضیٰ حسین محمد شاہ کے زمانے سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہد تک مختلف امراء کی ملازمت میں رہا ۔ مثلاً سید سربلند خان تونی ، سید سعادت خان نیشاپوری ، محمد قاسم خان ، علی قلی خان عباسی ، احمد خان بنگش (فرخ آبادی) وغیرہ ۔ اس کے ایک دوست رجب علی نامی نے اس کا تعارف وارن ہسٹنگز کے سیکریٹری کیپٹن جوناتھان اسکاٹ سے کروایا (۱۷۷۶ء) اور اس نے منشی کی حیثیت سے اس کی ملازمت اختیار کر لی ۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر لکھی ، کیونکہ اسے امید تھی کہ اگر یہ اس کے انگریز آقاؤں کو پسند آ گئی تو اسے ان کی سرپرستی حاصل ہو جائے گی جو آیندہ بھی برقرار رہے گی ۔ اس کی یہ امید پوری ہوئی اور اس کے بیٹے کو بھی ایک اچھی خاصی ملازمت مل گئی ۔ یہ غالباً پہلی فارسی تاریخ ہے جو براہ راست انگریزی حکام کی سرپرستی سے لکھی گئی ۔ کتاب کی تکمیل کے وقت مصنف کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی ۔ 'حدیقۃ الاقالیم' میں دنیا کا جغرافیہ اور اس کے ربع مسکون کا حال ، ہفت اقلیم کی کیفیت ، مختلف ممالک کے نوادر و عجائب ، انبیاء ، دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں ، فلاسفہ اور علماء و مشاہیر کے احوال مندرج ہیں ۔ یہ بہت ضخیم کتاب ہے (بڑے سائز کے ۸۸۸ صفحات) ۔ مرتضیٰ حسین ۱۷۱۹ء - ۱۷۲۰ء/۱۱۳۲ء میں بلگرام میں پیدا ہوا اور حدود ۱۷۹۵ء میں فوت ہوا ۔ اس کا والد اللہ یار ، مبارز الملک سربلند خان حاکمِ گجرات کا بخشی تھا ، اور اس کی وفات پر سب سے پہلے اسی امیر نے اسے آگرے بلوا کر اپنی ملازمت میں لیا تھا ۔ اس کی کتاب لکھنؤ میں دو بار چھپی (۱۸۷۹ء و ۱۸۸۱ء) ، اور اس کے متعدد نسخے موجود ہیں ۔[1]

(۱۴) 'جام جہان نما' : از قدرت اللہ شوق صدیقی ساکن موی ، روہیلکھنڈ (م-۱۸۰۹ء/ ۱۲۲۴ھ) عمومی تاریخِ عالم جو کل ۳۹ ابواب پر مشتمل ہے ۔ مصنف نے ابتدائے آفرینش سے شروع کرکے ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ تک کے واقعات تحریر کیے ہیں ۔ آخر میں اولیاء اور زہاد وغیرہ کے اور خود مصنف کے اپنے سوانح حیات ہیں ۔ یہ حصہ بہت کارآمد ہے ۔ یہ تاریخ ۱۷۸۵ء/۱۱۹۹ھ میں مکمل ہوئی ۔[2]

(۱۵) 'بحر المواج' : از محمد علی خان انصاری ابن عزت الدولہ ہدایت اللہ خان ابن

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ ، ج ۸ ، ص ۱۸۰ ، اسٹوری ، ص ۱۳۲ ۔

(۲) ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۱۸۴ ۔

شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق تہوّر جنگ ۔ مصنف کے مربیؔ سید محمد رضا خان شیرازی مظفر جنگ ، نائب ناظم بنگال و بہار نے اسے ترہت اور حاجی پور کی فوجداری عدالت کا داروغہ مقرر کر دیا تھا ۔ اس کے دو چچا خان راسخ اور شاکر خان معروف آدمی تھے ۔ 'بحرالمؔواج' کے علاوہ اس نے 'تاریخ مظفری' (دیکھیے آگے) اور 'تاریخ احمد شاہی' بھی تصنیف کی ہے ۔ 'بحرالمؔواج' ایک عمومی تاریخ ہے جو اس کے دیباچے کی رو سے ۱۷۹۴ء - ۱۷۹۵ء/ ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوئی تھی ۔ لیکن جس میں بعد ازاں اضافہ کرکے ۱۷۹۶ء/۱۲۱۱ھ تک کے واقعات درج کر دیے ہیں ۔ کتاب کی تین جلدیں ہیں جن میں کل نو باب (''بحر'') اور ۹۴ فصول (''امواج'') ہیں ۔ پہلی جلد میں برّصغیر کے بیرونی ممالک کی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔ دوسری جلد میں مغلوں سے پہلے کی سلطنتوں اور پھر مغلوں کی تاریخ بابر سے محمد شاہ کے عہد تک دی گئی ہے ، اور تیسری جلد میں احمد شاہ اور شاہ عالم ثانی کے عہد کے حالات ہیں ۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا بھی ذکر ہے ۔ کتاب کے متعدد نسخے موجود ہیں ۔ ایلیٹ نے راجا بنارس کے کتب خانے کے ایک مخطوطے سے استفادہ کیا تھا ، لیکن اور مخطوطے برلن ، بانکی پور وغیرہ میں پائے جاتے ہیں ۔[1]

(۱۶) 'لب السیر جہان نما' از میرزا ابو طالب خان طالب ، بن حاجی محمد بیگ خان تبریزی اصفہانی المعروف بہ ابو طالب لندنی ، جو ۱۷۵۲ء - ۱۷۵۳ء/۱۱۶۶ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں فوت ہوا اور اودھ کے نواب آصف الدولہ اور شجاع الدولہ کی ملازمت میں رہا اور بعد ازاں اس نے انگریزی ملازمت اختیار کر لی ۔ وہ بنارس کے باغی راجا بل بھدرا سنگھ کے خلاف مہم میں شریک تھا ۔ ۱۷۸۷ء - ۱۷۸۸ء/ ۱۲۰۲ھ میں وہ کلکتے چلا گیا اور وہاں ۱۷۹۱ء میں جو دیوان حافظ طبع ہوا اس کا مدیر (ایڈیٹر) وہی تھا ۔ ۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۳ء میں وہ ایک انگریز افسر کیپٹن رچرڈسن کے ساتھ یورپ گیا اور اس نے اپنے اس سفر کے کوائف اپنی تصنیف 'مسیر طالبی' میں بیان کیے ہیں جو ۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ء میں مکمل ہوئی ۔ وہ فارسی کا اچھا شاعر تھا اور اس کا ایک دیوان

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۲۳۵ - ۲۳۶ ، اسٹوری ، ص ۱۴۴ ۔ مصنف نے اس تاریخ سے پہلے ۱۷۹۳ء/۱۲۰۸ھ میں ایک کتاب 'تالیف محمدی' کے نام سے بھی لکھی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، خلفای اربعہؓ ، دوازدہ ائمہؓ اور اپنے زمانے تک کے اولیا و اصفیا کے حالات لکھے ہیں (دیکھیے اسٹوری ، ص ۲۰۲) ۔

موجود ہے ۔ اس کے علاوہ اس نے بعض اور تصانیف بھی چھوڑی ہیں ۔[1] 'لبّ السّیر' نواب آصف الدولہ کے نام سے منتسب ہے ۔ اس میں آغاز اسلام سے لےکر خلفاءٔ بنو عباس اور ان کے معاصر حکمرانوں کا ذکر ہے ، یہ چار ابواب میں منقسم ہے : (۱) انبیاءٔ کرام (۲) خلفاءٔ اسلام (۳) اصحابِ رسول اللہ صلعم ، فلاسفہ ، علماء اور شعراء وغیرہ کے حالات (۴) وہ حکمران خاندان جو خلفاء کے زمانے میں اور ان کے بعد ہوئے ۔ گویا یہ کتاب ایک قسم کی مختصر سی عالمی تاریخ ہے جو ابو طالب نے ۱۷۹۳ء - ۱۷۹۴ء/۱۲۰۸ھ میں مکمل کی ۔ اس کے قلمی نسخے کئی کتب خانوں ، بشمول برٹش میوزیم ، انڈیا آفس ، باڈلین اور آصفیہ میں موجود ہیں ۔[2]

(۱۷) 'مرآتِ آفتاب نما' از شاہنواز خان ہاشمی (عبدالرحمان) ، وزیر اکبر شاہ ثانی ۔ شاہنواز خان شاہ عالم کی چہیتی بیٹی کا اتالیق اور محلِ شاہی کا ناظمِ مطلق بھی رہا تھا ۔ اس کا انتقال اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی (۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ) کے چھ ماہ بعد ہوا ۔ 'مرآتِ آفتاب نما' کا نام شاہ عالم کے تخلص آفتاب کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور اس سے اس کی تاریخِ تکمیل (۱۸۰۳ء - ۱۸۰۴ء/۱۲۱۸ھ) بھی نکلتی ہے ۔ یہ ایک عمومی تاریخ ہے جس میں شاہ عالم کے عہد کے حالات زیادہ تفصیل سے دیے گئے ہیں ۔[3] اس کے علاوہ بعض مفید جغرافیائی اور سیرتی معلومات بھی شامل ہیں ۔ یہ ۹۳۴ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے اور اس کے متنوّع موضوعات میں حسب ذیل شامل ہیں : تخلیقِ کائنات ، معدنیات ، حیوانیات ، اشجار ۔ نسلِ انسانی ، اخلاقیات ، انبیای کرام ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی ازواج مطہّراتؓ، آپؐ کے اہل بیتؓ اور اصحابؓ، صوفیہ ، اولیاء ، فلاسفہ ، شعراء ، مصوّر ، خوش نویس ، ہندوؤں کے مذہبی فرقے ؛ بنو امیّہ ، بنو عباس اور ان کے ہم عصر خاندان ، غوری بادشاہ ، دکن کے حکمران خاندان ، ہندوستان کے قدیم ہندو راجا ، گورگانی بادشاہ وغیرہ ۔ آخر میں عجائب و غرائب دنیا کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے مکمل یا ناقص نسخے کئی کتب خانوں میں محفوظ ہیں ۔ ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی

---

(۱) ان میں تاریخی کتاب 'تفضیح الغافلین' ، جس میں اودھ کے حالات ہیں ۔ شعراء کا ایک تذکرہ بنام خلاصہ الافکار ، مثنوی سرور افزا ، لندن کی تعریف میں اور معراج التوحید ، ایک منظوم رسالہ بر نجوم شامل ہیں ۔ دیکھیے اسٹوری ، ص ۱۴۵ ۔

(۲) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۲۹۸ ببعد ۔

(۳) بالخصوص پچھلے ۲۱ سال کے ۔

موجود ہے ، جس کے لیے دیکھیے اورینٹل کالج میگزین ، بابت مئی ۱۹۲۶ء ، ص ۵۹ ۔[1]

(۱۸) مجمع الاخبار ، از ہر سکھ رائے ، ابن جیون داس بن رائے بسنت رام ، سہگل کھتری ، اس کا دادا عرصے تک صوبہ آگرہ کا حاکم رہا ، لیکن اس زمانے میں جب یہ صوبہ محمد شاہ نے جے پور کے راجا جے سنگھ سوائی کو دے دیا تھا ، ہر سکھ رائے لاہور کا باشندہ تھا اور اس نے اپنی یہ عمومی تاریخ ۱۸۰۵ء - ۱۸۰۶ء/۱۲۲۰ھ میں مکمل کی تھی ۔[2] یہ آٹھ جلدوں یا حصوں میں منقسم ہے جن میں سے ساتویں جلد سب سے زیادہ اہم اور کارآمد ہے ، اس لیے کہ اس میں ہندوستان کی صوبائی حکومتوں اور سلطنتوں کا خاصا تفصیلی بیان موجود ہے ۔ باقی جلدوں میں ہندو راجاؤں اور دیگر قدیم اقوام ، مثلاً ایرانیوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔ ایلیٹ و ڈاؤسن میں اس کے کئی طویل اقتباسات کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے ، جن میں سے ایک اقتباس بھرت پور کے جاٹوں کے بارے میں بھی ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔[3]

(۱۹) 'سلالۃ السیر' از ابوالقاسم بن محمد علی سمنانی ساسانی جو ایک اور کتاب 'جام جہان نما ساسانی' کا بھی مصنف ہے ۔ یہ ایک عمومی تاریخ ہے جو دو مقالوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے مقالے میں ہندوستان سے باہر کے حکمرانوں کی تاریخ ہے اور دوسرے میں ہندوستانی حکمران خاندانوں کی ۔ ایلیٹ نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ۔ مصنف نے طبری کی تاریخ کے فارسی ترجمے کے اس ایڈیشن پر بھی نظر ثانی کی تھی جو فرانسس گلیڈون نے تیار کیا تھا (دیکھیے اسٹوری ، ص ۶۵ ، ۱۴۸) ۔ اسی نام کی ایک اور تاریخ جس کا پورا نام 'زینۃ الزمان فی تاریخ ہندوستان موسوم بہ تاج التواریخ' ہے ، میرزا محمد بن رفیع ملک الکتاب شیرازی نے بھی تالیف کی تھی ۔ میرزا محمد نے ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں ایران سے آ کر بمبئی میں سکونت اختیار کی اور کتابوں کی اشاعت و فروخت کا کاروبار شروع کیا ۔ ۱۸۸۲ء میں ایرانی حکومت نے اسے 'ملک الکتاب' کا خطاب دیا اور ۱۸۸۹ء - ۱۸۹۰ء میں برطانوی حکومت نے 'خان صاحب' کا ۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف ہے جن میں ایک یہ 'سلالۃ السیر یا زینۃ الزمان' بھی شامل ہے ۔ یہ کتاب بمبئی میں ۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ میں

---

(۱) مزید تفصیل کے لئے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۳۳۲ دیکھیے ۔

(۲) مصنف نے تاریخ تکمیل ۱۷۹۹ء/۱۲۱۴ھ بتائی ہے لیکن اس کے بعد ضرور اضافہ کیا ہوگا ، کیونکہ تاریخ میں ۱۲۳۰ھ تک کے واقعات مذکور ہیں ۔

(۳) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۳۵۵ ببعد ، اسٹوری ، ص ۱۴۷ ۔

شائع ہوئی تھی[1] -

(۲۰) 'زبدۃ الغرائب' از محمد رضا طباطبائی - محمد رضا کے آبا و اجداد ایرانی بادشاہوں کے ملازم تھے - بہادر شاہ اول کے عہد میں یہ لوگ ایران سے ہندوستان آئے اور برہان الملک صفدر جنگ کی ملازمت میں منسلک ہوگئے - بعد کے زمانے میں بھی ان کے خاندان کے افراد اودھ کے دربار ہی سے وابستہ رہے - محمد رضا کچھ عرصے تک بادشاہ دہلی کے خزانے کا داروغہ رہا - لیکن پھر واپس لکھنؤ چلا گیا - 'زبدۃ الغرائب' یا 'زبدۃ التواریخ' پانچ جلدوں میں لکھی گئی تھی اور ۱۸۱۶ء تا ۱۸۳۰ء میں مکمل ہوئی تھی - یہ ایک عمومی تاریخ ہے جو ابتدائے آفرینش سے شروع ہوتی ہے اور اس میں مختلف اسلامی ملکوں کے حکمرانوں (بشمول تیموری خاندان دہلی) کے حالات و کوائف مذکور ہیں - آخری حصے میں فلسفیوں ، شاعروں ، اولیاء ، علماء و ادباء وغیرہ کے حالات دیے گئے ہیں - مصنف شاعر بھی تھا اور نجم تخلص کرتا تھا - اس کے اشعار اس کی تصنیف میں بھی موجود ہیں - اسی مصنف کی ایک اور کتاب 'مجمع الملوک' ہے -

(۲۱) 'مجمع الملوک' از مذکورہ بالا محمد رضا - یہ در اصل کوئی علیحدہ کتاب نہیں ہے بلکہ 'زبدۃ الغرائب' ہی کا ایک اضافہ کردہ ایڈیشن ہے جو ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ میں مکمل ہوا[2] - یہ محمد رضا کی ضخیم تاریخی دائرۂ معارف 'بحر الذخار' میں اس کی تیسری جلد کی حیثیت سے شامل ہے - اسی مصنف کی اور کتابیں یہ ہیں : 'اخبارات ہند' ، 'مفاتیح الریاسہ' ، 'نغمۂ عندلیب' اور 'خورشید لامع یا منظر العالم' (جغرافیے پر)[3] -

(۲۲) 'تاریخ ہندی' ، از سید محمد باقر علی خاں ولد حضرت شاہ کلیم اللہ بخاری - مصنف کے آبا و اجداد بادشاہانِ دہلی کے ہاں ملازم رہے تھے ، وہ خود بھی شہزادوں کا اتالیق رہا ، چنانچہ الہ آباد میں شہزادہ جہانگیر کا اتالیق تھا ، لیکن اس کی بے توجہی سے برداشتہ خاطر ہو کر وہاں سے چلا گیا اور انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی - اسے ہمیر پور میں منصف مقرر کیا گیا اور وہاں اس کا تعارف ایک سول سرونٹ ہنری پڈاک سے

---

(۱) دیکھیے اسٹوری ، ص ۱۴۸ ، ۴۹۲ -
(۲) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۴۳۲ ، ۴۳۴ -
(۳) دیکھیے اسٹوری ، ص ۱۴۸ -

ہوا اور ایسے تاریخ کا شوقین پا کر باقر علی خاں کو یہ کتاب لکھنے کا خیال آیا جو اس نے اسی کے نام سے منتسب کی ہے اور ۱۸۲۵ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی ہے ۔ کتاب کے شروع میں دہلی کے انگریز مجسٹریٹ ، ڈلکتہ اور سرچارلس مٹکاف کی تعریف میں اشعار ہیں ۔ مقدمے میں حضرت آدمؑ سے شروع کر کے انبیاءؑ کے حالات اور مشہور اولیاء ، فلاسفہ کے سوانح حیات دیے گئے ہیں ۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے ، جو پانچ جلدوں میں بہ تفصیل ذیل ہے : پہلی جلد : کیانی ، اموی ، عباسی اور چنگیز خانی حکمرانوں کی تاریخ ۔ جلد ۲ : امیر تیمور اور ہندوستان میں اس کے اخلاف کے حالات تا جنگ بکسر (۱۷۶۴ء) ۔ ج ۳ ، مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کے ہندو راجاؤں کا ذکر ۔ جلد ۴ ، غزنوی سلاطین اور بادشاہان دہلی تا بابر کی تاریخ ۔ جلد ۵ ، سلجوقی ، صفوی ، اسماعیلی اور بعض دیگر خاندانوں کا ذکر ۔ کتاب کا خاتمہ ہفت اقلیم کے بیان اور دیگر جغرافیائی معلومات پر مشتمل ہے ، نیز اس میں دنیا کے عجائب و غرائب کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ حصہ بظاہر بہت حد تک 'مرآۃ آفتاب نما' سے ماخوذ ہے ، اگرچہ مصنف نے اس کا اعتراف نہیں کیا ۔ کتاب خاصی ضخیم ہے (۱۴۴ صفحات)[1] ۔

(۲۳) 'بیان واقع' از خواجہ عبدالکریم بن خواجہ عاقبت محمود کشمیری ۔ یہ کتاب زیادہ تر نادر شاہ کے حالات پر مشتمل ہے اور اس کے حملۂ ہند ، دہلی میں قیام اور ایران کو واپسی کا مفصل ذکر کیا گیا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ مصنف نے محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہدِ حکومت کے تاریخی واقعات بھی بیان کیے ہیں ۔ بعد ازاں اس نے اپنے سفرِ مکّہ و دیگر بلادِ اسلامیہ کے حالات لکھے ہیں ۔ کتاب کے آخری حصے میں حکماء کے اقوال اور حکایات و نوادر دیے ہیں جو خاصے دلچسپ ہیں ۔ یہ تاریخ ۱۷۸۳ء/۱۱۹۸ھ میں مکمل ہوئی ۔ نادر شاہ کے حملۂ ہند کے چشم دید اور مفصل حالات علی قلی والہ داغستانی نے بھی اپنے تذکرۃ الشعرا بنام 'ریاض الشعراء' میں لکھے ہیں جن کا 'بیانِ واقع' میں مندرجہ حالات و واقعات سے مقابلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا[2] ۔ نیز دیکھیے 'جوہر صمصام' ، از محمد محسن (مصنفہ ۱۷۴۰ء/۱۱۵۳ھ) جس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف

---

(۱) دیکھیے اسٹوری ، ص ۶۳۵ ، ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ ۔

(۲) دیکھیے ریاض الشعرا ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، ذخیرۂ شیرانی ، نیز دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۱۲۴ ۔ 'بیان واقع' کا فارسی متن ابھی حال میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور نے شائع کیا ہے ۔

بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔

(۲۴) 'خلاصۃ التواریخ' از کلیان سنگھ ۔ یہ تاریخ ہندوستان میں مغلیہ عہد کے آغاز سے شروع ہو کر ۱۸۱۲ء/۱۲۲۶ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے ۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے ، دوسرے حصے میں اکبر شاہ ثانی کے عہد تک کے ناظمانِ بنگال کے حالات بھی شامل ہیں ۔ اس نام کی ایک اور تاریخ سوجان رائے بھیڈاری بٹالوی نے بھی لکھی ہے ۔ جسے ایم ۔ ظفر حسن نے طبع کیا اور ۱۹۱۸ء میں دہلی میں چھپی (دیکھیے ایم یاسین : سوشل ہسٹری آف اسلامک انڈیا ، کتابیات) ۔

(۲۵) 'مدینۃ العلم' از شیخ محمد بن شیخ پیر محمد فاروق بلگرامی ۔ مصنف اپنے وقت کے ایک معروف عالم دین و صوفی ، شیخ حبیب اللہ قنوجی کا شاگرد تھا ۔ 'مدینۃ العلم' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و کوائف پر مشتمل ہے اور در اصل شیخ حبیب اللہ کی عربی تصنیف 'روضۃ النبی' (مصنفہ ۱۷۰۸ء/۱۱۲۰ھ) کا فارسی ترجمہ ہے ۔ 'روضۃ النبی' کے علاوہ حبیب اللہ کی اور مشہور تصانیف یہ ہیں : 'جواہر خمسہ' ، 'تذکرہ الاولیا' ، 'انیس العارفین' ۔ 'مدینۃ العلم' کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے[1] ۔

(۲۶) 'حملۂ حیدری' ، از میرزا محمد رفیع باذل الملقب بہ رفیع خان ۔ باذل کا والد میرزا محمود مشہدی ، مشہد سے ہجرت کر کے شاہجہان کے عہد حکومت میں ہندوستان آ گیا تھا ، اس کے ساتھ اس کا چچا بھی آیا تھا جو بعد میں وزیر خان کے لقب سے مشہور ہوا اور جسے اورنگ زیب نے یکے بعد دیگرے برہان پور ، اکبر آباد اور مالوہ کا حاکم مقرر کیا اور جس کا انتقال ۱۶۷۷ء - ۱۶۷۸ء/۱۰۸۸ھ میں ہوا ۔ باذل ، شہزادہ معزالدین کا دیوان رہا اور بعد میں گوالیار اور پھر بریلی کا حاکم ہوا ۔ اورنگ زیب کے انتقال پر ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ میں اسے معزول کر دیا گیا اور اس نے اپنی باقی عمر وہیں دہلی میں گوشۂ عزلت میں بسر کی ۔ وہیں ۱۷۱۱ء/۱۱۲۳ھ میں اس کا انتقال ہوا ۔ 'حملۂ حیدری' مثنوی کی شکل میں رسول اللہ صلعم اور خلفای راشدینؓ کی منظوم تاریخ ہے ، جس میں حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ۔ مصنف کی وفات کے باعث یہ مثنوی نامکمل رہ گئی تھی لیکن اسے بعد ازاں کئی دوسرے مصنفین نے جاری

---

(۱) اسٹوری ، ص ۱۹۹ ۔

رکھا جن میں حسب ذیل شامل ہیں : نجف ، آزاد (محمد صادق آزاد) ، محب اللہ خاں حکمت (جس کا تصنیف کردہ حصہ صولت صفدری کے نام سے مشہور ہے) ، میاں احسن (تکملے کا نام محاربۂ غضنفری یا تکملۂ حملۂ حیدری) ، اور سید پسند علی بلگرامی (جن کا مصنفہ حصہ تکملۂ حملۂ حیدری کہلاتا ہے) - مثنوی حملۂ حیدری لکھنو میں ۱۸۵۱ء میں اور متھرا میں ۱۸۹۵ء میں چھپی - حکمت کا تکملہ صولت صفدری مخطوطے کی شکل میں موجود ہے ، پسند علی کا تکملہ (تکملۂ حملۂ حیدری) ۱۸۸۸ء/ ۱۳۰۵ھ میں آگرے میں چھپا[1] -

(ب) ہندوستان کی عمومی تواریخ

(۱) 'چہار گلشن شجاعی' ، از ہری چرن داس بن مکند رائے بن ساگر مل جو میرٹھ میں چودھری اور قانون گو اور نواب قاسم علی خان کی ملازمت میں تھا - وہ اس نواب اور اس کی بیٹی نجیب النساء خانم کے ہمراہ اودھ گیا (عالمگیر ثانی کے پہلے سال حکومت میں) اور قاسم علی خان کی وفات کے بعد اس کی بیٹی اور بیٹوں کی ملازمت میں رہا - یہ کتاب اس نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے نام سے منتسب کی ہے - اس کی تیاری میں ، اس کے اپنے بیان کے مطابق ، علاوہ تاریخ کی معروف اور مستند کتابوں کے ، 'فردوسی کے شاہنامے' ، 'راجا ولی' ، 'راماین' ، 'بھگوت گیتا' وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے - مصنف نے راجا یودھشٹر سے شروع کرکے شاہ عالم ثانی کے تیرھویں سال جلوس ۱۷۸۵ء/۱۱۹۹ھ تک کل ۶۳۵ سال کی تاریخ لکھی ہے[2] -

(۲) 'ریاض الملوک' از غوث بن محمد فائق ساوری - یہ زیادہ تر تاریخی حکایات و نوادر پر مشتمل ہے اور احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کے لیے لکھی گئی تھی[3] - اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے -

(۳) 'ہفت گلشن کام ور خان' ، جو 'ہفت گلشن محمد شاہی' بھی کہلاتی ہے - از محمد ہادی کام ور خان - یہ عمومی تاریخ محمد شاہ کے عہد حکومت کے دوسرے سال ، یعنی ۱۷۱۹ء/

---

(۱) دیکھیے اسٹوری ، ص ۱۹۹ - ۲۰۱ - حملۂ حیدری بہت حد تک معین الدین فراہی (م - ۱۵۰۱ء - ۱۵۰۲ء/۹۰۷ھ) کی تصنیف معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ پر مبنی ہے -

(۲) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۲۰۸ -

(۳) دیکھیے اسٹوری ، ص ۶۴۹ ، نیز اورینٹل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۲۶ء -

۱۱۳۲ھ میں لکھی گئی ۔ مصنف وزیر عنایت اللہ خان کا ملازم اور میر سامان کے عہدے پر مامور تھا ۔ کام ور خان اس کا خطاب تھا ۔ یہ تاریخ ایک حد تک 'تاریخ فرشتہ' کی تلخیص ہے ۔ سلاطین دہلی کی تاریخ صرف بابر کے عہد تک دی گئی ہے (باقی بادشاہوں کے حالات ایک اور کتاب بنام 'تذکرۂ چغتائی' ، میں مذکور ہیں) ۔ اس میں جونپور ، مالوہ ، گجرات ، خاندیش ، بنگال ، دکن ، سندھ ، ملتان اور کشمیر کے حکمرانوں کے حالات بھی درج ہیں ، اور آخر میں اولیاء و اصفیای ہندوستان کا ذکر کیا گیا ہے[۲] ۔

(۴) 'حقیقتہای ہندوستان' (تاریخی نام ۱۷۸۹ء - ۱۷۹۰ء/۱۲۰۴ھ) : از لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی ۔ مصنف کا باپ منسا رام حیدر آباد دکن کا ایک بڑا عہدیدار تھا اور ۱۷۹۰ء/۱۲۰۴ھ میں دیوان کے عہدے پر مامور ہوا ۔ شفیق ، عالی جاہ بن نظام علی خان کی ملازمت میں تھا ۔ وہ آزاد بلگرامی کا شاگرد تھا اور انہیں اپنا پیر بتاتا ہے ۔ اس کتاب کے علاوہ تین تذکروں بنام 'چمنستانِ شعراء' ، 'گلِ رعنا' اور 'شامِ غریباں' کا بھی مصنف ہے ۔ ان کے علاوہ اس نے چند اور کتابیں بھی لکھی ہیں ، جیسے 'آصف نامہ' . 'بساط غنائم' (دکن کی تاریخ) اور 'خلاصۃ الہند'۔ 'حقیقتہای ہندوستان' کیپٹن ولیم پیٹرک یا کرک پیٹرک کے پاس خاطر سے لکھی گئی تھی ۔ یہ چار مقالوں بر مشتمل ہے : (۱) مالیاتِ دکن (۲) صوبجاتِ ہندوستان ، (۳) صوبجاتِ دکن اور (۴) ہندوستان کے مسلمان بادشاہ از معزالدین سام تا علی گوہر (شاہ عالم ثانی) ۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم ، انڈیا آفس اور بانکی پور کے کتب خانوں میں موجود ہیں[۲] ۔

(ج) تواریخِ خاندانِ مغلیہ

(۱) 'مآثر عالمگیری' ، از محمد ساقی (م - ۱۷۲۳ء/۱۱۳۶ھ) ۔ محمد ساقی مستعد خان بہادر شاہ اول کے وزیر عنایت اللہ خان کا منشی تھا اور اس نے یہ تاریخ اس کی فرمایش پر تصنیف کی تھی ۔ وہ چالیس سال تک دربار شاہی سے وابستہ رہا اس لئے اس نے جو تاریخی واقعات قلم بند کئے ہیں وہ بیشتر اس کے چشم دید ہیں ، اگرچہ عالمگیر کے عہد کے ابتدائی دس سالوں کے حالات اس نے زیادہ تر محمد کاظم کے 'عالمگیر نامہ' سے اخذ لئے

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۱۳ ۔

(۲) دیکھیے اسٹوری ، ص ۴۷۶ ۔

ہیں ۔ یہ کتاب اورنگ زیب کی وفات کے تین سال بعد یعنی ۱۷۱۰ء میں مکمل ہوئی ۔
خوافی خان[1] نے لکھا ہے کہ مستعد خان باوجود اورنگ زیب کی ممانعت کے تاریخ نویسی
میں مشغول رہا اور اس نے بادشاہ کی مہم دکن کے حالات بھی بہت تفصیل سے لکھے
ہیں ، اگرچہ یہ احتیاط بھی برتی ہے کہ صرف شاہی افواج کی کامیابیوں کا ذکر کیا جائے ،
ناکامیوں کا نہیں ۔ یہ تاریخ دو جلدوں (کتابوں) میں منقسم ہے جن میں سے پہلی میں
اورنگ زیب کے عہد سلطنت کے پہلے دس سالوں کے واقعات مذکور ہیں جو (جیسا کہ
کہا جا چکا ہے) محمد کاظم کے 'عالمگیر نامہ' سے مقتبس ہیں ۔ اور دوسری جلد میں اس بادشاہ
کے عہد کے آخری چالیس سالوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اور اس کے انتقال کی
کیفیت بھی لکھی گئی ہے ۔ تاریخ کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں بادشاہ کے متعلق قصے
اور اس کے حالات درج ہیں ۔ 'مآثر عالمگیری' کو سنین کے حساب سے مرتب کیا گیا ہے
اور صحت کا خاص اہتمام مد نظر رکھا گیا ہے ۔ بقول اسٹوارٹ ، عہد عالمگیری کا کوئی
ایسا واقعہ نہیں ہے جو کسی اور تاریخ میں ملتا ہو اور 'مآثر' میں مذکور نہ ہو ۔ ایلیٹ و
ڈاؤسن نے اس کے متعدد اقتباسات کا انگریزی ترجمہ کیا ہے[2] ۔

(۲) 'منتخب اللباب' ، از محمد ہاشم خوافی (یا خافی) خان (مصنف نے خود اس کتاب
کا نام 'منتخب اللباب' محمد شاہی لکھا ہے) ۔ مصنف دہلی کے ایک اچھے خاندان کا فرد تھا ۔
اس کا والد خواجہ میر ، شہزادہ مراد بخش کی ملازمت میں ایک اعلیٰ منصب پر مامور تھا ،
اور وہ خود اورنگ زیب کی ملازمت میں رہا ۔ فرخ سیر کے عہد میں وہ نظام الملک کا
دیوان تھا ۔ 'منتخب اللباب' کے مقدمے میں حضرت نوح کے زمانے سے لے کر بابر تک
مغلوں اور تاتاریوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور بعد ازاں دہلی کے مغل بادشاہوں کی
تاریخ ہے ، جو محمد شاہ کے عہد حکومت کے چودھویں سال تک جاتی ہے[3] ۔ اسے عام طور
پر اورنگ زیب کے مکمل عہد حکومت کی غیر جانبدار اور بہترین تاریخ مانا جاتا
ہے ۔ اس عہد کے اکثر واقعات مصنف کے چشم دید ہیں اور اس نے انہیں تفصیل

---

(۱) مصنف منتخب اللباب ، دیکھیے نیچے ۔
(۲) ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۷ ، ص ۱۸۱ تا ۱۹۸ ۔ سر جادو ناتھ سرکار نے مآثر کا انگریزی
ترجمہ کیا ہے جو کلکتے میں ۱۹۴۷ء میں چھپا تھا (ببلوتھیکا انڈیکا) ۔
(۳) یہ کتاب مصنف نے محمد شاہ ہی کی خدمت میں پیش کی تھی اور اسی لیے اسے خافی خان
کا خطاب دیا تھا ۔

سے بے کم و کاست اور بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے ۔ اورنگ زیب پر دور حاضر کے جن مؤرخین نے کتابیں لکھی ہیں ، انھوں نے زیادہ تر اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے ۔ 'منتخب اللباب' میں کئی ایسے واقعات کی تفصیل ملتی ہے جو دوسری کتابوں میں نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت سرسری طور پر مذکور ہے ۔ اورنگ زیب کی اپنے بھائیوں سے تخت نشینی کے سلسلے میں جنگ ، شہزادہ شجاع کا اراکان کی جانب فرار اور وہاں جا کر غائب ہو جانا ، شیواجی اور سمبھاجی کے خلاف معرکے ، مہم دکن ، سید برادران کا عروج و زوال ، سکھوں سے جنگ ، عبدالصمد خان حاکم لاہور کا محاصرۂ گورداسپور اور اس کی تسخیر ، بندا بیراگی کی گرفتاری اور بیسیوں دیگر ایسے واقعات و حادثات ہیں جنھیں بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں ضمناً بنگلی میں انگریزوں کی تجارتی منڈیوں وغیرہ کا بھی ذکر آ گیا ہے ۔ یہ کتاب دو بڑی جلدوں میں ہے جن میں سے پہلی کو مولوی کبیر الدین احمد اور غلام قادر نے طبع کیا اور کلکتے میں ۱۸۶۰ء تا ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی ۔ دوسری جلد کو وولزلی ہیگ نے طبع کیا اور یہ بھی کلکتے میں ہی شائع ہوئی (۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۵ء) ۔ مخطوطے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں[1] ۔

(۳) 'تاریخ مظفری' ، از محمد علی خان انصاری ، مصنف 'بحرالمواج' (دیکھیے اوپر) ۔ اس کتاب کا پہلا حصہ ، جو ۱۷۸۷ء-۱۷۸۸ء/۱۲۰۲ھ میں مکمل ہوا ، معین‌الدولہ مبارزالملک خان محمد رضا خان بہادر نائب ناظم بنگال و بہار کے پاس خاطر کے لیے لکھا گیا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام 'تاریخ مظفری' رکھا گیا ۔ بعد ازاں مصنف نے اس میں مزید اضافہ کر کے ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ تک کے حالات و واقعات شامل کر دیے ۔ یہ تاریخ محمد شاہ اور اس کے جانشینوں کے دور حکومت کے سلسلے میں بہت بیش قیمت ہے اور متأخر مؤرخین اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں ۔ ایلیٹ و ڈاؤسن نے بھی اس کے کئی اقتباسات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے[2] ۔ اس میں متعدد جغرافیائی معلومات ہیں اور فارسی شعراء کا تذکرہ بھی شامل ہے ۔

(۴) 'شاہنامہ منور قلم'[3] ، از شیو داس لکھنوی ۔ یہ تاریخ ، فرخ سیر کے عہد سے شروع ہوتی ہے اور محمد شاہ کے عہد کے چوتھے سال پر ختم ہو جاتی ہے ، لیکن بظاہر

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۷ ، ص ۱۸۱ تا ۱۹۷ ، اسٹوری ، ص ۴۶۰ تا ۴۷۰ ۔
(۲) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۳۱۶ ببعد ، اسٹوری ، ص ۵۲۲ ۔
(۳) بعض مآخذ میں ''منور کلام'' درج ہے جو غالباً غلط ہے ۔

مصنف نے اسے ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ کے قریب مکمل کیا تھا ۔ ایک انگریز فوجی لیفٹیننٹ پرچارڈ نے ایلیٹ کی فرمایش پر اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جس میں سے اقتباسات ایلیٹ و ڈاؤسن کی تاریخ میں مندرج ہیں ۔ یہ تاریخ سوانح حیات اور دلچسپ حکایات کا اچھا مجموعہ ہے ، لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے چنداں اہمیت نہیں رکھتی ، اس لیے کہ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کسی اور کتاب میں نہ پائی جاتی ہو (دیکھیے ایلیٹ ، ج ۸ ، ص ۲۳۱ اور اسٹوری ، ص ۶۰۸) ۔

(۵) 'بہادر شاہ نامہ' از نعمت خان عالی ۔ یہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے عہد حکومت کے پہلے دو سالوں کی سرکاری تاریخ ہے اور ۱۷۰۸ء/۱۱۲۰ھ میں لکھی گئی تھی[۱] ۔

(۶) 'عبرت نامہ' ، از محمد قاسم عبرت ۔ اس میں اورنگ زیب کے عہد سے سید برادران کے زوال تک کے حالات درج ہیں ۔ اسے ۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ میں لکھا گیا ۔

(۷) 'ذکر السیر' ، (تاریخی نام - ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ) ، از غلام حسین خان بن محمد ہمت خان ، مصنف 'تاریخ بنارس' ۔ یہ بنارس کے راجہ بلونت سنگھ اور اس کے بیٹے چیت سنگھ کی ملازمت میں رہا ۔ اس تاریخ میں مصنف نے نادر شاہ کے ہندوستان پر حملے سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہد کے آخر تک کے واقعات بیان کیے ہیں[۲] ۔

(۸) 'ظفر نامہ' ، از غلام محی الدین احمد خان ۔ احمد شاہ ابدالی کے حملۂ ہند کے حالات جو معین الملک کے لیے لکھے گئے ۔ اس کا ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے (دیکھیے اورینٹل کالج میگزین ، بابت اگست ۱۹۲۶ء)[۳] ۔

(۹) 'تاریخ عماد الملک' ، از عبدالقادر خان بن واصل علی خان ، قاضی القضاۃ بنگال ۔ عماد الملک غازی الدین وزیر احمد شاہ و عالمگیر ثانی کی تاریخ ۔ مصنف کا بیان ہے کہ اس نے یہ سب واقعات خود عماد الملک سے سن کر تحریر کیے ہیں[۴] ۔

---

(۱) دیکھیے اسٹوری ، ص ۶۰۰ ۔
(۲) ایضاً ، ص ۶۴۲ ۔
(۳) ایضاً ، ص ۶۱۸ ۔
(۴) ایضاً ، ص ۶۲۳ ۔

(۱۰) 'وقائع مہابت جنگ'، از یوسف علی وفا عظیم آبادی، مداح و متوسل علی ویردی خان مہابت جنگ ۔ مصنف نے مہابت جنگ کی نظامت بنگال کے آغاز سے چند سال پہلے کے واقعات سے سروع کر کے ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ تک کے حالات قلم بند کیے ہیں ۔ اس نے ایک جدت یہ کی ہے کہ واقعات کا ذکر ایسے جملوں سے لیا ہے جن سے ان کی تاریخ نکلتی ہے (دیکھیے اسٹوری، ص ۱۰۷) ۔ سر جادو ناتھ سرکار نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا جسے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے Nawabs of Bangal کے عنوان سے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا ۔

(۱۱) 'بھاؤ نامہ' یا 'نگار نامۂ ہند' : از میر غلام علی رضوی (یا نقوی) ابن سید محمد اکمل خان، مصنف 'عماد السعادت' ۔ اس تاریخ میں بالخصوص پانی پت کی تیسری جنگ کا مفصل حال ہے جو احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان ۱۷۶۱ء میں لڑی گئی ۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے اس جنگ کی کیفیت ایک عینی شاہد، یعنی دکن کے ایک برہمن کاشی راؤ سے سن کر لکھی ہے، لیکن ممکن ہے کہ اس نے تاریخ ابراہیم سے بھی استفادہ کیا ہو جو ۱۷۸۶ء میں مکمل ہوئی تھی ۔ 'بھاؤ نامہ' بظاہر ۱۸۰۸ء کے بعد کسی تاریخ میں لکھا گیا تھا ۔ اس کی عبارت، اس دور کی بیشتر تواریخ کے برعکس، مرصع اور پرتکلف ہے[1] ۔

(۱۲) 'امیر نامہ'، از نواب امیر علی خان بہادر ۔ مصنف باڑھ (نزد پٹنہ) میں پیدا ہوا (۱۸۱۰ء) اور کلکتے میں نواب اودھ نصیر الدین حیدر کے سفیر کا معاون مامور ہوا ۔ بعد ازاں عدالت دیوانی میں کمشنر کا معاون مقرر ہوا اور اسے خان بہادر کا خطاب دیا گیا ۔ وہ مجلس قانون ساز کا رکن بھی رہا، اور جب اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کلکتے بھیجے گئے تو وہ ان کی ملازمت میں منسلک ہو گیا اور اسے مدارالمہام اور وزیر السلطان کے القاب عطا ہوئے ۔ ۱۸۷۵ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے اسے نواب کا خطاب دیا گیا ۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنی یادداشتیں جمع کر دی ہیں اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام 'امیر نامہ' رکھا ہے ۔ کتاب کے شروع میں کلکتے میں برطانوی حکومت کی ابتدائی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے ۔ 'امیر نامہ' ۱۸۷۰ء میں کلکتے میں طبع

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن، ج ۸، ص ۳۹۶ ۔

ہوا[1] - اس نے 'وزیر نامہ' کے نام سے اودھ کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے -

(۱۳) 'تاریخ کشمیر' ، از نراین کول عاجز - یہ تاریخ عارف خان نائب صوبہ کشمیر کے ایما سے شاہ عالم اول کے عہد کے چوتھے سال ۱۰-۱۷۱۱ء/۱۱۲۲ھ میں لکھی گئی - مصنف کا بیان ہے کہ اس نے اسے سنسکرت کتابوں اور ان کے فارسی ترجموں کی مدد سے ، جو ایکہ عالم حیدر ملک نے کیے تھے ، مرتب کی ہے - اس کی زبان سادہ اور سلیس ہے - اس میں قدیم ترین زمانے سے شروع کر کے ۱۰-۱۷۱۱ء/۱۱۲۲ھ تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں - اس کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں[2] -

(۱۴) 'واقعات کشمیر' ، (تاریخی نام - ۱۷۳۵ء/۱۱۴۸ھ) از خواجہ محمد اعظم بن خیر الزمان خان مجدد کشمیری (م - ۱۷۷۱ء/۱۱۸۵ھ) - محمد اعظم ملا عبداللہ ، مراد بیگ ، کامل بیگ اور میر ہاشم نامی علما کا شاگرد اور نقشبندی بزرگ شیخ مراد کا مرید تھا - 'واقعات کشمیر' کے علاوہ وہ کئی اور کتابوں کا بھی مصنف ہے - اس تاریخ میں زیادہ تر اولیاء ، شعراء اور علماء کا ذکر ہے اور یہ ایک مقدمے اور تین حصوں (اقسام) پر مشتمل ہے - لاہور میں ۱۸۸۶ء/۱۳۰۳ھ میں طبع ہوئی تھی[3] -

(۱۵) 'خالصہ نامہ' ، از بخت مل جو دیوان امر ناتھ اکبری کا دادا تھا - اس کا والد کشمیر سے لاہور آ گیا تھا اور مغل صوبیدار کی برطرفی پر واپس دہلی چلا گیا تھا - بخت مل غالباً وہیں پیدا ہوا تھا ، وہاں سے وہ کئی بار اودھ گیا اور آصف الدولہ نے اسے ملازمت کی پیش کش کی لیکن وہ انکار کر کے دہلی آ گیا - ۱۸۰۵ء میں سر جان میلکم کے ہمراہ ایک مشن پر رنجیت سنگھ کے زمانے میں لاہور آیا - اسی موقع پر سر جان میلکم کے ایما سے اس نے یہ تاریخ مرتب کی جس میں گرو نانک کے زمانے سے لے کر ۱۸۰۷ء - ۱۸۰۸ء/۱۲۲۲ھ تک کے حالات مندرج ہیں - اس کے پوتے دیوان امر ناتھ ولد دینا ناتھ (وزیر مال رنجیت سنگھ) نے بھی ایک تاریخ 'ظفر نامہ رنجیت سنگھ' کے نام سے لکھی ہے جس میں ۱۸۳۵ء - ۱۸۳۶ء تک کے واقعات مذکور ہیں - یہ تاریخ ۱۹۲۸ء میں سیتا رام کوہلی

---

(۱) دیکھیے استوری ، ص ۶۴۸ -
(۲) ایضاً ، ص ۶۸۱ -
(۳) ایضاً ، ص ۶۸۳ -

نے طبع کی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شائع کی گئی[1] -

(۱۶) 'مفتاح التواریخ' از طامس ولیم بیل - مصنف آگرے کے بورڈ آف ریوینیو میں ایک معمولی کلرک تھا - لیکن معلوم ہوتا ہے اسے فارسی سے خاص شغف تھا اور اس نے اس زبان میں کافی مہارت پیدا کر لی تھی - یہ کتاب قطعات تاریخی کا مجموعہ ہے جو ایشیا کے اور بالخصوص ہندوستان کے مشہور تاریخی واقعات سے متعلق ہیں اور جنہیں اس نے بڑی محنت و کاوش سے مختلف کتابوں کی مدد سے جمع کیا ہے - اس کے علاوہ اس نے کتبوں سے بھی استفادہ کیا ہے جو اسے مساجد و مقابر ، باغوں اور نالابوں ، قلعوں ، محلّوں وغیرہ میں ملے - اور اس نے اور اس کے دوستوں نے تاریخی تسلسل برقرار رکھنے اور خلا پُر کرنے کے لیے کئی طبع زاد قطعات کا بھی اضافہ کر دیا ہے - سنہ ہجری کے حساب سے کتاب کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک باب ایک صدی کے مطابق ہے ، جگہ جگہ ہجری سنین کے ساتھ ساتھ عیسوی ، ہندی ، فصلی اور جلالی سنین بھی دیے گئے ہیں - یہ کتاب اس نوعیت کی اور سب کتابوں سے زیادہ جامع اور بہتر ہے - ۱۸۴۹ء میں آگرے میں لیتھو سے چھپی تھی اور اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں نولکشور پریس میں طبع ہوئی -

(۱۷) 'آصف نامہ' از تجلّی علی موزوں ، نظام علی خان نظام حیدرآباد کی منظوم تاریخ -[2] تالیف ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ -

(۱۸) 'وقائع دکن' از محمد فیض اللہ ، شاہ جہان کے عہد حکومت میں دکن کے حالات ، سنہ تصنیف ۱۸۲۰ء/۱۲۳۶ھ -[3]

(۱۹) 'وقائع ہلکر' : از موہن سنگھ - جسونت رائے ہلکر کی تاریخ جو اپنے بھائی کاشی راؤ ہلکر کی جگہ اندور کا راجا ہوا - اس نے ۱۸۰۴ء میں لارڈ لیک سے شکست کھائی (فرخ آباد کے قریب) - جسونت راؤ ۱۸۰۶ء میں دیوالہ ہوگیا اور ۱۸۱۰ء میں مر گیا - موہن سنگھ نے اس کی یہ تاریخ اس کے بخشی بھوانی شنکر کی فرمایش پر ۱۸۰۸ء/۱۲۲۳ھ میں تصنیف کی تھی -[4]

---

(۱) اسٹوری ، ص ۶۶۶ -
(۲) ایضاً ، ص ۷۰۴ -
(۳) ایضاً ، ص ۷۳۹ -
(۴) ایضاً ، ص ۷۳۲ -

(۲۰) 'تاریخ حمید خان' از حمید خان ۔ مصنف لارڈ کارنوالس کے ہمراہ ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزی مہم میں میسور گیا تھا ۔[1] اس نے اس تاریخ میں ۱۷۹۲ء/۱۲۰۶ھ کے عہد نامہ صلح تک انگریزوں اور ٹیپو سلطان کی جنگ کے واقعات تحریر کیے ہیں ۔ یہ کتاب اسی سال یعنی ۱۷۹۲ء/۱۲۰۶ھ میں مکمل ہوئی ۔[2]

(۲۱) 'تاریخ ارادت خانی' از ارادت خان واضح ، اورنگ زیب کے بعد سے فرخ سیر کے عہد حکومت کے آغاز تک کے تاریخی واقعات پر مشتمل ہے ۔ 'مآثرالامراء' کی رو سے میر مبارک اللہ ارادت خان واضح اسحاق خان بن عظیم خان کا بیٹا تھا ۔ اس کا باپ اور دادا دونوں مغل دور کے بڑے امراء میں سے تھے ، چنانچہ دادا عظیم خان جہانگیر کے زمانہ میں میر بخشی تھا اور والد شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں کئی اہم عہدوں پر مامور رہا ۔ اس کا خطاب بھی ارادت خان تھا اور وہ آخر میں اودھ کا صوبیدار مقرر ہوا ۔ لیکن اس تقرر کے تھوڑے ہی عرصے بعد فوت ہوگیا ۔ ارادت خان واضح اورنگ زیب کے زمانے میں جگنہ کا فوجدار تھا اور بعد ازاں اورنگ آباد اور مانڈو میں بھی اسی حیثیت سے مامور رہا ۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں اسے حاکم دوآب مقرر کیا گیا ۔ وزیر معظم خان سے اس کے بہت دوستانہ مراسم تھے ۔ وہ فرخ سیر کے عہد میں فوت ہوا ۔ علاوہ اس تاریخ کے فارسی اشعار کا ایک دیوان اس کی یادگار ہے ۔ اس تاریخ میں اس نے واقعات کا آغاز اپنی امتیاز گڑھ (ادونی) کی امارت سے برطرفی اور احسن آباد (گلبرگہ) میں ماموریت پر کیا ہے ۔ پھر وہ مانڈو کی قلعہ داری اور فوجداری پر اپنے تقرر کا ذکر کرتا ہے ۔ وہ بعد ازاں شہزادہ بیدار بخت سے وابستہ ہوگیا تھا اور اس کے بعد کے حالات و واقعات بیان کرتا ہے ۔ یہ تاریخ (جیسا کہ مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے) صاف اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہے اور زیادہ تر مصنف کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہے ۔ سادگی کے باوجود اس کا اسلوب تحریر زور دار اور دل آویز ہے ۔ وہ ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا سپاہی بھی تھا اور فنونِ حرب سے بخوبی واقف تھا ۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے جو اس نے جہاندار شاہ اور فرخ سیر کی جنگ کے بارے میں لکھی ہے ۔ اس کتاب میں اس نے اورنگ زیب کے بعض خطوط بھی نقل کیے ہیں ۔ اقتباسات کے لیے دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۷ ،

---

(۱) میسور کی تیسری جنگ (۱۷۹۰ء تا ۱۷۹۲ء) ۔

(۲) دیکھیے اسٹوری ، ص ۷۷۳ ۔

(مطبوعہ الہ آباد)، ص ۵۲۹ تا ۵٦۳ - کیپٹن جوناتھن اسکاٹ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو اس کی کتاب 'ہسٹری آف دی دکن' ، کی دوسری جلد میں شامل ہے (پہلی جلد زیادہ تر 'تاریخ فرشتہ' پر مبنی ہے) - ایک اردو ترجمہ بعنوان سوانح عمری اولادت خاں ، از شمسی حیدرآبادی ، حیدرآباد میں شائع ہوا تھا -[1]

(۲۲) 'سیرالمتاخرین' ، از سید غلام حسین بن علی خان طباطبائی ، مصنفہ ۱۷۸۳ء - غلام حسین خان نواب علی ویردی خان کا قرابت دار تھا - اس کا والد ہدایت علی خان مہابت جنگ کی صوبیداری' بنگال کے زمانے میں حاکم بہار رہا تھا - وہ خود محمد شاہ کے عہد میں پانی پت اور سون پت کا فوجدار رہا اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں میر بخشی کے عہدے پر مامور تھا - بعد ازاں وہ بہار چلا گیا - 'سیر المتاخرین' تین جلدوں میں ایک ضخیم تاریخ ہے - پہلی جلد میں ہندوستان کی قدیم تاریخ بیان کی گئی ہے جو بزعم مصنف بعض ایسی سنسکرت کتابوں سے ماخوذ ہے جن کا اکبر کے عہد میں فارسی میں ترجمہ ہوا تھا ، لیکن جو بظاہر 'خلاصۃ التواریخ' (از سوجن رائے بھنڈاری) کے بیانات پر مبنی ہے جو بجائے خود کسی گمنام مصنف کی 'مختصر التواریخ' کی رہین منت ہے - تاریخ کا دوسرا حصہ (جلد ثانی و ثالث) زیادہ اہم ہے - اس میں زیادہ تر آخری مغل بادشاہوں اور بنگال میں انگریزی حکومت کے حالات بیان کیے ہیں (از ۱۷۰۰ء تا ۱۷۸٦ء) - ایک فرانسیسی نو مسلم مصطفیٰ نامی نے 'سیر المتأخرین' کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو کلکتے میں ۱۷۸۹ء میں شائع ہوا - اس کے بعد برگز نے ترجمہ شروع کیا جو نامکمل رہا - پھر ریمنڈ نے مکمل ترجمہ کیا جو اصل کتاب کی طرح تین جلدوں میں ہے - اس کا ایک اردو ترجمہ بنام 'مرآۃ السلاطین' منشی گوکل چند نے کیا جو نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا - اصل فارسی متن کلکتے میں ایک سے زائد مرتبہ چھپا اور دو دفعہ نولکشور پریس سے شائع ہوا - (دوسری دفعہ تین جلدوں میں ۱۸۹۷ء میں) - غلام حسین نے اپنے زمانے کے انگریز حکام کی تعریف بھی کی ہے اور ان کے نظم و نسق کو بہت سراہا ہے - مگر کہیں کہیں ان پر نکتہ چینی بھی کی ہے - ایلیٹ نے 'سیر المتاخرین' کو ایک نہایت کارآمد اور بیش قیمت تصنیف قرار دیا ہے اور ایک

---

(۱) دیکھیے اسٹوری ، ص ٦۰۲ - ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے زیر اہتمام فارسی متن کی ایک تنقیدی طبع تیار کی جا رہی ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گی ۔

انگریز عالم کا قول نقل کیا ہے جس نے کہا ہے کہ یہ کتاب یورپ کے بعض بڑے مؤرخین ، مثلاً لارڈ کلیرنڈن[1] ، ڈک ڈسلی[2] اور بشپ برنٹ[3] کے لیے بھی قابل فخر ہو سکتی ہے ۔ لیکن بعض اور مصنفین کا خیال ہے کہ اس میں جدید یا طبع زاد چیزیں بہت کم ہیں اور غلام حسین نے زیادہ تر متقدم تواریخ سے سرقہ کیا ہے ۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ متاخر مغل بادشاہوں کی تاریخ کے لیے یہ ایک بہت جامع اور مستند کتاب ہے اور زمانۂ حال کے مشرقی و مغربی تاریخ نگار اس سے بہت استفادہ کرتے رہے ہیں ۔

'سیر المتاخرین' کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کی رحلت سے ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے جانشینوں کا ذکر ہے ، جس میں اورنگ زیب کے تینوں بیٹوں ، اعظم ، معظم اور کام بخش کی باہمی آویزش ، جاجو کی جنگ اور اس میں معظم (بہادر شاہ اول) کی فتح ، اور پھر اس کے عہد کے اور اس کے پانچ جانشینوں کے دور حکومت کے حالات دیے گئے ہیں : یعنی محمد معزالدین جہاندار شاہ ، فرخ سیر (پسر عظیم الشان) رفیع الدرجات ، رفیق الدولہ اور محمد شاہ کے عہد کے (چودھویں سالِ حکومت تک) ۔ اس میں نظام الملک آصف جاہ اور سید برادران کے باہمی نزاع ، نادر شاہ کے حملے ، سراج الدولہ اور جنگ پلاسی اور میر جعفر کے حالات بھی خاصی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں ۔ کل زیر بحث زمانہ کم و بیش پچھتر سال (۱۷۰۶ء - ۱۷۸۱ء/۱۱۱۸ھ - ۱۱۹۵ھ) ہے ۔ مصنف نے مقدمے میں اس تاریخ کے لکھنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ :

"چون احوال عظمای ہند بعد از رحلت محمد اورنگ زیب عالمگیر را ظاہرا احدی متعرض نوشتن نگردیدہ ، ہر قدر معلوم و از معتمدان مقبول القول مسموع افتادہ باشد مجملاً بزبان قلم دادہ آید تا اگر دانشوری محرر

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۱۹۳ تا ۱۹۸ ۔ ایڈورڈ ہائڈ کلیرنڈن (۱۶۰۹ء تا ۱۶۷۴ء) انگریز بادشاہ چارلس ثانی کے عہد میں لارڈ ہائی چانسلر کے منصب پر فائز رہا تھا ۔ اس کی تاریخ بہت مشہور و مستند کتاب ہے ۔

(۲) ڈک ڈسلی (م - ۱۳۴۱ء) ، فرانسیسی کی وجہ سے مشہور ہے ۔

(۳) بشپ گلبرٹ برنٹ (۱۶۴۳ء تا ۱۷۲۵ء) انگریز بادشاہ ولیم اور ملکہ میری کے زمانے میں سالسبری کا بشپ تھا ۔ اس کی دو تاریخی کتابیں مشہور ہیں :
(۱) ہسٹری آف دی ریفارمیشن اور (۲) ہسٹری آف ہز اون ٹائمز ۔

بعد ازین زمان متصدی نقل و بیان احوال پیشینان گردد ، سررشتہ اخبار اعصار و زبان از ہم نگسلد ، بنا برین تشبثاً بعون اللہ و تائیدہ شروع در تسطیر نمودہ بر خود التزام کرد کہ آنچہ از ناقلان معتبر شنیدہ بعبارت صاف از تکلف دور در سلک تحریر کشد ، اگر غلطی ظاہر شود عذر ظاہر تر است و العہدۃ علی الراوی ، و ہرگاہ بعونہ تعالی انجام یابد بہ 'سیر المتاخرین' من ثمانیہ عشر الی خمس و تسعین من المایہ الثانیہ من الہجرۃ المقدسۃ مسمی خواہد بود ۔''

اور یہ حقیقت ہے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور کے تاریخی سلسلے میں 'سیر المتاخرین' ایک ایسی کڑی ہے جس کے بغیر اس زمانے کی تاریخ نامکمل اور غیر مربوط رہتی ۔

(۲۳) 'تاریخ شاہ عالم' از منا یا منو لال بن بہادر سنگھ منشی ۔ اس تاریخ میں شاہ عالم کے چوبیسویں سال جلوس (۱۱۹۶/۱۷۸۱ء) تک کے حالات بہت تفصیل سے دیے گئے ہیں[1] ۔

(۲۴) 'عبرت نامہ' ، از فقیر خیرالدین محمد الہ آبادی (م - ۱۸۲۷ء/۱۲۴۳ھ) ۔ مصنف 'تاریخ جولپور' و 'بلونت نامہ' ۔ وہ جولپور میں رہتا تھا اور حکومت برطانیہ کا پنشن خوار تھا ۔ بعد ازاں وہ لکھنؤ جا کر نواب سعادت علی خاں کا ملازم ہوگیا جسے اس نے ''اعتمادالدولہ و الدین اعتماد الاسلام والمسلمین وزیر ممالک عمدۃ الملک یمین الدولہ نظام الملک نواب سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ'' لکھا ہے اور بہت سراہا ہے ۔ اس کا انتقال تقریباً ۱۸۲۷ء میں ہوا ۔ خیرالدین نے اپنی یہ تاریخ امیر تیمور سے شروع کی ہے لیکن شروع کے مغل بادشاہوں کا ذکر صرف ۲۵ صفحوں میں بہت اختصار سے کیا ہے ۔ زیادہ تر مفصل حالات عالمگیر ثانی اور بالخصوص شاہ عالم ثانی کے زمانے سے متعلق ہیں ۔ اس نے شاہ عالم

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۳۹۵ جہاں شاہ عالم کے عہد کی ایک اور تاریخ بنام شاہ عالم نامہ کا بھی ذکر ہے جو غلام علی خاں نے لکھی تھی ۔ یہ شخص شہزادہ جوان بخت کا ملازم تھا اور اس نے غلام قادر روہیلے کے ہاتھوں شاہ عالم کے اندھا کئے جانے سے ذرا پہلے تک کے حالات لکھے ہیں (وہی کتاب ، ص ۳۹۵) ۔

کے سندھیا سے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے - اس جلوس کا ذکر کیا ہے جو انند راؤ نرسی نے شاہ عالم اور اس کی چہیتی بیٹی کی توہین کرنے کی غرض سے نکالا تھا - علاوہ ازیں غلام قادر روہیلہ کے شاہی خاندان کے افراد پر مظالم اور آخر میں شاہ عالم کو اندھا کرنے کی دردناک کیفیت مفصل بیان کی ہے - ایلیٹ نے اس کے خاصے طویل اقتباسات کا ترجمہ دیا ہے جو اس نے ایک قلمی نسخے سے ، جو اسے لکھنؤ میں مل گیا تھا ، کیے ہیں - آخر میں مصنف نے غلام قادر کے عبرت ناک انجام کا حال بھی بہت شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور انہی واقعات کی مناسبت سے تاریخ کا نام 'عبرت نامہ' رکھا ہے - یہ تین جلدوں میں ایک خاصی ضخیم کتاب ہے -

(۲۵) 'جام جم' ، از سر سید احمد خاں ، مشہور و معروف مصلح و ماہر تعلیم جو دہلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے - ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت وہ بجنور میں صدر امین کے عہدے پر مامور تھے ، ۱۸۶۶ء میں وہ انگلستان گئے اور کوئین وکٹوریا سے ملے ، وہاں سے واپسی پر انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی جانب توجہ شروع کی اور ۱۸۷۷ء کی جنوری میں ایم - اے - او کالج علیگڑھ کی بنیاد رکھی - ۱۸۸۶ء میں انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور ۱۸۹۹ء میں اپنی وفات تک برابر مسلمانوں کی بھلائی اور بہبودی کی تجاویز سوچتے رہے - انہوں نے ایک اردو رسالہ بنام 'تہذیب الاخلاق' بھی جاری کیا - وہ اردو اور فارسی کے بہت اچھے ادیب تھے - 'جام جم' انہوں نے فارسی میں لکھی ہے - یہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی ایک مختصر سی تاریخ ہے جو امیر تیمور سے شروع ہوتی ہے اور بہادر شاہ ظفر کے عہد میں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے ، لیکن اس میں ضمناً افغان اور سید حکمرانوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے - یہ تاریخ ۱۸۳۹ء/۱۲۵۵ھ میں مکمل ہوئی - اس میں مصنف نے ہر ایک بادشاہ کے والدین کے نام ، ان کی تاریخ پیدایش و تخت نشینی ، مقام جلوس ، قطعہ یا قطعات تاریخ جلوس ، مدت سلطنت ، سکّے ، وفات ، عمر بوقت وفات ، قطعۂ تاریخ وفات ، لقب بعد از وفات ، مقام تدفین وغیرہ ، سب کا ذکر بہت التزام سے کیا ہے - اور اس کے زمانے کے بڑے بڑے واقعات کو بھی مختصراً بیان کر دیا ہے -

(۲۶) 'مہر نیمروز' ، از میرزا اسد اللہ خاں غالب ، شہرۂ آفاق فارسی و اردو شاعر

اور صاحبِ اسلوب نثر نگار - یہ تاریخ غالب نے ۱۸۴۹ء/۱۲۶۶ھ میں بادشاہ دہلی بہادر شاہ ثانی ظفر کی جانب سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات ملنے پر لکھنا شروع کی تھی - خاندان مغلیہ کی تاریخ ہے - اگرچہ غالب نے رسمِ قدیم کی پابندی کرتے ہوئے اسے ابتدائے آفرینش سے شروع کیا ہے ، ان کا ارادہ 'پرتوستان' کے نام سے ایک جامع و مبسوط تاریخ لکھنے کا تھا ، اور 'مہر نیمروز' اسی کا پہلا حصہ ہے ، دوسرے حصے کا نام انہوں نے 'ماہ نیم ماہ' تجویز کیا تھا ، لیکن اسے لکھنے کا موقع نہ ملا اور اس طرح ان کی یہ تاریخ نامکمل رہ گئی - 'مہر نیمروز' میں ہمایوں کے عہد تک کے حالات و واقعات بیاں کئے گئے ہیں - یہ کتاب تقریباً پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے اور ایک سے زیادہ مرتبہ طبع ہو چکی ہے - یعنی سب سے پہلے فخر المطابع (دہلی) میں ۱۸۵۱ء/ ۱۲۶۸ھ میں چھپی اور پھر اسی مطبع میں ۱۸۶۴ء/۱۲۷۱ھ میں - اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں کلیات نثر غالب میں نول کشور پریس لکھنؤ میں ، اور پھر اسی پریس میں کانپور میں ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۸ء میں[۲] -

(۲۷) 'اویماق مغل' ، از میرزا محمد عبدالقادر خاں عرف میرزا محمد آغا جان بن میرزا شاہ محمد خاں آقا باش قاچار کابلی - مصنف کا باپ (میرزا شاہ محمد) سونگڑھ کے راجہ کیسری سنگھ کا مشیر تھا - یہ کتاب مغل اقوام اور سلاطین مغل کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے اور اس میں برصغیر کے مغل بادشاہوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے - ۱۹۰۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۰۲ء/۱۳۱۹ھ میں امرتسر میں چھپی -

(د) صوبجات وغیرہ سے متعلق مخصوص تواریخ

کشمیر

(۱) 'واقعاتِ کشمیر' : (تاریخی نام ۱۷۳۵ء-۱۷۳۶ء/۱۱۴۸ھ) از خواجہ محمد اعظم

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ و ڈاوسن ، ج ۸ ، ص ۴۲ -

(۲) دیکھیے اسٹوری ، ص ۵۲۷ -

بن خیر الزمان خاں (اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) ۔

(۲) 'تواریخ کشمیر' : از گمنام مصنف ۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ۔ نیز دیکھیے تاریخ کشمیر از نراین کول عاجز (اوپر) ۔

پنجاب

(۱) 'خالصہ نامہ' : از بخت مل ، جس کا ذکر آ چکا ہے ۔

(۲) 'خالصہ نامہ' : از رتن چند ، سکھوں سے متعلق پنجاب کی تاریخ جو ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۱ء تک میں لکھی گئی ۔

(۳) 'ظفر نامہ' رنجیت سنگھ' : از امر ناتھ اکبری ۔

اودھ

(۱) 'تاریخ اودھ' : از کمال الدین حیدر (کمال الدین حسینی حیدری) ۔ مصنف محمد علی شاہ اودھ کے زمانے میں شاہی رصدگاہ میں مترجم کے عہدے پر مامور تھا ۔ اس تاریخ میں اودھ کے حکمرانوں کے شروع سے لے کر واجد علی شاہ کی تخت نشینی (۱۸۴۶ء/ ۱۲٦۳ھ) تک کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں ۔ اس کا ایک اردو ترجمہ دو جلدوں میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا ، لیکن اصل فارسی کتاب غالباً اب تک نہیں چھپی ، قلمی نسخے موجود ہیں[۱] ۔

(۲) 'تاریخ اودھ' : از سعید عالم سنبھلی ۔

(۳) 'عماد السعادت' : از غلام علی نقوی (یا رضوی) ابن سید محمد اکمل خاں ، سعادت علی خاں کے عہد تک اودھ کے نوابوں کی ایک خاصی مفصل تاریخ ہے ، جو لکھنؤ میں انگریزی ریزیڈنٹ کرنل جان بیلی کی فرمایش پر لکھی گئی تھی ۔ اس میں پانی پت کی تیسری جنگ کے سلسلے میں درانیوں ، مرہٹوں اور سکھوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ تاریخ ۱۸۰۸ء/۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی تھی ۔ اسی مصنف کی ایک اور

---

(۱) دیکھیے اسٹوری ، ص ۷۱۰ ۔

کتاب 'نگار نامۂ ہند' کا ذکر اوپر آ چکا ہے[1] ۔

(۴) 'گلِ رحمت' : از نواب سعادت یار خان ، برادر زادۂ نواب مستجاب خان مصنف 'گلستانِ رحمت' ۔ یہ دونوں کتابیں روہیلہ نواب حافظ رحمت خان (م ۔ ۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ) سے متعلق ہیں لیکن 'گلِ رحمت' 'گلستانِ رحمت' سے زیادہ مفصل ہے اور مندرجہ ذیل چار حصوں میں منقسم ہے :

۱۔ نسب نامۂ حافظ رحمت خان ۔

۲۔ علی محمد خان اور حافظ رحمت خان کا ہندوستان میں ورود ۔

۳۔ حافظ رحمت خان بحیثیت ناظم کیٹھر اور اس زمانے کے واقعات ۔

۴۔ کیٹھر نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ، حافظ رحمت خان کی اولاد ۔ 'گلِ رحمت' آگرے میں ۱۸۳۰ء میں چھپی تھی[2] ۔

(۵) 'گلستانِ رحمت' : از نواب مستجاب خان بن حافظ رحمت خان ۔ یہ روہیلوں کی ایک نہایت عمدہ تاریخ ہے ۔ ایلیٹ نے اس کا ترجمہ بالاختصار کیا تھا[3] ۔

(۶) 'تبصرة الناظرین' : از سید محمد بن میر عبدالجلیل بلگرامی ۔ بلگرام کے مشاہیر کے حالات اور وہاں کے تاریخی واقعات پر مشتمل ہے ۔ یہ ۱۷۶۸ء/۱۱۸۲ھ میں تصنیف ہوئی ۔

بنارس

'تحفۂ تازہ' : از خیر الدین محمد ۔ یہ بنارس کے زمینداروں کی تاریخ ہے جو تقریباً ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں لکھی گئی ۔ اسی مصنف نے دو اور کتابیں 'عبرت نامہ' اور 'گوالیار نامہ' بھی لکھی ہیں ۔

بنگال

(۱) 'مظفر نامہ' : از کرم علی ۔ اس میں بنگال کے ناظموں کے ۱۷۷۲ء/۱۱۸۶ھ تک کے

---

(۱) ایک اور مصنف محمد محتشم نے بھی برہان الملک سعادت خان کی تاریخ لکھی ہے جس میں ۱۸۳۷ء/۱۲۵۲ھ تک کے واقعات ہیں اور جو تاریخ محتشم کے نام سے معروف ہے ۔

(۲) دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۳۰۲ ۔

(۳) ایضاً ، ص ۳۰۱ ۔

حالات دیے گئے ہیں، یعنی علی وبردی خان کی تخت نشینی سے لے کر مظفر خان کی گرفتاری و معزولی تک[1]۔

(۲) 'ریاض السلاطین': از غلام حیدر سالم زید پوری۔ مصنف بنگال میں ڈاک منشی تھا اور ۱۸۱۷-۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ میں فوت ہوا۔ 'ریاض السلاطین' سے اس کتاب کی تاریخ تصنیف (۱۷۸۷ء-۱۷۸۸ء/۱۲۰۲ھ) نکلتی ہے۔ یہ ایک مقدمے اور چار روضوں پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں بنگال کے قدیم ہندو حکمرانوں کا ذکر ہے اور اس صوبے سے متعلق جغرافیائی معلومات بھی دی گئی ہیں۔ چاروں روضوں میں تاریخ وار بنگال کے مسلمان صوبیداروں اور خود مختار حکمرانوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اسے مولوی عبدالحق عابد نے طبع کیا اور ۱۸۹۰ء میں کلکتے میں چھپی[2]۔

دکن

(۱) 'بساتین السلاطین': از ابراہیم زبیری، دکن کے عادل شاہی حکمرانوں کی تاریخ، سنہ تصنیف ۱۸۱۲ء-۱۸۲۴ء/۱۲۲۷ھ-۱۲۴۰ھ۔

(۲) 'وقائع دکن': (صحیح نام معلوم نہیں)۔ از فیض بخش قاضی۔ یہ تاریخ تقریباً ۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ میں لکھی گئی۔ اس میں زیادہ تر نظام علی خان اور راگھو ناتھ راؤ اور دیگر مرہٹہ سرداروں کے درمیان جنگوں کے حالات ہیں[3]۔

(۳) 'تاریخ عماد الملک': از غلام قادر خان۔ عماد الملک غازی الدین خان کی تاریخ جو ۱۷۹۶ء/۱۲۱۱ھ کے بعد لکھی گئی۔

(۴) 'قضایای سلاطین دکن': (تاریخی نام ۱۷۴۳ء/۱۱۵۶ھ) از میرزا مہدی خان صفوی۔ مصنف 'ضیاء العیون' و 'مجموعۂ میرزا مہدی خانی'، یہ سات ابواب میں دکن کی تاریخ ہے اور زیادہ تر 'تاریخ فرشتہ' پر مبنی ہے (اسٹوری، ص ۷۳۸)۔

---

(۱) اسٹوری، ص ۷۱۸۔
(۲) ایضاً، ص ۷۱۸۔
(۳) ایضاً، ص ۷۴۹۔

میسور

(۱) 'نشان حیدری' : از حسین علی خان بن سید عبدالقادر کرمانی مصنف 'تذکرۃ البلاد والحکام' اور 'بدیع المعانی' ۔ یہ تاریخ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے حالات پر مشتمل ہے اور ۱۸۰۲ء/۱۲۱٦ھ میں مکمل ہوئی۔ بمبئی میں ۱۸۹۰ء/۱۳۰۷ھ میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک انگریزی ترجمہ کرنل ڈبلیو مائلز نے کیا تھا جو لنڈن میں ۱۸۴۲ء میں شائع ہوا[۱]۔

(۲) 'تاریخ خدادادی' : از ٹیپو سلطان ۔ ۱۷۸۷ء میں مرہٹوں سے جنگ تک کی ایک مختصر سی سرگذشت ہے ۔ غالباً زین العابدین شوستری کی ضخیم تاریخ میسور بنام 'سلطان التواریخ' کی بنیاد یہی کتاب ہے[۲]۔

گجرات

'مرآۃ احمدی' : از علی محمد خان ۔ تاریخ گجرات جو ۱۷٦۱ء/۱۱۷۵ھ میں مکمل ہوئی۔ جیمز برڈ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو ۱۸۲۵ء میں لنڈن میں چھپا تھا[۳]۔ فارسی متن ۱۹۳۰ء میں کلکتے میں چھپا ۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ اور بہت سی ایسی تواریخ ہیں جو زمانۂ زیر بحث میں تالیف ہوئیں لیکن ان کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے ۔ تاہم جن کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے ، ان سے یہ اندازہ بخوبی ہو جائے گا کہ یہ دور فارسی تاریخ نویسی کے لحاظ سے ہندوستان کا زرخیز ترین دور تھا ، نیز یہ کہ اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ تنوع اور رنگا رنگی کے اعتبار سے ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں اور افادیت میں اُن تواریخ سے کسی طرح کم نہیں ہیں جو سابقہ ادوار میں لکھی گئی تھیں ۔

☆ ☆ ☆

---

(۱) دیکھیے استوری ، ص ۷۷۴ ۔
(۲) ایضاً ، ص ۷۷۰ ، ۷۷۳ ۔
(۳) محمد یاسین ، ص ۱۸٦ ۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۵ ، ص ۵۰۲ ۔

چوتھا باب

(الف) شعراء کے تذکرے (۱۷۰۷ء - ۱۸۵۷ء)

اس دور کے حالات کا مختصر جائزہ

اگرچہ اورنگ زیب عالمگیر کے جانشین دیرینہ جاہ و جلال بحال نہ رکھ سکے ، تاہم سلطنت کا وقار قائم رہا ، حتّٰی کہ نادر شاہ کے حملۂ دہلی نے بھی اس میں کوئی کمی پیدا نہ کی ۔ نادر شاہ کی نسبت احمد شاہ ابدالی کے حملے زیادہ تباہی اور بربادی کا موجب تھے ۔ ان حملوں کے بعد سلطنت کے وقار میں آہستہ آہستہ کمی شروع ہو گئی ، لیکن شاہ عالم ثانی کے زمانے میں میرزا نجف خان کی وزارت قائم ہوئی (۱۷۷۲ء - ۱۸۸۲ء) تو اگرچہ اس وقت مغل شہنشاہیت سمٹ کر مغل بادشاہت بن گئی تھی ، اسے پھر استحکام نصیب ہوا اور اس کا رعب داب بحال ہوگیا ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک روہیلوں ، مرہٹوں ، سکھوں اور انگریزوں کی وجہ سے بعض بڑے المناک حالات رونما ہوئے اور سیاسی انقلابات نے معاشرے کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ، لیکن اس زمانے میں ان نامساعد حالات کے باوجود بھی برّصغیر میں ہر طرف فارسی ہی کا دور دورہ تھا ۔ سرکاری ، ادبی اور ثقافتی زبان ابھی تک فارسی ہی تھی ۔ اس ملک کے گوشے گوشے میں ابھی تک اسی زبان میں کتابیں لکھی جا رہی تھیں ۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزوں کا سیاسی تسلط شمال مشرق اقطاع ہند میں ہولے ہولے بڑھتا چلا گیا اور قدرتی طور پر انگریزی زبان کا اثر بڑھنا شروع ہوا مگر اس کے باوجود شمالی ہند ، دکن ، مدراس اور سندھ میں ہزاروں شعراء فارسی میں شاعری کر رہے تھے اور متعدد ادباء اسی زبان میں مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف کر رہے تھے ۔

اس دور میں جو فارسی تذکرے لکھے گئے ہیں ان سے بھی بخوبی پتا چل سکتا ہے کہ اس ڈیڑھ صدی میں برّصغیر کے ہر حصے میں فارسی شعر و ادب کی شمع روشن تھی ۔ مثلاً 'سفینۂ خوشگو' (دفتر سوم) میں اس زمانے کے ۲۵۴ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے ، 'تحفة‌الشعراء' میں صرف دکن کے ۶۲ ، 'تذکرۂ بے نظیر' میں ۱۳۹ ، 'مردم دیدہ' میں ۶۱ معاصر فارسی

شعراء ، 'انیس الاحبا' میں شمالی ہند خاص طور سے لکھنؤ اور اس کے مضافات کے ۵۰ شعراء ، 'عقدِ ثریا' میں ۱۳۷ ہم عصر شعراء ، 'سفینۂ ہندی' میں اس زمانے کے ۳۳۵ شعراء ، 'ریاض الوفاق' میں صرف کلکتے اور بنارس کے ۱۴۲ شعراء ، 'اشاراتِ بینش' میں صرف کرناٹک کے ۷۷ شعراء ، 'گلدستۂ کرناٹک' میں کرناٹک کے ۷۰ شعراء ، 'صبحِ وطن' میں صرف مدراس کے ۹۲ شعراء ، 'خزینۃ الشعراء' میں اس زمانے کے ۱۹۰ شعراء اور 'گلزار اعظم' میں صرف کرناٹک کے ۴۳۳ شعراء کا ذکر ہے ، جو سب فارسی میں شعر کہتے تھے اور جن میں سے ایک کثیر تعداد ایسے شعراء کی تھی جن کے فارسی میں پورے پورے دیوان موجود تھے -

اس زمانے کے تذکرہ نگاروں میں سے آزاد بلگرامی ، صمصام الدولہ اور شفیق اورنگ آبادی نظام دکن کی ملازمت میں تھے اور افضل بیگ قاقشال اور رفیع الدین نقشبندی حیدرآباد دکن ہی میں مقیم تھے - ان کے تذکروں سے دکن میں فارسی کے رواج کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے -

اس دور کے تذکروں کی ممتاز خصوصیات

گذشتہ دور کے اکثر تذکروں کے برخلاف ، جن میں عام طور سے اہم اور مشہور شعراء کا ذکر ہوتا تھا اور کلام کے انتخاب کے وقت بھی عمدہ کلام انتخاب کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ، اس دور کے اکثر تذکروں میں ایسے اشخاص کا بھی ذکر موجود ہے جنھوں نے صرف چند شعر کہہ دیے ہیں - جہاں اس زمانے میں ادب کوچہ و بازار میں جا نکلا ، وہاں اس دور کے تذکروں نے اس وقت کے عامیانہ ذوق کی عکاسی بھی کی ہے اور ان سب اکثر ایسے معمولی شعراء کا کلام دیا گیا ہے جن کو دنیائے ادب میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہے ، چنانچہ اس دور کے تذکرے اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے عوامی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے -

گذشتہ دور کے تذکروں میں اہم شعراء کے اہم واقعاتِ زندگی بیان ہوتے تھے لیکن اس دور میں معمولی شعراء کے معمولی حالات تذکروں میں قلمبند کیے گئے ہیں - اس طرح اس زمانے کے عام تہذیبی اور مجلسی حالات کی طرف اشارے ملتے ہیں ، جو اس زمانے کے معاشرتی حالات کا جائزہ لینے میں مدد دیتے ہیں -

برخلاف گذشتہ دور کے جب تذکرہ نگاروں کا عام طور پر آفاقی نقطہٗ نظر تھا ، اِس دور میں اکثر تذکرہ نگاروں کا نقطہٗ نگاہ محدود تھا[1] ۔ چنانچہ اس زمانے میں عموماً ایک خاص دور ، ایک خاص مقام یا علاقے ، ایک خاص صنف (خواتین) ، خاص گروہ ، کسی خاص استاد کے شاگرد ، خاص طبقے (ہندو یا مسلمان) کے شعراء کے تذکرے لکھے گئے ہیں ۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک چھوٹے سے نقطے پر توجہ کے مرکوز ہونے سے پہلے کی نسبت معاشرتی حالات کے تجزیے میں آسانی پیدا ہوگئی ۔

اس دور میں متعدد تذکرے بعض تذکروں کے جواب میں لکھے گئے ہیں ، جن کا مقصد کسی خاص گروہ کی حمایت یا مخالفت رہا ہے ۔ مثلاً 'مردم دیدہ' میں خاص طور پر پنجاب کے ان شعراء کا حال اور کلام مفصل دیا گیا ہے ، جن کا حال یا کلام خان آرزو نے اپنے تذکرے 'مجمع النفائس' میں زیادہ تفصیل سے نہیں دیا ہے ۔ اس طرح مولوی محمد صالح واصف نے 'معدن الجواہر' نواب اعظم کے 'گلزار اعظم' کے جواب میں لکھی ہے ۔

گذشتہ دور کے برخلاف جب اکثر تذکرہ نویسوں کا محرک ادبی کارناموں کی سرگذشت یا ادبی ذوق کی تسکین تھا ، اس دور کے اکثر تذکرے کسی خاص گروہ بندی یا تعصّب یا ذاتی شہرت کے پیش نظر لکھے گئے ہیں ۔

اس لحاظ سے اس دور کے تذکروں کی عام قسم بندی اس طرح کی جا سکتی ہے :

۱۔ عام تذکرے جن میں فارسی کے عام شعراء کا ذکر ہے اور کسی خاص دور ، گروہ یا صنف وغیرہ کا ذکر نہیں ہے : 'سفینہٗ خوشگو' ، 'ید بیضا' ، 'تذکرۂ ندرت' ، 'گلدستہ' ، 'بہارستانِ سخن' ، 'ریاض الشعراء' ، 'منتخب الاشعار' ، 'تذکرۂ حسینی' ، 'مجمع النفائس' ، 'سفینۃ الشعراء' ، 'باغِ معانی' ، 'سفینہٗ عشرت' ، 'خزانہٗ عامرہ' ، 'تذکرۃ الشعراء' ، 'تذکرۂ یوسف علی خاں' ، 'لبِ لباب' ، 'صحفِ ابراہیم' ، 'خلاصۃ الافکار' ، 'نوبہار' ، 'مخزن الغرائب' ، 'تذکرۂ کاتب' ، 'نشترِ عشق' ، 'انیس العاشقین' ، 'معراج الخیال' ، 'نتائج الافکار' ، 'نغمہٗ عندلیب' ، 'حدائق الشعراء' ایسے ہی تذکرے ہیں ۔

۲۔ کسی خاص ملک یا علاقے کے تذکرے ۔

الف ۔ ہندوستانی شعراء کے عام تذکرے : 'گلِ رعنا' ، 'عقد ثریا' ۔

ب ۔ ایرانی شعراء کے عام تذکرے : 'شامِ غریباں' ۔

---

(۱) یاد ہوگا یہی بات تاریخ والے باب میں بھی کہی جا چکی ہے ۔ (مدیر عمومی)

ج ۔ کسی شہر یا علاقے کے تذکرے : 'مقالات الشعراء' قالع میں صرف سندھ کے شعراء کا ذکر ہے : 'مردمِ دیدہ' میں خاص طور پر پنجاب کے شعراء کا بیان ہے ، 'تذکرۂ اصلح' میں کشمیری ، 'ریاض الوفاق' میں کلکتہ اور بنارس کے 'گلدستۂ کرناٹک' ، 'اشاراتِ بینش' اور 'گلزارِ اعظم' ، میں کرناٹک کے اور 'صبحِ وطن' میں مدراس کے شعراء کا ذکر دیا گیا ہے ۔

۳۔ کسی خاص گروہ کے تذکرے ۔

الف ۔ مسلمانوں کے تذکرے : 'گلِ رعنا' (فصل اول) ، 'انیس الاحباء' ، باب اول ۔

ب ۔ ہندوستان کے تذکرے : 'گلِ رعنا' (فصل دوم) ، 'انیس الاحباء ، (باب دوم) ۔

ج ۔ کسی خاص استاد کے شاگردوں کے تذکرے : 'انیس الاحباء' میں میرزا فاخر مکین اور 'خزینۃ الشعراء' میں تقریباً تمام تر خوب اللہ اور محقر الہ آبادی کے شاگردوں کا ذکر ہے ۔

۴۔ کسی خاص عہد کے تذکرے : 'ہمیشہ بہار' میں اکبر سے محمد شاہ کی تخت نشینی تک کے شعراء ، 'سرو آزاد' میں ۱۵۹۱ء/۱۰۰۰ھ سے ۱۷۵۲ء/۱۱۶۶ھ تک ، 'تذکرۂ بینظیر' میں ۱۶۸۸ء/۱۱۰۰ھ تک ، 'سفینۂ ہند' میں محمد شاہ کی تخت نشینی سے کتاب کی تالیف کے وقت تک (کے ہندوستانی) ، 'تذکرۂ اصلح' میں اورنگ زیب سے محمد شاہ تک کے زمانے کے شعراء کا ذکر ہے ۔

۵۔ معاصرین کے تذکرے : 'سفینۂ خوشگو' (دفتر سوم) ، 'تذکرۃ المعاصرین' ، 'منتخب حاکم' ، 'سفینۂ علی حزین' ، 'تحفۃ الشعراء' ، 'مردمِ دیدہ' 'طبقاتِ سخن' ، 'ریاض الوفاق' ، 'گلدستۂ کرناٹک' ، 'ملک الشعراء' ، 'صبح وطن' ، 'اشاراتِ بینش' ، 'گلزار اعظم' ، 'معدن الجواہر' صرف معاصرین کے تذکرے ہیں ۔

اس دور کے تذکروں کی معاشرتی اہمیّت

اس دور کے تذکروں سے اس زمانے کے معاشرتی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اس زمانے کی اخلاق اور سیاسی حالت کا پتا بھی چلتا ہے ۔ متعدّد تذکرہ نگاروں نے اس

زمانے کے شعراء ، امراء اور بادشاہوں کے حالات کے ضمن میں ان کے اخلاق اور عادات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے اس زمانے کے عام اخلاقی معیار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ مثلاً :

خان آرزو ، 'مجمع النفائس' میں بعض شعراء کے وسیع المشرب ہونے کی طرف خاص طور سے اشارہ کرتے ہیں ، ملاحظہ ہو بسمل ، باقیا نائینی ، تقی اوحدی کا حال ۔ خاص طور سے تقی اوحدی کے ذیل میں لکھتے ہیں : ''وسعتِ مشرب داشت بمرتبہ کہ با ہفتاد و دو ملت بوجہ اتحاد میجوشید چنانکہ خود گفتہ :

شیعی و سنی و ملحد نیستم
کم کسی داند کہ این ہم مسلکی است''

اسی طرح شیخ سعد اللہ گلشن کے تحت لکھا ہے :

''باوجود تقیدِ مذہب کمالِ وسعتِ مشرب داشت ۔''

یا نثار کے حالات میں کہتے ہیں :

''بسیار عزیز و بزرگ کسی بود مطلقاً سر پرخاش نداشت ۔ بعضی از شوخ طبعان شعر او را روبروی او بے معنی میگفتند و او مشغول جواب نمیشد ۔''

اسی طرح شفیق 'گل رعنا' میں آزاد بلگرامی کی اخلاقی صفات بیان کرتے ہوئے خاص طور پر اپنے استاد کی ان عادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ''آنجناب را بر جادۂ آزادی و فقر و استقلال مزاج و بے طمعی قدمے استوار تر از شبلی و بایزید است ۔'' اس کے بعد ''انجاح حوائجِ عالم و فیض رسانی و دلسوزی خلق و کلمۃ الخیر و دستگیری غرباء و حفظ الغریب'' کی طرف ، جو اس کے بقول آزاد کی عادات میں شامل تھے ، اشارہ کیا ہے ۔ علاوہ ازیں آزاد کی اخلاقی صفات کے ذیل میں لکھا ہے : ''طریقہ آنجناب تحمل و بردباری است کہ اگر حرف درشتے از کسے میشنوند اغماض میفرمایند و عمل بر قول الٰہی 'و اذا خاطبہم الجاھلون قالوا سلاما' میکنند'' ۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ اگرچہ آزاد لطیفہ گوئی اور حسِ ظرافت میں بے نظیر تھے لیکن ''حرف ہزل در مجلس عالی ذکر نمیشود و

از زبان خامہ و خامہ زبان آنجناب حرفِ پوچ تراوش نمیکند چنانکہ فرمایند :

ز حرفِ تلخ مبرا ست خامۂ آزاد — کہ زہر ریختن از نیشکر نمی آید''

اسی طرح آزاد کے ذیل میں شفیق نے آزاد کے اقوال ، جو اکثر مواعظِ اخلاق اور اس کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہیں ، تفصیل سے دیے ہیں جن سے کسی حد تک اس زمانے کے اخلاق معیار کا پتا چلتا ہے ۔

تصوّف کا اثر

اس دور کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تصوّف کا بازار ابھی تک گرم تھا ۔ متعدد شعراء کے حالات میں تذکرہ نویسوں نے ان کے عرفانی رجحانات کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اسی طرح جو منتخب کلام ان تذکروں میں دیا گیا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں ابھی تک صوفیانہ اور عرفانی شاعری کا رواج تھا اور شعراء عشقیہ مضامین کے علاوہ اخلاق اور عارفانہ مضامین بھی بکثرت باندھتے تھے ۔

اسلام کا اثر

گذشتہ دور کی طرح اس دور میں بھی نثر و نظم کی تمام کتابوں میں اسلام کا اثر واضح و لائح ہے ۔ دوسری ادبی کتابوں کی طرح تمام تذکرے حمدِ باری تعالیٰ سے شروع ہوتے ہیں ۔ اکثر مسلمانوں کے تصنیف شدہ تذکروں میں حمد کے بعد نعت رسول ؐ و منقبتِ اہل بیتؓ اطہار و صحابۂ کرامؓ بھی ہوتی ہے ۔ اس حصے میں اکثر تذکرہ نگاروں نے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسول ؐ سے اپنی عبارت کو زینت بخشی ہے ۔ حمد میں اکثر ذاتِ خداوند کی عظمت اور اس کا فہم و ادراکِ انسانی سے بالا تر ہونے اور انسان کے عاجز ناچیز ہونے ، نیز اللہ تعالیٰ کی گونا گوں صفات و مظاہر اور بے شمار برکتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ نعتِ رسول ؐ میں آپ ؐ کے خاتمِ انبیاء ، رحمة للعالمین ہونے اور آپ کی دوسری صفات اور معجزات کو کنایةً بیان کیا ہے ۔ بعض تذکرہ نویسوں نے حمد و نعت کے ضمن میں شاعری کا اسلامی جواز بھی نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور حمد و نعت پیش کرتے وقت شاعری ، نجوم اور علوم کی مختلف اصطلاحات ، نیز ادبی صنائع و بدائع کو نہایت چابکدستی سے استعمال کیا ہے ۔

اسلامی تہذیب کا اثر اس زمانے میں اس قدر عمیق تھا کہ ہندو شعراء اور ادباء بھی

اپنی کتابوں کو مسلمانوں کی طرز پر حمد سے شروع کرتے اور مزید دلچسپ بات یہ کہ حمد کے بعد مسلمانوں کی طرح نعت رسولؐ اور منقبت اہل بیتؓ و صحابہؓ بھی بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے تمام ہندو تذکرہ نگاروں نے اپنی کتب کی ابتداء حمد سے کی ہے۔ ان تذکروں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطیف تذکرۂ 'ہمیشہ بہار' اور 'انیس العاشقین' ہیں جن میں حمد، نعت اور منقبت نہایت مفصّل ہیں اور سرتاسر آیات قرآنی و احادیث رسولؐ سے مزین و محلّی ہیں۔ ان کو پڑھ کر یہ خیال کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا کوئی غیرمسلم ہو سکتا ہے۔ صاحب 'ہمیشہ بہار' (کشن چند اخلاص) کا ابتدائیہ اس لحاظ سے بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہے مگر ہم صاحب 'انیس العاشقین' (رتن سنگھ زخمی) کی حمد و نعت و منقبت نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں :

''حمد سخن آفرینی است کہ بآیۂ وافی الهدایہ 'فاتوا بسورة من مثلہ' کج طبعان مدرسۂ ضلالت و گمراہی را باعتراف 'ربّنا ظلمنا انفسنا فاغفرلنا ذنوبنا انّا کنّا من الخاطئین' بمقامات صدق و یقین رسانده . . . شکر مواهب منعمی است کہ بنصّ 'ادعونی استجب لکم' دامن آرزوی طالبان جواہر زواہر تحقیق را پر از لآلیٔ آبدار ایمان و دین گردانده 'سبحانہ اعظم شانہ' علیمی کہ علمای ملائکہ بمنطوقۂ 'لا علم لنا الاّ ما علّمتنا انک انت العلیم الحکیم' بحضرتش معرف و حکیمی کہ عظمای حکما بفیض تربیتش بمصدوقۂ 'و من یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً' بصفات حسنہ متصّف ۔ کلام معجز نظام انبیا علیهم السّلام کہ بری از خطا است بمقتضای 'و ما ینطق عن الهوی ان هو الاّ وحی یوحیٰ' بعنایت بیغایت اوست و نظم دلکش شعراء کہ دور از لغزشہا است بفحوای 'الشّعراء تلامیذ الرحمٰن' بفضل بےنہایت او ۔ اللّهم لک الحمد و بک نستعین و صلّ علے محمد و آلہ الطیّبین و اجعلنی فی الدنیا والآخرة من المکرمین انک ربّی و رب العالمین :

خدایا بحقّ رسول کریمؐ	کریم السّجایا رضی و رحیم
خدایا بحقّ امیر عرب	شفیع امم شاہ والا نسب

امیرِ امیران و زوج بتولؓ ولیّ خدا و وصیؑ رسول
خدایا بحقّ حسینؓ و حسنؓ کہ رحمی بکن زود برحال من . . .''

اسی طرح اس دور کے تذکروں میں شعراء کے حالات یا ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض تذکرہ نگاروں نے قرآنی آیات اور احادیثِ رسولؐ سے اپنی عبارات کو مزیّن و منوّر کیا ہے ۔ مثلاً :

''سیعلمو الذین ظلموا ای منقلب ('مجمع النفائس'، ملا شوستری کے بیان میں) ۔
تلک امّة قد خلت لہا ما کسبت و لکم ما کسبتم و لا تسئلون عمّا کانو یعملون''
(ایضا والہ کے بیان میں)

''و اذا خاطبہم الجاھلون قالوا سلاماً'' ('گلِ رعنا'، آزاد کے بیان میں) ۔

یہ نکتہ بھی بہت دلچسپ ہے کہ 'ہمیشہ بہار' کا ہندو مؤلف (کشن چند اخلاص) جگہ جگہ پر جہاں کہیں حضرت علیؓ کا نام لیتا ہے، ان کے نام کے ساتھ امیر المومنین اور کرم اللہ وجہہ لکھتا ہے ۔ مثلاً :

''از غایتِ اعتقاد کہ بجناب امیرالمومنین علی کرّم اللہ وجہہ داشت و بشوق دریافت سعادتِ خاکِ پاکِ مرقدِ منوّر این بیت در قصیدہ بصد شوق گفتہ بود . . .'' (عرفی)

اسی طرح جن شعراء نے حج ادا کیا تھا ان کے ذکر میں خاص طور سے اس طرف اشارہ کیا ہے ۔ مثلاً ''بزیارتِ حرمین شریفین شرف اندوز گردید'' (پیامی)

شعراء کے پیشے

اس دور کے تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعری صرف وہی لوگ نہیں کرتے تھے جن کا پیشہ ہی شاعری تھا بلکہ مختلف طبقات کے لوگ شعر و شاعری کا زبردست شغف رکھتے تھے ۔ چنانچہ ان تذکروں میں جہاں ایسے شعراء کا ذکر ملتا ہے جو صرف شاعری کرتے تھے، وہاں اس زمانے کے متعدّد سلاطین و امراء، حکاّم و نوابین، سپاہیان و سپہ سالاران، حکماء اور دوسرے اہل فن کی شاعری کا بھی ذکر ملتا ہے ۔ مثلاً خان آرزو نے 'مجمع النفائس' میں حسب ذیل شعراء کے ذکر میں ان کے پیشے بھی

دیے ہیں :

حکیم مسیح الزمان آہی ، الفتی قالب تراش ، امین الدین کلانتر ، امتی کاتب ، انسی بیک کتابدار ، اسیری فراش باشی ، باقر زرگر ، رشیدی زرگر ، میرزا خلیل منشی ، دعوی قاضی ، شمس داعی ، شیخ الاسلام نخشب ، درویش دھکی جولاہا و خشت مال ، درویش روشن گر ، درویش قصہ خوان ، سراجای نقاش ، شیری سیالکوتی شالی کوب ، محمد شفیع علاقہ بند ، شفیع تاجر زادہ ، صافی مکتب دار ، عرفی کمانگر ، صوفی معمار ، عزیزی صباغ ، عنایت کاشی ساعت ساز ، غیاثای حلوائی ، امیر بیگ قصاب ، سعیدای قصاب ، مقیم کتابدار ، تقی عصار ۔

اسی طرح قدرت اللہ قاسم نے 'مجموعۂ نغز' میں حسب ذیل شعراء کے پیشے ان کے نام کے ساتھ لکھے ہیں :

منیر صیقل گر ، نثار معمار ، بخشی پارچہ فروش ، مد سنگھ شیفتہ آہنگر ، خواجہ ہینگا ، شیدا علاقہ بند ، صادق فیل بان ، شمبھ ناتھ عزیز مہاجن ، میر لطف علی لطیف دلالِ جواہر ، مغل علاقہ بند سوداگر ، منتون بزاز ، یکرنگ سنار ، شائق خیاط ، عارف رفوگر ، عنایت اللہ کلو حجام ، غلام ناصر جراح ، مقصود سقا اور فرین خاکروب ۔

اس امر سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اس دور میں شاعری کا رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ مختلف طبقات کے لوگ اس میں عملی دلچسپی لینے لگے تھے ۔ اس طرح جہاں یہ فن مخصوصِ خواص نہیں رہا تھا بلکہ ہر دلعزیز ہو گیا تھا ، وہاں عروسِ شاعری کے دلدادہ کوچہ و بازار میں جا نکلے اور ہر کس و ناکس کی زبان پر چڑھ جانے سے شاعری کی صحیح قدر و منزلت اور اس کے معیار میں زبردست کمی آ گئی تھی ۔ قدرتی نتیجے کے طور پر شاعری کا مقام پہلے کی بہ نسبت بہت پست ہوگیا اور آبروی شیوۂ اہل نظر خاک میں مل گئی ۔ خاص طور سے فارسی شاعری کو جہاں اس دور میں کمیت یا شعراء کی کثرتِ تعداد کے لحاظ سے زبردست فروغ ہوا اور ہزاروں فارسی گو شاعر اس برِ صغیر کے چپہ چپہ پر پیدا ہوئے ، وہاں فنی اور ادبی لحاظ سے اس کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا ۔ یہ منجملہ ان اعتراضات

سکے ہے جو لطف علی بیگ آذر نے اپنے تذکرے 'آتشکدہ' میں اور دوسرے گذشتہ و معاصر نقادوں نے ''سبک ہندی'' پر کئے ہیں اور یہ اعتراض بڑی حد تک صحت و صداقت پر مبنی ہیں ۔

ان تذکروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ باوجود کساد بازاری کے اس زمانے تک برصغیر پاک و ہند میں فارسی شعراء ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے ۔ شفیق 'گل رعنا' کے دیباچے میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے :

''تا زمانِ حال با وصفِ اختلالِ سلطنتِ تیموریہ و بی انتظامیٔ تمام ممالک ہندوستان این قلمرو بوجود سخن طرازان معمور است و ہنوز مجالس و محافل از مجالست این زمزمہ سنجانِ روح پرور ناصور ۔''

ہجو

اس دور کے تذکروں میں جگہ جگہ شعراء کے ہجویہ اشعار بھی ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں ہجو کا رواج بہت عام ہو گیا تھا ۔ اس کے خاص اسباب اس زمانے میں شعراء و ادباء کی بےقدری اور علم و ہنر کی کساد بازاری اور عام معاشی بدحالی تھے ۔ مثلاً 'مجمع النفائس' میں شفیعای اثر ، سعید اشرف ، بنائی ، جلالا نائینی ، شیدا ، شرمی ، غضنفر ، غیاث نقشبند ، مہری ، قاضی نور اللہ شوستری ، زمانای نقاش اور یحیٰی کاشی کے تحت ان کے ہجویہ اشعار بھی دیے گئے ہیں یا صاحبِ 'ہمیشہ بہار' نے وہ اشعار دیے ہیں جو شیدا نے میر الٰہی کی ہجو میں ، عالمی نے غزالی کی ہجو میں اور عاشق نے غبار کی ہجو میں کہے ہیں ۔

البتہ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اوقات یہ ہجویہ اشعار بھی نہایت عالمانہ ہوتے تھے اور ان سے شاعر کے علمی و فنی تبحّر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ، چنانچہ شفیق 'گلِ رعنا' میں ''نعمت خان عالی'' کے بیان میں لکھتا ہے :

''قطعۂ ہجو کامگار خان پسر دوم عمدۃ الملک جعفر خان وزیرِ اعظم خلد مکان دارد ، زبان زدِ عالم است ، عالمانہ نظم کردہ ۔ جناب آزاد . . . برو شرحی نوشتہ اند ، دیدنی است ۔''

ہندوستانی ایرانی تعصّب

اس دور کے تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی ایرانی تعصّب ، جو گذشتہ ادوار میں نسبتاً بہت کم تھا اور ہمیشہ پس پردہ تھا ، اب کھل کر سامنے آگیا تھا ۔ اس سے قبل اس قسم کا تعصّب صرف 'سبکِ ہندی' پر بعض ایرانی ناقدین کی غیر منصفانہ تنقید تک محدود تھا ۔ اصل میں اس تعصّب کی آگ اس برصغیر میں بعض ناعاقبت اندیش ایرانی شعراء کی بد زبانی کی وجہ سے بھڑکی ۔ اس میں سب سے زیادہ ہاتھ حزیں لاہیجی کا تھا جس نے اپنی خود نوشت سوانح حیات 'تاریخِ احوال' میں جا بجا ہندوستانی لوگوں کو ہدفِ ملامت ٹھہرایا ہے ۔ مثلاً اس کتاب میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے :

''رسوخ این شیوه از تأثیرات آب و ہوای ہند است کہ خلق این دیار با کسی بی غرض آشنا نمی شند . و از باستان نامہ ہویداست کہ قبل از اسلام نیز راجان و فرماندہان این دیار را ہمین طبیعت بوده است ۔''

اسی طرح (جیسا کہ آزاد بلگرامی نے 'خزانۂ عامرہ' میں لکھا ہے) حزین نے برملا اہلِ ہند کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ۔ ایک شعر میں حزین نے ہند کو 'دیو لاخ' کہا ہے ، چنانچہ آزاد بلگرامی اپنے تذکرہ 'خزانۂ عامرہ' میں لکھتا ہے :

''قضا را شیخ اہلِ ہند را ہجو کرد از آنجملہ است این بیت :

سپاس سیرتی است تمنای مردمی از دیولاخ ہند کہ انسان نداشتہ است ۔''

علی قلی خان والہ 'ریاض الشعرا' کا ایرانی مؤلّف اس بارے میں حزین کے حالات میں لکھتا ہے :

''پادشاه و امراء و سایرِ ناس کمالِ محبّت و مراعات نسبت بوی (بحزین) مرعی دارند از آنجا کہ مروت جبلّی و انصاف دانی حضرت شیخ است عموم این دیار را از پادشاه و امراء وغیره ہجوی ہای رکیک کہ لائق شانِ شیخ نبوده نمود و ہر چند ازین ادای زشت منع کردم فایدۀ نبخشید و تا حال درکارست ۔''

کے بعد والہ لکھتا ہے :

''القصّہ بعضی از غیوران این مملکت کمرِ انتقام بستہ تیغ ہجا بر وی

کشیدہ در نظرِ ارباب خرد خفیفش نمودند ۔ از جملہ سراج الدین علیخان آرزو کہ از شعرای این شہر (دہلی) است و در فضیلت و سخنوری گوی از ہمگنان میرباید بسیار اشعارِ غلط از دیوان شیخ بر آوردہ رسالۂ مسمی 'بہ تنبیہ الغافلین' نوشتہ و ابیاتِ مذکور را یک یک ذکر کردہ و تعریضات نمود ۔''

اسی طرح شیخ حزین نے میر محمد افضل ثابت وغیرہ کی ہجو کی جس کے جواب میں افضل کے فرزند میر محمد عظیم ثبات نے شیخ کے دیوان سے پانچ سو اشعار نکال کر شیخ حزین پر دوسرے شعراء کے یہاں سے سرقے کا الزام لگایا ۔ اسی زمانے میں 'ملا' ساطع وغیرہ نے شیخ حزین کی اس ہجو کا جواب دیا جو شیخ نے کشمیریوں کی کی ہے ۔

دوسری طرف ہندوستانیوں میں شیخ حزین کے طرف دار بھی موجود تھے جنہوں نے شیخ کی حمایت میں اس کے معترضین کا جواب دینا شروع کیا ، جیسے ٹیک چند ، مرزا قتیل ، سیالکوٹی مل وارستہ اور آزاد بلگرامی وغیرہ جنہوں نے نہ صرف آرزو وغیرہ کے اعتراضات کے جوابات دیے بلکہ شیخ حزین کی ہر طرح حمایت کی ۔

اسی زمانے میں بعض ایرانی شعراء نے بیدل وغیرہ ہندوستانی شعرا پر اعتراضات کئے جن کے جوابات ہندوستانی شعراء و ادباء نے دیے ۔ چنانچہ خان آرزو نے اپنے تذکرے 'مجمع النفائس' میں بیدل کے بیان میں لکھا ہے :

''چو از راہِ قدرت تصرّفات نمایان در فارسی نمودہ مردمِ ولایتِ ایران و کاسہ لسان اینہا کہ از اہل ہند اند در کلام این بزرگوار سخنہا دارند و فقیر در صحت تصرّف صاحب قدرتانِ ہند ہیچ سخن ندارد بلکہ قائل ، چنانچہ در رسالۂ 'دادِ سخن' ثابت نمودہ ، ہر چند خود تصرّف نمیکند ۔''

اسی طرح آرزو نے اپنے تذکرے 'مجمع النفائس' میں جگہ جگہ ایرانی شعراء پر زبان وغیرہ کی غلطیوں کے سلسلے میں سخت تنقید کی ہے ، مثلاً تازگی کے تحت لکھتے ہیں :

''فقیر آرزو گوید ہر گاہ احوال زباندانان چنین باشد ، وای بحالِ مردم و شعرای ملکِ دیگر کہ بفارسی سخن میرانند ۔ درین صورت اگر

ہزار غلط از ہندی واقع شود برابرِ غلطِ اہلِ زبان نبود ۔"

اس دور کے تذکروں کی ادبی اہمیت

اس دور کے تذکرے اس زمانے کی ادبی تاریخ کا سب سے اہم ماخذ ہیں ۔ ان سے اس زمانے کے شعراء کے حالات ، ان کے کلام اور عام ادبی رجحانات کا پتا چلتا ہے ۔ اگرچہ اس زمانے کے شعراء کے صحیح ادبی مقام کا اندازہ تنہا ان تذکروں سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ خود ان کے دواوین کا مطالعہ کیا جائے تاہم ان کے عام رجحان کی طرف اشارات ضرور مل جاتے ہیں جن سے اس دور کی ادبی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے ۔

اس دور کی اکثر تاریخیں اس زمانے کے ادبی کارناموں سے خالی ہیں اور اگر کبھی کوئی ذکر کسی شاعر کا ان تاریخوں میں آیا بھی ہے تو نہایت مختصر اور سرسری طور پر آیا ہے ۔ ان تذکروں میں ہزاروں ایسے شعراء کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو کسی تاریخ یا دوسری کسی کتاب میں موجود نہیں ۔ چنانچہ اگر آج یہ تذکرے ہماری دسترس میں نہ ہوتے تو ہم ان شعراء کی ایک کثیر تعداد سے بالکل بے خبر ہوتے ۔

گذشتہ دور کے بعض تذکروں کی طرح اس دور میں بھی بعض تذکروں میں معاصر شعراء کے علاوہ متقدم شعراء کا بھی ذکر ملتا ہے ۔ ان تذکروں سے کسی حد تک قدیم شعراء کے زمانے سے اس زمانے تک کی فارسی شاعری کے ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے اور مختلف ادوار میں شاعری میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی طرف خفیف سا اشارہ ان تذکروں میں ملتا ہے ۔

ان تذکروں میں شعراء کے کلام کے جو انتخاب دیے گئے ہیں ان سے اس زمانے کی ادبی اور معاشرتی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ گذشتہ ادوار کے برخلاف جب بادشاہوں ، شاہزادوں اور درباری امراء و شاہی حکام کی سرپرستی کے باعث شعراء عام طور پر معاشی لحاظ سے نسبتاً زیادہ آسودہ اور مرفہ الحال تھے ، بعد کے دور کے شعراء عام طور پر معاشی بدحالی کا شکار تھے ۔ اس کا سبب ملک میں عام سیاسی بدنظمی اور بدامنی تھا ۔ عام معاشی انحطاط کے سبب بادشاہ اور امراء ، جو خود بھی نسبتاً تنگدستی و بدحالی کا شکار

ہو چکے تھے ، ادب و ہنر کی سرپرستی کے قابل نہیں رہے تھے ۔ چنانچہ جہاں گذشتہ ادوار میں مدحیہ قصاید ، عشقیہ مثنویوں اور طرب انگیز غزلوں کا رواج عام تھا ، اس دور میں اکثر شعراء غزل یا رباعی لکھتے تھے جن میں اکثر فراق ، دوستوں کی بے وفائی ، شکوۂ روزگار ، دنیا کی بے ثباتی اور ایک دوسرے کی ہجو پر اشعار ملتے ہیں ۔

اگرچہ تذکرہ نگاروں کی عام رسم کے مطابق اس دور کے تذکرہ نگاروں نے بھی شعراء کے کلام پر تفصیل سے بحث نہیں کی اور یہ بات ممکن بھی نہیں تھی ، لیکن اکثر ایک دو لفظوں میں شاعر کی خاص خوبیاں یا نقائص بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ بعض تذکرہ نگاروں نے مخصوص اصطلاحات کے ذریعے شعراء کی امتیازی خصوصیّات بیان کی ہیں ۔ مثلاً صاحبِ 'ہمیشہ بہار' نے حسب ذیل اصطلاحات کے ذریعے شعراء کی ممتاز خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے :

> پختہ کاری ، معنی نگاری ، معنی آفرینی ، معانی ہای غریبہ و بدیع ، معنی یابی ، معنی بندی ، معانی ہای بعید الفہم ، معنی ہای برجستہ ، تلاشہای تازہ ، خوش فکری ، مضامین تازہ ، قصیدہ‌ہای بلند، اندیشۂ رسا، ادا بندی ، فصاحت ، بلاغت ، سخنہای راست براست ، متانت ، الفاظِ رنگین ، ذہنِ دقت پسند ، سخنانِ حکمت آمیز ، شوخیٔ الفاظ ، استعاراتِ بی اندازہ ، چاشنیٔ سوز و گداز ، انواعِ بدائع و صنائع ، طرزِ قدما ، ایہام ، جاسعیت ، عبارات روشن ، دقیقہ سنجی ، نکتہ سنجی ، فکرِ دور از کار ، معانیہای دلآویز ۔

اس دور کے اکثر تذکرہ نگاروں نے تقریباً مذکورہ بالا اصطلاحات ہی کے ذریعہ شعراء کے کلام کی خوبیوں کو بیان کیا ہے ، چنانچہ خان آرزو نے بھی اپنے تذکرے 'مجمع النفائس' میں تقریباً انہی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے ، لیکن ان کے علاوہ حسب ذیل بھی دی ہیں :

> خوش محاورہ (سالک) ، شعر و نغمہ باہم جمع کردہ (ابراہیم قانونی) ، بسیار صاف میگوید و بمزہ حرف میزند (ایماء) ، طبعش کمال شوخی و نمک داشت (الفتی) ، بسیار پختہ گو (شفیعای اثر) ، طلاقتِ لسان و وضوح بیان و دقّت نظر و صفائی ذہن و زود رسیدن بدقائق و حقائق (اسحاق)

ذہنی درست و طبعی سلیم داشت ، زبان شعراء را بسیار ورزیدہ و خیلے
خوب میگفت (پیام) ، تلاشہای بالا دست دارد (آزاد) ۔

ان اصطلاحات سے بخوبی اس زمانے کی ادبی تنقید کے معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں جدّتِ مضامیں اور صنائع و بدائع کے استعمال پر توجہ دی جاتی تھی اور یہ صفات اس زمانے میں خاص اہمیت کی حامل تھیں ۔

علاوہ ازیں اس زمانے کے بعض تذکروں میں شعراء کے بیان میں ادبی حکایات دی گئی ہیں ، جن سے نہ صرف ان شعراء کی اخلاقی اور مزاجی کیفیات کا علم ہوتا ہے بلکہ اس دور کے عام اخلاقی رجحان کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے ۔ مثلاً صاحبِ 'ہمیشہ بہار' نے ناصر علی ، عطا ، غنی ، داراشکوہ ، قدسی ، کلیم اور نورجہاں کے حالات میں بعض نہایت دلچسپ قصّے لکھے ہیں جن سے ان شعراء کے زمانے کے بعض معاشرتی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ۔ اسی طرح صاحبِ 'انیس العاشقین' نے ظہیر فاریابی ، عنصری ، فردوسی ، قاسم انوار ، کاتبی نیشا پوری ، کلیم ، کمال خجندی ، مسیح کاشی ، مہری اور جہانگیر کے بیان میں بعض مفید ادبی حکایات لکھی ہیں ۔ اسی طرح صاحبِ 'گلِ رعنا' نے آزاد کے بیان میں بعض ادبی لطائف بیان کئے ہیں اور ابوالفرج رونی ، ابوسعد لاہوری ، اسحاق لاہوری ، فقیر اور گلشن کے ذیل میں بعض دلچسپ ادبی حکایات دی ہیں ۔ صاحبِ 'مجمع النفائس' نے میر معصوم ، مہری ، مُلاّ مخفی ، ماہر نصر آبادی ، متی کلال اور ناظم شیرازی کے حالات کے تحت بھی بعض مفید ادبی حکایات درج کی ہیں ۔

اس زمانے کی ادبی تنقید میں ہندوستانی ایرانی تعصب کے علاوہ علاقائی تعصّب بھی بعض جگہ کارفرما نظر آتا ہے ۔ مثلاً حاکم لاہوری مؤلف 'مردم دیدہ' کو خانِ آرزو سے شکایت ہے کہ اس نے شعراء کے حالات اور کلام دیتے وقت انصاف سے کام نہیں لیا ہے ۔ یہ شعراء اکثر پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اسی طرح بعض تذکرے ، جن میں کسی خاص علاقے یا کسی خاص استاد کے شاگردوں کا بیان آتا ہے ، مبالغہ آمیز تعریفوں سے پُر ہیں ۔ ان میں شعراء کے کلام پر رائے دیتے وقت اکثر انصاف سے کام لیا گیا ہے ۔ مثلاً ملاحظہ ہو 'تذکرۃ المعاصرین' حزین ، 'انیس الاحبّا' ، 'گلدستۂ کرناٹک' ، 'صبح وطن' ، 'خزینۃ الشعراء' ، 'اشارات بینش' اور 'گلزارِ اعظم' ۔

کچھ تذکروں میں بعض عروضی نکتے بیان کئے گئے ہیں جو ادبی لحاظ سے نہایت

اہمیت کے حامل ہیں ۔ مثلاً 'سرو آزاد' اور 'خزانۂ عامرہ' میں جگہ جگہ مؤلف نے بعض اشعار دیتے وقت ان کے کچھ اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اسی طریقہ پر صاحبِ 'مجمع النفائس' نے بھی کچھ جگہ عمل کیا ہے ۔ صاحبِ 'گل رعنا' نے بھی اپنے اُستاد (آزاد بلگرامی) کی تقلید میں جگہ جگہ عروضی نکتے بیان کئے ہیں ۔ 'بہارستانِ سخن' میں ایک خاص باب (باب دوم) کے تحت عروض و قواعدِ فارسی سے بحث کی گئی ہے ۔ اسی طرح 'نغمۂ عندلیب' میں بھی روضۂ اول کے شعر ، صنائعِ شعری اور قافیہ و ردیفِ فارسی پر بحث کی گئی ہے ۔

علاوہ ازیں 'حدائق الشعراء' میں سات ''نخلہ'' کے تحت ایران کی سات مقامی زبانوں یا لہجوں (ہروی ، سگزی وغیرہ) کے متعلق بڑی مفید معلومات دی گئی ہیں ۔

تاریخی اہمیت

اس دور کے تذکروں میں جابجا شعراء کے حالات کے ذیل میں ان کے زمانے کے بعض تاریخی واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے ۔ خاص طور سے معاصر شعراء کے بارے میں لکھتے وقت ان کے زمانے کے بعض اہم تاریخی وقائع بھی مجملاً بیان کئے گئے ہیں ۔ بعض امراء و نوابین و شاہانِ وقت کے حالات کے تحت نہایت مفید تاریخی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں ۔ ان میں سے بعض واقعات خود تذکرہ نگار کے چشم دید ہیں ۔ اس لحاظ سے وہ تاریخی حیثیت سے اہمیّت کے حامل ہیں ۔ مثلاً آزاد بلگرامی نے 'سروِ آزاد' میں سید عبداللہ خان ، امیر الامراء سیّد حسین علی خان ، آفتاب (نواب ناصر جنگ) اور آصف ، نواب نظام الملک آصف جاہ کے بیان میں بعض ایسے تاریخی واقعات بیان کئے ہیں جن میں سے اکثر اس کے چشم دید ہیں ۔ آزاد خود ان میں سے اکثر نوابین سے ارادۃً یا ملازمۃً متعلّق رہا ہے اور جو واقعات اس نے بیان کئے ہیں ان میں سے اکثر میں وہ بذاتِ خود رہا ہے ۔ لہٰذا اس زمانے کی تاریخ کے لحاظ سے ان بیانات کی بڑی اہمیت ہے ۔

اسی طرح آزاد نے اپنے دوسرے تذکرے 'خزانۂ عامرہ' میں آصف جاہ ، امیر الامراء فیروز جنگ ، عماد الملک نواب نظام الدولہ ، مظفر جنگ ، امیر الممالک آصف جاہ ثانی ، برہان الملک ، صفدر جنگ اور شجاع الدّولہ کے زمانے کے ایسے تاریخی واقعات (خاص طور سے احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کی جنگوں کے بارے میں) تفصیل سے بیان کئے

ہیں جن کو یا تو اس نے خود دیکھا تھا یا معتبر ذرائع سے اس تک پہنچے تھے - چنانچہ اس زمانے کی تاریخ سمجھنے کے لئے ان بیانات کو خاص اہمیت حاصل ہے -

علاوہ ازیں آرزو ، والہ ، حزین اور شفیق کے تذکروں میں بھی ان کے زمانے کے تاریخی واقعات پر بیش قیمت مواد ملتا ہے - ان تذکرہ نگاروں نے بھی اپنے زمانے کے بعض چشم دید تاریخی وقائع لکھے ہیں جو اس زمانے کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہیں -

اسی طرح جابجا ان تذکروں میں قطعات تاریخ ملتے ہیں جو مختلف شعراء نے اپنے ہم عصر شعراء ، امراء یا بادشاہوں کی ولادت یا وفات ، عمارات کی تعمیر ، جنگوں ، حملوں ، یا دوسرے تاریخی واقعات کے متعلق لکھے ہیں - یہ قطعات تاریخی اور ادبی تحقیق کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں -

اس دور کے تذکروں کی چند مزید امتیازی خصوصیات

اس دور کے اکثر تذکرہ نگار خود بھی شاعر تھے ، چنانچہ ان میں سے اکثر نے اپنے تذکروں میں دوسرے شعراء کے ساتھ ساتھ اپنا کلام بھی دیا ہے - خاص طور سے آزاد ، والہ ، آرزو ، حزین اور مصحفی اس دور کے مشہور شعراء میں سے تھے - ان شعراء نے اکثر انتخاب اشعار کے موقع پر اپنے زمانے کے مطابق اچھے ذوق کا ثبوت دیا ہے - عمومی تذکروں میں جہاں معاصرین کے علاوہ متقدمین کا بھی ذکر آیا ہے ، اگرچہ متقدمین کے حالات اور انتخاب کلام میں کمتر تذکرہ نگاروں نے خود تحقیق اور انتخاب اشعار کی زحمت گوارا کی ہے ، لیکن ان میں سے بعض تذکرہ نگار ایسے ضرور ہیں ، جنہوں نے قدماء کے حالات آنکھ بند کر کے گذشتہ تذکروں سے نہیں لکھے بلکہ خود مختلف کتب تاریخ و تذکرہ سے تحقیق کی ہے اور اس کا نتیجہ اپنے تذکرے میں لکھا ہے - اس لحاظ سے خان آرزو ، آزاد ، شفیق ، خوشگو اور خلیل فارسی کے جملہ تذکرہ نگاروں میں نہایت ممتاز مقام کے حامل ہیں - ان تذکرہ نگاروں نے شعراء کے کلام کا انتخاب بھی دوسرے قدیم تذکروں سے نقل نہیں کیا ، بلکہ اکثر شعراء کے دواوین و کلیات کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق کے لحاظ سے شعراء کے کلام کا انتخاب دیا ہے - اس لحاظ سے بھی یہ تذکرہ نگار فارسی تذکرہ نگاری میں خاص اہمیت رکھتے ہیں -

معاصر شعراء کے حالات اگرچہ اس دور کے اکثر تذکروں میں موجود ہیں لیکن

خوشگو ، آزاد اور آرزو نے اس غرض سے خاص کد و کاوش کی ہے اور متعدد معاصر شعراء کے حالات خود ان سے حاصل کر کے لکھے ہیں ۔ ان تذکرہ نگاروں میں آزاد ، آرزو اور خلیل نے جن شعراء کے متعلق اپنی رائے دی ہے یا بعض شعراء پر جو تنقید کی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ اس لحاظ سے سب سے اہم تذکرہ آرزو کا 'مجمع النفائس' ہے جس میں آرزو نے مجمل لیکن نہایت دقیق اور عمیق رائے اکثر شعرای قدیم و معاصر کے بارے میں دی ہے ۔ شاید اس لحاظ سے فارسی کا کوئی تذکرہ کمتر اس کی برابری کر سکتا ہے ۔ البتہ کہیں کہیں آرزو ہندوستانی ایرانی تعصب کا شکار نظر آتا ہے لیکن اکثر مقامات پر اس نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ وہ اگر تعریف کرتا ہے تو مبالغہ آرائی کمتر کرتا ہے ۔ اسی طرح کسی شاعر کی تنقیص میں بھی بے انصافی کا مرتکب نہیں ہوتا ۔

اس دور کے تذکروں کی ایک اور امتیازی خصوصیت ہندو شعراء کا ذکر ہے ۔ اس سے پہلے کے تذکروں میں برہمن اور ایغم بیراگی کے علاوہ کسی دوسرے ہندو شاعر کا ذکر نہیں آیا ، اس دور میں نہ تنہا سینکڑوں ہندو شعراء کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے بلکہ شفیق نے 'گل رعنا' (فصل دوم) میں اور انیس نے 'انیس الاحبّا' (باب دوم) میں علیحدہ ہندو شعراء کا ذکر کر دیا ہے ۔

علاوہ ازیں فارسی تذکرہ نگاری میں پہلی دفعہ اس دور میں چند تذکرے ہندوؤں نے لکھے ہیں ، چنانچہ کشن چند اخلاص نے 'ہمیشہ بہار' ، بندرا بن داس خوشگو نے 'سفینۂ خوشگو' ، درگا داس عشرت نے 'سفینۂ عشرت' ، لچھمی نرائن شفیق نے 'گلِ رعنا' اور 'شامِ غریباں' ، موہن لعل انیس نے 'انیس الاحبّا' ، بھگوان داس بسمل و ہندی نے 'سفینۂ ہندی' اور رتن سنگھ زخمی نے 'انیس العاشقین' لکھے ۔ ان میں اخلاص ، خوشگو شفیق اور زخمی کے تذکرے اپنے معیار کے اعتبار سے بلند مرتبے کے حامل ہیں اور ان کا شمار فارسی کے اہم تذکروں میں ہوتا ہے ۔

اس دور کے تذکروں کا مختصر جائزہ

۱۔ 'ہمیشہ بہار'

کشن چند اخلاص نے ۱۱۳۶/۱۷۲۳ء میں تالیف کیا ۔ اس کے نام کے اعداد

کو ابجد کی رو سے دگنا کرنے سے اس کا سالِ تالیف نکلتا ہے۔ اس میں '۲۰۷' ایسے شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے جو اکبر اور جہانگیر کے زمانے سے محمد شاہ کی تخت نشینی (۱۷۱۸ء/۱۱۳۱ھ) تک ہندوستان میں گذرے ہیں ۔ اس تذکرے میں برہمن ، جہانگیر ، ریاض ، شیدا ، شادمان ، صائب ، عرفی ، ناصر علی ، فیضی ، دارا شکوہ ، قدسی ، کلیم ، ملا شاہ بدخشانی اور نور جہان کے حالات اور بیدل ، جویا ، رباض ، زلالی ، صلابت جنگ ، سلیم ، سرخوش ، صائب ، طالب آملی ، ظہوری ، غنی ، قدسی ، قبول ، کلیم ، گلشن ، مخلص کاشی ، منیر اور طاہر وحید کے کلام کا انتخاب مفصل دیا ہے ۔

مؤلف نے کہیں کہیں شعراء کی آپس کی نوک جھونک کے قصے بھی دیے ہیں ۔ مثلاً ملاحظہ ہو 'ملا' شیدا کے بیان میں شعراء کی نوک جھونک یا صائب کے ذیل میں اور کلیم کی ظفر خان احسن کے دربار میں نوک جھونک کی داستان ۔ بعض شعراء کے ذیل میں وہ تاریخِ وفات دی ہے جو دوسرے شعراء نے ان کے مرنے پر کہی ہے ۔ بعض شعراء کے حال میں ان کی بدیہہ گوئی کے قصے لکھے ہیں ۔ ملاحظہ ہو محمد سعید قریشی ، نواب نور جہان ۔ اکثر شعراء کے ذیل میں ان کی عادات و خصائل کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے ۔ یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے ۔

۴۔ 'سفینۂ بے خبر'

میر عظمت اللہ بے خبر نے ۱۷۲۸ء/۱۱۴۱ھ میں اپنی موت سے ایک سال قبل لکھا۔ بے خبر خوش ذوق شاعر تھے ۔ ان کی شاعری میں تصوّف اور عرفان کی چاشنی تھی۔ انہوں نے چند رسالے بھی توحید اور تصوّف پر لکھے ہیں ۔ 'سفینۂ بے خبر' میں ۹۸۷ شعرای متاخّر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ ان میں بعض ایسے شعراء بھی ہیں جنھوں نے ایک دو شعر سے زیادہ نہیں کہے ، لیکن مؤلف کا خیال ہے :

یک بیت دعویِ مسلّم بود　　　اگر مصرعش مصرعی ہم بود

ہر شاعر کا چند لفظوں میں تعارف کرا کے اس کے دو تین شعر دے ہیں ۔ سفینہ ہونے کے سبب اس سے زیادہ گنجائش بھی نہیں تھی ۔ لیکن اہلِ ذوق کے لئے یہ سفینہ عمدہ اشعار کا ایک خزینہ ہے ۔

اس کتاب کے دو قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہیں ۔ (ڈاکٹر محمد باقر ، سابق رئیس شعبۂ فارسی و پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے زیرِ نگرانی ان کی ایک ایم اے فارسی کی طالبہ نے اس سفینہ کی ترتیب و تصحیح کی ہے) ۔

۴۔ 'سفینۂ خوشگو'

بندرابن داس خوشگو نے ۱۷۲۴ء/۱۱۳۷ھ میں شروع کر کے ۱۷۳۴ء/۱۱۴۷ھ پایۂ تکمیل کو پہنچایا ۔ مولف متھرا کا رہنے والا تھا اور اپنے وقت کے مشہور فضلاء و ادباء مثلاً سرخوش ، آرزو ، سبقت ، بیغم ، گلشن اور بیدل سے اس کے قریبی تعلقات تھے ۔ بیدل سے اسے خاص ارادت تھی ۔ آخری عمر ترکِ دنیا کر کے الہ آباد ، بنارس اور پٹنے میں گذاری اور آخر ۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ میں پٹنے ہی میں انتقال کیا ۔

کتاب کے تین دفتر ہیں ۔ 'دفتر اول' میں ۳۶۲ شعرای متقدم ، 'دفتر دوم' میں ۸۱۱ شعرای متوسط و متاخر اور 'دفتر سوم' میں ۲۴۵ شعرای معاصر کا ذکر ہے ۔ اس کا ایک نسخہ دری شوستری نے ایران میں ۱۸۶۴ء/۱۲۴۱ھ ہجری شمسی میں ایک "آب آورد" سے دوبارہ (بعض اضافات کے ساتھ) ترتیب دیا ہے ، جس میں کل ۱۱۰۲ شاعروں کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔

خوشگو نے اپنے سفینہ کی ترتیب میں اکثر معتبر تذکروں اور تاریخوں سے مدد لی ہے ۔ اس کتاب کا دفتر سوم خاص طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے ، کیونکہ مؤلف نے اس دفتر کے اکثر شعراء سے ملاقات کی ہے اور ان میں سے بعض کے حالاتِ زندگی خود ان سے حاصل کئے ہیں ، مثلاً ملاحظہ ہو آرزو اور آزاد ۔ اکثر کے حالات دوسرے معتبر تذکروں اور دوسرے قابلِ اعتماد ذرائع جیسے 'کلمات الشعراء' ، 'تذکرۂ نصر آبادی' ، 'تذکرہ ہائے آزاد' ، 'ہمیشہ بہار' ، تذکرۂ والہ' سے لئے ہیں ۔ اس کتاب کو سفینہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ اس میں مؤلف نے اکثر شعراء کے حالات اور کلام کا انتخاب مفصّل دیا ہے ۔ بیدل کے حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام مفصل ترین ہے ۔ مجموعی طور پر اس تذکرے کا شمار فارسی کے بہترین اور اہم ترین تذکروں میں ہوتا ہے ۔

اس تذکرے کا دفتر سوم پٹنے سے ۱۹۵۸ء میں پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن کی ترتیب و تصحیح کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔ دفتر اول کے قلمی نسخے انڈیا آفس اور دفتر

دوم کے قلمی نسخے کتاب خانۂ مجلسِ تہران ، کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی لاہور اور بانکی پور پٹنہ میں موجود ہیں ۔ "آب آورد" کے نسخے کتاب خانۂ سپہ سالار تہران ، ملک تہران ، مرکزی تہران اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں ۔

۴۔ 'ید بیضا'

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ۱۷۳۲ء/۱۱۴۵ھ میں شروع کر کے ایک سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا ۔ آزاد کا شمار اس زمانے کے معروف ترین فضلاء و ادباء میں ہوتا ہے ۔ وہ ۱۷۰۴ء/۱۱۱۶ھ میں قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے ۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کا سفر کرنے اور حج کرنے کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے ، جہاں نظام دکن نے ان کو اپنا مقربِ خاص مقرر کیا ۔ آخری عمر میں شاہ مسافر کے تکیے میں عزلت نشین ہوگئے اور وہیں ۱۷۸۴ء/۱۲۰۰ھ میں انتقال کرگئے ۔ آزاد فارسی کے علاوہ عربی کے بھی ممتاز عالم تھے اور انہوں نے عربی میں متعدد کتابیں تالیف کی ہیں ۔ جہاں اس زمانے کے اکثر اہل فضل و ادب جیسے آرزو ، حاکم اور شفیق آزاد کے زبردست مداح اور ان کے فضل و کمال کے معترف تھے ، وہاں بعض لوگوں نے آزاد کی تالیفات پر زبردست تنقید بھی کی ہے ۔ مثلاً غلام حسین صدیقی بلگرامی نے 'شرائف عثمانی' میں آزاد کی بعض غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کے بقول آزاد سے 'مآثرالکرام' اور 'سرو آزاد' کی تالیف میں ہوئی ہیں ۔ اس طرح ان کتابوں پر محمد صدیق سخنور عثمانی بلگرامی نے 'تحقیق السداد فی عزلات آزاد' میں بھی سخت تنقید کی ہے ۔ حتی کہ صاحبِ 'خلاصۃ الافکار' نے آزاد کی بعض باتوں کا زبردست مذاق اڑایا ہے اور ان کو بعض مقامات پر آڑے ہاتھوں لیا ہے ۔ مؤلف نے 'ید بیضا' کے علاوہ 'سروِ آزاد' اور 'خزانۂ عامرہ' نامی تذکرے بھی فارسی میں لکھے ہیں ۔

اس تذکرے میں ۵۳۲ فارسی شعرای متقدم و متاخر کا الفبائی ترتیب سے ذکر دیا گیا ہے ۔ اکثر شعراء کا حال مختصر ہے ، لیکن بعض نسبتاً غیر معروف شعراء کا حال تفصیل سے دیا ہے ۔ یہ تذکرہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ اس کے قلمی نسخے بانکی پور ، انڈیا آفس اور آصفیہ حیدر آباد کے کتابخانوں اور گوٹھی یاسین (سندھ) میں محمد ابراہیم صاحب کے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہیں ۔

۵۔ 'تذکرۂ ندرت'

علی فطرت عطاء اللہ ندرت نے ۱۷۳۶ء/۱۱۴۹ھ میں لکھا ۔ اس میں تیسری صدی

سے بارھویں صدی ہجری (نویں صدی سے اٹھارھویں صدی عیسوی) تک کے شعراء کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا ایک واحد نسخہ ایتھے کی فہرست میں مذکور ہے ۔

۶- 'گلدستہ'

عبدالوہاب عالمگیری نے ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں لکھا ۔ اوحدی نے اپنے تذکرے 'عرفات العاشقین' کا ایک خلاصہ 'کعبہ' عرفان' کے نام سے ترتیب دیا تھا ۔ پھر جہانگیر کے حکم سے اس کا بھی ایک خلاصہ 'انتخاب ِ کعبہ' عرفان' کے نام سے تین رکن میں ترتیب دیا اور رکنوں کا نام 'حنانی' ، 'منانی' اور 'ربانی' رکھا جو بالترتیب شعرای متقدم ، متوسط و متاخر پر مشتمل ہے ۔ مؤلف ِ گلدستہ نے 'انتخاب ِ کعبہ' عرفان' سے شعراء کے حالات کا اضافہ کر کے اس کا نام 'گلدستہ' رکھ دیا ہے ۔ اس میں شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ اس کا واحد قلمی نسخہ کتاب خانہ' بانکی پور میں موجود ہے ۔ (ملاحظہ ہو فہرست کتاب خانہ' بانکی پور ، جلد ۸ ، صفحہ ۱۱۷) ۔

۷- 'بہارستان سخن'

میر عبدالرزاق صمصام الدولہ نے اس کتاب کی تالیف ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں شروع کی ۔ آپ دکن کے معروف ترین فاضل اور ادب دوست امراء میں سے تھے اور نظام دکن کے دربار سے منسلک تھے ۔ 'بہارستان ِ سخن' کو پایہ' تکمیل تک پہنچانے سے قبل ان کا انتقال ہو گیا ۔ ان کے بعد ان کے بیٹے میر عبدالحی خان نے اپنے باپ کی دوسری معرکۃالآرا کتاب 'مآثر الامراء' کی تکمیل کے ساتھ اس کتاب کو بھی آخری شکل بخشی اور اس میں شعراء کے حالات مختلف معتبر تذکروں اور کتابوں سے جمع کر کے اضافہ کئے ۔ یہ کام اگرچہ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء تک جاری رہا لیکن چونکہ اس کا پہلا نسخہ ۱۷۷۸ء/ ۱۱۹۲ء میں مکمل ہو گیا تھا لہذا اس کا سال ِ تکمیل وہی قرار پایا ۔

اس میں بارہ فصلیں ہیں ۔ ان میں سے گیارہ میں مؤلف نے عربی اور فارسی کی ابتدا ، شاعری کا جواز آیات ِ قرآنی اور احادیث رسول[ص] سے ، عروض و قوافی ، اقسام ِ قوافی ، بلاغت و فصاحت و استحکام ِ کلام ، صنائع و بدائع ِ شعر ، معما و لغز ، علم انشاء و شرائط منشی ، آداب ِ کتابت ، خط ، حروف و اعراب و الفاظ و تفسیر اور قواعد ِ لغت فارسی پر بحث کی ہے ۔ بارھویں فصل میں پانچ طبقہ اور ایک خاتمے کے تحت محمود

غزلوی کے وقت سے مؤلف کے زمانے تک کے ۱۳۰ فارسی شاعروں کا حال اور ان کا منتخب کلام دیا ہے ۔ شعراء کے متعلق تقریباً تمام تر معلومات دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں ۔ البتہ مرتب نے ان حالات کو تحقیق و تدقیق کے بعد لکھا ہے اور اکثر شعراء کے ذیل میں ان کے متعلق بیشتر ضروری معلومات دے دی ہیں ۔ یہ تذکرہ ۱۹۵۸ء میں مدراس (ہندوستان) سے نہایت مخلوط شکل میں شائع ہوا ۔

۸۔ 'ریاض الشعراء'

علی قلی خان والہ داغستانی نے ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں شروع کر کے ایک سال بعد مکمل کیا ۔ والہ اصفہان میں ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا اور شاہ طہماسپ صفوی کے ندمای خاص میں رہا ۔ جب شاہ طہماسپ کو نادر شاہ نے تخت سے معزول کر دیا تو والہ نے اصفہان ہی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی ۔ اسی زمانے میں محمود خان افغان نے اصفہان پر حملہ کر دیا اور والہ کی منگیتر خدیجہ سطان سے زبردستی اپنے غلام کرم داد کی شادی کر دی ۔ اس المیے کے بعد والہ نے ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں ہندوستان کا رخ کیا ، یہاں محمد شاہ ، احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے درباروں سے منسلک رہا اور دہلی میں ۱۷۵۵ء/۱۱۶۹ھ میں فوت ہوا ۔ والہ بقول حاکم مؤلف 'مردم دیدہ' ایک "خوش معاش و خوش پوش و خوش صحبت" آدمی تھا ۔ اغلب اوقات مقروض رہتا تھا ۔ شاعری میں کسی کو ہم پلہ نہیں گردانتا تھا ۔ اس کے وسیع المشرب ہونے کی دلیل اس کی یہ رباعی ہے :

دیدم نزاع سنی و شیعہ تعصّب — کاموختہ اند کیش جہل از ام و اب
ہر جا کہ خریست کنیتش شیعہ بود — ہر جا کہ سگی است سنیش ہست لقب

والہ نے اس تذکرے میں دو ہزار پانچ سو شعرای متقدم ، متوسط و متأخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا ہے ۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت ستر دیوان اور جدید تذکرے اور تواریخ کا مطالعہ کیا اور معتبر کتابوں سے ضروری معلومات کو جمع کیا ۔ بعض فنون شاعری پر بھی بحث کی اور قدیم شعراء کے دواوین سے اچھے اشعار کا انتخاب کیا ۔ بعض شعرا کے حالات لکھتے وقت ان کے زمانے کے تاریخی حالات بھی دیے ہیں اور بعض شعراء کے کلام پر تنقید کی جو اکثر غرض اور تعصّب سے خالی ہے ۔ بعض شعراء کے ذیل میں ان کی تالیفات اور تصنیفات کی تفصیل دی ہے ۔

والہ نے تذکرے میں شعراء کے حالات کے ضمن میں اس زمانے کے بعض اہم تاریخی

وقائع بیان کئے ہیں جو اس کے چشم دید ہیں لہٰذا تاریخی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

اکثر شعراء کے حالات مختصر اور ان کے ایک دو شعر بطور نمونہ دیے ہیں اور اکثر غیر مشہور کو شامل کیا ہے۔ بعض افراد اور شعراء کے حالات میں ان کی زندگی کے اکثر اہم واقعات بیان نہیں کئے حتیٰ کہ ان کی تاریخِ وفات بھی نہیں دی۔ مؤلف نے ظاہراً ایرانی تعصب کے سبب بعض مشہور معاصر ہندوستانی شعراء جیسے آرزو اور آزاد کا اپنے تذکرے میں قطعاً ذکر نہیں کیا ہے، جب کہ غیرمعروف کی ایک کثیر تعداد کا، جن میں اکثر کا حال خود اسے بھی معلوم نہیں تھا، ذکر کیا ہے۔ یہ تذکرہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

۹۔ 'منتخب الاشعار'

میرزا کاظم مردان علی خان مبتلا نے ۱۷۶۷ء/۱۱۶۱ھ میں لکھا ہے۔ مؤلف ۱۷۳۱ء/ ۱۱۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوا اور صفدر جنگ سے مردان علی خان کا لقب پایا۔ آخری عمر میں عظیم آباد (پٹنہ) چلا گیا جہاں ۱۷۹۸ء/۱۲۱۲ھ میں فوت ہوا۔

اس تذکرے میں ۱۱۷ شعرای متقدم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ اکثر شعراء کا حال مختصر اور ان کا ایک دو جملے میں تعارف کرایا ہے لیکن کلام نسبتاً زیادہ مفصل دیا ہے۔ اکثر شعراء کی زندگی کے اہم حالات حتیٰ کہ سالِ وفات بھی نہیں دیے لیکن اشعار کا انتخاب مؤلف کے اعلیٰ ادبی ذوق کا شاہد ہے۔ یہ تذکرہ ابھی تک طبع نہیں ہوا۔ اس کے دو نسخے کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی لاہور اور ایک کتاب خانۂ رامپور میں موجود ہیں۔

۱۰۔ 'منتخب حاکم'

ملا عبدالحکیم حاکم لاہوری نے ۱۷۴۷ء/۱۱۶۱ھ میں ترتیب دیا۔ بقول ریو اکثر مطالب آرزو کے تذکرے سے ماخوذ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاکم نے اپنے دوسرے مفصل تر تذکرے 'مردم دیدہ' کی تالیف سے قبل اسے ترتیب دیا۔ البتہ معلوم نہیں کن وجوہ کی بنا پر 'مردم دیدہ' میں میر عبدالحی اور شیخ نور محمد کا ذکر نہیں کیا، جب کہ باقی شعراء کا ذکر اس میں دیا ہے۔ منتخب حاکم کے قلمی نسخوں کا ذکر رہاتسک اور ریوزنگ فہرستوں میں آیا ہے۔

۱۱۔ 'تذکرۃ الشعرای کشمیر'

اصلح میرزا نے یہ تذکرہ تقریباً ۱۷۴۷ء/۱۱۶۱ھ میں تالیف کیا ۔ اگرچہ خود مؤلّف نے اس کا سالِ تالیف کتاب میں کہیں نہیں لکھا ۔ اس میں اورنگ زیب سے محمد شاہ کے زمانے تک کے ۳۰۵ شعراء کا ذکر دیا گیا ہے ۔ ان میں سے چند کے علاوہ تمام شعراء کا تعلّق کسی نہ کسی طرح کشمیر سے ہے ۔ اس لیے اس کو 'تذکرۂ شعرای کشمیر' کہا جا سکتا ہے ۔ اکثر شعراء کا حال نہایت مختصر اور نمونۂ کلام بھی مختصر دیا ہے ، چنانچہ اکثر شعراء کے صحیح ادبی مقام کا تعیّن اس تذکرے سے ممکن نہیں ۔ بعض شعراء کے عہد کا تعیّن بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ اقبال اکیڈمی کراچی کی طرف سے ۱۹۶۷ء/۱۳۴۶ش میں جشنِ تاجگذاری شاہنشاہِ ایران کے موقع پر پیر حسام الدین راشدی کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع ہوا ۔

۱۲۔ 'تذکرۂ حسینی'

میر حسین دوست سنبھلی نے ۱۷۴۹ء/۱۱۶۳ھ میں تالیف کیا ۔ اس تذکرے میں ۴۴۵ فارسی شعرای متقدّم و متاخّر کا ذکر ہے ۔ اکثر شعراء کے حالات مختصر ہیں اور ان کی زندگی سے متعلق اکثر ضروری معلومات فراہم نہیں کی گئیں ، حتّیٰ کہ مؤلّف نے اپنے ہم عصر شعراء کے حالات بھی تفصیل سے نہیں دیے ۔ البتّہ اکثر عرفاء کے حالات تفصیل سے دیے ہیں ۔ ہر شاعر کی مؤلّف نے تعریف کی ہے اور کسی کے کلام پر تنقید نہیں کی ۔ بعض شعراء کے حالات کے ضمن میں ادبی حکایات بھی دی ہیں جس کی وجہ سے تذکرہ زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے ۔ لکھنؤ سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا ۔

۱۳۔ 'مجمع النفائس'

شیخ سراج الدین علی خان آرزو المقلب بہ استعداد خان نے یہ تذکرہ ۱۷۴۹-۵۰ء/ ۱۱۶۳-۶۴ھ میں تالیف کیا ۔ بقول خوشگو ، آرزو ۱۶۹۷ء/۱۰۹۹ھ میں اکبر آباد (آگرہ) میں علماء و فضلاء کے خاندان میں پیدا ہوا ۔ آرزو نے ۱۴ سال کی عمر سے شاعری شروع کر دی اور اپنے زمانے کے معروف شعراء جیسے گلشن ، میرزا حاتم ، میاں علی عظیم خلف الصدق میاں ناصر علی سرہندی وغیرہ کی صحبت میں رہا ۔ وہ آخری مغل بادشاہوں کی ملازمت میں سوانح نگار اور دوسرے اہم عہدوں پر فائز رہا ۔ آنند رام مخلص کی وساطت سے

اس کو شاہی دربار سے استعداد خان کا خطاب اور اس کے وطن میں ایک جاگیر ملی۔ مؤتمن الدولہ شوستری نے بھی اس کی سرپرستی کی جس کی خدمت میں آرزو بقول خود بیس سال رہا۔ اس کے بعد آرزو، مؤتمن الدّولہ کے بیٹے نجم الدّولہ کی ملازمت میں رہا جس سے اس کو ۱۵۰ روپیہ ماہانہ کا وظیفہ اور دوسری امداد ملتی رہی۔ پھر اس کے بھائی سالار جنگ کی ملازمت میں رہا جس کے ساتھ وہ لکھنؤ چلا گیا۔ چنانچہ چند ماہ بعد ۲۶ جنوری ۲۳/۱۷۵۶ء ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ میں آرزو نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔ بعد میں اس کی وصیت کے مطابق اس کو دہلی لے جا کر وکیل پورہ میں اس کے ذاتی مکان میں دفن کیا گیا۔

خان آرزو کا شمار اس سرزمین کے معدودے چند نوابغ میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف شاعری اور ادب میں ایک عالی مقام کا حامل ہے بلکہ ایک مورّخ، زبان شناس، لغت نویس، ادبی نقاد اور شعر و ادب کے شارح کی حیثیت سے بھی اس برّصغیر کا کمتر کوئی دوسرا ادیب اس کی برابری کر سکتا ہے۔ وہ جامعِ علوم و فنون تھا۔ وہ متعدّد زبانوں سے واقف تھا اور سنسکرت سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی لغت 'سراج اللغات' میں سنسکرت اور فارسی کی مشابہت اور نزدیکی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ باوجود اس علم و فضل کے وہ غرور و تکبّر سے بالکل دور تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے معترضین کے اعتراضوں کو صبر و تحمل سے سنتا اور ان کے صحیح اعتراضوں کو بڑی جرأت کے ساتھ قبول کرنے کو تیار رہتا تھا۔ یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ اس کے بعض شاگرد؛ جیسے مخلص، خوشگو، مظہر اور واقف، استاد کی زندگی میں ہی صاحبِ دیوان ہو گئے تھے۔ تقریباً تمام ہم عصر تذکرہ نویس اس کے علم و فضل کے معترف ہیں۔ چنانچہ صاحبِ 'مجموعۂ نغز' لکھتا ہے: ''اگرچہ زبان دانانِ ایران از ممر حسد بنفس الامر از او حسابی میگیرلد (نمی برند) اما حق آنست کہ وجودِ چنین کس در خاکِ ہندوستان حکمِ اکسیرِ اعظم دارد''۔ پھر کہتا ہے جس طرح علمای اہل حق کو عیال ابو حنیفہ کوفی کہتے ہیں، اسی طرح ''اگر شعرای ہندی زبان را عیال خان آرزو گویند می سزد'' [۱]

اسی طرح بلوخان کی رائے میں آرزو تمام ان شارحوں میں جو، ہندوستان نے پیدا کیے ہیں، سب سے بہتر ہے۔ اس کی شرحیں جو اس نے 'اسکندر نامۂ نظامی'، 'قصائد خاقانی' اور 'قصائدِ عرفی' اور 'گلستانِ سعدی' کی لکھی ہیں، نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے

---

(۱) مجموعۂ نغز، طبع لاہور، جلد ۱، صفحہ ۲۴۔

خیال میں 'برہان قاطع' کو آرزو کی تنقید کے بغیر شائع[1] نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح اس کا رسالہ 'تنبیہہ الغافلین' ہر لغت نویس اور قواعد نویس کو لازماً پڑھنا چاہیے کیونکہ اس میں فارسی محاوروں سے متعلق نہایت مفید اشارے موجود ہیں۔

خان آرزو نے 'مجمع النفائس' لکھتے وقت 'عرفان'، 'تذکرۂ نصر آبادی'، 'کلمات الشعراء' اور 'تحفۂ سامی' سے استفادہ کیا ہے۔ سب سے زیادہ اس نے 'عرفات العاشقین' سے معلومات اخذ کی ہیں اور بعض جگہ اس کے مصنف کے اقوال پر اعتراض بھی کیا ہے۔ بعض شعراء کے اشعار 'بیاضِ صائب' سے لکھے ہیں۔ بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کے اقوال پر بھی اعتراض کیے ہیں اور بعض مواقع پر تحقیق کر کے اپنی رائے لکھی ہے۔

'مجمع النفائس' میں کل ۱۷۳۵ (اور بقول اشپرنگر ۱۳۱۹) شعرای متقدّم و متوسّط و متاخّر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا ہے اور ان کے قریباً چالیس ہزار اشعار دیے ہیں۔ اگرچہ شعراء کے حالات نہایت مختصر ہیں، لیکن تقریباً ۱۵۰ شاعروں کے حالات نسبتاً مفصل دیے ہیں اور ان کی زندگی کے اہم حالات دیے ہیں۔ اس طرح قریباً چار سو شاعروں کا منتخب کلام نسبتاً مفصل دیا ہے۔ خصوصاً قزلباش خان امید، بیدل، جویا، رفیع، عاقل خان رازی، سالک قزوینی، سیادت، سلیم، شاہ پور، شوکت بخاری، صائب، منصف، مخلص، مقیمی، طاہر وحید، واعظ قزوینی اور یحیٰی کاشی کے اشعار دوسروں کی نسبت زیادہ تفصیل سے دیے ہیں۔ خود اپنے حالات اور اشعار سب سے زیادہ دیے ہیں۔ اپنے اشعار دوسرے شعراء کے ذیل میں بھی دیے ہیں۔

اس تذکرے کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں مؤلف نے شعراء کے کلام پر اپنی رائے دی ہے یا دوسرے تذکرہ نگاروں کے اقوال پر تنقید کی ہے یا شعراء کی غلطیاں بیان کی ہیں۔ اس لحاظ سے فارسی کا کوئی دوسرا تذکرہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ مؤلف نے جابجا بعض متعصّب ایرانی شاعروں اور ادیبوں پر تنقید کی ہے اور ان کے تعصب آمیز اقوال کی تردید کر کے ہندوستانی شعراء کو سراہا ہے۔ ان تنقیدوں میں بعض مقامات پر ہندوستانی ایرانی تعصب صاف طور پر جھلکتا ہے۔

---

(1) Contributions to Persian Lexicography by Blochman published in the Journal of the Royal Asiatic Society, Vol,. xxxii, 1868, pp. 18-25 and 70-71.

یہ تذکرہ مجموعی حیثیت سے فارسی کے بہترین تذکروں میں سے ہے۔ اسے مستقبل قریب میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے ۔

۱۴- 'تذکرۃ المعاصرین'

شیخ محمد علی حزین لاہیجی نے ۱۷۵۱ء/۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا ۔ حزین اپنے وقت کا مشہور عالم تھا ۔ وہ ۱۶۹۱ء/۱۱۰۳ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا ۔ محمود خان افغان کے حملے کے وقت والد کے ساتھ عازم ہندوستان ہوا ۔ یہاں پہنچ کر کچھ مدت دہلی میں رہا جہاں بادشاہ ، امراء اور ہر خاص و عام نے اس کی عزت کی لیکن اسی زمانے میں اس نے ہندوستانیوں اور کشمیریوں کی بےجا مذمت میں زبان کھولی جس کے نتیجے میں بعض ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کو اس سے پرخاش ہوگئی ۔ بالآخر وہ بنارس چلا گیا جہاں ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ میں فوت ہؤا اور وہیں دفن ہؤا ۔

ہندوستان میں ایرانی ہندوستانی تعصّب کی آگ بھڑکانے میں شیخ حزین کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے ۔ اس نے اپنی سوانحِ حیات 'تاریخ احوال' کے نام سے لکھی جس میں جابجا ہندوستانیوں پر رکیک طنز کیے ۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور ماہر شاعر ضرور تھا اور اس نے چار دیوان اور چند کتابیں نظم و نثر میں یادگار چھوڑی ہیں ۔ اس کی 'تاریخِ احوال' تاریخی لحاظ سے اہم ہے چونکہ اس میں حزین نے اپنے زمانے کے سیاسی حالات تفصیل سے لکھے ہیں ۔

'تذکرۃ المعاصرین' میں مؤلف کے سو ہم عصر شعراء اور علماء کا ذکر ہے ۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ مؤلف کے ذاتی تعلقات تھے ۔ لہٰذا ان کے متعلق اس کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ اس کتاب میں ایک خاص نقص یہ ہے کہ مؤلف نے اس کو بہت کم مدت میں لکھا ۔ خود کہتا ہے کہ اس نے اسے صرف نو روز میں 'مخطوطاتِ خاطر' سے تالیف کیا ۔ ظاہراً اس پر نظرِ ثانی بھی نہیں کی گئی ، کیونکہ ایک شخص 'مختار نہاوندی' کا ذکر دو جگہ (نمبر ۵۷ اور ۷۶ پر) دے دیا ہے ۔ بعض شعراء کا سال وفات دیا ہے ۔

یہ کتاب لکھنؤ سے ۱۸۷۶ء اور کانپور سے ۱۸۹۳ء میں کلیاتِ حزین کے ساتھ اور اصفہان سے علیحدہ ۱۹۵۵ء/۱۳۳۴ش میں شائع ہوئی ۔

۱۵- 'سفینۂ علی حزین'

یہ شیخ حزین کی تالیف ہے ۔ اس کا سال تالیف معلوم نہیں ۔ اس میں ۱۰۰ شعرای متأخر کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ مؤلف نے اکثر شعراء کا تعارف ایک جملے یا چند لفظوں میں کرا کے چند شعر 'نمونۃً' دیے ہیں ۔ بعض شعراء کے صرف ایک دو شعر دیے ہیں ۔ اگرچہ یہ سفینہ مختصر ہے لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس میں مذکور اکثر شعراء کا ذکر کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا ۔ مؤلف نے کسی شاعر کا سالِ وفات نہیں دیا ۔ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۰ء/۱۳۴۸ھ میں شائع ہؤا ۔

۱۶- 'تحفۃ الشعراء'

افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی نے ۱۷۵۱ء/۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا ۔ اس میں دکن کے ان ۶۲ فارسی شعراء کا ذکر ہے جو نظام الملک کے زمانے میں تھے ۔ مؤلف نے آصف جاہ اور نظام الدولہ کے حالات کے ضمن میں کچھ ان کے زمانے کے تاریخی وقائع بھی بیان کئے ہیں ، جو اکثر اس کے چشم دید ہونے کے سبب تاریخی لحاظ سے کافی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ناصر اور آصف جاہ کے حالات اور آزاد بلگرامی ، جرأت ، عاجز اور مظہر کے منتخب اشعار سب سے زیادہ ہیں ۔ اکثر شعراء کے حالات میں سالوں کا ذکر نہیں اور ان کے ضروری حالاتِ زندگی بھی نہیں دیے ۔ حسب ذیل شعراء کے تحت ان کے فارسی اشعار کے ساتھ اردو اشعار بھی دیے ہیں : شاہ فضل اللہ قادری ، سید عبدالولی ، میر فخر الدین اورنگ آبادی ، شہید تہرانی ، میر عبدالحئی خان ، عارف الدین عاجز ، میر عبد الوہاب دولت آبادی اور میرزا جانجانان مظہر ۔ یہ تذکرہ حال ہی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہؤا ہے ۔

۱۷- 'سروِ آزاد'

یہ تذکرہ بھی آزاد بلگرامی کی تالیف ہے جو ۱۷۵۲ء/۱۱۶۶ھ میں لکھا گیا ۔ یہ اصل میں آزاد کی کتاب 'مآثر الکرام' کا دفتر ثانی ہے ۔ اس میں ۱۴۳ شعراء کا ذکر تاریخی اعتبار سے دیا گیا ہے ۔ ان میں سے ۳۰ شاعر بلگرام یعنی مؤلف کے وطن سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس کتاب کی تالیف میں مؤلف نے متعدد کتابوں سے مدد لی ہے ۔ اکثر شعراء کی زندگی کے متعلق اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔ یہ کتاب معاصر شعراء کے لحاظ سے خاص

طور پر اہم ہے ۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اسے ۱۹۱۲ء میں لاہور سے طبع کرا کے کتابخانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا ۔

۱۸- 'سفینۃ الشعراء'

اس تذکرے کے اصل مؤلف کا نام معلوم نہیں لیکن قرائن سے پتا چلتا ہے کہ وہ آنند رام مخلص کے دوستوں میں سے تھا ۔ یہ تذکرہ ۱۷۴۸ء - ۱۷۵۶ء/۱۱۶۱ھ-۱۱۷۰ھ کے درمیان لکھا گیا اور ظاہراً ناتمام رہ گیا ہے ۔ بعض شعراء کا ذکر دو تین جگہ مکرر آیا ہے ۔ موجودہ نسخے میں جو اصل کتاب کا ایک تہائی ہے، ۶۹۳ شعرای متقدم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ اس کے خاص مآخذ تذکرۂ تقی اوحدی، 'عرفات العاشقین' اور 'تذکرۂ نصیر آبادی' ہیں ۔ ان کے علاوہ مؤلف نے مختلف منابع سے شعراء کے متعلق ضروری معلومات جمع کی ہیں ۔ خصوصاً متاخر شعراء کا ذکر تفصیل سے دیا ہے ۔ افسوس ہے اس کا کوئی کامل نسخہ آج موجود نہیں ۔ اس کا واحد نامکمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتاب خانے، ذخیرۂ کرزن میں موجود ہے ۔

۱۹- 'تذکرۂ بے نظیر'

میر عبد الوہاب متخلص بہ افتخار دولت آبادی نے ۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ میں لکھا ۔ سالِ تالیف اس کے نام سے نکلتا ہے ۔ مؤلف آزاد بلگرامی کے خاص دوستوں میں سے تھا ۔ صفدر جنگ کی ملازمت میں تھا اور دولت آباد میں ۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ میں فوت ہوا ۔

اس تذکرے میں ۱۴۹ ایسے شعراء کا الفبائی ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے جو ۱۶۸۸ء/۱۱۰۰ھ سے ۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ تک ایران یا ہندوستان میں تھے ۔ اگرچہ اکثر شعراء کے حالات مختصر ہیں لیکن ان کی زندگی سے متعلق اکثر مفید اور ضروری معلومات فراہم کر دی گئی ہیں اور اکثر شعراء کا سالِ ولادت یا سالِ وفات بھی دیا گیا ہے ۔ کلام کا انتخاب بھی مفصل ہے ۔ یہ انتخاب مؤلف کے اعلیٰ ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے ۔ مؤلف نے اکثر شعراء کے کلام کا انتخاب خود کیا ہے ۔ تذکرہ نگاری کے اصولوں کی رو سے اس تذکرے کو فارسی کے بہترین تذکروں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ ۱۹۴۰ء میں الہ آباد (سینٹ ہاؤس) سے شائع ہوا ۔

۲۰۔ 'مقالات الشعراء'۔

قیام الدین حیرت نے یہ تذکرہ ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ میں تالیف کیا۔ اس کے نام سے اس کا سالِ تالیف نکلتا ہے۔ اس میں ۱۵۰ ان شعرای متأخر کا ذکر موجود ہے جو اورنگ زیب سے عالمگیر ثانی کے وقت تک ہندوستان میں تھے۔ اکثر شعراء کا حال والہ، آرزو اور شوق کے تذکروں سے لیا گیا ہے اور صرف بعض کا کلام خود انتخاب کر کے دیا ہے۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

۲۱۔ 'باغِ معانی'

نقش علی نے ۱۷۶۰ء/۱۱۷۴ھ میں تالیف کیا۔ اس کا سالِ تالیف اس کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ آج موجود نہیں۔ اشپرنگر کے خیال میں یہ کتاب تین چار بڑی جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کا ایک نسخہ جو کتابخانہ بانکی پور میں موجود ہے، اس کا دفتر سوم ہے جس میں پندرھویں صدی عیسوی/نویں صدی ہجری سے مؤلف کے زمانے تک کے شعراء الفبائی ترتیب سے مذکور ہیں۔ اکثر شعراء کے حالات اور اشعار مختصر دیے ہیں۔ اس کے ایک نسخے کا ریو نے بھی اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے۔

۲۲۔ 'تذکرۂ شاعرات'

مؤلف کا نام معلوم نہیں۔ متنِ کتاب سے پتا چلتا ہے کہ یہ ۱۷۶۰ء/۱۱۷۴ھ کی تالیف ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں 'مرآت الخیال'، 'ریاض الشعراء'، 'مجالس النفائس'، 'تذکرۂ اوحدی'، تاریخِ وصّاف'، 'حبیب السیر' اور 'جواہر العجائب' سے استفادہ کیا ہے۔

اس کا ایک واحد نسخہ جو کتابخانہ پنجاب یونیورسٹی میں ہے، ناقص الاول ہے۔ یہ توتی اتون سے شروع ہو کر ہمدمی پر ختم ہوتا ہے اور اس میں کل ۳۹ فارسی شاعرات کا ذکر ہے۔ اکثر شاعرات کا حال اگرچہ مختصر ہے لیکن مؤلف نے کوشش کی ہے کہ ان کے متعلق ضروری معلومات جمع کر دے۔ کلام اکثر شاعرات کا مفصل دیا ہے۔ مؤلف کوئی ہندوستانی معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ کاملہ بیگم کے ذیل میں اس کی ایک رباعی پر والہ (مؤلفِ ریاض الشعراء) کے متعلق کہ ''این رباعی اغلب از سلیمہ بیگم باشد چہ در

ہندوستان زبانِ فارسی را مردان آنجا خوب نمید انند چہ جای زنان ، و در آن زمان رواج فارسی در ہند نبوده ـ'' مؤلف نے لکھا ہے : محاورۂ فارسی در ہندوستان از عہد قطب الدین ایبک و شمس الدین التتمش (معمول شده) است کہ اکثر بلکہ بسایری از مردم خراسان و ماوراء النہر و بلخ و طخارستان (کہ) ہمراه ایشان بودند ، درینجا سکولت ورزیدند ، ایشان ہمان زبان و ہم زبان ہند متکلّم و در آن عہد شعرائی بسیار زبردست از اہلِ ہند بوده اند و از زنان بی بی فاطمہ سام کہ ذکرِ ایشان گذشت در آن عہد بوده ـ''

۲۳ـ 'مقالات الشعراء'

میر غلام علی شیر قانع نے ۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ میں تالیف کیا ـ قانع کا شمار سندھ کے فضلاے وقت میں ہوتا ہے ـ وہ ۱۷۲۷ء/۱۱۴۰ھ میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے ـ ان کے اجداد سندھ میں عالی مراتب پر فائز رہے تھے ـ قانع نے تمام عمر ٹھٹھہ میں تصنیف و تالیف میں گزاری ـ وہ اگرچہ شیعہ تفضیلی تھے لیکن طریقت میں نقشبندی تھے ـ نہایت وسیع النّظر اور غیر متعصّب آدمی تھے ـ چنانچہ خود کہتے ہیں :

چو رافضی نکنم سرد دل بہ بغض کسی ز چار یار درین دہر گرم محفل ما ست

اسی طرح دوسرے مقام پر کہتے ہیں :

نبود عجب بما نشد ار صاف رافضی گو دل ز گرد کینۂ اصحاب شستہ ایم

آخری وقت تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور مرنے سے ایک سال قبل انہوں نے تین ضخیم کتابیں تالیف کیں ـ آخر ۶۳ سال کی عمر میں ۱۷۸۸ء/۱۲۰۳ھ میں اپنے وطن ٹھٹھہ میں فوت ہوئے ـ انہوں نے نظم و نثر میں متعدّد کتابیں لکھی ہیں جن میں چند دیوان ، مثنویاں ، 'تحفۃ الکرام' (تاریخ عمومی مخصوصاً تاریخِ سندھ تین جلدوں میں) ، 'تاریخِ عباسیہ' دو کتابیں نظم و نثر میں (جو نامکمل رہ گئیں) وغیرہ شامل ہیں ـ

مؤلف نے اس تذکرے کی تالیف میں 'یدِ بیضا' ، 'منتخب التواریخ' ، 'تاریخِ معصومی' ، 'اکبر نامہ' ، 'واقعاتِ تیموری' ، 'مجالس المومنین' ، 'تاریخِ غیاث الدین ہروی' ، 'لطائف الظرائف' ، 'تاریخ نظامی' وغیرہ سے مدد لی ہے ـ

اس تذکرے میں ۷۱۹ شعراء کا ذکر ہے جن کا کسی نہ کسی طرح سندھ سے تعلق

تھا - اکثر شعراء کا حال اور منتخب کلام مختصر دیا گیا ہے - مؤلف کو تاریخ گوئی سے خاص لگاؤ تھا ، چنانچہ بہت سے شعراء کے ذیل میں وہ قطعات تاریخ دیے ہیں جو انہوں نے دوسروں کے لئے یا دوسروں نے ان کے لئے کہے ہیں - مؤلف نے شعراء کے ایسے اشعار کو خاص طور سے انتخاب کیا ہے جن میں صنائع لفظی یا معنوی ہوں - بعض شعراء کے ذیل میں ان کی نثر کے بھی نمونے دیے ہیں -

یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے ۱۹۵۷ء میں پیر حسام الدین راشدی صاحب کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ بطرزِ احسن طبع ہوئی -

۲۴- 'سفینۂ عشرت'

درگا داس نے ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں تالیف کیا - اس کے نام سے سالِ تالیف نکلتا ہے - اس کا ایک واحد نسخہ 'کتابخانہ' بانکی پور میں ہے جو ناقص الآخر ہے - اس میں کل ۱۵۵ شعرای متقدّم و متاخر کا حال اور کلام البنانی ترتیب سے دیا ہے - اکثر شعراء کے حالات اور اشعار مفصّل ہیں - خاص طور سے مؤلف کے معاصر شعراء کے حالات اور اشعار تفصیل سے دیے گئے ہیں - سب سے مفصل حالات بیدل کے اور سب سے مفصّل کلام آرزو کا دیا ہے -

۲۵- 'مردمِ دیدہ'

ملاّ عبدالحکیم حاکم لاہوری نے ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں اورنگ آباد دکن میں تالیف کیا - حاکم ، آزاد بلگرامی کے خاص دوستوں میں سے تھا - وہ مراد آباد میں ۱۱۰۲ھ/۱۷۰۸ء میں پیدا ہوا اور آخری مغلوں کے زمانے میں مختلف امراء سے منسلک رہنے کے بعد اورنگ آباد چلا گیا - وہاں کے قیام کے دوران میں اس نے یہ تذکرہ لکھا - ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء میں لھٹہ میں فوت ہوا اور وہیں دفن ہؤا - اس نے عمر کا بیشتر حصّہ پنجاب میں گذارا -

اس تذکرے میں ۶۱ ایسے شعرای متاخّر کا ذکر ہے جن سے مؤلف نے ملاقات کی ہے - یہ کتاب دو ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے - باب اول میں ۱۸ شاعروں کا حال ہے - آرزو کے تذکرے سے من و عن نقل کیا گیا ہے ، البتہ بعض شعراء کے حالات اپنی طرف سے بھی اضافہ کئے ہیں - خاص طور سے ملاحظہ ہوں : آفریں ، آزاد ، امید ، آرزو ، حزیں ، راغؔ ، درد ، عظیم ، فقیر ، متیں ، منصف ، معجز ، والہ ، وجدان ، وفا اور واقف کے حالات -

باب دوم میں بھی شکفرونہ کا ذکر ہے جو آرزو کے تذکرے میں نہیں ہیں ۔ خاتمے میں ان کے حالات کے علاوہ اپنے چند بزرگوں کے حالات بھی دیے ہیں ، جو صوفی تھے مگر شاعر نہیں تھے ۔ حاکم نے دیباچے میں شکایت کی ہے کہ آرزو نے اپنے تذکرے میں بعض (پنجابی) شعراء کا ذکر نہیں کیا ہے ، چنانچہ خود اس نے باب دوم کے تحت ان شعراء کا ذکر کردیا ہے ۔

اس تذکرے کو 'مجمع النفائس آرزو' کا تکملہ کہنا چاہیے ۔ باب اول میں مؤلف نے بعض شعراء کے حالات اور کلام میں ، آرزو کے دیے ہوئے حالات اور کلام پر کچھ اضافہ کیا ہے ورنہ اکثر معلومات اور اشعار آرزو کے تذکرے ہی سے ماخوذ ہیں ۔ باب دوم میں شعراء کا کلام خود انتخاب کرکے دیا ہے لیکن ان کے حالات مختصر اور ناکافی دیے ہیں ۔

یہ کتاب پنجابی ادبی اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئی ۔

۲۶۔ 'خزانۂ عامرہ'

یہ عام تذکرہ آزاد بلگرامی کا تیسرا تذکرہ ہے جو انھوں نے ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں اورنگ آباد دکن میں تالیف کیا ۔ (ان کے دوسرے دو تذکروں 'ید بیضا اور 'سرو آزاد' کا ذکر پہلے آ چکا ہے) ۔ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں تقریباً ۲۵ کتب تذکرہ و تاریخ و لغت سے استفادہ کیا ہے جن کی فہرست اس نے مقدمۂ کتاب میں دی ہے ۔ علاوہ بریں ۲۶ ایسی کتابیں ہیں جن سے مؤلف نے استفادہ کیا ہے لیکن ان کا نام مقدمے میں نہیں بلکہ خود کتاب کے متن میں دیا ہے ۔

اس تذکرے میں کل ۱۳۵ شعرای متقدم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ شعراء کا کلام خود انتخاب کیا ہے ، اور کسی دوسری جگہ سے نقل نہیں کیا گیا ''الابقدر قلیلی و بناء بر ضرورت'' ۔ شعراء کے دیوان کے انتخاب کے وقت بھی الفبائی ترتیب ملحوظ رکھی ہے ۔ بعض شعراء کے اشعار کی شرح بھی کی ہے مثلاً ملاحظہ ہو نعمت خان عالی کا وہ قطعہ جو اس نے کامگار خان کی ہجو میں کہا ہے ۔

مؤلف نے تقریباً ۸۱ صفحات میں اس زمانے کے اہم تاریخی واقعات بیان کئے ہیں ۔

جو اس زمانے کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ اسی طرح نافض کے ذیل میں محاصرۂ اصفہان اور سلطان حسین اور نادر شاہ کے زمانے کے سیاسی واقعات لکھے ہیں جو تاریخی لحاظ سے اہم اور مفید ہیں ۔ بعض شعراء کے ذکر میں ان کے بعض اشعار کا دوسرے شعراء کے اشعار سے مقابلہ کیا ہے ۔ جگہ جگہ شعراء کے کلام سے اشعار نقل کرتے وقت مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح کی ہے ۔ بعض اشعار کے سلسلے میں تحقیق کرکے ان کے صحیح شعراء کا نام دیا ہے ۔

مؤلّف کو ''تاریخ گوئی'' کا خاص شوق تھا ، چنانچہ متعدد شعراء کے ذیل میں ان کی تاریخ وفات ، جو خود مؤلف یا دوسرے شعراء نے کہی ہے ، دی ہے ۔ بعض شعراء کے تحت جو اعتراضات تذکرہ نویسوں یا دوسرے شعراء نے ان کے بعض اشعار پر کئے ہیں ان کے جوابات دیے ہیں ، مثلاً آرزو کے اعتراضات کا ، جو اس نے حیرتی ، ثونی ، حزین ، حاتم اور سرخوش کے اشعار پر کئے ہیں ، یا ناصر علی ، عاقل اور میر محمد زمان کے اشعار پر شعراء کے اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔ بعض جگہ اہم ادبی موضوعات پر بحث کی ہے ، مثلاً انوری کے ذیل میں تشبیب ، نسیب ، حسنِ طلب ، مقطع ، ضمیر شاعر کے بیان میں ، بحورِ عربی و فارسی ۔ عرفی شیرازی کے ذیل میں ہای مختفی ۔ علی سرہندی کے ذکر میں قاعدۂ جمل ۔ نعمت خان عالی کے بیان میں نواقص شعر ۔ نظامی کے تحت ''انینا النکار'' پر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ اسی طرح شاعر تکّو کے بیان میں بادشاہوں اور امراء کا شعراء کو سونے سے تلوانے کا حال دیا ہے جس سے ان بادشاہوں اور امراء کی سخاوت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

مجموعی طور پر یہ کتاب تذکرہ ، تاریخ اور ادب کے لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے اور کانپور میں ۱۸۷۱ء میں اور مطبع نولکشور میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہو چکی ہے ۔

۲۷۔ 'تذکرۃ الشعراء'

اس کے مؤلف کا نام معلوم نہیں ۔ یہ تقریباً ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ میں تالیف ہوا ۔ اس میں ۲۲۰۰ شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے ۲۸ حدیقہ کے تحت دیا ہے ۔ ہر حدیقے میں ایک حرف دیا گیا ہے اور بالترتیب شعرای متقدم ، متوسّط اور متاخّر کا ذکر ہے ۔ اس کا واحد نسخۂ کتابخانہ باڈلین میں ہے (ملاحظہ ہو فہرست ایتھے ، نسخہ نمبر ۶۹۲) ۔

۲۸۔ 'گلِ رعنا'

لچھمی نرائن ماتھر متخلص بہ شفیق اورنگ آبادی نے ۱۷۶۷ء/۱۱۸۱ھ میں تالیف

کیا ۔ شفیق ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوا اور مدت تک نظام دکن کی ملازمت میں رہا ۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں فوت ہوا ۔ اس نے 'گلِ رعنا' کے علاوہ فارسی شعراء کا تذکرہ 'شامِ غریبان' اور ایک اردو شعرا کا تذکرہ 'چمنستانِ شعراء' بھی لکھا ہے ۔ وہ خاص طور سے ایک مؤرخ کی حیثیت سے مشہور ہے ۔ اس نے 'حقیقت ہای ہندوستان'، و 'تنمیق شگرف'، 'مآثرِ آصفی'، 'مآثرِ حیدری'، 'بساط الغنائم'، 'حالاتِ حیدرآباد' اور 'خلاصۃ الہند' نام کی تاریخیں تالیف کی ہیں ۔

'گلِ رعنا' ہندوستانی شعراء کا تذکرہ ہے ۔ یہ دو فصول پر مشتمل ہے ۔ فصل اول میں مسلمان اور فصل دوم میں ہندو شعراء کا ذکر ہے ۔ اکثر شعراء کے حالاتِ زندگی مختصر لیکن کلام مفصل دیا گیا ہے ۔ مؤلف نے اس کتاب کے دیباچے میں ۲۱۹ کتابوں کے نام دیے ہیں جن سے اس کتاب کی تالیف میں اس نے استفادہ کیا ہے ۔ ان کے علاوہ 'عرفات العاشقین'، 'منتخب التواریخ' اور 'صبحِ صادق' سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ مؤلف نے اپنے استاد آزاد بلگرامی کے حالات اور ان کا منتخب کلام سب سے مفصل دیا ہے ۔ آزاد کے ذیل میں ان کے اقوال اور ادبی لطیفے بھی تفصیل سے دیے ہیں ۔ اکبر کے بیان میں اس کی سیرت پر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ اس کے زمانے میں جو علمی، تحقیقی اور فقہی مذاکرات و مباحث اس کے دربار میں ہوتے تھے، ان کا مفصل بیان دیا ہے ۔ مؤلف نے اکبر کے زمانے کے اہم سوانح اور واقعات بھی دیے ہیں جو معاشرتی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں ۔

یہ تذکرہ معاصر شعراء کے لحاظ سے نہایت اہم ہے کیونکہ مؤلف کے بذاتِ خود اکثر ہم عصر شعراء سے گہرے تعلقات تھے ۔ اس کے علاوہ مؤلف، جو خود مؤرخ ہے، تاریخ اور تذکرے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے ۔ چنانچہ خود لکھتا ہے :

''فرق میان بیاض و تذکرہ این است کہ بیاض تنہا مشتمل بر اشعار بقید نامِ شاعر و بلا قید میباشد و تذکرہ محتوی بر احوال شاعر و ہم بر اشعار او ۔ تذکرہ نویسان کہ بالا مذکور شدند ازینہا نوعی کہ حضرت آزاد مدظلہ العالی در ضبطِ احوال موزونان یعنی تاریخ ولادت و وفات و نسب و حسب و دیگر آثار اہتمام دارند ہیچکس ندارد ۔ خوشگو متھرائی کہ باو 'ید بیضا' تذکرۂ اولی حضرت مدظلہ العالی رسیدہ، باری در ضبطِ

احوال تتبّع آنجناب دارد ، حاکم لاہوری از فیض صحبت آنحضرت این طریقہ را بقدر اختیار کردہ باقی تذکرہ ہا اکثر ناقص ۔"

مؤلّف نے میرزا صادق کے حالات ، اس کی تاریخ 'صبح صادق' کے حوالے سے لکھے ہیں اور اس کے سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ اس طرح آزاد ، حکیم اور واقف کے تحت بھی ان کے زمانے کے حالات دیے ہیں اور جن شعراء اور علماء سے انہوں نے ملاقات کی ، اسے تفصیل سے لکھا ہے ۔ اس کتاب میں نواب عماد الملک کے زمانے کے سیاسی حالات بھی مجملاً بیان کیے ہیں جو مؤلّف کے چشم دید ہونے کے سبب خاص تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ۔

'گلِ رعنا' کی فصل اول (جس میں مسلمانوں کا ذکر ہے) ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔ اس کے قلمی نسخے بانکی پور ، انڈیا آفس ، انجمن ترقی اردو کراچی ، پنجاب یونیورسٹی لاہور اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں موجود ہیں ۔ 'فصل دوم' (جس میں ہندوؤں کا ذکر ہے) انجمن ترقی اردو حیدر آباد دکن کی طرف سے شائع ہو چکی ہے ۔

۲۹۔ 'تذکرۂ یوسف علی خان'

یہ عام تذکرہ یوسف علی خان نے ۱۱۸۴/۱۷۷۰ء میں مرشد آباد میں اپنی دوسری کتاب 'حدیقۃ الصفا' کے تکملہ کے طور پر لکھا ۔ اس کتاب کو بھی 'مردم دیدہ' کی طرح 'مجمع النفائس' کا تکملہ کہنا چاہیے ۔ اس میں تقریباً نو سو متقدم و متاخر شعراء کا حال اور منتخب کلام خان آرزو کے تذکرے سے نقل کیا گیا ہے اور تتمّہ کے تحت معاصر شعراء کے حالات اور منتخب اشعار دیے ہیں ۔ اس تذکرے کی اہمیت بھی اسی تتمّہ سے ہے ۔ ابھی تک طبع نہیں ہوا ۔ اس کے قلمی نسخے باڈلین ، بانکی پور اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانوں میں ہیں ۔

۳۰۔ 'مجموعۂ عشق'

اس تذکرے کو ، جس کے دوسرے نام 'چہار چمن' اور 'باغِ گلہای حسن' ہیں ، شیخ محی الدین قریشی عشق میرٹھی نے ۱۱۸۷/۱۷۷۳ء میں لکھا ۔ اس کا سالِ تالیف 'باغ گلہای حسن' سے نکلتا ہے ۔ اس کا واحد نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں موجود ہے ۔

۳۱- 'لُبِ لباب'

عمر الدین علی نے ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ میں رچرڈ جالسن کی فرمائش پر لکھا - یہ کتاب اصل میں 'ریاض الشعراء' کا خلاصہ ہے - البتّہ بعض حالات جو 'ریاض الشعراء' میں مذکور نہیں ہیں ، اضافہ کر دیے گئے ہیں - اس میں 'ریاض الشعراء' ہی کی الفبائی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے - یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا - اس کے واحد قلمی نسخے کا اینھے کی فہرست میں ذکر ہے (ملاحظہ ہو نمبر ٦٩٥) -

۳۲- 'شامِ غریباں'

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (مؤلف 'گلِ رعنا') نے ۱۷۸۲ء/۱۱۹۷ھ میں تالیف کیا - 'اتمامِ نسخہ' سے اس کا سال تالیف نکلتا ہے - یہ ایسے ۴۸۳ شعراء کا تذکرہ ہے جو ایران سے ہندوستان آئے اور بابر سے محمد شاہ عالم تک کے درباروں میں رہے ، یا دکن میں بہمنی ، نظام شاہی ، عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں سے منسلک رہے - البتہ اس میں بعض ایسے شعراء کا بھی ذکر ہے جن کو کسی دربار میں باریاب ہونے کا موقع نہیں ملا - ان میں بعض شعراء ہندوستان ہی میں رہ گئے اور بعض ایران واپس چلے گئے - لیکن اس تذکرے میں تمام ایسے شعراء کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایک کثیر تعداد ایسے شعرا کی ہے جو ایران سے ہندوستان آئے اور یہاں کے شاہی درباروں سے منسلک رہے لیکن اس کا ذکر اس تذکرے میں نہیں آیا - مؤلف نے جن کتبِ تاریخ و تذکرہ سے اس کتاب کی تالیف میں استفادہ کیا ہے ، ان کا حوالہ نہایت ایمانداری سے دیا ہے - دوسری کتب کے علاوہ اس میں کہیں کہیں 'مرآتِ واردات' تالیفِ شاہ محمد شفیع نکینوی کا حوالہ بھی ملتا ہے - اس تذکرے کا ذکر کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا - اس لیے جو معلومات شفیق نے اس کتاب سے لی ہیں وہ کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں - ظاہراً یہ کتاب آج ناپید ہو چکی ہے -

تذکرے کے خاتمے پر شفیق نے اپنے استاد آزاد بلگرامی کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے کلام کا بھی نہایت مفصل انتخاب دیا ہے - اس تذکرے کے کل شعراء میں سے ۳۳ شعراء کا کلام خود شفیق نے انتخاب کیا ہے اور بعض کا آزاد بلگرامی کے تذکروں سے نقل کیا ہے - ان کے حالات کی عبارت بھی آزاد کی عبارت

سے مشابہت رکھتی ہے ۔ 'شام غریبان' کا آغاز حضرت آدم[ؑ] کے ذکر سے ہوتا ہے اور مؤلف نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ جنت سے نکالے جانے کے بعد وہ پہلے ہندوستان آئے ۔ اس سلسلے میں شفیق نے مختلف مذاہب سے روایات دی ہیں ۔ مؤلف نے متعدد شعراء کا سال وفات اور ان کے معاصر شعراء کی کہی ہوئی تاریخ ہائے وفات دی ہیں ۔ ردیف 'ب' میں صرف بیدل کا ذکر ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں تمام تذکرے اس بات سے متفق ہیں کہ بیدل عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے ، صاحب 'مرآت واردات' لکھتا ہے :

''طائر خوشنوای مرزا از گلستان عدم در اکبر نگر عرف راج محل از ممالک بنگالہ پر کشود و مدتی در آن سرزمین معاش بجمعیت بسر برد و در کمال جوانی رو بہ ہندوستان آورد و نعمت در صحبت میرزا سلیمان ، خالوی حقیقی سلطان محمد معز الدین خلف شاہ عالم بن عالمگیر سالہا بسر برد ، بعد فوت میرزا سلیمان در سلک ملازمان اعظم شاہ بن عالمگیر . . . . منسلک گشتہ بیت الغزل دیوان اعتبار گردید ۔''

'مرآت واردات' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اس کے مؤلف کے ساتھ ڈیڑھ سال تک مقیم رہے ہیں ، لہٰذا بیدل سے متعلق اس کے بیانات کو غلط نہیں کہا جا سکتا ۔

شفیق نے اس کتاب میں مختلف تذکرہ نگاروں کے بیانات پر تنقید کی ہے ۔ بعض الفاظ کی تحقیق پر بحث کی ہے اور کہیں معانی اور بیان کی نزاکتوں پر اپنی رائے دی ہے ۔ اس لیے اس کے علم و فضل کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

شفیق نے بعض شعراء کی قبروں کی جگہ بھی بتائی ہے ۔ چنانچہ سلیم کے متعلق لکھتا ہے :

''(سلیم) در دامن کوہی کہ مشہور بہ تخت سلیمان است مشرف بہ تالاب دل بہ فتح دال مہملہ مدفون گردید ۔''

اسی طرح طغرای مشہدی کے متعلق لکھتا ہے کہ :

''نزدیک قبر ابو طالب کلیم مدفون گشت ۔''

البتہ عجیب بات ہے کہ قدسی کا مزار لاہور میں بتایا جاتا ہے جب کہ غنی کشمیری کے

ایک قطعۂ تاریخ میں ، جو 'سروِ آزاد' میں موجود ہے ، اس کے ایک مصرع :

''گشتہ الد این ہر سہ در یکجا مقیم''

سے پتا چلتا ہے کہ قدسی ، سلیم اور کلیم کا مدفن ایک جگہ ہے ۔ اسی طرح بعض دوسرے شعراء کے متعلق بھی بعض مفید اور اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔ مؤلّف نے یہ تذکرہ نواب آصف الدولہ والیٔ حیدر آباد دکن کے نام معنون کیا ہے اور سہ ماہی 'اردو' میں بالاقساط محمد اکبر الدین صدیقی کی ترتیب و تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع ہؤا ہے ۔

۳۳۔ 'انیس الاحباء'

معاصر شعراء کا یہ تذکرہ موہن لعل انیس نے ، جو میرزا فاخر مکین کے شاگردوں میں تھا ، ۱۷۸۲ء/۱۱۹۷ھ میں لکھا ۔ اس میں مکین کے استاد عظیمائی اکسیر اصفہانی کے علاوہ صرف مکین کے شاگردوں کا ذکر ہے ۔ بابِ اول میں ۳۳ مسلمان شعراء اور بابِ دوم میں ۶ ہندو شعراء کا ذکر کیا گیا ہے ۔ البتّہ جن شعراء نے شروع میں مکین سے اصلاح لےکر بعد میں چھوڑ دیا ان کا ذکر نہیں کیا ۔ بعض شعراء کے ذیل میں اس زمانے کے تاریخی وقائع کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اکثر شعراء کے حالات اور کلام کے سلسلے میں اختصار سے کام لیا ہے ۔ صرف اپنے اور اپنے استاد کے حالات اور ناطق ، ذہین ، ساکن ، والی ، رہین اور راغب کے اشعار سب سے زیادہ مفصّل دیے ہیں ۔ اس تذکرے سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے تک لکھنؤ اور اس کے مضافات میں فارسی شاعری کا کس قدر رواج تھا کہ تنہا مکین کے شاگردوں کی تعداد اسی تھی ۔ ان شعراء میں سے ا نفر کا ذکر کسی دوسرے تذکرے میں نہیں ملتا ۔ یہ تذکرہ ابھی تک طبع نہیں ہؤا ۔ اس کے قلمی نسخے بانکی پور ، مجلس تہران اور برٹش میوزیم کے کتاب خانوں میں موجود ہیں ۔

۳۴۔ 'خلاصة الکلام'

مثنوی گو شعراء کا یہ تذکرہ علی ابراہیم خان خلیل نے ۱۷۸۴ء/۱۱۹۸ھ میں مکمل کیا ۔ خلیل اپنے وقت کے مشہور فضلاء میں سے تھے ۔ وہ مدّت تک میر قاسم مظفر جنگ اور انگریزوں کی ملازمت میں رہے ۔ تمام عمر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے ۔ آخر ۱۷۹۳ء میں بنارس میں فوت ہوئے ۔ خلیل نے اس تذکرے کے علاوہ اردو شعراء کا ایک تذکرہ 'گلزارِ ابراہیم' اور فارسی شعراء کا تذکرہ 'صحفِ ابراہیم' لکھا ہے ۔ ان کی کتاب

'وقائع جنگِ مرہٹہ' تاریخی لحاظ سے نہایت اہم ہے ۔

'خلاصة الکلام' میں ۸۷ ایسے شعراء کا الفبائی ترتیب سے ذکر ہے جنھوں نے مثنویاں لکھی ہیں ۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد میں تقریباً ڈھائی ہزار صفحے ہیں ۔ اس سے اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ خلیل نے تیرہ ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جس سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے ۔ ان میں تقریباً تمام اہم فارسی تذکرے شامل ہیں ۔ اگرچہ شعراء کے حالات مختصر دیے ہیں لیکن ان کی زندگی سے متعلق اکثر ضروری معلومات بہم پہنچا دی ہیں ، البتہ شعراء کا کلام نہایت مفصل دیا ہے ۔ اس تذکرے میں بعض ایسی مثنویوں کا ذکر موجود ہے جو آج نمعیاب یا بالکل نایاب ہوچکی ہیں ۔ مثلاً 'زاد المسافرین' ، 'ساقی نامہ' ادھم' ، 'ساقی نامہ' رضا' ، معراج الخیال تجلی' ، 'طوطی نامہ' حامد لاہوری' اور ثابت ، آشنا ، ابراہیم دہلوی ، جنوں ، خواجو کرمانی اور داعی کی مثنویاں اور آرزو کی مثنوی 'جوش و خروش' ۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔ اس کے قلمی نسخے بانکی پور ، باڈلین اور لینڈزیانا کی فہرستوں میں مذکور ہیں ۔

۳۵۔ 'عقدِ ثریا'

یہ تذکرہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی نے ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں لکھا ہے ۔ مصحفی اپنے وقت کے اردو کے زبردست استاد تھے ۔ انہوں نے اس کتاب کے علاوہ 'تذکرۂ فارسی گویان' (جس میں تقریباً تمام شعراء کا اردو کلام دیا ہے) اور اردو شعراء کے دو تذکرے 'تذکرۂ ہندی' اور 'ریاض الفصحاء' بھی لکھے ہیں ۔ امروہے میں پیدا ہوئے اور عنفوانِ شباب ہی میں دہلی چلے گئے ، جہاں وہ مدت تک رہے ۔ وہاں کے حالات خراب ہونے پر لکھنؤ چلے گئے جہاں تقریباً ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں فوت ہوئے ۔

اس مختصر سے تذکرے میں ۱۳۷ معاصر شعراء کا ذکر ہے جو محمد شاہ کے زمانے سے شاہ عالم تک ہندوستان میں تھے ۔ بعض شعراء کا صرف ایک دو جملے میں تعارف کرایا ہے اور ان کے اشعار بالکل نہیں دیے ۔ یہ تذکرہ سفینہ کی طرح بالکل مختصر ہے ۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ اس میں اس زمانے کے بعض ایسے شعراء کے نام اور چند شعر محفوظ ہیں جو دوسرے تذکروں میں نہیں ملتے ۔ یہ تذکرہ ۱۹۳۴ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے ۔

۳۶- 'تکملۃ الشعراء'

محمد قدرت اللہ شوق نے ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء کے بعد لکھا ۔ اس کے علاوہ اس نے اردو شعراء کے دو تذکرے 'حقیقت الشعراء' اور 'طبقات الشعراء' لکھے ہیں ۔ اس تذکرے کے مقالۂ اول میں عرب شعراء اور مقالۂ دوم میں شعرای عجم کا ذکر ہے ۔ اکثر مطالب دوسرے تذکروں سے ماخوذ ہیں ۔ اس کا واحد قلمی نسخہ کتاب خانۂ رضا رام پور میں موجود ہے ۔

۳۷- 'صحفِ ابراہیم'

یہ علی ابراہیم خان خلیل کا دوسرا فارسی تذکرہ ہے جو انہوں نے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں بنارس میں ساٹھ سال کی عمر میں لکھا ۔ اس میں ۳۲۷۸ شعرای متقدّم و متوسّط و متاخّر کا ذکر ہے ۔ تعداد کے لحاظ سے یہ فارسی کا سب سے بڑا تذکرہ ہے ۔ اس تذکرے کی تالیف میں مؤلف نے ۲۶ معتبر کتبِ تاریخ و تذکرہ سے استفادہ کیا اور شعراء کا کلام مختلف اصنافِ سخن سے دیا ہے ۔ ہر شاعر کے حالات اچھی طرح تحقیق و تدقیق کے بعد لکھے ہیں ۔ البتہ شعراء کے مصائب بیان کرنے سے پرہیز کیا ہے ۔ یہ تذکرہ جامعیّتِ مطالب ، تحقیق اور تاریخی حیثیت سے نہایت اہمیت کا حامل ہے ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ اس کے قلمی نسخے بانکی پور اور بعض ذاتی کتب خانوں میں موجود ہیں ۔

۳۸- 'خلاصۃ الافکار'

عام شعراء کا یہ تذکرہ ابوطالب خان تبریزی اصفہانی نے ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں مکمل کیا ۔ مؤلف لکھنؤ میں پیدا ہوا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں رہا ۔ ۱۷۹۹ء میں یورپ گیا جہاں کی سیاحت کا حال اس نے 'مسیرِ طالبی' میں لکھا ہے ۔

اس تذکرے میں ۲۹۴ شعرای متقدّم و متاخّر کا ذکر کیا ہے جو اس نے مختلف کتبِ تذکرہ و تاریخ سے تحقیق کر کے حاصل کیا ہے ۔ بعض شعراء کے ذیل میں ان کی نثر کے نمونے بھی دیے ہیں ۔ اپنے پانچ رسالے اخلاق ، موسیقی ، عروض و قافیہ ، فنونِ خمسہ ، طب و تاریخ بر اور 'لب السیر' و 'جہاں نما' دئیے ہیں ۔ آخری رسالے تاریخ و جغرافیہ کے لحاظ سے نہایت مفید ہیں ۔ ابوطالب خاں کو ''تاریخ گوئی'' سے بہت دلچسپی تھی ، چنانچہ اس تذکرے میں اپنے اور دوسرے شعراء کے کہے ہوئے قطعات تاریخ دیے ہیں ۔ بیدل اور

خسرو کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہندوستان سے باہر پیدا ہوئے اور ہندوستان میں نشوونما ہوئی ، البتہ مسعود سعد سلمان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوا ۔ اس نے ارزو کے بعض بیانات پر بہت سخت تنقید کی ہے ۔ اس کے بعض بیانات سے ہندوستانی ایرانی تعصّب کی بو آتی ہے ۔

تذکرہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ اس کے قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی ، باڈلین اور بانکی پور کے کتابخانوں اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں ۔

۳۹- 'تذکرۂ نوبہار'

محمد رفیع الدین نے ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں لکھا ۔ اس مختصر سے تذکرے میں ۶۱ ایسے شعرای متقدّم و متاخّر کا ذکر ہے کہ ''چاشنئی عرفان بمذاقِ جانِ ایشان رسیدہ'' لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ اس میں خاقانی ، سعدی اور فردوسی کا ذکر ہے مگر سنائی ، عطار ، رومی اور جامی کا ذکر نہیں ۔ مؤلف نے شعراء کا حال دوسرے تذکروں سے جمع کیا ہے ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہے ۔

۴۰- 'مخزن الغرائب'

شیخ احمد علی ہاشمی سندیلوی نے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں لکھا ۔ اس میں ۳۱۳۰ فارسی شعرای متقدّم و متاخّر کا ذکر ہے ۔ جامعیت کے لحاظ سے یہ تذکرہ 'صحفِ ابراہیم' کے بعد آتا ہے ۔ شعراء کے حالات اور کلام کا ماخذ مختلف تذکرے ہیں ۔ شعراء کے حالات مختصر ہیں اور اکثر شعرای متقدّم کا نمونۂ کلام مختصر ہے ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ قلمی نسخے بانکی پور ، برٹش میوزیم ، پنجاب یونیورسٹی لاہور اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتاب خانوں میں موجود ہیں ۔

۴۱- 'سفینۂ ہندی'

بھگوان داس ہندی نے ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں لکھا ۔ اس میں شاہ عالم کی تخت نشینی (۱۷۵۹ء) سے تالیفِ کتاب کے وقت تک کے شعراء کا ذکر ہے ۔ اس میں چند معاصر ہندو شعراء کا بھی ذکر ہے ۔ اکثر شعراء کے حالات مختصر ہیں ۔ مؤلّف نے شیخ حزین سے غیر معمولی عقیدت کا اظہار کیا ہے ۔ اکثر شعراء سے مؤلّف نے ملاقات کی

لہذا ان کے متعلق اس کے بیانات قابلِ اعتماد ہیں ۔ یہ تذکرہ پٹنہ سے سید شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی کی تصحیح سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ۔

۴۲۔ 'طبقاتِ سخن'

شیخ غلام محی الدین قریشی میرٹھی کا یہ دوسرا تذکرہ ہے ۔ اس میں طبقۂ اول میں شعرای اردو اور طبقۂ دوم میں معاصر فارسی شعراء کا ذکر ہے ۔ اس کا ذکر اشپرنگر اور برلن کی فہرستوں میں آیا ہے ۔

۴۳۔ 'تذکرۂ کاتب'

میرزا محمد علی کاتب صفوی نے ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں سلطان صفوی کی فرمائش پر لکھا جو 'کتابِ مخزن الغرائب' کا خلاصہ ہے ۔ شعراء کے حالات اور کلام مختصر ہیں ۔ جو تقریباً تمام تر 'مخزن الغرائب' سے ماخوذ ہیں ۔ اس کا واحد قلمی نسخہ رامپور کی رضا لائبریری میں ہے ۔

۴۴۔ 'ریاض الوفاق'

ذوالفقار علی مست نے ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ میں بنارس میں لکھا ، جس میں بنارس اور کلکتہ کے ۱۴۲ شعراء کا ذکر ہے ۔ یہ فارسی شاعری کی تاریخ کے لحاظ سے اہم ہے ، کیونکہ جن شعراء کا ذکر اس میں آیا ہے ان کے نام اکثر دوسرے تذکروں میں نہیں ملتے ۔ اس کا ذکر اشپرنگر اور برلن کی فہرستوں میں ملتا ہے ۔

۴۵۔ 'نشترِ عشق'

آقا حسین قلی خان عشق عظیم آبادی نے ۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ میں مکمل کیا ۔ اس میں ۱۴۷۰ شعرای متقدم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ اکثر شعراء کا انتخاب غزل اور رباعی سے دیا ہے ۔ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں ۳۲ مختلف کتبِ تذکرہ و تاریخ و لغت سے استفادہ کیا جن کا نام دیباچے میں دیا ہے ۔ تذکرہ بہت مفصل ہے اور سینکڑوں شعراء کا کلام اور ان کے حالات تفصیل سے دیے ہیں ۔ خاص طور سے معاصر شعراء کا حال اور کلام بہت مفصل ہے ۔ فارسی تذکروں میں یہ ایک اہم مقام کا حامل ہے ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ اس کے قلمی نسخے بانکی پور ، رامپور اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتابخانوں میں ہیں ۔

۴۶۔ 'انیس العاشقین'

کنور رتن سنگھ زخمی نے ۱۲۳۹/۱۸۲۴ء یا ۱۲۴۴/۱۸۲۹ء میں لکھا ۔ مؤلف کا خاندان کئی پشت سے شاہانِ اودھ کی ملازمت میں تھا ۔ وہ ۱۱۹۷/۱۷۸۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوا اور ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر و سیاحت کرتا رہا ۔ کچھ مدت تک شاہانِ اودھ کی خدمت میں رہا ۔ ۱۲۶۳/۱۸۴۶ء میں مسلمان ہوگیا ۔

اس تذکرے میں دو ہزار سے زیادہ شعرای متقدم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا ہے ۔ اکثر شعراء کا حال اوو کلام مختصر ہے ۔ بعض شعراء کے ذیل میں دلچسپ ادبی حکایات دی ہیں ۔ اکثر شعراء کا کلام غزلیات اور رباعیات سے دیا ہے اور قصیدہ اور اور مثنوی کے اشعار دیے ہیں ۔

یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ (جلد اول) کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی لاہور اور (جلد دوم) گوری پرساد (ماتا پرشاد) لکھنؤ کے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے ۔

۴۷۔ 'گلدستۂ کرناٹک'

غلام علی موسیٰ رضا رایق نے ۱۲۱۰/۱۷۹۵ء میں شروع کر کے ۱۸۳۲/۱۲۴۸ء میں مکمل کیا ۔ رائق ۱۱۸۰/۱۷۶۶ء میں ارکاٹ میں پیدا ہوا اور کرناٹک کے نوابوں کی ملازمت میں رہا ۔ ۱۲۴۸/۱۸۳۲ء میں فوت ہوا ۔ اس تذکرے میں ۱۷۰ ایسے شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے جو انیسویں صدی عیسوی میں کرناٹک میں تھے ۔ تمام شعراء اس کے ہم عصر تھے اور مؤلف تقریباً سب سے واقف تھا ، لہذا اس کی معلومات اہم اور قابلِ اعتماد ہیں ۔ تذکرہ مدراس سے شائع ہوا ۔

۴۸۔ 'محکِ شعراء'

محمد صالح شاملوی خراسانی نے ۱۲۵۲/۱۸۳۶ء میں حیدرآباد (سندھ) میں تالیف کیا ۔ اس میں ۱۸۱ شعراء کا تذکرہ ہے جن میں فتح علی شاہ قاچار (۱۷۹۷ء - ۱۸۳۴ء/ ۱۲۱۲ - ۱۲۶۰ھ) اور اس کے امراء ، شاہزادگان اور اس کے ہم عصر شعراء شامل ہیں ۔ مؤلف نے عبارت آرائی سے کام لیا ہے اور اکثر ضروری معلومات بہم نہیں پہنچائیں ۔ اکثر شعراء کا ذکر دوسرے معاصر تذکروں میں موجود ہے ۔ ایرانی شعراء کے علاوہ اس نے چند

ہم عصر ہندوستانی شعراء فطرت مازندرانی ، نصرت خان دکنی ، آزاد کشمیری ، نورالعین واقف ، ہادی بیگ شائق ، برہان قلی لکھنوی ، میر محمد حسین لکھنوی ، میرزا فاخر شاہ جہان آبادی اور علی نقی خان لاہوری کا بھی ذکر کیا ہے ۔ تذکرے کا ذکر کسی فہرست میں نہیں ۔ اس کا واحد نسخہ (جس میں دیباچہ نامکمل رہ گیا ہے) کتابخانۂ ملک تہران میں ہے ۔

۴۹۔ 'معراج الخیال'

وزیر علی عبرتی نے ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ میں تالیف کیا ۔ عبرتی عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے ۔ نواب شوکت جنگ ، تہوّر جنگ اور راجا بھوپ سنگھ کی ملازمت میں رہے ۔ اس تذکرے کے علاوہ عبرتی نے متعدد کتابیں فارسی نثر میں لکھی ہیں ۔ ان کا دوسرا تذکرہ جس میں فارسی نثر نگاروں کا ذکر ہے ، 'ریاض الافکار' کے نام سے ہے ۔ ایک کتاب 'جامِ جہاں نما' کے نام سے ہندوستان کی تاریخ ہے جس میں انگریزوں کی ہندوستان تک آمد سے ان کے کامل تسلّط تک کے واقعات درج ہیں ۔

اس تذکرے میں ۲۰۵ شعرائے متقدّم و متوّسط و متاخّر کا ذکر الفبائی ترتیب سے ۲۸ انجمن کے تحت دیا گیا ہے ۔ ہر انجمن میں ایک حرف شامل ہے ۔ جیسا کہ مؤلف نے دیباچے میں لکھا ہے ، اس کتاب کی تالیف میں 'نشترِ عشق' ، سروِ آزاد' ، 'یدِ بیضا' ، 'طبقات الشعرا' 'آتش کدۂ آذر' اور 'ریاض الشعرا' سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ ان کے علاوہ جیسا کہ کتاب کے متن سے ظاہر ہوتا ہے ، اس نے 'مرآت الخیال' ، 'صحائفِ شرائف' ، 'تذکرۂ دولت شاہ' ، اور 'تذکرۂ تحفۂ سامی' ، سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ یہ تذکرہ طبع نہیں ہوا ۔ ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتاب خانے میں اور ایک ایوانو کرزن کی فہرست میں دیا گیا ہے ۔

۵۰۔ 'صبحِ وطن'

نواب محمد غوث متخلص بہ اعظم نے ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ میں مکمل کیا ۔ اعظم نے دوسرا تذکرہ 'گلزار اعظم' کے نام سے لکھا ہے ۔ 'صبحِ وطن' میں ۹۲ شعرای مدراس کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ مؤلف نے بعض معلومات کو 'گلدستۂ کرناٹک' سے نقل کیا ہے ۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ میں مدراس سے شائع ہوا ۔

۵۱- 'نتائج الافکار'

محمد قدرت اللہ خان گوپاموی متخلص بہ قدرت نے ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا - ''ہدیۂ بارگاہِ اعظم'' سے اس کا سالِ تالیف نکلتا ہے - یہ ایک عام شعراء کا تذکرہ ہے جس میں ۵۲۹ شعرائے متقدّم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے - مؤلف نے ہر شاعر کے حالات مختلف تذکروں سے تحقیق کر کے جمع کئے ہیں - بعض ایسے شعراء کا بھی ذکر ہے جو دوسرے تذکروں میں نہیں - ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ میں مدراس سے شائع ہوا -

۵۲ - 'نغمۂ عندلیب'

محمد رضا نجم طباطبائی نے ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں واجد علی شاہ کے نام لکھا - مؤلف پٹنے میں پیدا ہوا اور آخری ایام لکھنؤ میں گزارے - اس کے علاوہ اس نے چند کتابیں ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیے پر بھی لکھی ہیں، جو سب اس کی ایک بڑی کتاب ''بحر الذخّار'' کا جزو ہیں -

'نغمۂ عندلیب' میں دو روضے ہیں - روضۂ اول میں فارسی قواعد، شعراء کی اقسام، صنائع، قافیہ اور ردیف پر بحث کی گئی ہے - اس کے بعد تقریباً ۵۰۴ شعرائے متقدّم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے - اس میں صرف وہ حصہ، جو مؤلف کے ہم عصر شعراء پر مشتمل ہے، خاص اہمیت کا حامل ہے - 'روضۂ دوم' میں دو حدیقے ہیں - حدیقۂ اول میں یونانی موسیقی اور حدیقۂ دوم میں ہندوستانی موسیقی پر بحث کی گئی ہے - کتاب طبع نہیں ہوئی ہے - اس کا ایک قلمی نسخہ ریو کی فہرست میں مذکور ہے (ملاحظہ ہو جلد ۳، صفحہ ۹۷۸ ب) -

۵۳ - 'حدائق الشعراء'

میرزا امیر بیگ بنارسی نے، جو سلاطین اودھ کی ملازمت میں تھا، ۱۷۹۶ء/۱۲۱۱ھ میں لکھا ہے - اس میں ۲۶۰۹ شعرائے متقدّم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے - اس میں مؤلف نے اسامی و تواریخِ تخت نشینی و مدّتِ سلطنتِ شاہان، دورۂ قبل از اسلام سے ایران اور دنیائے اسلام سے متعلق دیے ہیں - اس کے علاوہ ایران کی سات محلی زبانوں پر بحث کی گئی ہے - آخر میں شعراء کے منتخب اشعار بترتیب ردیف دیے

ہیں - کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی - قلمی نسخے ایوانو کرزن اور بوہار کی فہرستوں میں مذکور ہیں -

۵۴- 'خزینۂ الشعراء'

سید علی کبیر المدعو بہ محمد میر نجات نے ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ میں لکھا - اس تذکرے میں ۱۹۰ شعراء کا ذکر ہے جو تقریباً سب ہندی الاصل ہیں - ان میں سے اکثر خوب اللہ اور محقر اللہ آبادی کے شاگرد ہیں - اس کا واحد قلمی نسخہ کتاب خانہ انڈیا آفس میں موجود ہے -

۵۵- 'اشاراتِ بینش'

سید مرتضیٰ بینش نے ۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ میں لکھا - اس کتاب کے نام سے اس کا سالِ تالیف نکلتا ہے - بینش مدراس میں پیدا ہوا ، نواب اعظم کی ملازمت میں رہا ، آخر نجفِ اشرف کی زیارت کے لئے گیا اور وہیں فوت ہوگیا - اس کتاب میں کرناٹک کے ۷۷ ایسے شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ، جو مؤلف کے ہم عصر تھے اور نواب اعظم کی قائم کردہ ''مجلسِ مشاعرہ'' میں شامل تھے - اس میں بعض کے حالات مثلاً بصارت ، ثاقب ، حاجب وغیرہ اور بعض کے اشعار مثلاً ، اعظم ، رونق ، ثاقب ، راغب وغیرہ نسبتاً زیادہ مفصل دیے ہیں - یہ کتاب مدراس سے ۱۸۵۱ء/۱۲۶۸ھ میں شائع ہوئی -

۵۶- 'گلزارِ اعظم'

نواب غوث متخلص بہ اعظم کا دوسرا فارسی تذکرہ ہے جو انہوں نے ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا - اس میں کرناٹک کے ۳۳۴ شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے - اس میں مؤلف نے 'کلمات الشعراء' ، 'مجمع النفائس' ، 'سروِ آزاد' ، 'نتائج الافکار' ، 'مرآت الخیال' ، اور 'گلدستۂ کرناٹک' سے استفادہ کیا ہے - اس میں مذکور شعراء تمام تر مؤلف کے ہم عصر تھے - بعض شعراء کے ذیل میں مؤلف نے واصف کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں جو اس نے 'معدن الجواہر' میں کئے ہیں - اس تذکرے کی خاص اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ صرف کرناٹک میں

ابھی تک اتنے فارسی کے شعراء موجود تھے - یہ کتاب ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں مدراس کے سرکاری پریس میں چھپی ہے -

دیگر تذکرے

اس زمانے میں چند دیگر تذکرے بھی لکھے گئے ہیں جن کی تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں - 'معدن الجواہر' تالیف محمد صالح واصف بسال ۱۸۴۵ء/۱۲۶۲ھ 'ترجمہ مجالس النفائس' از عبدالباقی رضوی باسر نواب غوث (فہرست مدراس نمبر ۴۴۵) ، 'حیات الشعرا' تالیف متین کشمیری ، 'تذکرۂ منیر لاہوری' ، 'تذکرۃ الشعرای وارستہ سیالکوٹی' ، تذکرۃ الشعرای دیدہ معنوی' ، 'باغ ارم' ، 'تذکرہ جوہر بی زری' ، 'آفتاب عالم تاب' ، 'مجمع البلغاء' ، 'تذکرۃ الشعرای سف الدین طبیعت' ، 'سفینۃ الشوق' رای منکہ رای شوق (تقریباً ۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ) میں ، 'حدیقۂ ہندی' بھگوان داس ہندی ، سال ۱۷۸۵ء/۱۲۰۰ھ ، 'تذکرۃ الشعرای تقی لوحدی ملتانی' ، 'مجمع البلغای مائلی' ، 'تحفۃ الشعراء سلطان ابوالفتح صفوی طلوعی' اور 'تذکرۃ النساء' تالیف تقریباً ۱۷۶۸ء/۱۱۸۲ھ - ان میں سے اکثر تذکرے آج ناپید ہیں -

اردو تذکرے

اس دور میں متعدد تذکرے فارسی زبان میں اردو شعراء سے متعلق لکھے گئے ہیں - اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد آہستہ آہستہ مرکزی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی ، اور ملک میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آ گئیں - ایسے حالات کی وجہ سے معاشرے میں بولے ہوئے اردو زبان کی ترویج ہوئی اور فارسی کی ادبی جگہ اردو نے اور سرکاری جگہ انگریزوں کے مکمل تسلط (۱۸۵۷ء) کے بعد انگریزی نے لے لی - اردو شاعری کو اس زمانے میں زبردست فروغ حاصل ہوا - اگرچہ فارسی نظم و نثر کا رواج عام چلا آتا تھا ، لیکن فارسی کو اس سرزمین میں بہرحال زوال آ ہی چکا تھا ، تاہم پرانی ادبی اور علمی روایات کے باعث انیسویں صدی عیسوی کے ربعِ اول تک اردو شعراء کے تمام تذکرے (سوائے 'گلشنِ ہند' کے جو 'گلزار ابراہیم' کا اردو ترجمہ ہے) فارسی ہی میں لکھے گئے - 'نکات الشعرای میر' اور 'گلشنِ گفتار' تالیف حمید اورنگ آبادی سال تکمیل کے اعتبار سے اردو شعراء کے پہلے فارسی تذکرے ہیں ، جو آج بھی موجود ہیں - ورنہ ان سے قبل

اُردو شعراء کے چند دوسرے تذکرے بھی فارسی میں لکھے گئے تھے ، مثلاً خاکسار ، سودا اور آرزو کے تذکرے ۔ اس دور میں عرصے تک اکثر شعراء ذولسانین تھے اور اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے ۔ مثلاً آبرو ، آرزو ، امید ، انجام ، بیدل ، جویا ، درد ، سوز وغیرہ ۔ اس کا اندازہ اس زمانے کے اردو تذکروں کو دیکھ کر بخوبی ہو سکتا ہے ۔ بعض تذکروں میں شاعروں کے دونوں زبانوں کے اشعار دیے ہیں ، مثلاً 'تحفۃ الشعرای قاقشال' اور 'تذکرۂ فارسی مصحفی' ۔ حتّٰی کہ غالب تو اپنی رنگا رنگ فارسی شاعری کے مقابلے میں اُردو شاعری کو بالکل بے رنگ سمجھتے ہیں :

فارسی بین تا بہبینی نقش ہای رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بی رنگِ من است

اُردو شاعری کی طرح اُردو تذکرہ نگاری کو بھی مشاعروں کی وجہ سے بہت فروغ ہوا ۔ ایسی محفلیں خاص طور پر خان آرزو ، درد اور میر کے یہاں اکثر باقاعدہ ہوتی تھیں ، چنانچہ شفیق اورنگ آبادی نے 'چمنستانِ شعراء' میں درد کے ذکر میں لکھا ہے :

''شاہ عبدالحکیم لاہوری می گوید کہ این عزیز بزرگ عالی دودمان (درد) را فقیر مکرر بہ خانۂ خان آرزو روز مراختہ یعنی صحبت ریختہ، گویان ہندی کہ در پانزدہم ہر ماہی مقرر بود دیدہ ام'' ۔

بعد میں آرزو کے یہاں کی محفل درد کے یہاں منعقد ہونے لگی اور پھر وہاں سے میر تقی میر کے یہاں منتقل ہو گئی ۔ آخر مشاعروں کا رواج اس قدر ہوا کہ شہر شہر ، محلہ محلہ اور گھر گھر ادبی محفلیں منعقد ہونے لگیں ۔ اس کے ساتھ لوگوں نے اشعار کے انتخاب کا سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے ''بیاض نگاری'' اور ''گلدستہ نگاری'' کا رواج عام ہوگیا اور یہی آگے چل کر شعراء کے حالات کے اضافے کے ساتھ تذکرہ نگاری کی ابتدا اور بعد میں فروغ کا باعث ہوا ۔

اُردو تذکرہ نگاری کے محرّکات بھی وہی ہیں ، جو فارسی تذکرہ نگاری کے ہیں ، یعنی ایک ادبی یادگار چھوڑ کر ''حیاتِ جاوید'' حاصل کرنے کی انسانی خواہش ۔ اس کے علاوہ ادبی ذوق ، معاصرانہ چشمک ، علاقائی تعصب ، رقابت ، جواب گوئی اور گروہ بندی وغیرہ کا بھی اس میں دخل ہے ۔ بعض تذکرے فارسی تذکروں کے جواب میں لکھے گئے ہیں اور بعض دوسرے اُردو تذکروں کے جواب میں ۔ اُردو شعراء کے تذکروں میں

بعض میں مؤلف نے صرف اپنے حالات اور انتخاب کلام دیا ہے ۔ جیسے 'ذکر میر' اور بعض میں مختلف شعراء کے دواوین سے اشعار انتخاب کر کے دیے ہیں جیسے 'مداحُ الشعرا' ۔ بعض میں مختلف موضوعات پر اشعار کا انتخاب دیا ہے یا مختلف اصناف کے پسندیدہ اشعار دیے ہیں ، جیسے 'گلشنِ گفتار' اور 'مجموعة الانتخاب' ۔ بعض میں صرف مشہور شعراء کو شامل کیا گیا ہے ، جیسے 'گلشنِ بےخار' ، 'مدائح السعراء' ، جب کہ بعض عام شعراء کے تذکرے ہیں ، جیسے 'نکات الشعراء' ، 'مخزن نکات' ، 'تذکرۂ حسن' ، 'تذکرۂ فتوت' 'تذکرۂ شورش' ، گلزارِ ابراہیم' ، 'عیار الشعراء' ، 'عمدۂ منتخبہ' ، 'مجموعۂ نغز' ۔ بعض میں قدیم و جدید دونوں زمانے کے شعراء کا ذکر ہے ، جب کہ بعض میں صرف معاصر شعراء کا ذکر ہے ۔ بعض تذکرے دوسرے تذکروں کے جواب میں لکھے گئے ہیں ، جیسے 'تذکرۂ ریختہ گویان گردیزی' میر کے 'نکات الشعراء' کے جواب میں ۔ بعض تذکروں میں صرف مخصوص علاقے کے شعراء کا ذکر ہے ، جیسے 'مخزن فائق' صرف گجرات کے اور 'گلِ عجائب' صرف سلطنتِ آصفیہ دکن کے شعراء کے لئے ہے ۔ بعض تذکروں کے مقدمے میں علمِ شعر ، علمِ عروض ، تاریخِ ادب اردو اور اردو شاعری کی دوسری فنی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے ۔ جیسے 'دستور الفصاحت' ۔

اس دور کے اردو شعراء کے فارسی تذکروں کا مختصر جائزہ

۱۔ 'نکات الشعراء'

میر تقی میر نے ۱۷۵۲ء/۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا ۔ اس میں سو اردو شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ ریختہ (اردو) کی اسام ، اس کی خصوصیات ، لب و لہجہ اور شعری محاسن وغیرہ پر اجمالی بحث ، سب سے پہلے اسی تذکرے میں آئی ہے ۔ اسی طرح مؤلف کے وہ بیانات جو خاتمۂ کتاب میں ہیں ، اردو شاعری کی تنقیدی تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے مفید مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقیٔ اردو (دکن) سے شائع کیا ہے ۔

۲۔ 'گلشنِ گفتار'

تیس شعرای اردو کے ذکر پر مشتمل خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا مختصر تذکرہ ، تاریخ تالیف ۱۷۵۲ء/۱۱۶۵ھ ، بغیر کسی خاص ترتیب کے مرتب ہوا ۔ اس سے پتا چلتا

ہے کہ اُردو شاعری کی ترقی کے علاوہ دکن میں ادبی تنقید اور تذکرہ نگاری بہت پہلے شروع ہو چکی تھی - سید محمد ایم - اے نے ۱۹۳۱ء میں خورشید پریس سے شائع کیا[1] -

۳- 'تحفۃ الشعراء'

(اس کا ذکر فارسی شعراء کے ذیل میں گذر چکا ہے) یہ فارسی اور اردو شعراء کا تذکرہ ہے - ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد (دکن) سے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا -

۴- 'تذکرۂ ریختہ گویاں'

سید فتح علی گردیزی نے ۱۱۶۶/۱۷۶۳ء میں تالیف کیا - اس میں ۹۸ اردو شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے - معاصر شعراء کے حالات کے سلسلے میں یہ تذکرہ عینی شہادت کا حامل ہے - مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ایک مفصل اور مفید مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے -

۵- 'مخزنِ نکات'

شیخ محمد قیام الدین قائم چاند پوری نے ۱۱۶۸/۱۷۵۵ء میں لکھا - اس میں ۱۱۸ شعرای متقدم ، متوسط و متاخر کا ذکر ، تین طبقہ کے تحت دیا ہے - یہ مختصر تذکرہ شعراء کے حالات کے لحاظ سے مفید اور اہم ہے - اس میں دکن کے شعراء کا حال تفصیل سے دیا ہے - اس تذکرے میں بھی اکثر ایسے شعراء کا ذکر ہے جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے - مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک بسیط مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو دکن سے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا -

۶- 'تذکرۂ ریاض حسنی یا تذکرۂ فتوت'

خواجہ عنایت اللہ فتوت نے ۱۱۶۸/۱۷۵۵ء میں تالیف کیا - ۲۵ صفحات کے دیباچے کے بعد ۱۸۵ شعراء کا مختصر حال الفبائی ترتیب سے مع منتخب کلام دیا گیا ہے ، جن میں سے اکثر اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے - اس میں بہت سے ایسے شعراء کا بھی ذکر ہے جو اس سے پہلے کے تذکروں میں نہیں ملتے - یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا - اس

---

(۱) اس کا اُردو ترجمہ دانش محل لکھنؤ سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے -

کا ایک قلمی نسخہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن میں موجود ہے ۔

۷۔ 'چمنستانِ شعراء'

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے ۱۷۶۱ء/۱۱۷۵ھ میں لکھا ۔ اس میں ۲۱۴ ریختہ گو شعراء کا ذکر ابجد کی رو سے کیا گیا ہے ۔ اشعار کا انتخاب نہایت احتیاط سے دیا ہے اور مشتبہ اشعار کو تذکرے کے آخر میں دے دیا ہے۔ تبصرے کے علاوہ بعض جگہ شعراء کے کلام کی اصلاح بھی کی ہے ۔ تذکرے میں مذکور متعدد شعراء اس دور کے معروف فارسی گو شعراء تھے ۔ جیسے آرزو ، امید ، انجام ، ایجاد ، بیدل ، واقف ، گرامی ، مخلص وغیرہ ۔ مؤلف نے ہندو شعراء کا ذکر خاص طور سے کیا ہے ۔ اسے مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک مفید اور تحقیقی مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد (دکن) سے شائع کیا ۔

۸۔ 'طبقات الشعراء'

قدرت اللہ شوق صدیقی سنبھلی نے ۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ میں تالیف کیا ۔ اس میں ۲۷۳ شعرای اردو گو کا ذکر چار طبقوں کے تحت دیا گیا ہے ۔ اس طرح ریختہ کے موجدین اور دکنی شعراء ، ایہام گو شعراء ، شعرای متاخرین اور نو مشق شعراء کا ذکر آ گیا ہے ۔ مؤلف نے شعراء کے کلام پر تبصرے میں نہایت انصاف سے کام لیا ہے اور بعض معلومات شعراء سے متعلق ایسی فراہم کی ہیں جو سابقہ تذکروں میں نہیں دی گئی ہیں ۔ اپنے زمانے تک سب سے کامل اور ضخیم تذکرہ ہے ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس کا ایک خلاصہ ایک تحقیقی مقدمے کے ساتھ اگست ۱۹۳۸ء میں شائع کیا ۔

۹۔ 'تذکرۂ سخن آفرینانِ ہند'

میر غلام حسین نے ۱۷۷۷ء/۱۱۹۱ھ میں شاہ عالم بادشاہ کے نام تالیف کیا ۔ اس کا قلمی نسخہ ایوانو ، کرزن کی فہرست میں شمارہ ۶۲ کے تحت آیا ہے ۔

۱۰۔ 'تذکرۂ بہارِ بے خزان'

بہاء الدین حسین قلی عروج نے ۱۷۷۸ء/۱۱۹۲ھ سے پہلے لکھا ہے ۔ اس میں ۸۱

شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ قلمی نسخے کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن اور ایوانو کی فہرست (نمبر ۴۰۲) اور ایوانو تکملۂ اول (نمبر ۹۲ے) کے تحت دیے گئے ہیں ۔

۱۱۔ 'تذکرۂ شعرای اردو'

میر حسن دہلوی نے ۱۷۷۴ء اور ۱۷۷۸ء/۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان تالیف کیا ہے ۔ اس میں ۲۹۲ شعرای متقدم ، متوسط و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ حسنِ انتخابِ کلام کے لحاظ سے یہ تذکرہ تمام دوسرے تذکروں سے بہتر ہے ۔ اس کو حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے ایک مفید جامع مقدمے کے ساتھ علی گڑھ سے ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ میں اور پھر مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو (دکن) سے شائع کیا ۔

۱۲۔ 'تذکرۂ شورش'

سید غلام حسین شورش معروف بہ میر بھینسا نے ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں تالیف کیا ۔ اس کا دوسرا نام 'یادگارِ دوستان' ہے ۔ حالات مختصر ہونے کے باوجود جامع ہیں ۔ اس کی جلد اول کلیم الدین احمد نے پٹنہ سے شائع کی ۔

۱۳۔ 'تذکرۂ مسرت افزا'

ابوالحسن امیر الدین احمد المشتہر بہ امیر اللہ آبادی نے ۱۷۷۹ء/۱۱۹۲ھ میں تالیف کیا ۔ اس میں ۲۴۷ ریختہ گو شعراء کا ذکر ہے ۔ معاصرین کے متعلق تفصیلی بحث ملتی ہے ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ اس کا قلمی نسخہ باڈلین کی فہرست (نمبر ۳۸۸) کے تحت درج ہے ۔

۱۴۔ 'گلِ عجائب'

اسد علی خان تمنا اورنگ آبادی نے ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ میں تالیف کیا ۔ اس میں سلطنتِ آصفیہ کے اُن ۱۰۵ ریختہ گو شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے جو بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے اواخر تک بقیدِ حیات تھے ۔ مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو (حیدرآباد دکن) سے شائع کیا ۔

۱۵- 'گلشنِ سخن'

مرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خان مبتلا لکھنوی نے ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ میں لکھا ہے۔ شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام دونوں مختصر ہیں۔ معاصر شعرا کے متعلق مؤلف کی رائے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتابخانۂ رضا رامپور میں ہے۔

۱۶- 'گلزارِ ابراہیم'

علی ابراہیم خان خلیل نے ۱۷۸۴ء/۱۱۹۸ھ میں ترتیب دیا۔ اس میں ۳۲۰ شعرای متقدّم و متاخّر کا ذکر ہے۔ کلام پر رائے دیتے وقت اعتدال اور انصاف سے کام لیا ہے۔ شعراء کی شخصیت اور ان کے معاشرتی مقام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس تذکرے سے اس زمانے کے ادبی اور معاشرتی حالات کا بھی بخوبی پتا چلتا ہے۔ اس تذکرے کو عبداللہ خان نے حیدر آباد دکن سے ۱۹۰۶ء میں 'گلشنِ ہند' کے ساتھ (جو اس کا اردو ترجمہ ہے) مع مقدمات مولوی عبد الحق و محی الدین قادری شائع کرایا۔

۱۷- 'تذکرۂ ہندی گویان'

شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی نے ۱۷۹۵ء/۱۲۰۹ھ میں تالیف کیا۔ اس میں ۱۸۶ شعرا کا الفبائی ترتیب سے اور آخر میں ۵ شاعرات کا ذکر ہے۔ زیادہ تر معاصر شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس میں پہلی دفعہ پانچ عورتوں کا بھی ذکر ہوا ہے۔ اس کو مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۳۳ء میں ایک مبسوط اور مفید مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔

۱۸- 'عیارالشعرا'

خوب چند ذکا نے ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ میں اپنے استاد نصیر کی فرمائش پر لکھا۔ الفبائی ترتیب سے ۱۸۵۱ شعراء کے ذکر پر مشتمل اپنے زمانے تک کا سب سے ضخیم تذکرہ ہے۔ اردو شاعری کی ابتدا سے مؤلف کے زمانے تک کے شعراء شامل ہیں، جن کے حالات نہایت مختصر اور اکثر ضروری معلومات سے عاری ہیں۔ کہیں کہیں تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، پنجاب یونیورسٹی لاہور، بانکی پور، انڈیا آفس، علی گڑھ اور برلن کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

۱۹- 'تذکرۂ عشقی'

شیخ وحید الدین عشقی عظیم آبادی نے ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ میں تالیف کیا۔ اس میں

۳۴۹ شاعروں کا مختصر حال اور نمونۂ کلام الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ صرف حرف ''س'' تک کلیم الدین احمد نے پٹنہ سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔

۲۰- 'عمدۂ منتخبہ'

نواب اعظم الدولہ امیر خاں سرور نے ۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ میں شروع کر کے ۱۸۰۴ء/ ۱۲۱۹ھ میں تمام کیا۔ اس میں ۹۷۹ شاعروں کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ اپنے وقت تک کا جامع ترین تذکرہ ہے۔ سرور ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ چنانچہ انہوں نے شعراء کے متعلق جو رائے دی ہے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں متعدد ایسے شعراء کا ذکر ہے جو دوسری کتابوں میں نہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروق نے ایک مبسوط تحقیقی مقالے کے ساتھ ۱۹۶۱ءمیں دہلی سے شائع کیا۔

۲۱- 'مجموعہ الانتخاب'

شاہ کمال الدین حسینی نے ۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ھ میں حیدر آباد دکن میں لکھا۔ ۲۲۶ شعراء میں سے صرف ۵۶ شاعروں کا ذکر خود مؤلف نے بڑھایا ہے۔ باقی 'کتاب الشعراء'، 'مخزن نکات' اور 'تذکرۂ ہندی گویان' میں موجود ہیں۔ حالات مختصر لیکن نمونہ کلام نہایت مفصّل دیا ہے۔ اپنے مفصّل کلام کی وجہ سے یہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں شمالی ہند کے علاوہ دکن کے معاصر شعراء کا بھی ذکر ہے۔ تذکرہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ قلمی نسخے نواب سالار جنگ حیدر آباد دکن، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور انجمن ترقی اُردو ہند (نامکمل) کے کتابخانوں میں موجود ہیں۔

۲۲- 'ریاض الفصحاء'

غلام ہمدانی مصحفی امروہی کا دوسرا اردو گو شعراء کا تذکرہ جو اس نے ۱۸۰۶ء/ ۱۲۲۱ھ میں بقول مولوی عبدالحق ۸۰ سال کی عمر میں لکھا۔ اس میں ۳۲۳ شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ مصحفی کی ادبی اور شاعرانہ صلاحیت اس وقت اپنی پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا اس نے جو رائے شعرا کے کلام پر دی ہے بڑی، اہمیت کی حامل ہے۔ آخر میں اپنا بھی ذکر کیا ہے۔ تذکرہ ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد نے شائع کیا۔

۲۳- 'مجموعہ' نغز'

قدرت اللہ قاسم نے ۱۸۰۶/۱۲۲۱ھ میں ۶۹۶ اردو گو شعراء کے حالات پر مشتمل لکھا، جن کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ اگرچہ شعراء کے حالات مختصر ہیں لیکن نمونہ' کلام مفصل دیا ہے جس سے شعراء کے ادبی مقام کے تعیّن میں مدد ملتی ہے۔ اس میں قدیم دکنی شعراء سے شاہ عالم ثانی تک کے زمانے کے شعراء کا ذکر ہے۔ معاصر شعراء کے متعلق مؤلف کا بیان اہم اور معتبر ہے۔ پروفیسر شیرانی نے ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع کیا۔

۲۴- 'طبقات سخن'

شیخ غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی نے ۱۸۰۷/۱۲۲۲ھ میں تالیف کیا۔ اس میں ۱۶۶ شاعروں کا ذکر الفبائی ترتیب سے ہے۔ دو طبقات پر مشتمل ہے۔ جن میں شعرای اردو اور شعرای فارسی کا ذکر ہے۔ (طبقہ دوم کا ذکر پہلے فارسی تذکرے کے تحت آ چکا ہے)۔ تذکرے میں اس زمانے کی نثر کے نمونے لطیفوں اور خطوط کی شکل میں ملتے ہیں۔ بعض معلومات ایسی ہیں جو دوسرے تذکروں میں نہیں دی گئیں۔ اس تذکرے کو بالاقساط 'ہماری زبان' میں (۱۵ جنوری تا ۱۸ اپریل ۱۹۶۰ء) ڈاکٹر محمد حسن نے طبع کیا۔

۲۵- 'تذکرۃ الشعراء'

ابن امین اللہ طوفان نے ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۵ء/۱۲۴۷ھ اور ۱۲۵۱ھ کے درمیان تالیف کیا اور قاضی عبدالودود کی ترتیب و تقریظ کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ نے شائع کیا۔

۲۶- 'تذکرۂ بے جگر'

خیراتی لعل بے جگر نے اکبر شاہ ثانی کے عہد میں تالیف کیا۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔

۲۷- 'دستور الفصاحت'

احمد علی خان یکتا نے ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ میں لکھا۔ اس میں کل ۳۶ شعراء کا ذکر ہے مگر اپنی ادبی خوبیوں کے سبب سے بڑا اہم ہے۔ اس کے مقدمے میں اردو کی پیدائش،

ارتقاء اور مراکز کا بیان ہے ۔ بابِ اول میں فارسی قواعد کا وہ حصہ دیا گیا ہے جس کا تعلق اردو سے ہے ۔ بعد کے ابواب میں اردو صرف و نحو، علمِ عروض و قافیہ اور علمِ بیان و معنی پر بحث کی گئی ہے ۔ خاتمے میں حالات کے علاوہ ان ۳۶ شعراء کا منتخب کلام ہے جن کے اشعار کا حوالہ کتاب میں آیا ہے ۔ اسے امتیاز علی عرشی نے مفید حواشی اور ایک تحقیقی مقدمے کے ساتھ ۱۹۴۳ء میں رامپور سے شائع کیا ۔

۲۸- 'گلشنِ بے خار'

نواب مصطفٰے خان شیفتہ نے ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں شروع کرکے تین سال بعد بعمر ۳۶ سال پایۂ تکمیل کو پہنچایا ۔ جملہ ۶۴۴ ممتاز اور اہم شعرای متقدّم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ حالات مختصر لیکن مفید اور قابل اعتبار ہیں ۔ مؤلف نے ہر شاعر کے کلام پر اپنی ناقدانہ رائے بھی دی ہے ۔ آخر میں بعض اہم معاصر شعراء کی تقریظیں ہیں، جو اپنی جگہ ادبی لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں ۔ ۱۸۴۳ء میں لکھنو سے شائع ہوا ۔ اس کا اُردو ترجمہ محمد احسان الحق نے کیا جو کراچی سے شائع ہو چکا ہے ۔

۲۹- 'مدایح الشعراء'

نواب عنایت حسین خان مہجور (ابن علی ابراہیم خلیل) نے ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ میں مکمل کیا ۔ اس میں ۶۷ اُردو گو شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ حالات مختصر لیکن نمونۂ کلام مفصل دیا ہے جو خود مؤلف نے انتخاب کیا ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے ۔

۳۰- 'بہارِ بے خزاں'

احمد حسین سحر نے ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں تالیف کیا ۔ اس میں اُردو کے ۸۵ شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے جو میر درد سے غالب کے عہد تک گذرے ۔ تنقید میں تعادل اور توازن پایا جاتا ہے ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ قلمی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنو کے کتاب خانے میں موجود ہے ۔

۳۱- 'مخزن شعراء'

قاضی نور الدین حسین خان رضوی فائق نے ۱۸۵۱ء/۱۲۶۸ھ میں لکھا ۔ اس میں گجرات کے ۱۰۸ اُردو گو شعراء کا ذکر ہے ۔ آخر میں غالب کا وہ خط بھی ہے جو اس

نے ۱۴ جولائی ۱۸۶۳ء کو اس تذکرے کی بعض عبارات پر اصلاح کے سلسلے میں لکھا تھا ۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی اُردو ہند کے زیر اہتمام جامع پریس دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا ۔

۳۲- 'ہمیشہ بہار'

مولوی عبدالعلیم نصر اللہ خان خویشگی احمدی خورجوی نے ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ میں لکھا ۔ اس میں قدیم شعراء سے ۱۸۵۳ء تک کے شعرا کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ حالات مختصر لیکن نمونۂ کلام مفصل دیا گیا ہے ۔ تنقیدی عنصر کم ہے ۔ مؤلف کے ہم عصر شعراء کے لحاظ سے اہم ہے ۔ ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ میں مطبع فتح الاخبار کول (علیگڑھ) سے شائع ہوا ۔

۳۳- 'بزمِ سخن'

یہ تذکرہ سید علی حسن خان نے ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ء میں اپنے والد نواب صدیق حسن خان کی فرمائش پر ۱۴ سال کی عمر میں الفبائی ترتیب سے لکھا ۔ اس میں قدیم شعرای اُردو سے مؤلف کے ہم عصر شعراء تک کا ذکر ہے ۔ حالات اور انتخاب کلام دونوں مختصر ہیں ۔ چنانچہ اس سے کسی شاعر کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ۔ آخر میں واجد علی شاہ کے بیٹے برہر علی کا ذکر معلوم ہوتا ہے ۔ تذکرہ خود نواب صدیق حسن خان کی تالیف ہے جس کو اُنھوں نے اپنے بیٹے کے نام منسوب کر دیا ۔ یہ تذکرہ مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا ۔

علاوہ بریں ایک اہم ''تذکرۃ الشعرای ہنود'' تالیف بشاش بسال ۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ ہے جس میں اُردو کے ہندو شعراء کا ذکر ہے ۔

ایک اور ''تذکرہ در حال ریختہ گویانِ ہند'' تالیف محمد صدر الدین ہے جس کا ایک قلمی نسخہ براؤن کے تکملے میں نمبر ۳۰۴ پر بیان کیا گیا ہے ۔

ان کے بعد اُردو گو شعراء کا کوئی تذکرہ فارسی میں نہیں لکھا گیا ۔

(ب) اولیاء کے تذکرے

اس دور میں تقریباً نوے (۹۰) ایسے تذکروں کی نشاندہی کی گئی ہے - یہ مطبوعہ ہیں یا کتابخانوں کے مخطوطات کی فہرستوں میں مندرج ہیں - ان کے علاوہ اور تذکرے مختلف کتب خانوں میں بھی ہوں گے اور ممکن ہے بعض دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہے ہوں - اردو تذکروں کی تعداد بھی کافی ہوگی - اولیاء کے متعلق اس قدر سوانحی ادب سے ظاہر ہے کہ اس عہد میں بھی بزرگانِ طریقت کافی تعداد میں موجود تھے اور لوگ آن کی پاکیزہ سیرت اور رُوحانی عظمت کے دل و جان سے معتقد تھے - ان تذکروں کی پانچ قسمیں ہیں :

۱- مجموعی تذکرے

ان میں شروع سے لے کر تذکرے کے زمانۂ تحریر تک کے اولیاء اللہ کا ذکر موجود ہے - ان میں ہر صاحبِ طریقت کا مختصر حال درج کیا گیا ہے اور اکثر ان تذکروں کے مآخذ قدیم تذکرے ہیں - مثلاً 'سفینۃ العارفین' ، 'معیارِ سالکانِ طریقت' ، 'بحرِ ذخار' ، 'فوائدِ سعدیہ' ، 'خزینۃ الاصفیا' ، 'انوارالعارفین' -

۲- انفرادی تذکرے

یہ تذکرے عموماً ایک یا دو شخصیتوں کے متعلق ہیں - ضمناً اس بزرگ کے اب و جد ، پیر و مرشد اور آخر میں اولاد و خلفاء کا ذکر بھی موجود ہے - یہ تذکرے اس زمانے کی مذہبی ، روحانی اور ضمناً معاشرتی اور ملکی زندگی پر بھی روشنی ڈالتے ہیں - اس قسم کے اہم تذکرے یہ ہیں : 'مقاماتِ حضرتِ نقشبند' ، 'گنجِ ارشدی' ، 'مناقبِ رزاقیہ' ، 'انیس القادریہ' ، 'روضات القیومیہ' ، 'مناقبِ فخریہ' ، 'مناقبِ سلیمانی' وغیرہ -

۳- خاص سلسلہ ہائے تصوف کے تذکرے

ان تذکروں سے علمِ تصوف ، اس کے اصناف ، اس کے اتحاد و اختلاف اور طریق عبادت و ریاضت کی رنگا رنگی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں اور تصوف کی تاریخ و ارتقاء مرتب کرنے والوں کے لیے یہ تذکرے اہم دستاویز ہیں - اس قسم کے تذکرے 'بشارات قطریہ' ، 'در فضائلِ حضراتِ طریقۂ مجددیہ' ، 'معلوماتِ مظہریہ' ، 'اصول المقصود' (قلندری شیوخ کے متعلق) اور 'قصرِ عارفان' ہیں -

۴۔ ایک شہر یا بستی کے اولیاء کے تذکرے

ان تذکروں کی اہمیت واضح ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں کسی شہر کی روحانی زندگی کس حالت میں تھی ۔ اس قسم کے مشہور تذکرے یہ ہیں : 'تحفۃ الطاہرین' ، 'ٹھٹھہ اور مکلی کے اولیاء' ، 'ذکرِ جامعِ اولیائے دہلی' ، 'مآثر الکرام' (بلگرام کے اولیاء) ، 'تذکرۃ الکرام' (بہاری اولیاء) ، 'اشجار الجبال' (کول کے صوفیہ) ۔

۵۔ اولیاء کے وہ تذکرے جو ملکی تواریخ میں شامل ہیں

عصری رجحانات کے پیش نظر مؤرخ تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ علماء و شعراء اور عرفاء کے لیے ایک ایک باب مخصوص رکھتا تھا ۔ اس عہد کی مندرجہ ذیل تواریخ میں اولیاء کا ذکر بھی شامل ہے ۔ 'ہفت گلشنِ شاہی' ، 'مرآت احمدی' ، 'واقعاتِ کشمیر' ، 'برہان الفتوح' ، 'چہار گلشن' ۔

اب ہم چند تذکروں کا تعارف کراتے ہیں جو اس تاریخ ادبیات کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں :

انفاس العارفین : مؤلفہ شاہ ولی اللہ ، سال تالیف ۱۷۳۱ء/۱۱۴۴ء

یہ بڑا اہم تذکرہ ہے ۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم اور اپنے چچا ابوالرضا محمد کے سوانح زندگی بیان کیے ہیں ۔ بعض حالات و واقعات تو ان کے چشم دید ہیں اور بعض اپنے اعزا و احباء کی زبانی سنے ہیں ۔ تذکرۂ احوال کے علاوہ ان کے ملفوظات اور بعض مکتوبات بھی نقل کیے ہیں ۔ ابوالرضا محمد اور حضرت عبدالاحد سرہندی کے درمیان مسائلِ تصوف پر جو مراسلات ایک دوسرے کو لکھے گئے وہ بھی نقل کیے ہیں اور ان سے بعض دقیق نکات پر روشنی پڑتی ہے ۔ ضمناً دوسرے اولیاء اللہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے شاہ عبدالرحیم نے استفادہ کیا ۔ مثلاً خواجہ خورد ولد خواجہ باقی باللہ اور خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادی ۔ آخر میں شاہ ولی اللہ نے اپنے آباء و اجداد کا مختصر تذکرہ لکھا ہے ۔ اس کے بعد حرمین شریفین کے ان مشائخ اور علماء و محدثین کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے خود سند حدیث اور سلسلۂ صوفیہ سے نسبت حاصل کی ۔ اس تذکرے کا وہ حصہ بھی اہم ہے جہاں شاہ صاحب نے تحصیلاتِ علمی کا حال بیان کرتے ہوئے ان تمام درسی

کتابوں کا نام بنام ذکر کیا ہے جو ان کے زمانے میں عموماً مدارس میں زیرِ درس ہوا کرتی تھیں ۔ اس طرح ان کے اپنے مبلغِ علم اور استعداد پر روشنی پڑتی ہے ۔

تذکرے کے ایک بیان سے ظاہر ہے کہ شاہ عبدالرحیم نے اپنی فقیرانہ شان قائم رکھی اور بادشاہ یا امراء کے پاس حاضر ہونے سے احتراز کیا ۔ نیز بادشاہ کی طرف سے زمین یا مدد معاش لینے سے انکار کیا ۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب نے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا اور ان کے ایک مرید کو بھیجا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں پیغام دے اور اپنے ہمراہ لائے ۔ لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا ۔ مرید کے اصرار پر ایک خراب سا کاغذ ، جس میں جوتا لپٹا ہوا تھا ، اٹھایا اور اس پر لکھا :

> ''اجماع اہل اللہ است بر آنکہ بئس الفقراء علی باب الامیر و حق سبحانہ میفرماید ، 'و ما متاع الحیوۃ الدنیا الا قلیل' ۔ جزء اقل بشما رسیدہ ۔ اگر بالفرض بمن خواہید داد ، جزء لا یتجزیٰ خواہد بود ۔ برای این جز لایتجزیٰ نام خود را از دیوان خدای تعالی چرا بر آرم ، چرا کہ در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد نام او را از دیوان حق سبحانہ بر می آرند ۔''[1]

اسی طرح کے اور واقعات بھی ہیں ۔

شاہ عبدالرحیم 'فتاویٰ عالمگیری' کی تدوین میں بھی شریک ہوئے ۔ والد کے اصرار پر یومیہ بھی قبول کر لیا ۔ ان کے پیر ابوالقاسم اکبر آبادی مصر تھے کہ یہ کام درست نہیں ۔ آخر ایک مسئلے میں اختلاف کی وجہ سے ملا نظام اور دوسرے علماء نے ان کا نام خارج کروادیا ۔ شہنشاہ اورنگ زیب ان کا وظیفہ بند کر کے انہیں زمین دینا چاہتے تھے لیکن انہوں نے قبول نہ کیا ۔

جو لوگ اولیاء اللہ کی روحانی قوت کے منکر ہیں ، ان کے لیے اس تذکرے کے بیانات ایسے شواہد پیش کرتے ہیں جن سے انکار شاہ ولی اللہ جیسے برگزیدہ عالم و مومن کی گواہی سے انکار کے مترادف ہے ۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ شاہ عبدالرحیم کو کشفِ باطن

۱۔ شاہ ولی اللہ : انفاس العارفین ، دہلی ، ۱۳۳۵ھ ، ص ۲۹ ۔

حاصل تھا ۔ وہ دوسروں کے دل کی بات پڑھ لیتے تھے ۔ ایک بزرگ ابوالرضا محمد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی کشفِ باطن اور سلب علم کی قوت رکھتے تھے ۔ جذبِ روح اور ردِ روح کی کرامت بھی ان سے ظہور میں آئی ۔

اس زمانے میں بھی اکثر صوفیہ ابن عربیؒ سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ 'فصوص الحکم' کا مطالعہ پیش نظر رہا ہے ۔ ابوالرضا محمد دوسروں کے استفسار پر اس کے دقیق مسائل کی تشریح و توضیح کرتے نظر آتے ہیں ۔ اس دور میں درسِ حدیث کا بڑا چرچا رہا ہے ۔ حرمین شریفین میں جید علماء حدیث کا درس دیتے تھے اور اطرافِ عالم سے طالب علم وہاں پہنچتے اور درس حدیث کی سند لے کر اپنے اپنے ملکوں میں جاتے ۔ تذکرے کے ایک تفصیلی بیان سے درس حدیث کے ان چار طریقوں کا بھی پتا چلتا ہے جو رائج تھے ۔

روحانی تربیت کے لیے سالک طریقت سے جو ریاضتیں کرائی جاتی ہیں ، ان میں توجہ و انہماک کی مشق بڑی اہم ہے ۔ آج کل جدید نفسیات میں بھی قوتِ حافظہ ، ترکّز توجہ اور قوتِ ارادی کی تربیت کے لیے جو طریقے بتائے جاتے ہیں ، صوفیہ بھی اس قسم کے نتائج حاصل کرنے کے لیے تقریباً وہی طریقے استعمال کرتے تھے ۔ تذکرے کے صفحہ پانچ پر شاہ عبدالرحیم بیان کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اسم ذات کو تختی یا کاغذ پر لکھتے تھے اور سامنے رکھتے تھے تاکہ کثرت سے پیش نظر رہنے سے قوت متخیّلہ میں محفوظ ہو جائے ۔ اسی طرح صفحہ چھ پر فرماتے ہیں کہ شغل نفی و اثبات سے اس قدر مشق ہو گئی تھی کہ وہ ایک سانس میں دو سو مرتبہ ورد کر سکتے تھے ۔

مآثرالکرام دفتر اول از غلام علی آزاد ، مؤلفہ ۱۷۵۲ء/۱۱۶۶ھ

اس تذکرے میں دو فصلیں ہیں ۔ پہلی میں اسّی بزرگ فقراء اور اولیاء اللہ کا ذکر ہے ۔ اس میں اکثر وہ ہیں جو بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دوسری فصل میں تہتر فضلاء کا ذکر ہے ۔ ان میں بلگرام کے علاوہ برّصغیرِ پاک و بھارت کے علماء کا بھی ذکر ہے ۔ مؤلّف دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ان سے پہلے ایک علمی و ادبی مرکز سے متعلق علماء و صوفیہ کا تذکرہ مرتّب کرنے کا رواج نہیں تھا ۔ بلگرام کے علاوہ اور بھی ایسے مردم خیز شہر ہیں جن کی سرزمین میں سے جیّد علماء و صوفیہ پیدا ہوئے ۔ مؤلّف نے 'مرآۃ المبتدین' ، 'گلزار ابرار' ، 'نفحات الانس' ، 'منتخب التواریخ' ، 'معارج الولایت' ، 'اخبار الاخیار' ، سنابل

وغیرہ سے بھی استفادہ کیا اور خود بڑے بوڑھوں سے بھی تحقیق و تفتیش سے معلومات اکٹھی کیں ۔ اگرچہ علماء و فقراء کے متعلق احوال و کوائف مختصر دیے ہیں ، پھر بھی بہت غنیمت ہیں کیونکہ اکثر علماء کے نام گمنامی کی تہوں میں چھپ جانے سے محفوظ ہوگئے ۔

اس تذکرے میں ضمناً اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ طلبا ، تلاش و تحقیقِ علم میں کس قدر مشقت و زحمت اٹھاتے تھے ۔ ملک بھر میں مساجد ، مدارس اور خانقاہیں آباد تھیں اور مدرس علم کی روشنی پھیلاتے تھے ۔ مؤلّف نے خاص طور پر صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کی تعلیمی حالت کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ شاہجہان کہا کرتے تھے کہ ''پورب شیراز مملکت ما ست ۔'' ۱۷۱۷ء/۱۱۳۰ھ تک علم و تعلیم کے ہنگامے رہے ۔ محمد شاہ کے آغاز عہد میں جب سے برہان الملک سعادت خان حاکم ہو کر آئے اور جونپور ، بنارس ، غازی آباد ، کڑہ مالکپور وغیرہ اس کے تصرف میں آئے تو علماء کی مدد معاش کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور مدرسوں کی وہ پہلی سی رونق نہ رہی ۔ ۱۷۴۶ء/۱۱۵۹ھ میں صفدر جنگ الہ آباد کے صوبیدار مقرر ہوئے ۔ اس کے عہد میں تمام وظائف اور اوقاف ضبط ہوگئے تو علماء بھی پریشان حال ہوئے[۱] ۔

میر فتح اللہ شیرازی کے احوال میں بیان کیا ہے کہ وہ محقق دوانی میر صدرالدین ، میر غیاث الدین منصور اور میرزا جان میر کی تصانیف ہندوستان میں لائے اور انہیں درس میں شامل کیا ۔ چنانچہ اس عہد سے معقولات کا نیا رواج ہوا ۔

سید محمد ترمذی کے تذکرہ احوال[۲] کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں حقیقتِ وحی کے متعلق ایک بڑا ہنگامہ پیدا ہوا ۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی نے اپنے 'رسالۂ تسویہ' میں لکھا تھا کہ جبریل ہر پیغمبر کی قوتِ باطنی ہوتی ہے ۔ علماء نے اورنگ زیب سے کہا کہ اس میں شرع شریف کے مخالف عقیدے کا ذکر ہے ۔ چنانچہ شہنشاہ کے حکم سے تمام برگزیدہ صوفیہ سے اس کے متعلق ان کی رائے دریافت کی گئی ۔ اور شیخ کے مریدوں سے بھی کہا گیا کہ اس بیان کی تائید شرعی احکام سے کرو یا مریدی سے استغفار کرو ۔

---

(۱) مآثرالکرام ، غلام علی ، آگرہ ۱۹۱۰ء ، ص ۲۲۱ ، ۲۲۶ ۔
(۲) ایضاً ، ص ۸۳ ۔

واقعات کشمیر از محمد اعظم ، سال تکمیل ۱۷۵۵ء/۱۱۶۹ھ

یہ کتاب 'تاریخ کشمیر اعظمی' یا 'تواریخ اعظمی' کے نام سے بھی معروف ہے ۔ شروع سے لے کر سال تالیف تک یہ کشمیر کی مختصر تاریخ ہے ۔ سیاسی احوال و کوائف کے بعد تقریباً ہر بادشاہ یا ناظم کے عہد حکومت میں علماء و عرفاء اور شعراء کا ذکر کیا ہے ۔ اس کتاب کی اہمیت اسی تذکرے کی وجہ سے ہے ۔ ضمناً کشمیر میں اسلام کی آمد اور نشر و اشاعت کا ذکر کیا ہے ۔ جن حکام و سلاطین نے اس ریاست کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا ، ان کی تعریف کی ہے ۔ اس باب سے متعلق دور میں ہندو و مسلم اور اہل تسنن و اہل تشیع کے درمیان تعصّب کی وجہ سے جو فساد برپا ہوا ، خواجہ احسن اللہ کا شہر آشوب نقل کر کے اس کا نقشہ پیش کیا ہے ۔ قحط کی وجہ سے معاشی ابتری کا جو سماں ہوا ، اپنی ایک مثنوی میں اس کی بھی عکاسی کی ہے ۔

صوفیہ ، عرفاء میں قادری اور نقشبندی زیادہ ہیں ۔ چشتی اور سہروردی نسبتاً بہت کم ہیں ۔ عموماً سوانح زندگی بیان کر کے آخر میں بزرگ مذکور کا سال وفات دیا ہے اور اشعار میں تاریخ بھی خود نکالی ہے ۔

تحفۃ الطاہرین ۔ مؤلفہ محمد اعظم تتوی ، سال تالیف ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ

سمّہ خاندان کے جام تماچی نے شیخ حماد جمالی کی فرمائش پر کوہ مکلی پر ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی ۔ بعد میں اسی پہاڑ پر اسی بزرگ کی اجازت سے لوگوں نے اسی پہاڑ کو قبرستان بنا لیا ۔ جام نظام الدین کے عہد یعنی پندرھویں صدی عیسوی/نویں صدی ہجری کے اواخر میں ٹھٹہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ بعد میں یہ شہر دارالسلطنت کے ساتھ ساتھ علم و عرفان کا مرکز بن گیا ۔ اس کی سرزمین بھی برگزیدہ اولیاء و عرفاء کا مدفن بنتی گئی ۔ محمد اعظم نے بڑی کوشش سے کوہ مکلی پر آسودہ ۸۷ بزرگوں اور ٹھٹہ کے گیارہ محلّوں اور اس کے نواح میں آسودہ ۹۰ بزرگوں کے احوال و کوائف اس تذکرے میں بیان کیے ہیں ۔

مقدمات مظہری ، از غلام علی الملقب بشاہ عبداللہ ، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ

یہ کتاب شمس الدین حبیب اللہ حضرت میرزا جانجاناں مظہر متوفی ۱۷۸۰ء/۱۱۹۵ھ کا سوانحی تذکرہ ہے ۔ مؤلف نے احوال زندگی کے ساتھ ساتھ طریقۂ نقشبندیۂ مجددیہ کا ذکر کیا ہے ۔ حضرت جانجاناں کے مشائخ سید نور محمد ، حاجی محمد افضل ، حافظ سعد اللہ اور

حضرت محمد عابد کا بھی ذکر کیا ہے ، جن سے میرزا جانجاناں نے استفادہ کیا۔ بعد میں ان کے اپنے مکتوبات ، تصرفات اور روحانی کمالات کا ذکر کیا ہے ۔ آخر میں ان کے معمولات ، عبادات ، اوراد و وظایف اور شفاء امراض کے لیے ادعیہ و تعویذات مندرج کیے ہیں ۔ سب سے زیادہ اہم ابواب ان کے ملفوظات اور مکتوبات پر مشتمل ہیں ۔ ایک باب میں ان کے خلفاء کا ذکر کیا ہے ۔

کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ھجری میں شیعہ سنی اختلافات اور تاریخ سے وابستہ دوسرے اختلافی مسائل اہل دل کی تشویش اور ذہنی بے اطمینانی کا باعث بنے رہے ۔ پتا چلتا ہے کہ میرزا مظہر جانجاناں شیعہ سنی اور ہندو مسلم کے درمیان رواداری اور صلح کے قائل تھے ۔ ساتھ ہی آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پیغمبرؐ خاتم المرسلین ہیں اور کل نوع انسان کی طرف مبعوث ہوئے ہیں ۔ ان کا دین ناسخ ادیان ہے ۔ جو شخص ان کا پیرو نہیں کافر ہے :

"ہر کہ باوی نگردید کافر است "[1]

مخزن احمدی ، از محمد علی ، مؤلفہ ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ

اس کتاب میں سید المجاہدین سید احمد کی زندگی کے (قمری سال کے لحاظ سے) ابتدائی چالیس سال کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یعنی ۱۷۸۶ء/۱۲۰۱ھ سے ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ تک ۔ سیّد احمد (ش - ۱۸۳۱ء) ، سادات رائے بریلی کے زرین سلسلے کی ایک کڑی ہیں ۔ مؤلف ان کے مرید باصفا تھے ۔ انہوں نے چشم دید حالات بیان کیے ہیں یا ثقہ راویوں سے سن کر لکھے ہیں ۔ ابتدا میں سید احمد کی وصیت ، ان کے خاندان ، ان کی تعلیم اور ان کے سلسلہ ہائے تصوف کا ذکر کیا ہے ۔ وہ چشتیہ ، قادریہ ، مجددیہ اور مجددیہ سلسلوں سے منسوب تھے ۔ جوان ہوئے نور علم کے ساتھ نور قلب بھی میسر ہوا ۔ ان کے اب و جد کی طرح لوگ ان کے بھی ارادات مند ہونے لگے اور جب تیس چالیس آدمیوں کی جماعت ہو گئی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ شروع کردیا ۔

اس کتاب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ اور اس کے نواح میں برہان الملک سعادت خان کے عہد حکومت میں شیعیّت کا رواج ہوا ۔ نصیرآباد کے چار محلوں میں سے تین

---

(۱) غلام علی : مقامات مظہری ، دہلی ، ۱۳۰۹ ، ص ۹۹ ۔

محلے والوں نے شیعہ مذہب قبول کر لیا ۔ مؤلف بتاتے ہیں کہ تیس تیس چالیس چالیس بیگھہ زمین کی خاطر یہ لوگ اپنے مذہب سے منحرف ہوگئے ۔

کتاب میں سید احمد کے زیادہ تر علمی و روحانی مشاغل کا ذکر ہے ۔ البتہ واقعات کے بیان کرنے میں تقدیم تاخیر ہوگئی ۔ یہ سید صاحب مستجاب الدعوات اور متوکل علی اللہ تھے ۔ کئی مرتبہ وہ اپنے قافلے کے ہمراہ سفر کرتے اور کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہوتا یا ہوتا تو بہت تھوڑا ہوتا لیکن ان کی برکت سے سب کے لیے رزق مہیا ہو جاتا ۔ ان کی اجابتِ دعا اور ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے دستِ مبارک پر کئی ہندو مسلمان ہوئے اور بہت سے بے راہ عیاسوں نے توبہ و تقویٰ کی راہ اختیار کی ۔

کتاب کے طویل حصے میں مؤلف نے حضرت سید کے سفر حج کا حال بیان کیا ہے ۔ مؤلف نے ضمناً مالیبار کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھا ہے ۔ کالی کٹ کو کوکلی کٹ لکھا ہے ۔ اس بندرگاہ میں مسلمان آبادی کا حال بینن کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ وہاں ماپلا آباد ہیں ۔ اطراف و جوانب سے جہاز آتے ہیں ۔ لوگ مسافروں کو شادی کی دعوت دیتے ہیں ۔ جو عورت پسند ہو قاضی کے سامنے جا کر نصف مہر ادا کر کے نکاح پڑھواتے ہیں ۔ اگر منکوحہ کو ساتھ نہ لے جانا چاہے تو اڑھائی سال تک اس سے نان و نفقہ کی ضمانت لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے نہ آنے پر معلقہ کو مطلقہ ہونے کا حق دیتے ہیں ۔ چونکہ اکثر مرد واپس نہیں آتے تو ان کی اولاد اپنی ماؤں کے نام سے مسمّٰی ہوتی ہے ۔ ماپلا سے مراد مقامی زبان میں ماں کا بیٹا ہے ۔

'مخزنِ احمدی' میں سید احمد شہید کو سید المجاہدین کا لقب دیا گیا ہے لیکن آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی طرف سے بے التفاتی برتی گئی ہے ، حالانکہ مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوتے دیکھ کر سکھوں کے خلاف ایک صوفیٔ کامل کا جہاد کرنا زیادہ قابل توجہ تھا ۔

۔ مناقب المحبوبین ، از نجم الدین ، مؤلفہ ۱۸۶۱ء/۱۲۷۸ھ

مؤلف خواجہ محمد سلیمان تونسوی (م ۔ ۱۸۵۰ء/۱۲۶۷ھ) کے مرید ہیں ۔ کتاب کا زیادہ حصہ انہیں کے فضائل و مناقب کے لیے مخصوص ہے ۔ حضرت سلیمان سے کمتر تفصیلی حالات ان کے مرشد خواجہ نور محمد مہاروی (م ۔ ۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ) کے ہیں ۔ خواجہ نور محمد خواجہ محمد فخرالدین دہلوی کے مرید تھے ۔ انہیں کے فیض سے ان کے خلفاء کا ایک ایسا

سلسلہ چلا کہ تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری (اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی) ان کے روحانی سرچشموں سے فیضیاب ہوئی ہے - خواجہ نور محمد مہارویؒ کے چار بڑے خلیفہ ہوئے - حافظ جمال ملتانیؒ ، قاضی عاقل محمدؒ ، نور محمد نارووالہؒ اور خواجہ محمد سلیمانؒ تونسوی - اس کتاب میں دو متذکرہ صدر اولیاء کے علاوہ حافظ جمال ملتانیؒ کے متعلق بھی کچھ تفصیل سے لکھا ہے - ملتان میں سہروردی اولیاء یعنی حضرت بہاء الدین زکریاؒ ، حضرت صدر الدین عارفؒ اور حضرت رکن عالمؒ کے بعد حافظ جمالؒ ہی نامور ہوئے اور ان کی خانقاہ بھی اسی طرح چشمہ' فیض ثابت ہوئی - وہ مجاہد درویش تھے - وہ خود شمشیر بدست اپنے وطن کی حفاظت کرتے رہے - ان کی وفات ۱۸۱۱ء/۱۲۲۶ھ تک سکھ ملتان کو فتح نہ کر سکے -

کتاب کے آغاز میں چشتیہ سلسلے کے اولیاء کا مختصر ذکر کیا ہے اور خواجہ فخرالدین دہلویؒ تک ان کا سلسلہ' طریقت جوڑا ہے - مؤلف نے بیان کیا ہے کہ اس سلسلے کے بزرگوں کے حالات 'مرآت الاسرار' ، 'اقتباس الانوار' ، 'اخبار الاخیار' ، 'سیر العارفین' ، 'سیر الاقطاب' ، 'سیر الاولیاء' ، 'شجرۃ الانوار' ، 'مخبر الاولیاء' ، 'مرآۃ ضیائی' اور 'تذکرۃ الواصلین' میں موجود ہیں - اس لیے انہوں نے چشتی بزرگوں کا ذکر مختصر کیا ہے -

خواجہ نور محمد مہارویؒ کی زندگی اور ان کی تعلیمات کے متعلق 'اسماء الابرار' مرتبہ غازی الدین خان ، 'خلاصۃ الفوائد' مرتبہ محمد عمر ، 'خیر الاذکار' مرتبہ محمد گھلوی اور 'ملفوظات' خواجہ نور محمدؒ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے - حافظ جمال ملتانیؒ کے متعلق تین کتابوں کے حوالے ملتے ہیں جن سے ان کے معنوی جمال و کمال پر روشنی پڑتی ہے - 'اسرارالکمالیہ' از زاہد شاہ ، 'خصائل رضیہ' از عبدالعزیز ، 'انوار جمالیہ' از غلام حسین شہید -

عبادت و ریاضت کے علاوہ تصوف کو ایک علم کی حیثیت سے پڑھنے اور سمجھنے کا بھی سلسلہ جاری رہا - چنانچہ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے مرید ان سے 'لوائح' ، 'سواءالسبیل' ، 'تسنیم' اور دوسرے رسائل پڑھتے تھے -[1] حضرت خواجہ محمد سلیمانؒ نے اپنے مرشد سے 'آداب الطالبین' ، 'فقرات' ، 'لوائح' ، 'عشرہ کاملہ' ، 'فصوص الحکم' پڑھیں -[2] 'مثنوی مولانا روم' کا مطالعہ بھی عام رہا -[3]

---

(۱) مناقب المحبوبین ، نجم الدین ، مطبع حسنی ، ص ۱۱۴ -
(۲) ایضاً ، ص ۱۱۴ -
(۳) ایضاً ، ص ۱۰۸ -

حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی کی زندگی کی جزئی تفاصیل کے ساتھ ساتھ اس وقت کے لوگوں کے احوال و کوائف پر روشنی پڑتی ہے ۔ مرشد کے روزانہ مشاغل ، عبادت و ریاضت کے اوقات ، درس و وعظ ، لنگر کا اجراء ، ان کے سفر ، حکام و سلاطین کی ان سے عقیدت ، ان کے کمالات معنوی اور کرامات وغیرہ کا ذکر تفصیل سے موجود ہے ۔ وہ جلال و جبروت کے درویش تھے ۔ ان کی دعائیں مستجاب ہوتیں ، انہوں نے کہا : ''ملک بدست درویش است ہر کرا میخواہد میدہد[1]'' ۔

زمانے کی سیاسی شخصیتوں میں سے نواب نظام الملک غازی الدین خان وزیر کا ذکر بھی ملتا ہے ۔ بادشاہ دہلی نے شاہزادہ علی گوہر سے گستاخی کی وجہ سے اسے اندھا کرکے شہر بدر کر دیا ۔ وہ حج کو گئے ۔ واپس آ کر انہیں خواجہ نور محمد مہاروی کے پاس ہی پناہ ملی ۔ انہوں نے باقی زندگی وہیں گزاری ۔ 'رسالہ اسماء الابرار' ایک مثنوی اور دیوان ان کی یادگار ہیں ۔

حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں اخلاق انحطاط عام ہو رہا تھا ۔ علاوہ بریں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں قانون کا استحکام نہیں تھا ۔ زندگی کی امان نہیں تھی ۔ ڈاکو راستے میں مال و اسباب لوٹ لیتے تھے ۔ ایک مرتبہ دہلی میں سخت قحط پڑا جو ''چالیسہ کال''[2] مشہور ہے ۔ مہار اور اس کا نواحی علاقہ چوروں کا ضلع مشہور تھا ۔ ''جٹان دزدی بسیار میکردند ۔ خصوصاً گاوان و میشان را بسیار می دزدیدند و شیرگاؤ از وجہ حلال کم میسر می آمد[3] ۔''

حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی کے ہاں سماع کا خاص اہتمام تھا ۔ قوال موجود رہتے تھے جو مجالس خواص میں تہجد ، اشراق اور عصر کے وقت فارسی غزلیں و ہندی اور پنجابی راگ اور دوہے پڑھتے تھے ، جن سے سامعین پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہوتی تھی ۔ بظاہر خدا کے سوا کسی اور کو مدد کے لیے پکارنا ممنوع ہے ۔ لیکن اس کتاب کے

---

(۱) مناقب المحبوبین ، ص ۲۲۳ ۔
(۲) ایضاً ، ص ۱۶۰ ۔
(۳) ایضاً ، ص ۱۶۴ ۔

ملفوظات سے واضح ہوتا ہے کہ پیر و مرشد کو مدد کے لیے پکارنے کی اجازت تھی - چنانچہ مذکور ہے کہ ایک مرید نے مصیبت کے وقت کہا[1] :

"اغثنا یا حضرت خواجہ سلیمان"

اس قسم کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں -

خزینة الاصفیاء دو جلد ، مؤلفہ غلام سرور ، سال تکمیل ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ

'خزینہ الاصفیاء' تاریخی نام ہے اور یہ ایک مبسوط اور جامع تذکرۂ اولیاء ہے - مؤلف نے کوشش کی ہے کہ تمام مروجہ سلسلہ ہائے تصوف کے برگزیدہ اولیاء کے حالات و کوائف اختصار کے ساتھ جمع و تالیف کر دیے جائیں - کتاب کو مندرجہ ذیل سات مخازن میں تقسیم کیا گیا ہے :

'مخزنِ اول' میں احوال پیغمبر ؐ ، خلفائے راشدہ رض ، بارہ امام اثنا عشری رض ، چار فقہی ممالک کے امام ، امام ابو یوسف رح اور امام شیبانی رح کے حالات مندرج ہیں -

'مخزن دوم' میں مشائخ قادریہ کا ذکر ہے - شیخ معروف کرخی رح سے شروع کرکے آخر میں شیخ مسلم خان قادری رح کا حال لکھا ہے -

'مخزن سوم' میں اولیائے چشتی کا ذکر شیخ حسن بصری رح سے شروع کیا ہے اور شیخ فیض بخش لاہوری رح آخری صوفی ہیں جن کا ذکر شامل کیا ہے -

'مخزن چہارم' میں حضرات نقشبندیہ کا ذکر ہے - اس میں شیخ سلمان فارسی رح سے امام علی شاہ رح تک اولیاء کے حالات مندرج ہیں -

'مخزن پنجم' میں سہروردی صوفیہ کا ذکر شامل ہے - پہلے صوفی خواجہ ممتاز رح ہیں اور آخری قلندر شاہ رح ہیں -

'مخزن ششم' میں متفرق اولیاء اور صوفیہ کا ذکر ہے جو ان متذکرہ سلسلہ ہائے تصوف میں شامل نہیں -

'مخزن ہفتم' میں ازواج مطہرات رض نبی صلعم ، دختران آنحضرت صلعم ، زنان عارف اور مجاذیب کا ذکر شامل ہے -

---

(۱) مناقب المحبوبین ، نجم الدین ، مطبع حسنی ، ص ۲۳۹ ، ۲۴۰ -

اس تذکرے میں ۱۰۶۵ شخصیتوں کے احوال و کوائف محفوظ ہو گئے ہیں ۔ ان میں سے رسول اکرم و خلفاء ۲۲ ، مشائخ قادریہ کے ۱۵۹ ، مشائخ چشتی کے ۲۳۳ ، مشائخ نقشبندی کے ۱۶۵ ، مشائخ سہروردی کے ۱۰۴ ، مشائخ متفرق ۳۱۱ اور خواتین ۴۰ کا ذکر شامل ہے ۔ عصر قریب کے بعض صوفیہ کے حالات بھی شامل کئے ہیں جن کا ماقبل تذکروں میں ذکر نہیں ہو سکتا تھا ۔ پنجاب کا خاص خیال رکھا گیا ہے چنانچہ لاہور ، وزیرآباد ، شرقپور ، مہار شریف ، تونسہ شریف ، مکھڈ وغیرہ کے بزرگان کرام بھی شامل تذکرہ کیے گئے ہیں ۔ جب یہ تذکرۃ الاولیاء مرتب ہؤا تو خطۂ پنجاب میں چشتیہ سلسلے کو بڑا فروغ حاصل تھا اور خواجہ اللہ بخش تونسویؒ ، خواجہ شمس الدینؒ سیالوی ، خواجہ حیدر علی شاہؒ جلالپوری اور خواجہ غلام فریدؒ جیسے اکابر صاحب سلسلہ چشتی بزرگ زندہ تھے ۔ اکثر صوفیہ کی تواریخ وفات خود منظوم کی ہیں ۔

مفتی غلام سرور نے ایک اور تذکرہ 'حدیقۃ الاولیاء' کے نام سے اردو میں لکھا جس میں صرف پنجاب کے اولیاء کا ذکر ہے ۔ 'مدینۃ الاولیاء' کے نام سے ایک اور جامع و مبسوط تذکرہ بھی تالیف کیا ۔ لیکن اس کی اصل اساس 'خزینۃ الاصفیاء' ہے ۔ مؤلف نے بعض ایسے صوفیہ کے تذکروں کو اپنے مآخذ کے طور پر استعمال کیا ہے جو اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ۔ اس لحاظ سے بھی یہ تذکرہ اہم ہے ۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں :

> 'تشریف الشرفاء' ، 'شجرۃ الانوار' ، 'تذکرۂ نوشاہی' ، 'تذکرۃ العاشقین' ، 'اسرارالاصفیا' ، 'اخبار الاصفیا' ، 'مرآۃ الاسرار' ، 'سواطع الانوار' ، 'خلاصۃ البحر' ، 'روضۃ السلام' ، 'دارالمعارف' ، 'تذکرۂ آدمیہ' ، 'کتاب رضوانی' ، 'کتاب الحضرات' ، 'مناقب الاولیاء' ، 'جواہر السرایر' ، 'مظہر مجددی مخزن مجددیہ' ، 'انوار اعظمیہ' ، تذکرۃ الشہداء' ، 'اخبار الاصفیاء' ، 'مناقب الاصفیاء' ۔

مفتی غلام سرور نے 'خزینۃ الاولیاء' میں مذکور صوفیہ و عرفاء کے سنین ولادت و وفات کے متعلق جو قطعات لکھے تھے ان کو 'گنجینۂ سروری' یا 'گنج تاریخ' کے عنوان سے الگ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا جس کی طباعت ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی ۔

پانچواں باب

انشاء

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں فارسی انشاء اور مراسلت اس معراج پر پہنچ چکی تھی کہ اس سے بلند تر درجے کا تصور ممکن نہیں ۔ ابوالفضل علامی ، ابوالبرکات منیر لاہوری ، عبدالحمید لاہوری ، سعد اللہ خان ، چندر بھان برہمن ، سجان رائے بٹالوی ، محمد صالح کنبوہ ، اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ نے اپنے رقعات و مکاتیب کا ایسا بیش قیمت ذخیرہ یادگار چھوڑا کہ فارسی انشاء ہر قسم کے نمونوں سے مالامال ہو گئی ۔ ان ادیبوں کی نگارشیں حسن بیان کے ساتھ ساتھ زندگی کے بیشتر معاملات مثلاً سیاست ، معاشرت ، آداب و رسوم وغیرہ پر حاوی ہیں ۔ فقط ابوالفضل کے مکاتبات کے تین دفتر ایسے ہیں کہ عبارت کی متانت و استواری اور مدعا نگاری کے لحاظ سے فن انشاء کے نقطۂ عروج اور معراج کمال کا درجہ رکھتے ہیں ۔ اکبر کی طرف سے عبداللہ خان ازبک والیٔ توران اور محمد حکیم مرزا کو جو خطوط بھیجے گئے ہیں ان میں افہام و تفہیم اور انتباہ و ترغیب کا اور شان و شکوہ اور رعب و جلال کے اظہار کا کوئی پیرایہ نہیں چھوڑا گیا ہے ۔ متانت و جزالت بیان کا یہ عالم ہے کہ مضمون تو مضمون عبارت سے بھی شاہانہ جلال ٹپکتا ہے ۔ عبداللہ خان ازبک کہا کرتا تھا کہ اکبر کی تلوار سے تو کبھی واسطہ نہیں پڑا لیکن ابوالفضل کا قلم مارے ہی ڈالتا ہے[1] ۔ متانت زبان کا یہی انداز ایک حد تک اورنگ زیب کے رقعات میں بھی موجود ہے ۔ ایجاز و اختصار اور شگفتگی اس پر مستزاد ہے ۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں مغلوں کا زوال شروع ہوگیا ۔ اس سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا زوال بھی شروع ہوگیا ۔ اگرچہ اس صدی میں بھی مرزا عبدالقادر بیدل ، علامہ عبدالجلیل بلگرامی ، مرزا مظہر جانجانان ، لچھی نرائن شفیق ، نواب سید عبداللہ خان قطب الملک ، شیخ علی حزین ، سراج الدین علی خان آرزو ، مرزا قتیل اور فائق کے نام

---

(۱) جلال الدین احمد جعفری ۔ مقدمہ انشائے ابوالفضل ۔

نمایاں ہیں ، لیکن یہ لوگ مراسلات و مکاتبات میں وہ درجہ نہیں رکھتے جو سابقہ انشاء نگاروں کو حاصل تھا ۔ 'اعجاز خسروی' کی سی معجز نگاری ، 'سہ نثر ظہوری' کی سی رنگینی اور طغرا ، طاہر وحید یا ابوالفضل کی سی متانت و جرالت ان لوگوں کو میسر نہ تھی ۔ البتہ تلازمہ بندی ، مدعا نگاری اور آرائش الفاظ و معانی میں یہ حضرات متقدمین کی پیروی کرتے تھے ۔ ان میں تخلیقی صلاحیت اور جلالت و قدرت کم ہے ۔ مشق و مزاولت کے زور سے قلم میں روانی کا جوہر ضرور ہے ۔ متقدمین نے انداز بیان کے جو نمونے پیش کیے اور اسلوب کی جو راہیں نکالیں ، یہ لوگ ان پر بڑی مشاقی کے ساتھ گام زن ہوئے اور ان میں سے بعض کے ہاں پختگی کا رنگ نظر آتا ہے ۔ لیکن یہ خامی ان بزرگوں کے خطوط میں رہ رہ کر کھٹکتی ہے کہ اسلوب کی نزاکت اور انشاء پردازی کے تکلفات نے سادگی ، اصلیت اور خلوص کو دبا لیا ہے ۔ ان میں سے بہت کم خطوط ایسے ہیں جن میں مکتوب نگار نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہو حالانکہ مکتوب کی پہلی صفت غالباً یہی ہے ۔ مرزا غالب نے اپنی خطوط نگاری کا اولین وصف یہی قرار دیا ہے کہ "میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے ۔" انگریزی زبان میں بلکہ ہر زبان میں اعلیٰ خطوط کا جوہر اصلی یہی ہے کہ مکتوب میں مکتوب نگار کی شخصیت نقاب برافگندہ نظر آئے ۔ مذکورہ بالا مراسلہ نگاروں نے یہ فرض کماحقہ انجام نہیں دیا لیکن انیسویں صدی عیسوی کے بعض مکتوب نگار مثلاً مرزا غالب ، قتیل ، مومن ، شیفتہ وغیرہ کے خطوط میں ان کی زندگی ، شخصیت ، مزاج اور عادات کا عکس بہت صاف نظر آتا ہے ۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے ان منشیوں میں سے بعض نے ایک قدم یہ بھی اٹھایا کہ عبارت کو صنائع بدائع کے استعمال سے گرانبار کر دیا ۔ ان کے خطوط میں تجنیس ، براعۃ الاستہلال ، مراعاۃ النظیر ، ایہام بلکہ واسع الشفتین ، موصل الشفتین اور رقطا و حنیفا جیسی صنعتیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں ۔ تلازمہ بندی کا یہ شوق عام عہد شاہجہانی کا تبرک ہے اور ان ادیبوں کو بہت عزیز ہے ۔ تاہم ان تمام انشاؤں کو محض دفتری مراسلات یا نجی خط و کتابت سمجھنا مناسب نہ ہوگا ۔ ان میں سے بعض مجموعے ایسے بھی ہیں جو فارسی زبان دانی ، صرف و نحو ، محاسن و معائبِ کلام اور ملازمت و معاشرت کے آداب سے آشنا کرتے ہیں ۔ مثلاً اندرجیت کی 'طراز الانشاء' یا رجھور داس جونپوری کی 'دقائق الانشاء' کے مطالعے سے بلاغت و بیان ، اصولِ صرف و نحو ، آدابِ مناظرہ ، آدابِ

ملازمت وغیرہ سے آگاہی حاصل ہوتی ہے ۔ تہذیبی اور مجلسی نقطۂ نظر سے ان کا مطالعہ بہت سودمند ہے ۔

اس کے علاوہ بعض رقعات تاریخی حیثیت سے بھی اہم ہیں ۔ ان میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے سیاسی واقعات کی اتنی وافر تفاصیل موجود ہیں کہ انہیں عہد مغلیہ کی تاریخ کا عمدہ ماخذ سمجھا جا سکتا ہے ۔ سید عبداللہ خان قطب الملک کے اکثر رقعات ، جو اس بادشاہ گر امیر نے الہ آباد کے صوبہ دار چھبیلا رام کو ، اجیت سنگھ راٹھور کو (جس کی بیٹی سے فرخ سیر کا عقد سید بھائیوں کی وساطت سے ہوا[1]) نظام الملک ناظم دکن اور مرشد قلی خان ناظم بنگالہ وغیرہ کو لکھے ہیں ، اس عہد کی تاریخ کا ماخذ ہیں ۔ 'رقعات بیدل' میں شاہ عالم اور جہاندار شاہ کے زمانے کے تاریخی واقعات قلم بند ہوئے ہیں ۔ 'رقعات لچھمی نرائن' میں مرہٹوں کی تاخت و تاراج کی تفصیل ملتی ہے ۔ بعض رقعات کو ذاتی روزنامچہ (ڈائری) سمجھنا چاہیے ، جن میں معمولی واقعات قلمبند ہو گئے ہیں ، مثلاً لچھمی نرائن نے شہر فیض آباد کی آتشزدگی کی تفصیل ایک خط میں درج کی ہے[2] ۔

علماء اور صلحاء نے بھی اپنے خطوط کے ذریعے اٹھارھویں صدی عیسوی کے مکتوباتی ادب میں اچھا اضافہ کیا ہے ۔ شاہ ولی اللہ ، شاہ غلام علی اور مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط سے اس عہد کے مذہبی میلانات اور عقائد کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ ان بزرگوں نے جہاں اپنی تصانیف سے عوام کے بگڑے ہوئے عقائد اور توہمات کی اصلاح کی ہے ، وہاں خطوط سے بھی یہی فریضہ انجام دیا ہے ۔ چونکہ ان خطوط میں عقائد و اصول کا بیان لازمی عنصر ہے اور آیات و احادیث کے حوالے آتے ہیں اس لئے ان کی زبان کسی قدر دقیق ہے ۔ عربی تراکیب ، مشکل الفاظ ، فلسفیانہ اور متکلمانہ اصطلاحیں ان میں جا بجا نظر آتی ہیں ۔ مرزا مظہر جانجاناں کے مکتوبات میں البتہ سادگی و سلاست ہے ۔ وہ اپنا ما فی الضمیر صاف اور سلیس زبان میں ادا کرتے ہیں ۔ یہ مکاتیب اصلاحی اور افادی حیثیت کے علاوہ اس عہد کی سیاسی حالت اور اختلالِ سلطنت کے حالات سے بھی آگاہی بخشتے ہیں ۔

---

(۱) میر غلام علی آزاد نے 'سرو آزاد' ص ۲٦۷ پر اس کی منظوم تفصیل دی ہے ۔ رفاہ عام پریس ، لاہور ۱۹۱۳ء ۔

(۲) رقعات لچھمی نرائن ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، برگ ۵۸ ۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے ادیبوں اور شاعروں کے خطوط فنی لزا کتوں اور ادیبانہ حسن کاری کے نمونے ہیں ۔ ان میں متانت و محکمی نہ سہی لیکن حسن اور لطافت ضرور ہے ۔ خان آرزو ، شیخ علی حزین اصفہانی (جو شمالی ہند کی سیر کرنے کے بعد بنارس میں مقیم ہوگئے تھے) میر تقی میر ، مرزا محمد رفیع سودا ، مرزا فاخر مکین ، شیخ غلام ہمدانی مصحفی ، سید انشا ، مرزا قتیل ، میر قمر الدین منت وغیرہ نے اس صدی کے دہوں میں فارسی انشاء نگاری و مراسلت کا حق ادا کیا ہے ۔ ان میں سے بعض اشخاص اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں لیکن ان کی خط و کتابت فارسی ہی میں ہوتی تھی ۔ اگرچہ ان میں سے صرف چند ادیبوں کے خطوط ہمارے سامنے ہیں لیکن جو موجود ہیں ان سے بھی اس عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات پر روشنی پڑتی ہے اور اس زمانے کی مکتوبات نگاری کا نمونہ ملتا ہے ۔

انیسویں صدی عیسوی کے مکاتبات میں بھی مشق و مزاولت ، ضابطہ بندی اور اخذ و نقل کا بھی رنگ نمایاں ہے ۔ بعض انشاء پردازوں نے کچھ ادبی تجربے بھی کیے ہیں ۔ مثلاً بعض ادیبوں نے خالص فارسی لکھی ہے جس میں عربی الفاظ کے نہ لانے کا التزام کیا ہے ۔ پاکستان و ہند میں اس تحریک کے سب سے بڑے اور باوقار نقیب مرزا غالب تھے ، جن کی نظم و نثر میں عربی الفاظ نسبتاً کم نظر آتے ہیں ۔ 'مہر نیمروز' ان کی اسی کوشش کی یادگار ہے ۔ اس دور کی بعض انشائیں عربی الفاظ سے یک قلم خالی ہیں ۔ مثلاً 'انشائے عجیب' تالیف محمد جعفر ۔ صنعتوں کے معاملے میں حکیم بدرالحسن نے 'رقعات منظری' میں کئی خط صنعتِ مہملہ میں غیر منقوط لکھے ہیں ۔ بہت سی صنائع بدائع اور بھی صرف کی ہیں اور فن طب کے تلازمے خوب باندھے ہیں ۔ منشی کامتا پرشاد کا مجموعہ 'انشای بے نقاط' ایسا ہے کہ اول سے آخر تک نقطہ دار حرف نہیں ہیں ۔

اس صدی کے بعض رقعات کے مجموعے نو مشق مبتدی اشخاص کے لیے بہت مفید ہیں ۔ ان میں مضامین کا تنوع اور ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کے لیے سلیس نمونے موجود ہیں ۔ بعض میں القاب و آداب کی فہرستیں ہیں جو فن انشاء کے لوازم ہونے کے علاوہ ہمارے قومی آداب ، حسنِ معاشرت ، فرقِ مراتب ، آدابِ انسانیت اور مشرقی شرافت و غیرت کی بھی تعلیم دیتے ہیں ۔ بیٹے کا باپ کو ولیٔ نعمت ، قبلۂ دارین لکھنا ، چھوٹے بھائی کا اپنے برادر گرامی کو اخوان پناہ ، مشفق برادران کہنا یا شوہر کا بیوی کو 'شمعِ فانوسِ عصمت'

'گوہر درج عفت' کے الفاظ سے خطاب کرنا اہل مشرق کی مرتبہ دانی اور شرافت کا آئینہ دار ہے ۔ ان الفاظ کی تہہ میں ہماری تہذیب جھلکتی ہے ۔ اس تہذیب و ثقافت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے بلکہ ہندو اس سے اتنے متاثر ہوگئے تھے کہ ان کے لباس ، خورا ک ، بول چال ، آداب و اطوار' افکار و عقاید اور انداز زندگی سب اسلامی رنگ میں رنگے گئے تھے ۔ وہ شاہی دفاتر کی ملازمت میں مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ ، محکمۂ مال میں مسلمانوں سے بہت آگے اور فن انشاء میں مسلمانوں کے قدم بہ قدم تھے ۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں ہندو منشیوں نے رقعات و مکاتیب کے بے شمار مجموعے تالیف کیے ہیں ۔ ان مجموعوں کے متعلق یہ تصور کرنا البتہ غلط ہے کہ یہ تعداد میں یا حسن عبارت میں مسلمانوں کے مجموعوں سے زیادہ ہیں ۔ مسلمان اہل قلم بالعموم قرآن ، حدیث ، فقہ اور تفسیر سے باخبر ہوتے تھے اور عربی و فارسی کی بلاغت کا ورثہ انہیں پشت بہ پشت منتقل ہوتا تھا ۔ ہندو منشیوں نے بھی مراسلات میں بہت محنت کی ہے اور کہیں کہیں اپنے مسلمان حریفوں کے برابر آ گئے ہیں ، لیکن ان سے آگے کبھی بھی نہیں بڑھ سکے ۔ ان کے لیے یہی بات باعث تعریف ہے کہ وہ ایک غیر ملکی زبان میں اہل زبان کے دوش بہ دوش چلنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں ۔ صفحات مابعد میں مجموعہ ہائے انشا کی جو فہرست آتی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ ہنود نے اس فن پر کچھ کم احسان نہیں کیا ۔ بہ این ہمہ جادو ناتھ سرکار کا یہ قول حقیقت سے دور ہے کہ ہندو منشی مسلمان منشیوں سے زیادہ کامیاب تھے ۔

انیسویں صدی عیسوی کی انشاؤں کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جو فنی اعتبار سے تو نہیں لیکن اپنی افادی حیثیت کے پیش نظر قابل تعریف سمجھی جا سکتی ہے ۔ یعنی انشاء و مراسلات کے بعض مجموعوں میں عدالتی کاغذات کے نمونے بھی جمع کر دیے گئے ہیں ۔ مثلاً بیعنامہ ، رہن نامہ ، ہبہ نامہ ، وقف نالش ، استغاثہ ، تمسک قرض وغیرہ کے باضابطہ عدالتی نمونے درج کیے ہیں ۔ بعض خوش طبعوں نے ان عدالتی نمونوں کے علاوہ عاق نامہ ، طلاق نامہ ، نکاح نامہ ، تعزیت نامہ ، تہنیت نامہ وغیرہ اور عاشق و معشوق کی خط و کتابت اور القاب کے نمونے بھی درج کیے ہیں اس لیے کہ زندگی کے مختلف مرحلوں میں منشی کو اس قسم کے رقعات سے بھی دوچار ہونا ہی پڑتا ہے[1] ۔

---

(۱) انشائے فائق ، ص ۱۴ ، ۱۵ ، ۲۷ ، مطبع نظامی کانپور ۱۲۷۹ھ

تاریخی ، سیاسی ، معاشرتی ، تہذیبی اور عدالتی نقطۂ نظر سے ان خطوط و رقعات کا مطالعہ بہت مفید ہے ۔ بعض مکتوبات ان خوبیوں سے عاری ہیں ۔ تاہم ان کا بھی کوئی نہ کوئی افادی یا تفریحی پہلو ہے ۔ بعض میں دوستانہ بے تکلفی کی جھلک نظر آتی ہے ۔ مرزا عبدالقادر بیدل کے اکثر خطوط ، جو انہوں نے اپنے معاصر امراء مثلاً شکراللہ خان کو لکھے ، دوستانہ خوش گفتاری سے معمور ہیں ۔ محمد حسین قتیل کے خطوط بنام خواجہ امام الدین امامی اس خوش معاشی و خوش باشی کے آئینہ دار ہیں جو بے تکلف دوستوں اور عزیز شاگردوں میں روا رکھی جاتی ہے ۔ کسی خط میں ''لڈوئے مونگ'' کی فرمائش ہے ، کسی میں 'دریائے لطافت' کا ایک نسخہ بھیجنے کی نوید ہے ، کسی میں لکھنؤ کے مشاعرے کا حال درج ہے ۔

انیسویں صدی عیسوی کے ان مکتوبات میں بعض مجموعے ایسے بھی ملتے ہیں جو نہایت قابل انشاء نگاروں کے قلم سے نکلے ہیں اور حسن عبارت کا شاہکار سمجھے جانے کے مستحق ہیں ۔ یہ مرزا غالب ، حکیم مومن خان مومن اور نواب مصطفٰی خان شیفتہ کے خطوط کے مجموعے ہیں ۔ مرزا غالب کے خطوط 'پنج آہنگ' اور 'باغ دو در' میں محفوظ ہیں ۔ مومن وارفتہ مزاج کے خطوط کو ان کے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خان نے ان کی وفات سے تین سال بعد مئی ۱۸۵۵ء میں مرتب کرکے مطبع سلطانی سے شائع کروایا ۔ شیفتہ اگرچہ فارسی انشاء نگاری میں اپنے ان دونوں استادوں سے پیچھے ہیں لیکن ان کی خوش اسلوب ، نازک تراش طبیعت حسن کاری میں ایک مقام رکھتی ہے ۔ غالب و مومن کے دوستوں ، عزیزوں اور شاگردوں یعنی مولانا فضل حق خیر آبادی ، مفتی صدرالدین آزردہ ، مولوی عبداللہ خان علوی ، امام بخش صہبائی ، نیّر رخشاں ، نواب محمد سعید خان ، نواب یوسف علی خان ناظم ، مولانا غلام امام شہید ، مولوی غلام غوث بیخبر ، مرزا ہرگوپال تفتہ وغیرہ نے بھی فارسی مراسلت کو اپنا شیوہ بنائے رکھا ہے ۔ یہی کیفیت دہلی کے علماء کی ہے ۔ شاہ عبدالعزیز کی شخصیت کو اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کا سنگم سمجھنا چاہیے ۔ وہ ۱۸۲۳ء/۱۲۳۹ھ میں فوت ہوئے ۔ ان کے خطوط اصلاح مذہب اور رد بدعت کے مضامین پر مشتمل ہیں ۔ لکھنؤ اور صوبجات متحدہ کے مشرق علاقوں کے علماء نے بھی اپنے مکتوبات سے یہی فریضہ انجام دیا ہے ۔ مولانا دلدار علی مجتہد ، مفتی محمد عباس اور علمائے فرنگی محل کی تحریریں مذہب کی اصلاح و احیاء کے لیے وقف تھیں ۔

انیسویں صدی عیسوی میں اردو زبان کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ فارسی کی اہمیت بتدریج کم ہوتی چلی گئی - مرزا غالب نے ۱۸۴۸ء سے اردو میں خط لکھنا شروع کیے اور اگرچہ بعض مشاہیر مثلاً مفتی محمد عباس ، سلطان ٹیپو کے شہزادوں اور رجب علی ارسطو جاہ کو وہ فارسی ہی میں خط لکھتے تھے ، لیکن انہوں نے اردو میں ایسا انداز تحریر ایجاد کیا کہ ان کی تقلید میں اکثر ادیبوں اور منشیوں نے خط و کتابت کے لیے اردو کو اختیار کر لیا - اس طرح فارسی مراسلت کا رواج کم ہو گیا - تاہم برصغیر کی مختلف ہندو اور سکھ اور مسلمان ریاستوں کی دفتری زبان اب بھی فارسی ہی تھی - درباری خط و کتابت اسی میں ہوتی تھی - بیسویں صدی عیسوی میں مشکل ہی سے کوئی ایسا ممتاز اہل قلم نظر آتا ہے جس نے فارسی میں اعلیٰ درجے کے خطوط لکھے ہوں - یوں اس صدی کے ابتدائی عشروں میں بعض بزرگوں مثلاً حسن نظامی ، علامہ اقبال ، شیخ غلام قادر گرامی ، مولانا ظفر علی خان ، شاد عظیم آبادی ، مولانا نجم الحسن مجتہد وغیرہ کو فارسی سے شغف تھا، لیکن ان میں سے صرف چند حضرات کے خطوط بعض گھرانوں میں محفوظ ہیں - اس طرح یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ بیسویں صدی عیسوی میں فارسی کی انشاء میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا اور یہ دستور ختم ہوگیا -

۱۷۰۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کی فارسی مراسلت کا یہ سرسری خاکہ تھا ، اس کی تفصیل اور انشاء و مراسلت کے نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں -

اٹھارھویں صدی عیسوی

اس صدی میں اگرچہ مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور حکومت کے ساتھ درباری زبان میں بھی ضعف آنے لگتا ہے تاہم فارسی مراسلت کا دستور اسی طرح قائم رہا - جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور جنگ بکسر (۱۷۶۴ء) کے نتیجے میں انگریزوں نے شاہ عالم سے بنگال اور بہار کی دیوانی کی سند حاصل کر لی تھی اور چونکہ فارسی اب تک علمی اور درباری زبان تھی اس لئے انگریزوں نے سیاسی ضرورتوں کے لحاظ سے اسے سیکھنا ضروری سمجھا - بعض انگریز مثلاً سر ولیم جونز ، کرک پیٹرک ، گلکرسٹ ، وارن ہیسٹنگز ، ویلزلی وغیرہ مشرقی علوم سے طبعاً دلچسپی رکھتے تھے - ان تمام عوامل کے زیر اثر مدرسۂ عالیہ کلکتہ ۱۷۸۱ء ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۷۸۴ء اور فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء جیسے

اداروں کی بنیاد پڑی جس سے فارسی کی عظمت برقرار رہی ۔ دیسی ریاستوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرلوں کے مابین فارسی ہی میں خط و کتابت ہوتی تھی ۔ نوابانِ اودھ ، مرہٹہ پیشواؤں ، شاہ عالم ثانی ، راجہ بنارس ، راجہ جودھپور وغیرہ سے انگریزوں کی یہ خط و کتابت اب تک حکومتِ ہند کے پرانے فائلوں میں محفوظ ہے[۱] ۔

اس کے باوجود فارسی اس زور بیان ، متانت اور استحکام سے محروم رہی جو دو صدی پہلے کے ادیبوں کا امتیازی وصف تھا ۔ منشیوں کی تخلیقی صلاحیتیں گھٹ گئیں اور اسلوبِ نگارش میں وہ تقلید پر قناعت کرنے لگے ، یعنی مراسلت کے سابقہ نمونوں مثلاً 'انشائے ابوالفضل' ، 'بہار سخن محمد صالح کنبوہ' 'خلاصۃ المکاتیب' سجان رائے وغیرہ کو سامنے رکھ کر اپنا زور قلم دکھاتے رہے ۔ اس میں بھی زیادہ زور تلازمہ بندی پر دیا ہے ۔ اس دور کے بعض بزرگ مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل متوفی ۵ دسمبر ۱۷۲۰ء ، علامہ عبدالجلیل واسطی بلگرامی متوفی ۲۸ دسمبر ۱۷۲۴ء ، خان سراج الدین خان آرزو متوفی ۲۷ جنوری ۱۷۵۶ء ، شیخ علی حزین اصفہانی بنارسی متوفی ۱۷۶۶ء ، غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۷۸۶ء اس پائے کے بزرگ ہیں کہ انہیں اجتہاد کا منصب حاصل ہے اور ان کے متعلق تقلید کا لفظ زبان پر لانا موزوں نہیں معلوم ہوتا ۔ لیکن ان کے مکتوبات میں وہ محکمی اور استواری نہیں ملتی جو امیر خسرو ، محمود گاواں ، غیاث الدین خواند میر ، طاہر وحید اور ابوالفضل جیسے بلند پایہ مکتوب نگاروں کا جوہر ہے ۔ ان میں سے اکثر کا اسلوب تحریر خفیف سے فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے مشابہ ہے اور تقریباً سب لفظی بذلہ سنجی تلازمہ بندی ، خیال باقی اور اصطلاحات نگاری کے شائق ہیں ۔ البتہ شیخ علی حزین اور غلام علی آزاد اپنی سادگی پسندی ، مدعا نگاری اور سلاست و روانی کی بدولت اس گروہ سے الگ نظر آتے ہیں ۔

با ایں ہمہ مذکورہ بالا اشخاص اور ان کے دیگر معاصرین اپنے فن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں ۔ ان بزرگوں کا ایک جوہر اس عہد کی تہذیب و شائستگی کا پیدا کردہ یہ ہے کہ یہ لوگ شریف النفس ، قناعت پسند ، مرتبہ شناس اور آداب دان تھے ۔ گوشہ گیری ، یکسوئی اور پتا مار کر کام کرنے کی عادت جسے علامہ اقبال ، 'خون جگر' سے

---

(۱) Calendar of Persian Correspondence, vol : IV Calcutta, 1925, PP. 29, 121, 212, 252, 539.

تعبیر کرتے ہیں ، ان میں سے اکثر کا معمول تھی ۔ یہ لوگ بالعموم یک فنی ہوتے تھے یعنی ایک ہی فن کی تحصیل میں عمر عزیز گزار دیتے تھے ۔ اسی بنا پر نہایت ضخیم اور مفید کتابیں ان سے یادگار ہیں جو ان کی محنت و جان کاہی کی شہادت دیتی ہیں ۔ انشاء نگاری اور مراسلت کو اس زمانے میں بہت بلند مقام حاصل تھا اور ادیبوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس فن میں کمال حاصل کریں ۔ وجہ یہ تھی کہ دربار شاہی میں کسی اچھے عہدے کے حاصل کرنے یا اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ادیب کو مراسلت میں کمال حاصل ہو[1] ۔

نظامی عروضی سمرقندی نے 'چہار مقالہ' میں فن دبیری کی تعریف کے ضمن میں قیاسات خطابی و بلاغی ، حیلہ و استعطاف اور ترتیب سخن کو نمایاں خصوصیات قرار دیا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ دبیر کی ذہنی صلاحیتیں پختہ ، قوت بیان زبردست اور مطالعہ نہایت وسیع ہو ، تاکہ وہ ہر مضمون کو تحریر کرنے اور اسے مکتوب الیہ تک بہ طریق احسن پہنچانے میں اس فن کے تقاضوں سے عہدہ برا ہو سکے کہ ترسیل و ابلاغ کے یہی معنی ہیں ۔ اٹھارھویں صدی کے یہ مراسلت نگار ان اوصاف کے حامل تھے ۔ لیکن ان کے رقعات پڑھتے وقت یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ یہ لوگ تازہ بہ تازہ راہیں نکالنے کے قائل نہ تھے ۔ (شاید قابل نہ تھے) ۔ انہیں مترادف الفاظ اور ہم مضمون فقروں کی تکرار بہت پسند تھی اور کسی شے کے تلازمے لکھتے چلے جانے کو یہ بڑا کمال سمجھتے تھے ۔ در اصل تلازمہ بندی کا یہ شوق کچھ اسی زمانے سے مخصوص نہیں بلکہ تیرھویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) کے بعد کے ایران کے اکثر ادیبوں میں مختلف صنائع بدائع ، تلازمہ نگاری اور مترادف نویسی کا شوق پیدا ہوگیا تھا ۔ رشید الدین فضل اللہ تو ایک 'تاریخ وصاف' لکھ کر بدنام ہوگیا ورنہ بے شمار اہل قلم اسی مرض میں مبتلا تھے[2] ۔ خواند میر اپنی تالیف 'نامۂ نامی' ، میں جا بجا مختلف فنون مثلاً موسیقی ، دہقانی ، زراعت ، حفظ قرآن وغیرہ کے تلازمے درج کرتا ہے[3] ۔ 'ریاض الانشاء' اور 'مناظر الانشاء' میں یہی رنگ

---

(۱) سجان رائے بٹالوی نے خلاصۃ المکاتیب کے دیباچے میں اپنے خلاصے کی وجہ تالیف یہی بیان کی ہے کہ میں اپنے بیٹوں کو دبیر بنانا چاہتا ہوں ۔

(۲) براؤن اپنی تاریخ ادبی ایران میں وصاف کو پہلا بدراہ قرار دیتا ہے ۔ جلد چہارم ، ص ۴۱۳ ، طبع کیمبرج ۱۹۵۹ ۔

(۳) انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ نمبر ۲۰۵۵ ، برگ ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۸ ۔

نمایاں ہے۔ 'سہ نثر ظہوری' انھی پیچ در پیچ لفظی صنائع اور معنوی آرائش کا طلسم ہے۔ اس کی رنگین نگاری عبارت کے الجھاؤ کو گوارا بنا دیتی ہے ورنہ خیال بافی اور تلازمہ بندی کے پیچ سلجھائے نہیں سلجھتے۔

زیر بحث مراسلت نگاروں میں مرزا عبدالقادر بیدل کا رتبہ بہت نمایاں ہے۔ شاعری میں ان کے تخیّل کی پرواز اور فکر کی گہرائی کا جو عالم ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مرزا غالب جیسا شخص خامہ' بیدل کو 'عصائے خضرِ صحرائے سخن' سمجھتا ہے۔ لیکن مراسلت میں وہ بھی لفظی مناسبتوں اور تلازمہ بندی کے چکر میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک رقعے کا اقتباس ملاحظہ ہو جو نواب شکر اللہ خاں کے نام کپڑے کے تھانوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھا ہے۔ صنعتِ پارچہ بافی کی تمام مناسبات اور اصطلاحات اس ایک خط میں جمع ہو گئی ہیں:

> ''تار و پود خلعت التفات بر قامت اخلاص مندان ازان چسپان تر است کہ بہ آغوش کشائی زبان ہا راہ حرفے نوان کسود۔ ذیل عنایت بر فرق ارادت کیشان ازان پہناور (تر) است کہ ثنا پیائے طول کلام سر رشتہ عرض توان پیمود۔ بہ تالیف عجز بیانی لبے بہم آوردن ازین کارگاہ دو رشتہ بہم یافتن است و بہ ترتیب حیرت نگاہی مژگان باز کردن ازین پردہ بخیہ واری وا شگافتن[1]''

مرزا بیدل کے اکثر خطوط میں یہی انداز کارفرما ہے۔ لیکن وہ رقعے جو سنجیدہ مضامین پر مشتمل ہیں، اس تکلف سے بری ہیں۔ مثلاً نواب کرم اللہ خان کو ان کی مرحومہ بیگم کی تعزیت میں جو خط لکھا ہے وہ نسبتاً سادہ ہے۔ اسی طرح ایک اور مکتوب، جس میں اورنگ زیب کے دو بیٹوں یعنی محمد معظم اور محمد اعظم کی جنگ تخت نشینی کا حال لکھا ہے، نسبتاً اس تکلّف سے پاک ہے۔ محمد اعظم اور اس کے شہزادے بیدار بخت کے قتل ہو جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مرزا نے لفاظی و عبارت آرائی کے بجائے واقعہ نگاری کو ملحوظ رکھا ہے[2]۔ 'رقعات بیدل' سے محمد معظم

---

(۱) رقعات بیدل، ص ۹۴، مطبع احمدی شاہدرہ۔
(۲) ایضاً، ص ۲۳۵۔

کی تخت نشینی ، سلطنت اور اس کے رسوائے دہر بیٹے جہاندار شاہ کے زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس اعتبار سے ان کی تاریخی اہمیت بھی ہے ۔ بعض رقعات میں ادبی مسائل پر بحث ہے ۔ مثلاً حکیم فیض علی کی غزل پر اصلاح دیتے ہوئے محاسن و معائبِ کلام کے اصول بیان کئے ہیں ۔[1]

خان آرزو ، عبدالجلیل بلگرامی اور غلام علی آزاد کا اندازِ نگارش خفیف سے فرق کے ساتھ یہی ہے ۔ غلام علی آزاد بیانِ مطالب و واقعات میں بہت سلیس ہیں ۔ 'سروِ آزاد' اور 'خزانۂ عامرہ' میں ان کی زبان سادہ و رواں ہے اور اسلوبِ بیان صاف ہے ۔ مطالب پوری صحت اور نفاست و نزاکت سے بیان ہوئے ہیں ۔ لیکن جہاں انشاء کے تقاضوں اور روایتوں کا پاس کرتے ہیں وہاں ان کا انداز تحریر پیچیدہ ہو جاتا ہے ۔

خان آرزو کو فارسی اور اردو میں مجتہد کی حیثیت حاصل ہے ۔ وہ بہ یک وقت ادیب ، نقاد ، تذکرہ نگار ، قواعد نویس اور شاعر ہیں ۔ انہیں کسی اعتبار سے عاجز سخن نہیں کہہ سکتے ۔ 'مجمع النفائس' ان کی قوت تحریر کا شاہد ہے اور 'تنبیہ الغافلین' ان کی قادر البیانی کی آئینہ دار ہے ۔ لیکن انشاء کے میدان میں آتے ہی وہ بھی مراعاۃ النظیر ، تلازمہ نگاری ، مناسبات لفظی اور تکرار و ترادف کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ۔

شیخ علی حزیں (متوفی ۱۷۶۶ء) اصفہانی ہیں لیکن جب وہ اس برصغیر میں وارد ہوئے اور یہیں رہ پڑے تو انہیں شبہ قارۂ پاک و ہند کے ادیبوں میں شمار کرنا بالکل جائز ہے ۔ ''از بنارس نہ روم'' کہنے والا یہ ایرانی ، جو مرزا سودا کے اردو مطلع کی داد دے سکتا تھا ، بہت طبیعت دار شاعر تھا اور اس کی غزلیں نازک خیالی و فصاحت کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ امکان تھا کہ شاید نثر میں بھی وہ وہی مرصع کاری کرے گا جو شاعری میں اس کا معمول تھی ۔ لیکن اس کے برعکس وہ نثر میں نہایت سادہ نویس ہے ۔ ذیل کی عبارت ، جس میں نادر شاہ کے لشکریوں کی تاخت و تاراج اور اہل دہلی کے قتلِ عام (۱۷۳۹) کا ذکر ہے ، اپنی سادہ واقعہ نگاری میں 'ہمایوں نامہ' ، 'اکبر نامہ' ، اور 'رقعات عالمگیر' کی یاد دلاتی ہے :

''بالجملہ چون روز شد ہمان آشوب در اشتداد بود ۔ نادر شاہ صبح از

---

(۱) رقعات بیدل ، ص ۵ ۔

قلعہ سوار شدہ بہ قتل عام فرمان داد و فوجے از سوار و پیادہ بہ آن کار مامور گشتہ بہ ایشان گفت کہ تا جائے کہ یکے از قزلباش کشتہ شدہ باشد ، احدے را زندہ نہ گذارند ۔ لشکر قزلباش بنیاد قتل و غارت کردہ بہ منازل و مساکن آن شہر در آمدند و قتلے بہ افراط کردہ اموال بہ یغما و عیال بہ اسیری بردند و بسیارے ازاں شہر خراب و سوختہ شد ۔ چون نصفے روز بگذشت و تعداد کشتگان از حساب در گذشت ، نادر شاہ ندائے امان بقیۃ السیف در دادہ[1] ۔''

شاہ ولی اللہ اور ان کے معاصر علماء کے خطوط میں عربی الفاظ کی کثرت ہے ۔ یہ حضرات عربی فارسی میں کامل اور علوم متداولہ کے ماہر تھے ۔ ان کی عبارت میں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی بے لطفی ضرور محسوس ہوتی ہے ۔ لیکن خلوص اور جوش عمل اس کی تلافی کر دیتے ہیں ۔ یہ لوگ قدرتاً سادگی پسند ہیں ۔ لیکن مذہبی اصطلاحوں اور علمی مسائل و مباحث کی وجہ سے عبارت میں ثقالت کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ۔ شاہ ولی اللہ اپنے خطوط میں مذہبی مسائل کے علاوہ حدیث و تفسیر کے نکتے بھی بیان کرتے ہیں ۔ کبھی کبھی تجلّیاتِ ذات اور خلقِ قرآن کے باریک دقائق بھی تحریر کر جاتے ہیں ۔ ان موقعوں پر تحریر میں اصطلاحات کی کثرت اور عربی الفاظ کی افراط ہو جاتی ہے ۔ لیکن جہاں تبلیغِ دین کے لیے سادہ عبارت لکھنا چاہتے ہیں وہاں ان کی زبان سادہ و سلیس بھی ہے ۔ ملاحظہ ہو :

''اوّل چیزے کہ عقل آن را بر خودش واجب میگرداند ، آنست کہ تتبّع اخبار آن حضرت در بیان احکام الٰہی باید کرد و پیروی آن اخبار بہ دل و جوارح باید نمود ۔ ثانیاً برخود لازم می گرداند کہ اخبار اہل ملل از ائمہ خود دو قسم می باشند : نقل لفظ صاحب ملّت و آن چند قسم می باشند ، متواتر ، مستفیض ، مشہور و خبر صحیح و حسن و غریب و ضعیف ۔ دوم نقل بالمعنٰی و آن نیز چند قسم می باشد[2] ۔''

---

(۱) شیخ علی حزین اصفہانی ، تاریخ احوال ، ص ۲۸۱ ، طبع لندن ۱۸۳۱ء ۔
(۲) کلمات طیبات ، ص ۱۷۲ ، مطبع مجتبائی دہلی ۔

کم و بیش یہی کیفیت اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے علماء اور مشائخ کی ہے ، مثلاً شاہ غلام علی ، شاہ عبد العزیز ، شاہ رفیع الدین اور مولانا دلدار علی مجتہد وغیرہ ۔ اسلوب ہر شخص کا مختلف ہے لیکن علمی اصطلاحیں ، مذہبی روایات ، فارسی اشعار ، عربی مقولات اور آیات و احادیث کے حوالے کم و بیش سب میں ملتے ہیں ۔ تبلیغ دین متین اور اعلائے کلمۃ الحق کو ان کی قدرِ مشترک سمجھنا چاہیے ۔

اس عہد کے ایک بزرگ مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۷۸۰ء/۱۱۹۵ھ) مذہب ، فقر اور تصوّف کے جامع ہیں ۔ ان کی زندگی فقیرانہ تھی جس میں آزادگی و آزادہ روی کا رنگ بھی تھا ۔ یہ بھی اپنے رقعات میں مذہب اور تصوف یعنی شریعت اور طریقت کے مسائل کا بیان کرتے ہیں ۔ لیکن جیسا کہ انھوں نے فارسی شاعری کو ایہام گوئی سے نجات دلائی ، فارسی نثر میں بھی اصلاح کی ۔ ان کی عبارت میں سادگی اور وضاحت کا عنصر نمایاں ہے ۔ بالخصوص جہاں کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں وہاں ان کی زبان کی سلاست اور واضح ہو جاتی ہے ۔ ایک خط میں اپنے آباء و اجداد کا ذکر اس طرح کیا ہے :

> "دو عالم اعتبار نسبت این خاکسار بہ بست و ہشت واسطہ بتوسط محمد بن حنفیہ بہ شیر بیشۂ کبریا علی مرتضٰی علیہ التحیۃ و الثناء می رسد ۔ امیر کمال الدین یکے از اجداد فقیر در ہشت صد ہجری بہ تقریبے از بلدۂ طائف در مملکت ترکستان افتاد و باصبیہ یکے از حاکمان آن حدودش کہ سردار الوس قاقشالان بود وصلت دست داد ۔ چون اورا پسرے نبود ، حکومت آن ناحیہ تعلق بہ اولاد ایشان گرفت ۔ ازان خاندان دو برادر محبوب خان و بابا خان نام کہ احوال این ہر دو در تاریخ اکبری مذکور است ۔"[1]

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کا یہ انشائی یا مراسلاتی ادبی سرمایہ مذہبی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے کیونکہ اس سے اس دور کے تاریخی واقعات اور مذہبی میلانات پر روشنی پڑتی ہے ۔ رقعاتِ قطب الملک سیّد عبداللہ خان بارہہ (جو امیرالامراء سیّد حسین علی خان کا بڑا بھائی تھا) کے مطالعے

---

(۱) کلمات طیّبات ، ص ۱۲ ، مطبع مجتبائی دہلی ۔

سے فرخ سیر کے عہد کے سیاسی حالات نظر کے سامنے آتے ہیں ۔ بالخصوص وہ مراسلات جو اس نے راجا اجیت سنگھ راٹھور ، نظام الملک آصف جاہ اور چھبیلا رام صوبہ دار الہ آباد کو بھیجے ، امور سلطنت کے بعض غیر معروف حالات سے آگاہ کرتے ہیں[1] ۔ یہی کیفیت راجا لچھمی نرائن کے رقعات کی ہے جو خان آرزو کا شاگرد اور شجاع الدولہ کی بیگم (بہو بیگم) کا متوسل اور بعد ازاں آصف الدولہ کے دربار سے متعلق ہو گیا تھا ۔ اس کے رقعات کو فیض بخش نے ۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ میں جمع کیا[2] ۔ بعض رقعات سے اس کے عہد کے سیاسی خلفشار اور مرہٹہ گردی کی تفصیل معلوم ہوتی ہے ۔ ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ میں مرہٹوں نے میرٹھ کو جس طرح تاراج کیا تھا اس کا حال شرح و بسط کے ساتھ ایک خط میں درج ہے[3] ۔ انھی دنوں نواب شجاع الدولہ نے اٹاوہ کا قلعہ مرہٹوں سے چھین کر شرف الدولہ نواب ضابطہ خان ابن نجیب الدولہ کو ان کی قید سے آزاد کیا ۔ تاریخی واقعات کے ذکر میں سلاست و سادگی ضروری ہے لیکن اس واقعے کے بیان میں جابجا انشاء کی رنگینی اور تلمیح ، تشبیہ اور استعارہ کا تکلف موجود ہے ۔

تاریخی ، مذہبی اور سیاسی معلومات کے اس افادی پہلو کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے مکتوبات کا مجلسی اور تہذیبی پہلو بھی قابل داد ہے ۔ ان خطوط کی عبارتوں میں ہماری تہذیب ، آداب رتبہ شناسی ، حسن سلوک اور طرز معاشرت کا رنگ خوب جھلکتا ہے ۔ 'انشائے خلیفہ' تالیف شاہ محمد ذرا پہلے کا مجموعہ ہے ۔ اس مجموعے میں تہذیبی اور مجلسی شائستگی نمایاں ملتی ہے ۔ یہی کیفیت ایک دوسرے مجموعے 'انشائے دلکشا' میں پائی جاتی ہے ۔ محض القاب و آداب ہی پڑھ لینے سے اس آداب دانی اور فرق مراتب کا علم ہو سکتا ہے جو مشرقی معاشرت میں عام ہے ۔

اس فن کی بعض کتابیں مثلاً 'انشائے مادھورام' وغیرہ آرائش الفاظ و معانی کی تعلیم دینے کے علاوہ خط و کتابت کے آداب اور مکتوب الیہ کی مرتبہ دانی کا سبق بھی دیتی ہیں ۔

'انشائے خلیفہ' کے آخر میں صفحہ ۴۲ سے ۶۶ تک مختلف مضامین کے اشعار مثلاً شکایت بے وفائی ، انتظار نامہ ، گلہ مندی ، اظہار آرزو ، مصائب فراق ، عہد و پیمان وغیرہ

---

(۱) رقعات قطب الملک عبداللہ خان ، مطبوعہ علی گڑھ یونیورسٹی ۱۹۵۸ء ۔
(۲) فہرست ریو ، ج ۲ ، ص ۷۹۱ ۔
(۳) رقعات لچھمی نراین ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، ورق ۱۳ ۔

بھی درج ہیں تاکہ مبتدی اپنے خطوط کو حسب حال اشعار سے زینت دے سکیں[1] ۔ یہاں چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں :

آخر نہ من و تو دوست بودیم   آن عہد شکستی و بہانم
سعدی

بہ آن یار تغافل شیوہ شوخ من بگو قاصد   کہ من ہم اے وفا بیگانہ گاہے آشنا بودم
ابوالحسن بیگانہ

نظر بہ نامۂ این خاکسار نیست ترا   دماغ خواندن خط غبار نیست ترا

مشت غبار خود را از کوئے یار بردم   از خاطر رقیبان آخر غبار بردم

فن انشاء کی بعض کتابیں اس فن کی بنیادی ضرورتوں سے بھی آگاہ کرتی ہیں ۔ مثلاً 'دقائق الانشا' ، جسے رنچھور داس جونپوری نے ۱۷۴۰ء کے قریب مرتب کیا ہے[2] ، فن انشا کے سات دقیقوں پر بہ تفصیل ذیل مشتمل ہے :

دقیقۂ اول : بحث حروف تہجی و اعراب

دقیقۂ دوم : بحث کلمہ (اسم ، فعل ، حرف)

دقیقۂ سوم : اصول نثر و نظم

دقیقۂ چہارم : اسقام کلام

دقیقۂ پنجم : محاسن کلام

دقیقۂ ششم : قواعد زبان فارسی

دقیقۂ ہفتم : آداب گفتگو ، آداب مناظرہ ، آداب ملازمت وغیرہ

دقیقۂ ہفتم میں جو آداب و قواعد درج ہیں ان کے یہ معنی ہوئے کہ منشی کو فن مراسلت پر پوری طرح حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ آداب ِ معاشرت سے بھی واقف ہونا لازم ہے تاکہ وہ مختلف اشخاص سے گفتگو کرنے یا کسی حریف سے مباحثہ کرنے یا اپنے آقا سے ہمکلام

---

(۱) شاہ محمد خلیفہ ، انشائے خلیفہ ، مطبع حجری ۱۲۶۵ھ ۔

(۲) سخاؤ و ایتھے ، فہرست باڈلین نمبر ۱۴۰۳ ۔

ہونے کے آداب سے ماہر ہو ۔ اسلامی تہذیب میں مجلسی آداب کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ قرآن و حدیث میں والدین ، اعزہ و اقربا ، مسافر ، ہمسایہ ، چھوٹے بڑے ، دوست دشمن غرض ہر شخص کے حقوق معین کرکے احترام آدمیت کا سبق پڑھایا گیا ہے ۔ ہندو منشی بھی مسلمانوں کے یہ طور طریقے سیکھ کر ان کے ایسے ہمرنگ ہو گئے تھے کہ کتاب کو بسم اللہ سے شروع کرتے اور حمد ، نعت اور منقبت اہلبیتؓ اظہار درج کرنے کے بعد اصل موضوع شروع کرتے[1] ۔ قتیل نے اپنے رقعات میں یہ تفنن بھی کیا ہے کہ حمد عربی زبان میں لکھی ہے ، نعت ترکی میں، منقبت فارسی میں[2] ۔

بعض رسائل اور مجموعے ایسے ہیں کہ ان میں دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ وزراء ، امراء اور خوانین عالی شان کے القاب اور انداز خطاب کے نمونے بھی درج کئے گئے ہیں تاکہ کاتب کو القاب و آداب سے آگاہی حاصل ہو ۔ بعض میں عدالتی کارروائیوں اور دستاویزوں مثلاً بیعنامہ ، رہن نامہ ، امانت نامہ ، خلافت نامہ کے نمونے بھی درج ہیں اور بعض میں قبالہ نکاح اور طلاق نامہ کے نمونے بھی ہیں کہ زندگی میں کاتب و منشی کو یہ تمام مرحلے طے کرنے ہی پڑتے ہیں ۔ 'انشائے فائق' اسی قسم کی معجون مرکب امرت دھارا قسم کی کتاب ہے[3] ۔ بعض رسائل مثلاً 'ظہیر الانشاء' میں صنائع ، بدائع ، تقطیع ، تنقید ، تاریخ گوئی اور اصلاح کلام کے گُر بھی درج ہیں[4] ۔ 'انشائے مادھورام' میں تہنیت عہد ، تہنیت ولادت فرزند ، بیان جلوس شاہی ، فوجی مہمات کی واقعہ نگاری ، واقعات شکار ، تعزیت زن و فرزند سے متعلق بہت سے خطوط ہیں جو مختلف مواقع پر معرض تحریر میں آئے اور فن انشاء کے طالبوں کے لئے عمدہ نمونہ ہیں[5] ۔ تلازمہ بندی ان سب میں کم و بیش موجود ہے ۔

انیسویں صدی عیسوی

یہ زمانہ شمالی ہند میں انگریزوں کے عروج کا دور ہے ۔ اس کے ابتدائی عشروں میں

---

(۱) انشائے مادھو رام ، مطبع محمدی لکھنؤ ، ۱۲۶۵ھ وغیرہ ۔
(۲) رقعات قتیل ، ص ۱ تا ۴ ، مطبع شعلہ طور کانپور ۔
(۳) محمد فائق : انشائے فائق ، ص ۵ تا ۳۲ ، مطبع نظامی کانپور ۱۲۷۹ھ ۔
(۴) ظہیر الدین بلگرامی ، ص ۳ تا ۱۵ ۔
(۵) انشائے مادھو رام ، ص ۲۰ تا ۱۱۶ ، مطبع محمدی لکھنؤ ، ۱۲۶۵ھ ۔

وہ صوبجات متحدہ کے مشرقی اضلاع پر قابض ہوئے ۔ دہلی اور آگرہ پر ان کا قبضہ ۱۸۰۳ء میں ہو چکا تھا ۔ ۱۸۴۳ء میں انہوں نے امیران سندھ کو مغلوب کر کے اس علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کیا ۔ ۱۸۴۹ء میں سکھ حکومت کو ختم کر کے پنجاب اور صوبہ سرحد کو بھی ضمیمۂ سلطنت بنا لیا ۔ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ پر قابض ہو گئے ۔ اگلے سال غدر کی پاداش میں دہلی کی نام نہاد حکومت کو بھی ختم کر دیا ۔ اس سیاست کا اثر فارسی زبان پر بھی پڑا جو اب تک ان تمام حکومتوں کی دفتری زبان تھی اور برطانوی حکومت اسی زبان میں ان درباروں سے مراسلت کرتی تھی ۔ تاہم ہندوؤں ، سکھوں اور مسلمانوں کی جو ریاستیں انگریزوں کے ہاتھ سے بچی رہیں ان کی درباری زبان بدستور فارسی رہی ، اگرچہ آخری عشروں میں اس زبان پر اضمحلال آنے لگا ۔ راجپوتانے کی ریاستوں ، پٹیالہ اور کپورتھلہ کی سکھ ریاست اور حیدر آباد دکن کی اسلامی مملکت میں درباری مراسلت فارسی ہی میں ہوتی تھی ۔ ان ریاستوں[1] کے فرمان فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے ۔ چنانچہ ریاست ٹونک سے حافظ محمود خان شیرانی کے والد محمد اسمٰعیل خان کو ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں عطائے اراضی کا جو فرمان جاری ہؤا ، اس کے اقتباس سے فارسی کے رواج اور طرز انشا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :

> ''درینولا بحکمہ تعالیٰ موازی پنجاہ بیگھہ اراضی بارانی بہ جریب کشادہ از موضع بیگم پورہ نو آباد سرحد موضع کناپہ پرگنہ ٹونک بہ وجہ خیر خواہی و اطاعت و خیر سگالی سرکار بنام محمد اسمٰعیل خان نسلا بعد نسل مستداماً معاف و مرفوع القلم فرمودہ ۔''

(اقتباس از فرمان مملوکہ پروفیسر مظہر خان شیرانی)

اسی طرح راجہ نریندر سنگھ والیٔ پٹیالہ کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کی خط و کتابت ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے زمانے کی ، جو پنجاب سیکریٹیریٹ کے محافظ خانے میں موجود ہے ، اس سے بھی ان ریاستوں میں فارسی زبان کی مراسلت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ چارلس مٹکاف اور مہاراجا رنجیت سنگھ کے مابین جو عہد نامہ ہؤا تھا وہ فارسی ہی میں ہے وغیرہ وغیرہ ۔

---

(۱) دیکھیے رام جس کی تاریخ کپورتھلہ جس میں ص ۵۰۹ ، ۵۱۲ اور ۶۰۳ پر ریاست کی خط و کتابت جان لارنس اور لارڈ ایلگن وائسرائے ہند وغیرہ کے ساتھ درج ہے ۔ نیز نجم الغنی کی اخبار الصنادید ، ج ۲ ، ص ۵۱۶ ، مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۸ء ۔
نیز تاریخ ٹونک ، ص ۱۹ ۔ فرمان اکبر شاہ بنام وزیرالدولہ والی ٹونک ۔

انگریزی سیاست کے غلبے کے باوجود برِ صغیر کے ہندو اور مسلمان ادیبوں نے فارسی خط و کتابت کا دستور قائم رکھا ۔ محمد حسن قتیل ، سید انشا ، مصحفی ، مرزا غالب ، مومن ، مفتی صدر الدین آزردہ ، صہبائی ، نیّر رخشان ، علوی ، غلام غوث بیخبر ، مرزا ہرگوپال تفتہ ، جواہر سنگھ جوہر ، مفتی محمد عباس لکھنوی ، دلدار علی مجتہد ، غرض اکثر ذی علم حضرات ، جن میں شعراء ، ادیب اور عالم سبھی شامل ہیں ، فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے ۔ مرزا غالب کے بعض انگریز دوست مثلاً مسٹر اسٹرلنگ سیکرٹری ، میجر جان جیکوب (جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں مارا گیا اور مرزا غالب سے اردو کے بجائے فارسی میں شعر کہنے کی فرمائش کیا کرتا تھا) ان سے فارسی ہی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے ۔ 'باغ دودر' میں جان جیکوب کے نام جو خط ہے اس میں مرزا غالب نے لکھا ہے کہ تمہارے بنا کردہ کنویں کی تاریخ تعمیر کہہ کر بھیج چکا ہوں ۔ ساتھ ساتھ ایک ہندو دوست ہیرا لال کی نوکری ، زادِ راہ اور امداد کی تاکیدی سفارش بھی کی ہے[۱]۔

مذکورہ بالا ادیب خط و کتابت میں قدیم اسلوب کے پابند رہے ۔ مرصّع عبارتیں ، مترادف الفاظ اور ہم مضمون فقروں کی تکرار ، صنائع کا استعمال ، استعارے اور تشبیہ کی باریکیاں بدستور رائج رہیں ۔ مرزا غالب کو یہ "محمد شاہی روش" پسند نہ آئی ۔ انہوں نے اپنے فطری اجتہاد سے وہ طریقہ ایجاد کیا کہ مراسلے کو مکالمہ کر دیا اور القاب مختصر کیا ۔ انتخاب الفاظ کے سلیقے ، اسلوب کی حسن کاری اور انداز بیان کی ندرت سے انہوں نے مراسلت کو بڑا حسین فن بنا دیا ۔ فارسی انشاء میں اتنے خوش اسلوب اور تراشیدہ انداز والے خطوط کم ملیں گے ۔ تاہم بعض منشی قدیم طریقے کے پابند رہے ۔ بلکہ بعض کی عبارتوں میں ہندی الفاظ و محاورات کا بھی دخل ہوگیا ۔ قتیل (متوفی ۱۸۱۶ء/۱۲۳۲ھ) کے چند فقرے پڑھیے :

"وقتے کہ دو گھڑی روز باقی ماند ، ہزار کار را گزاشتہ ، در دالان پائیں نزدیک بہ درخت انجیر بر مونڈھا نشیند[۲] ۔"

---

(۱) مرزا غالب : باغ دودر ص ۱۳۸ ، طبع پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۰ء ، کلیات فارسی ، ص ۴۴ ، قطعہ ۵۵ ، طبع نولکشور ۱۹۲۵ء ۔

(۲) رقعات قتیل ، ص ۵۱ ۔

"مکتوبے کہ بخدمت والا شما نوشتہ بودم الٰہی یومنا ھذا جوابش نرسیدہ۔ وقتے می آید ، در لف مکتوب خودم بہ نزد صاحب روالہ خواہم نمود ۔ . . . انتظام این ضلع صورت نمی بندد ۔ مائیم و آفتاب گرم ۔ از خیمہ چہ پشم کندہ می شود[1] ۔"

"مطرز حریر براعت و قبائے قامت بلاغت سلمکم اللہ ۔ مسودۂ دیروزہ دیدہ شد ۔ ہمہ خوب نوشتہ اید ، بارک اللہ ، اللّٰھم زد ولا تنقص لیکن آن مادر قحبہ کہ حامل این امانت بود کمبخت کاذب و حرام زادہ بودہ است ۔"

فن انشاء کے نقطۂ نظر سے یہ انداز نگارش پست اور بے لطف ہے۔ کہیں ہندی الفاظ کھٹکتے ہیں اور کہیں عربی فقرے ۔ بعض ہندی یا ہندو منشیوں کے اسی ناپختہ انداز کو دیکھ کر مسلمان ادیب "بوئے کچوری" کا طعنہ دیا کرتے تھے ۔ اس لحاظ سے مرزا غالب کا یہ دعویٰ کہ :

چہ شناسد قتیل و واقف را

زیادہ غلط نہیں ۔ تا ہم مرزا قتیل کی محنت ، کاوش اور شوق زبان دانی کی داد نہ دینا ظلم ہے ۔ انہوں نے رقعات کے ایک اور مجموعے 'ثمرات البدائع' میں انشاء و مراسلت کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں ۔ اس کے اکثر خطوط جو نواب سعادت علی خان ، مرزا سکندر شکوہ اور خانوادۂ شاہی کے دوسرے افراد کی طرف سے گورنر یا مختلف انگریز حکام کو لکھے گئے ، مدعا نگاری ، عبارت آرائی اور ابلاغ و افہام کے اعتبار سے قابل تعریف ہیں ۔ اپنی ایک تصنیف 'شجرۃ الامانی' میں انہوں نے پابندیٔ محاورۂ ایران کے جو اصول درج کئے ہیں ، ان کی پابندی خود بھی کی ہے ۔ ایران کے سفر سے انہوں نے لطف محاورہ اور سلاست زبان کا جو سبق حاصل کیا تھا وہ ان کے بعض مکتوبات میں نمایاں ہے ۔ 'ثمرات البدائع' کے خطوط سے اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں سیاست اور انگریزی غلبے کا حال بھی کھلتا ہے ۔ اس لحاظ سے یہ خطوط سیاسی معلومات کا ماخذ بھی ہیں اور اس روز افزوں فرنگی استعماریت کی خبر بھی دیتے ہیں جس کے عقابی بازو بنگال اور بہار پر

---

(۱) رقعات قتیل ، ص ۷ ، مطبع شعلۂ طور کانپور ۔

پھیلنے کے بعد اودھ اور زیریں دو آبے میں پھیلنے لگے تھے ۔

مرزا قتیل کے رقعوں سے بعض معاشرتی اور تہذیبی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میر تقی میر آج مشاعرے میں آئے ، بدن میں رعشہ ہے ، آوزا بھی نہیں نکلتی تھی ، لیکن غزل خوب تھی[1] ۔ ایک خط میں کسی باورچی کا حال لکھا ہے کہ شاہ اودھ کے سامنے اس نے بیان کیا کہ میں نواب ضابطہ خاں کے باورچی خانے میں رہ چکا ہوں ۔ ان کے ہاں مختلف پلاؤ پکانے کے لئے ہر پلاؤ کا باورچی الگ تھا جو صرف ڈیڑھ سیر چاول پکاتا تھا[2] وغیرہ ۔

امام بخش صہبائی فارسی کے محقق اور عالم تھے ۔ ان کی تحریر میں پختگی ہے ۔ الفاظ بافی ، استعارے کی باریکی اور ہم مفہوم فقروں کے جوڑے ان کے ہاں ضرور ہیں لیکن لطافت کے ساتھ ۔ ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا اسلوب نگارش ژولیدہ نہیں ہے ، بلکہ ہموار اور متین ہے :

> ”در سر داشتم کہ اگر زمانہ مساعد شود و روزگار معین گردد ، یعنی از مشاغل لا یعنیٔ دنیائے دون ایں قدر فرصتے بدست افتد کہ چون شرار در ہوائے وارستگی بال توان کشود ، و این ہمہ مہلتے در کف آید کہ چون حباب در فضائے ناتوانی چشمے باز توان نمود ، ورقے چند در شرح زمانہ بازار کہ خواص نتیجہ خامۂ گوہر بار ظہوریش دانند و عوام ثمرہ افکار عمر و زیدش خوانند چون نامۂ اعمال رنود و اوباش سیاہ کردہ از ذکر این عیش لذتے و از حرف این نشاط مسرتے برم لیکن با این ہمہ سعی و تلاش ازین کیمیا اثرے و ازین عنقا نشانے نمے یافتم ۔ قلم را در دست گرفتم و کاغذ را مہرہ کشیدہ مرکّب تازہ در دوات کردم“[3] ۔

صہبائی اپنے علم و فضل کے زور میں محاکات سے بھی دلچسپی لیتے تھے ۔ شیخ علی حزین

---

(۱) شجرۃ الامانی ، ص ۵۳ ۔

(۲) ایضاً ، رقعہ ۱۰۶ ۔

(۳) شرح مینا بازار ، نولکشور ، ۱۸۸۰ء ص ۳ ۔

برصغیر میں وارد ہوئے تو خان آرزو نے ان کے بہت سے اشعار پر از روئے زبان و قواعد اعتراض کئے ، 'تنبیہ الغافلین' اس رسالے کا نام رکھا ۔ صہبائی نے خان آرزو کے ان اعتراضات پر محاکمہ کیا اور اکثر ان کی غلطی ثابت کر کے حزین کی حمایت میں ایرانی شعراء کے کلام سے سند دی ۔ مثلاً خان آرزو کو مندرجہ ذیل شعر میں ''نگین نامدار'' کی ترتیب پر اعتراض تھا :

بہ نام ما حزین امروز شد ملک سلیمانی　　　که داغ عشق در کف شد نگین نامدار ما

صہبائی نے خان آرزو کے اس اعتراض کو باطل قرار دیا ۔ بلخی کے شعر سے سند دے کر لکھتا ہے کہ ''خاتم نامدار اگر صحیح است نگین نامدار نیز صحیح خواهد بود ۔ مفید بلخی گوید :

چشمت گرفته زیرنگین روزگار را　　　مانند خاتم است ترا نامدار چشم

معہٰذا نسبت نامداری به نگین بغایت مناسب واقع شد[1] ۔''

اس عہد کی ایک عمدہ تالیف 'انشائے مومن' (حکیم مومن خاں دہلوی) ہے ، جسے ان کے پھوپھی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خاں نے مئی ۱۸۵۵ء میں چھپوایا ۔ اس کے مختلف خطوط سے انیسویں صدی عیسوی کے طرز انشاء کے علاوہ اس دور زوال کے جاگیرداروں کے مشاغل اور طرز زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ دوستوں اور بزرگوں کے علاوہ بعض رقعے ماہ جبین ، زہرہ نوا طوائفوں کے نام بھی ہیں[2] کہ مومن چالیس چوالیس سال کی عمر تک ان سب سے راہ و رسم رکھتے تھے ۔ بعض خطوط میں اپنی ہیئت دانی اور اصطرلاب بینی کے شوق کا ذکر کرتے ہیں کہ صبح سے شام تک انہی مشغلوں میں وقت صرف ہو جاتا ہے[3] ۔ کسی خط میں اپنے دیگر مشاغل کی تفصیل دی ہے جس میں صبح کی نماز اور طالب علموں کی تعلیم سے لے کر حسینوں سے ملاقات تک کا بے تکلفانہ ذکر کیا ہے ۔ ایک خط میں اپنے چچا غلام حسین خان سے جو حیدر آباد دکن میں تھے ، کسی دوست کی سفارش

---

(۱) صہبائی : قول فیصل ، ص ۹۲ ، مطبع نظامی کان پور ۱۸۶۲ء ۔
(۲) انشائے مومن ، ص ۹۶ ۔
(۳) انشائے مومن ، ص ۱۱۱ ۔

کی ہے - کہیں اپنی تنگ دستی کا بھی ذکر کر جاتے ہیں[1] - بہت سے خطوط بیٹے ، بیٹی اور ہمشیرہ کے نام ہیں جن میں خانگی معاملات اور پدرانہ شفقت کا اظہار ہوا ہے - سب سے دلچسپ اور ادیبانہ خوبیوں کے حامل وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اپنے پھوپی زاد بھائی حکیم احسن اللہ خان کو لکھے ہیں - یہ ان کے ہم عمر ، ہم مزاج دوست اور محرم راز بھائی تھے - ایک مرتبہ علالت کے دوران میں ان سے سونے کے کشتے اور حبِ مسکین نواز کی فرمائش کی تھی - اس کی تعمیل میں کچھ دیر ہوئی ، مومن نے تقاضے کا جو خط لکھا ہے ، اس میں دوستانہ بے تکلفی اور ناز و انداز کی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں :

"حبِ مسکین نواز چرا اسم بے مسمی است و کشتۂ سیم و طلا چرا ہم اثر کیمیا ؟ انتظار جاں بہ لب آوردہ - ہر چند زر و سیم با خاک برابر می کنم صحت را دل بر حالم نمی سوزد - حبوب شما اگر مسکین نواز است ، مسکین تر از من نیست کہ نقد دل و جان بہ سیمبران دادہ ام -"[2]

اس دور میں ، جسے فارسی کی شمع فروزاں کی آخری بھڑک کہنا مناسب ہوگا ، مرزا غالب کے خطوط فن انشاء کی بیشمار خوبیوں کے حامل ہیں - نظم کی طرح ان کی نثر میں بھی حسن کاری ، طرحداری اور انتخاب الفاظ کا وہ سلیقہ ہے جو ان کی عبارت کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنائے دیتا ہے - ایک خط سے ، جو انہوں نے دہلی سے اپنے سالے نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کے نام آگرے بھیجا ہے ، حسن عبارت و اسلوب کے علاوہ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ مرزا غالب اپنی البیلی نوجوانی کے زمانے میں فرصت کاروبار شوق اور ذوق نظارۂ جمال میں کتنے محو رہتے تھے - نیز یہ کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں شہر آگرہ کس قدر حسن خیز اور با رونق تھا :

"جان برادر! اشک و آہ غالب نامراد یعنی آب و ہوائے اکبر آباد بہ شما سازگار باد - زینہار اکبر آباد را بہ چشم کم ننگرند و از رنگینی آن دیار الحفیظ و الامان سرائے گزرند کہ آن آبادچۂ ویران و آن

---

(۱) انشائے مومن ، ص ۱۲۹ -
(۲) ایضاً ، ص ۶۲ -

ویرانۂ آباد بازی گاہ ہمچو من مجنونے و ہنوز آن بقعہ را در ہر کف خاک چشمۂ خونے است۔ روزگارے بود کہ در آن سرزمین جز مہر گیا نہ رستے و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔''[1]

غالب کثیر الاحباب تھے۔ اردو خطوط کی طرح ان کے فارسی مراسلات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں، عزیزوں اور معاصروں سے بالعموم خوشگوار تعلقات رکھتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے نام ان کے بعض خطوط خالص فارسی میں ہیں۔ جیمز ٹامسن گورنر آگرہ، جان جیکوب، علی بخش خان (نسبتی بھائی)، رجب علی خان، تفضل حسین خان، ناسخ، تفتہ، احسن اللہ خان، شہزادگان میسور وغیرہ کے نام متعدد خطوط 'پنج آہنگ' اور 'باغ دودر' میں ملتے ہیں، جن سے اسلوب کی نزاکتوں اور انداز بیان کی لطافت کے علاوہ ان کی الفت سرشت طبیعت اور بامروتی کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے معاصروں کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک خط میں حکیم مومن خاں سے تقویم بھیجنے کی فرمائش کی ہے۔ القاب بالکل مختصر ہے لیکن غالب نے کمال بلاغت سے انہی دو تین لفظوں میں مومن کی سخنوری اور علم نجوم کی ستائش کی ہے:

''فروغ طالع گفتار سلامت! با آنکہ ہنوزم لب از تلخی این مویہ زہرفشان است، دل از سادگی در بند آن است کہ اگر نگارش تقویم این سال کران یافتہ باشد، منش نیز بنگرم تا بہ روز افروزنی شکوہ خسرو انجم خود را چشم روشنی گویم۔ یا رب نامہ بر ازان در تہی دست نہ گردد۔''[2]

ایک خط میں، جو شیخ ناسخ کو ۱۸ صفر ۱۲۵۱ھ یعنی ۱۵ جنوری ۱۸۳۵ء کو لکھا ہے، یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ قرض خواہوں کی ڈگریاں میرے نام جاری ہو چکی ہیں اس لیے گھر سے نہیں نکلتا۔ کبھی کبھی ولیم فریزر سے ملنے کے لیے رات کو نکلتا تھا، سو اس ظالم (نواب شمس الدین) نے اسے بھی قتل کرا دیا۔ میری بد دعا خالی نہ جائے گی، جلد پھانسی پائے گا[3]۔

---

(۱) کلیات نثر غالب، ص ۱۹۱، مطبع نولکشور، لکھنؤ۔
(۲) ایضاً، ص ۵۹۔
(۳) ایضاً، ص ۱۶۲، ۱۹۸۔

اس دور کے انشاء نگاروں میں نواب مصطفیٰ خان حسرتی و شیفتہ کی ذات بہت قابل قدر ہے۔ عربی الفاظ کے کم استعمال، عبارت کی آرائش اور متانت الفاظ میں وہ غالب کے کامیاب مقلد ہیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ کو انہوں نے ایک خط میں جوانی کی بے راہ روی کا حال معذرتی انداز میں یوں لکھا ہے:

"نفس امارہ کہ ہر نفس عشوۂ دیگر درکار این شیفتۂ خیالات دژم و فریفتہ نیرنگ ہائے وساوس نژند می کند، آوخ کہ مرا دلِ آگاہ دادند و باز این اہرمنی خیالات را در دل راہ دادند۔ الٰہی از دست این دیو رہائی دہ، از ہمہ بیگانہ کن و بخود آشنائی دہ۔"

مرزا غالب کو انہوں نے 'گلشن بے خار' کا ایک نسخہ نہ بھیج سکنے کا جو عذر کیا ہے، (۱۸۳۲ء) اس سے متانتِ عبارت کے علاوہ ان کی وسعتِ مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

"بہ سخن پناہ سلامت! اگرچہ از دیر باز می دانم کہ ملازمان عالی را بہ سوئے سفینہ کہ بہ عرق ریزی فکرت پریشانم در گرو فراہم آمدن است، علاقہ خاطرے ہست اما درین بزم کہ نمی رسد، سنگے چند فرا راہ داشت۔ یکے آنکہ عرض خزف بے جوہر در نظر مشتریان گوہر نہ کم خجالت است۔ دوم آنکہ ہنوز تشریف مقامی دربر نداشت۔ اکنون این نوخاستہ شاہدِ شوخ و شنگ 'نیم پوشیدہ حلّہ و بیباک' دران انجم انجمن جلوہ گری میکند۔"[1]

فارسی مکاتبات کا یہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک بدستور جاری رہا۔ مرزا غالب کی 'اردوئے معلیٰ' کی تقلید میں اردو مراسلت عام ہو چکی تھی لیکن فارسی کا اقتدار بعض حلقوں میں اسی طرح قائم تھا۔ ۱۸۸۱ء میں سید محی الدین صاحب نے علیگڑھ کالج کے ہوسٹل کی تعمیر کے لیے سرسید کو ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم بھیجی تھی۔ ان کا خط یقیناً فارسی ہی میں ہوگا کیونکہ سرسید نے فارسی ہی میں اس کا جواب لکھا ہے۔ سرسید کے خط سے صاف ظاہر ہے کہ ایک صدی پہلے کی مکتوب نگاری کا انداز بدستور باقی ہے۔ سرسید اپنی سادہ نگاری کے باوجود آرائش عبارت کا بھی تھوڑا بہت اہتمام کر لیتے تھے اور

---

(۱) حسرتی: دیوان و رقعات فارسی، ص ۸، ۲۸ - نیم پوشیدہ حلّہ والا مصرع عرفی کا۔

لفظ ''مگر'' کو اردو محاورے کے مطابق لیکن کے معنی میں استعمال کرتے تھے جو فارسی میں مستعمل نہیں ہے :

''خداوند کہ محبت پیشہ ام ، بجز محبت در کشتِ سینہ ام لکشتہ الد۔ الطاف و عنایت شارا شکر گزارم و بہ این محبت جان نثار۔ مبلغ یک ہزار و پانصد روپیہ کہ بجہت تعمیر بورڈنگ ہوس مرحمت فرمودہ الد ، رسید۔ قوم را عزت افزود و دلم را تقویت داد و ساعد سعی مارا قوت بخشید ۔ سپاس آن زقوم ازین قوم ناسپاس دشوار مگر اجرکم علی اللہ صلہ' آن کافی است آنچہ برحال زارم دل سوختہ الد ، احسان شما مگر ہیچ جائے دل سوختن نیست . . . ۔

جرمِ معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست ۔''[1]

غالب کی فارسی نگاری کا اثر ان کے ماحول پر بھی پڑا اور ملک کے اطراف و آکناف میں پھیلا ۔ دکن میں ان کے شاگرد حبیب اللہ ذکاء کے مجموعہ' انشاء ''خاش و خاش'' میں غالب کی سادگی اور پرکاری سے اثر پذیر ہونے کے نقوش کہیں کہیں نمایاں ملتے ہیں ۔ لیکن غالب کی نامہ نگاری کا اہم ترین عنصر ان کی انسان دوستی ہے جس کی تقلید کوئی نہ کر سکا ۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں انشاء کے جو مجموعے تیار ہوئے ان کی مختصر فہرست یہ ہے :

دستور المکتوبات	مطبع نظامی کانپور
رقعاتِ امان اللہ	امان اللہ حسینی
رقعاتِ مظہری	شیخ صادق حسین
انشائے فیض رسان	منشی حفیظ اللہ
انشائے فائق	مولوی محمد فائق

---

(۱) اقتباس مکتوب سرسید احمد خان بنام محی الدین مورخہ ۱۳ اگست ۱۸۸۱ء۔ ماخوذ از دربار ملّی ، ص ۲۸۸ ۔

انشائے فیض بخش	شیر علی
انشائے گلزارِ عجم	مولوی مقبول احمد فاروق
انشائے دل آویز	مولوی عبد العزیز آروی (تلازمہ شطرنج)
رقعاتِ عزیزی	مولوی عبد العزیز آروی
انشائے عجیب	منشی محمد جعفر (عربی الفاظ سے خالی ہے)
انشائے صفیر بلبل	مولوی عبد اللہ خان خورجوی
ظہیر الانشاء	منشی محمد ظہیر الدین
رقعاتِ بیدل	مرزا عبد القادر بیدل
رقعاتِ آنند رام	آنند رام مخلص
انشائے تمیز	کالی رائے تمیز
دستور الصبیان لونڈ رائے ۔ دقائق الانشا	رن چھور داس جولپوری
انشائے مادھو رام	منشی مادھو رام
انشائے شائق	منشی اجودھیا پرشاد
انشائے دولت رام	منشی دولت رام
انشائے دلکشا	منشی فتح چند
انشائے بے نقاط	منشی کامتا پرشاد
انشائے لطیف	منشی ہیرا لال
رقعات لچھمی نراین	راجا لچھمی نراین
سلکِ مسلسل	منشی چندرکا پرشاد
رقعاتِ فیض آگین	منشی نند کشور
انشائے مومن	مطبع سلطانی دہلی ۱۲۷۱ھ
رقعاتِ قتیل	مطبع شعلۂ طور کانپور

موہبت عظمیٰ (انشا کا نمونہ)	آرزو ، سراج الدین علی خان اشرف المطابع دہلی ۱۲۶۸ھ
کلمات طیبات، مظہر جان جاناں و ولی اللہ وغیرہ	مطبع مجتبائی دہلی
دیوان و رقعات فارسی ، حسرتی ، مصطفیٰ خان	امپیریل پریس لاہور ۱۸۸۷ء
تاریخ احوال ، حزین شیخ علی	طبع لندن ۱۸۳۱ء
رقعات قطب الملک ، عبداللہ خان قطب الملک	علیگڑھ یونیورسٹی ۱۸۵۷ء
رقعات قتیل ، محمد حسن ،	مطبع شعلۂ طور کانپور
باغ دودر ۔ غالب ، مرزا اسد اللہ خان ۔ مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی ،	پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۰ء
کلیات نثر (پنج آہنگ) ۔ غالب ، مرزا اسد اللہ خان ۔	مطبع نولکشور ، لکھنؤ
پنج آہنگ ۔ غالب ، مرزا اسد اللہ خان ۔ مرتبہ پروفیسر وزیر الحسن عابدی	پنجاب یونیورسٹی پریس ، ۱۹۷۰ء

انشاء کے یہ نمونے اور رقعات کے یہ مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں فارسی مراسات سے منشی صاحبان کو پورا شغف رہا ہے ۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ دستور ، بہ وجوہ مذکورہ ، کم ہوگیا اور بیسویں صدی عیسوی میں صرف چند ذی علم گھرانوں میں اس کا شوق باقی رہا ، تاہم انشاء کا کوئی مجموعہ اس ثانی‌الذکر صدی میں شائع نہیں ہوا ۔

☆ ☆ ☆

چھٹا باب

دین ، تصوّف ، اخلاق

(الف) - دین

تمہید

فتاویٰ عالمگیری (جو اورنگ زیب کے ایماء سے علماء کی ایک جماعت نے مرتب کیا تھا) دورِ عالمگیری کا اہم ترین دینی کارنامہ تھا - یہ دراصل مغلوں کے زمانے کی بدلی ہوئی صورتِ حال اور نئے پیدا شدہ مسائل کے متعلق نئے فیصلے اور نئے حل تھے - فتاویٰ عالمگیری سے اس زمانے کے دینی مزاج کا نہایت اچھی طرح پتا چلتا ہے - اس کی مکمل سرگذشت اس جلد میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے ، جو عربی ادب سے متعلق ہے -

اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات و خطوط سے بھی اس دور کے دینی مزاج کا حال معلوم ہو سکتا ہے - یہ سرمایہ فارسی میں ہے اور انشاء سے متعلق باب میں اس کا ذکر آیا ہے - اورنگ زیب کی وفات کے بعد جو کچھ ہؤا اس کا عہد عالمگیری سے گہرا تعلق ہے اور اورنگ زیب کے زمانے میں جو کچھ ظہور میں آیا وہ ان حالات و واقعات کا ردِ عمل تھا جو اکبری جہانگیری زمانے میں پیش آئے - اکبر کی تحریکِ دین الٰہی ، حکیم ابوالفتح گیلانی کا لبرل اندازِ نظر ، فیضی اور ابوالفضل کی آزاد خیالی ، میر فتح اللہ شیرازی کا تفلسف ، ہندو علوم اور ہندو اہلِ دانش کے اثرات ، ان سب عناصر نے مل کر دین کے طریقۂ راسخہ کو خاصا دھکا لگایا -

اکبر کے تحت مغلوں کی سیاسی حکمتِ عملی ایک طرف افغانوں سے دشمنی اور دوسری طرف ہندوؤں سے دوستی کے اصول پر قائم تھی - اکبر اور جہانگیر نے باہمی شادی بیاہ تک اس کو وسعت دے دی - نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی اور ہندوانہ رسوم دین میں داخل ہوگئیں اور طریقۂ راسخہ کے بارے میں ، اونچی سوسائٹی میں ضعیف الاعتقادی پیدا ہوگئی - درباریوں کا ادبی ماحول وسعتِ مشرب کے نام سے دین داری سے اور بھی دور

ہوتا گیا اور وحدتِ ادیان کے نام سے 'ان الدین عنداللہ الاسلام' کے بجائے از 'یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است' کا مسلک یا مشرب عام ہوتا گیا ۔

شاہجہان کے زمانے میں احساسات اور بھی کمزور ہوئے ۔ اس کا چہیتا بیٹا دارا شکوہ ہندو تصوف سے متاثر ہؤا ۔ اس زمانے کے ہندو جوگیوں (بابا لال وغیرہ) سے میل جول کے باعث وہ اسلام اور ہندومت کی اصولی وحدت میں اعتقاد رکھتا تھا ۔ خصوصاً ویدانت کے مماثل تصورِ وحدت الوجود کی بنا پر ۔ وہ اسلامی تصوف کو اس مت کے اصولوں سے جدا نہ مانتا تھا ۔ دارا شکوہ سے متوسّل انشاء پرداز اور شاعر ، منشی چندر بھان ایک مرتبہ اتنا بڑھا کہ اسے یہ شعر کہنے کی جرأت ہوئی :

مرا دلے است بکفر آشنا کہ چندین بار ۔۔۔ بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم
بہ بین کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ ۔۔۔ کہ چون خراب شود خانۂ خدا گردد

خللِ اعتقاد کی یہ سرگزشت سید نجیب اشرف ندوی نے 'مقدمۂ رقعاتِ عالمگیری' میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے ۔ اس کتاب میں بے عقیدہ متصوّفین اور بعض باطل فرقوں کے اوہام و خرافات کی تفصیل بھی موجود ہے جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عہدِ عالمگیری تک دینی مزاج میں کس حد تک بگاڑ پیدا ہو چکا تھا ۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد جانشینی کی جنگ نے مزید اخلاق ، سیاسی اور معاشرتی انتشار پیدا کیا ۔ شیعہ سنی نزاع نے مستقل شکل اختیار کر لی اور ملکی سیاست میں بھی اختلال کا موجب بنا ۔ طریقت اور شریعت کا معارضہ بھی شدید تر ہوگیا ۔ برے رواج اور خلافِ اسلام رسمیں اور بدعتیں بڑھتی گئیں اور مرکزیت کو ہر طرف سے خطرے لاحق ہوتے گئے ۔

اس اثنا میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے سلطنتِ مغلیہ کا سارا رعب خاک میں ملا دیا اور روہیلوں اور سکھوں نے رہے سہے وقار کا خاتمہ کر دیا ۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انگریز سارے ہندوستان پر قابض ہوتے گئے اور ان کے زیرِ اثر نئے نئے فکری ، معاشرتی اور دینی مسائل پیدا ہوتے گئے ۔

ان حالات میں زوال کے اسباب پر غور شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں نئی دعوتوں کا ظہور ہوا جنہیں جائزۂ نو اور احیائے ثانی کی مساعی کہنا چاہیے ۔ ان مساعی

کے الگ الگ میدان یہ تھے :

۱- 'دینی' - دینی افکار کی بازیافت اور ان کی تعبیر و تشریح کا اندازِ نو اور تقابل و مناظرہ وغیرہ -

۲- 'اخلاقی و معاشرتی' - بدعتوں اور بد رسموں کے خلاف جہاد -

۳- 'تعلیمی' - علومِ اسلامیہ کی تدریس کے نئے انداز—بنیادی علومِ اسلامیہ (خصوصاً قرآن و حدیث) کی طرف پھر توجہ - اہم مدارس دینی کا قیام -

۴- 'سیاسی' - خاندان شاہ ولی اللہ کا نظامِ فکر ، شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین اور شاہ اسمٰعیل شہید کے عزائم و عقائد - سید احمدؒ بریلوی کی دعوت اور عملی جہاد ، اور بعد میں بہار اور بنگالہ میں آزادی کی تحریکیں -

۵- 'دورِ جدید' - (یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد) بدلے ہوئے حالات اور ان کے لئے نئی تدبیریں - ان سب مقاصد کی تکمیل کے لئے ، دینی رہنماؤں اور مفکروں نے اپنے سامنے وقت کے چند مسائل رکھ کر کام کا آغاز کیا - مثلاً وقت کے وہ مسائل جن کی طرف زیادہ توجہ ہوئی یہ تھے :

(الف) ضعفِ سلطنت کے سیاسی و اخلاقی اسباب کی جستجو -

(ب) دین میں جو جو توہمات داخل ہو گئے تھے ان سے دین کو پاک کرنا اور کتاب و سنت کی روشنی میں دین کی اصلی بنیادوں کی تحقیق -

(ج) فرقوں کے اختلاف کی ماہیت دریافت کرنا ، مثلاً شیعہ سنی نزاع اور مقلّد غیر مقلّد نزاع کے وجوہ کی دریافت اور پھر ان کو دور کرنے کے طریقے سوچنا -

(د) تصوف اور شریعت کی آویزش کی حقیقت معلوم کرنا اور پھر ان میں مفاہمت کی کوشش کرنا -

(ہ) ابتغاء الرزق (حصول رزق) کا مسئلہ جو مرکزی حکومت کے ضعف کی وجہ سے شرفاء اور عوام کے لئے پریشانی کا باعث بنتا رہا تھا ، اس پر محقّقانہ غور و فکر -

(و) ہندوستان میں نئی ابھرتی ہوئی غیر مسلم طاقتوں کا مسئلہ اور ان کے متعلق واضح

رویہ قائم کرنے کی کوشش ۔ سکھوں ، مرہٹوں اور انگریزوں کے متعلق زاویۂ نظر متعیّن کرنا ۔

(ز) نئی سیاسی صورت حال میں دینی اور تہذیبی سالمیت کی شکست و ریخت کے اسباب معلوم کرنا اور اس کی تعمیرِ نو کے لئے تدابیر سوچنا ۔

(ح) 'اتحادِ اسلامی' کا شعورِ نو اور ارتباط کے منصوبے اور یہ احساس کہ آزمائش کے وقت مسلمانوں کی نگاہیں مسلمانوں ہی کی طرف اٹھتی ہیں ۔ اس رویے کی تنظیم کہ مسلمان کو مسلمان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے اور باطل کے مقابلے میں بنیانِ مرصوص بن جانا چاہیے ۔

(ط) انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک ۔ پہلے ۱۸۵۷ء کے جہادِ حرّیت میں ، اس کے بعد بنگالے میں اسلامی دعوتوں کا ابھرنا ، پھر مسلسل عمل و حرکت اور جد و جہد تاکہ آزادی حاصل ہو اور برّصغیر میں اسلام پھر باوقار مقام حاصل کر لے ۔

(ی) نئے فکری اور سیاسی فتنے اور ان کا مقابلہ ۔

ان سب مسائل میں دین سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش ہوتی رہی ۔ مگر یہ سیاسی و معاشرتی رویّہ سب علماء کا نہ تھا ۔ علماء کا ایک معتدبہ گروہ دین کے لئے ایزدی تائید پر اتنا یقین رکھتا تھا کہ دین کو غالب بنائے رکھنے کی عملی کوششوں سے یکسر بے نیاز رہا اور 'انا لہ لحافظون' پر بھروسہ کر کے ان جھگڑوں میں الجھا رہا جو گروہی اور مقامی تھے ، اور سچ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے سیاسی قوت کا ضعف بھی انہی کی وجہ سے ہوُا ۔

عہدِ شاہجہانی میں درسیات میں معقولات کی طرف غیر معمولی توجہ کا آغاز ہوا ۔ اس کے علاوہ صرف و نحو اور چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل مرکزِ توجہ بن گئے ۔ معمولی مسائل پر مناظرے ہوئے اور بے شمار رسالے لکھے گئے (یہ میلان آج بھی موجود ہے) ۔ ان فقہی بحثوں سے اس دور کے مذہبی مزاج کا پتا چلتا ہے ۔ ہمارے فقہا ، فروعی مسائل اور مختلف فرقوں کی لڑائی کو ملت کے مصالحِ عامہ پر فوقیت دیتے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ اس طرح وہ دین کو محفوظ کر رہے ہیں ـــــ لیکن ابھرتی ہوئی غیر مسلم طاقتوں نے ان اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا ۔

تقلید و عدم تقلید کے مسئلے نے بے حد شدت اختیار کی ـــــ اس سے جہاں تقلید نے اجتہاد کے ہر دروازے کو بند کر دیا ، وہاں عدمِ تقلید نے آزادی اور بے راہ روی کو مہلک حد تک عام کر دیا ۔

شاہ ولی اللہ کے خاندان اور ان کے متبعین نے ان سب مسئلوں میں دین کی حفاظت اور تہذیبی سالمیت کے نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی ۔ اگرچہ دین کے عملی شعبوں میں دوسرے علماء کے کام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور کسی نہ کسی طور ہر سب کی کوششوں سے کچھ نتیجے ضرور برآمد ہوئے ، مگر احیائی فکر خاندان شاہ ولی اللہ ہی نے دیا ۔ ان سرگرمیوں کے اندر سے بہت سے دینی مدارس وجود میں آئے ، بہت سی اہم کتابیں لکھی گئیں اور حفاظتِ دین کے نئے نئے طریقے اختیار کئے گئے ۔ فرنگی محل کا مدرسہ جو عالمگیر کے زمانے میں قائم ہوا تھا ، ایک باقاعدہ و باوقار درسی و دینی مرکز بنتا گیا ۔ خاندانِ شاہ ولی اللہ نے دہلی میں جس ولی اللہی فکر کی بنیاد رکھی وہ آگے چل کر مدرسۂ دیوبند کی صورت میں نمودار ہوا ، جس کے اثرات طول و عرض ہند میں پھیل گئے ۔ سنّی عقائد کا بریلوی مکتب بریلی و بدایوں میں پھلا پھولا ۔ اس کے زیر اثر بھی بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے ۔ اسی طرح اہلِ حدیث کا مکتب دہلی اور لاہور میں ترقی کرتا رہا ۔ شیعہ مکتب کا اہم ترین مرکز لکھنؤ بن گیا ، جس کے زیر اثر طول و عرض ہند میں مدرسے اور مرکز قائم ہوتے گئے اور خیر آباد کا منطقی مکتب بھی بدستور سرگرم رہا تا آنکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے اس چمن کو افسردہ کر دیا ۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ، ہندوستان کی دینی تاریخ میں دورِ زوال اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ایک طرف صحیح دینی عقیدے کی بحالی اور مسلمانوں کے سیاسی و تہذیبی احیائے ثانی کی فکری دعوت سامنے آئی اور دوسری طرف اثراتِ زوال کے تحت نہایت معمولی فروعی مسائل موضوعِ بحث و نزاع بنتے رہے (جن کی حوصلہ افزائی انگریزی استعمار کے نمائندے بڑی شد و مد سے کرتے رہے) ۔ فرقوں کی اس لڑائی میں جہاں فرقہ وارانہ عصبیت میں شدت بھی منظر عام پر آئی وہاں مفاہمت کی کوششیں ظہور میں آئیں ۔ اس طرح ایک طرف منطق و معقولات نے تمام تعلیم و تدریس پر غلبہ پایا تو دوسری طرف قرآن و حدیث کی طرف توجہ بھی بڑھتی گئی ۔ علیٰ ہذا القیاس ، اگر ایک طرف صوفیانہ اشغال و اندازِ نظر نے دینی عقائد کو مغلوب کر لیا تو دوسری طرف صحیح طریقت

کے علم بردار بھی پیدا ہو گئے ۔

ان رجحانات کے تحت عالمگیر کی وفات کے بعد پانچ بڑے رجحانات کی باہمی کشمکش تمام دینی سرگرمیوں میں منعکس نظر آتی ہے اور انہیں انعکاسات کے نتیجے میں ملک کے دینی مدارس کئی مختلف زوایہ ہائے نظر اور کئی مختص النوع مسلکوں کی تعلیم کے مرکز بن گئے ۔ ان کی تقسیم کچھ یوں کی جا سکتی ہے :

(الف) خاندان شاہ ولی اللّٰہی کا مسلک ، جو مختلف مسالک میں امتزاج و مفاہمت اور احیاء کا علمبردار تھا اور سیاسی پیش قدمی کا قائل تھا ، علمائے دیوبند اس مسلک کے پیرو ہوئے ۔

(ب) فقہی معقولاتی مسلک ۔ علمائے فرنگی محل کا مسلک ۔

(ج) فقہی صوفیانہ مسلک ۔ احمد رضا خان بریلوی کا دبستان ۔

(د) علمائے اہل حدیث کا مسلک جو عدم تقلید کے عقیدے میں سخت رویہ رکھتا تھا اور ردِّ بدعت میں خصوصی طور سے منہمک رہا ۔

(ہ) معقولاتی مسلک ۔ چڑیا کوٹ ، رام پور اور خیر آباد کے علماء اور ان کے دبستان ۔

(و) مغربی اثرات کا مسلک (جو خصوصیت سے ۱۸۵۷ء کے بعد منظّم ہؤا) ۔ اس میں کل وہ نئے فرقے شامل ہیں جو کسی طرح تجدیدی نقطۂ نظر رکھتے تھے ۔

ان دبستانوں سے تعلق رکھنے والے علماء اپنے اپنے مرکزوں سے فیض یاب ہو کر ملک کے طول و عرض میں اپنے اپنے دبستانوں کی نمائندگی کرنے لگے ۔

اس باب میں خاندانِ شاہ ولی اللہ کے مجتہدانہ کارناموں کا ذکر بتفصیل ہوگا ۔ ان کے بعد ہر مسلک کے صرف چیدہ اور ممتاز ترین اکابر کا ذکر ہوگا ۔ خصوصاً ان کا جن کی تصانیف فارسی میں ہیں اور اہم ہیں ۔

یہ زمانہ ایسا تھا جس میں دینی تصنیفات کی زبان آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی گئی ۔ پہلے

عربی سے فارسی اور آخر میں فارسی سے اُردو —— اُردو اور عربی میں لکھنے والے علماء کی تصانیف کا ذکر ان زبانوں سے متعلق جلدوں میں آئے گا ۔ اس جلد میں صرف فارسی میں لکھنے والے ممتاز ترین علماء کا ذکر آئے گا ۔ باقی کی صرف فہرستیں پیش کی جائیں گی ۔ البتہ ان کے خیالات کو مربوط اور قابلِ فہم بنانے کے لئے ان کے مجموعی فکر اور ان کی عربی تصانیف کا حوالہ بھی آئے گا ۔

اب سب سے پہلے خاندانِ شاہ ولی اللہ کا تذکرہ پیش نظر ہے اور ہم شاہ عبدالرحیم اور ان کے اسلافِ کرام کا ذکر نظر انداز کرکے براہ راست شاہ ولی اللہ سے آغاز کرتے ہیں ۔

شاہ ولی اللہ صاحب

شاہ صاحب کا نام قطب الدین احمد تھا ۔ مولوی رحیم بخش کی روایت کے مطابق چہار شنبہ ۴ شوال ۱۱۱۴ ہجری (۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے ۔ اقبال احمد فاروقی نے درّالثمین (اُردو ترجمہ) کے دیباچے میں تولّد کی تاریخ ۱۱۱۴ھ لکھ کر شاہ صاحب کا تاریخی نام عظیم الدین بھی دیا ہے جس سے ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۴ء) تاریخ تولد برآمد ہوتی ہے مگر شہرت ولی اللہ ہی کو حاصل ہوئی ۔

ان کے والد شاہ عبدالرحیم بھی اس خالوادۂ علم و کمال میں بلند مقام کے مالک تھے ۔ (اس خاندان کے علمی و دینی کمالات کے لئے دیکھیے حافظ رحیم بخش : 'حیات ولی' ، نیز شاہ صاحب کی خود نوشت سوانح عمری 'الجزء اللطیف' —— اور 'انفاس العارفین') ۔ شاہ صاحب کی ابتدائی تربیت و تعلیم والد کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور پندرہ برس کی عمر میں علومِ رسمی کی تحصیل کر لی ۔ شاہ صاحب کی عمر کا سترھواں سال تھا کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے ۱۷۱۸ء/۱۱۳۱ھ میں انتقال فرمایا ۔ اس کے بعد شاہ صاحب کم و بیش بارہ سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے ۔

شاہ صاحب کو ۱۷۳۰ء/۱۱۴۳ھ میں حج کی سعادت نصیب ہوئی ۔ واپس آ کر کم و بیش تہائی صدی مختلف دینی شعبہ ہائے علم و عمل کی گران قدر خدمات انجام دیں ۔ انتقال ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں ہوا ۔ ان کے چاروں فرزند شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی سپہرِ علم و کمال کے آفتاب ہیں ۔ سب نے اپنے نامور والد (اور اپنے خاندان کی روایات کی پیروی کرتے ہوئے) اہم دینی خدمات انجام دیں ۔ مزید

دیکھیے ''درالثمین'' دیباچہ از اقبال احمد فاروقی[1] ۔

متعلقہ مآخذ میں شاہ صاحب کی کم و بیش ۵۸ مستند کتابوں کا ذکر آیا ہے ۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جن کا انتساب صحیح نہیں ۔ (دیکھیے درالثمین بحوالۂ سابق)۔ ان میں سے بہت سی عربی زبان میں ہیں (ان کے لئے اسی تاریخ ادبیات کی جلد متعلقہ عربی ادب ملاحظہ ہو) اس مقام پر صرف فارسی کتابوں کی فہرست پیش کی جا رہی ہے ۔

(۱) قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ۔ (۲) 'مؤطا' کی شرح فارسی میں (المصفّی) ۔ (۳) 'تفہیمات النہیہ' (کچھ فارسی میں کچھ عربی میں) ۔ (۴) 'سطعات' ۔ (۵) 'ہمعات' ۔ (۶) 'ازالۃ الخفا' ۔ (۷) 'وصیت نامہ' ۔ (۸) 'مکتوبات فارسی' ۔ (۹) 'رسالۂ دانش مندی' ۔ (۱۰) 'انفاس العارفین' ۔ (۱۱) 'البلاغ المبین' ۔ (۱۲) 'قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین' ۔ (۱۳) 'انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ' ۔ (۱۴) 'الطاف القدس' ۔ (۱۵) 'مکاتیب فارسی' ۔ (۱۶) 'سرورالمحزون' ۔ (۱۷) 'شرح رباعیتین خواجہ باقی باللہ' ۔ (۱۸) 'ہوامع شرح حزب البحر' ۔ (۱۹) 'لمعات' ۔ (۲۰) شفاء القلوب' وغیرہ ۔

ان کتابوں کا مختصر تجزیہ

تفسیر

۱ ۔ 'فتح الرحمٰن فی ترجمۂ القرآن' ۔ یہ قرآن مجید کا فارسی میں مختصر ترجمہ ہے ، جو نہایت واضح اور سادہ زبان میں ہے ۔ اس کا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں ترجمے کے اصول اور ترجمۂ قرآن کی اہمیت و ضرورت پر عالمانہ بحث کی گئی ہے ۔ اس ترجمے نے آگے چل کر تفسیر کے مجتہدانہ انداز کو بہت نمایاں کیا اور علم حقائق و معارف اور قرآن کے حکم و اسرار کے فہم میں بڑی مدد دی ۔

۲۔ 'الفوز الکبیر فی اصول التفسیر' ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، یہ رسالہ اصول تفسیر میں ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے باب میں پانچ علوم کا ذکر ہے جو اہم قرآن

---

(۱) مزید حالات کے لئے دیکھیے :
۱۔ شاہ صاحب کے بارے میں سندھ ساگر اکادمی کی مرتّبہ کتابیں ۔
۲۔ مقدمہ اُردو ترجمہ ازالۃ الخفا ۔
۳۔ ایم ایم شریف : اسلامی فلسفے کی تاریخ (انگریزی) ۔

کے لئے ضروری ہیں ۔ علوم یہ ہیں :

(الف) علمِ احکام ۔ واجب و مندوب و مباح و مکروہ و حرام وغیرہ کا علم ۔

(ب) علم مخاصمہ ۔ یعنی یہود و نصاریٰ و مشرکین و منافقین وغیرہ سے بحث و مناظرہ کا علم ۔

(ج) علم تذکیر بآلاء اللہ ۔ یعنی آسمان و زمین کے خلق ، الہام فطری اور صفات کاملۂ الٰہی کا علم ۔

(د) علم تذکیر بایّام اللہ ۔ یعنی ان وقائع کا علم جن کا ذکر قرآن مجید میں امم سابقہ کے ضمن میں آیا ہے ۔

(ہ) علمِ تذکیرِ موت وغیرہ مع الحاقِ حدیث و آثار مناسبہ ۔

اس کے دوسرے باب کا عنوان یہ ہے :

در بیانِ وجوہِ خفاء نظم قرآن بہ نسبت اذہانِ اہل زمان و علاج آن ۔''

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں جن عربیوں کی زبان اور محاورے میں قرآن نازل ہوا ، ان کے لئے فہمِ معنی مشکل نہ تھا لیکن جب اسلام پھیلا اور عجم نے قرآن میں غور و خوض کیا تو انہیں اس محاورے سے دوری کی وجہ سے الجھنیں پیدا ہوئیں اور اختلافات ظہور میں آئے ۔ مثلاً کبھی لفظ غریب کی وجہ سے ، کبھی ناسخ و منسوخ کی حقیقت سے بے خبری کے باعث ، یا شان نزول سے آگاہی نہ ہونے کے سبب ، کبھی حذفِ مضاف یا موصوف کی وجہ سے ، کبھی ابدال کی وجہ سے ، گاہے تقدیم و تاخیر کے سبب ، کبھی تعدّدِ معنی کے باعث ، یا کنایہ و تعریض یا متشابہ و مجاز عقلی کی بنا پر . . . ، شاہ صاحب نے ان سب مشکلات کی وضاحت کی ہے ۔

'تیسرا باب' ، لطائفِ نظمِ قرآن اور شرحِ اسلوبِ قرآنی کے بارے میں ہے ۔ 'چوتھا باب' فنونِ تفسیر اور حلّ اختلافِ تفاسیر کے متعلق ہے اور 'پانچواں باب' ذکرِ جملہ اعمالِ صالحہ شرح غریب قرآن وغیرہ پر مشتمل ہے (اور یہ عربی میں ہے ، اس کا نام 'فتح الخبیر' رکھا گیا ہے) ۔ اس میں قرآن مجید کی مختلف سورتوں کے مشکل الفاظ وغیرہ کی شرح و تفسیر ہے ۔ اس تفصیل سے 'فوزالکبیر' کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

حدیث

۳۔ 'مصفّی شرح مؤطا' : 'مؤطا' احادیث کا وہ مجموعہ جو امام مالک نے مدوّن کیا ۔ شاہ صاحب نے عربی میں بھی اور فارسی میں بھی اس کی شرح لکھی ہے ۔ عربی شرح کا نام 'مسوّی' ہے اور فارسی کا 'مصفّی' ۔

سیرۃ

۴۔ 'سرور المحزون ترجمۂ نورالعیون' ۔ یہ سیرۃ رسول کریم ؐ ہے ۔ اصل کتاب علامہ سیّد الناس (ابوالفتح محمد بن محمد) نے لکھی ۔ ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا (طبع مفتی محمد مراد در ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ) ۔

مسئلۂ خلافت

۵۔ 'ازالۃ الخفا خلافت الخلفاء' ۔ اس کتاب میں خلفائے اربعہؓ کی خلافت کے بارے میں محققانہ بحث کی گئی ہے ۔ یہ معرکے کی کتاب ہے ۔ یہ صرف خلفاء کے مناقب تک محدود نہیں بلکہ اس میں اسلام کی سیاستِ اجتماعی کے بنیادی اصول جمع ہوگئے ہیں ۔

سب سے پہلے خلافت کی تعریف ہے اور وہ یہ ہے کہ خلافتِ عامہ وہ عمومی ریاست ہے جو اقامتِ دین کے لیے بالفعل بہ حیثیت نیابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم معرضِ وجود میں آتی ہے اور اس کے مقاصد یہ ہیں : علوم دینیہ کا زندہ کرنا ، ارکان اسلام کا قائم رکھنا ، جہاد کا جاری کرنا ، قضا و حدود قائم کرنا ، مظالم کا دور کرنا ، نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا ۔

نتیجہ یہ نکالا ہے کہ خلافت کا مقصد اقامتِ دین بہ طریقِ آنحضرت ؐ ہے ۔ باقی سب باتیں اس میں آ جاتی ہیں ۔ خلافتِ عامہ کی بحث میں شرائطِ خلافت ، فرائضِ خلافت وغیرہ اور جمہور پر اس کی اطاعت کے سلسلے میں باریک نکات ، پھر خلافتِ خاصہ کے اصول و شرائط ہیں ۔

'ازالۃ الخفا' میں اصل موضوع پر جو کچھ ہے وہ تو ہے لیکن اس کے بعض حصے ضمنی طور پر علمِ سیاست اور فلسفۂ اجتماعیات کے لحاظ سے بھی بے حد قیمتی ہیں ۔ ایک بابِ تنبیہات ہے ، اس میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب اقوام کی قوت شہویہ اور قوت سبعیہ

میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور مال کی کثرت سے فتنۂ مال ظہور میں آتا ہے اور مشورہ ترک ہو جاتا ہے اور حکومت غیر عادل لوگوں میں اور علم کمینے لوگوں میں آ جاتا ہے اور خوفِ خدا نہیں رہتا تو اجتماع میں شدید ابتری ظہور میں آتی ہے۔

انہوں نے لکھا ہے کہ ضروری نہیں برے زمانے میں سب لوگ برے ہوں۔ بعض اچھے بھی ہوتے ہیں، جن کے دل فیوضِ الٰہی سے لبریز ہوتے ہیں۔ وہ اصلاحِ احوال کے لئے تنظیم کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے خلافت کے ساتھ ساتھ حکومتِ استبداد (ملوکیت) کا بھی تجزیہ کیا ہے اور یہ اصول آج کے اسلامی معاشرے کے لئے رہنما اصول بن سکتے ہیں۔

۶۔ 'قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین': یہ کتاب شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی افضلیت کے بارے میں ہے۔ پہلے افضلیت کا معیار عقلی و نقلی بیان کیا ہے۔ پھر صحابہؓ کرام کے عمومی فضائل کا ذکر کیا ہے مگر شیخینؓ کے روحانی و دینی مراتب کی خصوصیاتِ فائقہ کے بارے میں بدلائل یہ بتایا ہے کہ ان کی افضلیت قطعی تھی۔ اس قطعی رائے کے باوجود انہوں نے اس خیال کے مخالف فرقے کے بارے میں لہجہ بڑا عقلی و عملی اختیار کیا ہے تاکہ ملّت اسلامیہ کے نصب العینِ اتحاد کو نقصان نہ پہنچے۔ (اسام خان نوشہروی نے مذکورہ بالا دو کتابوں خصوصاً 'ازالۃ الخفا' کے ایک حصے پر مبنی ''فقہ عمر'' کے نام سے ایک کتاب مرتّب کی ہے جو دراصل ''رسالہ در مذہب فاروق اعظم'' کا ترجمہ ہے)۔

علم اسرارالدین کے بعد، جس کی اہم کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' عربی میں ہے، شاہ صاحب کی کتب تصوف و حکمت اور حقائق عالیہ کا مخزن ہیں۔ ان کا تذکرہ بعد کی فصل 'در باب تصوف' میں آئے گا۔ بہرحال یہ امرِ واقعہ ہے کہ شاہ صاحب کے افکار کا کوئی جائزہ ان کے حکیمانہ اور صوفیانہ خیالات کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے قارئین سے التماس ہے کہ اس تبصرے کو تصوف کی فصل کے ساتھ ملا کر پڑھیں۔

شاہ صاحب کی متفرق کتابوں میں رسالہ 'البلاغ المبین' در ردّ بدعت، 'فضائل امام بخاریؒ' مع مکتوبات اور مکاتیب فارسی میں ہیں[1]۔ ایک رسالہ 'دانش مندی'

---

(۱) 'مکاتیب فارسی'۔ یہ وہ خطوط ہیں جو کلمات طیبات میں دوسرے بزرگوں کے خطوط کے ساتھ ابوالخیر مراد آبادی فاروقی نے جمع کئے ہیں اور چھپ چکے ہیں۔ یہ پچیس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شاہ صاحب کے دینی کارناموں کی روداد ان کی عربی کتابوں کے حوالے کے بغیر مرتب نہیں ہو سکتی ۔ ان کی عربی کتابوں میں 'حجة اللہ البالغہ' کا رتبہ فائق ہے ۔ اس میں احکامِ دین کے اسرار و حکم بیان ہوئے ہیں ۔ یہ کتاب افکار دینی کا ایک نیا باب کھولتی ہے اور کل زندگی کا ایک نیا تصور پیش کرتی ہے ، جو دور جدید میں اسلام کی فتوحات کے لیے فتح باب کا درجہ رکھتی ہے ۔ اسی طرح عربی کی اور کتابیں ہیں ، جن سے بے نیاز ہو کر ان کی فارسی کتابوں کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں ۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ طریقہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ شاہ صاحب کے مجموعی نظامِ فکر کی مجمل سی روداد پیش کر دی جائے تا کہ فارسی تصانیف کا ان کے پورے علمی کارنامے میں مقام متعین ہو سکے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے موضوعات میں تفسیر ، حدیث ، اسرارالدین (حکمتِ دین و فقہ) ، تصوف ، سیرة ، مسئلہ خلافت و امامت اور ردّ بدعت کو اہمیت حاصل ہے ۔ انہوں نے اپنے اور اپنے بزرگوں کے حالات و مکاشفات[1] بھی لکھے ہیں ۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

خطوط ہیں اور ان میں ایک عربی خط (مکتوب المدنی) بھی ہے (جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے) ۔

یہ مکاتیب کچھ مرزا مظہر جانجاناںؒ شہید کے نام ، کچھ خواجہ محمد امین اور حضرت شاہ ابو سعید نقشبندی مجددی کے نام اور بعض بطور شرح ابیات لکھے گئے ہیں (مکتوب الیہم معلوم نہیں) ۔ ان مکاتیب میں وہی خیالات ہیں جو ان کی کتابوں میں ہیں ۔ میرزا مظہرؒ شہید کو تمیم طریقۂ احمدیہ کہا گیا ہے اور بعض خطوط میں "قیومیت" کی تشریح ہے ۔ اکثر حالات میں دو رجحان ہیں : (۱) ایک تو طریقۂ راسخہ کی تعیین اور (۲) فروعات میں اختلاف کو کم کرنے اور باہم اتحاد و ایتلاف کی کوشش ۔ اور یہ چیز ان کی جملہ تصانیف میں ہے ۔

(۱) 'انفاس العارفین' ۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے اور اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات لکھے ہیں ۔ حصہ اول (بوارق الولایہ) میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم کے حالات ، حصہ دوم (شوارق المعرفة) میں اپنے چچا شیخ ابوالرضا محمد کے حالات و واقعات و اخلاق و عادات ، حصہ سوم (امداد فی مآثرالاجداد) حصہ چہارم (النبذةالابریزیہ فی اللطیفةالعزیزیہ)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ان میں جابجا یہ موضوعات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں ایک صحیح اسلامی زندگی کا لائحہ عمل بھی ہے[2] اور درس و تدریس کے طریقوں کی بحث بھی۔[3] مگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

میں شاہ عبدالعزیز کے حالات، حصہ پنجم (العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس محمدیہ) میں بزرگوں کے حالات، حصہ ششم (انسان العین فی مشائخ حرمین) میں ان علمائے حرمین کے حالات ہیں جن سے آپ نے [illegible] سلوک حاصل کیا اور حصہ ہفتم (الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف) میں ان کے اپنے حالات ہیں۔

(۵) 'وصیت نامہ' (الوصیۃ فی ا[illegible] مجموعہ خمس رسائل دہلی) فارسی میں ہمارے نقطۂ نظر سے ایک اہم تحریر ان کا وصیت نامہ ہے جس میں انہوں نے اپنے احباب و اولاد کو بعض عملی نصیحتیں کی ہیں جو ایک سچے، دین دار اور فرض شناس مسلمان کا دستور العمل بن سکتی ہیں۔ پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں ہمیشہ کتاب و سنت پر عمل کرنا چاہیے اور معقولیوں کو نظر انداز کرکے علمائے محدثین (جامع حدیث و فقہ) کی پیروی کرنی چاہیے اور تفریعات فقہ کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔ دوسری وصیت یہ ہے کہ امر بالمعروف کی حد یہ ہے کہ فرائض و کبار اور شعائر اسلامی کے معاملے میں شدت برتی جانی چاہیے۔ لیکن فروعی اختلافی مسائل میں شدت مناسب نہیں۔ ایک اور وصیت میں ان مشائخ زمانہ سے بچنے کی تلقین ہے جو انواع بدعت میں مبتلا ہیں اور کرامت فروشی کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح رمالوں، کاہنوں اور اہل نیرنج سے بچنا چاہیے۔ ایک اور وصیت میں کہا ہے کہ ہمارے اور ہمارے اہل زمان کے درمیان اختلاف ہے اور وہ فنا و بقا، استہلاک و انسلاخ کے بارے میں ہے۔ اگرچہ یہ کیفیات اکابر صوفیہ پر وارد ہوتی ہیں مگر ہر شخص ان کا اہل نہیں۔ اس لیے شرع ہی کو واجب الاتباع بنانا چاہیے۔ ایک اور وصیت میں ہے کہ اصحاب آنحضرت[ؐ] کے بارے میں اعتقاد نیک رکھنا چاہیے اور ان کے مناقب ہی بیان کرنے چاہئیں اور ان کے مشاجرات میں نہیں الجھنا چاہیے۔ حکمت اس کی یہ بتائی ہے کہ اگر صحابہ[رض] میں سے بعض کی مذمت کی جائے اور انہیں بدگمانی کا نشانہ بنایا جائے تو سلسلۂ روایت حدیث پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ دین کے نظام عقائد کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔ ایک قیمتی وصیت طریق تعلیم اور تدریج نصاب سے متعلق ہے۔ ایک اور وصیت میں کہتے ہیں کہ ''عربیت نسب و عربیت لسان ہر دو فخر ماست''۔ اس لیے ہم عادات عجم سے متاثر ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ خصوصاً حضرت عمر[رض] کی یہ تلقین اپنے والیان و عاملین کو:

''خود را دور دارید از تنعم و ہیئت عجم و لازم گیرید نشستن در آفتاب، ہر آئینہ آفتاب حمام عرب است و برسم قوم معد باشید و درشت لباس باشید و سخت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور ایک 'وصیت نامہ' ۔ بزرگوں کی ایک سوانح عمری مع مکاشفات و کرامات اور ایک اپنی سوانح عمری اور مکاشفات ۔

شاہ صاحب کا دینی کارنامہ

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شاہ صاحب کے دینی کارناموں کی روداد ان کی عربی کتابوں کے حوالے کے بغیر مرتب نہیں ہو سکتی ۔ ان کی عربی کتابوں میں 'حجۃ اللہ البالغہ' کا رتبہ فائق ہے ۔ اس میں احکامِ دین کے اسرار و حکم بیان ہوئے ہیں ۔ یہ کتاب افکار دینی کا ایک نیا باب کھولتی ہے اور کل زندگی کا ایک نیا تصور پیش کرتی ہے ، جو دور جدید میں اسلام کی فتوحات کے لیے فتح باب کا درجہ رکھتی ہے ۔ اسی طرح عربی کی اور کتابیں ہیں ، جن سے بے نیاز ہو کر ان کی فارسی کتابوں کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں ۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ طریقہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ شاہ صاحب کے مجموعی نظامِ فکر کی مجمل سی روداد پیش کر دی جائے تا کہ فارسی تصانیف کا ان کے پورے علمی کارنامے میں مقام متعین ہو سکے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے موضوعات میں تفسیر ، حدیث ، اسرارالدین (حکمتِ دین و فقہ) ، تصوف ، سیرۃ ، مسئلہ خلافت و امامت اور ردِ بدعت کو اہمیت حاصل ہے ۔ انہوں نے اپنے اور اپنے بزرگوں کے حالات و مکاشفات[1] بھی لکھے ہیں ۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

خطوط ہیں اور ان میں ایک عربی خط (مکتوب المدنی) بھی ہے (جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے) ۔
یہ مکاتیب کچھ مرزا مظہر جانجاناںؒ شہید کے نام ، کچھ خواجہ محمد امین اور حضرت شاہ ابو سعید نقشبندی مجددی کے نام اور بعض بطور شرح ابیات لکھے گئے ہیں (مکتوب الیہم معلوم نہیں) ۔ ان مکاتیب میں وہی خیالات ہیں جو ان کی کتابوں میں ہیں ۔ میرزا مظہرؒ شہید کو تتمیم طریقۂ احمدیہ کہا گیا ہے اور بعض خطوط میں ''قیومیت'' کی تشریح ہے ۔ اکثر حالات میں دو رجحان ہیں : (۱) ایک تو طریقۂ راسخہ کی تعیین اور (۲) فروعات میں اختلاف کو کم کرنے اور باہم اتحاد و ایتلاف کی کوشش ۔ اور یہ چیز ان کی جملہ تصانیف میں ہے ۔

(۱) 'انفاس العارفین' ۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے اور اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات لکھے ہیں ۔ حصۂ اول (بوارق الولایہ) میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم کے حالات ، حصہ دوم (شوارق المعرفہ) میں اپنے چچا شیخ ابوالرضا محمد کے حالات و واقعات و اخلاق و عادات ، حصہ سوم (امداد فی مآثرالاجداد) حصہ چہارم (النبذۃالابریزیہ فی اللطیفۃالعزیزیہ)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ان میں جابجا یہ موضوعات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ ان کی تصانیف میں ایک صحیح اسلامی زندگی کا لائحہ عمل بھی ہے[2] اور درس و تدریس کے طریقوں کی بحث بھی ۔[3] مگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

میں شیخ عبدالعزیز کے حالات ، حصہ پنجم (العطیۃ الصمدیہ فی انفاس محمدیہ) میں بزرگوں کے حالات ، حصہ ششم (انسان العین فی مشائخ الحرمین) میں ان علمائے حرمین کے حالات ہیں جن سے آپ کو سند سلوک حاصل ہوئی اور حصہ ہفتم (الجزء اللطیف فی ترجمہ العبد الضعیف) میں ان کے اپنے حالات ہیں ۔

(۲) 'وصیت نامہ' (الوصیۃ فی النصیحۃ ۔ مطبع مجتبائی دہلی) فارسی میں ہمارے نقطۂ نظر سے ایک اہم تحریر ان کا وصیت نامہ ہے جس میں انہوں نے اپنے احباب و اولاد کو بعض عملی نصیحتیں کی ہیں جو ایک سچے ، دین دار اور فرض شناس مسلمان کا دستور العمل بن سکتی ہیں ۔ پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں ہمیشہ کتاب و سنت پر عمل کرنا چاہیے اور معقولیوں کو نظر انداز کرکے علمائے محدثین (جامع حدیث و فقہ) کی پیروی کرنی چاہیے اور تفریعات فقہ کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھنا چاہیے ۔ دوسری وصیت یہ ہے کہ امر بالمعروف کی حد یہ ہے کہ فرائض و کبار اور شعائر اسلامی کے سلسلے میں شدت برتی جانی چاہیے ۔ لیکن فروعی اختلافی مسائل میں شدت مناسب نہیں ۔ ایک اور وصیت میں ان مشائخ زمانہ سے بچنے کی تلقین ہے جو انواع بدعت میں مبتلا ہیں اور کرامت فروشی کرتے رہتے ہیں ۔ اسی طرح رمالوں ، کاہنوں اور اہل نیرنج سے بچنا چاہیے ۔ ایک اور وصیت میں کہا ہے کہ ہمارے اور ہمارے اہل زمان کے درمیان اختلاف ہے اور وہ فنا و بقا ، استہلاک و انسلاخ کے بارے میں ہے ۔ اگرچہ یہ کیفیات اکابر صوفیہ پر وارد ہوتی ہیں مگر ہر شخص ان کا اہل نہیں ۔ اس لیے شرع ہی کو واجب الاتباع بنانا چاہیے ۔ ایک اور وصیت میں ہے کہ اصحاب آنحضرتؐ کے بارے میں اعتقاد نیک رکھنا چاہیے اور ان کے مناقب ہی بیان کرنے چاہئیں اور ان کے مشاجرات میں نہیں الجھنا چاہیے ۔ حکمت اس کی یہ بتائی ہے کہ اگر صحابہؓ میں سے بعض کی مذمت کی جائے اور انہیں بدگمانی کا نشانہ بنایا جائے تو سلسلۂ روایت حدیث پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ دین کے نظام عقائد کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے ۔ ایک قیمتی وصیت طریق تعلیم اور تدریج نصاب سے متعلق ہے ۔ ایک اور وصیت میں کہتے ہیں کہ "عربیت نسب و عربیت لسان ہر دو فخر ماست" ۔ اس لیے ہم عادات عجم سے متاثر ہونے کو پسند نہیں کرتے ۔ خصوصاً حضرت عمرؓ کی یہ تلقین اپنے والیان و عاملین کو :

"خود را دور دارید از تنعم و ہیئت عجم و لازم گیرید نشستن در آفتاب ، ہر آئینہ آفتاب حمام عرب است و برسم قوم معد باشید و درشت لباس باشد و سخت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس موقع پر تفصیل دینا ممکن نہیں ۔

اب سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرنا ہوگا کہ شاہ صاحب کی دینی تصنیفی سرگرمیوں کی غایتیں کیا ہیں ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات سمجھ میں آتے ہیں :

اول : اسلام کو بہ حیثیت دین اس کی اصل شکل میں پیش کرنا ـــــ اور ان فاسد اور ضعفِ یقین پیدا کرنے والے خیالات و عقائد کی تردید و تنقید جو مرورِ زمانہ سے عالمِ اسلام میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً عام اور مقبول و مروج ہوگئے تھے ۔

دوم : اسلام کے دو سب سے بڑے سرچشموں (قرآن اور حدیث) کے بارے میں جو غلط مبحث اور غلط فہمیاں تاریخی اسباب کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں ، ان کا ازالہ اور ان کے مطالعے کے لیے صحیح اصول اور صحیح زاویۂ نظر قائم کرنا ۔

سوم : فقہِ اسلامی کی تدوینِ نو کے اصول مرتّب کرنا جس میں کل زندگی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

گزران باشید و کہنہ بوئی خو کنید و تناول کنید شتران را یعنی بگیرید و رام سازید و جست کردہ سوار شوید بر اسپان و تیر اندازید بہ نشانہ ہا ۔"

اس کے بعد نکاحِ بیوگان کی تلقین کی ہے اور کہا ہے کہ ہندوؤں کے طریقے اختیار نہ کریں ۔ زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کی ہے ، اسراف اور شادیوں کے موقعہ پر فضول خرچی سے منع کیا ہے ۔ سوم و چہلم و شش ماہی و فاتحہ سالینہ وغیرہ سے روکا ہے ۔ غیر ضروری علوم سے اجتناب کی تلقین کی ہے اور آخر میں دعا کی ہے کہ "خدا کرے آخر لشکر ہائے اسلام میں ہم ہوں ۔"

(۳) 'رسالۂ دانش مندی' ۔ یہ شاہ صاحب کی کتابوں میں فن تعلیم پر ایک مختصر رسالہ ہے ۔ اس میں تعلم اور تعلیم کے طریقوں کی بحث ہے جو شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد سے سیکھی اور روایت اس کی امام ابوالحسن الاشعری تک پہنچتی ہے ۔

شاہ صاحب نے دانش مندی کے معنی لکھے ہیں : "کتاب دانی" (جسے دوسرے الفاظ میں درس و تدریس کہا جا سکتا ہے) اور اس کے تین مراحل قرار دیے ہیں : اول کتاب کا خود بڑی تحقیق سے مطالعہ کرے ، دوم اس کا درس دے ، سوم اس پر شرح یا حاشیہ لکھے اور یہ علم ، علم کلام و اصول سے مختلف ہے ۔ شاہ صاحب نے اس میں طریقۂ تعلیم (Methodology) کی جزئیات بیان کی ہیں ۔

سامنے رکھ کر نئے حالات کے مطابق رہنمائی کی ہے ۔ اسی طرح احکامِ دین کی حکمتوں کا باندازِ نو بیان کرنا جس کا مقصد معاصر معقولی ذہن کی تسکین و اطمینان تھا ۔

چہارم : ان عظیم اختلافات میں راہِ اعتدال تجویز کرنا جن کے باعث امتِ مسلمہ مختلف فرقوں میں تقسیم ہو کر ملّت کے سیاسی ضعف کا باعث بنی ۔ مثلاً شیعہ سنی اور مقلّد غیر مقلّد کی نزاع میں ، یا مثلاً شریعت و طریقت کی بحث میں ۔

پنجم : ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کے دینی و اخلاقی زوال کے وجوہ اور ان کے سیاسی انحطاط و ضعف کے اسباب کا تجزیہ کرکے احیائے نو کے لیے سعی کرنا اور اس کے لیے تحریک کی بنیاد رکھ کر اس کے اصول بنانا اور اسلام پر مبنی ایک نئے عالمگیر نظام کی دعوت دینا ۔

ششم : دینی اور دنیوی زندگی کے بارے میں صاف نقطۂ نظر اور صحیح لائحۂ عمل پیش کیا اور غلط باطنی رجحانات کی مخالفت کی اور تکمیل روحانی یا سعادت کو غایۃ الغایات قرار دے کر امتِ مسلمہ کو یاد دلایا کہ اس کا مقصد دنیا میں نیکیوں کو پھیلانا اور برائیوں کو روکنا اور ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جو سعادت (نیکی ، خوش حالی اور ترقی) کا ضامن ہو ۔

قرآن کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ کتابِ مبین ہے ، اس لئے ہر مسلم اور مسلمہ کو اسے اس طرح پڑھنا چاہیے کہ یہ ''بیان للناس'' بن جائے ۔ جہاں وہ اہلِ نظر کے لئے کتاب الحکیم ثابت ہو وہاں اس کے معانی سے بقدر عقول ہر عام و خاص کو واقفیت حاصل ہو تاکہ وہ ''ہدایۃ للمتقین'' بن جائے ۔ اس غرض سے انہوں نے اس کا ترجمہ سادہ اور سلیس فارسی میں کیا ۔

یہ خیال تو غلط ہے کہ اس ترجمے سے پہلے کبھی قرآن مجید کا ترجمہ ہوا ہی نہیں ۔ کئی ترجمے ہوئے اور کئی تفسیریں لکھی گئیں مگر شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے لوگوں کے لئے اس کا ترجمہ باسلوبِ خاص کیا ۔ شاہ صاحب کے زمانے میں فارسی ہی خواندہ لوگوں کی عام زبان تھی ، اس لئے انہوں نے یہی زبان ترجمے کے لئے اختیار کی ۔ اس امر کا

کوئی ثبوت نہیں ملا کہ اس ترجمے پر تلواریں نکل آئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاہ صاحب سے اس زمانے کے بعض علماء نے بعض باتوں میں اختلاف کیا اور جھگڑا ہوا مگر وہ ترجمے کے مسئلے پر نہ تھا۔

قرآن مجید کو عام فہم اور واضح بنانے پر شاہ صاحب نے جتنا زور دیا ہے، اتنا ہی زور اس بات پر دیا ہے کہ ہر شخص ترجمہ یا تفسیر نہیں کر سکتا۔ انہوں نے 'الفوز الکبیر'' میں تفسیر و ترجمہ کے آداب بتائے ہیں اور کہا ہے کہ اس کے لئے کئی متعلقہ علوم سے گہری واقفیت کی ضرورت ہے۔ انہوں نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم کا مقصد نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور باطل عقائد کی تردید ہے۔

شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں قرآن مجید میں نسخ کے سوال پر واضح بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ منسوخ آیتیں چار سے زیادہ نہیں۔ انہوں نے تفسیر میں اسرائیلیات کے عنصر پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور اپنے وصیت نامے میں قرآن پڑھنے کے آداب بتائے ہیں۔

حدیث کے بارے میں شاہ صاحب نے اپنی اکثر کتابوں میں عالمانہ بحثیں کی ہیں۔ انہوں نے 'مؤطا' امام مالک اور 'صحیح البخاری' کو بنیادی مجموعے قرار دے کر جا بجا ان کے مستند ترین ہونے پر استدلال کیا ہے۔ شاہ صاحب نے دین کی اہم بنیاد کی طرف متوجہ کیا جس کی اہمیت اہل الفقہ اور اہل الحدیث کے تقلید و عدمِ تقلید کے جھگڑوں کی وجہ سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اہل الرّای اور اہل الحدیث کی نزاع کوئی نئی نہ تھی مگر ہندوستان تک پہنچتے پہنچتے اس میں شدت پیدا ہو گئی اور انتہا پسندی اور بے اعتدالی نے راہ پا لی۔ شاہ صاحب نے اس میں ایک صحیح اور معتدل مؤقف اختیار کیا اور جہاں حدیث کی بنیادی اہمیت کا اثبات کیا وہاں اہل الحدیث کی بعض انتہا پسندیوں سے متنبّہ بھی کیا۔

فقہ اور اصولِ فقہ

شاہ صاحب نے رفعِ اختلافِ امت کے لئے بڑا کام کیا ہے، دینی سطح پر بھی اور سیاسی سطح پر بھی۔ چونکہ اختلاف کے مواقع بیشتر فقہی تنقیحات کی وجہ سے ہیں اس لئے

---

(۱) اس کا تیسرا باب عربی میں ہے، اس کا الگ نام فتح الخبیر رکھا گیا ہے۔

انہوں نے ان تنقیحات میں اصولی محاکمے کر کے اختلافات رفع کئے ہیں ۔ انہوں نے دینی سطح پر اسلامی فرقوں کی جنگ کے اسباب دریافت کیے ہیں اور ایک معتدل راستہ متعیّن کیا ہے ۔ فرقوں کی یہ جنگ ہندوستان میں دو میدانوں میں بہت شدید رہی ہے ۔ اول : مقلّدین اور غیر مقلّدین کا اختلاف ۔ دوم : شیعہ اور سنّی کی نزاع ۔

مسئلۂ اول کے سلسلے میں شاہ صاحب نے اپنے ایک عربی رسالے میں (جس کا نام ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' ہے) نہایت عمدہ استدلال اور تاریخی و فقہی بصیرت سے اس قدیم اختلاف پر نظر ڈال کر ''انصاف'' کی راہ دکھائی ہے ۔ اس رسالے کے دیباچے یہ الفاظ (اردو ترجمے کے مطابق) اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہیں :

> ''ایک وقت اللہ تعالیٰ نے میرے قلب میں ایک ایسی میزانِ حق و عدل کا القا فرمایا جس سے امتِ محمدیہ کے مابین واقع ہونے والے تمام اختلافات کے اسباب معلوم کر سکوں اور جان لوں کہ اللہ اور اس کے نزدیک حق کیا ہے ؟''
>
> (ترجمہ از صدر الدین اصلاحی)

اس رسالے میں دورِ نبوی سے لے کر دسویں صدی عیسوی/چوتھی صدی ہجری یعنی ائمہ کے دور تک فقہی اجتہاد اور فقہی اختلاف کی صورتیں پیش کر کے ، آخر میں ان بیماریوں کا ذکر کیا ہے جو باہمی نزاع اور ہنگامہ آرائی کا باعث بنیں ۔ سب سے پہلی بیماری اہلِ علم کے فقہی مجادلوں اور مناظروں کی شکل میں آئی ۔ اس کی ایک وجہ ائمہ مجتہدین کی حقیقی بنائے اختلاف سے عدم واقفیت بھی تھی ۔ ایک وجہ فقہی اقوال کی حقیقت سے بے خبری اور ''ظاہریت'' کے مفہوم سے نا آشنائی بھی تھی ۔

ایک دوسری بیماری اندھی تقلید تھی ۔ اگرچہ اس تقلید کے وزنی وجوہ بھی تھے مگر اس سے اجتہاد کے جائز اور ضروری راستے بھی بند ہوگئے ۔ دوسری طرف اہل الحدیث کی طرف سے انتہا پسندانہ شدت پیدا ہوگئی جس نے سوچ اور فکر کے دروازے بند کر دیے ۔ پھر غیر ضروری اصطلاحی بحثوں اور موشگافیوں کا بھی زور ہوا جس نے خواہ مخواہ کی تدقیق پیدا کر کے فہمِ مسائل کو الجھا دیا ۔

ان بحثوں کے بعد شاہ صاحب نے ایک نقطۂ عدل کی نشان دہی کی ہے اور

لکھا ہے کہ :

''مذہب کے چند جزئی مسائل نے باہمی ہنگامہ آرائیوں کا جو
طوفانِ عظیم بپا کر رکھا ہے اس پر جب میں نے غور کیا تو یہ پایا
کہ ہر گروہ حق و اعتدال سے ہٹا ہوا ہے ۔''

اس کے بعد تقلید اور اجتہاد کی جائز حدوں کی تعین کی ہے ، استخراجِ مسائل کے اصول گنائے ہیں اور تمسک بالحدیث کے صحیح معنی بتائے ہیں اور فروعی مسائل میں اعتدال رکھ کر اصولی احکام شرعی پر اتفاق کرنے کی تلقین کی ہے تاکہ امتِ محمدیہ میں کامل ربط و ضبط اور مؤدت و الفت پیدا[1] ہو ۔

فرقے کی جنگ کا دوسرا میدان شیعہ سنی اختلاف ہے ۔ اس کے سلسلے میں بھی شاہ صاحب نے خاص طور سے توجہ دی ، اس لئے کہ یہ مسئلہ ان کے نزدیک محض نظری نہ تھا بلکہ ہندوستان میں ملت کے اتحاد کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھا ۔ مغلوں کے دور میں ایرانی تورانی نزاع کی صورت میں اس کا خاص سیاسی مفہوم پیدا ہو چکا تھا ، بلکہ ملت اسلامیۂ ہند کے لئے اس سے زیادہ خوفناک حادثہ کوئی تھا ہی نہیں ، چنانچہ یہ ثابت ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی ایک بڑی وجہ یہ نزاع بھی تھی ۔

شاہ صاحب نے اس سلسلے میں دو اہم کتابیں لکھیں اور دونوں فارسی میں ہیں :

(۱) 'ازالۃ الخفا' ۔ (۲) 'قرۃ العینین' ۔ ان میں شاہ صاحب کا استدلال عقلی بھی ہے اور علمی بھی اور کوشش یہ کی ہے کہ اصول بھی قائم رہے اور اختلاف بھی کم ہو ۔

علم اسرارالدین

یہ علمِ کلام کی وہ نوع ہے جس میں احکامِ دین کی عقلی تعبیر کی گئی ہے اور اس کے ضمن میں زندگی اور کائنات کی عمرانی اور تمدنی حقیقتوں کے حوالے بھی دیے ہیں ۔ اس موضوع پر 'حجۃ اللہ البالغہ' (عربی) اور 'تفہیماتِ الٰہیہ' (عربی و فارسی) کے بعض حصے بڑے بلند حقائق پر مشتمل ہیں ۔

---

(۱) تفہیمات الٰہیہ میں بھی ان اختلافات پر گفتگو کی ہے اور ان کے رفع کرنے کے طریقے بتائے ہیں ۔

شاہ صاحب نے 'حجۃ اللہ البالغہ' میں اسلام کی کل حقیقتوں کی جو تشریح و تعبیر کی ہے ، اس کی تفصیل کے لئے عربی ادب سے متعلق جلد ملاحظہ کی جائے ، البتہ یہاں ان کی حکمتِ اجتماعی کا مختصر سا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

شاہ صاحب کی اجتماعی حکمت کو سمجھنے کے لئے ان کی اصطلاح 'ارتفاقات' اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ ارتفاق کے معنی ہیں : استعانت و انتفاع ۔ دوسرے الفاظ میں تعاون و تناصر ۔ شاہ صاحب نے مذکورہ کتاب میں حکمتِ ارتفاق پر گفتگو کرتے ہوئے ایک عقلی نظامِ فکر قائم کیا ہے اور انسان کی حیوانی جبلّتوں سے ابتدا کر کے (جو انسانی حیات کے لئے ناگزیز ہیں) انسان کے لئے الہامِ طبعی کا ذکر کیا ہے جو بنیادی انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ناگزیر ہیں ۔ یہ بتایا ہے کہ کون سے طریقے ان کی تکمیل کے لئے اختیار کئے جائیں ۔ اس الہامِ طبعی کی ابتدائی صورت دوسرے حیوانی گروہوں میں بھی موجود ہے مگر انسان کو برتر عقل کا مالک بنا کر اسے بہتر تدابیر پر قادر کیا گیا ہے ۔ اس طرح اسے حیوانوں سے تین چیزیں زائد دی گئی ہیں :

۱ ۔ 'رفاہ عام کا میلان' ۔ حیوانات جبلّتوں کے تابع چلتے ہیں اور وہ وہی کام کرتے ہیں جن کی دعوت جبلّتوں کے اندر سے نمودار ہوتی ہے ۔ مگر انسان ایسے کام بھی کرتے ہیں جن میں انہیں کسی قریبی نفع کی امید نہیں ہوتی اور کسی جبلّت کی تسکین بھی مطلوب نہیں ہوتی ۔ یہ کام عقل کے حکم یا فیصلے سے کئے جاتے ہیں ۔ مثلاً کسی اچھے شہری نظام کی آرزو ، سماجی اخلاق کی پیروی یا بعدالموت کے عذاب و ثواب کے حوالے سے کام کرنا یا یہ کوشش کرنا کہ لوگوں کے دلوں میں اپنا دبدبہ بٹھائے ۔ یاد رہے کہ میکڈوگل نے ان میلانات کو جبلّتوں میں شامل کیا ہے (مثلاً Domineering) مگر دراصل یہ بعید نفع والی جبلّتیں ہیں ، قریبی نفع والی نہیں ۔ اس لئے انہیں میلان کہنا چاہیے نہ کہ جبلّت ۔

۲ ۔ 'حُسبِ جمال' ۔ انسان اپنی ضروریات کی تکمیل میں محض جبلّتوں کے تقاضے پورے نہیں کرتا بلکہ وہ ہر چیز میں حسن اور خوبصورتی کا بھی تقاضا کرتا ہے اور یہ وہ عطیۂ ربّانی ہے جسے ذوق کہا جاتا ہے ۔

۳ ۔ 'تقلید و نقالی کا میلان' ۔ اور پھر نقل پر قانع نہ ہو کر ایجاد و اختراع کی کوشش کرنا ۔

... میں ہوتا ہے لیکن بعض انسانوں
... کا مادہ بھی ہوتا ہے اور وہ معاشرے کے فائدے کے لئے ایجاد بھی کرتے رہتے ہیں -

شاہ صاحب کا خیال ہے کہ ارتفاق کی ضرورت انسان کی ضرورتوں کے اندر سے پیدا ہوتی ہے - اور مذکورہ بالا تینوں ملکات کی مدد سے ایک تمدن ظہور میں آتا ہے اور انہیں چار صورتوں سے تکمیل پذیر بھی ہوتا ہے - ابتدائی دیہی نظام زندگی سے شہریت تک ، شہریت سے ہئیتِ حاکمہ تک اور یہاں سے آگے خلافت تک -

ابتداء میں اجتماع سادہ عادات کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے - پھر ان میں روحانی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں ، لہٰذا تمام نظامِ انسانی کو درست رکھنے کے لئے امام یا خلیفہ کی ضرورت ہوتی ہے جو معاشرے میں عدل پیدا کرے اور اسے صحت مند رکھے - اس کے لئے ضروری ہے کہ خلیفہ یا امام صاحبِ شوکت ہو جو خلافت کے تقاضے پورے کر سکے -

شاہ صاحب نے 'البدور البازغہ' (عربی) میں ارتفاقات کی مزید تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شہریت (ارتفاق دوم) کے لئے پانچ حکمتوں کی ضرورت ہے - (۱) حکمتِ معاشیہ - (۲) حکمتِ اکتسابیہ - (۳) حکمتِ منزلیہ - (۴) حکمتِ تقابلیہ اور حکمت تعاونیہ -

شہریت جب ترقی کرتی ہے تو ایک اجتماعی نظامِ تمدن کی ضرورت پڑتی ہے جو ایک مملکت یا خلافت اور آخر میں اتحادِ اقوامِ عالم کے نظامِ واحد کی شکل اختیار کر سکتی ہیں -

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ارتفاقات تمام اقوام میں پائے جاتے ہیں اور جو لوگ اس تعاون کے قائل نہیں وہ انتشار کے علم بردار اور انسانی بہبود کے مخالف ہیں - طبعی طور سے کسی صحت مند انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ارتفاق کا قائل نہ ہو - لیکن جب کوئی سوسائٹی ان ارتفاقات کے سلسلے میں ، صحیح عملی تنظیم نہیں کرتی تو اس سے بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے ، معاشی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ لوگ جنہیں معاشی وسائل پر قدرت ہے ، عیاشی اور تن آسانی کے لئے بددیانتی کرتے اور اس کے وسائل کی ایجاد میں انہماک کا اظہار کرتے ہیں - پھر اس سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے -

شاہ صاحب کا سیاسی ادراک

شاہ صاحب نے اپنی قوتِ تجزیہ اور بصیرتِ روحانی سے ملتِ اسلامیہ ہند کے زوال و انحطاط پر بھی نظر ڈالی اور کچھ نتیجے نکالے جن کا اظہار انہوں نے 'حجة الله البالغه' 'تفہیمات' میں نیز مختلف خطوط میں کیا ہے جو اس زمانے کی مختلف سیاسی اور [illegible] شخصیتوں کے نام لکھے۔ ان خطوط میں بہت سے عربی میں ہیں اور کچھ فارسی میں (ابوالحسن مراد آبادی کی تصنیف 'کلماتِ طیبات' کے باب چہارم میں ہیں)۔ ان میں یوں [illegible] اور طریقت کے نکات زیرِ بحث آئے ہیں مگر معنی خیز سیاسی اشارے بھی موجود ہیں۔ شاہ صاحب کے تجزیات پر نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے امتِ مسلمہ کے سیاسی زوال کو روکنے کے لئے چار طریقے اختیار کئے:

١۔ صحیح دینی احساس پیدا کیا اور قرنِ اول کے اسلام کی طرف رجوع کی دعوت دی۔

٢۔ شیعہ سنی، مقلّد غیر مقلّد، اور اربابِ طریقت و شریعت کے مقاماتِ اتصال دریافت کر کے شیرازہ بندی کا احساس پیدا کیا۔

٣۔ معاصر سلاطینِ اسلام میں سے بعض کو بذریعہ خطوط متوجہ کیا اور اپنے ملک کے اکابر و عمائد کو بھی جھنجھوڑا اور انہیں تلقین کی کہ اس زوال کو روکنے کی تدبیر کریں۔

٤۔ انہوں نے توجہ دلائی کہ جو نظام موجود ہے وہ ارتفاق کے لحاظ سے ناقص ہے۔ پھر 'فک کل نظام'[1] کی دعوت دے کر ایک ایسے لئے اجتماعی نظام کی ضرورت کا شعور دلایا جس کی بنیاد منہاجِ نبوت ﷺ پر ہو، (اس کے لئے دیکھیے: عبیداللہ سندھی: شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ١٩٥٢ء۔ نیز شمس الرحمٰن محسنی: شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے۔ سندھ ساگر اکیڈمی ١٩٤٦ء اور مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مکتبہ ملیہ راولپنڈی)۔

شاہ ولی اللہؒ صاحب کی اس دعوت نے آگے چل کر ایک ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کی۔ آئندہ کی تحریکوں میں جہاد کا جو جذبہ مجاہدین نے دکھایا اس کا

---

(١) موجودہ نظام کو ختم کر دینا۔

[illegible] کر

[illegible] جذبے کو پھر سے

[illegible] قول میں بڑی صداقت ہے کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے دور جدید کی جملہ احیائی تحریکوں کا نقطۂ آغاز اور مرکز یہی دعوت تھی -

شاہ عبدالعزیزؒ

حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز تھے - ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۳۰ ستمبر ۱۷۴۶ء) کو پیدا ہوئے - تاریخی نام غلام حلیم ہے - اپنے نامور والد شاہ ولی اللہ سے ابتدائی تحصیل علمی کے بعد ، شیخ محمد عاشق پھلتی ، خواجہ محمد امین کشمیری اور مولانا نوراللہ بڈھانوی سے بھی تربیت حاصل[1] کی - سترہ سال کی عمر میں علوم معقول کے عالم یگانہ قرار پائے اور ہر معنی میں اپنے والد کے جانشین ہوئے - ۷ شوال ۱۲۳۹ھ (۵ جون ۱۸۲۴ء) کو دہلی میں انتقال ہوا - اس وقت ان کی عمر ۸۹ سال کی تھی -

شاہ صاحب کی تصانیف میں فارسی کی کتابوں کے نام یہ ہیں : ۱- 'تفسیر عزیزی' (فتح العزیز) ۲- 'بستان المحدثین' ۳- 'فتاویٰ عزیزی' ۴- 'عجالۂ نافعہ' ۵- 'شرح میزان المنطق' (فارسی) ۶- 'تحفۂ اثنا عشریہ' ۷- 'عزیزالاقتباس فی فضائل اخیارالناس' (فارسی) -

ایک رسالہ 'سرالشہادتین' عربی میں ہے - ان کے علاوہ دو تین رسالے اور بھی ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے -

'تفسیر عزیزی' (فتح العزیز) : قرآن مجید کے سوا تین پاروں کی یہ تفسیر فارسی میں ہے - سورۂ فاتحہ سے پارہ دوم کے ربع تک اور آخر کے ۲ پارے - یہ شاہ صاحب کے آخری حصۂ عمر کی تالیف ہے - اس تفسیر کا مزاج دینی بھی ہے اور معقولی بھی ، تاریخی بھی ہے اور تشریحی بھی - اس میں انہوں نے فن تفسیر میں ایک خاص اسلوب اختیار کیا ہے

---

(۱) تعلیم و تربیت کی تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ ملفوظات عزیزی - مترجمہ محمد علی لطفی و انتظام اللہ شہابی (پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز ، ۱۹۶۰ء) - نیز کمالات عزیزی مرتبہ ظہیر الدین و سید احمد ولی اللّٰہی ۱۹۶۷ء ، کراچی -

جو اشارے ان کے نامور والد نے اپنے ترجمے میں کئے ہیں ، یہ گویا ان کی توسیع ہے ۔ لاہور کے ایڈیشن میں حاشیے پر اور آخر میں ان موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر اس تفسیر میں بحث ہوئی ہے ۔ (اس کے ایک پارے (تبارک) کا اردو ترجمہ بمبئی سے ۱۲۶۸ھ میں عبدالملک بن محمد صادق نے مطبع محمدی میں چھپوایا) ۔

'فتاوی عزیزی' : اس میں شاہ صاحب کے فتوے جمع ہیں ۔ ان سے ان کے تفقہ اور تجربہ و آگاہی کا پتہ چلتا ہے ۔

'عجالۂ نافعہ' ۔ علم حدیث کے بعض اہم مسائل سے متعلق ہے جو شاہ صاحب نے ... قمرالدین الحسنی کی خواہش پر لکھا ۔ اس میں علم حدیث کی دینی اہمیت کے بارے میں کہا ہے کہ :

> ''علم حدیث شرافتے دارد کہ ہیچ علم بآن نمی تواند رسید زیرآکہ قرآن . . . وغیرہ ہمہ موقوف بر بیان پیغمبر ست و کشفیات و عقلیات را تا باین میزان نسنجند و برین معیار نزنند قابلِ اعتماد و محلِ اعتبار نمی تواند بود ۔''

انہوں نے فرمایا کہ جب علمِ حدیث کی اہمیت اتنی بنیادی ہے تو ضروری ہے کہ اس کے متعلق یعنی اس کے راویوں اور اس کے صحیح مجموعوں کے بارے میں یقینی علم حاصل ہو ۔ اس کے لئے انہوں نے ضروری اصول وضع کئے ہیں اور خاتمے میں موضوع حدیثوں اور راویوں کے کذب کی علامتیں بتائی ہیں ۔

ہمارے جدید دینی مذاق یا دینی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے یہ حصہ قابلِ توجہ ہے ۔ آج جب کہ حدیثوں پر شک کیا جاتا ہے ، موضوع حدیثوں کی پہچان کے یہ اصول مفید رہنمائی کر سکتے ہیں ۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ علامتیں چند در چند ہیں ۔ علمائے جرح و تعدیل نے اس معاملے میں بے حد چھان بین کی ہے اور غلط حدیثوں کے علمی اور نقلی رد پیش کئے ہیں ، جن کو معیار بنانے کے بعد وضعی حدیث کے ابھرنے کا موقعہ ذرا کم ہی نکلتا ہے ۔ شاہ صاحب نے جو گیارہ اصول بتائے ہیں ان میں سے دو چار آج کے دور کو مطمئن کرنے کے لئے مفید ہیں ۔ مثلاً ان کی رائے میں وہ حدیث موضوع ہوگی جس میں کوئی روایت تاریخ کے مسلّم واقعات کے خلاف ہو اور وقت و حال اس کے غلط ہونے کی شہادت دیں یا

سرچشمہ یہی دعوت تھی ۔ خصوصاً اس لئے کہ حضرت سید احمدؒ بریلوی کے رفیق خاص شاہ اسمعیلؒ شہید اسی خاندان سے متعلق تھے ۔ انہوں نے سید صاحب کے ساتھ مل کر ایک اہم زمانے میں علمِ جہاد بلند کیا اور حمّیت کے ضعیف شدہ جذبے کو پھر سے بیدار کیا ۔ شیخ محمد اکرام کے اس قول میں بڑی صداقت ہے کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے دور جدید کی جملہ احیائی تحریکوں کا نقطۂ آغاز اور مرکز یہی دعوت تھی ۔

شاہ عبدالعزیزؒ

حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز تھے ۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۳۰ ستمبر ۱۷۴۶ء) کو پیدا ہوئے ۔ تاریخی نام غلام حلیم ہے ۔ اپنے نامور والد شاہ ولی اللہ سے ابتدائی تحصیل علمی کے بعد ، شیخ محمد عاشق پھلتی ، خواجہ محمد امین کشمیری اور مولانا نوراللہ بڈھانوی سے بھی تربیت حاصل[1] کی ۔ سترہ سال کی عمر میں علوم معقول کے عالمِ یگانہ قرار پائے اور ہر معنی میں اپنے والد کے جانشین ہوئے ۔ ۷ شوال ۱۲۳۹ھ (۵ جون ۱۸۲۴ء) کو دہلی میں انتقال ہوا ۔ اس وقت ان کی عمر ۸۹ سال کی تھی ۔

شاہ صاحب کی تصانیف میں فارسی کی کتابوں کے نام یہ ہیں : ۱۔ 'تفسیرِ عزیزی' (فتح العزیز) ۲۔ 'بستان المحدثین' ۳۔ 'فتاویٰ عزیزی' ۳۔ 'عجالۂ نافعہ' ۵۔ 'شرح میزان المنطق' (فارسی) ۶۔ 'تحفۂ اثنا عشریہ' ۷۔ 'عزیزالاقتباس فی فضائل اخیارالناس' (فارسی) ۔

ایک رسالہ 'سرّالشہادتین' عربی میں ہے ۔ ان کے علاوہ دو تین رسالے اور بھی ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے ۔

'تفسیر عزیزی' (فتح العزیز) : قرآن مجید کے سوا تین پاروں کی یہ تفسیر فارسی میں ہے ۔ سورۂ فاتحہ سے پارہ دوم کے ربع تک اور آخر کے ۲ پارے ۔ یہ شاہ صاحب کے آخری حصۂ عمر کی تالیف ہے ۔ اس تفسیر کا مزاج دینی بھی ہے اور معقولی بھی ، تاریخی بھی ہے اور تشریحی بھی ۔ اس میں انہوں نے فن تفسیر میں ایک خاص اسلوب اختیار کیا ہے

---

(۱) تعلیم و تربیت کی تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ ملفوظاتِ عزیزی ۔ مترجمہ محمد علی لطفی و انتظام اللہ شہابی (پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز ، ۱۹۶۰ء) ۔ نیز کمالات عزیزی مرتّبہ ظہیر الدین و سید احمد ولی اللّٰہی ۱۹۶۷ء ، کراچی ۔

جو اشارے ان کے فاضل والد نے اپنے ترجمے میں کئے ہیں ، یہ گویا ان کی توسیع ہے ۔ لاہور کے ایڈیشن میں حاشیے پر اور آخر میں اُن موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر اس تفسیر میں بحث ہوئی ہے ۔ (اس کے ایک پارے (تبارک) کا اردو ترجمہ بمبئی سے ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں عبدالملک بن محمد صادق نے مطبع محمدی میں چھپوایا) ۔

'فتاویٰ عزیزی' : اس میں شاہ صاحب کے فتوے جمع ہیں ۔ ان سے ان کے تفقہ اور بصیرت و آگاہی کا پتہ چلتا ہے ۔

'عجالۂ نافعہ' ۔ علم حدیث کے بعض اہم مسائل سے متعلق ہے جو شاہ صاحب نے سید قمرالدین الحسنی کی خواہش پر لکھا ۔ اس میں علمِ حدیث کی دینی اہمیت کے بارے میں کہا ہے کہ :

> ''علم حدیث شرافتے دارد کہ ہیچ علم بمثابۂ آن نمی تواند رسید زیرا کہ قرآن . . . وغیرہ ہمہ موقوف بر بیان پیغمبرؐ است و کشفیات و عقلیات را تا باین میزان نسنجند و برین معیار نزنند قابلِ اعتماد و محلِ اعتبار نمی تواند بود ۔''

انہوں نے فرمایا کہ جب علمِ حدیث کی اہمیت اتنی بنیادی ہے تو ضروری ہے کہ اس کے متعلق یعنی اس کے راویوں اور اس کے صحیح مجموعوں کے بارے میں یقینی علم حاصل ہو ۔ اس کے لیے انہوں نے ضروری اصول وضع کئے ہیں اور خاتمے میں موضوع حدیثوں اور راویوں کے کذب کی علامتیں بتائی ہیں ۔

ہمارے جدید دینی مذاق یا دینی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے یہ حصہ قابلِ توجہ ہے ۔ آج جب کہ حدیثوں پر شک کیا جاتا ہے ، موضوع حدیثوں کی پہچان کے یہ اصول مفید رہنمائی کر سکتے ہیں ۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ علامتیں چند در چند ہیں ۔ علمائے جرح و تعدیل نے اس معاملے میں بے حد چھان بین کی ہے اور غلط حدیثوں کے علمی اور نقلی رد پیش کئے ہیں ، جن کو معیار بنانے کے بعد وضعی حدیث کے ابھرنے کا موقعہ ذرا کم ہی نکلتا ہے ۔ شاہ صاحب نے جو گیارہ اصول بتائے ہیں ان میں سے دو چار آج کے دور کو مطمئن کرنے کے لئے مفید ہیں ۔ مثلاً ان کی رائے میں وہ حدیث موضوع ہوگی جس میں کوئی روایت تاریخ کے مسلّم واقعات کے خلاف ہو اور وقت و حال اس کے غلط ہونے کی شہادت دیں یا

وہ مقتضائے عقل و شرع کے خلاف ہو ۔ اس کے علاوہ جس حدیث میں رکاکتِ لفظ و معنی نظر آئے وہ بھی مقامِ نبوت کے خلاف ہوگی ۔ اسی طرح جس حدیث میں سیاسی جالب داری کی بات ہو ، وہ بھی قابلِ تحقیق ہوگی ۔ موضوع حدیثیں گھڑنے والوں کے لئے واعظ لوگ بھی مطعون ہیں اور امراء و ملوک کی صحبت میں بیٹھنے والے سخن ساز لوگ بھی جو بادشاہوں کے لئے ناجائز سہولتیں پیدا کرنے کے لئے افسانہ سازی کرتے تھے ۔ ان اصولوں سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ حدیث کی صحت کے معاملے میں کتنی احتیاط روا رکھی جاتی رہی ہے ۔ جو لوگ حدیث پر اعتراض کرتے ہیں وہ علمائے جرح و تعدیل کی کاوشوں کی بے قدری کرتے ہیں ۔ (عجالۂ نافعہ کا اردو ترجمہ مع فوائد مولانا عبدالحلیم چشتی نے ۱۹۶۴ء چھپوا دیا ہے) ۔

'بستان المحدّثین' : اس میں شاہ صاحب نے محدّثین کبار کے مسانید اور مجموعوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کی اہمیت واضح کی ہے ۔ (اس کا اردو ترجمہ از عبدالسمیع کراچی سے شائع ہو چکا ہے ۔ ۱۳۲۵ء) ۔

شاہ صاحب کی مشہور ترین کتاب 'تحفۂ اثنا عشریہ' ہے جو متنازعہ فیہ ہونے کے باوجود ، مناظراتی ادب ہی میں نہیں ، مسلمانانِ ہند کی دینی تاریخ میں بھی اہم مقام رکھتی ہے ۔ یہ دراصل اس زمانے کے بعض مذہبی نزاعات کے ماحول میں لکھی گئی ہے جن کو ابھارنے میں ، ان سے پہلے کے دو سو سال کے واقعاتِ تاریخی اور عواملِ معاشرتی نے بڑا حصہ لیا ، جن کی ایک افسوس ناک شکل ہندوستان میں شیعہ سنی مخاصمت تھی (جسے کسی حد تک ایرانی تورانی نزاع کا نتیجہ سمجھنا چاہیے ۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مخاصمت کے دور کرنے میں (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے) بھرپور حصہ لیا تھا اور بڑی حد تک ملّتِ اسلامیۂ ہند کو انتشار سے بچانے کی کوشش میں اس موضوع کے نزاعی امور پر بہت کچھ لکھا ۔ یہی خدمت شاہ عبدالعزیز صاحب کو انجام دینی پڑی ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں شاہ صاحب کے زمانے میں یہ مخاصمہ کچھ زیادہ ہی شدید ہوگیا تھا اور اس کی ذمے داری اس زمانے کے کوتوالِ دہلی مرزا نجف خان ، امیرالامراء ذوالفقار الدولہ پر ڈالی جاتی ہے ۔ مرزا مظہر جان جاناںؒ کا حادثہ بھی ہو چکا تھا اور خود شاہ صاحب اور ان کے خاندان کو بھی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ میرزا مظہر جانِ جاناںؒ

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''حال مردم این شہر از روزیکہ نجف خان است از شاہ تا گدا تباہ است ۔''
(کلمات ِ طیبات) ۔

میرزا نجف خان ایسے بلند نظر امیر سے تو اس امر کی توقع نہیں لیکن خیال گذرتا ہے کہ بعض کوتاہ نظر لوگوں نے اس کے معتقدات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہوگا ورنہ میرزا مظہر یہ الفاظ نہ لکھتے ۔ ادھر شاہ فخرالدینؒ اور ان کے خلیفہ شاہ نیاز احمد بریلوی تفضیلی عقائد کے بزرگ تھے ۔ انہوں نے تفضیلی عقیدے پھیلائے ۔ ان حالات کی وجہ سے انتہا پسندانہ خیالات کی اشاعت ہوئی اور تعصب بڑھ گیا ۔

ان حالات میں شاہ صاحب نے شیعہ عقائد کی تردید میں ایک کتاب 'تحفہ اثنا عشریہ' لکھی ۔ اس پر مصلحۃً اپنا تاریخی نام غلام حلیم لکھا (اور ولدیت میں والد ماجد کا عرفی نام قطب الدین احمد رقم ہوا) ۔ یہ کتاب جہاں اہل ِ سنت میں مقبول ہوئی وہاں اس کا مخالفانہ رد ِ عمل بھی سخت ہوا ۔ (دیکھیے نجوم السماء از مرزا محمد علی ، ص ۳۵۳) ۔ سر سید احمد خان نے آثار الصنادید' میں ان احساسات پر خاصا کچھ لکھا ہے اور 'تحفہ حسن' میں بھی اشارے کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے وہ مقصد پورا ہوا جس کے لئے لکھی گئی تھی ۔ بقول شیخ محمد اکرام ''یہ شیعہ سنی مسائل کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے'' (رود ِ کوثر ، از اکرام ، ص ۵۷۱ ، ۵۷۲ ، لاہور ۱۹۵۸ء) ۔ اس کتاب کے جواب میں شیعہ علماء نے کئی کتابیں لکھیں مثلاً کامل دہلوی کی کتاب 'نزہت اثنا عشریہ' (۱۲۰۶ھ) ۔ 'نصرۃ المومنین و ذلۃ الشیاطین' ، مجتہد العصر سید دلدار علی کے چھ رسالے ('صوارم الہیات' ، 'حسام الاسلام' ، 'احیاء السنۃ' ، 'رسالہ ذوالفقار' ، 'صوارم در اثبات امامت' ، 'رسالہ غیبت') ۔ مجتہد العصر موصوف کے فرزند سید محمد کا 'رسالہ البوارق' (۱۸۶۷ء) اور 'طعن الرماح' ، سید محمد قلی کنتوری کے رسالے 'تقلیب المکائد' ، 'برہان السعادت' اور 'مصارع الافہام' وغیرہ وغیرہ (تفصیل کے لئے دیکھیے 'نجوم السماء' نیز الذریعہ کی 'تصانیف الشیعہ') ۔

'تحفہ اثنا عشریہ[1]' کا مناظراتی لحاظ سے جو بھی مقام ہو اس موقع پر اس کا علمی پہلو

---

(۱) مطبوعہ مطبع حسنی ، دہلی ۱۲۷۱ھ ۔ کتاب کا عرفی نام 'نصیحۃ المومنین و فضیحۃ الشاطین' درج ہے ۔

ہی ہمارے مدّنظر ہے ۔ 'تحفہ' در اصل اپنے طریقِ استدلال اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے ایک خاص منقولی ، تحقیقی اور منطقی انداز لئے ہوئے ہے ۔ اس میں الزامی جواب اور جدل (Argumentum et becculum) سے کام نہیں لیا گیا بلکہ فریقِ ثانی کے مسلّمات سے استشہاد کیا گیا ہے ۔ کتاب میں کسی مقام پر تضحیک و تحقیر سے بھی کام نہیں لیا گیا اور باہمہ احترام دلیل ہی کو وسیلہ بنایا گیا ہے ۔ یہ کتاب بعض اہم دینی مباحث کا معقول مأخذ ہے ۔ اس میں مشاجراتِ صحابہؓ کے محرکات و اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس کے چند ابواب مثلاً باب ششم در نبوت ، باب ہفتم در امامت ، باب ہشتم در جہاد ۔ یہ ابواب مسلمانوں کے سیاسی فکر کے بعض اہم پہلوؤں کے لئے بڑی عمدہ رہنمائی کرتے ہیں ۔

فضائلِ صحابہؓ و اہل بیتؓ

اس موضوع پر شاہ صاحب کے تین رسالے اور بھی ہیں (۱) 'سرّالجلیل فی مسئلة التفضیل' (فارسی) ۔ (۲) 'عزیز الاقتباس فی فضائل اختیار الناس' (فارسی) ۔ (۳) 'وسیلة النجات' (فارسی) ۔ یہ تینوں محمد ایوب قادری نے مع ترجمہ و مع مکتوبات شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع‌الدین یک جا چھپوا دیے ہیں (۱۹۶۶ء) ۔ مضمون ان کا ان کے نام سے ظاہر ہے ۔ ان میں بھی شیعہ سنی کے دینی نزاع پر گفتگو ہے اور انداز بیان سادہ ، مطلب خیز اور اطمینان و یقین پیدا کرنے والا ہے ۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے اس تصنیفی کام سے ان کے ذہنی رخوں کا علم حاصل ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی قابلیتوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے ۔ شاہ صاحب ، اپنے والد ماجد سے مختلف شخصیت کے مالک معلوم ہوتے ہیں ۔ شاہ ولی اللہ جہاں ایک خود آگاہ مفکر کے طور پر ابھرتے ہیں (جنہیں اپنے منصب کا گہرا شعور و احساس ہے اور وہ یہ ذمے داری محسوس کرتے ہیں کہ اپنی آگاہی اور کشف سے پورے ملّی نظام فکر کے رخ کو بدل دیں کیونکہ انہیں اس کے بارے میں آگاہی دی گئی ہے اور ہدایت ہوئی ہے) وہاں شاہ عبدالعزیز صاحب ایک مجلسی شخصیت نظر آتے ہیں ۔ خوش بیان مقرر ، بذلہ سنج ، حاضر جواب ، مناظر اور متکلم —— ان کے ذہن کا دروازہ سوسائٹی کی طرف کھلتا ہے ۔ شاہ ولی اللہ اگرچہ خارجی ماحول سے بے نیاز نہیں مگر ان کے ذہن کا باطنی دروازہ زیادہ کشادہ ہے ۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیز کے خطوط ، ان کے مجربات ، ملفوظات اور

خطبات ان کے فضائل و خصائص و اوصاف پر گہری روشنی ڈالتے ہیں ۔

شاہ صاحب کے دو فتوے بڑے دور رس نتائج کے حامل ہیں ـــ ایک فتویٰ تو یہ کہ انگریزی زبان کی تحصیل (جس کا ابتدائے عہد انگریزی میں بڑا جھگڑا تھا) جائز ہے بخلاف اس رائے کے کہ انگریز کا کامل مقاطعہ لازم ہے ، جس میں انگریزی زبان کا مقاطعہ بھی شامل ہے ۔ دوسرا فتویٰ یہ کہ ہندوستان مسلمانوں کے لئے دارالحرب ہے اور اس میں جہاد فرض ہے لہٰذا انگریزی حکومت سے آزادی حاصل کرنا لازم ہے ۔

اس دوسرے فتوے کی بنیاد پر سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "Our Indian Mussalmans" میں حکومت برطانیہ کو یہ تاثر دیا کہ مسلمان مذہباً مکلّف ہیں کہ برطانوی حکومتِ ہند کے وفادار نہ رہیں ۔ شاہ صاحب نے جہاد کی جو دعوت دی اس سے ان کے شاگرد اور جانشین متاثر ہوئے ۔ چنانچہ شاہ اسماعیل اور دوسرے بزرگ ، جنہوں نے سکھوں کے خلاف اور بعد میں انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا ، وہ اس دعوت سے متاثر ہوئے ۔

شاہ صاحب کے شاگرد

مولوی رحیم بخش نے شاہ صاحب کے شاگردوں کی فہرست 'حیاتِ شاہ ولی اللہ' میں دی ہے ۔ ان میں شاہ رفیع الدین (شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی) ، شاہ عبدالقادر ، شاہ محمد اسحاق ، مفتی صدرالدین ، شاہ غلام علی ، مخصوص اللہ ، مولوی رشید الدین خان ، مولوی کریم اللہ دہلوی ، مولوی شاہ اسماعیل (شہید) ، مولانا محبوب علی ، مولوی عبدالخالق ، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی ، مولوی فضل حق خیر آبادی ، مولوی حسین علی لکھنوی ، مولوی حسین احمد ملیح آبادی وغیرہم شامل ہیں ۔

ان میں سے ہر ایک نے ولی اللٰہی فکر کی اشاعت میں حصہ لیا اور شاہ عبدالعزیزؒ کے دینی و سیاسی مزاج کی پیروی کی ۔ لیکن تصنیف و تالیف کے اعتبار سے ان میں شاہ رفیع الدینؒ ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ اسماعیلؒ شہید ، جن کے عملی جہاد کی سرگزشت سید احمد بریلویؒ کی دعوتِ جہاد کے ساتھ وابستہ ہے ، خصوصی تذکرے کے مستحق ہیں ۔

شاہ رفیع الدینؒ

شاہ رفیع الدینؒ (شاہ ولی اللہؒ کے فرزند اور شاہ عبدالعزیزؒ کے چھوٹے بھائی) بہ حیثیت مصنف و مفکر اپنے نامور باپ اور برگزیدہ بھائی کے مقابلے میں کچھ کم تھے مگر

چونکہ انداز فکر وہی تھا اس لئے انہوں نے بھی اپنے زمانے کے اہم سوالوں (یعنی شکوک و شبہات) کے تشفی بخش ازالے کی کوشش کی اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بری رسموں اور بدعتوں کو دور کرنے کا اہتمام کرتے رہے۔

ان کی کتابوں میں 'ترجمۂ قرآن مجید'، 'تکمیل الاذہان'، 'رسالۂ مقدمۂ العلم'، 'اسرارالمحبۃ'، 'دمغ الباطل'، 'تفسیر آیت النور'، 'مجموعۂ رسائل تسعہ' اور 'علامات قیامت' مشہور ہیں۔ ان میں کچھ عربی میں ہیں کچھ فارسی میں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ شاہ رفیع الدینؒ اپنے والد بزرگوار کی حکمت کے شارح بھی تھے، لہٰذا مذکورہ بالا اکثر کتابوں میں انہوں نے وہی دینی عقلی انداز اختیار کیا ہے۔ تفسیر (عربی) 'آیت النور' کے مقدمے میں حقایق (معارف الٰہیہ) کی بحث کرنے والوں کو پانچ گروہوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) محدثین، (۲) متکلمین، (۳) صوفیہ، (۴) حکما اور (۵) آخر میں حکمت ولی اللٰہی کا دبستان جس سے وہ خود بھی متعلق ہیں۔ غرض شاہ رفیع الدین نے اپنی فارسی کتابوں میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہے اور ان کے استدلال کی بنیادی زمین وہی ہے جو ان کے بزرگوں کی ہے، اگرچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ان بزرگوں کے درجے کے مجتہد اور مناظر نہ تھے۔

شاہ عبدالقادرؒ

شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء میں ولادت ہوئی۔ سال وفات ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء ہے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ترک کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر اکبر آبادی مسجد کے ایک حجرے میں گذار دی۔ سرسید احمد خان 'آثار الصنادید' میں لکھتے ہیں کہ من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب تھا کہ رؤسائے شہر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بسبب ادب دور دور خاموش بیٹھتے۔ فارسی زبان میں آپ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہوسکا لیکن آپ کا یہ علمی کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اردو زبان میں قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ 'موضح القرآن' کے نام سے آپ نے کیا۔

شاہ اسماعیلؒ شہید

شاہ عبدالغنیؒ (بن شاہ ولی اللہؒ) کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ۱۲ ربیع الآخر ۱۱۹۳ھ

(۲۹ اپریل ۱۷۷۹ء) کو پیدا ہوئے ۔ دس سال کے تھے کہ والد فوت ہو گئے ، پھر شاہ عبدالقادرؒ کے زیر تربیت رہے ۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں علوم نقلی و عقلی سے فراغت پائی ۔ سید احمد بریلویؒ نے جب دعوت کا آغاز کیا تو ان سے بیعت کر لی اور ان کے ایما سے ردّ بدعات اور جہاد فی سبیل اللہ کے حق میں وعظ کہنے لگے ۔ شاہ اسمٰعیل کی تقریروں میں بڑا اثر تھا ۔ انہوں نے تعلم و تعلیم کے ساتھ جسمانی ریاضت اور فنون سپہ گری میں بھی دسترس پیدا کی (مولانا مہر اپنی کتاب 'جماعت مجاہدین' میں اس آخری بات سے انکار کرتے ہیں مگر بعض کتابوں میں اس کا تفصیلی ذکر ہے ، اور فنون سپہ گری کی مشق ایسے مجاہدین کے لئے کوئی مستبعد بات بھی نہیں) ۔ ۷ جمادی الآخر ۱۲۴۱ھ (۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء) کو رائے بریلی میں حضرت سید احمدؒ صاحب کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے اور عمر بھر ان کے ساتھ رہے تا آنکہ مئی ۱۸۳۱ء میں بمقام بالاکوٹ سید صاحب کے ہمراہ شہید ہوئے ۔

ان کے اخلاق و عادات اور سیرۃ و کردار کی تفصیلات مختلف مصنفوں نے پیش کر دی ہیں[1] ۔ اس موقع پر انہیں بہ حیثیت مصنف دیکھنے کی ضرورت ہے ۔

مولانا غلام رسول مہر نے مندرجہ ذیل تصانیف کا تذکرہ کیا ہے : (۱) 'ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت و الضریح' ۔ (۲) 'منصب امامت' ۔ (۳) 'عبقات' ۔ (۴) 'تقویۃ الایمان' ۔ (۵) 'تذکیر الاخوان' ۔ (تقویۃ الایمان کا حصہ دوم (عربی میں) اردو ترجمہ از محمد سلطان) ۔ (۶) 'تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین' ۔ (۷) 'اصول فقہ' ۔ (۸) 'رسالۂ منطق' ۔ (۹) 'صراط مستقیم' حصہ اول (۱۰) 'رسالہ یک روزہ' ۔ (یک روزی) نیز کچھ حاشیے بھی لکھے ہیں جو ضائع ہو گئے ہیں ۔ سید احمد صاحبؒ کے مکاتیب بھی انہیں کے قلم سے بیان کئے جاتے ہیں ۔ فارسی کی چند منظومات و مثنویات اور ایک آدھ مثنوی بھی ان کی طرف منسوب ہے ۔

ان تصانیف میں 'منصبِ امامت' ، 'صراط المستقیم' ، 'رسالۂ ایضاح الحق' وغیرہ فارسی میں ہیں ۔ ان کی کتاب 'عبقات' غیر معمولی اہمیت کی مالک ہے[2] ۔

---

(۱) اتحاف النبلاء از صدیق حسن خان ، منظورۃ السعداء ، وصایا اور ارواح ثلاثہ کے علاوہ آثار الصنادید از سرسید احمد خاں اور جدید ترین : جماعت مجاہدین و سیرت سید احمد شہید از غلام رسول مہر وغیرہ ۔

(۲) اس کا اردو میں ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے کیا ہے ۔ شائع کردہ مجلۃ العلمیہ حیدرآباد (دکن) ۔

'منصبِ امامت' : سیاستِ اجتماعیہ کے سلسلے میں یہ مختصر کتاب (یا رسالہ) ، 'حجۃ اللہ البالغہ' اور 'ازالۃ الخفاء' کے مطالب پر ایک نئی تفسیر ہے اور اسلامی فلسفہ سیاست کی جدید تشریح کا درجہ رکھتی ہے ۔

یہ اسلامی سیاسی نظریہ (جو کئی صدیوں کی ملوکیت و سلطنت کے باعث تقریباً فراموش سا ہو گیا تھا) شاہ اسمٰعیلؒ کی نظر میں دینی زندگی کے لئے اصل الاصول کا درجہ رکھتا ہے ۔ انھوں نے فرمایا کہ قوم کی پیشوائی کا منبع پانچ اصول ہیں : (۱) وجاہت (۲) ولایت ۔ (۳) بعثت ۔ (۴) ہدایت ۔ (۵) سیاست ۔

شاہ صاحب کی رائے میں وجاہت تین قسم کی ہوتی ہے : اول محبوبیتِ رب‌العالمین ۔ دوم ملائکہ مقربین میں عزت ۔ سوم نیک بندوں کے لئے وسیلۂ فیض ۔ اور یہ سب باتیں بدرجہ اتم انبیائے کرام کو عطا ہوئی ہیں اور درجہ بدرجہ خدا کے نیک بندوں کو بھی حاصل ہوتی ہیں ۔

انبیاء یا ان کے طریقے پر چلنے والے اہل ہمت فیوضِ باطن کے علاوہ بندگانِ خدا اور معاش و معاد کی اصلاح پر بھی مامور ہوتے ہیں اور اس کے لئے قوانین وضع کرتے ہیں ۔ اس کا نام سیاست ہے ۔ سیاست کی دو قسمیں ہیں : (۱) مربّیانہ اور (۲) امیرانہ ۔ صحیح سیاست یہی مربّیانہ یا سیاست ایمانی ہے ، نہ کہ سیاستِ سلطانی جو اپنی ذات کے لئے نفع حاصل کرنے کی غرض سے ہوتی ہے ۔

سیاستِ ایمانی کی دو قسمیں ہیں : (۱) سیاستِ مدنی ۔ (۲) سیاستِ ملیؔ ۔ سیاستِ مدنی سے مراد بنی آدم کے معاملاتِ معیشت کی اصلاح کا انتظام ، مثلاً بیع و شرا وغیرہ کی تنظیم وغیرہ ۔ سیاستِ ملیؔ سے مراد معاملات اور قضا و دعوی و شہادت وغیرہ کے احکام ، بنائے دین کی پاسداری اور ملّت کی خدمت گزاری ہے ۔

سیاستِ ایمانی کی مختلف قسمیں یہ ہیں : سیاستِ مدنی افعالی ، سیاستِ مدنی اموالی ، سیاستِ ملی افعالی ، سیاستِ ملیؔ اموالی ۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے ان تمام اقسام کے تحت صیغے یا اور فرائض مقرر کئے ہیں اور یہ رسالے کا میری نظر میں سب سے قیمتی حصہ ہے ۔

شاہ صاحب نے آگے چل کر کہا ہے کہ سیاستِ ایمانی کے لئے چند سلیقوں کی ضرورت ہے ، ان کے بغیر یہ سیاست تکمیل پذیر نہیں ہو سکتی ۔ یہ اصول پانچ ہیں :

اول فراست یعنی مردم شناسی ، دوم امارت ، سوم عدالت ، چہارم حفاظت ، معاشرتی اخلاقی برائیوں سے بچنا ، ظلم و تعدی کو روکنا ۔ پنجم نظامت ، تدبیر و شجاعت ، سلیقہ فصل خصومت ۔ یہ حصہ ایک اچھی سیاست و حکومت کی رہنمائی کے اہم اصول بیان کرتا ہے ۔ پھر اس کی جزئیات کی بحث کے بعد شاہ صاحب امام اور امامت کی تعریف و تشریح تک آ گئے ہیں ۔ امامت کی دو قسمیں ہیں : ایک امامتِ حقیقی اور دوسری امامتِ حکمی ۔ ان کی بحث کے بعد امامتِ تامہ ، خلافتِ راشدہ ، اس کے بعد سلطنت ، سلطنتِ عادلہ ، سلطنتِ جبریہ ، سلطنتِ ضالہ ، سلطنتِ کفر وغیرہ کی بحث ہے ۔

راقم الحروف کی رائے میں 'رسالۂ منصبِ امامت' کے تین نکتے قابل غور ہیں : اول یہ کہ شاہ صاحب احیائے ملت کے لئے امامتِ جدید پر زور دے رہے ہیں اور ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے بعد یہ دعوت ، ملی تقاضوں کے عین مطابق تھی ۔ دوم وہ امام کا ایک ایسا تصور دلاتے ہیں جو مثالی ہونے کے باوجود قابلِ عمل بھی ہے ۔ سوم یہ کہ ان کے نزدیک خلافتِ راشدہ منقطع ہوئی ہے ، ختم نہیں ہوئی اور اس کا احیاء دوبارہ ممکن بھی ہے اور ضروری بھی ۔ یہ خیال بھی قابل غور ہے کہ امام کسی شخصِ خاص کا نام نہیں بلکہ ایک عقیدے کا نام ہے ۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک امامت ایک امرِ روحانی ہے اور خدا کی طرف سے بندوں پر شفقت کا ایک نظام ہے ۔ حبِ زر اور لذات و شہوات کے حصول کا ذریعہ نہیں ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک امام کی جملہ صفات حضرت سید احمدؒ میں پائی جاتی تھیں ۔ چنانچہ مجاہدین کی جماعت انہیں امام المومنین کہا کرتی تھی (جماعتِ مجاہدین ، از مہر) ۔

'صراط المستقیم' ۔ یہ کتاب شاہ صاحب نے مرتّب کی ، اس میں حضرت سید احمدؒ کے ملفوظات جمع ہیں ۔ دوسرے اور تیسرے باب میں وہ ملفوظات جو مولانا عبدالحئی نے سنے ، وہ بھی اس میں شامل کر لئے گئے ہیں ۔ ایک مقدمہ ، چار ابواب اور ایک خاتمے میں وہ سب بحثیں ہیں جو اس دور میں مابہ النزاع تھیں یا جن کا شدید رواج تھا ۔
بابِ اول میں وجوہِ تمایز مابین طریق نبوت و طریق ولایت ، اس میں چند فصول ہیں ۔

باب دوم ۔ طریق اجتناب از بدعات و طریق ادائے طاعت ۔ (بدعتوں کے مختلف رنگ جو غیر اقوام سے اختلاط کی وجہ سے پیدا ہوئے) ۔

باب سوم ۔ طریقت کے مختلف مسالک اور ان میں ترجیح و فضلیت کے وجوہ ۔

باب چہارم ۔ در بیانِ طریقِ سلوکِ راہ نبوت ۔

خالص دینی عقیدوں کے لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت ظاہر ہے مگر مسلمانانِ ہند کی اجتماعی معاشرتی تاریخ کے لحاظ سے اس کی افادیت اور بھی زیادہ ہے ۔ خصوصاً وہ باب جو بدعت سے متعلق ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ہندوؤں سے میل جول اور دوسرے سیاسی و معاشرتی عوامل کی وجہ سے مسلمانوں کے کلچر میں کیا کیا نئے رجحانات پیدا ہوئے ۔ تصوّف کے پردے میں کیا کیا طریقے داخل ہوئے ۔ ہندوؤں کے کون کون سے طریقے مسلمانوں نے قبول کر لئے اور دورِ مغلیہ میں شیعہ امراء اور علماء کے زیر اثر کیا کیا خیالات مقبولِ عوام ہوگئے ۔ حضرت شہیدؒ نے ان سب کا رد کیا ہے ۔ شاہ صاحب نے حضرت سید احمدؒ کی طرح بیوگان کے نکاحِ ثانی پر خاص زور دیا ہے ۔ اور معلوم ہے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس نے سرحد کے افغانوں کو مضطرب کر دیا تھا مگر سید صاحب نے اس قرآنی حکم کو ترک نہ کیا ۔

'رسالہ ایضاح الحق الصریح' ۔ اس رسالے میں شاہ صاحب نے مولوی تفضل علی خان کے استفسار پر بدعت اور سنت کا فرق بتایا ہے ۔

شاہ صاحب کے نزدیک دین میں کسی نئی چیز کا پیدا کرنا بدعت ہے ۔ اسی طرح یہ بھی بدعت ہے کہ شریعت میں جو چیزیں موجود ہیں ان میں اپنی رائے یا خواہشِ نفس یا اجتہادِ غلط کی بنا پر کمی یا بیشی یا افراط و تفریط ہو ۔ شاہ صاحب نے اس سلسلے میں امورِ دینی اور غیر دینی کا فرق ظاہر کیا ہے اور لکھا ہے کہ علوم کی وسعت ، ایجاداتِ مختلفہ اور زندگی کے وہ نئے شئون بدعت میں داخل نہیں جو علم یا مدافعت اسلام یا عقلِ انسانی کے انکشافات فائقہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اسی طرح وہ اشغالِ صوفیہ بھی بدعت نہیں جو کتاب و سنت کے خلاف نہیں ۔

بہرحال امورِ معاش کے سلسلے میں نئی باتیں ، دفاعِ ملک کے لئے نئے نئے آلات ، علومِ نافعہ انسانی کی اشاعت اور دوسرے نئے نئے علوم و فنون جو تمدنِ انسانی کی جائز ضرورتوں کے تحت پیدا ہوئے ہیں ، بدعت نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ امور دینی نہیں ، امورِ معاش و تمدن ہیں ۔

دراصل اس دور میں بدعت کے خلاف شدید ردِ عمل کی وجہیں دو تھیں: اول یہ کہ مسلمان ان غیر اسلامی رسموں میں پھنس گئے جنہیں شارعؑ نے حکمتِ تمدنی و روحانی کے تحت منع کیا تھا ۔ دوم وہ ان عادتوں کا شکار بن گئے تھے جو بدنی ضعف ، لہو و لعب ، سخت کوش زندگی سے دوری ، تن آسانی اور اسلامی روحِ جہاد کو کمزور کرنے کا باعث تھیں ۔ شاہ صاحب اپنے بزرگوں کی پیروی میں ان رسموں کے استیصال کے لئے تازیست کوشاں رہے ۔

آئندہ چل کر حضرت سید احمدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ شہید کی تصانیف کے خلاف ایک طوفان اٹھا اور یہ لوگ وہابی کہلائے (اور کہا گیا کہ یہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے خیالات کے لوگ ہیں اور ان پر طرح طرح کے الزام لگے) ۔ مگر یہ بحث اس کے بعد کے باب میں آئے گی جس میں بتایا جائے گا کہ وہابیوں کے خلاف منظم محاذ کلیۃً نہ سہی ، ایک حد تک ضرور ، سیاسی سازشوں کا نتیجہ تھا ۔ اس کو انگریزوں نے بھی ہوا دی کیونکہ انگریزوں کی نظر میں وہابی سلطنت انگلشیہ کے خلاف جہاد کو فرض سمجھتے تھے ۔ چنانچہ انگریزوں نے ان کے خلاف مقدمے قائم کیے اور شدید سزائیں دیں ۔ تاہم عقائد کا اختلاف بھی واضح ہے ۔

۱۸۵۷ء تک کے دوسرے علماء

ادھر خاندانِ شاہ ولی اللہ کے افراد سلسلۂ تعلیم و تعلم ، رشد و ہدایت اور دعوت و جہاد میں مصروف تھے ۔ ان کے متوازی بہت سے اور ہم عصر علماء بھی نظر آتے ہیں جن میں سے کچھ تو انہیں کے سلسلے کے فیض یافتہ تھے ، کچھ ان سے الگ اور کچھ ان کے بالمقابل ۔ مگر موضوعات وہی تھے جن کا ذکر آ چکا ہے اور مراکز بھی وہی جن کا بیان ہو چکا ہے ۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تصانیف کی زبان عربی سے فارسی اور پھر آہستہ آہستہ اردو ہوتی جا رہی ہے ـــــ لیکن ۱۸۵۷ء تک سکہ فارسی ہی کا چل رہا ہے ۔

اس زمانے میں شاہ ولی اللہ کے علاوہ قابلِ ذکر علماء ، جو فارسی میں صاحبِ تصنیف ہیں ، یہ ہیں :

۱۔ شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ، متوفی ۱۷۰۲ء/۱۱۱۴ھ ۔

۲۔ شاہ خوب اللہ آبادیؒ ، م ۱۷۳۱ء/۱۱۴۴ھ ۔

۳- محمد علی صدر پوری ، م ۱۸۷۲ء/۱۲۸۹ھ -

۴- مرتضیٰ زبیدی ، م ۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ -

۵- علامہ تفضل حسین کاشمیری ، م ۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ -

۶- قاضی ثناء اللہ پانی پتی ، م ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ -

۷- ملا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی ، م ۱۸۱۹ء/۱۲۳۱ھ -

۸- مجتہد علامہ دلدار علی لکھنوی ، م ۱۸۲۰ء/۱۲۳۵ھ -

۹- سخاوت علی جونپوری ، م ۱۸۵۸ء/۱۲۷۴ھ -

۱۰- حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ، م ۱۸۹۹ء/۱۳۱۷ھ -

۱۱- سلامت اللہ بدایونی ، م ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ -

۱۲- فضل حق خیرآبادی -

ان میں سے شاہ کلیم اللہؒ دہلوی اور شاہ خوب اللہ آبادیؒ کا ذکر تصوف کے باب میں آئے گا - اسی طرح مظہر جان جاناںؒ کا تذکرہ بھی اسی جگہ ہوگا -

مولوی محمد علی صدر پوری

صدر پور پرگنہ ملیح آباد کے رہنے والے تھے - انیسویں صدی عیسوی/تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ ثانی میں پیدا ہوئے - مرزا حسن علی محدث لکھنوی شافعی المذہب سے تعلیم حاصل کی - ۱۸۴۰ء-۱۸۴۱ء/۱۲۵۶ھ میں ٹونک تشریف لے گئے اور نواب وزیر محمد خان کے متوسلین میں شامل ہوگئے - ۱۸۷۲ء-۷۳/۱۲۸۹ھ میں انتقال ہوا - ردّ بدعت اور اشاعتِ سنت میں منہمک رہے - ان کی اکثر تصنیفات مواعظ وغیرہ سے متعلق ہیں اور بیشتر فارسی میں ہیں - شاعر بھی تھے - ان کی کتابوں کی فہرست رحمان علی نے 'تذکرہ علمائے ہند' میں دی ہے - 'ہدیۃ الاخیار' ، 'وقائع احمد' اور 'ترجمہ حقیقۃ الاسلام' خاصی شہرت رکھتی ہیں -

مرتضیٰ زبیدی

قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے - جامعِ علومِ معقول و منقول تھے - ابتدائے عمر میں حرمین شریفین چلے گئے - عمر کا بیشتر حصہ زبید میں گذارا اس لئے زبیدی کہلاتے ہیں -

۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ میں فوت ہوئے ۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے ۔ اصولاً یہ عربی کے مصنف ہیں مگر چونکہ ان کی تصانیف سے ہندوستان کے فارسی نویس مصنفوں نے بڑا اثر قبول کیا اس لیے ان کا نام یہاں درج کیا گیا ہے ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۔ متوفی ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ

قاضی پانی پتی نے مرزا مظہر جان جاناں سے فیض حاصل کیا تھا ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور انہیں ''بیہقیٔ وقت'' کہا کرتے تھے ۔ تفسیر ، فقہ ، کلام اور تصوّف میں بڑا مرتبہ حاصل کیا ۔ ان کی 'تفسیرِ مظہری' بہت شہرت رکھتی ہے ۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں :

(۱) 'سیف المسلول در رد شیعہ' ۔ (۲) 'ارشاد الطالبین' ۔ (۳) 'مالابدّ منہ' ۔ (۴) 'تذکرۃ الموتی والقبور' ۔ (۵) 'تذکرۃ المعاد' ۔ (۶) 'حقوق الاسلام یا حقیقۃ الاسلام' ۔ (۷) 'رسالۂ حرمت و اِباحتِ سود' ۔ (۸) 'رسالۂ حرمتِ متعہ' ۔ (۹) 'رسالۂ شہاب ثاقب وغیرہ' ۔

مُلا عبدالعلی بحرالعلوم لکھنوی

بحرالعلوم ، مُلا نظام الدین سہالوی اور مُلا قطب الدین شہید سہالوی کے پوتے تھے ۔ سترہ سال کی عمر میں علومِ مروجہ کی تحصیل ختم کر لی تھی ۔ بعد میں بعض وجوہ سے شاہجہان پور ، رام پور ، بوہار اور کرناٹک میں رہ کر درس و تدریس میں مصروف رہے ۔ بحرالعلوم کا خطاب انہیں نواب محمد علی خان رئیس کرناٹک نے دیا تھا ۔ تراسی (۸۳) سال کی عمر میں (۱۸۱۹ء-۲۰ یا ۱۸۲۵ء میں) میں انتقال ہوا ۔ معقولات میں ان کی بہت سی تصانیف مشہور ہیں ۔ مثلاً 'حاشیہ میر زاہد' ، 'شرح مسلم' ، 'شرح مسلم الثبوت' ، 'حاشیہ بر شرح صدرائے شیرازی' وغیرہ ۔ فقہ میں 'ارکان اربعہ' (اصول فقہ) اور 'شرح فقہ اکبر' اور دوسرے دینی موضوعات پر رسالہ در احوالِ قیامت ، رسالۂ توحید وغیرہ ۔ مولانا روم کی مثنوی کی شرح بھی لکھی جو بے حد معروف ہے ۔

مجتہد علامہ دلدار علی لکھنوی

علامہ ۱۷۵۳ء/۱۱۶۶ھ میں نصیر آباد میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد کا اسم گرامی محمد معین النقوی تھا ۔ معقولات کی تحصیل سید غلام حسین دکنی ، مولوی حیدر علی سندیلوی

وغیرہ سے ہوئی ۔ باقی علوم کربلائے معلیٰ اور مشہد میں حاصل کرکے ہندوستان آئے اور درس و تدریس میں منہمک ہوگئے اور بعد میں مرتبۂ اجتہاد پایا ۔ معقولات میں ان کی تصنیف 'حاشیہ بر شرح ہدایۃ الحکمۃ' بہت مشہور ہے ۔ فقہ ، اصول فقہ اور دوسرے دینی موضوعات پر 'اساس الاصول' ، 'عمادالاسلام' (پانچ جلدوں میں) ، 'احیاءالسنۃ' ، 'رسالہ جمعہ' وغیرہ معروف ہیں ۔ ۱۸۲۰ء میں انتقال ہوا اور لکھنؤ میں دفن ہوئے ۔ ان کے فرزند سید محمد مجتہد العصر نے اس سلسلے کو جاری رکھا ۔ وہ بھی صاحبِ تصنیف تھے اور انہوں نے بھی شیعہ عقائد کی اشاعت میں حصہ لیا (تفصیل دیکھیے شیخ محمد اکرام : 'رودِ کوثر ، ص ۶۳۲ و بعد) ۔ شیعہ تصانیف کے متعلق مشہور کتاب 'الذریعہ' میں علامہ موصوف کے نہایت ہی مجمل حالات کے ساتھ آپ کی تصنیف 'اساس الاصول' کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو مطبعِ محمدیہ میں ۱۵ صفر ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) کو چھپی تھی ۔ یہ قواعدِ شرع اور ان کی اساس کے متعلق ہے اور مقدمہ ، چار مقاصد اور خاتمے پر مشتمل ہے ۔ آپ نے اس کتاب کا موضوع ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"علم الاصول والاحکام لحل معاقدالحلال و الحرام ۔"

اس کتاب میں آپ نے اپنے دلائل کی بنیاد کتاب ، اخبار ، اجماع ، عقل اور اجتہاد پر رکھی ہے ۔ مقدمے میں اُن اعتراضات کا جواب ہے جو استر آبادی کی تصنیف 'فوائدالمدنیہ' میں بیان ہوئے ہیں ۔ کتاب عربی میں ہے ۔

مولانا سلام اللہ محدث رام پوری

سلام اللہ محدث ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد سے تھے ۔ اپنے زمانے کے بڑے فقیہ ، محدث اور مفسر تھے ۔ ان کی تصانیف 'کمالین شرحِ جلالین' ، 'محلی شرح مؤطا' ، 'ترجمہ فارسی صحیح بخاری' ، 'ترجمہ فارسی شمائل ترمذی' وغیرہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔ انتقال ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ یا ۱۸-۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ میں ہوا ۔

مذہبِ شیعہ کی فکری تنظیمِ نو[1]

اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ برِ صغیر میں مسلمانوں کی فکری تنظیمِ نو

---

(۱) یہ شذرہ ادارے کی طرف سے شامل کیا جا رہا ہے ۔ اس کی تیاری میں نزھۃ الخواطر ، تذکرۂ علمائے ہند ، الذریعہ اور نجوم السماء سے استفادہ کیا گیا ہے ۔

کا زمانہ ہے ۔ ایک طرف اگر خاندان ولی اللٰہی اور دوسرے علماء حنفی مسلمانوں کی طرف سے اس فریضے کو انجام دیتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف خاندانِ اجتہاد[1] (یعنی مولانا دلدار علی اور ان کے فرزندوں کے ساتھ ان کے شاگرد) اور دیگر شیعہ علماء ، شیعہ افکار کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ یہ صدیاں مسلمانوں میں فی الواقعہ دینی فکر کی نہضت کا زمانہ ہیں ۔ خاندان ولی اللٰہی اور دوسرے حنفی علماء نے جو کام کیا صفحاتِ بالا میں اس کا خاصی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے ۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر شیعہ مذہب کی جدید فکری تنظیم کے متعلق بھی اجمالاً کچھ ذکر کر دیا جائے ۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے پیشتر کوئی کام نہیں ہوا ۔ شیعہ حضرات نے تو اس طرف قطعاً کوئی توجہ ہی نہیں دی جو کچھ مواد ملتا ہے ، اس کے لیے ہم حنفی مصنفین کے شکر گذار ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی کتب میں خاصے مثبت انداز کے ساتھ شیعہ علماءِ ہند کا بھی ذکر کر دیا ہے ۔

جنوبی ہند میں شیعہ ریاستیں پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں قائم تھیں تا آنکہ سترھویں صدی عیسوی میں انہیں اورنگ زیب عالمگیر نے ختم کر دیا ۔ لیکن اس طرف شیعہ افکار کو از سرِ نو مرتّب کرنے کی کوئی خاص کوشش شاید نہیں ہوئی ۔ مگر شمالی ہند میں جب مغلیہ سلطنت منتشر ہونے لگی اور اودھ کی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو یہ کام بڑی شدّ و مد کے ساتھ کیا گیا ۔ جیسا کہ سطورِ بالا میں ہم نے سیّد دلدار علی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے ، انہوں نے ایران و عراق سے تکمیلِ تعلیم کے بعد یہاں واپسی پر تصنیف و تالیف کا ایسا سلسلہ جاری کیا جو ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں اور شاگردوں نے برابر جاری رکھا ۔ ان کے بیٹوں میں سلطان العلماء مجتہد العصر سید محمد (م ۱۸۶۷ء)، اور سید علی (م ۱۸۴۴ء) ، اور شاگردوں میں مولوی یاد علی (م ۱۸۳۷ء) ممتاز ہیں ۔

ان تمام شیعہ علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ شیعہ عقاید کی اساس قرآن و حدیث اور عقل و اجتہاد کی روشنی میں پیش کی ۔ اس ضمن میں مولانا دلدار علی کی تصنیف 'اساس الاصول'

---

(۱) مولانا دلدار علی اور ان کی اولاد کو خاندان اجتہاد کہا جاتا ہے ۔

کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے ۔ ان کی دوسری تصنیف 'عماد الاسلام' میں بھی یہی مقصد سامنے رکھا گیا ہے ۔ اس کی پانچ جلدیں ہیں جن میں علی الترتیب توحید ، عدل ، نبوت ، امامت اور معاد کے مسایل پر بحث کی گئی ہے ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مولانا شیعہ عقاید کی فکری اساس مستحکم کرنا چاہتے تھے ۔ آپ کے فرزند سلطان العلماء نے اس فکری اساس کو اور بھی مضبوط کرنے کے لیے 'عجالۂ نافعہ' تصنیف کی جو علمِ کلام اور اصولِ دین سے تعلق رکھتی ہے ۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز سلطان العلماء کے معاصر تھے ۔ انہوں نے 'تحفۂ اثنا عشریہ' لکھی تو اس کے جواب میں منصبِ امامت کے متعلق جنابِ سلطان العلماء نے بھی کتابیں تصنیف کیں ۔ اس ضمن میں 'صمصامِ قاطع' اور 'طعن الرماح' کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ پھر خاندانِ ولی اللّٰہی نے جہاں قرآنی مطالب کو عوام تک پہنچانے کے لیے فارسی اور اردو میں اس کی تفسیر کی ، جس کا ذکر اپنے مقام پر ہو چکا ہے ، غفران[1] مآب یعنی مولانا دلدار علی کے خاندان نے بھی یہی کام کیا ۔ آپ کے چچیرے بھائی اور شاگرد مولوی یاد علی نے فارسی زبان میں کلامِ مجید کی تفسیر لکھی اور آپ کے فرزند سید علی نے قرآنِ مجید کی تفسیر اردو زبان میں بیان کی اور یہ سب کچھ شیعہ عقاید کی روشنی میں ہوا ۔ معلوم ہوتا ہے خاندانِ ولی اللّٰہی اور خاندانِ اجتہاد دونوں دینی لحاظ سے ایک ہی نہج پر کام کرکے اپنے اپنے عقاید کی تدوینِ نو اور اشاعت میں مصروف تھے ۔

فکری لحاظ سے اپنے فرقہ کو توانا بنانے کے ساتھ ساتھ ان حضرات نے اجتماعی ، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے بھی اس کو مضبوط بنانے کے لئے سعیٔ بلیغ کی ۔ نوابانِ اودھ شاہانِ اودھ بن گئے ۔ ان علماء نے دیکھا کہ اب ایک شیعہ ریاست اور سلطنت قائم ہو چکی ہے ، لٰہذا یہاں ایک مربوط اور منظم شیعہ معاشرہ وجود میں لایا جا سکتا ہے ۔ پختگی اور تبدیلیٔ عقاید کے لئے مختلف تدابیر تو ہو ہی رہی تھیں ، معاشرے میں ربط اور نظم قائم کرنے کے لیے بھی باقاعدہ کوشش کی گئی ۔ اجتماعی زندگی میں تقویت پیدا کرنے کے لئے مولانا دلدار علی نے نماز باجماعت اور جمعہ کا آغاز کیا جس میں نواب اودھ بھی شامل ہوا کرتے تھے ۔ اس غرض کے لئے جماعت اور جمعہ کے اثبات کے لیے ایک رسالہ قلمبند

---

(۱) وفات کے بعد مولانا دلدار علی کو غفران مآب کے لقب سے یاد کیا جانے لگا ۔

کیا - اس نئی ریاست اور نئے معاشرے کی مالی حالت سدھارنے کے لئے آپ نے خراج اور املاک و اراضی کے مسایل کے متعلق ایک 'رسالہ ارضین' لکھا اور مجلسی کی 'حدیقة المتقین' کے باب الزکواة کی شرح تحریر کی - بعد میں آپ کے فرزند مجتہد العصر سید محمد علی نے بھی محمد علی شاہ نصیر الملت کے نام پر 'فوائد النصیریہ' لکھ کر زکواة اور خمس وغیرہ کے مسایل بیان کیے - ان مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ زکواہ اہتمام سے جمع کی جاتی تھی حتیٰ کہ سلیمن[1] لکھتا ہے کہ جب واجد علی شاہ کا سرکاری خزانہ خالی ہوگیا تو وہ زکواہ اپنی جمع شدہ پونجی (Reserve) سے دیا کرتا تھا - زکواة سے جمع کی ہوئی رقم مستحق لوگوں میں مجتہد العصر کے سامنے تقسیم کی جاتی تھی - 'رسالہ ارضین' میں مولانا دلدار علی نے ان معاملات پر بھی بحث کی جو غیر مسلموں کے ساتھ پیش آتے تھے - جدید ضروریات کے زیرِ نظر اسی طرح اصولِ فقہ میں مجتہد العصر نے بھی 'احیاء الاجتہاد' لکھی - اس طرح نظر آتا ہے کہ خاندانِ اجتہاد نے شیعہ فکر میں خاصی حرکت پیدا کر دی تھی اور جہاں معاشرے میں نئی مذہبی زندگی کا آغاز ہوا وہاں سماجی اور معاشی مسایل کو حل کرنے کی کوشش بھی عمل میں لائی گئی - ۱۸۵۷ء میں جب جنگِ آزادی شروع ہوئی تو جہاد کے حق میں فتویٰ نہ دے کر مجتہد العصر نے اس جدید معاشرے کو بچانا چاہا مگر زمانے کے حالات کا دھارا ایسا تیز تھا کہ ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا لے گیا -

خاندانِ اجتہاد کی اس فکری تنظیمِ نو میں ایک خلا ضرور نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تصوف کی مخالفت کی گئی - اسی بات کا نتیجہ تھا کہ بہت سے شیعہ افراد ، جن میں میرزا غالب جیسے اکابر بھی شامل تھے ، اپنی روحانی تشنگی بجھانے کے لیے بالخصوص چشتی بزرگوں کے توسّل کے جویا ہوا کرتے تھے -

ب - تصوّف

ہندوستان میں تصوّف کے سارے سلسلے کم و بیش موجود رہے - خصوصاً چشتیہ ، نقشبندیہ اور قادریہ - عہدِ عالمگیری کے بعد ان سب سلسلوں کو پھر فروغ ہوا اور چشتی ، نقشبندی مسلک خاص طور سے بہت پھیلے - قادری مسلک بھی بہرحال مقبول رہا -

---

(۱) Sleeman, W. H., Rambles & Recollections, I, p. 311

اورنگ زیب کے عہد میں مجددیہ نقشبندیہ کے ممتاز بزرگ خواجہ معصوم سرہندی تھے۔ ان کے بعد شیخ عبدالاحد سرہندی (معروف بہ شاہ گل و وحدت) ہوئے۔ ان کے مرید حاجی محمد افضل اور شاہ گلشن دہلوی ۔ یہ سلسلہ مؤخر الذکر کے خاندان میں خاص طور سے چلتا رہا ۔ ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد کو ان میں امتیاز حاصل ہے ۔ میرزا مظہر جانجاناں اور ان کے مرید شاہ غلام علی اور ان کے مرید شیخ خالد نے بہت ترقی دی ۔ شاہ احمد سعید دہلوی نے بھی سلسلۂ مجددیہ کے فروغ میں آخری دور میں حصہ لیا ۔

دوسری طرف سلسلۂ چشتیہ کو شاہ کلیم اللہ دہلوی (م ۱۷۲۹ء/۱۱۴۲ھ) کے ذریعے پھر اثر و رسوخ حاصل ہوا ۔ انہوں نے دہلی میں رہ کر دور دور تک دکن اور پنجاب اور دوسرے علاقوں میں مراکز قائم کئے ۔

اس زمانے میں سلسلۂ صابریہ کا ایک اہم مرکز امروہہ تھا اور وہاں شاہ عضد الدین (م ۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ) ، حضرت شاہ عبدالہادی (م ۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ) اور شاہ عبدالباری (م ۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ) نے اس سلسلے کو بہت فروغ دیا ۔ شاہ عبدالباری کے خلیفہ سید عبدالرحیم (۱۸۳۰ء/۱۲۴۶ھ) تھے ۔ یہ سید احمد شہید کے ساتھ شریک رہے اور بالا کوٹ میں شہید ہوئے ۔ اس سلسلے کے دوسرے بڑے بزرگ میاں نور محمد جھنجھانوی (م ۱۸۴۳ء/ ۱۲۵۹ھ) تھے اور ان کے مرید حاجی امداد اللہ کے مرید رشید احمد گنگوہی (م ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ) تھے ۔ اس جماعت کے بزرگوں نے مدرسۂ دیوبند قائم کیا ۔ سلسلۂ قادریہ ، جس کے اہم بزرگ دور عالمگیری میں حضرت میاں میر تھے ، مختلف مقامات پر خصوصاً بٹالہ ، ملتان اور دکن میں چلتا رہا ۔

تصوف کے یہ سب سلسلے کبھی تو متفق اور کبھی الگ ہو کر چلتے رہے اور اختلاف کا باعث ہوتے رہے ۔ خصوصاً شریعت و طریقت کے بارے میں سوچ کے انداز مختلف ہو جاتے رہے ۔ ان اختلافات کے اندر سے ، بعض بد عقیدہ صوفی بھی ابھرتے رہے جن کے خیالات اور طریقے مخالفِ شرع ہوتے تھے ۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ، جو اس دور کے عظیم مفکّر اور امامِ وقت تھے اور ان کی نظر ملت کے ارتباط اور استحکام پر رہتی تھی ، اپنی تصانیفِ تصوف میں مفاہمت و تطبیق کے راستے تجویز کئے ہیں ۔ خود ان کا اپنا تعلق ایک سے زیادہ سلسلوں سے تھا جس کی

تفصیل انہوں نے اپنی کتاب 'انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ' میں پیش کی ہے ۔ اسی طرح کا مفاہمتی رویہ شاہ کلیم اللہؒ صاحب نے اختیار کیا جنہوں نے سماع میں چشتیہ مسلک کا احترام کرتے ہوئے اپنے مریدوں کو دوسروں کے مسلک کا احترام کرنے کی تلقین کی ۔

صاحبِ تصانیف صوفی

۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی :

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے یہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مختصر تذکرہ اس نقطۂ نظر سے کر دیا جائے کہ انہوں نے تصوف کے سب سلسلوں کو جمع کرنے کی کوشش کی اور تصوف کے موضوع پر حکیمانہ کتابیں لکھیں ۔ جدید دور کے مصنفوں نے شاہ ولی اللہ کے صوفی ہونے سے انکار کیا ہے مگر ان کی متعدد تصانیف اس خیال کی تردید کرتی ہیں ۔ اس کے علاوہ 'روضۃ القیومیہ' میں ان کا ذکر مشائخ میں آیا ہے ۔

بہرحال ان کی کتابوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ انہوں نے اپنے مکاتیب میں بھی سب مسائلِ صوفیانہ پر بحث کی ہے اور اپنی روحانی واردات کا بتفصیل تذکرہ کیا ہے ۔ تصوّف کے موضوع پر ان کی کتابیں عربی میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی ۔ رسالہ 'فیصلہ وحدت الوجود و الشہود'، اور 'القول الجمیل' وغیرہ عربی میں ہیں ۔ اور 'سطعات' 'ہمعات' وغیرہ فارسی میں ۔ ان فارسی کتابوں کا تجزیہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے ۔ ان کے مطالب کو یہاں دہرانا تکرارِ لاحاصل ہوگی ۔ صرف بطور خلاصہ شاہ صاحب کے صوفیانہ کارنامے کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔

صوفیانہ فکر کے لحاظ سے شاہ صاحب کی کتابیں، جن اہم نکات پر زور دیتی ہیں اور جس خاص اسلوبِ خیال کی نمائندگی کرتی ہیں ، ان کے خاص اصول یہاں بیان کئے جا رہے ہیں :

اول : شاہ ولی اللہؒ اپنی دوسری کتابوں کی طرح کتبِ تصوف میں بھی حکیمانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کے دور تک ہندوستان میں ایک علمی زبان پختہ ہو چکی تھی جس کی اصطلاح اور محاورے سے کسی کو بھی مفر نہ تھا ۔ جو شخص بھی اپنی تصنیف کو علمی مرتبہ دلوانا چاہتا تھا اسے منطق اور حکمت کا اسلوب اختیار کرنا پڑتا تھا ۔ چنانچہ

شاہ صاحب کی یہ تصوف کی کتابیں بھی ہیں اور انہیں بجا طور سے حکمت اعلیٰ کی کتابیں بھی قرار دیا جا سکتا ہے ۔ 'سطعات' اور 'ہمعات' کے انداز بیان اور مطالب پر غور کیجئے ، انہیں تاریخ حکمت میں بلند مقام مل سکتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملّا صدرا کی حکمت کے ذریعے اشراقی خیالات ہندوستان میں کافی پھیل چکے تھے اور جزو زبان ہو چکے تھے ۔ شاہ صاحب نے شیخ اکبر اور شیخ الاشراق کے خیالات کو اچھی طرح سمجھ کر ، ان کے ان حصوں کا جو وحدت وجود یا مسئلہ توحید کو مبہم یا گمراہ کن بنانے والے تھے ، ناقدانہ تجزیہ کر کے وجود حقیقی اور عالم کے بارے میں اپنا تصور پیش کیا ہے جو قرآنی تصور کے مطابق ہے ۔

دوم : ابن العربیؒ کی وحدت وجود اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی وحدت شہود کے مابین تطبیق دینے کی کوشش کی ۔ اس کی تائید ان کے مکتوب مدنی سے ہوتی ہے ۔

سوم : طریقت کے مختلف سلسلوں کے مابین آشتی و رواداری کی فضا پیدا کی ۔ خود ان کا اپنا عمل یہ تھا کہ چاروں اہم سلسلہ ہائے طریقت سے عقیدت رکھتے تھے اور بیعت میں چاروں مشائخ کے نام شامل کرتے تھے ۔

چہارم : تصوّف ، زہد و ترک دنیا نہیں ۔ اسلام کی مجموعی عملی زندگی کا ایک داخلی حصہ ہے جس کے بغیر ایک مسلمان کی زندگی مکمل نہیں ہو سکتی ۔ یا یوں کہیے کہ یہ کل زندگی نہیں ہو سکتی ۔ اس زندگی کا ایک نقشہ شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں پیش کیا ہے جس میں فنون سپہ گری سے لے کر عبادت تک تمام اشغال حیات کو ایک سلسلۂ عمل کا دائرہ قرار دیا ہے ۔

شاہ صاحب کی جملہ تصانیف (خصوصاً فارسی تصانیف میں جن کی تفصیل پہلے آ چکی ہے ۔ مثلاً 'انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ') میں بس یہی مرکزی عقائد پھیلے ہوئے ہیں ۔

تصوف و حکمت

'سطعات' : فارسی کا یہ رسالہ (جو شاہ ولی اللہ اکادمی سندھ نے شائع کر دیا ہے)

"طلسم الٰہی" کے بیان میں ہے اور طلسمِ الٰہی اس رابطے کا نام ہے جو مجرد محض اور عالم شہادت کے مابین قائم ہے، جس کا دوسرا نام حکمتِ الٰہیہ ہے۔

یہ رسالہ ۴۹ سطعات (یا فصول) پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کے مرکزی نتائج دو ہیں۔ اول یہ کہ ہر شے کی تنظیم مرکز کے سوا متصور نہیں ہو سکتی، اس لئے لازم آیا کہ مادی اور غیر مادی اشیاء دونوں کا بھی ایک مرکز مشترک ہو ـــ اس کا نام وجود ہے اور اس لحاظ سے وحدتِ وجود ایک عقیدۂ راسخہ ہے۔ دوم یہ کہ انبیا علیہم السلام، معلمین حکما ہیں۔ جو حکم نبی کا بہترین شارح ہو اسے صدیق کہتے ہیں۔ تعلیمِ انبیا میں مرکزی نقطہ حکمتِ الٰہیہ ہے۔ باقی سب حکمتیں ثانوی ہیں، البتہ صدیقین کے علم کو حکمت کہیں گے۔ خلاصہ یہ نکلا ہے کہ انسانی معاشرے میں نظام قائم کرنے کا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صدیقین سے حکمت اکتساب کرتے ہیں اور یہ اکتساب کرنے والے شہداء کہلاتے ہیں اور اس علم و حکمت کو الکتاب کہا جاتا ہے۔

'سطعات' کا موضوع یہ ہے کہ تجلیؔ و وجود کیا شے ہے، اور یہ بھی کہ سالک سلوک سے "موطن امام نوع انسانی" سے کس طرح اتصال پا سکتا ہے۔

رسالے میں قرآن کی آیات اور احادیث کے حوالے سے حکمت الٰہی کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کی عبارت بڑی دقیق اور عالمانہ و حکیمانہ ہے اور حکمتِ اسلامی کی تعبیرِ نو بذریعہ اصطلاح نو ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اس کی شرح لکھ دی ہے اور جناب غلام مصطفیٰ القاسمی نے عمدہ حواشی میں اسے مرتب کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حکمت ولی اللٰہی کی روشنی میں اس کی علمی مگر نسبتاً آسان تشریح کی ضرورت ہے۔

'انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ' : یہ فارسی رسالہ اولیاء اللہ کے مختلف سلسلوں کے حالات پر مشتمل ہے اور جابجا اپنی تنقیدی یادداشتیں بھی ہیں۔

'الطاف القدس' : اس میں شاہ صاحب نے اپنے مکاشفات (ذاتی روحانی تجربے) قلمبند کئے ہیں۔

'ہمعات' : یہ فارسی کتاب بھی شاہ صاحب کی اہم کتابوں میں سے ہے۔ اصل کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے (سندھ ساگر اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے)۔ اس کتاب

میں تصوف کی حقیقت اور معاشرۂ اسلامی میں اس کے اثرات ، اس کے صالح و غیر صالح حصے کی بحث ، اس میں غلطیوں اور کمزوریوں کے وجوہ ، اس کے مختلف طبقات سے بحث ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''تصوف خود عہدِ رسالت و صحابہ میں موجود تھا ، گو اس وقت اس کا یہ نام نہ تھا''۔ اسلام کی دو حیثیتیں ہیں : ایک ظاہری ، دوسری باطنی۔ ظاہری کا تعلق اعمال و احکام سے ہے اور باطنی کا تزکیۂ نفوس و تصفیۂ قلوب سے۔ اس باطنی صفت کا نام ''احسان'' ہے۔ یعنی حضورِ قلب سے خدا کی عبادت کرنے والا گویا خدا کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے بعد تصوف کی تاریخ پر گفتگو ہے اور مختلف مدارجِ ارتقا کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح تصوف ، تزکیۂ باطن کے ایک عمل سے منسلک ، اور منظم طریقہ بنتا گیا اور شریعت سے جدا ہوتے ہوتے بعض اوقات اس کے خلاف ہوتا گیا۔ مگر اکابر صوفیہ شریعت کے اتباع کی ہمیشہ تلقین کرتے رہے اور عامل رہے۔ شاہ صاحب نے سلوک کی بحث میں لکھا ہے کہ سالک سب سے پہلے اپنے عقائد درست کرے اور اسلام کے احکام کا پابند ہو۔ یہ اطاعت ہے ، پھر اوراد و وظائف اور ذکر کے آداب و شرائط ، مراقبے کے مختلف طریقوں کا تذکرہ ہے اور سلوک کا مقصد قرب الی اللہ بتایا ہے۔

سلوک میں ہر انسان کی فطری استعداد کی اہمیت بھی جتلائی ہے ۔۔۔ یہ حصہ نفسیات کے نقطۂ نظر سے مفید ہے۔ کرامات کا تجزیہ بھی کیا ہے (تفصیل کے لئے اردو ترجمہ از محمد سرور دیباچہ)۔

ہمارے نقطۂ نظر سے قابل ذکر امر یہ ہے کہ تصوف کے مختلف خانوادوں کے تذکرے کے بعد ، شاہ صاحب نے اسے خدا کا احسان قرار دیا ہے کہ :

> ''با جمیع خانوادہ ہائے گزشتہ با اکثر آن ہا بحسب ظاہروے را ارتباط واقع شدہ چنانکہ فی الجملہ بیان آن در 'انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ' کردہ شد''۔ (ہمعات ، طبع عبیداللہ سندھی ، ص ۱۶)۔

جیسا کہ سابقاً بیان ہوا ، شاہ صاحب نے اس کتاب کے ہمعہ ۱۸ میں نوع انسانی کے طبائع مختلفہ اور استعدادات مختلفہ کی بحث کی ہے۔ چونکہ جبلتوں اور نفسِ انسانی کے اندرونی نظام اور اس کے ظاہری آثار (Behaviour) کا مربوط علم دور جدید کا کارنامہ سمجھا جاتا

ہے ، یہاں اس بحث کو پھیلا کر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شاہ صاحب کو بجا طور سے اس علم کے پیشروؤں میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ افرادِ انسانی کو خدا تعالٰی نے مختلف قابلیتیں (استعدادات) عطا فرمائی ہیں اور ہر فرد اپنی اسی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کرتا ہے اور اپنی استعداد سے زیادہ کسب نہیں کر سکتا ۔ اس لئے جو کوئی اپنی استعداد کو پہچانے بغیر کوئی اکتساب کرنا چاہتا ہے تو اسے ناکامی ہوتی ہے ۔

انسان کو خدا تعالٰی نے دو قوتیں عطا فرمائی ہیں : ایک قوت ملکیہ اور دوسری قوت بہیمیہ ۔ پھر یہ ہے کہ انسان کو نفسِ ناطقہ عطا کیا گیا ہے ۔ اس کے دو رخ ہیں : ایک ملائکہ کی طرف اور دوسرا بہیمیت کی طرف ۔ شاہ صاحب کے نزدیک جملہ اخلاق و افعال انہیں دو قوتوں کی کمی یا بیشی ، شدت یا نرمی کے مطابق تشکیل پاتے ہیں ۔ ان دونوں قوتوں کی پیکار نفس انسانی میں جاری رہتی ہے اور بعض اوقات بے اعتدالی کی وجہ سے انسان سے حرکاتِ قبیحہ سرزد ہوتی ہیں ۔ شاہ صاحب نے ان بے اعتدالیوں کے روحانی علاج بتائے ہیں ۔ انسان کا اصلِ کمال ان دونوں قوتوں کی تعدیل پر منحصر ہے ۔ اس سلسلے میں قلب ، عقل اور جگر کی کارفرمائی ، جو طبع انسانی کی ساخت میں حصہ لیتی ہے ، زیر بحث آئی ہے ۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ شاہ صاحب اپنی بحث میں لاشعور کا (اس اصطلاح کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی اصطلاح ''بہیمیت'' کے ذریعے) تجزیاتی ذکر کرتے ہیں ۔ اور انسان کے باطن کے اس ''گہرے تاریک'' حصے کے اثرات کی حیثیت واضح کرتے ہیں ۔

اس رسالے میں ان کی اصطلاح ''مفہمیت'' بھی قابل توجہ ہے جو کامل انسانوں کے لئے استعمال ہوئی ہے جو انوارِ نبوت سے (جو ختم نبوت کے بعد بھی جزوی طور سے موجود رہتی ہے) مستفیض ہوتے ہیں ۔ یہ وہ حضرات ہیں جو دنیا کے ظاہری و باطنی نظام کو عدل و خیر کے ساتھ چلاتے رہتے ہیں ۔

شاہ صاحب کے فرزندان میں سے ہر ایک اسی طریق کار کا پابند رہا اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی تحریروں میں انہیں نکات اساسی کی شرح کی ہے ۔

حضرت شاہ اسمعیلؒ شہید کی کتاب 'عبقات' کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے ۔ اس کتاب پر شاہ ولی اللہ صاحب کے افکار کا پرتو سب سے زیادہ ہے ۔ علمی و فکری لحاظ سے (اور خاندانی روایت کے نقطہ نظر سے) شاہ اسمعیلؒ شہید کی عظیم کتاب 'عبقات' ہے ، جو اپنے جدِّ بزرگوار شاہ ولیؒ اللہ کی کتاب 'سطعات' وغیرہ کے مقصد و معانی کی تشریح کا پہلو لئے ہوئے ہے ۔ وہ 'عبقات' میں فرماتے ہیں کہ ''لمعات اور سطعات وغیرہ کتابوں کی خوشبو اس کی راہ سے پھیلائی گئی ہے ۔ میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ ان موتیوں (یعنی سطعات و لمعات) کے سلسلے میں اس کتاب کو بھی شمار کرنا چاہیے اور جس چیز کا مجھے حق نہیں ہے اس کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں ۔''

اس کتاب میں علوم کی ماہیت اور اقسام ، وجود ، تجلیؔ ، ایجاب و اختیار ، مراتبِ نفس وغیرہ پر حکیمانہ بحث ہے ۔

حکمتِ ولی اللّٰہی کے اسلوب کے مطابق ، اس کتاب میں بھی دین ، تصوف اور حکمت کا امتزاج ہے ۔ شاہ صاحب نے خود فرمایا ہے : ''ارباب کشف جن امور کو پانے میں کام یاب ہوئے ہیں اور دلیل و برہان والے جن نتیجوں تک پہنچے ہیں ان دونوں کے درمیان یہ رسالہ حلقۂ اتصال کا کام دے گا ۔'' خاتمہ میں لکھا ہے : ''شرعی علوم کی گہرائیوں میں جو اترنا چاہتا ہے اور الدرونی راز علوم سے واقف ہونا چاہتا ہے ، ان کے لئے ناگزیر ہے کہ تجلیات کا اور عالمِ مثال کا علم حاصل کرے ۔'' یہ کتاب قدرتی طور پر دقیق ہے اور شاہ صاحب کا ارادہ اس کی شرح لکھنے کا بھی تھا مگر جہاد و شہادت نے فرصت نہ دی ۔

اس خاندان کے خیالات کا عکس آگے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے توسط سے مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی پر پڑا اور مکتب دیوبند کے اکابر اکثر و بیشتر اسی طریق کار کے پابند رہے ۔

شاہ کلیم اللہؒ جہان آبادی

صاحبِ تصانیف اکابر صوفیہ میں سے شاہ کلیمؒ اللہ جہان آبادی (م ۱۷۲۹ء/۱۱۴۲ھ) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے ۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں :

(۱) 'قرآن القرآن' (عربی) (۲) 'عشرۂ کاملہ' (۳) سواء السبیل' (۴) 'کشکول کلیمی' (۵) 'مرقع' (۶) 'تسنیم' (۷) 'رسالہ تشریح الافلاک' (کی شرح فارسی میں) (۸) 'الہامات کلیمی' (۹) 'شرح القانون' (رسالہ در رد روافض) (۱۰) 'و رسالۂ علم منطق' (۱۱) 'مکتوبات' ۔

شاہ کلیم اللہ کی تصانیف سلسلۂ چشتیہ کے اشغال و عقائد کی تشریح و وضاحت کرتی ہیں ۔ ان کے افکار و عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(۱) ''فیض دینی و دنیوی بہ عالم رسانند و ہمہ حلاوت و عیش خود فدائے بندگان می باید کرد'' (مکتوبات) ۔

(۲) ''در اعلائے کلمۃ الحق می باشند و جان و مال خود صرف آن کار می کنید'' (مکتوبات) ۔

(۳) ''اے دوست دنیا جائے نفس پروری و تن آسانی نیست'' (مکتوبات) ۔

(۴) ''بر دل بندگان خدا محبت دنیا سرد گردانند'' (مکتوبات) ۔

شاہ کلیمؒ اللہ کی کتابوں میں با سعادت زندگی کے اصول ملتے ہیں ۔ ان میں ایک یہ ہے کہ ایصالِ خیر کو مقصود قرار دیا جائے ، ایک یہ ہے کہ ایصالِ خیر میں اخلاص اور نیک نیتی سے کام لیا جائے ۔ انہوں نے ایک نہایت قیمتی مشورہ یہ دیا کہ مسئلہ وحدت‌الوجود ہر کس و ناکس کے آگے نہ چھیڑا جائے ۔

چشتی مسلک میں وسعتِ مشرب کی اہمیت معلوم ہے ۔ اس کے تحت انہوں نے فرمایا کہ ہندو مسلمان ہر ایک سے عمدہ تعلقات رکھنے چاہییں تاکہ غیر مسلم تعلیمات اسلام سے متاثر ہوں ۔

شاہ کلیم اللہ مریدوں میں ادب و احترام کا جذبہ پیدا کرنے پر بڑا اصرار کرتے ہیں ۔ وہ احیائے سنت اور رد بدعات کے لئے ہمیشہ سرگرم رہے ۔ ان کی تلقین یہ تھی کہ تبلیغ کی زبان وہ ہونی چاہیے جو مخاطبوں کی زبان ہو ۔

ان کی تصانیف میں نظامِ خلافت ، طریقۂ بیعت اور اتباع شریعت کی تلقین جیسے مضامین کی توضیح ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے لکھا :

"آنچہ در شریعت راسخ نیست ناقص است . . . مرد آن است کہ جامع باشد سیان شریعت و طریقت و حقیقت ۔"

"شریعت معیار است ، عیار فقر بر شریعت روشن می گردد ۔"

بے شریعت صوفیوں کو انہوں نے ملحد کہا ہے ۔ دنیا داری کے وہ مخالف نہ تھے لیکن دنیا طلبی اور حُبِ جاہ کے سخت خلاف تھے ۔ انہوں نے لکھا :

"ملاقات سلاطین کہ بر در درویش آیند ، روا باشد ، اما بر در آنہا نباید رفت ۔"

یہ بھی انہیں کا قول ہے کہ :

"اختلاط ملوک رونق ایمان می برد ۔"

چشتیہ مسلک میں سماع کی ممانعت نہیں لیکن انہوں نے کہا کہ سماع کے کچھ آداب ہیں جن کا ہر صورت لحاظ رکھنا چاہیے ۔

"در سماع آداب را رعایت کنند ۔"

ان کا یہ ارشاد یہاں خاص ذکر کے لائق ہے کہ جہاں مشائخ نقشبندیہ کا اثر زیادہ ہو وہاں سماع کو بند رکھنا چاہیے ۔ مروت و محبت کی یہ صورت دراصل ان کے مشرب محبت کے لوازم میں تھی ۔

شاہ کلیم اللہ کے خلفاء

(۱) شاہ نظام الدینؒ اورنگ آبادی (م ۱۷۲۹ء/۱۱۴۲ھ) مصنف 'نظام القلوب' ۔

(۲) شاہ فخر الدینؒ دہلوی (م ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ) مصنف 'نظام العقائد' و 'رسالہ مرجیہ' و 'فخر الحسن' (شاہ ولی اللہ کی ایک کتاب کا جواب) ۔

(۳) خواجہ نور محمدؒ مہاروی اور شاہ نیاز احمدؒ بریلوی ۔

شاہ گلشن دہلوی کا سلسلہ

ان کا تعلق سلسلۂ نقشبندیہ سے تھا - شیخ عبدالاحد سرہندی (شاہ گل) کے مرید تھے - اصلی وطن برہانپور تھا لیکن قیام زیادہ دہلی میں رہا - سخن گو اور سخن فہم اور ولی دکنی کے استاد تھے - خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی ان کے شاگرد تھے اور مرید بھی -

خواجہ ناصر عندلیب (م ۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ) :

شاہ گلشن کے سلسلے کا یہ نامور صوفی صاحبِ تصنیف بھی تھا - ان کی کتابوں میں ۱- 'نالۂ عندلیب' ۲- 'رسالۂ ہوش افزا' اور ۳- 'معدن الرموز' (ارکان اسلام کی متصوفانہ بحث) شامل ہیں -

ان کے سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے سلسلۂ محمدیہ کی بنا ڈالی - چنانچہ یہ قول عام طور سے بڑی شہرت رکھتا ہے : ''محبت ما محبت خدا و دعوت ما دعوت محمد است -'' سلسلۂ محمدیہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ آغاز میں نقشبندی طریقے کا پابند ہے - وہ اشغال و اذکار جو اس طریقے میں ہیں ان کی پیروی کی جاتی ہے اور مجددی مسلک کے مطابق توجہ اور مراقبے سے نسبتِ باطن کا القا کیا جاتا ہے - لیکن آخر میں صرف کلام اللہ کا واسطہ درمیان میں رہ جاتا ہے -

خواجہ میر درد (م ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ)

خواجہ ناصر عندلیب کے فرزند ، سلسلۂ محمدیہ کی نسبت سے المحمدی کہلاتے تھے - لیکن وہ نقشبندی سلسلے میں بڑا اعتقاد رکھتے تھے - ان کا مقام اردو شاعری میں مسلّم ہے مگر ان کی فارسی تصانیف ، جن کا موضوع تصوّف ہے ، ان کی شاعری ہی کی طرح مقبول و مشہور ہیں - ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں :

(۱) 'اسرارالصلوۃ' (۱۷۳۵ء/۱۱۴۸ھ) (۲) 'واردات' (۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ) (۳) 'علم الکتاب' (۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ کے بعد) (۴) 'نالۂ درد' - (۵) 'آہِ سرد' اور شمعِ محفل' ، 'دردِ دل' ، 'حرمتِ غنا' ، 'واقعاتِ درد' ، 'سوزِ دل' وغیرہ ان کی ممتاز ترین کتاب 'علم الکتاب' ہے - یہ دراصل ان کی کتاب 'واردات' کی شرح ہے جس میں ۱۱۱ واردات کا بیان ہوا ہے - واردات میں سے ہر ایک پر ایک رسالہ لکھ کر اس کا نام 'علم الکتاب' رکھا ہے -

'علم الکتاب' میں جو مرکزی عقیدہ جاری و ساری ہے وہ طریقِ محمدی کا اتباع ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ قرآن مجید ہمارا امام ہے :

"ہمیں امامِ مبین را کہ قرآن مجید باشد پیشوائے خود سازلد۔"
(علم الکتاب)

ہمارا سلوک اور طریق نبوی ؐ ہے :

"سلوک ما سلوک نبوی ؐ است و طریق ما طریق محمدی ؐ نام ما نام محمد ؐ است و نشان ما نشان محمد ؐ محبت ما محبت خدا و دعوت ما دعوت محمد ؐ۔"

مظہر جان جاناں ؒ (م ۱۷۸۰ء)

اس دور کے ایک ممتاز اور نامور صوفی (جو ادیب ، شاعر اور صاحب تصنیف بھی تھے) مظہر جانجاناں ؒ تھے۔ یہ نقشبندی سلسلے کے بزرگ تھے اور حضرت شاہ گل (جن کا ذکر آ چکا ہے) کے خلفاء سے فیض حاصل کیا۔ تصوّف میں ان کے مکاتیب خاص اہمیّت کے مالک ہیں۔ ان میں انہوں نے اپنے سلسلے کے عقائد و اشتغال کی حکیمانہ و محققانہ توضیح کی ہے۔ یہ مکاتیب ۸۸ ہیں جو سب کے سب انہوں نے اپنے مُریدوں اور معتقدوں کے نام لکھے۔ یہ ان کے ملفوظات کے ساتھ 'کلماتِ طیّبات' کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔ آپ کی وسعتِ مشرب کا یہ عالم تھا کہ ویدوں کو الہامی کتاب مانتے تھے اور ہندو دھرم کو دینِ منسوخ کہا کرتے تھے۔ آپ کے ملفوظات میں ہے :

"اہلِ استدراج را نیز احوال و اذواق دست می دہد و کشفِ توحید و مکاشفہ و معائنہ کہ در سرایای صورِ عالم بظہور می آید حکمائی یونان و براہمۂ ہندو دریں معنی شریک اند۔"

آپ مراقبہ کے علاوہ تہلیل ، درود ، نوافل اور تلاوت کی کثرت پر زور دیتے تھے۔ آپ کی دو مختصر مثنویاں ہیں۔ ان میں بھی آپ کے متصوّفانہ خیالات بیان ہوئے ہیں۔ ان میں یہ حمدیہ و نعتیہ اشعار آپ کی محبت و عقیدت کے آئینہ دار ہیں :

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست　　محمد ؐ چشم بر راہِ ثنا نیست

خدا خود مدح گوی مصطفیٰؒ بس　　محمدؐ حامدِ حمدِ خدا بس
منا جانی اگر باید توان کرد　　بہ بیتی ہم قناعت میتوان کرد
محمدؐ از تو می خواہم خدا را　　الٰہی از تو عشقِ مصطفیٰؐ را

ساری زندگی متابعتِ نبویؐ میں گذاری ۔ توکل اور استغناء شعار رہا ۔ امیروں اور دنیا داروں سے الگ تھلگ رہتے تھے لیکن غریبوں ، عزیزوں اور دوستوں سے بڑی محبت سے ملتے تھے ۔

مظہر جانجاناںؒ کے مریدانِ خاص میں دو بزرگ نامور ہوئے ؛ ایک تو قاضی ثناء اللہ پانی پتی (جن کا تذکرہ دینی مصنفین میں گذر چکا ہے) اور دوسرے تصوف میں ان سے بھی زیادہ ممتاز شاہ غلام علی تھے ، جن کا اصلی نام شاہ عبداللہ تھا ۔ قاضی پانی پتی کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا اور دیگر دینی تصانیف کے علاوہ ان کی تصوف کی کتاب 'ارشاد الطالبین' خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے ۔

شاہ غلام علیؒ

سلسلۂ مظہریہ کے نامور ترین فرد جنہیں زمانہ شیخ الشیوخ کے لقب سے یاد کرتا تھا اور بعض نے انہیں انیسویں صدی عیسوی/تیرھویں صدی ہجری کا مجدد کہا ہے ۔ ان کے ملفوظات ان کے مرید شاہ عبدالغنی وغیرہ نے جمع کیے ہیں ۔ (ان کے مزید حالات کے لیے دیکھیے سرسید احمد خاں : 'آثارالصنادید' و شیخ محمد اکرام : رود کوثر وغیرہ) ۔ ان کے مریدوں میں شیخ خالد اور مولانا محمد جان اور شاہ احمد سعید دہلوی شہرت رکھتے ہیں ۔ آخری بزرگ کا اثر سب سے زیادہ پنجاب میں ہوا اور 'تکملہ' مقالات مظہری' ان کی تصنیف ہے ۔ اس میں انہوں نے سلسلۂ مجددیہ قیومیّہ کے بزرگوں کے حالات لکھے ہیں ۔ ان کے خطوط ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے 'تحفہ زواریہ' کے نام سے شائع کر دیے ہیں ۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے رود کوثر)

تصوف کے یہ سلسلے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے ۔ چنانچہ پنجاب ، سرحد ، سندھ ، دکن اور بنگال میں جابجا خانقاہیں تھیں اور فیضِ روحانی کے چشمے جاری تھے ۔ ان مشائخ میں صاحبِ تصنیف بزرگوں کی بھی کمی نہ تھی ۔ سرحد میں عبدالرحمٰن بابا پشتو اور فارسی کے شاعر تھے ۔ سندھ میں شاہ فقیراللہ تھے جن کے مکتوبات و ملفوظات ملتے ہیں ۔ سندھ میں مخدوم معین تتوی ، ابو حسین ظاہری اور ابوالحسن داہری صاحبِ فیض

تھے ۔ مؤخرالذکر کی تصنیف 'ینابیع الحیٰوۃ الابدیہ' ہے ۔ بنگال میں شاہ ابواللیث تھے ، ان کی تصانیف میں 'زبدۃ الفوائد' مشہور ہے ۔

ان کے علاوہ اس دور کی چند صوفیانہ تصانیف کی ایک فہرست درج ذیل ہے :

(۱) 'ہدایت ربانی' از بدرالدین قادری ۔

(۲) 'شجرۂ سلسلۂ قادریہ' از میاں غلام رسول ۔

(۳) 'لطائف نفسیہ' از خیالی ۔

(۴) 'خلاصۃ العندلیب' کی شرح از عبدالحق شہید پوری ۔

(۵) 'شرحِ عین العلم' از محب اللہ ۔

(۶) 'محک الطالبین' از محمد سعید القادری ۔

(۷) 'درایۃ الاعمی' از حسین کاشمیری ۔

(۸) 'کنز العقاید' از محمد باقر لاہوری (نقشبندی عقائد پر رسالہ) ۔

ان کتابوں میں سے بعض میں احکام و مسائلِ دین بھی ہیں جن کے ساتھ صوفیانہ معارف کو پیوند دیا گیا ہے ۔ اس کے بعد اردو تصنیف کا دور آ جاتا ہے جس میں علمی تحریر کی زبان اردو ہوتی گئی ۔

مزید معلومات کے لئے دیکھیے رحمان علی اور 'تذکرہ اولیائے ہند' وغیرہ ۔

ج ۔ اخلاق

اخلاق کا بہت سا سرمایہ تصوف اور دین کی کتابوں میں ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ شاعری میں بھی ہے ۔ علمی انداز کی کتابیں فارسی میں کچھ زیادہ نہیں ، جو ہیں ان میں خافی خان کی کتاب 'اخلاقِ ہاشمی' قابل ذکر ہے ۔ اس کا اسلوب 'اخلاق جلالی' اور 'اخلاق محسنی' کے بین بین ہے ۔ سنجیدہ مضامین و مطالب دلکش زبان میں ہیں ۔

ضمیمہ

اس دور کی دینی تصانیف اور علما کی مجمل فہرست

حدیث

شیخ سیف اللہ : شرح شمائل ترمذی ۔

شیخ محب اللہ : شرح صحیح مسلم (عربی) ۔

حافظ فخر الدین بن محب اللہ : شرح صحیح مسلم (فارسی) ۔

شیخ الاسلام صدر الصدور : شرح صحیح بخاری ۔

سلام اللہ : (م ۱۷۸۸ء) فارسی ترجمہ صحیح بخاری و شمائل ترمذی ۔

عام مسائل ۔ دینی کتب

ابو طاہر بن کمال ملتانی : عمدۃ الاسلام ۔

محمدؐ حفیظ جالندھری : (م ۱۷۷۰ء/۱۱۸۴ھ) نافع الطالبین ۔

عبداللہ حافظ : (۱۷۰۰ء/۱۱۱۲ھ) راحت المومنین ۔

امام محمدؐ صدیق : توضیح السّنۃ فی توضیح البدعۃ ۔

مختلف علاقوں کے علماء کے نام

پشاور کے علماء

قاضی طلا محمد ۔ شاہ عبدالرحمٰن ۔ میاں محمدؐ عمر ۔

حافظ محمد احسن ۔ شاہ محمد غوث ۔

ان کی تصنیفات

۱- قاضی طلا محمد ۔ (م ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ) ۔
دیوانِ فارسی ۔ دیوانِ عربی ۔ جواہر النظر ۔ لفحۃ المسک وغیرہ ۔

۲- شاہ عبدالرحمٰن چھوہروی : (ہری پور ہزارہ) (م ۱۹۲۳ء/۱۳۴۲ھ) (امّی) محبّیر العقول فی بیان کمالات عقل العقول ۔

۳- میاں محمدؒ عمر : (م ۱۷۷۲ء/۱۱۹۰ھ) ۔

سر الاسرار یا خزینۃ الاسرار (۹۰۰ صفحات) فارسی ۔

۴- حافظ دراز ۔ حافظ محمد احسن (م ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ) ۔

شرح صحیح البخاری ۔ معراج نامہ ۔ وفات نامہ ۔ سورۂ یوسف سے والضّحیٰ تک تفسیر ۔

۵- شاہ محمدؒ غوث (م ۱۷۳۹ء/۱۱۵۲ھ) ۔

شرح غوثیہ (شرح بخاری) ۔ رسالہ اصول حدیث ۔

رسالہ در بیان کسب سلوک و بیان طریقت و حقیقت ۔ ترجمہ مفید غوثیہؔ ۔

پنجاب کے علماء

۱- حافظ ولی اللہ (م ۱۸۷۸ء/۱۲۹۶ھ) ۔

مباحث و مناظر ۔ کئی کتابوں کے مصنف ۔

۲- مجتہد العصر سید ابوالقاسم (م ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ) ۔

مذہب امامیّہ کے متعلق کتابیں ۔

تفسیر لوامع التنزیل سواطع التاویل ۔

۳- حافظ محمد صدیق (۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ) ۔

سلک الدرر(فیضی کی بے نقط تفسیر کا جواب) ۔

ہدیۃ الانام الخطباء ۔ مقامات حریری کے مقابل بے نقط خطبے ۔

سندھ کے علماء

۱- شاہ فقیر اللہ علوی ۔ (۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) شاعر ۔

۲- مخدوم محمدؒ معین ٹھٹھوی (م ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ) شاعر۔

شرح رموز عقاید صوفیہ۔ رسالہ اویسیّہ۔

رسالہ در بحث تناسخ و دیگر عربی و فارسی تصالیف۔

۳- پیر محمد راشد۔ (م ۱۸۲۷ء/۱۲۴۳ھ)۔

ملفوظات۔ مکاتیب۔ شرح اسماء الحسنیٰ۔ جمع الجوامع۔

۴- مخدوم محمد ہاشم۔

۵- مخدوم محمد ابراہیم۔

۶- مخدوم محمد حیات۔

۷- مخدوم محمد قائم۔

بنگال کے علماء

۱- شاہ ابواللیث (م ۱۸۰۷ء)۔

۲- کرامت علی جون پوری (م ۱۸۷۲ء)۔

شیعہ مصنّفین

۱- دلدار علی (م - ۱۸۲۰ء)۔

مرآۃ العقول یا عماد اسلام چھ جلد۔ اسا س الاصول۔ شہاب ثاقب (تصوّف کے خلاف)۔ رسالہ ارضئین۔ رسالہ ذہبیہ۔ مسکن القلوب۔

۲- مولوی یاد علی۔ تفسیر قرآن۔

۳- سلطان العلماء سید محمد (م ۱۸۶۷ء)۔

۴- مرزا محمد کامل بن عنایت احمد خان کشمیری۔

تاریخ العلماء۔ منتخب کنز العمال ملا علی متقی۔

تنبیہ اہل الکمال و الانصاف علی اختلاف رجال اہل الخلافۃ۔

☆ ☆ ☆

ساتواں باب

علوم و فنون

الف - موسیقی

تاریخ و ارتقاء

جلد دوم کے بابِ موسیقی میں ہم لکھ آئے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے زہد و اتقاء کی وجہ سے مزامیر کے ساتھ موسیقی سننا چھوڑ دیا ۔ اس لئے موسیقی سے وابستہ تمام ہنرمند درباری سرپرستی سے محروم ہوگئے ۔ اس کے باوجود یہ فن مرا نہیں بلکہ ذرا خاموش ہو گیا ۔ اورنگ زیب کے بعد آنے والے بادشاہوں کو تاج و تخت کا تجمّل اور قصر و ایوان کی آسائشیں میسر ہوئیں تو عیش و عشرت کے دروازے پھر کھل گئے اور اس کے ساتھ طاؤس و رباب زینتِ محافل بن گئے ۔ جہان دار شاہ (۱۷۱۲ء - ۱۷۱۳ء) کو تھوڑا وقت ملا مگر اتنے ہی میں وہ خوب کھل کھیلا ۔ عبدالرّسول لکھتے ہیں :

''نغمہ سرائی بلبل لواہان گل پیرہن و ترنم پیرائی باربد آہنگان ناہید فن ، راہ نوائی خسروانی از حجاز و عراق بر تار تنبور بستہ . . . پای کوبی رقاصان طاؤس فریب و خنیا گران با سرا جامہ زیب و ضرب اصول تال دھولک و مردنگ و فنکاری ، عشرت افزا و بہجت آرا شد[1] ۔''

عہدِ فرخ سیر

فرخ سیر (۱۷۱۳ء - ۱۷۱۹ء) کے عہد میں رنگ اور کھل گیا ۔ اس کی شادی کے موقع پر عیش و عشرت کی بساط بچھی ۔ موسیقی کے بغیر تو محفل جم ہی نہیں سکتی تھی ۔ چنانچہ جلیل واسطی بلگرامی نے مثنوی ''کتخدائی فرخ سیر'' میں جہاں اور رنگینیوں اور

---

(۱) عبدالرسول : 'نیرنگ زمانہ' لاہور ، ۱۹۶۰ء ، ص ۵۹ ۔ غلام حسین : سیر المتاخرین ۱۸۶۶ء ، ج ۲ ، ص ۳۸۵ - ۳۸۶ ۔

تماشوں کا ذکر کیا ہے وہاں نغمہ و آہنگ کے قال و حال کا بھی ذکر کیا ہے ۔ ضمناً لفظوں کے دروبست میں ایرانی اور ہندی راگ اور گیتوں اور سازوں کے نام بھی لئے ہیں ۔ ہم اس مثنوی میں سے چند اشعار انتخاب کرکے پیش کرتے ہیں جن سے اس زمانے میں موسیقی کا رنگ ڈھنگ ظاہر ہوگا[۱] :

بسعی مطربان از جوش نغمہ — ہوا گردید گوہر پوش نغمہ
شگفتن گل کند از موج آواز — رگ ابریست گوئی تار ہر ساز
چنان رقصد نوا بر تار ہر ساز — کہ بر روی رسن رقصد رسن باز
کند مرغول شان دل در فلاخن — زلد مضراب شان در سینہ ناخن
رسا تر از شراب سر ترنم — نوا در تار با گرم تلاطم
ترنم قوت روح و حظ جان بود — بخون گرمی شراب مرحنان بود
چو بربط نغمۂ رنگین برون داد — بہ مشتاقان شراب لالہ گون داد
کہا نہ از پی اندوہ داس است — غم از جوش طرب منکوب باس است
مثل این نغمہ را دانش نمیزد — برو صد چوب لا واللہ می زد

بلاول راگنی

چنان زد راہ زہد آہنگ و دستان — کہ دل دادند ناس و یا پرستان

دھناسری

نوا گوید قوام ساحری ام — پی تقویم چون پٹ من جری ام

پٹ منجری

چو صید دل نماید حسن آہنگ — برد از چہرۂ ہر تار سارنگ
مغنی آنچنان فال طرب دید — کہ کاہن ڈول را ہوش تہی دید

ہنڈول

چنان از نغمہ دل بر بی غمی زد — کہ بی 'اہال گوش' خود ہمی زد

مالکوس

بود ہر نغمہ راہ عشرت انگیز — دل شوریدہ را در این دلآویز

دھاوی

---

(۱) جلیل واسطی بلگرامی : مثنوی کتخدائی فرخ سیر ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، برگ ۲۰ - ۲۴ -

چنان آہنگ بروی ہوش محفل که بودی در طپش زلگوله دل
دف از نقش نوا رنگین بہار است تو گوئی چون کف بسته نگار است
بفیض سلمک رنگین قانون ز سرگردانی آید فکر بیرون
صف رامشگران فارسی خوان کند انداز دل از موج الحان

عہد محمد شاہ اور اس کے موسیقار

محمد شاہ (۱۷۱۹ء - ۱۷۵۹ء) کا عہد موسیقی کے لئے جوبن کا زمانہ ہے - گھر گھر موسیقی کی رس پہنچ گئی - پیشہ ور عورتیں بادشاہ کی منظورِ نظر اور زینتِ مجالس ہوئیں - اربابِ نشاط کے کوٹھے آباد ہوئے - نامی گرامی خیالیے اور قوال پیدا ہوئے - بین، ڈھولک، پکھاوج اور سارنگی بجانے والے زمانے کے بےمثال فنکار موجود تھے - درگاہ قلی خان ۱۷۲۸ء/۱۱۵۱ھ میں دہلی گئے - وہ خود نغمہ و نشاط کے رسیا تھے - انہوں نے دہلی کو خوب دیکھا - انہوں نے 'مرقع دہلی میں اربابِ طرب' کے عنوان سے ماہرین فن کے متعلق تفصیل سے جائزہ لیا ہے - انہوں نے بتایا ہے کہ اہل فن میں سے[۱] :

۱- 'نعمت خان' کو نئے نئے نغمے اور ان کے ذیلی شعبے ایجاد کرنے میں بہت مہارت تھی - رنگین خیالوں کا وہ بھی موجد تھا - بادشاہ کے سوا کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا تھا - بین بجانے میں شاید دنیا میں اس سے بہتر شخص پیدا نہیں ہوا - اس کا بھائی بھی کیف و حال سے خالی نہیں تھا - چار چار گھنٹے تک نغموں کو نئے نئے رنگ سے گاتا اور قوت استعداد سے پھر اصلی آہنگ کی طرف لوٹ آتا، اس طرح کہ بڑے بڑے مغنیوں کے ہوش اڑتے - اس کا بھتیجا بھی ''سہ تار'' بجانے میں عجیب مہارت رکھتا تھا - اس نے نئی نئی طرزیں ایجاد کیں -

۲- 'فیروز خان' نعمت خان کا شاگرد تھا - بین نوازی میں اسے بھی کمال حاصل تھا - دھرپد، خیال اور ترانہ میں بھی مہارت تھی[۲] -

۳- 'تاج خان' - بڑے نامور قوال تھے - ان کے نغمات بےخودی طاری کرتے تھے - جانی

---

(۱) درگاہ قلی خان : مرقع دہلی، (اس کا اُردو ترجمہ حسن نظامی کا شائع کردہ ہے)
(۲) شاہنواز خان : مرآۃ آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، شمارہ Pe-I برگ ۳۹۷ -

اور غلام رسول اس کے بیٹے بھی بادۂ روحانی سے لذت اندوز تھے - ہر مہینے کی ساتویں کو سماع سے شغف رکھنے والے فقراء و مشائخ جمع ہوتے اور قوال باری باری نغمہ سرا ہوتے -

۴- 'باقر طنبورچی' سرکار شاہی میں ملازم تھا - اس کے نغمے دلوں کو چرکے لگاتے تھے -

۵- 'حسن خان ربابی' فنِ رباب نوازی میں مسلّم الثبوت استاد تھا - ضعف سے اس کی کمر جھکی ہوئی تھی -

۶- 'غلام محمد سارنگی نواز' تان سین کا پوتا تھا ، اس نے بڑا سریلا گلا پایا تھا - گیت اور دھرپد میں سالار اعلیٰ تھا -

۷- 'قاسم علی' نعمت خان کا شاگرد ، گیت کو پوری رنگینی سے گاتا - حضور شاہنشاہی میں امتیاز رکھتا تھا -

۸- 'معین الدین قوال' استادِ زمانہ ، فنِ قوالی میں یگانہ -

۹- 'حسین خان ڈھولک نواز' نادرۂ روزگار تھا ، ڈھولک بجانے میں منتہائے کمال تک پہنچا تھا - خواہ مہینے تک مجلس جمی رہے ، وہ ڈھولک کو ہر راگ کے ساتھ اس طرح بجا سکتا تھا کہ اس میں ذرہ بھر ابتذال نہ آئے -

۱۰- 'شاہباز دھمدھی نواز' - اس کا باپ سرکارِ اعظم شاہ میں ملازم تھا - وہ بھی یہی ساز بجاتا تھا - تمام دہلی میں اس کی نظیر نہ تھی -

۱۱- 'محمد نام شاہ درویش سبوچہ نواز' - وہ مادر زاد اندھا تھا - ایسا ساز ایجاد کیا تھا جس میں سے ڈھولک ، پکھاوج اور طنبور کی آوازیں پیدا ہوتی تھیں - ایک اور اندھا تھا جو قانون و اصول کے مطابق پٹ کو ڈھولک اور پکھاوج کی مانند بجاتا تھا - کثرتِ ضرب کی وجہ سے اس کا پیٹ سیاہ ہو چکا تھا

۱۲- 'شاہ دانیال' - کبت اور خیال میں خاص مہارت رکھتا تھا -

۱۳- 'رمضانی' - اس کا اسلوبِ خیال بڑا اثر انگیز تھا -

۱۴- 'رحیم خان' - 'دولت خان' ، 'گیان خان' اور 'ہدو' چاروں بھائی خیال گانے

میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے -

۱۵- 'رجی امرد' - دہلی کے مروجہ خیال جو سدا رنگ کے نام سے متصف تھے ، خوب سمجھتا تھا اور مرغوب اسلوب میں گاتا تھا -

۱۶- 'آسا پور' - کبت خوانی میں ماہر تھا اور اساتذہ کے قانون کے مطابق نہایت مضبوطی اور مربوطی سے گاتا تھا -

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی نغمہ و آہنگ میں کمال رکھتی تھیں - ان میں ہندو بھی تھیں اور مسلمان بھی - عموماً ڈومنیاں کہلاتی تھیں - ان میں اللہ بندی ، چمنی ، پنا ، کمال بائی بادشاہ کی منظور نظر تھیں - 'اللہ بندی' منظور نظر قوال تھی - 'لور بائی ، دہلی میں رائج الوقت جنگلہ گانے میں مہارت رکھتی تھی - 'چمنی' کا نغمہ السان کو بے خود بناتا تھا - 'پنا بائی' شاگردِ نعمت خان ، غزل خوانی میں بلبل داستان سرا تھی - 'کمال بائی' محل بادشاہی میں اس کا گذر تھا - رنگینی اور حزنیت سے گاتی تھی - نادر شاہ کے حملے کے بعد بادشاہ نے ساز و نوا سے محفوظ ہونا ترک کر دیا تھا - ایسی حالت میں صرف کمال بائی کی غزل خوانی ہی مرغوبِ خاطر تھی -

محمد شاہ کے درباری مغنّی سارنگ خان نے سارنگی ایجاد کی - سارنگی کی وجہ سے بین ، طنبورہ اور ستار کا رواج کم ہوا[1] -

شاہ عالم ثانی

اس مغل شہنشاہ کے زمانہ میں بھی عیش و نشاط کی کمی نہ تھی - بادشاہ خود بھی شعر و موسیقی سے شغف رکھتا تھا - اس کے عہد کی عیش طلبی کی یادگار بادشاہ سے منسوب ایک کتاب 'خلاصۃ العیش عالمشاہی' ہے ، جس میں جسمانی ، غذائی اور جنسی لذات حاصل کرنے کے طور طریق اور نسخے بتائے گئے ہیں - اسی عنوان سے یعنی 'خلاصۃ العیش عالمشاہی' کے نام سے ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ میں ہندوستانی موسیقی پر جامع کتاب مرتّب ہوئی - 'سنگیت درپن' اور دوسری قدیم کتابیں اس کے متخذ ہیں - کتاب ۸۰ برگ پر مشتمل ہے - اس کا ایک قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری میں شمارہ ۱۸۵۳ء میں موجود ہے[2] -

---

(۱) عبدالرحیم شرر : گذشتہ لکھنؤ ، لاہور ، ص ۱۲۶ -

(۲) Sarchan and Ethe., Catologue of the Persian, Hjndustani and Pashto Manuscripts, Oxrord, 1889. in the Bodleian Library.

اس دور کے آغاز میں مشہور شاعر شیخ سعداللہ گلشن (م- ۱۷۲۸ء) کی سوانح کے ضمن میں اکثر تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ انہیں موسیقی میں امیر خسرو کی طرح کمال حاصل تھا[۱] -

عہد بہادر شاہ اور اس کے فنکار

سلاطین مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء - ۱۸۵۷ء) کے عہد تک ارباب نغمہ و موسیقی دربار کے لوازم رہے - اگرچہ بادشاہ کی سرپرستی برائے نام ہی تھی لیکن دربار سے وابستگی کی روایت چلی آ رہی تھی - فن اپنی قوت اور بل پر ہی زندہ تھا - لوگ بھی نغمہ کے شوقین تھے - چنانچہ اس عہد کے باکمالوں کے نام بھی ہم تک پہنچے ہیں[۲] -

'میر ناصر الدین' - نغمہ سرائی اور بین نوازی میں یکتائے زمانہ تھے -

'ہمت خان' - دھرپد گانے میں اس کا نظیر نہ تھا - محمد نظیر سجادہ نشین خواجہ میر درد کے ساتھ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو مجلس نغمہ گرم ہوتی - ان کے سوز سے سننے والے گرم ہوتے -

'رحیم حسین ستار زن' - تان سین کی اولاد میں سے تھا - رؤسائے جھجر نے اس کی کمال قدردانی کی -

'لکھوا پکھاوجی' - اپنے فن میں یکتائے روزگار تھا -

'نظام خان اور قائم خان' - دھرپد سرائی میں بے مثل تھے -

'راگ رس خان' - بین نوازی میں یگانہ روزگار تھا -

'تان رس خان' - ایک اور باکمال تھے - ان کا نام قلب بخش تھا - تان رس خان خطاب تھا - بادشاہ خیالوں کے بول لکھتے اور تان رس خاں انہیں راگ ، سُر اور لے میں ڈھالتے -

---

(۱) مثلاً دیکھیں مجمع النفائس تالیف سراج الدین علی خان آرزو ، دو مخطوطے پنجاب یونیورسٹی ، لائبریری میں محفوظ ہیں -

(۲) سرسید احمد خان : 'تذکرۂ اہل دہلی' ، کراچی ، ۱۹۵۵ء -

میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے -

۱۵- 'رجی امرد' - دہلی کے مروجہ خیال جو سدا رنگ کے نام سے مصنف تھے ، خوب سمجھتا تھا اور مرغوب اسلوب میں گاتا تھا -

۱۶- 'آسا پور' - کبت خوانی میں ماہر تھا اور اساتذہ کے قالوں کے ... مضبوطی اور مربوطی سے گاتا تھا -

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی نغمہ و آہنگ میں کمال رکھتی تھیں - ان ... بھی تھیں اور مسلمان بھی - عموماً ڈومنیاں کہلاتی تھیں - ان میں اللہ بندی ، چمنی ، کمال بائی بادشاہ کی منظور نظر تھیں - 'اللہ بندی' منظور نظر قوال تھی - 'نور بائی' دہلی میں رائج الوقت جنگلہ گانے میں مہارت رکھتی تھی - 'چمنی' کا نعمہ ان ... بے خود بناتا تھا - 'پنا بائی' شاگرد نعمت خان ، غزل خوانی میں بلبل داستان سرا تھی - 'کمال بائی' محل بادشاہی میں اس کا گذر تھا - رنگینی اور حزنیت سے گاتی تھی - نادر شاہ کے حملے کے بعد بادشاہ نے ساز و نوا سے محفوظ ہونا ترک کر دیا تھا - ایسی حالت میں صرف کمال بائی کی غزل خوانی ہی مرغوب خاطر تھی -

محمد شاہ کے درباری مغنّی سارنگ خان نے سارنگی ایجاد کی - سارنگی کی وجہ سے بین ، طنبورہ اور ستار کا رواج کم ہوا[1] -

شاہ عالم ثانی

اس مغل شہنشاہ کے زمانہ میں بھی عیش و نشاط کی کمی نہ تھی - بادشاہ خود بھی شعر و موسیقی سے شغف رکھتا تھا - اس کے عہد کی عیش طلبی کی یادگار بادشاہ سے منسوب ایک کتاب 'خلاصۃ العیش عالمشاہی' ہے ، جس میں جسمانی ، غذائی اور جنسی لذات حاصل کرنے کے طور طریق اور نسخے بتائے گئے ہیں - اسی عنوان سے یعنی 'خلاصۃ العیش عالمشاہی' کے نام سے ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ میں ہندوستانی موسیقی پر جامع کتاب مرتّب ہوئی - 'سنگیت درپن' اور دوسری قدیم کتابیں اس کے مآخذ ہیں - کتاب ۸۰ برگ پر مشتمل ہے - اس کا ایک قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری میں شمارہ ۱۸۵۳ء میں موجود ہے[2] -

---

(۱) عبدالحلیم شرر : گذشتہ لکھنؤ ، لاہور ، ص ۱۷۶ -

(۲) Sarchan and Ethe., Catologue of the Persian, Hjndustani and Pashto Manuscripts, Oxrord, 1889. in the Bodleian Library.

اس دور کے آغاز میں مشہور شاعر شیخ سعداللہ گلشن (م۔ ۱۷۲۸ء) کی سوانح کے ضمن میں اکثر تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ انہیں موسیقی میں امیر خسرو کی طرح کمال [illegible] تھا[1]۔

بہادر شاہ اور اس کے فنکار

[illegible] کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء — ۱۸۵۷ء) کے عہد تک [illegible] و موسیقی دربار کے لوازم رہے۔ اگرچہ [illegible] کی سرپرستی برائے نام ہی تھی [illegible] سے وابستگی کی روایت چلی آ رہی تھی۔ [illegible] وت اور دل پوری زندہ تھا۔ [illegible] نغمہ کے شیدائی تھے۔ چنانچہ اس عہد کے [illegible] کے نام ابھی ہم تک [illegible]۔

'میر ناصر الدین' ۔ نغمہ سرائی اور بین نوازی میں یکتائے زمانہ تھے ۔

'ہمت خان' ۔ دھرپد گانے میں اس کا نظیر نہ تھا ۔ محمد نظیر سجادہ نشین خواجہ میر درد کے ساتھ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو مجلس نغمہ گرم ہوتی ۔ ان کے سوز سے سننے والے گرم ہوتے ۔

'رحیم حسین ستار زن' ۔ تان سین کی اولاد میں سے تھا ۔ رؤسائے جھجر نے اس کی کمال قدردانی کی ۔

'لکھوا پکھاوجی' ۔ اپنے فن میں یکتائے روزگار تھا ۔

'نظام خان اور قائم خان' ۔ دھرپد سرائی میں بے مثل تھے ۔

'راگ رس خان' ۔ بین نوازی میں یگانہ روزگار تھا ۔

'تان رس خان' ۔ ایک اور باکمال تھے ۔ ان کا نام قطب بخش تھا ۔ تان رس خان خطاب تھا ۔ بادشاہ خیالوں کے بول لکھتے اور تان رس خان انہیں راگ ، سُر اور لے میں ڈھالتے ۔

---

(۱) مثلاً دیکھیں مجمع النفائس تالیف سراج الدین علی خان آرزو ، دو مخطوطے پنجاب یونیورسٹی ، لائبریری میں محفوظ ہیں ۔

(۲) سرسید احمد خان : 'تذکرۂ اہل دہلی' ، کراچی ، ۱۹۵۵ء ۔

لکھنؤ اور موسیقی

دہلی کے علاوہ لکھنؤ بھی فن موسیقی کا بڑا مرکز بن گیا - نوابان اودھ ، امراء و رؤساء نے اہل فن کی سرپرستی کی - شجاع الدولہ (۱۷۵۶ء - ۱۷۷۵ء) کو ارباب نشاط کا بڑا شوق تھا - نواب وزیر کے علاوہ امراء و سالاران فوج بھی اپنے ہمراہ ارباب نشاط کے گروہ رکھتے تھے - آصف الدولہ کے عہد میں 'اصول النغمات الآصفیہ' لکھی گئی ، جسے قدیم معتمد کتابوں سے مضامین اخذ کر کے بڑی محنت سے مرتب کیا گیا - اس کے عہد میں ہولی ، بہار اور بسنت پر جشن ہوتے اور رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتیں - غازی الدین حیدر نے بھی ذاتی طور پر دلچسپی لے کر فن موسیقی کی سرپرستی کی -

'خواجہ حسن مودودی' - سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء - ۱۸۱۵ء) کے عہد میں ہوئے - آپ مصنف 'اصول النغمات الآصفیہ' کے استاد تھے - ان کے گانے کی تاثیر کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کے تاخت و تاراج کے زمانے میں وہ میانہ میں سوار ہو کر لکھنؤ سے اٹاوہ جا رہے تھے - راستے میں ایک گاؤں سے گذر ہوا ، جہاں مرہٹے آنے والے تھے - کہاروں نے میانہ رکھ دیا اور آگے بڑھنے سے رک گئے - خواجہ صاحب نے نماز عصر کے بعد الاپنا شروع کیا - کہاروں پر اتنا اثر پڑا کہ وہ تازہ دم ہو گئے اور خواجہ صاحب کو جائے امن میں پہنچا دیا -

'نواب سالار جنگ' - آصف الدولہ کے ماموں تھے - بڑے بڑے قوالوں اور کلاونتوں سے بازی لے جاتے تھے - بڑی مصری اور سندر جان ، عہد آصفی میں خیال گانے میں بے نظیر تھیں -

'حیدری خان' - وارفتہ مزاج تھے - غازی الدین حیدر کے زمانے میں ایک دفعہ اسے بادشاہ کے پاس لے گئے - اس نے اس طرح گانا گایا کہ باشاہ رو پڑے -

'عظیمن جان' - محمد علی شاہ (۱۸۳۷ء - ۱۸۴۲) کے زمانے کی طوائف ہے ، گانے میں باکمال تھی -

'سہڑو بائی' - غازی الدین حیدر کے ہاں ۵۰۰ روپے پر ملازم تھی :

"ای نسیم سحر آرامگہ یار کجاست"

والی غزل ایسے انداز میں گاتی کہ محویت کا عالم طاری ہو جاتا -

نجبن ، سلارو ، متھو طوائف ، رام کلی ، خورشید جان ، مہتاب جان ، ہیرا جان ، حلانو عہد آصفی کی بے مثال گانے والیاں تھیں ۔

عہد واجد علی شاہ اور اس کے فنکار

واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء - ۱۸۵۶) کے عہد میں موسیقی کو بڑا فروغ ہوا ، لیکن فن اپنے اعلیٰ پیمانے سے گر گیا اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر آ گیا ۔ واجد علی شاہ نے بسط خان سے فنِ موسیقی حاصل کیا اور اس فن میں پوری بصیرت حاصل کی ۔ اس نے نئی راگنیاں تصنیف کیں ۔ مثلاً ناجو ، جوگی کنٹر ، جوہی ، شاہ پسند وغیرہ ۔ عوام میں ٹھمری کا چرچا ہوا ۔ دھرپد ، ہوری جیسی مشکل چیزیں ترک کر دی گئیں ۔ کھماچ ، جھنجھوٹی ، بھیرویں ، سندورا ، تلک کامود ، پیلو وغیرہ چھوٹی چھوٹی مزہ دار راگنیاں اہل مذاق کے تفنن کے لئے منتخب کی گئیں ۔ بھیرویں لکھنؤ کا ہی حصہ ہے ۔ سوز خوانوں نے بھی اس کو رواج دیا ۔ اکثر سوز خان پیار خان اور حیدر خان کے شاگرد تھے ۔ لکھنؤ میں موسیقی کو اس قدر عروج ہوا کہ عام لڑکے بالے بھی راگ راگنیاں سمجھتے تھے[1] ۔

لے کی کیفیت سے واجد علی شاہ کو گہری واقفیت تھی ۔ اس کی نس نس میں لے کی کیفیت طاری تھی ۔ گاتے وقت ہر عضو اور بنِ مو سے بے اختیار حرکت پیدا ہوتی ۔ فن بھاو میں اسے کمال حاصل تھا ۔ اس نے 'بنی' 'ناجو' اور 'دلھن' فن موسیقی پر کتابیں تالیف کیں ۔

واجد علی شاہ کو تاشا بجانے کا بہت شوق تھا ۔ محرّم کی ساتویں تاریخ مٹیا برج کلکتہ میں آسانی کوٹھی سے مہندی اٹھتی تھی ۔ گلے میں تاشا ڈال کر بجاتا اور بجاتے وقت اتنی جلدی جلدی ضربیں لگاتا کہ ایک قرعے کا دوسرے سے امتیاز نہ ہو سکتا ۔ ان مسلسل قرعوں کے زیر و بم سے لے اور گت پیدا ہوتی[2] ۔

مٹیا برج میں احمد خان ، تاج خان ، غلام حسین خان باکمال گویے تھے ۔ دلّی خان اپنے سحر آفرین گلے کی وجہ سے کلکتے میں مشہور تھا ۔ زہرہ اور مشتری گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں ۔ بی حیدر کا سوز سننے کے لئے محرم میں لوگ گھنٹوں انتظار کرتے

---

(۱) عبدالحلیم شرر : گذشتہ لکھنؤ ، ص ۱۷۲ ۔

(۱) اسرار حسین : قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ ، ۱۹۳۶ء ، ص ۶۰ ۔

رہتے ۔ محمد حسین کے مقابلے میں سارے برصغیر میں کوئی کامل طبلہ نواز نہیں تھا[1] ۔

عہد واجد علی شاہ میں بہار خاں ، جعفر خاں ، حیدر خاں ، باسط خاں اور محمد علی خاں خاندان تان سین کے افراد تھے ۔ نعمت خاں ، باسط خاں کے شاگرد تھے ۔ گیارہ سال تک مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے ساتھ رہے ۔ گوہر جان لکھنوی مٹیا برج کی ایک محفل میں تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو بجایا کی کہ تمام اہل کمال دنگ رہ گئے ۔ نجبن ٹپہ لگانے میں فرد تھی ۔ نظام الدین احمد خاں ، محمد احمد خاں ، صفدر علی خاں ، چھجو خاں عہد واجدی میں موسیقی کے ماہرین شمار ہوتے تھے ۔ شوری ٹپہ گانے میں بے مثل تھا ۔ والا قدر نواب وزیر مرزا بہادر ٹھمری گانے میں مشہور تھا ۔ ڈولے خاں لکھنوی ہوری اور دھرپد گانے کا استاد تھا ۔

'نواب گیتی آرا بیگم' ۔ نواب حضور عالم وزیراعظم کی صاحبزادی تھی ۔ جلترنگ بے مثل بجاتی تھی ۔

'مہدی حسن خاں لکھنوی' ۔ واجد علی شاہ کے ملازم تھے ۔ بین بجانے میں برصغیر میں ان کا جواب نہ تھا ۔ مسماۃ شرفی دریا آبادی ، حسین بخش لکھنوی کی شاگرد تھی ۔ موسیقی دانی کے ساتھ سارنگی بجانے میں اسے کمال حاصل تھا ۔

واجد علی شاہ نے اپنی ایک تصنیف میں اپنے فنکاروں کی تعداد بتائی جس سے اس کی محفل کا رنگ قیاس کرنے میں مدد مل سکتی ہے ۔ لکھتے ہیں ''پندرہ کلاونت مغنّی ، دو پکھاوجی ، تیئیس طبلہ نواز ، چھیالیس سارنگی نواز ، بائیس ستخرہ نواز ، ایک نے نواز ، چھ رقاص ، ایک شعبدہ باز ، دو ڈھولک نواز ، ایک سر سنگھار نواز ، اُنیس نفر نقار خانے میں ۔ سرکار میں جو ڈومنیاں ہیں ان کو سرورِ محفل اور جو ان کے مرد ہیں ان کو بہارِ محفل کہتے ہیں[2]'' ۔

واجد علی شاہ نے فن موسیقی میں 'بنی' 'ناجو' 'دلھن' 'صوت المبارک' کتابیں تالیف کیں ۔ دہلی اور لکھنو کے علاوہ اجودھیا ، بنارس ، آگرہ بھی موسیقی کے مراکز تھے ۔

---

(۱) عبدالحلیم شرر : گذشتہ لکھنؤ ، ص ۱۷۲ ۔

(۲) واجد علی شاہ : بنی ، ص ۳۳۲ ، ۳۳۳ (بحوالہ رئیس احمد جعفری : واجد علی شاہ اور ان کا عہد ، لاہور ۱۹۵۸ء ، ص ۳۳ - ۳۴) ۔

ریاستوں میں رامپور ، گوالیار ، بڑودہ ، بہرام پور ، میسور اور حیدرآباد موسیقاروں کی سرپرستی کے لیے مشہور تھیں ۔ میسور میں ٹیپو سلطان کی ہدایت پر فن موسیقی پر ''مفرح القلوب'' کے عنوان سے کتاب مرتب ہوئی ۔ ایک اور کتاب سلطان کے بینڈ کے لئے مرتب کی گئی جس کے ہر باب میں سولہ غزلیں جمع کی گئیں ۔

بعض راگ اور بعض ساز مخصوص صفات کی بنا پر شہروں سے یا ریاستوں سے منسوب ہو گئے کیونکہ وہاں کے اہل فن نے ان میں کمال مہارت حاصل کی اور وہیں سے روایت چلتی رہی ۔ ٹھمری اور غزل لکھنؤ میں ۔ ٹپہ ، گرہ بند ، بنارس میں ۔ خیال اور رباب گوالیار میں اور ریاست رام پور میں ۔ بین اور ستار جے پور میں زیادہ مقبول و مروج ہوئے ۔

موسیقی کی تعریف اور اس کا آغاز

اس عہد میں فن موسیقی کے متعلق چند ایک جامع و مستند کتابیں مرتب ہوئیں ۔ ان میں سے 'خلاصۃ العیش عالمشاہی' ، 'اصول النغمات آصفیہ' ، 'مفرح القلوب' ، 'نی' ، 'باجو' ، 'صوت المبارک' مؤلفہ واجد علی شاہ علمی اور فنی نقطۂ نظر سے اہم ہیں ۔ ان کے علاوہ اور بھی مختصر اور اہم رسائل تالیف ہوئے ہیں ۔ ان میں بعض تو وہی معلومات ہیں جن کا خلاصہ ہم پہلی دو جلدوں کے ابواب موسیقی میں لکھ آئے ہیں ۔ اس دور کی جو کتابیں ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں ان میں ایرانی و ہندی موسیقی کے متعلق خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ امیر علی خاں نے ''وزیر نامہ'' میں موسیقی کی تعریف و غایت کے متعلق دقیق بحث کی ہے ۔ اسی طرح 'مقدمات ِ ظہوری' کے مؤلف عبدالرزاق حسین سورتی نے بعض اہم اصطلاحوں اور موسیقی کی چند بنیادی چیزوں پر روشنی ڈالی ہے ۔

واجد علی نے ایرانی موسیقی کے بارہ نغمات کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ ہر مقام میں ایک نہ ایک خصوصیت ہے جس سے انسانی جذبات متاثر ہوتے ہیں ۔ مثلاً :

عشاق ، بوسلیک و نوا سے فوائد شجاعت

راست و اصفہان و عراق سے فرح و نشاط

رہاوی و حسینی و حجاز سے ذوق و شوق

بزرگ و کوچک و زنگولہ سے حزن ، اندوہ و ملال[1]

---

(۱) واجد علی : مطلع العلوم و مجمع الفنون ، فصل اول ۔

آوازیں اور گوشے

'مقدمات ظہوری' کے 'مقدمة الثانی فی مبانی الاغانی' میں بعض ایسی معلومات پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق اکثر کتابیں خاموش ہیں ۔ اس کے مصنف لکھتے ہیں ، آوازیں چھ قسم کی ہیں :

۱۔ 'سلمک' ۔ یہ اصفہان کی پستی اور رنگولہ کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے اور گیارہ نغموں سے حاصل ہوتی ہے ۔

۲۔ 'گردانیہ' ۔ یہ عشاق کی پستی اور راست کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے اور نو نغموں سے حاصل ہوتی ہے ۔

۳۔ 'نو روز' ۔ یہ بوسلیک کی پستی اور حسینی کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے اور چار نغموں سے حاصل ہوتی ہے ۔

۴۔ 'گوشت' ۔ یہ حجاز کی پستی اور نوا کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے اور چھ نغموں سے حاصل ہوتی ہے ۔

۵۔ 'مایہ' ۔ یہ کوچک کی پستی اور عراق کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے اور چھ نغموں سے حاصل ہوتی ہے ۔

۶۔ 'شہناز' ۔ یہ بزرگ کی پستی اور رہاوی کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے اور چھ نغموں سے حاصل ہوتی ہے[1] ۔

'مرآة آفتاب نما' کے مؤلف نے ہندی سنگیت کی سات بنیادی آوازوں کے متعلق بتایا کہ یہ حیوانوں پرندوں اور دوسری اشیاء کی آوازوں سے ماخوذ ہیں ۔ اہل فن ہی اس کی صحت کے متعلق رائے دے سکتے ہیں ۔ اس کی تشخیص یہ ہے[2] :

کھرج ماخوذ از آواز طاؤس

رکھب ماخوذ از آواز بین

---

(۱) عبدالرزاق الحسینی : مقدمات ظہوری ، ص ۱۱ ۔
(۲) شاہنواز خاں : مرآة آفتاب نما ۔

گندھار ماخوذ از آواز موج

مدہم ماخوذ از آواز کلنگ

پنچم ماخوذ از آواز کوئل

دھیوت ماخود از آواز اسپ

نکھاد ماخوذ از آواز فیل

ہندی سنگیت میں ہر راگ کے آٹھ پتر بتائے جاتے ہیں - اسی طرح ایرانی موسیقی میں ہر مقام کے چار فرزند بتائے جاتے ہیں - چونکہ بارہ مقامات ہیں ، اس لئے کل ۴۸ فرزند ہوئے - ان کو گوشہ ہا کہتے ہیں یعنی جگر گوشہ ہا - ان اڑتالیس میں سے صرف تیس کے نام کتابوں میں ملتے ہیں - لیکن ان کی ترکیب و ترتیب کے متعلق تفصیلات مذکور نہیں - ان کے نام ہیں[1] :

۱- بہار نشاط - ۲- غریب - ۳- سوار - ۴- غم زدا - ۵- نبات ترک - ۶- سرفراز - ۷- بستہ نگاہ - ۸- نبات گردانیہ - ۹- نہاوندک - ۱۰- صفا - ۱۱- دلبر - ۱۲- اوج کمال - ۱۳- نگار - ۱۴- وصال - ۱۵- شہری - ۱۶- عشیران - ۱۷- غزال - ۱۸- طرب عشرت انگیز - ۱۹- بحر کمال - ۲۰- اصلی - ۲۱- اعتدال - ۲۲- گلستان - ۲۳- سربرگیر - ۲۴- حیران - ۲۵- جمال - ۲۶- روح افزا - ۲۷- حیرت - ۲۸- معتدلہ - ۲۹- معنوی - ۳۰- پہلوی -

ساز اور ان کے موجد

'مجمع العلوم' اور 'مجمع الفنون' کے توسط سے ہمیں بعض سازوں اور ان کے موجدوں کے نام یکجا ملتے ہیں جس سے معلومات میں مفید اضافہ ہوتا ہے[1] - مثلاً :

بربط کا موجد فیثا غورث - ارغنون ، افلاطون - قانون ، ابو نصر فارابی - طنبور ، نرکان - شہنائی ، بوعلی سینا - موسیقار ، ابو حفص سغدی - ستار ، امیر خسرو -

تصانیف

اس عہد میں جہاں فن موسیقی کو فروغ ہوا وہاں حکومت کا شیرازہ بکھر جانے سے اس فن مین بھی زوال و انحطاط آ گیا - گذشتہ ادوار کی طرح اس دور میں بھی فن

---

(۱) واجد علی : مطلع و مجمع الفنون -

موسیقی پر رسائل تصنیف و تالیف ہوتے رہے ۔ بعض جامع و مستند کتابیں بھی ہوئیں ۔ 'خلاصۃ العیش عالمشاہی' اور 'اصول النغمات الآصفیہ' کا ذکر ہم کر آئے ہیں ۔ واجد علی شاہ کی تصانیف اس فن پر معلومات کا مخزن ہیں اور اس فن پر سند کا حکم رکھتی ہیں کیونکہ ان کا مصنف خود اہل فن ہے ۔ اس دور کے اواخر میں فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی کتابیں مرتّب ہوئیں ۔ چونکہ فارسی کتابوں سے استفادہ کرنے والے لوگ کم ہیں ، خاص طور پر فن موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے افراد فارسی سے نا آشنا ہیں ، اس لئے یہ کتابیں کمیاب ہیں ۔ اگر کبھی چھپی نہیں تو اب نایاب ہیں ۔ چند کتابوں کے علاوہ اکثر رسائل پرانی معلومات کی صدائے بازگشت ہیں ۔ جن کتابوں کا ہم سراغ لگا سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں ۔ ان کے مشمولات سے ان کی اہمیت پر روشنی پڑے گی ۔

۱۔ **'شمس الاصوات'** ۔ مصنف نامعلوم ۔ ۱۶۹۶ء/۱۱۰۹ھ میں تالیف ہوئی ۔ چھ ابواب پر مشتمل ہے ۔ مشمولات کی تفصیل یہ ہے :

ا۔ در کیفیت تفاصیل سر کہ در اصطلاح ہند آنرا سر ادھیای گویند ۔

ب۔ در ذکر راگہای کہ در اصطلاح ہند آنرا راگ ادھیای گویند ۔

ج۔ در شرح الاپ یعنی برداشتن و گردانیدن سر در راگ و ذکر ارکان آن کہ آن را پرکرن ادھیای گویند ۔

د۔ در شرح تفصیل اقسام گیت کہ در اصطلاح ہند آنرا پربندھ ادھیای گویند ۔

ھ۔ در شرح قوانین دستک زدن کہ آنرا تار ادھیای گویند ۔

و۔ در کلیات ساز و احوال کہ آنرا نا ادھیای گویند ۔

اس کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں شمارہ ۲۰۲۲ پر موجود ہے اور اس کے ۳۳ برگ ہیں ۔

۲۔ **'اصول النغمات'** ۔ مؤلف نامعلوم ، اس میں صرف پانچ اصولوں پر بحث کی گئی ہے ۔ (۱) در بیان سُر ۔ (۲) در بیان پرکرن ۔ (۳) در بیان راگ ادھیای ۔ (۴) در بیان تار ادھیای ۔ (۵) در بیان ناد ادھیای ۔

یہ رسالہ ۳۵ اوراق پر مشتمل ہے ۔ اس کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں شمارہ ۲۰۴۳ پر موجود ہے ۔

۳۔ 'مفرح القلوب' ۔ مؤلف حسن علی عشرت ۔ ٹیپو سلطان (۱۷۸۳ء - ۱۷۹۹ء) کی ہدایت پر ۱۷۸۳/۱۱۹۷ھ میں مرتّب ہوئی ۔ کتاب مقدمہ ، چھ ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے ۔

مقدمہ ۔ در ذکر صدای مردنگ و آواز گردش زنگولہ و آوازۂ زنگولہ و صدای کر ۔

باب اول : در بیان نغمہ ابیض ، اصولہا و ضربہا و فتاحا و طرز ہای ششگانہ ۔

باب دوم : در بیان نغمۂ اصغر ، وقت سرائیدن آن و اصولہای پنجگانۂ آن ۔

باب سوم : در بیان نغمہ احمر و اصولہا و ضربہا ۔

باب چہارم: در بیان نغمہ ز برجد و اصولہا و ضربہا ۔

باب پنجم : در بیان نغمہ ورد و ضربہا و طرزہای ششگانہ ۔

باب ششم : در بیان نغمۂ عباسی و اصولہا ۔

خاتمہ ۔ در بیان دو غزل فارسی و چندین ریختہ ہندی خارج از وزن ششگانہ ۔ یہ کتاب انڈیا آفس میں شمارہ ۲۰۳۴ پر موجود ہے اور اس کے ۱۸۵ برگ ہیں ۔

۴۔ انڈیا آفس میں شمارہ ۲۰۳۳ پر بیالیس اوراق میں رسائل موسیقی موجود ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

الف ۔ 'الہام الطرب' ۔ موسیقی پر عام رسالہ ۔

ب ۔ 'منفعت الطالبین' ۔ جن میں چار فصلیں ہیں ۔ (۱) در شش راگ و سی و شش راگنی ۔ (۲) در بیان راگ و راگنیہا کہ مخصوص اند علی الترتیب ۔ (۳) در تفصیل راگ و راگنیہا ۔ (۴) در بیان اختلاط راگ و راگنیہا ۔

ج ۔ فارسی میں راگ راگنیوں کی فہرست ۔

۵۔ 'اصل الاصول' از محمد نصیر محمدی رنج نبیرۂ خواجہ میر درد ۔

یہ کتاب مصنف کے ممدوح میاں ہمت خاں کی سرپرستی میں تالیف ہوئی ۔ میاں ہمت خاں، میاں نور خاں ''نورنگ'' کے چھوٹے بھائی تھے جو میاں لعل خاں 'پرب لعل' کے بیٹے تھے جو خود میاں فراز خاں ادا رنگ کے بڑے بھائی اور میاں بھوپت خاں کے بیٹے تھے ۔ میاں بھوپت میاں نعمت خاں سدا رنگ کے بھائی تھے ۔ موسیقی کے لیے یہ تمام خاندان آفتاب تھا ۔

یہ کتاب دو ابواب میں منقسم ہے ۔ پہلا باب فن تال میں ہے ۔ اس میں دو فصلیں اور خاتمہ ہے ۔ دوسرا باب فنِ لے کے متعلق ہے ۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں شمارہ ۲۹۷۵ پر موجود ہے ۔ اس مخطوطے میں دوسرا باب موجود نہیں ۔

۶۔ 'تشریح الموسیقی' ۔ از محمد اکبر المعروف محمد ارزانی بن محمد مقیم (م ۱۷۲۲ء/ ۱۱۳۴ھ) مؤلف نے تمہید میں لکھا ہے کہ یہ رسالہ بدھ پرکاش مصنفہ میر تان سین کا ترجمہ ہے ۔ اس میں آٹھ ابواب ہیں :

۱۔ در بیانِ منشا و مبدای علم و تسمیۂ موسیقی ۔

۲۔ در بیانِ انواع سماع ۔

۳۔ در بیانِ لوازمات و موالعات مغنّی ۔

۴۔ در بیانِ تعداد اصول و فروع و اثمار شجرۂ علم موصوف ۔

۵۔ در بیانِ تقسیم بعض اصول و فروع و اثمار شجرۂ مذکور ۔

۶۔ در بیانِ اوقات سرائیدن اصول و فروع و بعض اثمار مذکورہ ۔

۷۔ در بیانِ آمیزھا یعنی ملوونیہای ہر یک ۔

۸۔ در بیانِ ساز و تالہا ۔

ساتواں باب سب سے زیادہ تفصیلی ہے ۔ چھ راگ اصول اور ۳۰ راگنیاں فروع شمار کی ہیں اور بتایا ہے کہ پانچ راگ اور ۲۳ راگنیاں تقسیم نہیں ہوتیں جیسا کہ برم ہار ماہان بھارت جیسی ضخیم کتاب اور رسالہ گوالیار میں اس کے وجوہ مذکور ہیں ۔ تقسیم ہونے والی راگنیوں کو ان کی بیٹیاں (دخترک) بنا کر تقسیم کیا ہے ۔ ان دس سازوں کے نام لیے ہیں

جن کے نغمے شاہنشاہ نے سنے یعنی طنبور بین ، رباب ، مردنگ ، عود ، جلترنگ ، داریا (؟) ڈھولک ، پکھاوج ، بردی (؟)

(ب) خطّاطی

خطّاطی کا مطالعہ ہم پچھلی جلد میں بھی کر چکے ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ ۱۷۰۷ء تک فن خطاطی کی کئی انواع اور طرزیں اپنے پورے ارتقاء تک پہنچ چکی تھیں اور ان میں ہر خطاط کی اپنی خاص طرز میں پیشرفت سے ایک انفرادیت پیدا ہوگئی تھی ۔ خط کوفی ، خط نسخ ، خط تعلیق ، اسی طرح ثلث ، شکستہ ، نستعلیق اور خط دیوانی کی طرزوں میں برابر نمایاں نمونے سامنے آتے رہے اور حالات اور ملکی ماحول کے مطابق ان میں نئی شان پیدا ہوتی ۔

تاریخی طور پر ہم جانتے ہیں کہ مغل بادشاہوں کا سلسلہ برابر ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ تک جاری رہا ۔ اس کے بعد برطانوی حکومت برسر اقتدار آ گئی اور اس کا سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا ۔ اس کے بعد پاکستان ظہور میں آ گیا ۔ مگر قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ خط اسلامی کا جو رواج عہدِ سلاطین غزنہ سے یہاں ہوا وہ برابر اور متواتر برقرار رہا ۔ اسلامی ادب اور اس کی مختلف اصناف کا لسانی اعتبار سے ہر ملک اور شہر میں شائع ہونا بذاتِ خود ایک نہایت دلچسپ اور طویل داستان ہے ۔ میں کہوں گا کہ یہ سب خطِ اسلامی کا اپنا جلوہ ہے ۔ اس عہد سے متعلق بعض کتابیں تذکرۂ خوش نویساں کے طور پر تالیف ہوئیں مثلاً غلام محمد ہفت قلمی کا تذکرہ ۔ اسی طرح خطّاطی کی تعلیم کے لئے بھی کتابیں لکھی گئیں ۔

ہم نے عہدِ اورنگ زیب میں مطالعہ کیا ہے کہ بادشاہ نے خود کتابت کر کے دو تین قرآن کے نسخے حرمِ نبوی اور مکہ معظمہ کے لئے ارسال کیے تھے ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے خطّاطی کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی تھی ۔ شاہی خاندان کے افراد میں خطّاطی کی تعلیم ایک روایت بن گئی تھی ۔ جہاں تک عام خطّاطوں کا تعلق ہے کئی خطّاط ، جو عہد اورنگ زیب میں مشہور ہوئے تھے ، انھوں نے اس فن کے معیار کو برقرار رکھا ۔ ان ہی میں سے اکثر شاہ عالم کے عہد میں بھی برابر کام کرتے رہے ، جن میں مرزا حاتم بیگ مشہور خوش نویس خصوصیت سے شکستہ نما خط دیوانی کے ماہر تھے اور اکثر

فرامین وغیرہ لکھتے تھے ۔ شاہ عالم اور فرخ سیر کے دربار میں میر منشی کے عہدے پر سرفراز تھے اور میر غلام علی کی طرز پر خطّاطی کرتے تھے ۔

عالم گیری عہد کے مشہور ایرانی خوش نویس عبدالباقی حداد کے شاگرد محمد عارف تھے ۔ وہ اپنے زمانے میں بہت نامور خوش نویس تھے ۔ خطِ ثلث اور خطِ نسخ میں ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے ایک خاص طرز یعنی اپنا ایک خاص معیار پیدا کیا تھا ۔ وہ بہادر شاہ اول کے دربار سے منسلک تھے اور ان کو 'یاقوت رقم' کا خطاب ملا تھا ۔ ان کے شاگردوں میں محمد افضل اور محمد عسکری ، مرزا زین العابدین اور میرزا افضل اللہ خاص کر بہت مشہور تھے اور ان کا بھتیجا عصمت اللہ ان کے اعلیٰ تلامذہ میں سے تھا اور عہد شجاع الدولہ کا ممتاز خطّاط تھا ۔

حاجی نامدار مشہور خطّاطوں میں سے تھے اور آقا عبدالرشید دیلمی کی روش پر لکھتے تھے ۔ جو کچھ لکھتے اس میں ایک خاص جاذبیت پیدا کرتے تھے ۔ یہ اورنگ زیب کے اواخر عہد میں بھی جانے پہچانے تھے لیکن فرخ سیر کے مشاہیر میں قرار پائے ۔ عہد محمد شاہ کے مشہور خطّاط محمد حفیظ خان (م - ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ) تھے جو ہر طرز میں خطّاطی کرتے تھے ، یعنی خط نسخ ، خط ثلث ، خط نستعلیق اور خط شکستہ خوب لکھتے تھے ۔ داروغۂ کتاب خانہ کے عہدے پر سرفراز تھے ۔ جب زمانۂ انقلاب آیا تو ملازمت ترک کر کے عبادت و توکل و قناعت پر تکیہ کر لیا ۔ ان کے خط میں ایک خاص شایستگی اور استادانہ شان تھی ۔ انہوں نے قرآن کریم کے چند نسخے طرزِ یاقوت پر مطلاّ اور مذہب لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے ، وہ آخر عمر میں قرآن مجید ہی لکھا کرتے تھے ۔ ان کے تلامذہ اکثر فن خطاطی کے مشاہیر میں سے ہوئے ہیں ، مثلاً میر ابوالحسن عرف میر کان ، قادر بخش ، محمد اسمعیل ، محمد تقی وغیرہ ۔ خاص طور پر نستعلیق شکستہ میں منشی لچھمن سنگھ ، لچھمی رام پنڈت ، لالہ سکھ رام منشی ان کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے ۔

اس زمانے میں شکستہ طرزِ خط کی طرف زیادہ رغبت نظر آتی ہے ۔ اس عہد میں فنون میں روایت سے کسی قدر آزادی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اور کسی قدر روایتی روش سے ہٹ کر تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ۔ اس ضمن میں ہم اس عہد کے ایک مشہور خطّاط مولوی حیات علی کو بہت نمایاں پاتے ہیں ۔ ان کے متعلق مولانا غلام محمد

ہفت قلمی نے لکھا ہے :

''ذاتِ فیض آیاتش بجلمۂ فنس و ہنر آراستہ و در علمِ عربی و فارسی و ترکی بے عدیل و در نوشتنِ خط شکستہ وغیرہ شہرۂ آفاق ۔''

انہوں نے خط میں کمال پیدا کرنے کے لئے متواتر سات سال مشق کی ، یہاں تک کہ وہ اپنے استاد سے بھی بہتر لکھنے لگے ۔ انہوں نے خطِ شکستہ کو پریم ناتھ اور نستعلیق کو خلیفہ سلطان سے اخذ کیا تھا ۔ ان کی کوشش سے خط شکستہ مزید مجلا ہو گیا ، اور بعض استادان فن بھی اس کی بلندی تک نہیں پہنچے ۔ پریم ناتھ کے متعلق لکھا ہے کہ سرکار شاہ عالم ثانی میں انہیں اقتدار حاصل تھا ۔ فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے ۔ تخلص ''آرام'' تھا ۔ ہمیشہ قناعت پسند رہے ۔

میر ابوالحسن عرف کلن ، جن کا ہم نے تلامذۂ حفیظ خاں میں اوپر ذکر کیا ہے ، عالی خاندان اور ساداتِ رضوی میں سے تھے ۔ خط نستعلیق آقا رشید دیلمی کی طرز پر لکھتے تھے ۔ ایک عرصے تک نواب عبدالاحد خاں کی رفاقت میں رہے ۔ اس کے بعد اکبر شاہ ثانی کی سرکار سے متوسّل ہوگئے ۔ آپ کے صاحبزادے میر محمد حسین بھی خوش نویس تھے اور باپ کے صحیح جانشین تھے ۔ یہ لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے میر منشی ہوگئے تھے ۔ ان کے معاصر غلام علی خاں مشہور خطّاط اکبر شاہ ثانی کے دربار میں خوش نویس تھے ۔ خوش گفتار اور علمِ مجلسی کے ماہر ہونے کے علاوہ علمِ موسیقی میں بھی دخل تھا ۔ انہوں نے 'شاہ عالم نامہ' بھی لکھا تھا ۔ ان کے ساتھ کاتب حافظ محمد علی بھی تھے جو خط نستعلیق اساتذہ کی قدیم روش پر لکھتے تھے ۔ میرزا جوان بخت بہادر کے خطاطی کے استاد تھے ۔ اسی نام کے دوسرے خطّاط محمد علی بن زرین قلم اپنے والد کے دوش بدوش خط نستعلیق ، خاص طور پر خط جلی لکھنےمیں باکمال تھے ۔ میرزا محمد علی حکاک مُہر کن اپنے فن میں بےنظیر تھے ۔ خوش وضع اور خوش کلام بزرگ تھے ۔ ان کے چہرے پر نور برستا تھا ۔ بعض اوقات مُہر کنی کے علاوہ قطعات جلی بھی لکھتے تھے ، جن میں وہ اکثر خط ہندی ، خط نسخ ، خط ریحان اور خط ثلث کو خوب برتتے تھے ۔

میرزا محمد علی بن میرزا خیر اللہ بن لطف اللہ مہندس بن احمد معمار شاہجہانی صاحبانِ فن کے ایک مشہور خاندان سے تھے ۔ ان کا تعلق بقول غلام محمد ہفت قلمی فرمان نویس

فرامین وغیرہ لکھتے تھے ۔ شاہ عالم اور فرخ سیر کے دربار میں میر منشی کے عہدے پر سرفراز تھے اور میر غلام علی کی طرز پر خطاطی کرتے تھے ۔

عالم گیری عہد کے مشہور ایرانی خوش نویس عبدالباقی حداد کے شاگرد محمد عارف تھے جو اپنے زمانے میں بہت نامور خوش نویس تھے ۔ خطِ ثلث اور خطِ نسخ میں ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے ایک خاص طرز یعنی اپنا ایک خاص معیار پیدا کیا تھا ۔ وہ بہادر شاہ اول کے دربار سے منسلک تھے اور ان کو 'یاقوت رقم' کا خطاب ملا تھا ۔ ان کے شاگردوں میں محمد افضل اور محمد عسکری ، مرزا زین العابدین اور میرزا افضل اللہ خاص کر بہت مشہور تھے اور ان کا بھتیجا عصمت اللہ ان کے اعلیٰ تلامذہ میں سے تھا اور عہد شجاع الدولہ کا ممتاز خطاط تھا ۔

حاجی نامدار مشہور خطاطوں میں سے تھے اور آقا عبدالرشید دیلمی کی روش پر لکھتے تھے ۔ جو کچھ لکھتے اس میں ایک خاص جاذبیت پیدا کرتے تھے ۔ یہ اورنگ زیب کے اواخر عہد میں بھی جانے پہچانے تھے لیکن فرخ سیر کے مشاہیر میں قرار پائے ۔ عہد محمد شاہ کے مشہور خطاط محمد حفیظ خان (م - ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ) تھے جو ہر طرز میں خطاطی کرتے تھے ، یعنی خط نسخ ، خط ثلث ، خط نستعلیق اور خط شکستہ خوب لکھتے تھے ۔ داروغۂ کتاب خانہ کے عہدے پر سرفراز تھے ۔ جب زمانۂ انقلاب آیا تو ملازمت ترک کر کے عبادت و توکل و قناعت پر تکیہ کر لیا ۔ ان کے خط میں ایک خاص شایستگی اور استادانہ شان تھی ۔ انہوں نے قرآن کریم کے چند نسخے طرزِ یاقوت پر مطلاً اور مذہب لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے ، وہ آخر عمر میں قرآن مجید ہی لکھا کرتے تھے ۔ ان کے تلامذہ اکثر فن خطاطی کے مشاہیر میں سے ہوئے ہیں ، مثلاً میر ابوالحسن عرف میر کلن ، قادر بخش ، محمد اسمعیل ، محمد تقی وغیرہ ۔ خاص طور پر نستعلیق شکستہ میں منشی لچھمن سنگھ ، لچھمی رام پنڈت ، لالہ سکھ رام منشی ان کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے ۔

اس زمانے میں شکستہ طرزِ خط کی طرف زیادہ رغبت نظر آتی ہے ۔ اس عہد میں فنون میں روایت سے کسی قدر آزادی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اور کسی قدر روایتی روش سے ہٹ کر تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ۔ اس ضمن میں ہم اس عہد کے ایک مشہور خطاط مولوی حیات علی کو بہت نمایاں پاتے ہیں ۔ ان کے متعلق مولانا غلام محمد

ہفت قلمی نے لکھا ہے :

''ذات ِ فیض آیاتش بحلیہ ٔ فیض و ہنر آراستہ و در علم ِ عربی و فارسی و ترکی بے عدیل و در نوشتن ِ خط شکستہ وغیرہ شہرۂ آفاق ۔''

انہوں نے خط میں کمال پیدا کرنے کے لئے متواتر سات سال مشق کی ، یہاں تک کہ وہ اپنے استاد سے بھی بہتر لکھنے لگے ۔ انہوں نے خط ِ شکستہ کو پریم ناتھ اور نستعلیق کو خلیفہ سلطان سے اخذ کیا تھا ۔ ان کی کوشش سے خط شکستہ مزید مجلاّ ہو گیا ، اور بعض استادان فن بھی اس کی بلندی تک نہیں پہنچتے ۔ پریم ناتھ کے متعلق لکھا ہے کہ سرکار شاہ عالم ثانی میں انہیں اقتدار حاصل تھا ۔ فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے ۔ تخلص ''آرام'' تھا ۔ ہمیشہ قناعت پسند رہے ۔

میر ابوالحسن عرف کلن ، جن کا ہم نے تلامذۂ حفیظ خاں میں اوپر ذکر کیا ہے ، عالی خاندان اور سادات ِ رضوی میں سے تھے ۔ خط نستعلیق آقا رشید دیلمی کی طرز پر لکھتے تھے ۔ ایک عرصے تک نواب عبدالاحد خاں کی رفاقت میں رہے ۔ اس کے بعد اکبر شاہ ثانی کی سرکار سے متوسّل ہوگئے ۔ آپ کے صاحبزادے میر محمد حسین بھی خوش نویس تھے اور باپ کے صحیح جانشین تھے ۔ یہ لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے میر منشی ہوگئے تھے ۔ ان کے معاصر غلام علی خاں مشہور خطّاط اکبر شاہ ثانی کے دربار میں خوش نویس تھے ۔ خوش گفتار اور علم ِ مجلسی کے ماہر ہونے کے علاوہ علم ِ موسیقی میں بھی دخل تھا ۔ انہوں نے 'شاہ عالم نامہ' بھی لکھا تھا ۔ ان کے ساتھ کاتب حافظ محمد علی بھی تھے جو خط نستعلیق اساتذہ کی قدیم روش پر لکھتے تھے ۔ میرزا جوان بخت بہادر کے خطاطی کے استاد تھے ۔ اسی نام کے دوسرے خطّاط محمد علی بن زرین قلم اپنے والد کے دوش بدوش خط نستعلیق ، خاص طور پر خط جلی لکھنےمیں باکمال تھے ۔ میرزا محمد علی حکاک مُہر کن اپنے فن میں بے نظیر تھے ۔ خوش وضع اور خوش کلام بزرگ تھے ۔ ان کے چہرے پر نور برستا تھا ۔ بعض اوقات مُہر کنی کے علاوہ قطعات جلی بھی لکھتے تھے ، جن میں وہ اکثر خط ہندی ، خط نسخ ، خط ریحان اور خط ثلث کو خوب برتتے تھے ۔

میرزا محمد علی بن میرزا خیر اللہ بن لطف اللہ مہندس بن احمد معمار شاہجہانی صاحبان ِ فن کے ایک مشہور خاندان سے تھے ۔ ان کا تعلق بقول غلام محمد ہفت قلمی فرمان نویس

میاں عبدالکریم قادری کے خاندان سے تھا اور یہ مسلّم الثبوت استادوں میں سے تھے - ان کے خفی و جلی خط میں جادو کا اثر تھا - انہوں نے آقا رشید دیلمی کی روش پر لکھنے میں کمال حاصل کیا تھا - مدتِ مدید تک عماد الملک کی سرکار سے وابستہ رہے ، اگرچہ بیچ میں کچھ عرصہ فرخ آباد میں بھی چلے گئے تھے - ان سے ہفت قلمی کی ملاقات لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ بہادر کے ہاں ہوئی - انہوں نے لکھا ہے کہ چونکہ مجھے اساتذہ کے خطوط سے عشق ہے ، اس لئے ان سے نیاز مندی ہے - مرزا کے تلامذہ ہی میں سے قاضی نعمت اللہ بھی تھے - ہفت قلمی نے لکھا ہے کہ ایک روز ان کے ہاں ان سے ملاقات ہو گئی تو دہلی کے احباب کا حال دریافت فرمایا اور بعد ازاں خطّاطی کے قدیم و جدید نمونے دکھائے اور کافی دیر تک یہ مجلس رہی - انہوں نے 'گلستان' کا ایک نسخہ وزیر علی خاں کے لئے مطلاّ اور مذہّب مرتّب کیا تھا ، جس کے دیکھنے سے غلام محمد ہفت قلمی بہت محظوظ ہوئے - انہوں نے لکھا ہے کہ 'گلستان' کے اس نسخے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خطّاطی کی پوری قوت اس کی کتاب میں صرف کر دی گئی ہے - حروف کی ترکیب ، دوائر کرسی اور حروف کی کشش ہر چیز میں کمال دکھایا تھا - میرزا اس زمانے میں وزیر علی خاں کے خط نستعلیق کے استاد تھے - ان کے شاگردوں میں قاضی نعمت اللہ ، خلیفہ بخش اللہ اور میر نثار علی اچھے خطّاط تھے - ان کے علاوہ ان کے تلامذہ میں مقبول نبی خاں کا نام بھی ملتا ہے جو مشہور شاعر انعام اللہ خاں کے بیٹے تھے -

غرض احمد معمار شاہجہانی کے خاندان کے افراد ہنرمندی میں یکتائے روزگار ہو گذرے ہیں - محمد افضل الحسینی خوش نویس مشہور خطاط تھے - ان کے خط میں اور جواہر رقم اور ہدایت اللہ زریں رقم کے خط میں خاصی مماثلت تھی - ابتداء میں اعتماد الدولہ قمرالدین کی سرکار میں ملازم تھے اور میر منّو کے استاد تھے - خفی و جلی خط میں قطعے لکھتے تھے - محمد افضل القریشی اکثر رشید دیلمی کی روش پر خطّاطی کرتے تھے - محمد افضل قادری لاہوری اپنے زمانے میں بڑے مشہور تھے - یہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں تھے اور 'آقای ثانی' کہلاتے تھے - ان کے معاصر محمد مقیم جامع مسجد دہلی میں رہتے تھے - عالم دین تھے اور میر عماد کے خط کی روش پر لکھتے تھے - میر محمد موسیٰ سید تھے اور سرہند سے تعلق رکھتے تھے - ان کو بھی دربارِ محمد شاہی سے توسّل تھا - میر محمد عطا حسین خان متخلّص بہ تحسین المخاطب بہ مرصع طغرا نویسی میں مشہور تھے -

ان کے والد محمد باقر شوق تھے جو بہت بڑے عالم تھے ۔ میر محمد عطا نے شجاع الدولہ کے لئے 'چہار درویش' کو ریختہ ہندی میں رنگین عبارت میں تصنیف کیا تھا ۔ یہ بھی اکثر نستعلیق طرز میں خطّاطی کرتے تھے ۔ شروع میں ابوالمنصور خان صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے ۔ اسی زمانے میں سید اعجاز رقم خان خطّاط تھے جو صاحبِ کمال اور روشن قلم تھے ۔

نور اللہ نام کے بے شمار کاتب ہو گذرے ہیں ۔ ان میں سے پہلے نور اللہ بن احمد معمار کا ذکر مقصود ہے ۔ دہلی کی شاہی مسجد کے ایوان کے طاقوں پر کتبات کے آخر میں نور اللہ احمد کے الفاظ ہیں ، جن سے مراد یہی نور اللہ بن احمد شاہجہانی ہیں ۔ ان کے بعد شیخ نور اللہ قابلِ ذکر ہیں جو عبدالرحیم کے شاگردوں میں سے تھے ۔ ان کے تلامذہ میں 'حافظ نور' بھی تھے ۔ حافظ نور اللہ صاحب کمال تھے ۔ غلام محمد ہفت قلمی ، غلام قادر روہیلہ کے ہنگامے کے بعد نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں ان سے مُلا تھا ۔ حافظ صاحب متواضع شخص تھے ۔ ان میں کسی قسم کا کوئی تکبر وغیرہ نہ تھا ۔ انہوں نے اپنے لکھے ہوئے نمونے بھی ہفت قلمی کو دکھائے ۔ اس وقت یہ وہاں ہفت بند مُلا محسن کاشی کی کتابت آصف الدولہ بہادر کی فرمائش پر رشید دیلمی کے لکھے ہوئے نمونے کی نقل کے طور پر کر رہے تھے ۔ ہفت قلمی کے ساتھ ملاقات میں دیر تک شاہجہان آباد کا ذکر رہا اور وہاں کے خوش نویسوں حفیظ خان ، میر کلن ، حکیم میر محمد حسین وغیرہ کا حال دریافت کرتے رہے ۔ حافظ نور اللہ نے ہفت قلمی سے خاص طور پر کہا کہ سنا ہے آپ آقا رشید کی خطّاطی کا نمونہ اپنے ہمراہ اس شہر میں لائے ہیں ۔ دوسری مرتبہ جب ہفت قلمی حافظ نور اللہ سے پھر ایک مرتبہ ملنے گئے تو اپنے ہمراہ نثر لقمان حکیم جس پر آقا رشید دیلمی کے دستخط تھے لے گئے ۔ حافظ صاحب اس کے خفی و جلی خط سے بہت محظوظ ہوئے اور دوپہر تک آقا رشید کے خط کا مطالعہ کرتے رہے ۔ پھر اپنے ہاں سے آقا رشید کا لکھا ہوا نمونہ دکھا کر اس کی سند پیش کی ۔ اس وقت ان کے تلامذہ لالہ سرب سنگھ اور میاں وجیہ اللہ بھی موجود تھے ۔ حافظ نور اللہ کے بھائی حافظ خورشید تھے اور وہ بھی ہفت قلمی سے لکھنؤ میں ملے تھے ۔ شیخ نور اللہ کے شاگرد خلیفہ سلطان تھے جو اکثر مسجد لطف اللہ خان صادق (دہلی) میں سکونت رکھتے تھے اور بعد میں علی گڑھ آ گئے تھے ۔ ان کا سلسلۂ تلمّذ شاہ اعزّ الدین اور محمد عابد تک پہنچتا ہے ۔ یہ سب کے سب خط نستعلیق رشید دیلمی کی روش پر لکھتے تھے ۔

اس عہد کے جن دوسرے مشہور خطّاطوں کا ذکر ہفت قلمی نے 'تذکرۂ خوش نویساں' میں کیا ہے ، ان کے اسماء یہ ہیں : (۱) حافظ عبدالعلی پسر محمد علی جو بنارس میں تھے - (۲) حافظ ابراہیم مشہور خطّاطوں کی اولاد سے تھے - ان کے فرزند (۳) حافظ بقاء اللہ قلعہ مبارک میں لکھتے تھے - (۴) مولوی محمد خلیل اور (۵) حکیم میر محمد حسین ، جو خط نسخ میں قاضی عصمت اللہ کے شاگرد تھے ، اکثر قرآن کریم لکھتے تھے - (۶) مولانا فخر الدین ؒ ولد مولانا نظام الحق ؒ ، چشتیہ خاندان کے دہلی میں بہت بڑے بزرگ تھے - ان کا انتقال ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں ہوا - (۷) میر رضوی بن صاحب میر ، یہ خطّاطی کے علاوہ مصوری بھی کرتے تھے - (۸) آغا میرزا جو سید امیر رضوی کے شاگرد تھے - (۹) میرزا عباد اللہ بیگ ، یہ بھی سید رضوی کے شاگرد تھے - (۱۰) مولائی صاحب ، جو مرشد زادہ میر معظم بخت بہادر کے استاد تھے - (۱۱) محمد جان بن میاں محمد عاشوری ، یہ میر کلن کے تلامذہ میں سے تھے - (۱۲) بدر الدین علی خان مخاطب بہ مرصّع رقم ، سب کی خطّاطی کرتے تھے - (۱۳) خواجہ غلام نقش بند خان خلف خواجہ یوسف اور (۱۴) میر سوز (محمد میر متخلص بہ سوز) - (۱۵) عماد الملک غازی الدین خان اور (۱۶) میرزا ارجمند -

یہاں ایک اہم امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے جو ہمیں اس فن کے مطالعے سے حاصل ہوا ہے - ہمارے اس معاشرے میں خاندانی طور پر علم و فن نے ترقی کی ہے جسے انگریزی میں ہم بلفظِ ''گلڈ'' تعبیر کر سکتے ہیں - خاندان کو کوئی نہ کوئی امتیاز حاصل ہوتا تھا اور وہ اپنی روایاتِ فن کو آگے بڑھاتا رہتا تھا - مثال کے طور پر مذکورہ خطّاطوں کے ذکر میں ملتا ہے کہ انہوں نے آقا عبدالرشید دیلمی کے نقش قدم پر یا روش پر خط نستعلیق لکھا ہے - اس طرح خود یہ خاندان اور یہ افراد خطّاطی کی روایت میں سند کا درجہ حاصل کر لیتے تھے - کفایت خان نے ، جس کا اصل نام جعفر خان تھا ، خط شکستہ کا احیا کیا اور اس کی روش یا طرز پر اس کے لڑکے عبداللہ نے اسے سنبھالا اور اسے درایت خان کا خطاب ملا - اسی نسبت سے کفایت خان کے خط کو ، جو خط شکستہ تھا ''کفایت خانی'' کہا گیا ہے - اسی طرح اس کے لڑکے درایت خان کے خط کو ''درایت خانی'' لکھا گیا ہے - کفایت خان کے فرزندوں محمد اکبر یا اکبر علی ، محمد موسیٰ اور میاں لعل خان نے اپنے دادا کے پیشۂ خطّاطی کی روایات کو برقرار رکھا اور آخر تک اس خاندان کے افراد اسی فن کتابت سے وابستہ رہے -

قرآن کریم اور خاص کر عربی رسم الخط لکھنے والوں کو اکثر خط نسخ لکھنے کی

وجہ سے نسّاخ کہا گیا ہے ۔ ایک رسالہ 'اصول النسخ' کے نام سے (۱۹۱۷ء/۱۳۳۶ء)
الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا ، جس کے مصنّف مولوی محمد حامد علی مرصّع رقم نساخ
ابن مولانا شیخ محمد علی محدّث لکھنوی ہیں ۔ اس کا تعارف نامہ محمد جان نے لکھا ہے ۔
مصنّف نے اس کے شروع میں سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھنؤ کے دورِ متاخرین
کے نسخ نگاروں کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں عہدِ اورنگ زیب عالم گیر میں محمد عارف
نے ، جو یاقوت رقم ثانی کے خطاب سے ممتاز تھے ، یاقوت مستعصمی کے طرز تحریر میں بہت
کچھ تغیر و تبدل کیا ۔ ان کے برادر زادے قاضی عصمت اللہ تھے ، جن کا لقب یاقوت ثالث
تھا ۔ ان سے استفادہ یا تلمّذ کرنے والے عبداللہ طبّاخ تھے ۔ ان کے بعد ان کے دو فرزند
علی اکبر اور علی امیر نے اپنے باپ سے نسخ کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ ان کے تلامذہ میں
شاہ غلام علی خلیفہ حضرت حاجی محمد تقی مہولوی باکمال نسخ نگار تھے ۔ ان کے بعد ان
کے دو فرزند میر اکبر علی اور میر کبیر علی مشہور ہوئے ۔ پھر ان کے بعد درویش مشرب
شاہ غلام علی نسخ نگار ہوئے ۔ ان کے معاصرین میں نواب احمد قلی خان عرف مرزائی
بڑے کامل استاد تھے ، جن کے بعد ان کے نواسے میر بندہ علی مرتعش اعلٰی درجے کے
نسّاخ تھے ۔ یہ ایک سو سال کی عمر میں ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں فوت ہوئے ۔ آغا محمد اور
محمد میرزا اور مولوی محمد مہدی ان کے شاگرد تھے ۔ مولوی محمد یحیٰی مہاجر مکّہ معظمہ
بھی مشہور نسّاخ تھے ۔ اسی زمانے میں مولوی زکریا اور حافظ خورشید برادر حافظ نور اللہ
کا فیضِ ہنر جاری تھا اور منشی عبدالحیٔ سندیلوی بھی مشہور تھے ۔ ان کے تلامذہ میں
سے میر طفیل احمد بلگرامی بھی اچھے نسخ نگار تھے ۔ میر اکبر علی سکنہ قصبہ کالپی
بھی تھے ۔ اس زمانے میں دہلی میں حافظ امیر الدین بادشاہ بہادر شاہ کے ہاں قرآن لکھتے
تھے جن کا انتقال ۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ میں ہوا ۔ ان کے علاوہ منشی محمد حفیظ ، مولوی محمد صالح
اور منشی محمد جعفر وغیرہ بھی قرآن لکھتے تھے ۔ اس کے مقابلے میں پنجاب میں ضلع گوجرانوالہ
کے مقام ایمن آباد ، سودھرہ ، کوٹ وارث اور سبزیال کے نسّاخ مشہور تھے ، جن میں سے
خاص کر عبدالرشید ، محمد حسین ، مولوی عبداللہ اور ان کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ
وغیرہ اس فن میں سبقت لے گئے تھے ۔ مولوی محمد دین بڑے مشہور کاتبِ قرآن تھے ۔ دہلی
میں خاص کر میر علی پنجہ کش اور ان کے تلامذہ منشی رحیم اللہ اور منشی رضی الدین
اس فن میں خاصے مشہور تھے ۔ غرض یہ حضرات قرآن کریم لکھنے اور عربی رسم الخط
لکھنے میں مشہور تھے ۔ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر بھی اس لحاظ سے

قابل ذکر ہیں ۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں اور کتبے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں ملتے ہیں ۔

اس مرحلے پر میر علی پنجہ کش کی ایک خاص ایجاد کا ذکر کر دینا ازبس ضروری ہے ۔ میر صاحب موصوف نے کتھے کی سیاہی ایجاد کی تھی جو ان سے سیکھ کر ان کے تلامذہ بھی استعمال میں لاتے تھے ۔ اس سیاہی کی وجہ سے تحریر میں آب و تاب پیدا ہو جاتی تھی اور حرف اُبھر آتے تھے ۔ تحریر کی یہ آب و تاب اور نمود میر پنجہ کش اور اُن کے تلامذہ کی خصوصیت ہے جو اُنیسویں صدی عیسوی سے پہلے کی تحریروں میں نہیں پائی جاتی ۔ ظاہر ہے اس نئی سیاہی کے استعمال کے باعث زمانے کا تعین بآسانی ہو سکتا ہے ۔ اہل ایران ابھی تک اس سیاہی سے ناآشنا ہیں ۔

اس متاخر زمانے میں روزمرہ کے معمولات میں خط کی ایک عام شکستہ شکل بن گئی تھی ۔ اس عہد میں فنونِ لطیفہ ، خاص طور پر خطّاطی نے پابندیوں سے ہٹ کر ذرا آزاد صورت اختیار کر لی تھی ۔ لوگ روایات کے زیادہ پابند نہیں رہے تھے ۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملے گا کہ اس عہد میں اکثر کتابیں خط شکستہ میں لکھی گئیں اور بعض اسی خط میں طبع بھی ہوئیں ۔ بہرحال خط نستعلیق اپنی صحیح صورت میں باقی نہیں رہا ۔ اس کا ایک محرّک بھی تھا یعنی یہ کہ خط دیوانی کی عام ضرورت نے اس عمل پر مجبور کیا تھا ۔ اس کے علاوہ بعض ہندو انشاء پردازوں نے بھی اس طرز کو رواج دیا تھا ۔ ان غیر مسلموں میں کایستھ لوگ زیادہ تھے ، چنانچہ ان میں لچھمی نرائن ، کنول داس ، کنور پریم کشور ، رائے آنند رام ، پنڈت راجہ امید سنگھ ، لچھمن سنگھ ، لالہ درگا داس ، درگا پرشاد ، رائے سدھ رائے ، شکر نوساری ، شکر ناتھ وغیرہ شامل ہیں ۔ لچھمی نرائن ۱۸۱۳ء/۱۲۲۸ھ میں فوت ہوئے ۔

اس مختصر کیفیت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ سے ہندوستان میں برٹش راج کا سکّہ جم گیا اور پریس بھی عام ہو گئے ، مگر خوش قسمتی سے فارسی ، جو صدیوں سے یہاں کی ملکی زبان تھی ، خاصی حد تک برقرار رہی ۔ اب کئی مقامی اور قدیم ہندی زبانیں بھی نشوونما پا رہی تھیں ، پریس کے اجراء نے کسی قدر قدیم قسم کے کاتبوں میں ایک تبدیلی ضرور پیدا کی اور اکثر کاتب جو واقعی بلند پایے کے تھے ، برابر کام کرتے رہے ۔ ہم ان میں سے دو کا ذکر کریں گے : دہلی میں میر پنجہ کش اور پنجاب میں

امام ویردی خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ایک کتابچہ بنام 'پنجۂ نگارین' لکھنؤ کے مطبع ابراہیم کی پچھلی صدی کی مطبوعات میں سے ہے ۔ افسوس اس پر تاریخ وغیرہ نہیں اور نہ کوئی رسمی مقدمہ یا دیباچہ ہے ، مگر اتفاق سے لکھنؤ سے ایک اور رسالہ 'اعجاز رقم' ۱۹۲۷ء میں دوبارہ شائع ہوا ۔ دراصل یہ دونوں رسالے منشی محمد شمس الدین اعجاز رقم کی خطّاطی کی مشقوں کا مجموعہ ہیں ۔ دوسرے رسالہ کے مقدمہ کے آخر میں یوں لکھا ہے :

''رقمہ شمس الدین اعجاز رقم لکھنوی بعمر ہشتاد سالگی ۱۹۱۵ء ۔''

غرض کہ اس مشہور کاتب نے فن کی بہت خدمت کی اور ظاہر ہے کہ وہ ۱۹۱۵ء تک زندہ تھے ، یعنی قریب ایک صدی فن کتابت کی خدمت کی ۔ اسی طرح دوسرے کاتب امام ویردی جو ایرانی تھے ، دہلی میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں نواب شیر افگن خان کے ہاں زندگی گذاری ۔ ان کو موسیقی سے بھی شغف تھا ، فارسی جلی خط میں خوب لکھتے تھے اور ان کے اکثر نمونے ہم نے دیکھے ہیں ۔ خاص کر نستعلیق طرز میں ہر سائز کے قطعات لکھتے تھے ۔ لاہور میں وہ نواب شیخ امام الدین خاں کے ہاں رہتے تھے ۔ انہوں نے ان کی مسجد کے کتبات بھی خوب لکھے ہیں ۔ ان کا انتقال لاہور میں ۱۸۸۳ء میں ہوا اور یہیں دفن ہوئے ۔ ان کے معاصرین میں ایک صاحب محمد بخش تھے جنھوں نے رنجیت سنگھ کے لئے سعدی کی 'کریما' کا ایک نسخہ مطلاّ اور مذہّب تیار کیا تھا اور ان کو انعام بھی ملا تھا ۔ یہ خطّاط عام طور پر ''الخط صیدٌ و المشق قیدٌ'' پر عمل کرتے تھے ۔

انگریز کے زمانے[1] میں عام طور پر اسکولوں میں خط کی تعلیم کے لئے خط نستعلیق میں لکھی ہوئی سلیٹ کاپیاں پہلی تین جماعتوں کے لئے مقرر تھیں اور خاص کر ہمارے زمانے میں لاہور میں ایک کاتب ''نتھو'' نامی تھے جو عام طور پر اسکولوں کی کتابیں گلاب سنگھ کے چھاپہ خانے میں ملازم کی حیثیت سے لکھتے تھے ۔ ہم نے ایسا نستعلیق لکھنے والا کم دیکھا ہے ۔ اسی زمانے میں یہاں اور لوگ بھی اعلٰی درجے کے کاتبِ قرآن تھے ۔ ان میں خاص کر کاتب محمد قاسم لدھیانوی کا ذکر لازمی ہے جنھوں نے ہمیشہ قرآن لکھا ۔ جب ۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ والیٔ افغانستان یہاں آئے تو ان کا لکھا ہوا قرآن مجید ان کی

(۱) چونکہ برطانوی عہد کے متعلق صرف چند ایک باتیں تھیں لہٰذا ہم نے انہیں جلد کے حصۂ اول میں شامل کر لیا ہے ۔ اسی طرح قیام پاکستان سے بعد کی باتیں بھی یہاں آ گئی ہیں ۔

خدمت میں پیش کیا گیا ۔ ان کے بے شمار تلامذہ تھے ، جن میں ان کے اپنے صاحبزادے شریف بھی شامل ہیں ۔ ہم نے شروع ہی سے دیکھا کہ لاہور میں خاص خاص اداروں کے اپنے اپنے کاتب ہوتے تھے ۔ ان میں منشی اسد اللہ باشندہ ضلع اناؤ (یوپی) تھے ۔ لاہور میں ۱۸۹۰ء میں آئے اور یہیں قریب نوے سال کی عمر میں انتقال کیا ۔ انہوں نے 'مرقع چغتائی' یعنی 'دیوان غالب' کا مصور ایڈیشن لکھا تھا ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ان کا سلسلۂ تلمذ میر عماد اور رشید دیلمی تک پہنچتا ہے ۔ ان کے صاحبزادے سمیع اللہ بھی خوب لکھتے تھے ۔ لاہور میں عبدالمجید پروین رقم نے بڑی شہرت حاصل کی ۔ علامہ اقبالؒ کی تمام کتابیں ان کی لکھی ہوئی شائع ہوئیں ۔ یہاں کے باشندوں میں حاجی دین محمد کاتب بہت مشہور ہوئے ہیں ۔ ۱۹ اگست ۱۹۷۱ء کو نوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ۔ انہوں نے فن کی خاطر بہت سفر کئے تھے اور اس قدر جلی حروف میں نستعلیق کے نمونے اور زیبائشی کارنامے یادگار چھوڑے ہیں کہ اپنی مثال آپ ہیں ۔ انہوں نے ایک مرتبہ دیوار پر انارکلی میں ''کرنال شاپ'' کا عنوان لکھا تھا جس میں حرف ''پ'' قریب ۳۵ فٹ لمبا تھا ۔ اس ضمن میں بعض دیگر کاتب مثلاً حافظ یوسف ، پیر عبدالحمید ، عبدالقدوس ، علی محمد ، منشی عبدالقادر ، جنڈیالہ والے مولوی شاہ دین اور ان اداروں میں دیگر کاتب بھی تھے ۔ تاج الدین زرّین رقم کی شہرت پورے ملک میں ہے ۔ لاہور میں باکمال کاتب مثلاً نفیس رقم ، الماس رقم ، صوفی خورشید ، اقبال بن پروین رقم اپنے ماحول میں اور عبدالواحد ہر فن مولا اپنے رنگ میں آج بھی موجود[1] ہیں ۔

جہاں تک خطّاطی کی پرانی روایات کا تعلق ہے ، میرے خیال میں اس وقت پاکستان ایک واحد ملک رہ گیا ہے جہاں اسے فروغ حاصل ہے اور یہ تمام یہاں کے روزناموں کی وجہ سے ہے جو اردو میں ہر روز ہزاروں کی تعداد میں چھپتے ہیں ۔ ان میں سے ہم جو اخبار بھی اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کاتب نے اس کے اندر تمام ظاہری جاہ و جلال اور فنّی حسن و کمال اپنے خط سے پیدا کیا ہے ۔ موقع کی ضرورت کے اعتبار سے خط کی کئی طرزوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور اختراعیں بھی کی جاتی ہیں ۔ ان اخباروں میں خاص کر عنوان اس عمدگی سے دلکش ہوتے ہیں کہ انسان ایک مرتبہ ضرور ان کا مطالعہ

---

(۱) لاہور میں کاتب صاحبان کے متعدد مراکز ہیں جہاں اساتذہ سے ان کے شاگرد فنِ خطّاطی باقاعدہ طور پر سیکھتے ہیں اور ان کی خصوصیّات اپنی تحریروں میں پیدا کرتے ہیں ۔

کرتا ہے۔ ہر اخبار کے اپنے خاص کاتب ہیں جو اس نہج پر اخباروں کے عنوان لکھتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کتابت کی دلکشی کا یہ ایک نیا دور ہے۔ پرانی قسم کی کتابت کا دوسرے اسلامی ممالک میں اب بہت کم رواج رہ گیا ہے۔

(ج) طب

یہ دور (۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء) برصغیر پاکستان و ہند میں طبِ مشرق کی تالیف و تصنیف کے لحاظ سے ایک اہم دور ہے۔ اس میں بیرون ملک (ایران، خراسان، عرب وغیرہ) سے یہاں آنے والے قابلِ ذکر اطباء میں سے آخری حکیم علوی خان تھے۔ ان کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اب خود برصغیر میں بکثرت اعاظمِ طب پیدا ہونے لگے۔ اس دور میں حکیم محمد اکبر ارزانی، حکیم محمد شریف خان، حکیم محمد حسین خان جیسے فضلا پیدا ہوئے، جن کی تالیفات و تصنیفات بعد میں طبی نصاب کا حصہ بنیں۔ اس دور میں عربی فارسی کے علاوہ اردو میں بھی طبی کتابیں لکھی جانے لگیں (اگرچہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں) اور طبِ جدید (ایلوپیتھی) کا برصغیر میں تعارف و نفوذ و اثر بڑھا۔ چنانچہ اس دور کی متعدّد تالیفات میں جدید طبی نظریات اور فرنگی مفردات کا بیان ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ متعدد تالیفات خالصۃً طبِ جدید پر ہیں۔ علاوہ بریں اسی دور کو یہ خصوصیّت بھی حاصل ہے کہ اس میں لکھی گئی متعدد کتابیں فوراً ہی طبع ہوگئیں کیونکہ اب برّصغیر میں چھاپہ خانہ آ چکا تھا۔ اس تمہید کے بعد ہم پہلے اس دور کے معروف طبیبوں اور ان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ **'حکیم محمد اکبر ارزانی (م - ۱۷۹۵ء/۱۲۱۰ھ)'**: عہد آخر کے عظیم طبیب اور مصنّف گذرے ہیں۔ ان کی تصانیف طبی نصابِ تعلیم میں داخل رہی ہیں۔ ان کے ترتیب دیے ہوئے متعدد مرکّب (مثلاً شربت ارزانی) اطبّائے مابعد کے مطبوں اور دواخانوں میں بکثرت مستعمل رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ 'طب اکبر' ان کی پہلی کتاب ہے جو معالجات کی معروف نصابی کتاب و 'شرح اسباب و علامات' مؤلفہ نجیب‌الدین سمرقندی کا فارسی ترجمہ ہے اور بکثرت لاہور، کانپور، لکھنؤ اور ایران سے طبع ہو چکی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی دوسری کتاب 'مفرّح القلوب' ہے جو ۱۷۱۱ء/۱۱۲۳ھ میں تالیف ہوئی۔ یہ 'قانونچہ' کے حصہ کلیات کی شرح ہے اور بارہا لکھنئو اور دیگر شہروں سے طبع ہوتی رہی ہے۔ حکیم صاحب کی کتاب 'میزان الطب' طبِ یونانی کی مقبول ترین کتاب رہی ہے اور بیسویں صدی عیسوی کی باقاعدہ طبی درسگاہوں کے قیام سے قبل تک

طبی نصاب کی پہلی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھی ۔ اس کی درجنوں اشاعتیں ہو چکی ہیں اور ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حکیم صاحب نے طب ہندی (ویدک) کے علم العلاج اور ترکیب الادویہ (فارمیسی) کو اپنی کتاب 'مجرّباتِ اکبری' میں فارسی میں منتقل کیا ۔ یہ کتاب ۱۸۹۳ء میں نولکشور پریس کانپور سے شائع ہوئی ۔ ارزانی کی دوسری مقبول ترین کتاب 'قرابا دین قادری' ہے جو ۱۷۱۷ء/۱۱۳۰ھ میں تالیف ہوئی اور بارہا طبع ہو چکی ہے ۔ یہ ان کی آخری کتاب ہے ۔

۲۔ 'میر محمد ہاشم بن عبدالهادی علوی شیرازی' (م ۔ ۱۷۴۷ء) : میر محمد ہاشم بن عبدالهادی علوی شیرازی ایران سے برّصغیر میں آنے والے اعاظم اطباء کے آخری فرد ہیں ۔ ۱۶۶۹ء میں شیراز میں ولادت ہوئی اور ۱۷۰۰ء میں یہاں وارد ہوئے ۔ عالمگیرؒ ، شاہ عالم بہادر شاہ اور محمد شاہ کے عہد میں مغل دربار میں معزّز و مقرّب رہے ۔ علوی خان اور معتمد الملک خطابات پائے ۔ تلامذہ و اخلاف کا ایک کثیر سلسلہ چھوڑا ۔ 'تحفۂ محمد شاہی' (خواص الجواہر) 'جامع الجوامع' ، 'عشرۂ کاملہ' ، 'خلاصۂ قوانین العلاج' ، 'تذکرة العلاج' (دو جلدیں) ، 'قرابا دین علوی خان' ، اور 'مطب علوی خان' مطبوعہ کانپور ۱۸۸۳ء آپ کی تصنیفات ہیں ۔ حکیم بہاء الدولہ بہادر نے آپ کے مجرّبات 'خلاصة التجارب' کے نام سے مرتّب کئے ، جو مطبع احمدی اور کان پور سے کئی بار چھپ چکے ہیں ۔

۳۔ 'حکیم محمد حسین خان' بن حکیم محمد ہادی خان عقیلی شیرازی : مرشد آباد (بنگال) کے ایک مؤقر و مقتدر خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور حکیم علوی خان کے خواہر زادہ تھے ۔ متعدد ضخیم اور محققانہ طبّی تصانیف ان سے یادگار ہیں جو اپنی ضخامت کی وجہ سے داخلِ نصاب تعلیم نہیں کی گئیں مگر تحقیق کے مواقع پر معتبر و معتمد مراجع و مآخذ کے طور پر مسلسل استعمال ہوتی رہیں اور تصانیفِ مابعد میں ان تمام کے بکثرت حوالے دیے جاتے ہیں ۔ کئی کتابوں کے اردو ترجمے بھی ہوچکے ہیں ۔ آپ نے مختصر رسایل کے علاوہ ایک مبسوط کتاب 'مجمع الجوامع' کے نام سے تالیف کی جو تمام فنونِ طب پر حاوی ہے اور بار بار طبع ہو چکی ہے ۔ 'مخزن الادویہ' اس کا پہلا حصہ ہے جو مفردات ادویہ کے افعال و خواص پر مشتمل ہے ۔ یہ علیحدہ مطبع احمدی دہلی سے ۱۸۵۱ء میں طبع ہوئی ۔ 'مجمع الجوامع' کا دوسرا حصہ 'قرابا دین کبیر' ہے ، جو ۱۷۷۱ء/۱۱۸۵ھ میں تالیف ہوا اور مرکبات پر مشتمل ہے ، تیسرا 'خلاصة الحکمت' ہے اور کلیات کے موضوع

ہو سکا۔ ۱۷۸۰ء/۱۱۹۵ھ میں مکمل ہوا۔ چوتھا حصہ عضو عضو کے امراضِ مختصہ سے تعلق رکھتا ہے اور پانچواں تمام امراض غیر مختصہ سے۔ آپ کے رسایل کے نام 'رسالہ جدری'، 'رسالہ ذات الجنب'، 'رسالہ ام الصبیان'، 'رسالہ عرق معدنی' اور 'رسالہ ختان' ہے۔ یہ سارے ۱۷۶۹ء/۱۱۸۳ میں تالیف ہوئے اور دہلی سے ۱۸۹۴ء/۱۳۱۲ھ میں طبع ہوئے۔

۴۔ 'حکیم محمد شریف خان بن اکمل خان دہلوی' (م - ۱۸۱۵ء) : قبل غدر کی ایک اہم طبّی شخصیت ہیں۔ آپ نامور مصنّف اور ایک وسیع و معروف طبّی خاندان کے بانی تھے۔ متعدد کتابیں مختلف زبانوں میں لکھیں۔ لیکن ہم صرف فارسی تصنیفات کا ذکر کریں گے۔ ادویۂ ہندیہ کے متعلق آپ کی تصنیف 'تالیف شریف' ہے جو مطبوعہ ہے۔ آپ نے معالجات کے متعلق 'راد غریب'، خواصِ جواہر کے بارے میں 'رسالۂ خواص الجواہر' اور مرکبات کے موضوع پر 'علاج الامراض' اور 'عجالۂ نافعہ' کتابیں لکھیں۔ یہ بھی طبع ہوچکی ہیں۔

۵۔ 'حکیم بایزید بن شاہ رحمت اللہ' : آپ حکیم قاضی ثناء اللہ بریلوی (شاگرد حکیم علوی خان) اور حکیم کبیر علی سنبھلوی کے شاگرد تھے۔ آخر عمر میں رام پور میں قیام رہا اور وہیں وفات پائی۔ حکیم بایزید کو اپنے دور کے اطباء میں سے یہ خصوصیت حاصل تھی کہ دست کاری و جرّاحی کے فن میں، جسے اطبّائے متاخرین نے ترک کر دیا تھا، کمال و مہارت پیدا کی اور جرّاحی کے کئی معرکہ آرا عملیے کئے۔ اس فن پر آپ نے 'جرائب النعمت' ۱۷۶۱ء/۱۱۷۵ھ میں اور 'ریاض العمل' ۱۷۸۸ء/۱۲۰۳ھ میں تالیف کیں۔ آپ کی مشہور کتابیں مرکبات کے متعلق 'قرابا دین نافع الامراض' (مؤلفہ ۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ)، معالجات کے متعلق 'خزینۃ العلاج' (مؤلفہ ۱۷۸۸ء/۱۲۰۳) اور، علم القابلہ پر رسالہ 'معالجات قابلہ' (مؤلفہ ۱۷۷۳ء/۱۱۸۷ھ) اور آتشک پر 'فوائد النعمت' مؤلفہ ۱۷۶۱ء/۱۱۷۵ھ) ہیں۔ 'فصول فیض اللہ خانی' (مؤلفہ ۱۷۸۷ء/۱۲۰۲) بھی آپ کی تالیف ہے۔

مختلف درباروں میں طب

اس عہد میں مختلف درباروں میں بلند پایہ اطباء رہتے تھے۔ انہوں نے بھی اعلیٰ درجے کی طبی تالیفات چھوڑی ہیں۔ جن کا ذکر اختصار سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ 'دربار مغلیہ' : حکیم محمد رضی الدین بن کاشف الدین نے ۱۷۰۷ء/۱۱۱۹ھ میں

سمیات کے فوائد اور تریاقات کی دریافت کی تاریخ ، طریقہاے استعمال اور ان کی اقسام پر ایک رسالہ 'عجائب الاتفاق در شناختن تریاق' شہزادہ محمد اعظم شاہ بن عالمگیر کے لئے لکھا - حکیم راضی خان بن قطب الدین خان نے بہادر شاہ اول کے لئے معالجات کے موضوع پر ایک کتاب بعنوان 'فوائد معدہ و امراض معدہ' لکھی - حکیم علوی خان نے محمد شاہ کے نام اپنی تصنیف 'تحفۂ محمد شاہی' معنون کی ، جس کا ذکر ہوچکا ہے - شاہ عالم ثانی کے نام حکیم مظفر نے اپنی کتاب 'خلاصۃ العیش عالم شاہی' معنون کی جو جنسیات کے موضوع پر ہے -

۲- **'دربار دولت خداداد میسور'** : 'بحرالمنافع' از مولود محمد اور 'تحفۂ مہدی' از مرزا محمد نصیر افشار ترک علی الترتیب ۱۷۹۴ء اور ۱۷۹۹ء میں تالیف ہو کر ٹیپو سلطان شہید کے نام معنون ہوئیں - سلطانِ شہید کی بالغ نظری کے باعث مغربی طب کی کئی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا - ایک ولیم کاک برن کی کتاب کا ترجمہ 'در بیان امراض پیچش' ہے جس کا ذکر ایتھے اور اسٹیوارٹ نے اپنی اپنی فہرستوں میں کیا ہے - اسی طرح جان کومین سن کی کتاب کا ترجمہ 'قانون در علم طب' کے نام سے ہوا - اس میں ادویہ کے افعال و خواص ، آلاتِ دوا سازی ، نباتی و معدنی ادویہ کی ترکیب ، تیاری اور جوہر نکالنے کا بیان ہے - علم الادویہ کے متعلق انگریزی اور فرانسیسی کتابوں سے 'مفردات در علم طب' ترجمہ ہوئی - اس میں نباتات ، معدنیات اور حیوانات کا مفصل بیان ہے اور ان کی تصاویر بھی دی گئی ہیں - مقامی لغات کے ساتھ ساتھ دواؤں کے انگریزی اور فرانسیسی مترادفات بھی دیے گئے ہیں - برق و طبی تجربات پر ایک اور انگریزی رسالہ کا بھی ترجمہ ہوا - یہ تینوں کتابیں بھی سلطان ٹیپو شہید کے نام معنون ہوئیں - مترجمین کے نام نامعلوم ہیں - مذکورہ بالا مرزا محمد نصیر افشار ترک نے ڈاکٹر پولاک کے کلمات سے 'نسخۂ جراحی' بھی مرتب کیا جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے -

۳- **'دربارِ آصفیہ حیدرآباد دکن'** : صرف کتابوں اور مصنفین کا نام دیا جاتا ہے - ترجمہ 'پالکا ہو یکالی' (ویدک) از دیاناتھ ، 'ترکیب الادویہ' ، از مہدی حسن بن محمود عالم بشارت خانی - 'اسرار مسیحا' ، (مفردات) از حکیم مسیح الزمان خان - 'خواص الجواہر' ، از مہدی علی خاں - 'رسالۂ وبا' (امراض وبائی) از حاجی محمد علی خاں خراسانی - 'قوت لایموت' (اغذیہ)

و 'شفائیہ' (حمیات) و 'علاج الاطفال' و 'میزان المزاج' (ادویہ) و 'رسالۂ استعمال چوب چینی' از سید افضل علی خاں شفائی خاں ۔ 'کتاب الفوائد' (فنونِ طب) از میر قاسم علی بن سید علی ۔ 'مجربات جمالی' (معالجات) از حکیم جمال الدین والا جاہی ۔ 'مفاد الرجال'، 'مفاد النساء' (معالجات) از حکیم محمد حسن بن محمد عالم ۔ 'خلاصۃ العیش عالم شاہی' از غلام علی خاں ۔ عروس الدولہ، 'دستور عالم سکندر جاہی' از صفدر علی خاں ۔

۴۔ **'دربار نواب ارکاٹ'** : 'طب اعظم' از سید محمد ابن سید شاہ اعظم الحسنی مؤلفہ ۱۸۰۳ء/۱۲۲۰ھ جو نواب الف خاں والیٔ ارکاٹ کے نام معنون ہوئی ۔ اس سے پہلے حکیم محمد اسمٰعیل خاں بن بقا اول نے مرکبات کے متعلق 'مجموعۂ بقائی' ۱۷۴۳ء/۱۱۵۶ھ میں تالیف کی ۔ حکیم محمد اسمعیل خاں کے بیٹے حکیم اسکندر نے 'قانون احداث سکندری' (کلیات) 'قرابا دین سکندری' (مرکبات) اور 'مفردات اسکندری' (مفردات) نواب ارکاٹ کے نام پر تالیف کیں ۔

مدراس کی طرف مزید کتب طبی بھی تصنیف ہوئیں ۔ مثلاً حکیم احمد اللہ مدراسی نے 'تحقیق النبض' 'رسالۂ چوب چینی'، 'سُلّم الدرجات' (۱۸۰۳ء)، 'شفاء المجدور' اور 'تحقیق البرہان' لکھیں ۔ انہوں نے ابن سینا کی 'الادویۃ القلبیہ' کا ترجمہ بھی 'تفریح القلوب' کے نام سے کیا ۔

۵۔ **'دربار تالپور سندھ'** : 'طب احمدی' از فیض بن بندہ علی ۔ 'طب عباسی' از مرزا عباس علی ۔ 'طب ولی' از نواب ولی محمد خاں لغاری (م ۔ ۱۸۳۲ء) ۔ 'رسالۂ دلائل البول'، 'رسالہ در نبض' ہر دو منظوم و 'دافع الامراض'، از حکیم حبیب اللہ بھکری ۔ 'نسیم الصبا لاصلاح الوباء' از حکیم میر محمد وفا لکوی ۔ 'شفاء السقیم' از حکیم محمد تقی تتوی ۔ 'طب خسروی' از حکیم مرزا خسرو بیگ گرجی ۔

سندھ کی طرف اور بھی طبی کتب تالیف ہوئیں ۔ مثلاً 'طب داؤدی' از داؤد خاں بن خدا یار خاں والیٔ سندھ (م ۔ ۱۷۱۸ء/۱۱۳۱ھ) ۔ ایک طبّی کتاب از ہندو مصاحب داؤد خاں ۔ 'خلاصۂ ذخیرۂ خوارزم شاہی' از میر اسد اللہ شاہ ساق بھکری (م ۔ ۱۷۶۷ء/ ۱۱۸۱ھ) ۔ 'جامع المنافع' از حکیم سید عبدالکریم رضوی بھکری ۔ 'گنجینۂ حیدری' از حکیم میاں محمد بجلر سندھی ۔ طب مراد از حکیم محمد مراد علی خاں والیٔ خیر پور ۔ 'مجرّب الشفاء'

(معالجات) از سید احمد بن محمد ملتانی 'مجمع الفوائد' (معالجات) از محمد امین بن ملا سومرو ساکن شکار پور سندھ مؤلفہ ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ -

۶- 'دربار نواب فرخ آباد' : حکیم اصغر حسین فرخ آبادی نے ۱۸۴۳ء میں 'رسالہ سوال و جواب طبیہ' اور 'رسالہ ما بال در حال طب' ۱۸۵۱ء میں 'رسالہ فی الهیضہ' اور 'قوانین الشفائیہ' اس کے بعد ۱۵۸۶ء میں 'تریاق اکبر' تالیف کی - علاوہ بریں حکیم میر احسان علی فیض آبادی نے حمیات پر 'فوائد منتظمہ' لکھی -

۷- 'دربار شاہان اودھ' : حکیم میر شاہ مرزا خان مولوی رضوی نے لغات طبی 'فواکہ شاہی' کے عنوان سے ۱۸۲۷ء/۱۲۴۴ھ میں تالیف کر کے نصیر الدین حیدر کے نام معنون کی -

طب پر مزید کتب

'صحت الامراض' (۱۷۲۶ء) از پیر محمد گجراتی - 'تعلیم العلاج' (۱۷۲۴ء) از ابوظفر حسام - 'تحفۃ المسیحا' (۱۷۴۹ء) از دیکھنی - 'جامع الفاظ عیسوی' (۱۸۰۶ء از داختر پوجہت - 'رسالہ چیچک' از ملا فیروز (مصنف دساتیر) - 'مجربات مظهریہ' از ابوالبقا مظہر الدین - 'لغات الادویہ' از عبدالغفور ہمایون - 'آداب النشاط و آداب الانبساط'، جنسیات پر (۱۶۳۳ء) از ابن رمضان بیگ احمد مازندرانی - 'اقسام الامراض' معالجات پر ، از محمد شمس الدین بن حکیم حسام الدین - 'تبصرۃ الاطباء' (۱۸۴۷ء) از حکیم محمد علی - 'تجربات حیدری' (۱۷۸۷ء) از خواجہ حیدر حسین خان - 'تلخیص المجرّبات' (۱۸۵۶ء) از حکیم شیخ احمد - 'تنبیہ المجانین' از لعل محمد - 'ترجمہ موجز' فن اول از خدا یاور خان - ترجمۂ موجز' (۱۸۲۴) از محمد فضل الدین - تکملۂ ہندی (ویدک) و 'تکملۂ یونانی' (مفردات) از شاہ اہل اللہ دہلوی (م - ۱۷۷۳ء/۱۱۸۷ھ) - 'تلخیص العقاقیر' (مرکبات) از حکیم محمود علی خان - 'جامع اصول طبّیہ' (معالجات) از محمد صدیق اللہ - 'جزئیات الرموز' ، (۱۷۸۱ء) از حکیم شاہ محمد - 'حل المشکلات' (لغات طبّی) از سید شریف الحسینی - 'خلاصۃ الاطباء' (معالجات) از حکیم محمد ناصر انصاری - 'خلاصہ مفید الانسان' (طب کیمیا) از عبدالکریم بن اسحاق احمد مغبری - 'خواص الادویہ' (مغردات) از محمد افضل - 'دوا خانہ' (لغات طبی - ۱۷۴۸) از عبداللہ محمد فقیر - 'رسالہ آتشک' (امراض متعدیہ) از محب اللہ

ابن محمد جیلانی - 'رسالہ در سموم' (۱۸۲۶ء) از محمد شریف بن محمد صادق - 'رسالہ قارورہ' (منظوم) از شیخ پیر - 'سراج الطب' (معالجات - ۱۸۵۲ء) از اشرف علی بن رجب علی - 'سرّالعلاج' (حفظان صحت و تشخیص - ۱۶۲۸ء) از حکیم بدایت اللہ - 'شفاء الاطفال' (۱۸۴۸ء) از حکیم میر احسان علی - 'شفاء الاطفال' (۱۸۶۳ء) از محمد صادق بن محمد کاظم رضوی - 'شرفیہ' (حفظ صحت) از محمد مسیح بن محمد امین طباطبا - 'طب حسینی' (۱۸۴۲ء از حکیم اشرف علی بن رجب علی - 'طب احمدی' (معالجات - ۱۸۳۹ء) از خواجہ احمد علی خان - 'طب سعیدی' (مفردات - ۱۸۳۳ء) از احمد خان فاخر رامپوری - 'طب فاروق' (۱۱۶۶ء) از محمد فاروق - 'طب گوپال شاہی' (معالجات و کیمیا) از گوپال - 'فوائد الاطباء (معالجات - ۱۸۰۴ء) از غوثی غلام میر حسن - 'فوائد شفائی' از حکیم محمد ارشد شفائی (م - ۱۸۱۴ء) - 'فوائد ہمایوں' (معالجات - ۱۸۳۰ء) حکیم میر جان بن حکیم شیخ اعظم - 'قرابا دین' از حکیم ذکاء اللہ بن اسحاق بن اسمٰعیل خان - 'قواعد علوی خان' (معالجات) از حکیم محمد صادق و حکیم میر زین العابدین - 'کشائش حکمت' (۱۸۶۰ء) از محمد یار ولد علی خان - 'کیمیا با سلیقا' (طب کیمیائی - ۱۸۸۷ء) - 'مجربات بو علی خان' (معالجات - ۱۸۰۴ء) از حکیم بو علی خان - 'مجربات' از عبدالحق الہ آبادی - 'مجربات' از میر ضامن علی - 'مجموعہ اکبری' (معالجات - ۱۷۰۹ء) از میر علی اکبر بن گدا علی - 'مخزن اسرار اطباء' دو جلد (مفردات - ۱۷۶۰ء) و 'معدن تجربات' (۱۷۵۹ء) از محمد مہدی بن محمد جعفر اکبر آبادی - 'مطب' (معالجات) از حکیم امام الدین - 'مفردات ہندی' (۱۸۰۵ء) از محمد شرف الدین - 'مقراض الامراض' (معالجات - ۱۸۵۱ء) از شیخ احمد حسرت بن شیخ عبداللہ - 'منتخب الادویہ' از عباد اللہ خیرآبادی - 'منتخب الادویہ' (۱۸۴۸ء) از حکیم محمد جعفر بن سید محمد - 'منتخب الطب' (کلیات و معالجات) از شیخ سراج الدین - 'ترجمہ قانونچہ' از عبدالمجید - لوامع البشریہ' (۱۸۴۲ء) از حسین بن عبداللہ الحسینی مشہور بہ شیر کاظی - 'منتخب الادویہ' از حکیم صادق حسین خان معروف بہ مناطبیب پائیگاہ - 'مفردات باہیہ' از حکیم فرید الدین عرف حکیم کاو مراد آبادی - 'مناظر الابدال' (۱۸۵۶ء) از حکیم محمد یحیٰی ابن قاضی القضاۃ محمد مصطفیٰ علی خان - 'نہج الحذاقت' (۱۸۴۶ء) از حکیم قدرت احمد بن حافظ عنایت احمد -

☆ ☆ ☆

فرہنگ و فہارس

'فرہنگ ادویہ' - 'فہرست اختیات بدیعی' - 'فہرست کتاب دیسقوریدوس' - ہر سہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہیں -

کتابیات

۱- "نوادر" مرتبہ احسن شیر ۱۹۶۱ء پٹنہ -

۲- "لباب المعارف العلمیہ فی مکتبۃ دارالعلوم الاسلامیہ" مولوی عبدالرحیم ۱۹۱۸ء آگرہ -

۳- "فہرست کتب عربی فارسی و اُردو مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی" ۱۳۳۴ھ - حیدر آباد دکن -

۴- "ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی اورینٹل لائبریری آف دی لیٹ ٹیپو سلطان آف میسور" چارلس ، اسٹیوارٹ ، ۱۸۰۹ء لندن -

۵- "کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان دی برٹش میوزیم" جلد دوم چارلس ریو ۱۸۸۱ء لندن -

۶- "ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی پرشین مینو سکرپٹس ان دی لائبریری آف انڈیا آفس" از ہرمن ایتھے ، ۱۹۰۳ء ، آکسفورڈ -

۷- "ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان دی کرزن کلیکشن آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال - از ایوانو (Ivano) ۱۹۲۶ء کلکتہ" -

۸- ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان دی کلیکشن آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" فرسٹ - سپلی منٹ . . . از ڈبلیو اوینو ۱۹۲۷ء کلکتہ -

۹- "ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان دی کلیکشن آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" سیکنڈ سپلی منٹ ڈبلیو اوینو ۱۹۲۸ء کلکتہ -

۱۰- "کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس اینڈ بکس ان دی لائبریری آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" - مرتبہ مولوی اشرف علی ۱۸۹۰ء کلکتہ -

۱۱- "نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع و النواظر" - عبدالحئی حسنی - جلد سادس - حیدر آباد -

۱۲- "تذکرہ کاملان رام پور" احمد علی خان شوق رام پوری -

۱۳- "طب اسلامی" از ابن مظہر معین الدین رہبر فاروق - ۱۳۵۶ء حیدر آباد دکن -

۱۴- "فزیشن آتھرس آف گریکو عرب میڈیسن ان انڈیا" ، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ ، نئی دہلی -

۱۵- "سندھ میں طب یونانی" (بزبان سندھی) از پیر حسام الدین راشدی مطبوعہ رسالہ مہران سالگرہ نمبر ، ۱۹۵۷ء -

آٹھواں باب

دیگر علوم و فنون

کسی ملک و ملت کی تہذیب و معاشرت کے معیار اور وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے ان علوم و فنون کے مطالعہ سے بہت مدد ملتی ہے جو مختلف ادوار میں اس قوم کے ہاں رائج رہے ہوں۔

ان علوم و فنون پر آج جو آثار ہمارے سامنے ہیں ان کے پیش نظر کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر پاکستان و ہند میں ان علوم و فنون کی ترویج میں زیادہ حصہ یہاں کے مسلمان علماء و فضلاء ہی کا ہے۔ ان آثار کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہاں کا معاشرہ ایسے کسی علم یا فن کو قبول نہیں کرتا تھا جو ان کے مذہب و عقاید کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو۔ خصوصاً مسلمان ایسے کسی علم یا فن کو نہیں اپناتے تھے جس کا تعلق تہذیب حجازی سے نہ ہو۔ چنانچہ علم نجوم پر قلم اٹھاتے وقت اس حقیقت کو پہلے واضح کر دیتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے علم نجوم کی تعلیم سب سے پہلے حضرت دانیال پیغمبر کو دی اور پھر دنیا کے شرفاء اور نجباء نے اس علم کو اپنایا۔ اسی طرح طب کی کتاب لکھتے وقت مباحث کو ایسی حدیثوں سے شروع کرتے تھے جن میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کی اہمیت بھی بیان فرمائی ہے۔ علم تعبیر خواب پر کتاب لکھتے وقت پہلے اس کی وضاحت کر دیتے تھے کہ علم تعبیر میں کمال خدائے بزرگ و برتر نے سب سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا اور پھر حضور صلعم کو اس علم میں مہارت بخشی گئی۔ تیر اندازی پر رسالے لکھتے تو قرآنی آیات کے حوالے سے حضرت داؤد علیہ السلام کی تیر اندازی میں مہارت کا ذکر کرتے اور ایسی احادیث سے شروع کرتے جن میں کہا گیا ہے کہ میری امت اور اپنی اولادوں کو فن تیر اندازی اور فنون سپہ گری سکھاؤ۔ مقصد یہ تھا کہ جو علوم خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو سکھائے ان کے جاننے والوں کی شرافت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اور ان کو سیکھنا کوئی معیوب بات نہیں۔ غرض کم ہی کوئی علم ایسا ہوگا جس میں لکھنے والے اپنی کتابوں کا رشتہ تہذیب حجازی اور اپنے سے پہلے کے آثار سے نہ جوڑتے ہوں۔ تہذیب حجازی کے ساتھ پیوستہ رہنے کی اس نمایاں خصوصیت کے تسلسل کو ہم قدیم ادوار سے لے کر موجودہ زمانے تک کے آثار میں برابر دیکھتے ہیں۔

زیر نظر مقالے میں ان دوسرے علم و فنون، مثلاً حساب، ہیئت، نجوم، تیر اندازی، فلاحت و باغبانی، جواہر شناسی اور فن شکار وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے جن پر عالمگیر کے بعد یعنی اٹھارھویں، انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی بمطابق بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں کتابیں لکھی گئیں۔

مذکورہ علم و فنون کے اعتبار سے بھی یہ دور پچھلے ادوار کی طرح خاصی اہمیت کا حامل ہے اور اس دور میں بھی سرزمین پاکستان و ہند کے زیادہ تر مسلمان دانشمندوں نے ان علوم سے متعلق بہت سارے بلند پایہ اور گراں قدر آثار یادگار چھوڑے ہیں ۔

اگرچہ مغلیہ سلطنت کو زوال آنے سے جس طرح مرکزی ہند یعنی نواحِ دہلی میں اسلامی تہذیب اور امراء سے متعلقہ علوم و فنون کا چراغ آہستہ آہستہ گل ہوتا گیا اسی طرح فارسی کی سرپرستی کرنے والا بھی کوئی نہ رہا لیکن آس پاس کی ریاستوں اور دور و نزدیک کے چھوٹے درباروں میں ان علوم کی ویسے ہی سرپرستی ہوتی رہی ۔ چنانچہ ریاست میسور ، رامپور ، بنگال ، دکنی دربار ، ٹونک ، سندھ اور پنجاب کے بعض علاقوں میں فارسی کے شیدائی ان علوم پر فارسی ہی میں کتابیں لکھتے رہے ، بلکہ بعض امراء نے تو خود بھی بعض علوم پر کتابیں تصنیف کیں ۔ اس دور میں علمِ حساب ، ہیئت و نجوم ، سیاق و ہندسہ ، رمل و نجوم اور زیج و تقویم پر زیادہ کتابیں لکھی گئیں ۔

اب ہم ان ادوار میں مذکورہ علوم و فنون پر لکھی گئی کتابوں کا موضوع وار ذکر کرتے ہیں ۔

علمِ حساب

اس علم پر اگرچہ پچھلے ادوار میں بھی مسلمانوں نے بہت کام کیا تھا لیکن طوسی کی 'جامع الحساب' ، بہاء الدین عاملی کی عربی کتاب 'خلاصۃ الحساب' اور اس کے ترجمے اور شرحیں ، فیضی کی 'لیلاوتی' ، عطا اللہ رشیدی کی 'خزینۃ الاعداد' اور لطف اللہ مہندس کی 'منتخب خلاصۃ الحساب' ہی کو زیادہ شہرت حاصل تھی ۔ عالمگیر کے بعد سے جنگ آزادی تک کے دور میں برِ صغیر کے مسلمانوں نے جس قدر کام علمِ حساب پر کیا ہے دوسرے کسی علم یا فن پر نہیں کیا ، بلکہ پچھلے ادوار میں بھی علمِ حساب پر اتنا کام کبھی نہیں ہوا ۔ ہماری اطلاع کے مطابق اس دور میں علمِ حساب پر کتابوں کی تعداد ۳۳ کے قریب ہے اور ان میں 'غایۃ جہد الحساب' ، 'دیوان پسند' ، 'تحریر الصدر' ، 'نقود الحساب' ، 'زبدۃ الحساب' ، 'بدیع الحساب' ، 'مرآۃ الحساب' ، 'شرح خلاصۃ الحساب' ، 'دستور الحساب' وغیرہ زیادہ اہم ہیں ۔ اس دور میں علمِ حساب پر حسب ذیل کتابیں لکھی گئیں :

۱۔ 'رسالۂ ارتفاع الجبال' ۔ علمِ حساب میں یہ رسالہ محمد زمان فیاض بن محمد صادق انبالوی دہلوی کی تصنیف ہے ، جسے انہوں نے ۱۷۰۲ء/۱۱۱۴ھ میں لکھا ۔ (بانکی پور ۱۱ : ۵۵ ، آصفیہ ۱ : ۸۰) ۔

۲۔ 'غایۂ جہدالحساب' ۔ علمِ حساب میں محمد زمان بن محمد صادق انبالوی دہلی کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ۱۷۱۸ء/۱۱۳۰ھ میں لکھا ۔ یہ کتاب در اصل ''خلاصہ الحساب'' از بہاء الدین عاملی متوفی ۱۶۲۱ء/۱۰۳۱ کی شرح ہے (بانکی پور ۱۱ : ۵۵) ۔

۳۔ 'تحریر الصدر' ۔ علمِ حساب پر یہ رسالہ صدر الدین بن زبردست خان (زندہ در ۱۷۲۲ء/ ۱۱۳۵ھ) کی تصنیف ہے اور در اصل بہاء الدین عاملی کی عربی کتاب 'خلاصۃ الحساب' کی فارسی شرح ہے ۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۳۴ء) ۔

۴۔ 'اربعین یا چہل سوال' ۔ کسی گمنام مصنف کے علم حساب کے متعلق چالیس سوالوں کا جواب ۔ اس رسالے کا ایک نسخہ ۱۷۵۲ء/۱۱۶۶ھ میں 'آستانِ قدس' مشہد کی لائبریری کو پیش کیا گیا تھا ۔ (مشہد ۳ : ۹) ۔

۵۔ 'خزینۃ الاعداد' ۔ علمِ ریاضی (حساب ، الجبرا اور جیومیٹری) پر یہ رسالہ عطاء اللہ کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ۱۷۶۴ء/۱۱۸۷ھ میں ترتیب دیا ۔ یہ مصنف عطاء اللہ رشیدی بن استاد احمد معمار کے علاوہ کوئی اور شخص ہے (بمبئی یونیورسٹی ۲۳۹ ، سٹوری ۲ : ۱۷) ۔

۶۔ 'دستور حساب' ۔ فن حساب پر لالہ اندرمن[1] حصاری کی تصنیف ہے ۔ اس نے یہ رسالہ دہلی میں اپنے ایک عارضی قیام کے دوران ۱۷۶۷ء/۱۱۸۰ھ میں لکھا ۔ اس میں ۵ مقالے اور ایک خاتمہ ہے ۔ ہر مقالے میں کئی کئی باب اور فصلیں ہیں (بانکی پور ۱۱ : ۵۶) ۔

۷۔ 'کفایت الجبر' ۔ علم حساب میں یہ رسالہ محمد صلاح الدین بن دیانت خان جہاندار شاہی کی تصنیف ہے جو بگمان غالب اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں لکھا گیا ۔ اس میں ایک مقدمہ ، تیرہ باب اور ایک خاتمہ ہے (بانکی پور ۱۱ : ۵۷) ۔

۸۔ 'مجمع الحساب' از لالہ گھاسی رام دہلوی ، مؤلفہ ۱۷۸۸ء/۱۲۰۲ھ ۔ اس کے نو باب ہیں ۔ ۱۸۴۹ء/۱۲۶۶ھ کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ۔ (میگزین مئی ۱۹۳۴ء) ۔

۹۔ 'رسالہ' نور الحساب' ۔ یہ رسالہ سید نور الاصفیاء اورنگ آبادی متوفی ۱۸۳۹ء/۱۲۵۵ھ کی یادگار ہے ۔ قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۰۸ء/۱۲۲۳ھ کتب خانہ' آصفیہ کی فہرست میں درج ہے ۔ (آصفیہ ۱ : ۸۱۲) ۔

۱۰۔ 'نور المحاسبین' ۔ علمِ حساب پر یہ بھی سید نور الاصفیاء اورنگ آبادی کی تصنیف ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ' آصفیہ کی فہرست میں مذکور ہے ۔ (آصفیہ ۱ : ۸۲۰) ۔

۱۱۔ 'وصالیہ' ۔ علم ریاضی پر حمید الوصالی کی تصنیف ہے ۔ ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۱۸ء/۱۲۳۳ھ کا ذکر کتب خانہ' آصفیہ کی فہرست (۱ : ۸۲۰) میں ملتا ہے ۔

۱۲۔ 'ترجمہ' خلاصۃ الحساب' ۔ بہاء الدین عاملی کی عربی کتاب کا ترجمہ ، جو مولوی روشن علی جونپوری (متوفی ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ) کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے ۔ پنجاب یونیورسٹی ، علیگڑھ ، آصفیہ اور بوہار وغیرہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں ۔ اس میں ایک مقدمہ اور دس ابواب ہیں ۔ (بوہار : ۱ : ۱۷۶ ، میگزین مئی ۱۹۳۴ء ، ص ۱۰۰ ، سٹوری ۲ : ۱۳۲) ۔

۱۳۔ 'نقود الحساب' ۔ علم حساب پر مولوی ابو علی محمد ارتضا علی خان بہادر خوشنود گوپاموی

---

(۱) دو ہندو مصنفین کی مندرجہ ذیل دو تألیفات بھی علم حساب پر ہیں :
۱۔ حساب نامہ از انند کاہن بن ہیمراج گوالیاری (اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۴ء) ۔
۲۔ دیوان پسند از لالہ چھتر مل ولد پیران چند منشی (ایوانو ۷۵۶ ، آصفیہ ۱ : ۸۱۰)

متوفی ۱۸۳۵/۱۲۵۱ھ کی تصنیف ، جسے انہوں نے ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ میں مکمل کیا ۔ اس میں ایک مقدمہ ، سات ابواب اور ایک خاتمہ ہے ۔ یہ رسالہ ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ میں شائع ہوا (ایوانو ، ضمیمہ ۱ : ۱۰۶ ، آصفیہ ۱ : ۸۲۰) ۔

۱۴۔ 'دستور الحساب' ۔ علم حساب پر حکیم سراج الدین کی تصنیف ۔ سال تکمیل ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ ۔ قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (۱ : ۸۱۰) میں موجود ہے ۔

۱۵۔ 'شرح خلاصة الحساب' ۔ علم حساب پر بہاء الدین عاملی کی عربی کتاب پر ترجمہ و تشریح از مرزا محمد بیگ ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے (آصفیہ ۱ : ۸۱۶ ، سٹوری ۲ : ۱۲) ۔

۱۶۔ 'مرآة الحساب' ۔ علم حساب و سیاق کے بارے میں منظوم رسالہ از ابوالفیض محمد ملاحت ، ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ میں لکھا گیا ۔ تین مقدموں ، چار ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے ۔ قلمی نسخہ مکتوبہ تقریباً ۱۸۴۳ء/۱۲۵۹ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی) میں محفوظ ہے ۔ اسی نام کا ایک رسالہ مصنفہ محمد ماہ فہرست کتب خانۂ آصفیہ (۱ : ۸۲۰) میں بھی مذکور ہے جس کا زمانہ معلوم نہ ہو سکا ۔

۱۷۔ 'مرآة العالم' ۔ علم حساب و ریاضی پر حافظ احمد بن انصاری مغربی کی تصنیف جو ۱۸۴۵ء/۱۲۶۲ھ سے پہلے وجود میں آئی ۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (۱ : ۸۲۰) میں موجود ہے ۔

۱۸۔ 'زبدة الحساب' ۔ علم حساب پر محمد بن احمد مغربی کی تصنیف ۔ اس کی تاریخ تالیف صحیح صحیح معلوم نہیں لیکن بعض قرائن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں لکھا گیا ۔ اس میں ایک مقدمہ اور چار مقالے ہیں ۔ اس کا ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (ایوانو ضمیمہ ۱ : ۱۰۴) میں موجود ہے ۔ ۱۸۵۴ء/۱۲۷۰ھ میں شائع ہوا (آصفیہ ۳ : ۳۳۸) ۔

۱۹۔ 'میزان الحساب' ۔ علم ریاضی و حساب پر قادر علی خان بہادر کی تصنیف ۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ میں شائع ہوا ، کتب خانہ آصفیہ (۱ : ۸۲۰) میں موجود ہے ۔

۲۰۔ 'ہدیع الحساب' ۔ علم حساب ، مساحت اور نجوم وغیرہ پر یہ رسالہ مرزا رجب علی بیگ کی تصنیف ہے ۔ اس میں ایک مقدمہ ، سات باب اور ایک خاتمہ ہے ۔ ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ میں لکھنؤ سے اور ۱۸۵۰ء/۱۲۶۷ھ میں کانپور سے شائع ہوا (آصفیہ ۱ : ۸۱۸) ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ محرم ۱۸۴۹ء/۱۲۶۶ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی) میں موجود ہے ۔

۲۱۔ 'رسالہ رفیع الصنعت' ۔ علم ریاضی و حساب پر عمدة الدولہ عمدة الملک محمد رفیع الدین خان متوفی ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ کی تألیف جسے انہوں نے ۱۸۲۵ء/۱۲۶۹ھ میں ترتیب دیا ۔ اس کے ایک مطبوعہ نسخے کا ذکر فہرست کتب خانۂ آصفیہ (۱ : ۸۱۲) میں موجود ہے ۔

۲۲- 'مجمع الفوائد' - علمِ حساب و سیاق پر جان محمد بن محمود خان کی تصنیف جو اس نے رنجیت سنگھ (۱۷۹۲ء - ۱۸۳۹ء) کے زمانے میں پانچ فصلوں میں ترتیب دی - اس کا ایک ۱۸۵۳ء/ ۱۲۷۰ھ کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء) -

۲۳- 'قاعدۂ کلیہ' - علمِ ریاضی پر مولوی فیاض الدین خان کی تصنیف جس کے مطبوعہ نسخے کا ذکر، جو ۱۸٦۸ء/۱۲۸۵ھ میں چھپا، کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست (۱ : ۸۱۸) میں آیا ہے -

۲۴- 'اعظم الحساب' - حافظ احمد بن محمد انصاری مغربی نے علم حساب پر یہ رسالہ نواب اعظم الامراء محمد غوث خان اعظم (م-۱۸۳۵ء) کے نام معنون کیا - قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (۱ : ۸۰٦) میں محفوظ ہے -

۲۵- 'بساط غریب' - علمِ ریاضی پر مولوی نصیر الدین حیدر آبادی کی تصنیف - اس کا ایک مطبوعہ نسخہ، جو ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ میں چھپا، کتب خانۂ آصفیہ (۱ : ۸۰٦) میں موجود ہے -

۲٦- 'تحفۂ مختاریہ' - علمِ حساب پر محمد حسن بن محمد حسین قاری کی تصنیف جو اس نے ۱۸۸٦ء/۱۲۹۳ھ میں مکمل کر کے نواب مختار الملک کے نام معنون کی - اس کا ایک معاصر بلکہ مصنف کا اپنا نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (۱ : ۸۰۸) میں موجود ہے -

۲۷- 'رسالہ در علمِ حساب' کسی گمنام مصنف کا لکھا ہوا ہے اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے - اس کے ایک قلمی نسخے کا ذکر مدراس یونیورسٹی کی فہرست میں آیا ہے -

۲۸- 'حساب نامہ' - علمِ حساب پر سات ابواب پر مشتمل ہے جسے انند کاہن بن ہیم راج کایستھ نے لکھا - اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے -

۲۹- 'رسالۂ نادریہ' - علم حساب پر یہ رسالہ مولوی جلال بن مُلا حسین نے لکھا - سٹوری (۲ : ۲۸) نے اس کے ایک نسخے کا ذکر کیا ہے -

۳۰- 'بسیط الحساب' - علمِ حساب پر یہ رسالہ عبیداللہ عیسیٰ صدیقی گوپاموی کی تصنیف ہے - کتب خانۂ رامپور میں ایک قلمی نسخہ موجود ہے (سٹوری ۲ : ۲٦) -

۳۱- 'منتخبِ عجائب' - علمِ حساب پر یہ رسالہ گوپال سنگھ کی تصنیف ہے - اس کے ایک قلمی نسخے کا ذکر سٹوری نے اپنی کتاب (۲ : ۲۸) میں کیا ہے -

۳۲- 'معیار العقول در اعمال جرّ ثقیل' - جرِّ ثقیل کے قواعد و ضوابط کے بارے میں حسابات وغیرہ پر ابو علی حیدر آبادی کی تصنیف - اس کا ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۵۰ھ کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست (۱ : ۸۲۰) میں درج ہے -

۳۳- 'ترجمۂ خلاصۃ الحساب' - ایک مقدمہ، بارہ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل یہ رسالہ بھی بہاء الدین عاملی کی عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو محمد صادق بن عبدالعلی تبریزی کی

تالیف ہے ۔ قرائن سے انیسویں صدی عیسوی/تیرھویں صدی ہجری کی تألیف معلوم ہوتی ہے (بانکی پور : ۱۱ ، سٹوری ۲ : ۱۳) ۔

علمِ نجوم و ہیئت

ان علوم پر پچھلے ادوار میں جو آثار زیادہ مشہور ہوئے ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں ؛ طوسی کی 'شرح بطلیموس' جو ۱۲۶۴ء/۶۶۳ھ میں مکمل ہوئی ۔ علاء الدین علی شاہ منجّم بخاری کی 'احکام الاعوام' جو ۱۲۸۹ء/۶۸۸ھ کے قریب لکھی گئی ۔ کسی گمنام مصنف کی 'مدخل منظوم' جو ۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ میں تالیف ہوئی ۔ 'کفایۃ التعلیم فی صناعۃ التنجیم' جسے محمد بن مسعود نے ۱۱۳۷ء/۵۳۲ھ کے قریب لکھا ۔ علی بن شریف بخاری کی 'برہان الکفایہ' جو تیرھویں صدی عیسوی/ساتویں صدی ہجری میں لکھی گئی ۔ قوشجی متوفی ۱۴۷۴ء/۸۷۹ھ کا 'رسالہ فی الہیئۃ' اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے معاصر ابن بدیع الزمان کی 'آثار النجوم' وغیرہ ۔ ان مستقل کتابوں کے علاوہ غیاث الدین اصفہانی کی 'دانشنامۂ جہاں' اور محمد فاضل سمرقندی (معاصرِ ہمایوں) کی 'جواہر العلوم' ایسے قاموسوں میں بھی علم نجوم و ہیئت پر ابواب ملتے ہیں ۔ زیرِ بحث دور میں بھی برّصغیر کے مسلمان علماء نے ان علوم پر خاطر خواہ کام کیا اور قابلِ قدر آثار اگلی نسلوں کے لئے یادگار چھوڑے ۔ ہماری اطلاع کے مطابق اس دور میں ایسے آثار کی تعداد ۲۷ تک پہنچتی ہے جن میں 'حکم الریاضی' ، 'تقریب التحریر' ، 'مدخل منظوم' ، 'اسرار النجوم' ، 'معراج التوحید' ، 'نجم الصدر' ، 'انوارِ نجوم' ، 'کنز العاشقین' ، 'مفتاح النجوم' اور 'حدائق النجوم' زیادہ مشہور اور اہم ہیں ۔ جو منجم اور ہیئت داں اس دور میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے ان میں محمد صادق انبالوی ، خیر اللہ مہندس ، ابو طالب اصفہانی اور قبول محمد انصاری سرِفہرست ہیں ۔

۱۔ 'حکم الریاضی' ۔ علم ہیئت و فلکیات (مختلف اجرامِ فلکی کے فاصلوں پر) میں یہ رسالہ محمد زمان بن محمد صادق انبالوی دہلوی کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ۱۷۰۸ء/۱۱۲۰ھ میں شروع کر کے ۱۷۱۷ء/۱۱۳۰ میں مکمل کیا ۔ یہ رسالہ دراصل محمود بن عمر چغمینی کی عربی کتاب 'الملخص فی الہیئۃ' کی فارسی میں شرح ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ 'الہام الغیب' اور رسالہ در ہیئت' بھی اسی کا دوسرا نام ہے (بلوشہ ۲۳۷۰) ۔

۲۔ 'تقریب التحریر' ۔ ۱۳ مقالوں پر مشتمل یہ رسالہ نصیر الدین طوسی کی 'تحریر المجسطی' کا جو عربی میں ہے ، فارسی ترجمہ و شرح ہے ، جسے ابوالخیر معروف بہ خیر اللہ مہندس نے ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ میں تألیف کیا ۔ یہ کتاب فلکیات و نجوم پر ہے (ضمیمہ ایوانو ۲ : ۹۵ ۔ سٹوری ۲ : ۳۷ ، بانکی پور ۱۱ : ۷۰) ۔ 'شرح مجسطی' بھی اسی رسالے کا دوسرا نام ہے ۔

۳۔ 'مدخل منظوم' ۔ علم ہیئت و فلکیات پر یہ رسالہ خیر اللہ مہندس کی یادگار ہے جسے انہوں نے ۱۷۳۷-۸ء/۱۱۵۰ھ میں تصنیف کیا ۔ اس کا ایک نسخہ رامپور لائبریری میں موجود ہے ۔

۴۔ 'رسالہ در ہیئت' ۔ علم ہیئت و فلکیات میں یہ رسالہ شیخ علی حزین متوفی ۱۷۶۶ء/

۱۱۸۰ھ کی علمی محنت کا نتیجہ ہے، جسے انہوں نے ۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ میں تصنیف کیا (ایوانو ۲ : ۱۷۷۸) ۔

۵۔ 'رسالہ' ہیئت' ۔ علمِ ہیئت پر یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کا ہے جسے اس نے ایک مقدمہ اور تین ابواب میں لکھا ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء) ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) کی یادگار ہے ۔

۶۔ 'اسرار النجوم' ۔ علمِ ہیئت پر یہ رسالہ جعفر حسینی کی تصنیف ہے جس نے ۱۷۸۵ء/ ۱۱۹۹ھ سے پہلے اسے ترتیب دیا ۔ کتب خانہ' آصفیہ میں اس رسالے کا ایک نسخہ موجود ہے (سٹوری ۲ : ۱۰۴) ۔ یہ کتاب ابن بدیع الزمان معاصر شاہ اسمٰعیل صفوی کی 'آثار النجوم' (باڈلین) کی یاد دلاتی ہے ۔

۷۔ 'کلیات النجوم' ۔ علمِ ہیئت پر یہ رسالہ ۱۷۹۶ء/۱۲۱۱ھ سے پہلے کی تصنیف ہے ۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ' آصفیہ میں موجود ہے ۔

۸۔ 'معراج التوحید' ۔ علمِ ہیئت پر یہ منظوم رسالہ ابو طالب اصفہانی کی تصنیف ہے جس کا ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال ہوا ۔ یہ رسالہ اس نے ۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ھ میں مکمل کر کے سلطان ابوالفتح صفوی کے نام معنون کیا ۔ اس کے ایک نسخے کا ذکر سٹوری (۲ : ۹۷) نے اپنی کتاب میں کیا ہے ۔

۹۔ 'فضل الخاتم فی ہیئت العالم' ۔ علمِ ہیئت پر یہ رسالہ محمد حاضر کی تصنیف ہے ۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ کتب خانہ' آصفیہ کی فہرست (۱ : ۸۱۸) میں درج ہے ۔

۱۰۔ 'تیسیرِ مطلوب فی عملِ جیوب' ۔ علمِ ہیئت و ہندسہ پر یہ رسالہ حافظ احمد کی تصنیف ہے ۔ کتب خانہ' آصفیہ کی فہرست (۱ : ۸۰۹) میں اس کے ایک نسخے کا ذکر ملتا ہے ۔

۱۱۔ 'خاص النجوم' ۔ علمِ ہیئت پر یہ رسالہ لالہ شوشوقت رائے بن بھوپت رائے کی تصنیف ہے ۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ' آصفیہ میں موجود ہے (۳ : ۱۷۰۰) ۔

۱۲۔ 'کاشف الدقایق' ۔ علمِ ہیئت پر یہ رسالہ لالہ سدا سکھ کول بن کیول رام کول کی تصنیف ہے ۔ اس رسالے کا ایک نسخہ کتاب خانہ' آصفیہ (۳ : ۱۷۰۲) میں موجود ہے ۔

۱۳۔ 'انظار الکواکب' ۔ علمِ ہیئت پر یہ رسالہ صلاح الدین خان حیدر آبادی کی تصنیف ہے ۔ کتب خانہ' آصفیہ میں (۲ : ۱۶۹۸) اس رسالے کا ایک نسخہ موجود ہے (سٹوری ۲ : ۱۰۴) ۔

۱۴۔ 'نجم الصدر' ۔ علمِ نجوم پر یہ رسالہ صدر الدین محمد بن زبردست خان کی تالیف ہے ۔ غالباً مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ جس کی تاریخ کتابت ۲۰۔ ربیع الثانی ۱۱۳۵ھ

(۱۷۲۳ء) ہے ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء)

۱۵- 'زبرجد (رسالہ)' - علم نجوم و جادو وغیرہ میں یہ منظوم و منثور رسالہ سید زین العابدین بن رضی الدین شوستری (صاحب فتح المجاہدین) متوفی ۱۷۹۹ء کی تصنیف ہے - یہ رسالہ سلطان ٹیپو (۱۷۸۲ء - ۱۷۹۸ء/۱۱۹۷ھ - ۱۲۱۳ھ) کے لئے پانچ قسموں میں لکھا گیا تھا (ایوانو ۱۵۰۶) -

۱۶- 'انوار النجوم' - علم نجوم و غیب گوئی پر یہ رسالہ قبول محمد انصاری کی یادگار ہے جس کا ایک حصہ انہوں نے ۱۷۸۵ء/۱۲۰۰ھ میں تصنیف کیا - اس میں چار دفتر ہیں جو مختلف ابواب و فصول میں تقسیم ہوتے ہیں - پہلے دفتر میں افلاک انجم کا بیان ہے - دوسرے میں رائج حالات پر بحث ہے ، تیسرا دفتر خوشی کے کاموں کے بارے میں ہے اور چوتھا پریشانی کے حالات اور سفر وغیرہ کے متعلق ہے - اس مصنف نے 'آثار النجوم' اور 'اسرار النجوم' سے فکری رشتہ جوڑا ہے (سٹوری ۲ : ۹۶ ، ایوانو ضمیمہ ۱ : ۱۰۴) -

۱۷- 'رسالۂ دلپسند' - علم نجوم پر یہ رسالہ پنڈت راج نیم دھر کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ۱۷۸۹ء/۱۲۰۵ھ میں ترتیب دیا اور نواب امیر الدولہ والی ٹونک کے نام معنون کیا - اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء) -

۱۸- 'کنز العاشقین' - علم نجوم و غیب پر یہ رسالہ محمد بن محمد صادق علم کی تالیف ہے جسے اس نے ایک عربی رسالہ 'خواص منازل قمر' سے ۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ میں ترجمہ کیا - اس رسالے کے ایک مخطوطہ کا حال ریو نے اپنی فہرست (۲ : ۵۶۲) پر درج کیا ہے -

۱۹- 'شگرف بیان' - از عبدالرحیم گورکھپوری جو ۱۸۰۸ء کے بعد کلکتہ میں فوت ہوئے - اس رسالے کا بڑا حصہ نجوم و ہیئت سے متعلق ہے - کلکتہ مدرسہ کے کتب خانے میں اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے - (سٹوری ۲ : ۱۹) -

۲۰- 'رسالہ در علم نجوم' - کسی گمنام مصنف کا رسالہ تین امراء کی سرپرستی میں لکھا گیا جن کے نام خواجہ ظہیر الدین ، خواجہ نصیر الدین اور خواجہ شرف الدین بتائے گئے ہیں - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ فہرست باڈلین میں درج ہے (سٹوری ۲ : ۱۱۲) - ہو سکتا ہے بارھویں یا تیرھویں صدی ہجری (اٹھارھویں یا انیسویں صدی عیسوی) کی تصنیف ہو -

۲۱- 'رسالہ فہرست ثمر سال' - اجناس اور میوہ جات کے متعلق غیب گوئی اور نجوم وغیرہ کے متعلق یہ رسالہ کسی گمنام مصنف نے ۱۸۱۰ء/۱۲۶۵ھ میں ترتیب دیا - اس کے ایک نسخے کا ذکر فہرست ایوانو ۱۵۰۵ نمبر کے تحت آیا ہے -

۲۲- 'رسالہ جونش' - یہ رسالۂ منشی بنسی رام کی تصنیف ہے - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء ، ص ۱۰۵) -

۲۳- 'مفتاح النجوم' - علمِ نجوم در یہ رسالہ ہندی کتاب 'جنتکا بھرن' کا ترجمہ ہے جس میں نو ابواب ہیں - ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ کا کتابت شدہ ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے - معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی کی یادگار ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء) - مترجم کا نام ابوالحسن اجودھنی ہے - (آصفیہ ۲ : ۴ ، ۱۷ ؛ سٹوری ۲ : ۱۰۸) -

۲۴- 'زائچہ نامہ' - علمِ نجوم پر کرپا رام کھتری کے اس رسالے کا ایک مخطوطہ مکتوبہ ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں موجود ہے - (میگزین مئی ۱۹۳۴ء ، ص ۱۰۵) -

۲۵- 'حدائق النجوم' - علمِ نجوم پر یہ رسالہ رتن سنگھ زخمی متوفی ۱۸۵۰ء/۱۲۶۷ھ کی تصنیف ہے - یہ رسالہ انہوں نے ۱۸۳۶ء/۱۲۵۲ھ میں ترتیب دیا - یہ رسالہ ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ اور ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ میں شائع ہوا - کتاب خانہ ریاست کپور تھلہ اور فہرست آصفیہ (۱ : ۸۰۸) میں اس کے نسخے موجود ہیں (سٹوری ۲ : ۹۹) -

۲۶- 'معراج السماء' - علمِ نجوم و ہیئت پر یہ رسالہ قاسم بن حسین کی تصنیف ہے - اس میں دو مقدمے ، پندرہ مقالے اور ایک خاتمہ ہے - اس کا ایک نسخہ رامپور لائبریری میں موجود ہے - (سٹوری ۲ : ۱۰۸) -

۲۷- 'ممتحن القلوب' - علم نجوم پر یہ رسالہ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کے اوائل کی تصنیف ہے - مصنف کا نام وغیرہ معلوم نہیں ہو سکا - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی) میں موجود ہے -

علمِ سیاق و ہندسہ

ان علوم پر کتب و رسائل کے اعداد و شمار سے یہ پتا چلتا ہے کہ پچھلے ادوار میں علمِ سیاق و ہندسہ پر مستقل کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں - البتہ قطب الدین ، ملا قوشجی ، بہاء الدین عاملی ، عبدالعلی بیرجندی اور غیاث الدین جمشید ایسے علماء و ریاضی دانوں نے علم حساب و ریاضی پر اپنے آثار میں ان علوم پر بھی بحثیں کی ہیں - اس دور کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علمِ سیاق نے خاطر خواہ ترقی کی اور اس علم پر مستقل کتابیں وجود میں آئیں - فارسی زبان میں ان علوم پر تصانیف کا یہ سلسلہ انگریزی حکومت قائم ہونے کے زمانے تک قائم رہا - انگریزی دور میں علماء نے انگریزی اور اردو میں لکھنا شروع کیا اور یوں برصغیر میں فارسی تصانیف کا سلسلہ ختم ہو گیا - علمِ سیاق پر 'خلاصۃ السیاق' ، 'سیاقنامہ' ، 'رسالہ جبر و مقابلہ' اور 'دستور السیاق' ، ایسی کتب زیادہ مشہور ہوئیں اور علمِ ہندسہ پر 'شمس الهندسہ' ، 'تحریر الاشکال' اور 'تقریر التحریر' کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی - سیاق و ہندسہ پر اس دور میں مندرجہ ذیل آثار وجود میں آئے :

۱- 'خلاصۃ السیاق' - دفتری حسابات کے قواعد اور علمِ سیاق پر یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی تصنیف ہے ، جسے اس نے ۱۷۰۳ء/۱۱۱۵ھ بعہد عالمگیر مکمل کیا - مقدمے میں علمِ سیاق کی

مختصر تاریخ بھی دی گئی ہے۔ برٹش میوزیم لنڈن، برلن، ڈھاکہ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری (شیرانی ۱۱۶۴، ۳۸۲، ۲۳۲۲) میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ اکبری دور کے امراء مثلاً ابوالفضل، فیضی، منصور شیرازی اور ٹوڈر مل کا ذکر کیا ہے۔ رسالے کی ترتیب میں اس نے خواجہ نظام الملک طوسی کی پیروی کی ہے۔ اکثر اصطلاحیں ہندوستانی زبانوں کی استعمال ہوئی ہیں۔

۲۔ 'ہشت السیاق یا سیاقنامہ' ۔ حسابات، پیمائش اور زمینداری معاملات وغیرہ کے بارے میں یہ رسالہ خلیفہ علام رسول کی تصنیف ہے جسے شاید انہوں نے ۱۷۷۷ء/۱۱۹۱ھ میں ترتیب دیا۔ خلیفہ صاحب کی تاریخ وفات تو معلوم نہ ہو سکی البتہ رسالے کی تاریخ تألیف کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواسط کے علماء میں سے تھے۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری (ض: ۳۸) میں موجود ہے اور دوسرا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ اس میں دو فصلیں ہیں؛ پہلی حساب کے قواعد پر اور دوسری میں علم سیاق اور بخشی گری وغیرہ پر بحث ہوئی ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء، شیرانی ۱۴۷، ۸۴۲)۔

۳۔ 'کفایۃ الجبر' ۔ علم ہندسہ و الجبراء پر یہ رسالہ جہاندار شاہ کے زمانے (۱۷۱۳ء) میں لکھا گیا۔ مصنف کا نام صلاح الدین ہے۔ (سٹوری ۲: ۱۷، بانکی پور ۱۱: ۵۷)۔

۴۔ 'رسالہ جبر و مقابلہ' ۔ قاضی القضاۃ نجم الدین خان ثاقب کا یہ رسالہ علم حساب و الجبرا کے ابتدائی قوانین پر فارسی نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ قاضی صاحب نے ۱۳ ربیع ثانی ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) کو وفات پائی۔ یہ رسالہ ۱۸۱۱ء/۱۲۲۷ھ سے قدرے پہلے تصنیف ہوا۔ اس کے قلمی نسخے بوہار، ایوانو، علیگڑھ اور لاہور میں موجود ہیں۔ ۱۸۱۲ء میں یہ رسالہ 'خلاصۃ الحساب' عاملی کے ساتھ کلکتہ سے شائع ہوا۔

۵۔ 'رفیع البصر' ۔ ہندسہ اور بصریات پر یہ رسالہ نواب رفیع الدین خان متوفی ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ کی تصنیف ہے، جس نے اسے ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ میں مکمل کیا۔ ۱۲۵۰ھ میں یہ رسالہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔

۶۔ 'سیاق نامہ' ۔ علم سیاق اور دفتری حسابات پر یہ رسالہ لالہ نند رام کی تصنیف ہے۔ اس رسالے کا ایک مطبوعہ نسخہ، جو ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا، کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست (۱: ۸۱۶) میں درج ہے۔

۷۔ 'دستور السیاق' ۔ علم سیاق و حساب پر یہ رسالہ لالہ اوری لال کی تصنیف ہے جس نے اسے ۱۸۹۸ء/۱۳۱۶ھ میں مکمل کیا۔ اس میں گیارہ مقدمے اور سات باب ہیں۔ اس رسالے کا ایک معاصر قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی) میں موجود ہے۔

۸۔ 'شمس الہندسہ' ۔ نواب شمس الامراء محمد فخر الدین خان متوفی ۱۸۶۳ء نے علم ریاضی و ہندسہ پر یہ رسالہ ۱۸۲۵ء / ۱۲۴۱ھ میں مکمل کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ آصفیہ (۱: ۸۱۸) میں موجود ہے۔ اس رسالے کا پہلا ایڈیشن ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) آصفیہ (۱: ۸۱۷)

میں اور دوسرا ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں شائع ہوا ۔

۹۔ 'رسالہ در علم ہندسہ' ۔ علم ہندسہ پر یہ رسالہ ایک مقدمے اور دو مقالوں پر مشتمل ہے ۔ مصنف کا نام یا سال تالیف معلوم نہ ہو سکا البتہ قرائن بتاتے ہیں کہ یہ رسالہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز کی یادگار ہے

۱۰۔ 'تحریر الاشکال' ۔ اس رسالے میں علم ہندسہ کی ایسی مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے جو پہلے لاینحل تھیں ۔ مصنف نے اس فن پر خواجہ نصیرالدین طوسی کی عربی کتاب 'تحریر اقلیدس' اور ان کے دوسرے آثار سے استفادہ کیا ہے ۔ اس کتاب کا مقدمہ عربی زبان میں لکھا گیا ہے ۔ مصنف کا نام محمد زمان بن محمد صادق ابیالحی ثم دہاری ہے ، جو شاید اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کے اوایل میں زندہ تھا ۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۷۲۷ء/۱۱۴۰ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۳۶۰) میں موجود ہے ۔

۱۱۔ 'تقریر التحریر یا ترجمہ تحریر اقلیدس' ۔ علم حساب و ہندسہ میں نصیرالدین طوسی کی عربی کتاب 'تحریر اقلیدس' کا فارسی ترجمہ ہے جسے خیراللہ مہندس نے ۱۷۳۱ء / ۱۱۴۴ھ میں تصنیف کیا جو ۱۷۴۷ء / ۱۱۶۰ھ تک زندہ تھا ۔ اس میں پندرہ مقالے ہیں اور اس کے ایک نسخے کا حال فہرست ایتھے شمارہ ۲۲۷۰ میں درج ہے ۔ (منزوی ۲ : ۱) ۔

زیج و تقویم

زیج و تقویم پر قدیم ادوار کے ایرانی و پاکستانی مسلمان علماء نے بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں ۔ برصغیر کے مسلمانوں میں محمود بن عمر، جس نے ناصر الدین بن التتمش کے لئے تیرھویں صدی عیسوی/ساتویں صدی ہجری میں 'زیج ناصری' لکھی ، سولھویں صدی عیسوی/دسویں صدی ہجری میں مصنف 'زیج مظفر شاہی' ، اور 'ملا' فرید جس نے سترھویں صدی عیسوی / گیارھوں صدی ہجری میں 'زیج شاہجہانی' ترتیب دی ، زیادہ مشہور ہوئے ۔ ایرانی علماء میں نصیر الدین طوسی ، ابی عبداللہ کمالی ، غیاث الدین جمشید ، الغ بیگ ، رکن الدین اصفہانی زیادہ مشہور ہیں جنہوں نے بالترتیب 'زیج الخانی' ، 'زیج اشرف' ، 'زیج خاقانی' ، 'زیج جدید سلطانی' ، 'زیج جامع' اور 'کتاب تقویم' تصنیف کیں ۔

زیر بحث دور میں بھی علمائے برصغیر نے زیج و تقویم کے میدان میں بے شمار گراں قدر آثار یادگار چھوڑے ہیں جن میں راجہ جے سنگھ کی 'زیج جدید محمد شاہی' ، 'تسہیل زیج محمد شاہی' اور 'زیج بہادر خانی' زیادہ اہم ہیں ۔ ان علوم پر فارسی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جنگ آزادی کے زمانے تک جاری رہا اور اس کے بعد ، انگریزی عملداری کی وجہ سے ، لکھنے والوں نے اکثر و بیشتر انگریزی اور اُردو میں کتابیں لکھیں ۔ ان علوم پر فارسی تصانیف کے نام درج ذیل ہیں :

۱۔ 'زیج جدید محمد شاہی' از راجہ جے سنگھ در سال ۱۷۲۷ء - ۱۷۲۸ء / ۱۱۴۰ - ۱۱۴۱ھ برائے سال ۱۷۸۰ء - ۱۷۸۱ء / ۱۱۹۵ھ ۔ راجہ جے سنگھ اپنے باپ راجہ بسن سنگھ کے بعد ۱۶۹۸ء

۱۱۱۰ھ میں ریاست عنبر کے تخت پر بیٹھا ۔ وہ عالمگیر کی فوج کا ایک مقتدر سپہسالار تھا - ریاست جے پور اس نے بسائی تھی ۔ اس کا انتقال ۱۷۴۳ء/۱۱۵۶ھ میں ہوا ۔ یہ کتاب 'زیج الغ بیگ' پر مبنی ہے ۔ نیز 'زیج خاقانی' پر اس کتاب میں تین مقالے ہیں ۔ پہلا مقالہ ۴ ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس میں ہجری ، محمد شاہی ، عیسوی اور بکرمی تقویم ہے ۔ دوسرا مقالہ ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے اور یہ "در معرفت طالع ہر وقت" سے بحث کرتا ہے ۔ تیسرا مقالہ ۴ ابواب اور خاتمے پر مشتمل ہے اور اجرام فلکی پر ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں بھی موجود ہے (عباسی ۲۰۴) (باڈلین ۱۵۷۲ - ریو ۴۶۰ - بانکی پور ۱۰ : ۳۹) -

۲- 'شرح زیج جدید محمد شاہی' - راجہ جے سنگھ کی کتاب 'زیج جدید محمد شاہی' پر یہ شرح خیراللہ مہندس کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے جو ۱۷۴۷ء / ۱۱۶۰ھ تک زندہ تھے -

۳- 'تسہیل زیج محمد شاہی' - یہ کتاب راجہ جے سنگ کی 'زیج جدید محمد شاہی' کی تلخیص و تشریح ہے ۔ مصنف کا نام عبداللہ مخاطب بہ مہارت خان بن عظیم الدین محمد خان ہے ۔ اس کتاب کی تاریخ تصنیف یا اس کے مصنف کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی ۔ البتہ بعض قرائن کی بنا پر یہ معلوم ہے کہ وہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے ربع چہارم میں زندہ تھا ۔ اس کتاب کے متعدد نسخوں کی نشاندہی سٹوری نے اپنی کتاب (۲ : ۹۴) میں کی ہے جن میں سے ایک کی تاریخ کتابت ۱۷۹۱ء / ۱۲۰۵ھ ہے -

۴- 'زیج مختصر محمد شاہی' - راجہ جے سنگھ کی کتاب 'زیج محمد شاہی' کا خلاصہ ہے جو شاید اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کیا گیا ۔ مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا (سٹوری ۲ : ۹۴) -

تقویم

۱- 'رسالہ تقویم' - عبداللہ ابن حسن علی نے یہ رسالہ ۱۷۶۸ء/۱۱۸۲ھ میں نواب شمس الدولہ بہادر ہزبر جنگ کی فرمایش پر ترتیب دیا ۔ اس میں 'زیج جدید سلطانی' ایسی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے (ایتھے ۲۲۶۲) -

۲- 'تقویم فارسی' - یہ رسالہ ۱۷۸۳ء/۱۱۹۸ھ میں لکھا گیا - مصنف نامعلوم - (ایتھے ۲۲۶۳) -

۳- 'رسالہ در تحقیق سنہ' - علم تقویم پر یہ چھوٹا سا رسالہ محمد نجم الدین عرف قاضی القضاۃ کی تصنیف ہے جس نے اسے ۱۷۸۷ء/۱۲۰۲ھ میں مکمل کیا -

۴- 'تقویم فارسی' - ۱۷۸۰ء - ۱۷۸۱ء/۱۱۹۴ھ - ۱۱۹۶ھ سالوں کی کسی نامعلوم مصنف کی تصنیف ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں ذیل شمارہ ۲۰۰۴ موجود ہے -

۵- 'زیج میر عالمی' - نظام حیدر آباد (دکن) کے درباری امیر میر عالم متوفی ۱۸۰۸ء/ ۱۲۲۳ھ کے نام صدر خان شیرازی نے لکھی ۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے - (سٹوری ۲ : ۹۷)

۶- 'رسالۂ تقویم' - یہ رسالہ ۱۸۱۱ء/۱۲۲۶ھ میں ترتیب دیا گیا - مؤلف نامعلوم - اس کا ایک مخطوطہ ایوانو کی فہرست (کرزن) کے ص ۳۰۰ پر بیان ہوا ہے -

۷- 'رسالہ در تحقیق سنہ' - ہندوستان میں رائج شمسی اور قمری سالوں کی تقویم سے متعلق یہ رسالہ قاضی القضاۃ نجم الدین خان متوفی ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ کی تصنیف ہے جسے اس نے ۱۷۹۶ء/ ۱۲۱۰ھ سے قدرے پہلے ترتیب دیا - اس رسالے کا ایک معاصر نسخہ فہرست ایوانو میں اور دوسرا فہرست ریو میں موجود ہے (سٹوری ۲ : ۹۷) -

۸- 'اصطلاحات التقویم' - تقویم کی فنی اصطلاحوں پر غلام حسن بن فتح محمد جونپوری کی تصنیف - غلام حسین انیسویں صدی عیسوی/تیرھویں صدی ہجری کے اواسط میں زندہ تھا - اس میں ایک مقدمہ، ۱۴ ابواب اور ایک خاتمہ ہے - مخطوطے کا حال فہرست ایوانو ضمیمہ ۱ : ۱۰۵ پر درج ہے - (سٹوری ۲ : ۹۹)

۹- 'زیج بہادر خانی' - غلام حسن کربلائی جونپوری نے یہ رسالہ ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ میں ترتیب دیا - ۱۸۵۵ء میں یہ رسالہ شائع ہوا - کتب خانۂ آصفیہ میں اس کے قلمی اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں - (سٹوری ۲ : ۹۹)

۱۰- 'رسالۂ تقویم' - فصلی، شمسی، بکرمی، عیسوی، داؤدی، ہجری اور ترکی تقویم پر یہ رسالہ محمد غیاث الدین نے ۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ میں ترتیب دیا - اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی شمارہ ۲۰۱۴) میں موجود ہے -

۱۱- 'الشواہد النفیسہ فی اثبات کبیسہ' - ہاشم اصفہانی کا رسالہ جسے اس نے ۱۸۲۶ء/ ۱۲۴۲ھ میں بمقام بمبئی ترتیب دیا - ۱۸۲۷ء میں بمبئی سے شائع ہوا -

۱۲- 'روزنامہ سال ۱۲۴۸ء' - تقویم و غیب گوئی پر یہ رسالہ ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں کسی گمنام مصنف نے ترتیب دیا - اس کے ایک مخطوطے کی فہرست ایوانو (کرزن)، ص ۳۰۴ پر دی گئی ہے[1] -

فن اصطرلاب و صنعت کرہ

ان علوم میں برصغیر کے علماء نے جن علماء کی تالیفات سے فائدہ اٹھایا وہ ہیں نصیرالدین طوسی متوفی ۱۲۷۳ء/۶۷۲ھ صاحب 'بست باب در اصطرلاب' مولانا ناصر عمر شیرازی (زندہ تا ۱۲۹۷ء/ ۶۹۷ھ) صاحب 'رسالۂ معرفت اصطرلاب' علی جفری رومی (زندہ ۱۵۰۲ء/۹۰۸ھ) صاحب 'رسالہ در اعمال اصطرلاب' اور عبدالعلی بیرجندی متوفی ۱۵۲۷ء/۹۳۴ھ صاحب 'رسالہ در صنعت اصطرلاب'

---

(۱) زیج اسکی از راجہ کندن لال اشکی اور معیارالازمان از رتن سنگھ زخمی کا ذکر سٹوری ۲ : ۹۸ و ۹۹ پر دیکھئے -

ان کے علاوہ 'سی باب در اصطرلاب' اور 'صد باب در اصطرلاب' ایسی کتابیں بھی برصغیر میں بہت مشہور تھیں ۔

پچھلے ادوار میں برصغیر کے ریاضی دان و منجّم عبدالرحیم اکبر شاہی ، صاحب 'تقویم جدید اکبر شاہی' ، ملا فرید شاہجہانی صاحب 'زیج شاہجہانی' اور لطف اللہ مہندس عالمگیری ، صاحب 'رسالہ در معرفت سمت قبلہ' نے زیادہ شہرت حاصل کی ۔

زیر بحث دور میں اگرچہ یہ فنون اس حد تک مقبول رہے تاہم متعدد منجّم و ریاضی دان پیدا ہوئے اور انہوں نے اس میدان میں بیش بہا خدمات انجام دے کر اپنے اسلاف کی سنت کو قائم رکھا ۔ اس دور کے بڑے بڑے دانشمند خیر اللہ مہندس ، غلام حسین کربلائی اور نواب رفیع الدین ہیں ۔ انگریزی عملداری کے برسر اقتدار آنے اور محکمۂ موسمیات قائم ہونے کی وجہ سے ان فنون میں فارسی کے بجائے انگریزی میں کتب لکھی جانے لگیں ۔ اس دور کے فارسی آثار حسب ذیل ہیں :

۱۔ 'حاشیہ بر شرح بیست باب در اصطرلاب' ۔ شرح بست باب عبدالعلی بیرجندی کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ۸۹۹/۱۴۹۳ء میں مکمل کیا ۔ زیر بحث حاشیہ اسی شرح پر خیر اللہ مہندس کی یادگار ہے ۔ خیر اللہ مہندس ، راجہ جے سنگھ صاحب 'زیج جدید محمد شاہی' کا معاصر بلکہ علمی امور میں اس کا مشیر و راہنما تھا ۔ اس حاشیے کا ایک نسخہ بانکی پور (۴ : ۱۶۷) لائبریری میں موجود ہے ۔ (سٹوری ۲ : ۹۵)

۲۔ 'رسالہ در اصطرلاب' ۔ فلکیات کے موضوع پر یہ رسالہ بھی خیر اللہ مہندس کی تصنیف ہے جس کے ایک نسخے کی نشاندہی سٹوری نے (۲ : ۹۵) اپنی کتاب میں کی ہے ۔

۳۔ 'انیس الاحباب فی بیان مسائل اصطرلاب' ۔ غلام حسین بن فتح محمد کربلائی جونپوری نے فن اصطرلاب پر یہ رسالہ ۱۸۱۸ء/۱۲۳۴ھ میں ترتیب دیا ۔ یہ دراصل بہاء الدین عاملی کے رسالہ ''صفیحہ'' کی شرح ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے ۔ (سٹوری ۲ : ۹۹)

۴۔ 'رفیع الصنعت' ۔ فن اصطرلاب پر نواب رفیع الدین خان متوفی ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ کی تصنیف جسے انہوں نے ۱۸۸۲ء/۱۲۶۹ھ میں مکمل کیا ۔ اسی سال یہ رسالہ حیدر آباد سے شائع ہوا ۔

۵۔ 'رسالۂ معرفت ربع مجیب' ۔ فن اصطرلاب وغیرہ پر عطاء اللہ قاری کی تصنیف ۔ اس رسالے کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۸۴۳ء/۱۲۵۹ھ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے ۔ (سٹوری ۲ : ۱۱۳)

۶۔ 'ضوابط استخراج سمت قبلہ' ۔ سمت قبلہ معلوم کرنے کے متعلق حیدر لکھنوی کا یہ رسالہ ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ میں لکھنو سے شائع ہوا ۔

علم رمل

اگرچہ ہندوؤں کو بھی علم رمل سے بہت دلچسپی رہی ہے لیکن جو شہرت مسلمان دانشمندوں

نے حاصل کی ، کسی ہندو رمّال کو نصیب نہ ہوئی ۔ تیرھویں صدی عیسوی/ساتویں صدی ہجری کے رمال حیدر شیرازی کا نام کسے معلوم نہیں ۔ اس کے دو بیٹوں ناصر الدین اور عمر نے بھی اس علم میں بے حد مہارت حاصل کی اور بالترتیب 'تحفہ الرمل' اور 'خلاصہ الرمل' تصنیف کیں ۔ ان کے بعد چودھویں صدی عیسوی/آٹھویں صدی ہجری میں معین الدین اور حمزہ بن عمر نے بالترتیب 'زبدۃ الرمل' اور 'دیوان الرمل' ترتیب دیں پندرھویں صدی عیسوی/نویں صدی ہجری میں بولاق بن یادگار نے 'احکام الرمل' اور سولھویں صدی عیسوی/دسویں صدی ہجری میں ہدایت اللہ رمال نے اکبر اعظم کے لیے 'ادبیر الرمل معروف نہ ہدایت الرمل' لکھی ۔

زیر بحث دور میں بھی بہت سارے مسلمان دانشمندوں نے اس علم میں مہارت حاصل کی ہے اور متعدد آثار یادگار چھوڑے ہیں ۔ ان میں سے عبدالغنی شروانی کی 'انوار الرمل' ، مولوی روشن علی کی 'اختصار الرمل' اور 'ضیاء الرمل' ، اور عبدالرحمٰن ابن علی رمال کی 'مرآہ الرمل' زیادہ اہم ہیں ۔ علم رمل پر اس دور میں مندرجہ ذیل کتب وجود میں آئیں :

۱۔ 'فالنامہ' ۔ رمل و نجوم وغیرہ کے بارے میں یہ رسالہ لالہ مول راج کی تصنیف ہے جسے اس نے کسی ہندی رسالے سے سنہ ۱۷۲۳ء/۱۱۳٦ھ میں فارسی زبان میں منتقل کیا ۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں محفوظ ہے ۔

۲۔ 'خیر الرمل' ۔ علم رمل پر یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی تصنیف ہے ، جس نے اسے سنہ ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ میں ترتیب دیا ۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۲۰٦۵) میں موجود ہے ۔

۳۔ 'انوار الرمل' ۔ علم رمل پر یہ ضخیم رسالہ عبدالغنی شروانی کی تصنیف ہے جو تین سو سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ اس میں ایک مقدمہ ، دو مقالے اور ایک خاتمہ ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کے اوائل یا اواسط کی یادگار ہے (شیرانی نمبر ۲۳۷۳ ، ایتھے ۲۲٦۷ ، میگزین مئی ۱۹۳۴ء) ۔

۴۔ 'لطائف الاحکام' ۔ علم رمل پر یہ منظوم رسالہ شاہ محمد گھڑتلی کی تصنیف ہے ۔ شاہ محمد غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کے اواخر کے علماء میں سے تھا ۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۰۱ھ (۱۷۸٦ء) پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۴۴۷) میں موجود ہے ۔

۵۔ 'رسالہ اختصار الرمل' ۔ علم رمل پر یہ رسالہ مولوی روشن علی بن شاہ عبدالرسول متوفی ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ کی تصنیف ہے اور دو ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی) میں بھی موجود ہے ۔ (آصفیہ ۲ : ۱٦۸۰)

٦۔ 'ضیاء الرمل' ۔ علم رمل پر یہ رسالہ بھی مولوی روشن علی بن شاہ عبدالرسول کی

تصنیف ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی ، شمارہ ۲۰۶۷) میں محفوظ ہے ۔

۷۔ 'مصداق الرمل' ۔ علمِ رمل و نجوم پر یہ رسالہ محمد عطاء اللہ لاہوری کی تصنیف ہے جس نے اسے بدیع الدین لاہوری اور میر روشن علی دہلوی کی کتب سے استفادہ کر کے لکھا ۔ اس کا ایک مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۳ء) کا حال باڈلین لائبریری کی فہرست (۳ : ۶۴) کے تحت درج ہے ۔

۸۔ 'مرآۃ الرمل' ۔ عبدالرحمٰن ابن علی الرمّال کی تصنیف ۔ اس رسالے کا ۱۸۸۱ء کا کتابت شدہ ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (شمارہ ۲۰۸۷) میں موجود ہے ۔

۹۔ 'خلاصۃ البحرین' ۔ علمِ رمل پر اس رسالے کا ناقص الطرفین اور کیڑوں کھایا ہوا نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (شمارہ ۲۰۶۷) میں موجود ہے ۔ ہو سکتا ہے تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کی یادگار ہو ۔

۱۰۔ 'حیرت القلوب' ۔ علمِ رمل پر اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ بخطِ آلِ رسول ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی ، شمارہ ۱۹۴۹) میں موجود ہے ۔ غالباً انیسویں صدی عیسوی/تیرھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے ۔

قیافہ شناسی

علمِ رمل و نجوم کی مختلف شاخوں میں ایک شاخ فراست اور قیافہ شناسی بھی ہے ، جس کے ذریعے کسی شخص کے چہرے کو دیکھ کر اس کی صفات و عادات کے علاوہ اس کے مستقبل کا حال معلوم کرتے ہیں ۔ پچھلے ادوار میں اس علم پر برج موہن کی 'مرآۃ القیافہ' اور نور بخش کا 'رسالہ در علمِ فراست' ایسی بہت سی کتابیں لکھی گئیں ۔ لیکن زیرِ بحث دور میں اس علم پر شاید کچھ زیادہ کام نہیں ہوا اور ہمیں صرف تین کتابوں کا پتہ چل سکا ہے جن میں سے 'ہدایۃ الصدر' زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے ۔ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں :

۱۔ 'ہدایۃ الصدر' ۔ علمِ قیافہ پر یہ رسالہ صدر الدین محمد بن زبردست خان (زندہ در ۱۷۲۲ء/ ۱۱۳۵ھ) کی تصنیف ہے ۔ اس کا ایک معاصر نسخہ مکتوبہ ۱۷۱۹ء/۱۱۳۲ھ پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے (میگزین مئی ۱۹۳۴ء) ۔ معلوم ہوتا ہے یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کے ربعِ اول میں تصنیف ہوا ۔

۲۔ 'رسالہ در علمِ قیافہ (منظوم)' ۔ علمِ قیافہ و نجوم پر یہ رسالہ فضل اللہ نے ۱۶۹۰ء/ ۱۱۰۲ھ میں لکھا ہے ۔ (عباسی ۸ ، باڈلین ۱۸۸۳) ۔

۳۔ 'مثنوی در علمِ قیافہ' ۔ علمِ قیافہ پر یہ ضخیم مثنوی ذیل کے شعر سے شروع ہوتی ہے :

بنام فرازندۂ آسمان — قیافہ نمائے وجود جہان

کسی گمنام شاعر نے اس مثنوی کو ۲۴ رجب ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) میں بمقام بنارس مکمل کیا ۔

علم جفر و تکسیر

علم نجوم و رمل کی مختلف شاخوں میں ایک شاخ 'جفر' اور 'تکسیر' بھی ہے ۔ علم 'جفر و تکسیر' کے ذریعے آیات یا الفاظ قرآنی یا دیگر الفاظ کے حروف کو ایک دوسرے سے توڑ کر اور آگے بڑھا کر کے ان کے اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔ پچھلے ادوار میں ان علوم پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں جن میں چودھویں صدی عیسوی/آٹھویں صدی ہجری کے عالم جلال الدین منجم کی 'تحفۂ روحانی'، اس کے بعد سید امام الدین کی 'کتاب جفر' پھر عیسیٰ بن قاضی شیخ اجودھنی کی 'خواتم الاسرار'، محمود عمانی کی 'زبدۃ الالواح' اور غالباً مرتضیٰ کی 'جفر مرتضوی' زیادہ مشہور ہوئیں ۔

زیر بحث دور میں بھی ان علوم پر کافی کام ہوا ۔ لیکن انگریزوں کی حکومت قائم ہونے اور جدید علوم و فنون کے رائج ہونے کی وجہ سے معاشرہ ان قدیم علوم کا کچھ زیادہ معتقد نہیں رہا تھا ۔ لہٰذا ان علوم پر لکھی گئی بہت سی کتابیں مفقود ہوئیں اور ان کے مصنفین گمنامی کا شکار ہوئے ۔ جن چند کتابوں کا سراغ مل سکا ان کے نام درج ذیل ہیں :

۱۔ 'ضیاء العیون' ۔ علم جفر پر مرزا مہدی خان صفوی نے یہ رسالہ حیدر آباد دکن میں بسال ۱۷۰۳ء/۱۱۱۴ھ ترتیب دیا ۔ اس رسالے میں بعض آیات قرآنی اور مہر نبوت کے حیرت انگیز اثرات کے بارے میں، نیز آیات کی تکسیر سے جو نتائج اور اثرات نکلتے ہیں، ان کا بیان ہے ۔ اس میں ایک مقدمہ اور دو منظر ہیں ۔ منظر اول : 'در تکسیرات بعضی از سورہ و آیات قرآن مجید' اور منظر دوم : 'در نقش معظمی کہ در تمام ایام ہفتہ باید دید' (ایتھے ۲۲۷۲، باڈلین ۱۴٦۳، ایوانو ضمیمہ ۱ : ۹۱۱) ۔

۲۔ 'اسرار الجفر' ۔ علم جفر پر یہ رسالہ ابو صالح معین الدین محمد منعم بن شیخ جعفر الاعدادی کی تصنیف ہے ۔ مؤلف نے اس کی ترتیب کے لئے اپنے باپ کے تجربات اور آثار کے علاوہ ابی عبداللہ مغربی کی عربی کتاب 'بحر العیون' سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ اس نے یہ رسالہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے کچھ عرصہ بعد لکھا ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری (۱۱ : ۴۳) میں موجود ہے ۔

۳۔ 'کتاب جفر' ۔ علم جفر و تکسیر پر یہ رسالہ فقیر اللہ بن عبدالرحمٰن نے ۱۷۴۹ء/۱۱٦۲ھ میں ترتیب دیا ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۲۱۱۵) میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے ۔

۴۔ 'رسالۂ تشریح الحروف' ۔ علم جفر و تکسیر اور جوتش وغیرہ پر میر حسین دوست سنبھلی کی تصنیف، اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ۔

فن حرب و سپہ گری

فنون جنگ اور سپہ گری پر قدیم ادوار کے مسلمان علماء نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں، جن

میں سے غزنوی دور کے عالم فخر مدبر کی 'آداب الحرب و الشجاعت' کو غیر فانی شہرت حاصل ہے ۔ اسی طرح ایرانی دانشمند نظام الدین کی 'مضمار دانش' جو ۱۶۶۰ء/۱۰۷۱ھ میں لکھی گئی ہے، بہت مشہور ہے ۔ تیر اندازی بھی چونکہ فنون جنگ میں شامل تھی لہذا مسلمانوں نے بہت سے رسالے اس فن پر ترتیب دیے ۔ ان میں رسالہ 'ہدایت الرمی' جو محمد بدھ نے بنگال میں سولھویں صدی عیسوی/دسویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھا، 'رسالہ تیر اندازی' جو پندرھویں صدی عیسوی/ نویں صدی ہجری کی تصنیف ہے، اور 'رسالہ تیر اندازی' از صانع الغنی اصفہانی، زیادہ مشہور ہیں ۔

زیر بحث دور میں بھی ان فنون پر متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں 'تائید بصارت' 'فتح المجاہدین'، 'ضوابط سلطانی' وغیرہ زیادہ اہم ہیں ۔ اس دور میں کچھ رسالے انگریز حکام کی زیر نگرانی ترتیب دیے گئے جن میں نسبۃً جدید طریقے بیان ہوئے ہیں ۔ اس دور میں فنون جنگ، سپہ گری اور تیراندازی پر لکھی گئی کتب حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ 'تائید بصارت یا رسالہ شمشیر شناسی' ۔ تلوار کی اقسام کو پہچاننے اور تلوار چلانے کے فن پر یہ کتاب مرزا لطف اللہ نثار کی تالیف ہے جو عہد عالمگیر کے عالم عبداللطیف خان تنہا کے شاگرد تھے ۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۷۰۶ء/۱۱۱۸ھ میں مکمل کی ۔ اس کے ایک قلمی نسخے کا حال انڈیا آفس فہرست (شمارہ ۳۰۵۶) اور دوسرے کا کیمبرج یونیورسٹی کی فہرست کے صفحہ ۲۲۳ پر دیا ہے ۔ ایوانو (کرزن) ص ۴۲۹ پر بھی ایک نسخے کا حال درج ہے ۔ (شیرانی ۴/۶۲۰۰) ۔

۲۔ 'فتح المجاہدین'۔ فن حرب اور جہاد کے بارے میں آٹھ ابواب پر مشتمل یہ رسالہ زین العابدین کی تصنیف ہے، جسے اس نے سلطان ٹیپو کی زیر نگرانی ۱۷۸۲ء/۱۱۹۷ھ میں ترتیب دیا ۔ اس رسالے کے متعدد قلمی نسخوں کا حال انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں درج ہے ۔ (باڈلین ۱۹۰۳ ۔ ایتھے ۵۱۷، ۱۳۷، ۲۲۱۱، ۲۲۱۷) ۔

۳۔ 'ضوابط سلطانی'۔ شاہی عہدیداروں کے امتیازی نشان، شاہی جھنڈے کا نمونہ اور سرکاری مہر یا دستخط وغیرہ کے بارے میں قوانین پر مشتمل یہ کتاب سلطان ٹیپو کی زیر نگرانی ترتیب دی گئی ۔ اس میں چار باب اور مختلف فصلیں ہیں اور غالباً یہ رسالہ ۱۷۹۶ء/۱۲۱۱ھ میں مکمل ہوا ۔ مصنف کا نام معلوم نہیں ۔ اس کتاب کے دو نسخوں کا حال انڈیا آفس لائبریری (۲۷۶۱ - ۶۲) کے ذیل میں درج ہے (ایوانو ۱۴۴۲) ۔

۴۔ 'ضابطہ امثال راہ رفتن سواری' ۔ اس رسالے میں فوجی دستوں کی تنظیم اور مارچ کرنے کے اصول و قواعد بیان ہوئے ہیں ۔ اس رسالے کا ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ فہرست ایوانو ص ۵۸۷ پر درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے اواخر میں ترتیب دیا گیا ۔

۵۔ 'حکم نامہ' ۔ ان رسالوں میں فوجی دستوں کی نقل و حرکت کے بارے میں کمانڈروں اور دوسرے افسروں کو ہدایات دی گئی ہیں ۔ یہ تین حکم نامے جو فہرست ایوانو کے صفحہ ۵۸۷ — ۵۹۷ پر درج ہیں اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں جاری ہوئے ۔ ان میں

سے ایک کی تاریخ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) اور دوسرے کی ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) ہے۔

۶۔ 'رسالۂ توپخانہ'۔ فنِ آتشبازی پر یہ رسالہ کسی گمنام عالم کی تصنیف ہے، جس میں گولہ بارود اور جنگی سامان کی مختلف چیزوں مثلاً موزہ، دنب، شہابہ، مہتاب، سندور، کرکمر وغیرہ کو بنانے اور استعمال کرنے کے طریقوں پر بحث ہوئی ہے۔ قرآئن سے پتا چلتا ہے کہ یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر یا انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کی لائبریری میں موجود ہے۔

۷۔ 'رسالۂ قواعد'۔ چھوٹے چھوٹے تین رسالوں کا یہ مجموعہ فوجی نظم کے بارے میں ہے۔ پہلے رسالے میں وہ اشعار وغیرہ ہیں جو بگل بجاتے وقت پڑھے جاتے ہیں، دوسرے میں عسکری جزئیات وغیرہ کا بیان ہے اور تیسرے رسالے میں بعض فوجی قواعد اور ضوابط جمع کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے اواخر کی یادگار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ایک مخطوطے کا حال جو تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں کتابت ہوا ہے، فہرست ایوانو ص ۷۵۸ پر درج ہے۔

۸۔ 'فائدۂ شناختنِ شمشیر'۔ اس رسالہ کا انیسویں صدی عیسوی/تیرھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ایک نسخہ فہرستِ ایوانو میں درج ہے جس میں تلوار کی قسموں کو جاننے کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ غالباً یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ (ایوانو ۱۶۲۰)۔

۹۔ 'رسالۂ سپہ گری'۔ فنِ حرب پر اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۳۲۴۲) میں موجود ہے۔ اس رسالے پر مفتی محمد امجد کی مہر تاریخ ۱۷۹۸ء/ ۱۲۱۳ھ ثبت ہے جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ رسالہ اسی دور کی تصنیف ہے۔

۱۰۔ 'رسالۂ منجنیق'۔ فنِ حرب پر یہ رسالہ لیفٹننٹ میجر اولڈ سن کی تصنیف ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا اور مطبوعہ نسخہ فہرست آصفیہ (۱ : ۸۱۲) میں درج ہے۔

۱۱۔ 'رسالہ در سپاہداری' جماعتِ انگریزیہ'۔ کسی گمنام مصنف کا یہ رسالہ انگریزوں کے فوجی قوانین اور تنظیم سپاہ وغیرہ کے متعلق ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی اصول و قواعد بھی اس میں درج ہیں۔ یہ رسالہ غالباً انیسویں صدی عیسوی/تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھا گیا۔ اس کے ایک قلمی نسخے کا حال فہرست ایوانو (کرزن) ص ۲۴۷ پر درج ہے۔

۱۲۔ 'فرمانِ قواعدِ شوال'۔ گھوڑ سوار نوجوں کے لیے فن حرب کے اصول و قواعد پر مشتمل یہ رسالہ فراشیش صاحب بہادر کی تصنیف ہے۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۸۶۴/۳) میں موجود ہے۔

تیر اندازی

۱۔ 'کشفِ اسرارِ رمل'۔ فنِ تیر اندازی پر یہ رسالہ خواجہ محمد فاضل بن خواجہ محمد قاسم کی تصنیف ہے، جسے انہوں نے ۱۷۰۰ء/۱۱۱۲ھ میں مکمل کیا۔ برٹش میوزیم ص ۱۰۴۷ اور

انڈیا آفس ۴۹۷ا اور ۳/۲۷۷۰ میں بھی اس کتاب کے نسخے محفوظ ہیں ۔ یہ رسالہ محمد باقر کی کتاب 'کشف الاسرار' (باڈلین ۱۵۶۰) ، جو علم نجوم پر ہے ، کی یاد دلاتا ہے ۔

۲۔ 'کلیات الرمی' ۔ تیر اندازی کے فن پر یہ ضخیم کتاب سید امین الدین اندخودی کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ۱۷۱۹ء/۱۱۶۲ھ میں مکمل کیا ۔ اس میں ایک مقدمہ ، پچیس کلیان اور ایک خاتمہ ہے ۔ مؤلف نے اسے محمد شاہ کے نام معنون کیا ۔ (ایتھے ۲۷۷۱) بوھار ۱ : ۱۸۵ ۔

۳۔ 'نکات الرمی' ۔ فن تیر اندازی پر یہ منظوم رسالہ میر ناصر کی تصنیف ہے جس نے اسے بعہد محمد شاہ ۱۷۲۷ء/۱۱۳۰ھ میں ترتیب دیا ۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۱۱۸۶) میں موجود ہے ۔

۴۔ 'رسالۂ تیر اندازی' ۔ گمنام مصنف کا یہ رسالہ ۲۷ ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۱۳۰۵) میں موجود ہے ۔

۵۔ 'رسالۂ تیر اندازی' ۔ تیراندازی کے فن پر یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی یادگار ہے جو اپنے استاد کا نام نور اللہ بتاتا ہے اور جگہ جگہ اسی فن کی کتاب 'دستور العمل' کا حوالہ دیتا ہے ۔ گمان غالب ہے کہ یہ رسالہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کی تصنیف ہے ۔

۶۔ 'رسالۂ تیراندازی' ۔ دو مقالوں پر مشتمل یہ رسالہ متقی ابن میر ہادی کی تصنیف ہے ۔ اس کا ایک نسخہ مکتوبہ قرن سیزدہم ہجری (انیسویں صدی عیسوی) پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۱۱۷۶) میں محفوظ ہے ۔

فن شکار ، باز نامے ، فرسنامے

شکار کھیلنا قدیم ادوار سے مسلمانوں کا محبوب مشغلہ چلا آ رہا ہے ۔ خاص طور پر مسلمان بادشاہوں اور شاہزادوں کو اس سے بہت دلچسپی رہی ہے ۔ اس وجہ سے تقریباً ہر دور کے دانشمندوں نے ایسی بےشمار کتب اور رسالے ترتیب دیے ، جن میں شکار کھیلنے ، باز اور گھوڑے پالنے ، انہیں شکار کے لئے تربیت دینے اور ان کے امراض کے علاج معالجے سے متعلق اصول و قواعد بتائے گئے ہیں ۔ ایسی کتب میں ہم بارھویں صدی عیسوی/چھٹی صدی ہجری کے خواجہ محمد صادق ایرانی کی 'دستورالصید' ، صفوی عہد کے نظام الدین کی 'مضمار دانش' ، شاہجہانی دور کے گمنام مصنف کا 'بازنامہ' اور عبداللہ خاں کا 'فرسنامہ' اور اسی عہد کے نظام الدین ساوجی کے 'فرسنامہ' کا نام لے سکتے ہیں ۔

زیر بحث دور کے اوائل میں ان فنون پر کافی کام ہوا ، لیکن جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے آ جانے سے فارسی زبان میں ایسی کتب کا سلسلہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا ۔ پھر جدید آلات کے ایجاد ہونے سے گھوڑوں اور بازوں کے ذریعے شکار کھیلنے کے بجائے لوگ آتشیں آلات سے شکار

کھیلنے لگے جس کی وجہ سے ایسی کتب کی تالیف کی ضرورت ہی نہ رہی ۔ اس دور میں ایسی کتب کے نام یہ ہیں :

۱۔ 'مرآۃ الصید' ۔ فنِ شکار پر یہ رسالہ اللہ یار جامی قوش بیگی کی تصنیف ہے جسے اس نے شہزادہ محمد معظم (بن اورنگ زیب عالمگیر) کو شکار کی تعلیم دینے کے لئے ۱۶۹۹ء/۱۱۱۰ھ میں ترتیب دیا تھا ۔ اس رسالے کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی شمار ۳/۱۸۲۵) میں موجود ہے ۔

۲۔ 'تعلیم الصید معروف بہ باز نامہ' ۔ فنِ شکار اور میرِ شکار کے فرائض کے بارے میں یہ رسالہ میر عبداللہ الحسنی بن میر پارسا کی تصنیف ہے ، جسے انہوں نے محمد شاہ کے زمانے میں ترتیب دیا ۔ اس رسالے کے دو نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور (ذخیرۂ شیرانی شمار ۱۸۲۵ ، ۱۹۱۰) موجود ہیں ، جن میں سے ایک ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ کا کتابت شدہ ہے ۔ نام سے ظاہر ہے کہ مصنف چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) کے ایرانی عالم خواجہ محمد صادق کے رسالے 'دستورالصید' سے متاثر ہے ۔

۳۔ 'تذکرۂ صیدیہ' ۔ مختلف کھیلوں اور شکار کے بارے میں یہ رسالہ شیخ علی حزیں متوفی ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ کی تصنیف ہے ۔ اس میں ایک مقدمہ تین ابواب اور ایک خاتمہ ہے ۔ فہرست ایوانو (کرزن) ۴۲۵ ، اور ریوص ۴۸۳ ، ایتھے ۱۷۱۲ پر اس کے قلمی نسخوں کا ذکر آیا ہے ۔ اس میں جانوروں کے حلال و حرام ہونے کے بارے میں بھی بحث ہوئی ہے ۔

۴۔ 'طریقۂ تیاریٔ بحری' ۔ فنِ شکار پر یہ رسالہ قربان علی کی تصنیف ہے جو شاہ عالم ثانی کے زمانے میں زندہ تھا ۔ یہ رسالہ اس نے نواب اللہ وردی کی فرمائش پر لکھا ۔ 'بحری' ایک پرندے کا نام ہے جس کے متعلق اس رسالے میں بحث ہوئی ہے ۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۱۸۲۵) میں موجود ہے ۔

۵۔ 'باز نامہ' ۔ فنِ شکار پر اس رسالے کے مصنف کا پتا نہیں چل سکا ۔ اس میں صرف گلابی اور سیاہ آنکھوں والے پرندوں کے متعلق بڑے دلچسپ مطالب بیان کئے گئے ہیں ۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ شاید یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہو ۔ اس کے دو نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی بشمارہ ۱۳۸۴ ، ۱۹۸۵) میں موجود ہیں جن میں سے ایک کی تاریخ کتابت ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء ہے ۔

۶۔ 'بازنامہ' ۔ فنِ شکار پر یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی یادگار ہے ۔ اس میں چھوٹے چھوٹے ۷۶ ابواب ہیں ۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ شاید یہ رسالہ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں لکھا گیا ۔ اس کے ایک نسخے کا حال ایوانو (کرزن) ص ۴۲۶ پر درج ہے ۔

۷۔ 'کبوتر نامہ' ۔ کبوتروں کی تربیت اور ان کے امراض کے علاج وغیرہ کے بارے میں یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی یادگار ہے ۔ اس کے ایک قلمی نسخے کا حال فہرست ایوانو (کرزن) ص ۴۲۶ پر دیا ہے ۔

۸- 'فرسنامہ' - شیخ علی حزین متوفی ۱۱۸۰/۱۷۶۶ھ کی یہ تصنیف گھوڑوں کی اقسام اور ان کے امراض کے علاج کے بارے میں ایک معلومات افزا کتاب ہے -
(بانکی پور ۳ : ۲۳۲ ، ۲۳۳)

۹- 'رسالہ در خواص الحیوان' - مختلف حیوانوں کے بارے میں یہ رسالہ بھی شیخ علی حزین متوفی ۱۱۸۰/۱۷۶۶ھ کی تصنیف ہے - اس کے ایک نسخے کا حال فہرست ریو ص ۴۸۳ پر درج ہے -

۱۰- 'رسالۂ اسپان' - گھوڑوں کی مختلف اقسام کے بارے میں ہے - اس رسالے کے مصنف کا پتا نہیں چل سکا ، البتہ اس کے آخر میں ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) کی مہر لگی ہے جس کی بنا پر اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ رسالہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے اواخر میں ترتیب دیا گیا ہو - اس کے دو نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی شمارہ ۶۳۳۵ ، ۲۳۷۵) میں موجود ہیں -

علم مساحت

علم مساحت دراصل علم ریاضی کا ایک حصہ ہے ، جس کے ذریعے زمین کی سطح کا اندازہ کرنے کے علاوہ اس کی پیمائش کی جاتی ہے - پہلے ادوار میں ایران اور برصغیر کے مسلمان علماء نے اس علم میں بہت ساری اور کتابیں لکھی ہیں - ایسی کتب میں 'درہ المساحہ' از غیاث الدین جمشید جو پندرھویں صدی عیسوی/نویں صدی ہجری کے آخر میں لکھی گئی ، 'رسالہ تسطیح و تخطیط' از غیاث الدین منصور شیرازی ، دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں لکھا گیا ، اور اسی دور میں کسی گمنام مصنف نے 'درج الجواہر و برج الزواہر' لکھ کر آذربائیجان کے نواب فخر الدولہ کو پیش کی ، بہت مشہور ہوئی - ان کتب کے بعد گمنام مصنفین نے علم مساحت میں متعدد رسالے لکھے جن سے صدیوں تک دنیا نے فائدہ اٹھایا -

زیر بحث دور میں اس علم پر صرف تین رسالوں کا پتا چل سکا ہے - اس کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ برصغیر میں انگریزی حکومت قائم ہونے سے زیادہ تر کتابیں انگریزی اور کچھ اردو میں لکھی جانے لگیں اور ان علوم پر فارسی زبان میں کتابوں کی ضرورت ہی نہ رہی - اس علم پر لکھے گئے رسالوں کے نام یہ ہیں :

۱- 'رسالۂ مساحت' - علم زراعت پر یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری میں لکھا گیا - یہ اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۱۶۷ھ پبلک لائبریری لاہور میں موجود ہے - (عباسی ۲۹۲)

۲- 'تبدیل سطوح' - نواب شمس الامراء میر فرخندہ علی خاں متوفی ۱۲۴۹/۱۸۳۳ھ کا یہ رسالہ علم حساب و مساحت سے متعلق ہے - یہ رسالہ ۱۲۵۱ھ میں شائع ہوا - (سٹوری ۲ : ۱۹)
آصفیہ ۱ : ۸۰۶

۳- 'سوالات مساحت مع حل' - علم مساحت پر یہ رسالہ مولوی ذکاء اللہ صاحب تاریخ ہند

کی تصنیف ہے، جسے انہوں نے اشاعت سے کچھ عرصہ پیشتر ترتیب دیا۔ یہ رسالہ ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔ (آصفیہ ۱ : ۸۱۶)

علمِ فلاحت و فنِ باغبانی

پاکستان و ہند زرعی ملک کی حیثیت سے خاص مقام رکھتے ہیں لہٰذا یہاں ایسے علوم و فنون کا وجود میں آنا اور پنپنا فطری بات تھی۔ نیز فلاحت و باغبانی چونکہ مسلمانوں کے ایک طبقے کا پیشہ تھا اس لیے قدیم ادوار میں ان فنون پر مسلمان علماء نے بہت سارے رسالے اور کتابیں لکھیں۔ ان آثار کی ترتیب میں برصغیر کے مسلمانوں نے اکثر قاسم بن یوسف ہروی کی 'ارشاد الزراعت' مؤلفہ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء اور عبدالعلی بیرجندی متوفی ۹۳۲ھ/۱۵۲۷ء کی 'گزارِ فلاحت' جیسی کتب ہی کو پیش نظر رکھا۔ ان کے بعد برصغیر کے بیا کرنامی ایک عالم کا 'بیاکرنامہ' مصنفہ ۹۹۷ھ/۱۵۸۸ء بھی بہت مشہور ہوا، جس میں زرعی و غیر زرعی آلات پر بہت حاصل معلومات درج ہیں۔

زیرِ بحث دور میں بھی ان علوم پر خاصا کام ہوا ہے۔ ان آثار میں کسی گمنام مصنف کی 'کتابِ زراعت' صدر الدین بن زبردست خاں کی 'زبدۃ السلاطین' احمد علی بن محمد خلیل کی 'عقبندنامہ' اور رحیم بخش کا رسالہ 'کسب نامۂ باغبانی' زیادہ اہم ہیں۔ فارسی میں ان علوم پر کتابیں صرف انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک لکھی گئیں، لیکن اس کے بعد ان علوم پر اردو یا انگریزی میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس دور میں لکھی گئی کتابوں کے نام یہ ہیں :

۱۔ 'کتابِ زراعت'۔ ہندوستان میں فصلِ خریف و ربیع کی مختلف زرعی اجناس اور سبزیات کے بونے، پالنے اور کاٹنے کے بارے میں یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی یادگار ہے، جس نے اکثر اصطلاحیں فارسی کی بجائے ہندوستانی زبانوں کی استعمال کی ہیں۔ بعض قرائن بتاتے ہیں کہ مصنف بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کا آدمی تھا۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) کیمبرج یونیورسٹی میں اور دوسرا برٹش میوزیم لنڈن میں موجود ہے۔
(ریو ص ۱۰۱۳)

۲۔ 'رسالہ در زراعت'۔ مختلف اجناس کی کاشت کے موسموں اور طریقوں وغیرہ سے متعلق یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی تصنیف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں لکھا گیا جس کا ایک قلمی نسخہ ایوانو نے ۱۲۱۴ھ کے تحت درج کیا ہے۔

۳۔ 'رسالہ در فلاحت'۔ علمِ زراعت و کاشتکاری وغیرہ پر یہ رسالہ انیسویں صدی عیسوی کے ربعِ اول کی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اس میں بارہ ابواب اور ایک خاتمہ ہے۔ اس رسالے کے ایک ناقص الاول نسخے مکتوبہ ۱۲۵۵ھ کا ذکر ایوانو نے اپنی فہرست (ذخیرۂ کرزن) میں ص ۳۴۹ پر کیا ہے۔ (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۱۶۱۲، باڈلین ۱۸۲۵)

۴۔ 'تحفۂ پنجاب'۔ زرعی آلات پر یہ باتصویر رسالہ تین مقالوں پر مشتمل ہے اور لالہ اجودھا پرشاد لاہوری کی تصنیف ہے۔ آلات کے نام فارسی، اردو، پنجابی میں بیان ہوئے ہیں۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی میں محفوظ ہے۔

۵- 'زینت البساطین' - فنِ باغبانی پر یہ رسالہ صدرالدین بن زبردست خان کی تصنیف ہے جو محمد شاہ کا معاصر تھا - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۳۲ھ (۱۷۱۹ء) پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے - (میگزین نومبر ۱۹۳۳ء : سٹوری ۱۰۹۳) -

٦- 'تحلیدیہ' - فنِ باغبانی (مختلف قسم کے پودوں کو لگانے اور پالنے وغیرہ) کے بارے میں یہ رسالہ احمد علی بن محمد خلیل جونپوری کی تصنیف ہے جس نے اسے ۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ میں مکمل کیا - خلیل نے یہ رسالہ امان اللہ حسینی کی کتابوں 'شجرۂ نہال' اور 'نسخہ' کوخ باد' کو بنیاد بنا کر ترتیب دیا ہے - اس رسالے کا ایک مخطوطہ فہرست ایوانو (کرزن) ص ۳۲۸ پر مندرج ہے -

۷- 'انتخاب رسالہ اشجار باردار و گلدار' - فنِ باغبانی ، درختوں اور پھولوں کی کاشت ، پرورش اور بیماریوں وغیرہ کے بارے میں یہ مفید رسالہ عبدالغنی بن شاہ مبارک شرف کی یادگار ہے جس نے راجہ خان بہادر نصرت جنگ متوفی ۱۸۵۰ء/۱۲٦۷ھ کے نام پر اسی سال تصنیف کیا - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۵۱ء/۱۲٦۸ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی) میں ہے -

۸- 'کسب نامہ' باغبانی' - فنِ باغبانی پر یہ رسالہ رحیم بخش کی تصنیف ہے جسے اس نے غالباً انیسی صدی عیسوی/تیرھویں صدی ہجری میں ترتیب دیا - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸٦۸ء پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے - ہمارا خیال ہے 'باغ نامہ' (ریو ۲۱۳ ب) بھی اسی رسالے کا دوسرا نام ہے - (میگزین نومبر ۱۹۳۳ء)

جواہر شناسی

جواہر اور دوسری معدنیات سے مسلمانوں کو قدیم الایام سے بہت دلچسپی رہی ہے اور ان کی پہچان اور خواص کے بارے میں 'جواہر نامہ' کے نام سے بے شمار رسالے لکھے گئے ، جن میں ہیروں اور جواہر کی اقسام ، ان کے رنگ و حجم اور ان کے خواص کے بارے میں معلومات درج ہیں - چنانچہ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں ابوبکر نے ایک رسالہ لکھا - اس کے بعد زین الدین عطار متوفی ۱۴۰۳ء/۸۰٦ھ نے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں رسالہ لکھا - پھر نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں محمد بن منصور نے 'جواہر نامہ' لکھا جو بہت مشہور ہوا -

زیر بحث دور میں بھی مسلمانوں نے مذکورہ رسالوں کو بنیاد بنا کر رسالے لکھے - البتہ جنگِ آزادی کے بعد سے ان علوم پر کوئی رسالہ فارسی زبان میں نہیں ملتا - اس دور میں مندرجہ' ذیل رسالے لکھے گئے :

۱- 'رسالہ' مروارید' - جواہر اور قیمتی پتھروں کے رنگ ، شکل اور خواص و فوائد وغیرہ کے بارے میں یہ رسالہ شیخ علی حزین متوفی ۱۷٦٦ء/۱۱۸۰ھ کی تصنیف ہے - اس رسالے میں مروارید اور دوسرے جواہرات کی اقسام بھی بیان ہوئی ہیں - اس رسالے کا ایک نسخہ ، جو خود مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے -

۲- 'مختصر جواہر نامہ' - یہ رسالہ جو محمد بن منصور کے 'جواہر نامے' کو بنیاد بنا کر ترتیب دیا گیا ہے ، جواہرات (الماس ، یاقوت ، لعل ، زمرد ، مروارید ، فیروزہ ، لاجورد ، مرجان ، قیمتی پتھروں اور عقیق وغیرہ جواہرات) کی پہچان ، رنگ ، خواص وغیرہ کے بارے میں لکھا گیا ہے - اس کے مصنف کا نام احمد بن عبدالعزیز جوہری ہے - اس میں بارہ باب ہیں اور ہر باب میں ایک قیمتی جوہر کے بارے میں بحث ہوئی ہے - اس کے ایک قدیم نسخے کا حال ایتھے (۲۷۸۰) کے تحت بھی درج ہے -

۳- 'جواہر نامہ' - جواہرات کے بارے میں بارہ ابواب پر مشتمل یہ رسالہ عبدالعزیز جوہری کی تصنیف ہے - اس میں محمد بن منصور کے جواہر نامے مصنفہ ۸۸۶/۱۴۸۱ء سے استفادہ کیا گیا ہے - قرائن سے اٹھارھویں صدی عیسوی کی تصنیف معلوم ہوتا ہے - (ریو ۷۸۹ ، ایتھے ۱۹۹۷)

علمِ تعبیرِ خواب

علمِ تعبیر مسلمانوں کا ورثہ خاص ہے جو انہیں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملا اور اس میدان میں انھوں نے عربی و فارسی کتب و رسائل کے ڈھیر لگا دیے - قدیم ادوار میں علمِ تعبیر پر جو آثار زیادہ مشہور ہوئے ان کے نام یہ ہیں :

'تحفۃ الملوک' از حذیفہ بن احمد ، 'تحفۃ الرؤیا' از حنیفہ بن احمد ، 'تعبیر الرؤیا' از ابو ریحان اندلسی ، 'کافی الرؤیا' ، 'حدایق الرؤیا' ، 'دستور' از ابراہیم کرمانی ، 'ارشاد' از جابر مغربی ، 'جوامع ابن سیرین' ، 'تعبیر قادری' ، 'کتاب التحبیر فی علم تعبیر' ، 'کامل التعبیر' از ابوالفضل جو چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں لکھی گئی ، 'تعبیر نامہ سلطانی' یا 'کنز الرویای مامونی' از قاضی اسمٰعیل جو ۱۳۶۱/۷۶۳ھ میں لکھی گئی - 'تعبیر نامہ' ، 'خواب نامہ' ، 'تعبیر خواب و تحریکِ اعضا' اور 'رسالہ تعبیرِ خواب ، وغیرہ -

علمِ تعبیر پر کتابوں کا یہ سلسلہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) تک برابر جاری رہا جب کہ مغلیہ سلطنت کے زوال اور پھر جنگِ آزادی کی وجہ سے حالات ایسے ناسازگار ہوئے کہ اس علم پر تصانیف کا کام آہستہ آہستہ بند ہو گیا ، اور اگر کسی نے کوئی رسالہ لکھا بھی تو اردو میں - اس دور کے متعدد رسالے ایسے بھی ہوں گے جو حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے معدوم ہو گئے - اس کے باوجود ہم نے اس دور میں علمِ تعبیر پر دو رسالوں کا سراغ لگایا ہے جو حسب ذیل ہیں :

۱- 'تعبیر نامہ' - علمِ تعبیرِ خواب پر یہ رسالہ عظیم الدین نے ۱۸۴۵/۱۲۶۱ھ میں ترتیب دیا - اس کا ایک قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے - (ڈھاکہ ۳۲۶)

۲- 'جواہر التعبیر' - علمِ تعبیر پر یہ رسالہ منشی دیبی پرشاد نے ترتیب دیا - اس رسالے کا ایک نسخہ (مطبوعہ ۱۸۸۲ء) کتب خانۂ آصفیہ (۲ : ۱۲۷۲) میں موجود ہے -

اوزان و مقادیر

ان علوم و فنون پر مسلمانوں کے آثار کی مجموعی تعداد اگرچہ بہت زیادہ نہیں ہے تاہم مختلف ادوار میں ایسے متعدد رسالے لکھے گئے ۔ چنانچہ قاضی زادہ رومی متوفی ۹۳۱ھ/۱۵۲۳ء کا 'رسالہ اوزان و مقادیر' اور محمد مومن بن علی الحسینی کا اسی نام کا رسالہ ، جو محمد قطب شاہ والئ گولکنڈہ (۱۰۲۰ - ۱۰۳۵ھ/۱۶۱۱ - ۱۶۲۵ء) کے لیے لکھا گیا ، صدیوں تک لوگوں کے مطالعہ میں رہے ۔ مغلیہ دور میں بھی بعض ایسے رسائل کا پتا چلتا ہے ۔ زیر بحث دور میں ان موضوعات پر جن تین رسالوں کا پتا چلایا جا سکا ہے ۔ ان کے نام یہ ہیں :

۱۔ 'رسالۂ اوزان شرعی و عرفی' ۔ وزنوں ، مقداروں ، پیمائشوں اور سکّوں کے بارے میں یہ رسالہ شیخ علی حزین متوفی ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء کی یاد گار ہے ۔ (بانکی پور ۳ : ۲۳۲ ، ریو ۴۸۳ ، ایوانو (کرزن ۵۰۲) ۔

۲۔ 'تحقیق الاوزان' ۔ وزنوں اور مقداروں کے سرکاری پیمانوں کے متعلق یہ رسالہ عبد اللہ بن اشرف صدیقی کی تصنیف ہے جو غالباً انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں زندہ تھے ۔ یہ رسالہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں لکھنئو سے شائع ہوا ۔ (سٹوری ۲ : ۳۴) ۔

۳۔ 'رسالۂ تفصیل سکّہ' ۔ قدیم زمانے سے لےکر شاہ عالم کے عہد تک ہندوستانی بادشاہوں کے سکّوں اور ٹکسال کے فن پر یہ رسالہ ۱۱۸۶ھ/۱۷۸۲ء میں نواب یحییٰ خان نے بمقام فیض آباد لکھا ۔ اس کے ایک قلمی نسخے کا حال انڈیا آفس لائبریری (شمارہ ۲۷۸۹) کی فہرست میں دیا گیا ہے ۔

آشپزی و طبّاخی

زیر بحث دور کے بعض مصنفین کی نگارشات سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ قدیم ادوار کے مسلمانوں نے ان فنون پر متعدد رسالے ترتیب دیے ، جن میں نعمت خاں عالی اور نواب قاسم علی خان کے رسالے زیادہ اہم ہیں ۔ برّصغیر میں رائج اصطلاحوں کے اعتبار سے بھی یہ رسالے اہم ہیں ۔ ان فنون پر لکھے گئے رسالے درج ذیل ہیں :

۱۔ 'خوانِ نعمت' ۔ مختلف کھانوں کے پکانے کے طریقوں اور فنِ طباخی و آشپزی کے بارے میں یہ کتاب نعمت خاں عالی شیرازی متوفی ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء یا ۱۷۱۰ء یا ۱۱۲۲ھ کی تالیف ہے ۔ اس رسالے کے متعدد نسخے دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں ۔

۲۔ 'الوانِ نعمت' ۔ مختلف قسموں کی شیرینی بنانے کے طریقوں پر مشتمل یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی یادگار ہے ور غالبا اٹھارھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے ۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (۲ : ۱۷۶۲) میں موجود ہے ۔

۳۔ 'لذب الطعام' ۔ کھانوں کی اقسام پر یہ رسالہ غالب علی خان کی تصنیف ہے ۔ اس رسالے کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۲۳۵۲) میں موجود ہے ۔

۴۔ 'منتخب النعم'۔ مختلف کھانوں کے متعلق یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی کی یادگار ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (۲ : ۱۷۶۲) میں موجود ہے۔

۵۔ 'منتخب الطعام'۔ فنِ طباخی و طعام پزی پر یہ رسالہ آصف الزمان فرنگی کی تصنیف ہے جو غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی/بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں زندہ تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے بائیس باب ہیں اور ہر باب میں کسی ایک کھانے کے اجزاء اور پکانے کی ترکیب بیان کی گئی ہے۔ اکثر اصطلاحیں وہی ہیں جو ہندوستانی معاشرے میں رائج ہیں۔ اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۶۸۹) میں موجود ہے۔

۶۔ 'مختصراتِ نسخہ' چند'۔ نان، پلاؤ، کھچڑی اور چند دوسرے کھانوں کے پکانے کے بارے میں یہ رسالہ نعمت خان عالی شیرازی کی کتاب 'خوانِ نعمت' سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے ایک قلمی نسخے کی تفصیل انڈیا آفس لائبریری (شمارہ ۲۷۹۲/۲) کی فہرست میں درج ہے۔

۷۔ 'رسالۂ ماکول و مشروب'۔ مختلف کھانوں اور مشروبات کی اقسام وغیرہ کے متعلق یہ منظوم رسالہ عبدالقادر ثناخوان کی تصنیف ہے جس نے اسے ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں مکمل کیا۔ اس کے قلمی نسخوں کا ذکر فہرست ایتھے ۲۳۶۶ - ۶۹ اور فہرست ایوانو ۸۸۱ کے تحت آیا ہے۔ عباسی ۱۶/۱۱۴ کے مطابق یہ رسالہ یوسفی کی تألیف ہے جو ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء کے قریب آدابِ خورد و نوش کے بارے میں لکھا گیا۔ شاید کتب خانۂ آصفیہ (۲ : ۱۷۶۲) کا رسالہ 'خلاصۃ الماکولات و المشروبات' بھی یہی ہو۔

۸۔ 'ترکیبِ چند اقسام در صنعتِ پختِ طعام'۔ نواب قاسم علی خان بہادر قیام جنگ کے مطبخ میں جو کھانے پکتے تھے، ان کی ترکیب وغیرہ پر مشتمل اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۱۸۷) میں موجود ہے۔

کھیلیں

جیسا کہ 'سردار نامہ' کے مصنف نے اشارہ کیا ہے، قدیم ادوار کے مسلمان علماء نے عربی اور فارسی میں متعدد رسالے اور کتابیں لکھی تھیں۔ زیرِ بحث دور میں بھی برصغیر کے مسلمان مصنفین نے کھیلوں پر کافی تعداد میں رسائل ترتیب دیے لیکن دوسرے کھیلوں کی بہ نسبت شطرنج پر لکھے گئے رسائل زیادہ مشہور ہوئے۔ دوسرے علوم کی طرح کھیلوں پر فارسی میں رسائل لکھنے کا کام صرف اٹھارھویں صدی عیسوی تک ہوتا رہا، جب کہ اس کے بعد ان موضوعات پر اُردو اور انگریزی میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس دور میں کھیلوں پر مندرجۂ ذیل رسالوں کا پتا چلتا ہے:

۱۔ 'بشاشت الکلام'۔ ایک بہت ہی دلچسپ کھیل کے متعلق یہ کتاب ملک الدین کی تصنیف ہے، جسے اس نے اپنے بھائی کے ایجاد کردہ ایک کھیل بنام ''محبوبہ کا کھیل'' کی تقلید میں

غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایجاد کیا - فارسی الفباء کے بیس حروف کو باری باری وہ محبوبہ کے نام کا پہلا حرف بناتا ہے ، پھر ایک منظوم سوال ہوتا ہے جس کا جواب بھی اسی حرف سے شروع ہوتا ہے - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) باڈلین لائبریری (شمارہ ۱۸۸۸) میں موجود ہے -

۲- 'سردار نامہ' - شطرنج کے کھیل پر یہ رسالہ شیر محمد خان ایمان کی تصنیف ہے جسے اس نے دکن کے حاکم نظام الملک آصف جاہ (۱۷۶۱ء - ۱۸۰۲ء/۱۱۷۵ھ - ۱۲۱۷ھ) کی فرمایش پر ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں مکمل کیا - یہ رسالہ اس نے عربی اور فارسی کی قدیم کتابوں سے فائدہ اٹھا کر لکھا ہے -

۳- 'بساطِ غریب' - شطرنج کے اصول و قواعد پر یہ رسالہ محمد نصیر الدین نقش کی تصنیف ہے - اس رسالے کا ایک مطبوعہ نسخہ ، جو ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا ، کتب خانۂ آصفیہ (۲ : ۱۷۵۶) میں موجود ہے -

۴- 'مجموعۃ العجائب' - قواعد و اصولِ شطرنج کے بارے میں یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی یادگار ہے - اگرچہ اس رسالے کا صحیح سالِ تالیف معلوم نہیں ، تاہم گمانِ غالب یہ ہے کہ اس کا مصنف تیرھویں صدی ہجری بمطابق انیسویں صدی عیسوی کے علماء میں سے تھا - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی نمبر ۴۴۴۹) میں موجود ہے -

فنونِ متفرق

جن اہم اور مقبولِ عام علوم و فنون کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ، ان کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے فنون پر بھی مسلمان عالموں نے رسائل چھوڑے ہیں ؛ مثلاً زلزلہ کے متعلق ، مہر کنی کے بارے میں ، حجامت بنانے کے اصول ، کشتے مارنے کے طریقے ، آہنگری ، عطر سازی اور رنگ رزی وغیرہ - ان فنون میں حجامت بنانے پر 'محلوق نامہ' نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) ، مہر کنی پر 'کنز الکتاب' کے نام سے رحمتی کے قلم سے ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں ، زلزلوں پر منظوم رسالہ مغلیہ دور میں اور عطریات پر 'عطریۂ نورس شاہی' کے نام سے نظام الدین محمود کا رسالہ ابراہیم عادل شاہ کے نام لکھا گیا - لیکن زیرِ بحث دور میں ان فنون پر کوئی رسالہ فارسی میں نہیں ملتا ، البتہ رنگرزی ، آہنگری اور کشتے مارنے پر اس دور میں بھی رسالے لکھے گئے جو درجِ ذیل ہیں :

۱- 'رسالۂ عطریات و رنگرزی' - ارگجہ ، عودتی اور عبیر خاصہ کی تیاری اور رنگرزی کی تیاری اور رنگرزی کے فن پر یہ رسالہ سلطان ٹیپو کی تحریروں کو بنیاد بنا کر لکھا گیا - اس میں دو باب ہیں اور اس کے ایک قلمی نسخے مکتوبہ ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) کا حال انڈیا آفس لائبریری (۲۷۸۵) کے ذیل میں درج ہے -

۲- 'رسالۂ آہنگری' - آہنگری کے فن پر اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی

لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۱۰۲۱) میں موجود ہے۔ قراین سے یہ رسالہ انیسویں صدی عیسوی/ تیرھویں صدی ہجری کی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ 'کشتہ سازی (رسالہ در کشتن رسائن)' سونے ، چاندی اور فولاد وغیرہ کے کشتے مارنے کے متعلق یہ رسالہ کسی گمنام مصنف کی یادگار ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ' باڈلین شمارہ ۱۸۵۳ کے تحت درج ہے۔ (باڈلین ۱۸۷۳)

دوائر المعارف یا قاموس

دائرۃ المعارف یا قاموس کی قسم کی کتابیں لکھنے کا رواج بھی مسلمانوں میں قدیم ایام سے چلا آتا ہے۔ ایسی کتب میں مختلف علوم و فنون پر ابواب لکھے جاتے تھے۔ ان قاموسوں میں امام فخر رازی کی 'حدائق الانوار'، محمد بن عمر رازی کی 'جامع العلوم'، محمد فاضل سمرقندی کی 'جواہر العلوم' جو ہمایوں کو پیش کی گئی، 'مجموعۃ الصنائع' از میر یحیٰی جو ۱۰۳۳/۱۶۲۳ء سے پہلے لکھی گئی، مرزا خان کی 'تحفۃ الہند' جو عالمگیر کے نام لکھی گئی اور محمد معالی سلفی کی 'گلشن حکمت' کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

زیر بحث دور میں بھی ایسے دائرۃ المعارفوں کی کمی نہیں رہی اور برّصغیر کے مسلمان دانشمندوں نے تقریباً سبھی علوم کے بارے میں قاموس لکھے ہیں۔ ان میں 'رشحات الفنون'، 'مطالع الہند'، 'جامع بہادر خانی'، 'مرآت العلوم'، 'جامع العلوم' اور 'مطلع العلوم' زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس دور کے سارے قاموس حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ 'رشحات الفنون'۔ مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، طب، صرف، معانی، فقہ و حدیث وغیرہ پر یہ قاموس امین الدین ہروی نے ۱۱۲۳/۱۷۱۱ء میں ترتیب دیا۔ اس کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم کی لائبریری میں (ریو ۱۰۵۴) اور دوسرا بانکی پور کے کتب خانے (۹ : ۱۷۱) میں موجود ہے۔

۲۔ 'تحفۂ مجلسِ دبیر'۔ صرف و نحو، عروض و قوافی، اقسامِ شعر، علمِ سیاق، مساحت، زراعت اور تقویم وغیرہ سے متعلق گیارہ ابواب پر مشتمل یہ قاموس سید شاہ ولی الحسینی کی تصنیف ہے جسے انہوں نے ۱۱۴۸/۱۷۳۵ء میں مکمل کیا۔ اس قاموس کا ایک قلمی نسخہ جسے مصنف نے ۱۱۵۰/۱۷۳۷ء میں اپنے ہاتھ سے کتابت کیا، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۱۴) میں موجود ہے۔

۳۔ 'جامع العلوم'۔ مختلف علوم و فنون پر یہ قاموس محمد فضل امام خیرآبادی نے ۱۱۴۱/۱۷۲۸ء میں ترتیب دیا۔

۴۔ 'منتخبِ عزیزی'۔ ادب اور علوم کی کتابوں کے انتخاب پر مشتمل یہ مخزن محمد عزیزالدین عالمگیر ثانی نے ۱۱۶۷/۱۷۵۳ء میں مکمل کیا۔

۵- 'ترجمۂ سبعیات' - تاریخ ، جغرافیہ ، ہیئت و مذہب وغیرہ ایسے متعدد علوم سے متعلق یہ مخزن غلام رسول حلوت کی تصنیف ہے جو ۱۷۷۷ء/۱۱۹۱ھ کے لگ بھگ زندہ تھا - اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۱۰۳۷) میں موجود ہے -

۶- 'مطالع الہند' - مختلف علوم و فنون مثلاً فلسفہ ، حساب ، ہندسہ ، ہیئت ، نجوم ، موسیقی اور ہندوستان کی بہت سی رسوم پر یہ کتاب سلامت علی طبیب ولد شیخ محمد عجیب کی تصنیف ہے - ہیئت و ہندسہ کی بحث میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی 'تحریر اقلیدس' کا ذکر ملتا ہے - اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۰۸ء/ ۱۲۲۳ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی) میں موجود ہے - یہ رسالہ سلطان حذاقت خان کی فرمایش پر لکھا گیا اور پانچ مطلعوں اور ایک تکملہ پر مشتمل ہے - ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (۲ : ۱۷۰۴) میں بھی موجود ہے -

۷- 'قوانین تجارت' - علم حساب ، سیاق ، اصول تجارت ، مساحت اور اوزان وغیرہ سے متعلق یہ قاموس کسی گمنام عالم نے ۱۸۰۶ء میں لکھی - اس قاموس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (۲۱۸۲) میں موجود ہے -

۸- 'گلدستہ ہمیشہ بہار' - علم سیاق ، حساب ، رمل اور قوافی ایسے علوم و فنون پر یہ رسالہ قادر بخش کی تصنیف ہے جس نے ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں اسے مکمل کیا - اس رسالے کا ایک ناقص الاوسط نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۸۸۳) میں موجود ہے -

۹- 'مخزن الفواید' - عروض ، قوافی ، نجوم ، موسیقی اور صنائع شعری وغیرہ ایسے علوم پر یہ قاموس مولوی محمد فائق نے ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں نواب شجاع الدولہ کے لیے لکھی - اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی (نمبر ۳۳۰۹) میں موجود ہے -

۱۰- 'خزانۃ العلم' - علم ریاضی (حساب ، ہندسہ اور ہیئت و نجوم وغیرہ) پر یہ ضخیم کتاب ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ میں مسٹر ہاکنس کی فرمایش پر انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی - اصطلاحات کی تشریح کے اعتبار سے بےحد مفید کتاب ہے - مخطوطے : انڈیا آفس ۲۲۶۱ - مطبوعہ ۱۸۳۷ء بمقام کلکتہ -

۱۱- 'مطلع العلوم و مجمع الفنون' - مختلف علوم و فنون پر یہ قاموس واجد علی خان کی تصنیف ہے جو غالباً وہی شخص ہے جس نے ۱۸۱۸ء/۱۲۳۳ھ کے قریب 'گلشن جنگ' کے نام سے پونا کی تاریخ لکھی (سٹوری ۷۶۳) - اس قاموس کا ایک نسخہ مطبوعہ ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ کتب خانۂ آصفیہ (۲ : ۱۷۶۸) اور اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری (۱ : ۱۹۸۴) میں موجود ہے -

۱۲- 'جامع بہادر خانی' - علم و حساب و ہندسہ و ہیئت ، اجرام ، مساحت ، نجوم اور تقویم وغیرہ پر یہ ضخیم کتاب ابوالقاسم عرف غلام حسین جونپوری کربلائی کی تصنیف ہے ، جس نے اسے ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ میں مکمل کیا - اس میں ایک مقدمہ ، چھ خزینے اور خاتمہ ہے - اس کے ایک مخطوطے کا حال فہرست ایوانو (ذخیرۂ کرزن) کے ص ۴۰۲ پر درج ہے - (آصفیہ ۱ : ۸۱۲ : پر ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۵۰ھ درج ہے - سٹوری ۲ ; ۲۰ ، ۹۹) قلمی نسخے ایوانو (کرزن) اور ریو کی

فہرست میں ہیں ۔

۱۳- 'مرآت القوانین' ۔ تین حصوں پر مشتمل یہ کتاب علم سیاق و حساب ، مساحت و پیمایش اور نجوم و تاثیرات قمر کے بارے میں لکھی گئی ۔ مصنف کا نام منشی گنیش داس بدھرہ ہے جو ۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ تک زندہ تھا ۔ نجوم و حساب وغیرہ پر یہ نہایت اہم کتاب ہے ۔ اس کتاب کا ایک معاصر قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ شیرانی (نمبر ۲۳۲) میں موجود ہے ۔

۱۴- 'محاصل القوانین' ۔ مختلف علوم و فنون پر یہ مخزن سید غلام جیلانی شجاعت کی تصنیف ہے ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مطبوعہ ۱۸۸۴ء کتب خانہ آصفیہ (۲ : ۱۶۶۸) میں موجود ہے ۔

۱۵- 'منتخبات محمدی در صنائع' ۔ مختلف صنعتوں کے بارے میں یہ قاموس مرزا محمد ملک الکتاب کی تالیف ہے جو ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ تک زندہ تھا ۔ اس قاموس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ (۲ : ۱۷۵۶) میں موجود ہے ۔

۱۶- 'مفتاح الرشاد' ۔ محمد مسیح الدین خان بہادر کے لکھے ہوئے اس قاموس میں مختلف علوم و فنون کے اصول و قواعد کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں ۔ اس قاموس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ (۲ : ۱۷۶۸) میں موجود ہے ۔

نواں باب

لغات ، زباندانی و زبان آموزی ، شرحیں ، فرہنگ ، قواعد

اس باب میں مندرجہ ذیل انواع زیرِ نظر ہیں :

(الف) ۱- لغات - ۲- فرہنگ - ۳- نصاب

(ب) شرحیں اور قواعدِ زبان

یہ بحث دو واضح حصوں میں تقسیم ہوگی (۱) ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اور (۲) ۱۸۵۷ء سے اب تک - اس باب میں ۱۸۵۷ء تک کی تفصیلات ہیں -

یہ دور زبان آموزی ، زبان دانی اور تحقیقِ زبان کے اعتبار سے فارسی ادبیات کا اہم دور ہے - اسی وجہ سے اس دور میں لغات کی تدوین اور زبان آموزی اور زبان فہمی کی طرف سابقہ دور سے بھی زیادہ توجہ ہوئی - چنانچہ اس مقصد کے لئے ہر قسم کی کتابیں لکھی گئیں جن کی تفصیل آگے آتی ہے -

تحقیقِ الفاظ و محاورات کی یہ تحریک اس دور کے سیاسی اور معاشرتی حالات کے تابع تھی -

سیاسی حالات میں زیادہ اہم وہ نسلی شعور تھا جو شاہجہان کے بعد ہندوستان میں شدّت اختیار کر گیا تھا - ملکی انتظام اور عام معاشرت میں دو واضح طبقے نظر آتے ہیں ؛ ایرانی اور تورانی - دورِ عالمگیر میں یہ احساس بڑھ گیا اور اس کے بعد کی ساری سیاست میں اس احساس نے نمایاں حصہ لیا -

ہندوستان کا فارسی ادب بھی اس سے متاثر ہوا - شاعری میں استعمالِ ہند اور سبکِ ہندی کی بحثوں نے ایک مناظراتی رخ اختیار کیا - شاہجہان کے عہد میں شیدا ہندی اور ملا محمد جان قدسی کے ادبی معارضے نے زمانے کی سب سے بڑی بحث کی صورت اختیار کر لی تھی اور

جب عالمگیر کی وفات کے بعد محمد شاہ اور احمد شاہ کا دور آیا تو یہ نزاع معاشرے کے ہر لکھے پڑھے آدمی تک پہنچ چکی تھی۔ نیا واقعہ یہ پیش آیا کہ محمد علی حزیں ایران سے شاہجہاں آباد (دہلی) میں وارد ہوئے تو انہوں نے فارسی گویانِ ہند کے متعلق بہت سی ناگوار باتیں کہہ ڈالیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو اس دور کے ممتاز فارسی داں اور عالم تھے، حزیں کی شاعری پر اعتراض کئے اور ایک رسالہ 'تنبیہ الغافلین' لکھا جس میں حزیں کے اشعار پر گرفت کی۔ خانِ آرزو کی بہت سی اور کتابوں میں بھی اس بحث کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مثلاً 'داد سخن'، 'مثمر' (جو قواعدِ زبان پر فارسی میں ایک عمدہ کتاب ہے) اور 'چراغِ ہدایت' (جو فارسی تازہ گویوں کے الفاظ کا فرہنگ ہے) وغیرہ میں اس نزاع کی جھلک بار بار دکھائی دیتی ہے۔

خانِ آرزو کا موقف یہ تھا کہ قادر سخنانِ ہند کے تصرفات (الفاظ و محاورہ میں) مخلِ فصاحت نہیں۔ بلکہ کثرتِ مطالعہ اور مشق و ریاضت کے باعث وہ 'زمرۂ اہلِ زبان' میں شامل ہیں۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے عربی دانانِ عجم کے تصرفات کا حوالہ دیا یا اس تفریس کو حجت بنایا جو شعرائے فارسی کے کلام میں ملتی ہے۔ انہوں[1] نے ایک بحث میں ایک ایرانی سے یہ بھی کہا کہ تم نے فارسی اپنی بڑی بوڑھیوں سے سیکھی ہے اور ہم نے خاقانی و انوری سے سیکھی ہے۔ لہذا ہمیں زبان میں سند ہونے کا ترجیحی حق حاصل ہے۔ خانِ آرزو نے یہاں تک لکھ دیا کہ پرانے اہلِ زبان تو ہمارے لئے سند ہیں مگر جدید اہلِ زبان ہمارے لئے سند ہی نہیں کیونکہ ان کے استعمالات غیر فصیح ہیں۔

خانِ آرزو کے موقف کے حق میں اور اس کے خلاف متعدد رسالے[2] لکھے گئے — اور اس کا اثر لغت نگاری پر بھی پڑا۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ میرزا غالب کی 'برہانِ قاطع' والی بحث میں ایک بار پھر اس کی گونج 'قاطع برہان' کی صورت میں سنائی دیتی

---

(۱) بحوالہ 'دربار ملی'۔ [illegible]
ایک مکتوب میں درج [illegible]
(۲) میر محسن اکبر آبادی: [illegible] و [illegible]
رجم الشیاطین اور رسالہ در [illegible]
وغیرہ۔

ہے –– اس کے بعد زمانہ انگریزوں کا آ گیا اور ع ''آن قدح بشکست و آن ساقی نماند'' ––
فارسی کی بساط ہی لپیٹ دی گئی اور انگریزی نے اس کی جگہ لے لی ۔ خلاصہ یہ ہے کہ
اورنگ زیب کے زمانے کے بعد سیاسی و معاشرتی حالات نے ہندی احساس کو بڑی
تقویت دی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لغت نگاری کے ہندی دبستان کے استعمالات و محاورات کا
فصاحت و صحت کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا اور ہندوستان کے انتظامی محکموں کی
خاص اصطلاحات کے فرہنگ مرتب ہوئے (مثلاً 'چراغِ ہدایت' آرزو اور 'مرآة الاصطلاح'
آنندرام مخلص) ۔

اس دور میں ایک کوشش یہ بھی ہوئی کہ لغات کی تحقیق و تنقید کی طرف توجہ
ہوئی ۔ 'فرہنگِ جہانگیری' (جسے سابقہ تمام لغات کا جامع کہا جاتا ہے) 'فرہنگِ رشیدی'
اور 'برہانِ قاطع' کی چھان بین ہوئی اور تنقید کے اصول مقرر ہوئے ۔ چنانچہ خانِ آرزو کی
'سراج اللغات' اور 'مثمر' میں اس کی بھرپور کوشش ہوئی ہے ۔ خالص ایرانی محاورے کی
بھی جستجو ہوئی ، مثلاً وارستہ کی 'مصطلحات' میں ۔ اسی طرح محاورات پر جامع لغات کی
طرف توجہ ہوئی ۔ مثلاً ٹیک چند بہار کی 'بہارِ عجم' ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کی
لغت نگاری ، مثلِ سابق ، فارسی شاعری کی خدمت کے لئے ہوئی ۔ ان لغات میں شواہد کے
لئے بالالتزام اشعار کا استعمال کیا جاتا رہا ۔ البتہ مخلص کی 'مرآة الاصطلاح' میں نثری امثال
سے بھی استشہاد کیا گیا ہے ۔

اس دور میں عربی کی بعض اہم لغات فارسی میں منتقل ہوئیں ، یعنی عربی الفاظ کی
شرح فارسی میں ہوئی –– مثلاً فیروز آبادی کی 'قاموس' اور 'منتہی الارب' کا فارسی
ترجمہ ہوا ۔

حاجی خلیفہ کی مشہور 'قاموس الکتب' (کشف الظنون) کا فارسی میں ترجمہ
کریم الدین محمد بن علام بن عبدالسلام نے کیا (ملاحظہ ہو اشاریہ فہرست فارسی مخطوطات
انڈیا آفس) ۔ یہ اگرچہ لغت نہیں مگر اس کے ذکر سے عام علمی فضا کی نشاندہی مقصود ہے ۔

زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر اردو الفاظ کے فارسی متبادل اور اسی طرح
ترکی الفاظ کے فارسی متبادل الفاظ کے فرہنگ تیار ہوئے ۔ مثلاً بسلسلۂ اردو خانِ آرزو کی
'نوادر الالفاظ' اور اوحدین بلگرامی کی 'نفائس اللغات' اور بسلسلۂ ترکی قتیل کی

'چہار شربت' کی ایک فصل میں ۔ اس دور کی لغت نگاری کی ایک خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس میں ہندو ادیب پورا حصہ لے رہے ہیں ۔ اس کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ اس دور تک پہنچ کر ہندو ادیبوں نے کثرتِ مطالعہ و مجاہدہ کی بنا پر ایک ماہرانہ حیثیت حاصل کر لی تھی اور ان کی کتابیں بہرحال قابلِ اعتنا ٹھہرتی ہیں ـــــ اور ان میں سے بعض تالیفات ہندو ذہن کی ترجمانی بھی کرتی ہیں ۔ مثلاً 'مرآۃ الاصطلاح' میں ہم مخلص کی مصلحت شناسی کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہیں کہ وہ خانِ آرزو سے قرب کے باوجود (اور ان کی طرف جھکاؤ کے باوصف) ''آرزو - حزیں نزاع'' میں خاصا غیرجانبدار نظر آتا ہے ۔ اور وارستہ تو حزیں کا پرجوش حامی ہو کر اور ایرانی محاورہ دانوں سے ارتباط کا دعویٰ کرتے ہوئے ہندی موقف کی مخالفت کرتا ہے ۔

اس دور میں فارسی کے تعلق میں فقہ اللسان کا آغاز ہوتا ہے اور خانِ آرزو ''توافق لسانین'' (فارسی اور سنسکرت کی وحدت) کا اصول دریافت کرتے ہیں ، شرحیں لکھی جاتی ہیں اور نصاب مرتّب ہوتے ہیں ۔ اور یہ سب سرگرمی اس لئے نظر آتی ہے کہ اہلِ ہند کا ایرانی ادیبوں سے ارتباط دورِ عالمگیر کے بعد کم سے کم ہوتا جا رہا ہے ۔ اس لئے فارسی محض اکتسابی زبان بن جاتی ہے جس کی تسہیل وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی ۔ چنانچہ نصاب کی کتابیں ، فرہنگ اور شرحیں زبان آموزی کے اسی قصد سے مرتّب ہوئیں ۔ اسی طرح قواعدِ زبان اور لسانیاتی تحقیق (فقہ اللسان) کی بحث بھی آگے آئے گی ۔

فی الحال ہم ۱۸۵۷ء تک کے اہم لغت نگاروں کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی بحث دوسری فصل میں آئے گی ۔

اہم لغت نگار

سراج الدین علی خانِ آرزو[1]

ولادت ۱۶۸۹ء/۱۱۰۱ھ (یا ۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ھ بقول سفینۂ خوشگو) ۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے لیکن گوالیار سے بھی نسبت تھی ۔ وہ گوالیار کا ذکر بہت سے موقعوں پر فخر کے لہجے

---

(۱) آرزو کے یہ سوانحی حالات ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے دکتوری مقالہ ''خانِ آرزو'' پر مبنی ہیں جس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ۔

میں کرتے ہیں اور اس کی زبان کو ''افصح زبان ہا'' کہتے ہیں ۔ والد کا نام شیخ حسام الدین تھا ۔ وہ اورنگ زیب کے زمانے میں فوج میں ایک اعلیٰ منصب رکھتے تھے ۔ حسام یا حسامی تخلص سے شعر بھی کہتے تھے ۔ سلسلۂ نسب شیخ نصیر چراغؒ دہلی اور شیخ محمد غوث گوالیاریؒ تک پہنچتا ہے ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد درسیات کے دوسرے مراحل طے کئے اور عربی کی تحصیل مولانا عماد الدین سے کی ۔ چودہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز ہو گیا تھا اور پھر یہ سلسلہ (وقفوں کے ساتھ) جاری رہا ۔ ۱۷ یا ۱۸ برس کی عمر میں فوج کی ملازمت کا بھی پتا چلتا ہے ۔ لیکن اس میں زیادہ مدت صرف نہیں کی ۔

خانِ آرزو نے تحصیلاتِ مروجہ میں غیر معمولی استعداد حاصل کی ۔ عربی ، فارسی کے علاوہ ہندی (شاید سنسکرت ؟) سے بھی واقفیت تھی ۔

دہلی میں فرخ سیر کے زمانے میں بسلسلۂ ملازمت آئے ۔ اور پھر اگرچہ آکبر آباد اور گوالیار بھی جاتے رہے اور اس زمانے کے نامور ادبا و علماء سے تعلقات و روابط قائم ہوگئے ۔ محمد شاہ کے تخت نشین ہونے پر گوالیار اور آکبر آباد آئے اور بالآخر دہلی ہی میں مقیم ہو گئے ۔ (۱۷۱۹ء/۱۱۳۲ھ کے قریب ۔ دیکھیے 'سروِ آزاد' بلگرامی) ، یہاں منجملہ دوسرے صاحبانِ اثر و رسوخ کے آنند رام مخلص سے بھی دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے اور دربار کی طرف سے جاگیر ، خطاب (استعداد خان) اور منصب ہفصدی عطا ہوا ۔ آرزو کا انتقال ۱۷۵۶ء/۱۱۶۹ھ میں ہوا ۔

خانِ آرزو اپنے زمانے کے نامور عالم اور کثیر التّصانیف شخص تھے ۔ فارسی (اور قدرے اردو) شاعری کے علاوہ انہوں نے چند شرحیں ، دو رسالے ('عطیۂ کبریٰ' اور 'موہبتِ عظمیٰ') فنِ بیان و بلاغت پر ، ایک رسالہ تنقید پر ('داد سخن') ، ایک اور رسالہ 'سراجِ منیر' (قصیدہ منیر پر تنقیدی محاکمہ) ـــ اور رسالہ 'تنبیہ الغافلین' (علی حزین کے کلام پر اعتراضات) لکھا ۔ لیکن ان کے فائق کارنامے ان کی لغات سے ملتے ہیں ('سراج اللغات' ، 'چراغِ ہدایت' اور 'نوادرالالفاظ') ۔ اور ایک کتاب فقہ اللغہ پر ('مثمر') ، تذکرۂ شعراء موسوم بہ 'مجمع النفائس' ۔ اس موقعہ پر ہم صرف ان کی کتبِ لغت پر تبصرہ کریں گے اور بعد میں اپنے موقعہ پر دوسری کتب بھی زیر بحث لائی جائیں گی ۔

سراج اللغات[1]

اس لغات کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں 'فرہنگ رشیدی' اور 'برہان قاطع' کی بھرپور تنقید ہے ۔ خصوصاً مؤخرالذکر پر اس کی جرح زیادہ ہے کہ اسے برہان کا تکملہ کہا جا سکتا ہے ــــ اس کے علاوہ مذکورہ دونوں لغات میں جو کمی ہے وہ بھی پوری کی گئی ہے ۔ اس میں متقدمین کے استعمالات جمع کئے گئے ہیں ۔

'سراج اللغات' کے دیباچے میں خان آرزو نے لکھا ہے کہ 'فرہنگ رشیدی' سے بہتر کوئی لغت نہیں اور 'برہان قاطع' کی خوبی اس کی جامعیت ہے مگر ان دونوں میں اغلاط بھی ہیں ، اس لئے ان کی اصلاح کی ضرورت تھی اور یہی 'سراج اللغات' کی غرض و غایت ہے ۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۴۷/۱۷۳۴ھ ہے اور اس کے مآخذ میں 'رسالہ مجدالدین قومی' اور جملہ سابقہ لغات اور بعض شروح شامل ہیں ۔ یہ تصنیف تین وجوہ سے ممتاز ہے :

(۱) جامعیت ۔ (۲) تنقید اور (۳) تحقیق ــــ اور 'برہان قاطع' کے نقّادوں کے تو آرزو پیش رو ہیں ۔

چراغ ہدایت

خان آرزو کی یہ لغات اصطلاحات متاخرین پر مشتمل ہے ۔ اس کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے آرزو نے لکھا ہے کہ اس میں دو قسم کے الفاظ ہیں :

> "قسم اول الفاظے است کہ معانی آن مشکل بود و اکثر اہل ہند بران اطلاع نداشتند ۔
>
> قسم دوم : لغاتیکہ معانی آن اگرچہ معروف و معلوم بود لیکن در صحت بودن آن از روزمرہ اہل زبان بعضے را تردد بہم رسیدہ پس مستندات از اشعار اساتذہ آوردہ شد کہ صحیح است ۔"

آرزو نے لکھا ہے کہ یہ کتاب فارسی گویان ہند کے لئے لکھی گئی ہے ، نہ کہ زباندانان ایران و توران کے لئے ۔

---

(۱) میں نے 'سراج اللغات' خود نہیں دیکھی ۔ یہ معلومات میں نے بلاخمن کی "کنٹری بیوشنز" سے حاصل کی ہیں ۔

'مثمر' میں ایک جگہ 'چراغِ ہدایت' کے بارے میں آرزو نے لکھا ہے :

"مشتمل بر اکثر مصطلحات و مرکباتِ تازہ گویان از عہدِ ملا ظہوری تا عہد خود . . . کہ در لغات موجود نبود و مردمِ ہند بدان احتیاج داشتند بلکہ بعضے ازان چنانست کہ کم کسے را از اہلِ ایران اطلاع باشد مثل نرگسی زن کہ سر حلقۂ اہلِ زبان مثل شیخ علی حزین ہم بران اطلاع نداشت و ندارد . . . و این در واقعہ تکملہ سراج اللغہ است" -

آرزو نے اپنی اسی کتاب میں بھی استعمالِ ہند پر جابجا بحث کی ہے اور اپنے خاص مسئلہ توافقِ لسانین کی طرف بھی مختلف لفظوں کے ذیل میں اشارے کیے ہیں - کہیں کہیں حزین پر اعتراض بھی ہیں اور شعرائے ایران کے غلط تلفظ کا ذکر بھی ہے -

'چراغِ ہدایت' اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس میں دورِ مغلیہ کی دفتری اور انتظامی اصطلاحات دی گئی ہیں - کتاب چھپ چکی ہے ، اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے مجموعۂ آزاد میں ہے -

نوادر الالفاظ[1]

یہ فرہنگ اگرچہ اصولاً اردو سے متعلق ہے مگر چونکہ اردو کی تشریح فارسی میں ہے اور جابجا فارسی الفاظ کی بحث بھی آ گئی ہے اس لئے یہاں اس کا ذکر بے محل نہیں -

اس تصنیف کا مقصد بھی فارسی ہی کی خدمت ہے ؛ یعنی مقامی حضرات جن اردو (ہندی) الفاظ کے فارسی (عربی) مترادفات سے بے خبر ہیں ، ان کی امداد کے لئے 'نوادر الالفاظ' کی تدوین ہوئی ہے — اس تصنیف کا مقصد عبدالواسع ہانسوی کی ہم مقصد کتاب 'غرائب اللغات' کی تنقید بھی ہے - بعد میں اوحد الدین بلگرامی نے بھی کم و بیش اسی مقصد سے 'نفائس اللغات' لکھی جس میں اردو الفاظ کے فارسی اور (بیشتر) عربی مترادفات درج ہوئے ہیں - ہانسوی کی 'غرائب اللغات' ایک بنیادی کتاب ہے - خانِ آرزو نے اس پر اضافہ کیا ہے اور تنقید بھی کی ہے (تفصیل کے لئے دیکھیے راقم الحروف کا شائع کردہ نسخۂ نوادر ، جس کے دیباچے میں مزید چند دو زبانہ لغات کا ذکر ہے) -

---

(۱) یہ کتاب راقم الحروف نے مرتب کی اور انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے شائع کر دی ہے -

کتاب کا انداز تحقیقی ، تنقیدی اور تشریحی ہے --- اور بڑی مفید بات یہ ہے کہ تشریح کے ضمن میں اسی دور کے خصوصاً دہلی وغیرہ کے تہذیبی و معاشرتی کوائف بکثرت ملتے ہیں ۔

مثمر[1]

خان آرزو کی یہ کتاب ، کتاب لغت نہیں بلکہ ملے جلے مطالب کی حامل ہے ۔ تاہم اس کے مندرجات لغت سے الگ بھی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب فارسی کے کسی لغت نگار کے لئے ناگزیر ہے ۔ اس کے وسیع الافادہ ہونے کے باعث ، اس کے ضروری ابواب و فصول کا ایک خاکہ پیش کرنا مفید ثابت ہو گا ۔ (میرا خیال ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے 'سخندان فارس' میں اور بلاخمن نے اپنے انگریزی 'رسالہ کنٹری بیوشنز' میں اس سے بہت استفادہ کیا ہے --- اور مؤخرالذکر نے اصول لغت نگاری پر جو کچھ لکھا ہے وہ اسی کتاب پر مبنی معلوم ہوتا ہے) ۔

آغاز میں فصحاء اور عوام کی زبان کے فرق پر لکھا ہے ۔ اس کے بعد خاص ایرانی تلفظ کی بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ الفاظ جن کے آخر میں 'ان' آتا ہے ان میں الف ، واو سے کیوں بدلتا ہے ۔ آرزو کا خیال ہے کہ یہ ابتداء میں کاشان تک محدود تھا مگر ان کے زمانے میں ''اکثر مردم عراق و شیراز'' وغیرہ اسی طرح بولتے تھے ۔

اس کے بعد فارسی کے مختلف لہجوں کا ذکر ہے ۔ اس کے بعد طبقات شعرائے فارسی ہیں (جس میں مختلف طرزوں کا ذکر ہے) ۔

دیگر اہم بحثیں یہ ہیں :

۱۔ کیا ہندوستان کے فارسی ادیب قابل استناد ہیں ؟ (آرزو کا جواب اثبات میں ہے) مگر صرف وہ جو مطالعہ کی کثرت کی بنا پر زمرۂ اہل زبان میں شامل ہو چکے ہوں اور ''قادر سخن'' ہوں ۔

۲۔ کیا سب اہل زبان سند ہیں ؟ (آرزو کا جواب نفی میں ہے ۔ صرف وہ اہل زبان

---

(۱) اس کا ایک قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں ہے ۔ ایک اور نسخہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے ۔

سند ہیں جو فصیح ترین محاورہ (زبان اُردو) پر قدرت رکھتے ہوں اور اپنی
زبان کے مزاج سے شناسائی رکھتے ہوں) ۔

۳۔ پرانی فارسی لغات کا ایک جائزہ ۔ اس میں جہانگیری ، رشیدی ، برہان قاطع
وغیرہ کی تنقید ہے ۔

۴۔ فصیح الفاظ کی تشریح ۔

اس میں مخصوص تورانی الفاظ ، بعض ایرانی مستعملات اور ہندی استعمالات کا تفصیلی
بیان ہے ۔

اس کے ضمن میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایرانیانِ حال لازماً سند قرار نہیں دیے
جا سکتے ۔

۵۔ غیر فارسی الفاظ کا استعمال فارسی میں ۔

اس کے ضمن میں توافقِ لسانین کے اصول پر عالمانہ بحث کی ہے ۔

۶۔ تصرّف فارسیان در ہندی . . . ،

۷۔ توافقِ الفاظ فارسی اور ہندی زبان میں ۔

اس میں اشتراکِ الفاظ کی بحث کی ہے اور اس کی مختلف صورتیں بتائی ہیں ، (اگرچہ
بعض صورتوں میں آرزو کے خیالات سائنسی تجزیے کی تاب نہیں لا سکتے مگر سنسکرت اور
فارسی کے متحدالاصل ہونے کے سلسلے میں خاصا مواد ہے) اور لکھا ہے کہ :

''عجب است از رشیدی وغیرہ کہ در ہندوستان بودہ اند و ہیچ لحاظ
نکردہ اند کہ درین دو زبان توافق است ۔''

مختلف فرہنگ نویسوں کی غلطیاں ، ہندی الفاظ کی تفریس ، ہندی الفاظ کے استعمال
سے کلام غیر فصیح نہیں ہو جاتا ـــــ یہ بحثیں بھی ہیں ۔

آرزو نے اس کتاب میں حروفِ تہجی میں سے ہر ہر حرف کی لغوی اہمیت بیان کی
ہے ـــــ اور حرف کی دوسری انواع پر بھی عالمانہ گفتگو کی ہے ۔

(آرزو کی لکھی ہوئی شروح اور کتبِ علمِ بیان و معانی کا ذکر الگ آ رہا ہے) ۔

۳- آنند رام مخلص

آنند رام نام ، مخلص تخلص ، اصلاً سودھرہ پنجاب کا رہنے والا ، ذات کا کھتری - فارسی میں کامل اساتذہ سے استعداد حاصل کی - بسلسلۂ ملازمت دہلی میں رہا اور رائے رایان کا خطاب پایا - شعر و شاعری میں پہلے میرزا بیدل سے اصلاح لی ، پھر خانِ آرزو سے ، جن سے ان کے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے - ۱۷۵۱ء/۱۱۶۴ھ میں انتقال ہوا[1] -

مخلص کا ذکر سب تذکرہ نویسوں نے عزت و احترام سے کیا ہے - آرزو نے اسے ''از منتخبانِ روزگار'' کہا ہے - سید غلام علی نسیم امروہوی (اس زمانے کے ایک شاعر) نے لکھا تھا :

آن سپہرِ سخنوری مخلص
فخرِ عرفی و انوری مخلص

مخلص کی تصانیف یہ ہیں :

(۱) 'مرآۃ الاصطلاح' - (۲) 'چمنستان' - (۳) 'ہنگامۂ عشق' - (۴) 'کارنامۂ عشق' - (۵) 'تذکرہ' - (۶) 'پری خان' - (= مرقع تصویر) - (۷) 'رقعات' - (۸) 'دیوان مع رباعیات' - صاحبِ 'نشترِ عشق' نے مخلص کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے : ''در فارسی روش مخصوص بدست آوردہ'' ــــ ، و ''نظم را بحد اعتدال رسانیدہ'' - مخلص کی نثر بھی رواں اور سادہ ہے - خصوصاً 'چمنستان' میں اس کا اسلوب سلیس بھی ہے اور شگفتہ بھی[2] -

مرآۃ الاصطلاح

اس موقع پر مخلص کی کتاب 'مرآۃ الاصطلاح' ہمارے مدنظر ہے - یہ کتاب ۱۷۴۵ء/۱۱۵۸ء میں مکمل ہوئی - 'مرآۃ الاصطلاح' کے دیباچے میں مخلص نے اپنی

---

(۱) مزید حالات کے لئے دیکھیے : مجمع النفائس آرزو قلمی پنجاب یونیورسٹی ، ص - ۸۳۵ و خزانۂ عامرہ آزاد بلگرامی ، ص ۶۲۵ و نشترِ عشق (قلمی) ، جلد ، ۲ ، ق ۵۳۲ و چمنستانِ مخلص (مطبوعہ) ، ص ۶۲ ، فارسی قلمی کتابوں کی متعدد فہرستیں اور مخلص کی اپنی کتابیں و مخزن الغرائب سندیلوی (قلمی) و میر تقی میر - نکات الشعرا و شفیق اورنگ آبادی کا گلِ رعنا (قلمی) ، ریاض الشعراء - از والہٗ داغستانی (قلمی) -

(۲) مخلص کے باقی کمالات و اکتسابات کے لئے دیکھیے میری کتاب ''ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' -

کتاب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

''بر خلاف فرہنگ نویسان کہ بتحریرِ لغاتِ قدیم مصروف بودہ ، بہ تحقیقِ مصطلحاتِ فارسی گویانِ تازہ توجہے نمودہ آید . . . واز خدمتِ زبان دانانِ معتبر بپایۂ تحقیق رسد ۔''

تقریباً یہی غرض و غایت 'چراغِ ہدایت' کی ہے اور یہ اس زمانے کی ضرورت کے تحت تھی ۔ مغلوں کے آخری دور میں جبکہ تعلیم عام تھی اور فارسی دانوں کی بھی کثرت تھی ، صحیح اور مستند زبان کے ایک معیار کی جستجو لازمی تھی ۔ اس غرض کے لئے لغت کی کتابیں سامنے آئیں ۔ عام لوگ کتابی زبان سے آشنا تھے اور روزمرۂ وقت سے بے خبر ۔ اس ضرورت سے جدید کتابیں مدّون ہوئیں اور موجودہ کتاب بھی ان میں شامل ہے ۔

مصنف نے اس امر کی پابندی کی ہے کہ جدید شاعروں کے اشعار و عبارات سے استناد کرے ۔ چنانچہ آرزو ، سعید اشرف ، فصاحت خان راضی ، شرف الدین پیام ، محمد علی حزین ، صائب ۔ رضی دانش ، میرزا نجات وغیرہ کے اشعار اکثر بطور سند لائے گئے ہیں ۔

کتاب کے ماخذ بہت سے معلوم ہوتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے زیادہ تر انحصار 'سراج اللغات' 'حجتِ ساطع' 'مثلا ساطع' اور امثال میرزا محمد قزوینی پر رکھی ہے ۔ یہ اہم کتاب حروفِ تہجّی کے مطابق مرتب ہوئی ہے —— اور اس کی چند خصوصیات قابل توجہ ہیں :

۱۔ یہ کتاب 'بہارِ عجم' کی طرح مفصّل نہیں مگر اس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہے —— یہ بیک وقت لغت کی کتاب ، ایک بیاض ، ایک مجموعۂ لطائف و عجائبات ہے ۔

۲۔ مصنّف کے ذاتی واقعات بھی اس میں کافی ہیں ۔

۳۔ اس میں زمانے کے تہذیبی و معاشرتی حالات بکثرت ہیں ۔ مثلاً ضوابطِ شاہی کا حال ، شاہی مناصب کی تفصیل ، رسوم کا تذکرہ ، اس زمانے کی عام زندگی کے متعلق مفید معلومات (قلمِ فرنگی ، شیشے کے آلات کی صنعت ، جمعہ بازار کی سرگذشت ، قہوے کی اقسام ، پھولوں کی مختلف اقسام وغیرہ وغیرہ) ۔

۴- اس میں معاصرین کے حالات بھی ملتے ہیں اور ان کے ذاتی کوائف بھی ہیں -

۵- لغت کی پیش کش انوکھی ہے ؛ پہلے الفاظ بہ ترتیب ِ تہجی (صرف محاورات و کنایات ہیں) ، اس کے بعد تشریح کے لئے امثال ِ موزوں (اشعار) اور امثال ِ غیر موزوں (نثر) ، اس کے ضمن میں کہانیاں اور لطیفے آ جاتے ہیں ـــ اور غیر متعلق مگر نہایت مفید واقعات اور بحثیں بطور جملۂ معترضہ -

ان وجوہ سے 'مرآہ الاصطلاح' لغات سے زیادہ تہذیبی تاریخ کی کتاب بن گئی ہے - بہار نے 'بہار ِ عجم' میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے جس کا اعتراف بھی کیا ہے ، لیکن تعجب ہے کہ وارستہ اپنی ' مصطلحات ' میں اس کتاب کا ذکر نہیں کرتا[1] -

۳- سیالکوٹی مل وارستہ

سیالکوٹی مل نام ، وارستہ تخلص ، سیالکوٹ کا رہنے والا - بعض کے نزدیک لاہوری تھا (ملاحظہ ہو مؤید ِ برہان ، ص ۸) - لیکن اس کا مولد لاہور نہ تھا جیسا کہ بلا خمن کو سہو ہوا ہے[2]- وارستہ کے حالات ِ زندگی بہت کم معلوم ہوئے ہیں - شاعری میں میر محمد راغ سیالکوٹی (متوفی ۱۷۳۷ء/۱۱۵۰ھ) سے تلمذ تھا - شاعر کی حیثیت سے وارستہ کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے (مثلاً 'خزانۂ عامرہ' ، 'گل ِ رعنا' شفیق ، تذکرۂ 'کلمات الشعراء ِ سرخوش ، اور 'نشتر ِ عشق') - بعض مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیس برس ایران میں بھی رہا جہاں محاورۂ جدید کی تحقیق کرتا رہا ، لیکن قطعی معلومات نہیں مل سکیں - 'مصطلحات ِ وارستہ' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں پندرہ برس محاورے کی تلاش میں رہا اور زبان ِ دانان ِ ایران سے رجوع کرتا رہا - شاید سید سلیمان[3] اور بلاخمن نے اسی سے مذکورہ بالا قیاس کیا ہو - معلوم ہوتا ہے کہ آخری عمر میں ڈیرہ غازی خان آ گیا تھا - وہیں ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ میں فوت ہوا -

وارستہ نے شاعری بھی کی لیکن اس حیثیت سے کچھ مقام حاصل نہیں کیا - لسانی

---

(۱) یہ کتاب شائع ہونے کے قابل ہے کیوں کہ آخری دور ِ مغلیہ کے تہذیبی حالات کے سلسلے میں اہم ماخذ ہے -

(۲) ـــ کنٹری بیوشنز ، ص ۳۰ -

(۳) ـــ مقالہ رسالہ معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۱۸ء -

مسلک کے لحاظ سے وہ محمد علی حزین کا پیرو تھا - چنانچہ آرزو کی کتاب 'تنبیہ الغافلین' (در ردّ علی حزین) کے جواب میں 'رجم الشیاطین' کے نام سے ایک رسالہ لکھا - اگرچہ اپنی کتاب 'مطلع السعدین' میں آرزو کو سراج المحققین لکھتا ہے اور اس کی کتاب 'مثمر' کا بھی ذکر کرتا ہے - وارستہ کی تصنیفات کے نام یہ ہیں :

(۱) 'مصطلحات الشعراء' - (۲) 'مطلع السعدین' - (۳) 'صفاتِ کائنات' یا 'عجائب و غرائب' - (۴) 'جواب شافی' یا 'رجم الشیاطین' (۵) 'جنگ رنگا رنگ' (؟ = تذکرۂ وارستہ') - ان میں سے یہاں صرف 'مصطلحات' کی تشریح دی جا رہی ہے -

مصطلحات الشعراء

وارستہ کا شاہکار اس کی تحقیقی کتاب 'مصطلحات الشعراء' ہے - کتاب شاید ۱۷۶۶ء/ ۱۱۸۰ھ میں ختم ہوئی - گویا یہ وارستہ کی آخری تصنیف ہے کیوں کہ وارستہ اسی سال فوت ہوا تھا - بہرحال اس کتاب کی تدوین میں وارستہ کو بڑی محنت کرنی پڑی اور لغاتِ قدیم و جدید سے استفادے کے بعد اس نے صرف ان محاورات کو جمع کیا جو تازہ استعمال کے مطابق تھے- اس سلسلے میں کئی کتابوں سے فائدہ اٹھایا جن میں معاصرین کی کتابیں ('مرآۃ الاصطلاح' مخلص اور 'بہارِ عجم') بھی شامل ہیں - آغا احمد علی نے 'مؤیدِ برہان' میں لکھا ہے کہ ''مصطلحات در بیانِ لغات و محاوراتِ تازہ گویان است ... از زبان دانانِ ایران دیار محاورات اخذ کردہ[۲]'' - 'مصطلحات' کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی تنقیدی نظر ہے - وہ پرانی لغات کے نتائج و تحقیق کو سوچے سمجھے بغیر قبول نہیں کر لیتا بلکہ ہر ہر لفظ اور ہر ہر محاورے کو بڑی چھان بین کے بعد اپنی کتاب میں جگہ دیتا ہے - اس کا نقطۂ نگاہ خالص ایرانی ہے--- اور وہ آرزو اور علی حزین کی نزاعِ ادبی میں مؤخرالذکر کا طرفدار ہے - اس نے آرزو کی تحقیق پر (جو چراغِ ہدایت میں ہے) خاص طور سے تنقید کی ہے اور معیار وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا - 'سراج اللغات' پر اعتراض کئے ہیں اور ایک موقعہ پر لکھا ہے :

''اے کاش بہ شعرائے ایران کہ زبان دانی حق ایشان است تمسک می جست

---

(۱) ان کتابوں کی تفصیل کے لئے دیکھیے میری کتاب ''ادبیات فاسی میں ہندوؤں کا حصہ'' ص ۱۴۴ ، (مجلس ترقی ادب ایڈیشن) -

(۲) موید برہان ، ص - ۸ -

تا تردد از میان برخاست . . . "

وارستہ کا 'بہارِ عجم' پر بھی یہی اعتراض ہے ۔ بہرحال وہ محاورے میں اہلِ زبان ایرانیوں کی سند مانتا ہے اور نہ تو ہندی الاصل ادیبوں کو سند مانتا ہے ، نہ ان کے تصرفات کو صحیح سمجھتا ہے ۔

'مصطلحاتِ وارستہ' کی یہ اہمیت بہرحال مسلّم ہے کہ معاصر لغت نگاروں نے اور خصوصاً بہار نے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے اور بعض صورتوں میں تو اس کے بیانات حرف بحرف نقل کر لئے ہیں ۔ بہار نے یہ استفادہ دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے ۔

وارستہ کو اہلِ حرفہ کی اصطلاحات سے بڑی آگاہی ہے اور پیشہ وروں کے مخصوص الفاظ کا وہ خاص خیال رکھتا ہے ۔ بعض اوقات ہندی یا پنجابی متبادل الفاظ لاتا ہے اور تشریح کو آسان بنا دیتا ہے ۔

'مصطلحاتِ ترکی' میں یہ بات خاصی کھٹکتی ہے کہ اس کی تاریخی و جغرافیائی معلومات ناقص ہیں اور ترتیب میں بھی وہ کسی قاعدے کی پابندی نہیں کرتا اور سند کا بھی پابند نہیں ۔ اس کے باوجود حقیقت (بقول صاحب اللغات) یہ ہے کہ "تالیفش اگرچہ مختصر است لیکن خیلے معتبر . . ." ، اور یہ 'فرہنگِ انندراج' اور 'ہفت قلزم' کا بھی ایک ماخذ ہے اور 'بہارِ عجم' میں یہ رسالہ تقریباً سارا ہی جذب کر لیا گیا ہے ۔

۴۔ ٹیک چند بہار

بہار کے حالات بہت کم ملتے ہیں ۔ دہلی مولد ، آرزو اور شیخ ابوالخیر وفائی کا شاگرد ، دربارِ دہلی سے اسے رائے یا راجا کا خطاب ملا تھا ۔ آرزو کے دوستوں میں سے تھا ۔ گردیزی اور میر تقی میر دونوں اپنے تذکروں میں اس کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے ہیں ۔ 'تذکرۂ گلزار ابراہیم' کے مطابق شاید ایران بھی گیا تھا ۔ ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا ۔

تصانیف یہ ہیں :

(۱) 'بہارِ عجم' ۔ (۲) 'جواہر الحروف' ۔ (۳) 'نوادر المصادر' ۔ (۴) 'ابطالِ ضرورت' ۔ (۵) 'جواہر الترکیب' ۔ ممکن ہے کچھ اور تصانیف بھی ہوں لیکن معروف یہی ہیں اور یہ سب قواعد و تحقیقِ زبان سے متعلق ہیں ۔

بہارِ عجم

بہار کا اہم کارنامہ اس کی لغات 'بہارِ عجم' ہے جو بیس سال سے زیادہ مدت کی محنتِ شاقہ کے بعد تیار ہوئی اور خاصی ضخیم ہے ۔ ماخذ میں اکثر قدیم و جدید کتبِ لغت شامل ہیں ۔ کتاب کی ترتیب عام طریقے کے مطابق ہے اور مصنف کے مدنظر جامعیت ہے ۔ 'آصف اللغات' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ، ''مفردات چند و مرکباتِ بسیار'' پر مشتمل ہے اور مصنف مرکباتِ تازہ پر خاص نظر رکھتا ہے اور متقدمین و متاخرین سے نظائر لاتا ہے ۔ بہرحال اہم خصوصیت اس کی جامعیت ہے اور شاید اس کی مقبولیت کا راز بھی اسی میں ہے کہ یہ بہت سی اور کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے ۔

آرزو نے اپنی کتاب 'مثمر' میں 'بہار عجم' کے بارے میں لکھا ہے :

''و بہارِ عجم وغیرہ کہ از یارانِ فقیر آرزومت و مثلِ او درین عصر بہم نرسیدہ ۔ و درس کتاب گاہے با او صلح است و گاہے جنگ است ۔''

اس سے 'بہارِ عجم' کی اہمیت اور بہار کے موقف کے بارے میں ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے ۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندی ایرانی نزاع میں یہ بھی مخلص کی طرح معتدل مسلک کا محقق تھا ، یعنی جیسا کہ خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ وہ بعض باتوں میں آرزو کا ہم خیال ہے اور بعض میں ان سے اختلاف کرتا ہے مگر ہے یارانِ آرزو میں ۔

اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ۔ ایک ایڈیشن بہار کے ایک شاگرد اندر ۔ نے مرتب کیا تھا ـــ بہار کی باقی کتابوں پر قواعد و زباندانی کے ضمن میں گفتگو ہوئی ہے ۔

کتبِ نصاب[1]

نصاب کا مقصد تحقیقِ الفاظ و تمرینِ معانی نہیں بلکہ مبتدیوں کو زبان سکھانا ہے ـــ ہندوستان میں فارسی اور عربی چونکہ اکتسابی زبانیں تھیں اس لئے ان کی تحصیل میں

(۱) ـــ اس حصے کی جملہ معلومات پروفیسر شیرانی کی کتاب ''کتبِ نصاب'' سے ماخوذ ہیں ۔

سہولت پیدا کرنا ایک اہم تدریسی فریضہ تھا اور ایران میں عربی کی آموزش کی طرح ہندوستان میں فارسی کو بچوں کے لئے سہل بنانے کا کام یہاں مدت سے جاری تھا — 'خالق باری' (جو پروفیسر شیرانی کی تحقیق کے مطابق امیر خسرو کی تصنیف نہیں، بلکہ ابتدائی عہدِ مغلیہ کے کسی خسرو شاہ کی ہے) اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کا سلسلہ زیرِ بحث دور میں بھی جاری رہا۔

ماحول کی بدلی ہوئی تمدنی ضرورتوں کے تحت اس دور میں سہ زبان نصابوں پر پہلے سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے، عربی اور فارسی کے اردو (ملکی، پنجابی) مترادفات لائے جا رہے ہیں۔ نمونہ وہی 'خالق باری' کا ہے، مگر انداز تدوین بہت سی صورتوں میں اپنا اپنا ہے۔ اس دور میں فارسی کے مرکزِ لاہور میں بڑی ادبی سرگرمی نظر آتی ہے جس کے سیاسی اسباب کا مجمل تذکرہ تمہید میں آچکا ہے۔ لہذا مسلمان اور ہندو انشا پرداز اس دور میں اسی خطے کی اس تدریسی ضرورت کی تکمیل میں بطورِ خاص سرگرم نظر آتے ہیں۔ اس دور کے چند اہم نصاب یہ تھے:

صمدِ باری یا نصابِ سہ زبان از عبدالواسع ہانسوی

ہانسوی مصنفِ 'غرائب اللغات' اس دور کے اہم لغت نگار اور شرح نگار تھے۔ اس کتاب کی ترتیب میں یہ ندرت ہے کہ اس میں الفاظ جدا جدا عنوانوں کے تحت آئے ہیں۔ مثلاً اعضائے جسمِ انسانی، غلہ، سبزیاں، میوے، ادویہ وغیرہ — آخر میں مصادرِ مشہورہ درج ہیں۔ 'صمدِ باری' اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا آغاز صمد پاک — سے ہوتا ہے۔

نصاب از مصطفٰی (۱۷۱۴ء/۱۱۲۶ھ)

آٹھ سو صفحات میں عربی فارسی اردو کا نصاب ہے۔

مفتاحِ الفواہ از حافظ احسن اللہ لاہوری۔ (۱۷۸۱ء/۱۱۹۶ھ)

سترہ ہزار اشعار میں عربی فارسی اردو مترادفات کا منظوم نصاب۔ عربی کے لئے فارسی اور اردو متبادل لائے گئے ہیں۔ ترتیب ابتثی ہے جس میں حرفِ اول کو بنا قرار دیا گیا ہے اور حرفِ آخر بہ ترتیب ابتثی باب بنایا گیا ہے۔ درمیانی حرف کے لئے کوئی اصول نہیں۔ ابواب کی سرخیاں مصرعوں میں دی گئی ہیں۔

حافظ احسن اللہ نے ایک اردو نصاب بھی لکھا تھا جس کا نام 'ذوق الصبیان' ہے۔
نصابِ حسن (=شمع انجمن) از منشی حسن علی متوطن بیدر، ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں لکھی گئی۔

نصابِ مقلوب

از انشاء اللہ خاں انشاء۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ لفظ اول و ثانی ایک دوسرے کے مقلوب ہیں۔ جیسے رب سے بر اور ملح سے لحم وغیرہ۔

دیگر نصابات

۱۔ 'خالق باری' از محمد اکرم (۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ)
۲۔ 'خالقِ باری' از سید غلام علی شاہ امروہوی المتخلص بہ ولی۔
۳۔ 'فتح الفہم'۔ مصنف کا نام معلوم نہیں۔ عربی، فارسی، اردو مترادفات بانداز قصیدہ۔
۴۔ 'بالک باری' از پنڈت بلرام کشمیری الوری۔
۵۔ 'فارسی نامۂ کلاں'۔

قواعد، شروح اور دوسرے علوم زباندانی

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سے بیسویں صدی کے آغاز تک یہ سرگرمی جاری رہی لیکن ان شعبہ ہائے تصنیف میں میر شمس الدین فقیر کے علاوہ غیر معمولی اور ممتاز شخصیتیں صرف تین ہی نظر آتی ہیں:

۱۔ سراج الدین علی خان آرزو (جن کی شروح اور قواعد کی کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں)۔
۲۔ میرزا محمد حسن قتیل (جن کے رسالے زبان دانی اور زبان آموزی کے بڑے بڑے مسائل پر مشتمل ہیں)۔
۳۔ امام بخش صہبائی جن کا مذکورہ بالا اصناف میں بڑا حصہ ہے۔

باقی شرح نگاروں اور فرہنگ نگاروں کے کام کو ہم نے دوسرے بلکہ تیسرے درجے

کی سرگرمی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے ۔ البتہ بعض دوسرے درجے کے قواعد نگاروں کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائے گا ۔

میر شمس الدین فقیر (یا مفتون) دہلوی ۔ ولادت ۱۷۰۳ء/۱۱۱۵ھ ، سال وفات غالباً ۱۷۶۷ء (’خزانۂ عامرہ‘ میں فقیری تخلص لکھا ہے) ۔ اپنے زمانے کے بلند پایہ عالم تھے۔ ان کی تصانیف میں علومِ بلاغت (بیان ، بدیع ، عروض وغیرہ) پر ایک اہم کتاب ’حدائق البلاغت‘ بڑی شہرت رکھتی ہے (صہبائی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے) ۔ ان کی مثنوی ’تصویرِ محبت‘ بھی مشہور ہے ۔ ۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے ۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :

> ”در فضل و کمال و شعر و انشا و معانی و بیان و بدیع و عروض و قوافی و زبانِ فارسی دانی ممتازِ اقران“ (خزانۂ عامرہ) ۔

دکن میں بھی قیام رہا ۔

’سراج الدین علی خان آرزو‘ ۔ خانِ آرزو نے فارسی کی چند اہم کتابوں پر شرحیں لکھیں ۔ ان میں جابجا قواعدِ زبان فارسی بیان کئے ہیں اور تحقیقِ الفاظ کا اصولی طریقہ اختیار کیا ہے ۔ ان شروح کے لئے منوہر سہائے انور کا ’دستوری مقالہ‘ خانِ آرزو‘ دیکھیے ۔

ان کی سب سے اہم کتاب جو قواعد و مسائلِ صرف و نحو اسماق سے متعلق ہے ، ’مثمر‘ ہے جس کے مطالب کا ایک خاکہ لغات سے متعلق فصل میں آ چکا ہے ۔

’میرزا محمد حسن قتیل‘ : فنیل دہلوی نو مسلم تھا ۔ عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گذارا ۔ وفات غازی الدین حیدر کے زمانے میں ۱۸۱۷ء/۱۲۳۲ھ میں ہوئی اور بہ حیثیت مصنّف و انشاء پرداز بڑی شہرت پائی ۔ اس کی اہم تصانیف یہ ہیں :

۱۔ ’مظہر العجائب‘ ۔ مصطلحات و الفاظ (متعلق بہ موضوعات جو نو آموزوں کے لئے مفید ہوں) ۔ ردیف وار مرتب کر کے ہم مضمون و ہم معنی الفاظ و تراکیب جمع کئے ہیں ۔ ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ میں طبع ہوئی ۔

۲۔ ’ہفت تماشا‘ ۔ احوال ہندوان و رسوم این فرقہ و شیوۂ مسلمانان ساکن ہند قدیم الاسلام و جدید الاسلام . . .“ سات ابواب ہیں جن میں سے ہر ایک کو ’تماشا‘ کہا

ہے (طبع لکھنؤ ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ) -

۳- 'شجرۃ الامانی' - نظم و نثر فارسی کی استعداد کے لئے جن قواعد و اصولِ زبان کا جاننا ضروری ہے ، یہ کتاب ان پر مشتمل ہے -

۴- 'نہر الفصاحت' - جو مطالب نمبر ۳ میں نہیں آسکے ، اس میں بیان کر دیے گئے ہیں - اہلِ ہند کے غلط استعمالاتِ فارسی کے بارے میں ہے -

۵- 'رمعاتِ اقتبل' - ان رقعات میں بھی قواعد و اصولِ زبانِ فارسی کی بحثیں آئی ہیں -

۶ - 'چار شربت' - (۱۷۹۹ء/۱۲۱۴ھ) یہ علمِ عروض و قافیہ ، علمِ بیان ، مفردات و مرکبات ، حروفِ مکتوبی و ملفوظی ، مصطلحاتِ اہلِ زبان ، نثر و اقسامِ نثر اور بعض اہم لغاتِ ترکی پر مشتمل ہے -

صہبائی ، شیخ امام بخش (معمائی) دہلوی

سر سیّد احمد خان نے 'آثار الصنادید' میں ان کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے - طامس ولیم بیل نے لکھا ہے کہ یہ دہلی کالج میں استاد تھے - اپنے زمانے میں علومِ لسانی کے ماہرِ کامل سمجھے جاتے تھے - چند دوسرے اکابرِ علم کی طرح ۱۸۵۷ء کے انقلابِ دہلی میں شہید ہوئے - منجملہ دوسرے اکتسابات کے فنِ معمّا میں کمال دستگاہ رکھتے تھے - اِن کی تصانیف تین طرح کی ہیں :

۱- شروح[1] -

۲- قواعد ، عروض وغیرہ پر رسالے -

۳- محاکمہ[2] و معارضۂ لسانی -

۴- متفرق نظم و نثر (دیباچے اور تقریظیں) وغیرہ - ہماری موجودہ بحث کے نقطۂ نظر سے 'رسالۂ نحو در فارسی' قابلِ بحث ہے -

اس زمانے کا سارا انداز اصولی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب قواعد کی

---

(۱) شروح : شرح پنج رقعہ ظہوری ، شرح سہ نثر ظہوری ، شرح زنانہ بازار ، شرح شبنم شاداب ظہیرائے تفرشی ، شرح حسن و عشق نعمت خان عالی ، حل مقامات نصیرای ہمدانی -

(۲) دیباچہ اعلاء الحق بجواب احقاق الحق اور قول فیصل -

[illegible] سلسلک بنیادوں پر ہو رہی ہے ۔ صہبائی نے دیباچے میں غرض و غایت کا یوں بیان کیا ہے :

"۔ ۔ ۔ میں نے ان نارسایوں کی تربیت کے واسطے قواعدِ نحوِ فارسی کے بیان میں (بعبارتِ سہل و الفاظِ زوُد فہم) چند ورق سیاہ کر کے ایک مختصر سا رسالہ مرتّب کیا ۔"

خود کو "ہندی نژاد کج مج زبان صہبائی ہیچ مداں" لکھا ہے ۔

صہبائی کا ایک کارنامہ میر شمس الدین فقیر کی کتاب 'حدائق البلاغت' کا اردو ترجمہ بھی ہے ۔ چند رسالے معمّا سے متعلق ہیں اور علمِ قافیہ پر بھی رسالہ ہے ۔ اردو صرف و نحو کے قواعد پر بھی اردو میں ایک کتاب لکھی ہے ۔

درگا پرشاد نادر ان کے شاگرد تھے اور کئی کتابوں ('خزینۃ العلوم' وغیرہ) کے مصنف بھی تھے ۔ انہوں نے ان کی فارسی کتابوں کے ترجمے عقیدت سے کیے ہیں ۔

قواعد اور دوسرے علومِ زباندانی پر چند اور کتابوں کے نام یہ ہیں :

۱۔ 'دستورِ پارسی آموز' از عبداللہ عبیدی (مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ) ۔ دو حصوں میں ہے جو ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۷ء میں میڈیکل پریس آگرہ میں چھپی ۔ یہ کتاب مصنف کے استاد مولوی عبدالرحیم کی کتاب 'فرہنگِ دبستان' پر مبنی ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ کتاب مغربی انداز پر مرتّب ہوئی ہے ۔

۲۔ 'قواعد حسین لندنی' : ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ میں طبع ہوئی ۔ یہ کتاب مبتدیوں کے لئے ہے ۔

۳۔ 'منتخب النحو' : امیر حیدر حسینی بلگرامی تصنیف ۱۸۲۹ء/۱۲۴۲ھ ۔

۴۔ 'مخزن الفوائد' : از محمد فائق (تصنیف ۱۲۲۵۔-۱۲۲۸ھ) ، قوانینِ زبانِ فرس پر عالمانہ کتاب ۔ اس میں صرف و نحو کے علاوہ علمِ عروض اور علمِ قافیہ اور علمِ تاریخ گوئی کی بحث بھی ہے (کتاب طبع شدہ ہے) ۔

۵۔ 'قوانینِ دستگیری' : از غلام دستگیر ابن غلام حسین ۔ ضخیم عالمانہ کتاب ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ میں حیدر آباد دکن میں لکھی گئی اور ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ میں مطبع مولائی میں طبع ہوئی ۔

دسواں باب

قصّے اور داستانیں

۱۶۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک جو ڈیڑھ صدی کی مدت ہے اس میں فارسی کی جو داستانیں تصنیف ہوئیں ان میں 'بوستانِ خیال' ، 'قصہ ٔ چہار درویش' (جو 'باغ و بہار' اور 'حکایت عجیب و غریب' کے نام سے بھی موسوم ہے) اور 'قصہ ٔ حاتم طائی' (ہفت سیر حاتم) کو بہت مقبولیّت حاصل ہوئی ۔ پیشہ ور قصّہ خوان ، جو داستان گو بھی کہلاتے تھے ، یہ داستانیں بڑے بڑے مجمعوں اور محفلوں میں سنایا کرتے تھے ۔ تنہائی میں مطالعہ کرنے کے لئے بھی یہ داستانیں بہت مقبول تھیں ۔

'داستانِ امیر حمزہ' کی طرح 'بوستانِ خیال' معرکہ آرائی ، مقابلہ و مقاومت ، لشکر کشی ، حسنِ تدبیر اور ہوشمندی کا سبق دیتی ہے ۔ 'قصہ ٔ دقیانوس' خدا پرستی اور حق گوئی و بیباکی کا پیغام دیتا ہے ۔ 'قصہ ٔ حاتم طائی' میں خیرِ مطلق کی تلقین کی گئی ہے ۔ یہ قصّہ اس بات کا درس دیتا ہے کہ انسان تو انسان ، حیوانوں کے ساتھ بھی شفقت و رحم دلی کے ساتھ پیش آنا چاہیے ۔

'قصہ ٔ چہار درویش' میں بھی یہ اخلاقی عنصر موجود ہے ۔ ان اخلاقی رجحانات کے علاوہ آدابِ مجلس اور حسنِ معاشرت کے بہت سے پہلو ان داستانوں میں نمایاں ہیں ۔ یہ داستانیں خوش گفتاری ، خوش معاملگی اور حفظِ مراتب سکھاتی ہیں ۔ مہمان نوازی ، اعزّہ اور اقربا کے ساتھ حسنِ سلوک ، دوسروں کے کام آنا ، ایثار اور قربانی وغیرہ ان داستانوں کی وہ تعلیمات ہیں جنہیں انسانیت کا جوہر اور مذہب و اخلاق کے پیغام کا نچوڑ سمجھنا چاہیے ۔ 'قصہ ٔ حاتم طائی' میں ایثار ، مروّت اور مہمان نوازی کی تعلیم قدم قدم پر ملتی ہے ۔ اسی لئے ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے اس قصے کے افادی پہلو کو خاص اہمیت کا حامل قرار دیا ہے ۔ ان داستانوں نے اپنے زمانے پر بلکہ زمانہ ٔ مستقبل پر اس لحاظ سے

---

(۱) حیدر بخش حیدری : 'آرائش محفل' ، مقدمہ از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ، ص ۲۰ ۔

بڑا اثر ڈالا ہے کہ ان سے [illegible] کو الفاظ ، خیالات اور اسلوب کا بہت بڑا سرمایہ ہاتھ آیا ہے اور ہماری نسلوں نے [illegible] کے حقائق سمجھے ہیں -

تفریح ، آداب آموزی ، حوصلہ مندی ، شجاعت ، اخلاق اور حسنِ معاشرت کا سبق دینے کے علاوہ یہ داستانیں بہت تخیّل انگیز بھی ہیں - یہ قاری کے تخیّل کو پرِ پرواز عطا کر کے ایسے مختلف وادیوں اور میدانوں میں لئے پھرتی ہیں[1] -

یہ تحیّر خیزی اور تخیّل انگیزی ان داستانوں کی اصل روح ہے ، جس کے ساتھ تنوعِ واقعات دلچسپی کے سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیتا - بعض قصّے بالخصوص وہ جو سرزمینِ پنجاب سے متعلق ہیں ، حرماں نصیب عاشقوں کی سرگذشت ہیں - بعض داستانوں میں جذبات و احساسات کو مجسّم صورت میں پیش کیا گیا ہے ، جس سے ان میں تمامتر یا جابجا تمثیلی انداز پیدا ہوگیا ہے - لطیف احساسات کو مسلسل استعاروں کی صورت میں مجسّم کر کے پیش کیا گیا ہے -

ان داستانوں کا سرمایہ یہی چیزیں ہیں - مختلف کرداروں کے مکالمے ان قصّوں کی دلچسپی کو اور بڑھا دیتے ہیں - بعض داستانوں کی دلچسپی : ڈوما کے ناولوں کی طرح زیادہ طور پر مکالمات پر مبنی ہے - ان کے کردار بے شمار ہیں اور واقعات کا احاطہ نہیں ہو سکتا - مکالموں کا شمار ممکن نہیں - اس کے باوجود ان داستانوں میں ربط و تسلسل کی کمی نہیں - مصنّف انہی طلسماتی محیّر العقول واقعات کی زنجیر سے انہیں جوڑتا چلا جاتا ہے اور ہمارے خیالات کے سفینے ان واقعات کی سطح پر تیرتے چلے جاتے ہیں -

۱- بوستانِ خیال

اس بے حد طولانی داستان کا مصنف سید محمد تقی جعفری المتخلص بہ خیال ہے ، جو محمد افضل ثابت عالمگیری کا شاگرد تھا - ریو کا بیان ہے کہ محمد تقی خیال ، اللہ ویردی خان کے عہد میں دہلی سے بنگال پہنچا اور وہاں ۱۱۷۳ھ (مطابق ۱۷۶۰ء) میں فوت ہوا[2] - ریو کے بیان سے تصنیف یا مصنف کے متعلق تفصیلی معلومات نہیں ملتیں - ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی اپنی فہرست کے صفحہ ۱۹۳ پر یہی اختصار ملحوظ رکھا ہے - ان فہرستوں سے

---

(۱) دفتر پرویز ناتل خانلری ، قصہ حاتم طائی ، مقدمہ ، انتشارات نیل ، تہران -

(۲) فہرست برٹش میوزیم ، ج ۲ ، قصہ ۲ ، ص ۷۶۰ -

'بوستان' کے متعلق صرف اتنی معلومات ہے کہ مصنف نے اس داستان کے طولانی دفتروں میں تین فرضی بادشاہوں کی ... لکھے ہیں - ان بادشاہوں کے نام (۱) صاحبقرانِ اعظم ، (۲) صاحبقرانِ ... اور (۳) صاحبقرانِ اصغر ہیں ، جنہیں بالترتیب شاہزادہ خورشید تاج بخش ، شاہزادہ معزالدین ابو تمیم اور شاہزادہ بدر منیر کا خطاب ملا ہے - اسی مناسبت سے اس کتاب کے تینوں دفتروں کو (جن میں سے ہر ایک کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہے) خورشید نامہ ، معزنامہ اور جمشید نامہ کا نام دیا گیا ہے - 'بوستانِ خیال' کے نام کی مناسبت سے ان دفتروں کو بہارِ اول ، بہارِ دوم اور بہارِ سوم بھی کہتے ہیں -

'بوستانِ خیال' اور اس کے مصنّف کے متعلق سب سے زیادہ تفصیلی بیان خواجہ بدرالدین المعروف بہ خواجہ امان دہلوی کا ہے جو ایک رشتے سے مرزا غالب کے بھتیجے تھے اور غدر کے بعد تلاشِ روزگار میں الور چلے گئے تھے - وہاں انہوں نے ریاست کے کتب خانے میں مکمل داستان کی پندرہ جلدیں دیکھیں اور راجہ شیودان سنگھ کے حکم سے ان کا اردو میں ترجمہ کرنے میں مشغول ہوئے - دو ہی جلدوں کا ترجمہ کر پائے تھے کہ حالات بدل گئے اور انہوں نے ترجمے سے ہاتھ کھینچ لیا - خواجہ امان دہلوی کے بقول یہ داستان محمد تقی خیال نے کسی طوائف کے واسطے لکھی تھی ، جس سے انہیں انس تھا[1] - رفتہ رفتہ یہ داستان محفلوں تک جا پہنچی اور نواب اسحٰق خان سالار جنگ نے اس کا شہرہ سن کر خیال کو طلب کیا اور محمد شاہ بادشاہ تک پہنچا دیا - محمد شاہ نے اپنے کتب خانے کی نگرانی ان کے سپرد کی اور کہا کہ اس داستان کو طول دو - لکھنے کے لیے پندرہ کاتب بھی دیے - ابھی خیال نے 'مہدی نامہ' اور 'اسمٰعیل نامہ' کی تکمیل کی تھی کہ محمد شاہ کا انتقال ہوگیا - خیال کو دہلی سے نکلنا پڑا اور وہ بنگال میں نواب سراج الدولہ کے عہد میں پہنچا - وہاں پندرہ جلدیں پچیس سال کی مدت میں ختم کیں -

فارسی داستان کی تصنیف کے متعلق خواجہ امان نے لکھا ہے کہ محمد تقی خیال نے یہ داستان اپنی کسی آشنا طوائف کی فرمائش پر لکھی تھی - لیکن برٹش میوزیم کے نسخہ نمبر Add : 24935 کے آخر میں جو عبارت ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ مصنف نے یہ داستان نواب نجم الدولہ محمد اسحٰق اور رشید خان سالار جنگ پسران نواب جعفر خان کے

---

(۱) خواجہ امان - دیباچہ' حدائق الانظار، ص ۳ -

واسطے لکھی تھی[1] ۔ کتب خانۂ برلن میں جو نسخے ہیں ان کے دیباچے میں بھی نواب رشید خان کے نام کی مناسبت سے کتاب کا دوسرا نام 'فرمائش رشیدی' بھی درج ہے[2] ۔ باڈلین کے مجموعے (نسخہ ۴۸۰) کی تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب بہ مقام دہلی ۱۱۵۵ھ (۴۳-۱۷۴۲ء) میں شروع کر کے ذی الحجہ ۱۱۶۹ھ (ستمبر ۱۷۵۷ء) میں بہ مقام مرشد آباد ختم کی اور نواب رشید الدین خان کے نام معنون کی[3] ۔

خواجہ امان کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کتب خانۂ اوور میں اس داستان کی مکمل پندرہ جلدیں (فارسی) موجود تھیں ۔ اب یہ جلدیں یورپ کے مختلف کتب خانوں میں دو دو ، چار چار کی تعداد میں ملتی ہیں ۔ ان کا سب سے بڑا ذخیرہ باڈلین لائبریری میں ہے ، جہاں اس داستان کی چودہ جلدیں (نمبر ۸۳۳ تا ۸۴۶) محفوظ ہیں[4] ۔ لاہور ، علی گڑھ اور رام پور میں چند جلدوں کا سراغ ملتا ہے ۔ بانکی پور لائبریری میں پوری پندرہ جلدیں (مخطوطے) موجود ہیں[5] ۔ لیکن اس داستان کے اردو ترجمے جو مختلف مطبعوں میں شائع ہوئے ، نسبتاً زیادہ ملتے ہیں ۔ انیسویں صدی عیسوی میں فارسی زبان پر زوال آ جانے اور اردو کا رواج عام ہو جانے کے باعث یہ داستان بڑے شوق سے ترجمہ کی گئی ۔ خواجہ امان اس کی دو جلدوں کے ترجمے کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے بعد انہوں نے اس کی ایک اور جلد ترجمہ کی ۔ بعد ازاں منشی نولکشور کے چھاپہ خانے میں اس کے اردو ترجمے شائع ہوتے رہے جو اس کی مقبولیت کا ثبوت ہیں ۔ ان کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ خواجہ امان نے 'معز نامہ' کی ایک جلد کا ترجمہ 'حدائق الانظار' کے نام سے کیا ۔ اس میں معزّ الدین اور شہزادی شمسہ تاج دار کے معاشقے کا حال ہے ۔ مطبع بدر الدجیٰ دہلی سے ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں شائع ہوئی ۔ تعداد صفحات ۵۵۶ ہے ۔ یہی جلد اتنے ہی صفحات میں محمود المطابع دہلی سے ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ میں شائع ہوئی ۔

---

(۱) ریو : فہرست ، ج ۲ ، ص ۷۷۱ ۔
(۲) فہرست برلن ، ص ۹۹۳ ۔
(۳) فہرست باڈلین ، ص ۴۴۰ ۔
(۴) ایتھے و سخاؤ : فہرست باڈلین ، ص ۵۳۶ ۔
(۵) عبدالمقتدر : فہرست بانکی پور ، مرآۃ العلوم ، ج ۱ ، ص ۱۱۱ ۔

۲۔ خواجہ امان نے 'خورشید نامہ' کی جلد نہم و دہم کا ترجمہ 'نجم الاسرار' کے نام سے کیا ۔ مطبع ادرالدحلی دہلی سے ۱۲۵۹ھ (۱۸۷۸ء) میں شائع ہوئی ۔ تعدادِ صفحات ۷۳۸ ہے ۔

۳۔ خواجہ امان نے 'خورشید نامہ' کی جلد نامہ ہفتم کا ترجمہ کیا ۔ 'ضیاء الانوار' نام اس کا رکھا ۔ مطبعِ اسلامیہ میرٹھ سے ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں طبع ہوئی ۔ تعداد صفحات ۵۴۲ ۔ صاحبقرانِ اصغر کی مہمات کا بیان ہے ، لیکن اس میں رزم و بزم کی فرضی داستانوں کے علاوہ علم و حکمت کے جواہر ریزے بھی موجود ہیں ۔ حکیم اسقلینوس نے آفرینشِ عالم ، آغازِ کائنات اور زمان و مکان کے بڑے دقیق مسائل بیان فرمائے ہیں جن میں حکمائے یونان اور دانایانِ ہند کے مقولے اور اسرارِ علمی بھی شامل ہیں ۔

۴۔ 'بوستانِ خیال' کی جلد ہفتم (خورشید نامہ) کا ترجمہ آغا حجو نے 'نورالانوار' کے نام سے کیا ۔ یہ ۱۸۹۰ء میں مطبع نولکشور میں طبع ہوا ۔ تعداد صفحات ۸۵۵ ۔

۵۔ 'بوستانِ خیال' کی جلد پنجم (خورشید نامہ) کا ترجمہ پیارے مرزا صاحب لکھنوی نے 'مطلع الانوار' کے نام سے کیا ۔ یہ ۱۸۹۲ء میں مطبعِ نولکشور سے شائع ہوا ۔ تعداد صفحات ۹۸۸ ۔

۶۔ 'بوستانِ خیال' کی جلد دوم (معزالدین نامہ) کا ترجمہ آغا حجو لکھنوی نے 'دومۃ الابصار' کے نام سے کیا ۔ یہ ۱۸۹۷ء میں مطبعِ نولکشور سے شائع ہوا ۔ تعدادِ صفحات ۵۲۶ ۔ اس میں بھی رزم و بزم کے علاوہ علم و حکمت اور جغرافیہ کا بیان ہے ۔ ہفت اقلیم کی حدود معین کی گئی ہیں جو پرانے زمانے کے علمِ جغرافیہ میں اہمیت رکھتی تھیں ، لیکن اب بے کار اور غلط در غلط ہیں ۔

۷۔ 'بوستانِ خیال' کی جلد سوم (جمشید نامہ) کا ترجمہ آغا حجو لکھنوی نے 'ضیاء الابصار' کے نام سے کیا ۔ یہ مطبعِ نولکشور میں ۱۸۹۹ء میں چھپا ۔ تعداد صفحات ۷۳۴ ۔

۸۔ 'بوستانِ خیال' کی جلد اول و دوم (مہدی نامہ) کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا ۔ یہ مطبعِ نولکشور سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا ۔ تعدادِ صفحات ۴۹۶ (جہازی تقطیع کے)۔

اس داستان میں ، جو تقریباً آٹھ ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور واقعات و تخیلات

کا بحرِ بیکراں معلوم ہوتی ہے ، سراسر طلسماتی فضا چھائی ہوئی ہے ۔ جنگ آزما ، مہم جو شہزادے ، ان کے دلیر رفیق ، جنگجو سرادر ، طالع آزما امراء ، سب اپنے اپنے وطن سے نکل کر دیارِ غیر میں قسمت آزمائی کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کا عجیب مزاج ہے ۔ یہ ایک نادیدہ معشوقہ کے عاشق ہو جاتے ہیں ۔ اس کا نام سن کر ، تقدیر دیکھ کر ، اس کی صفات کا شہرہ سن کر اسے حاصل کرنے کے لئے جنگلوں کی خاک چھانتے ، صحراؤں کو عبور کرتے ، دشوار گذار پہاڑوں سے گزرتے بالآخر منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں ۔ یہ معشوقہ بالعموم کسی بہت ہی ماہرِ فن جادوگر کی بیٹی یا کسی شاہِ ذیجاہ کی دختر ہوتی ہے اور اپنے طلسمی قلعے یا شاہی محل میں محوِ استراحت ہوتی ہے ۔ یہ شہزادے اور ان کے عیار ندیم بڑی بڑی حکمتوں سے شہزادی کی خوابگاہ تک رسائی حاصل کرتے اور اس سے ہم کلام ہوتے ہیں ۔ انہیں بڑے ہنر یاد ہیں ۔ ان کے پاس طلسمی مہرے ہیں ، سلیمانی ٹوپی ہے ۔ یہ سب کو دیکھتے ہیں ، انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا ۔ چاہیں تو درخت کے پتوں میں یا غنچوں میں مکھی بن کر بیٹھ رہیں ۔ ضرورت ہو تو آدھی رات کے سناٹے میں قلعے کی فصیل پر کمند پھینک کر اندر اتر جائیں ۔ فنِ حرب و ضرب کے ماہر ہیں ۔ ان کی تیغِ دو پیکر ہر میدان میں انہیں سرخرو کرتی ہے ۔ ان کے یاد کئے ہوئے منتر اور وظیفے انہیں ہر مشکل موقع پر کامیابی عطا کرتے ہیں ۔

لیکن جہاں کوئی حربہ کام نہیں آتا وہاں یہ حضرات پہاڑ پر چڑھ کر کسی بزرگ کے مزار پر چلہ کھینچتے ہیں ۔ ابھی مراقبے میں محو ہیں کہ یکایک ایک شیر وہاں آتا ہے اور اپنی دم سے مزار پر جھاڑو دے کر چلا جاتا ہے (انہیں کچھ نہیں کہتا) ۔ اس کے بعد جنگلی ہرنی آتی ہے اور انہیں اپنے دودھ سے سیر کر جاتی ہے ۔ تھوڑی دیر بعد یہ بزرگ اپنی قبر سے باہر نکلتے ہیں اور زمین سے ایک چمکدار تلوار نکال کر شاہزادے (ملک زادہ جمیل الدین) کو عطا کرتے ہیں ۔ اس تلوار کی کاٹ کی کیا تعریف کی جائے ۔ برقِ خاطف سے زیادہ مہلک ہے ۔ ہر معرکے میں فتح عطا کرتی ہے ۔ اسے انگلستان کے داستانی بادشاہ آرتھر کی تلوار کا جواب سمجھیے ، جسے آرتھر نے لوہے کے سندان میں سے کھینچا تھا ۔

داستان کے یہ افراد عجیب معجونِ مرکّب ہیں ۔ سب کے سب مسلمان ہیں ۔ لیکن جادو گری ، بادہ نوشی ، رقص و سرود ، فسق و فجور ہر چیز سے واقف ہیں ۔ یہ لوگ

قرآنِ پاک کی آیتیں پڑھتے پڑھتے یکایک فارسی کی عشقیہ غزل پڑھنے لگتے ہیں ۔

داستان چونکہ بے حد طویل ہے ، اس کے کرداروں کی تعداد قدرۃً زیادہ ہی ہونی چاہئے ۔ سیرت کے لحاظ سے ان اشخاصِ قصّہ کے نام بھی مختلف ہیں ۔ لیکن سب کے ناموں سے اعجوبہ پن ، تحیّر اور خوف کا ملا جلا احساس پیدا ہوتا ہے ۔ شہزادوں کے نام جمیل الدین ، بدرِ منیر ، شمسِ جہاں ہیں ۔ ان کے رفیقوں ، مصاحبوں اور امراء میں مہتر سلیم ملک لصرون ، مہران ، طربوس بشطون شاہ ، طمطراق خاں ، اکلیل الملک ، سیفور پھن سینہ وغیرہ ہیں ۔ عیاروں میں مہتر سلیم ، مہتر ضیا ، عیارِ ذوفنون موجود ہیں ۔ فقیروں کی فہرست دیکھنا ہو تو سلطان الزاہدین ، پیر دریائی ، درویش مصباح ، شمعون الصفا ، صدوق عابد کے نورانی چہرے نظر آتے ہیں ۔ داناؤں اور حکماء کے ذیل میں قطاس الحکمہ حکیم آخشیجان اور حکیم اسقلینوس کے نام ممتاز ہیں جو آفرینشِ عالم بلکہ ازل سے ابد تک کا حال سنا دیتے ہیں ۔

ان لوگوں کے مقابلے پر جو جادوگر ، کافر ، رہزن ، پہلوان وغیرہ ہیں ، ان کے اسمائے گرامی سنیے اور داد دیجئے ۔ ۔ ہمناک ارلاک ، بیکال بن تمثال ، شمران پیل زن ، فرغال سگ انداز ، وسواس بن خناس ، شنگل ، بسطول گرگ پیشانی ، خوکال فولاد گردن ، عیلاق ببرکلہ ، اژدر خاں مارخوار ، حنارمنکوس ، خولک ، طوفان قری بازو ، سیلان بن سیلاب وغیرہ کے ہیبت ناک نام ان کے کردار کو نمایاں کرتے ہیں ۔ عورتوں میں بھی ہر مزاج اور ہر انداز کی خواتین ہیں ۔ سفلہ دراز مو ، غاشیہ ، شمرانہ ، دمرانہ ، جیفہ خاتون ، ملکہ مشکین مو ، دلچسپ خاتون ، نوشابہ ، ناز ، بالش ناز پرور ، نار بستان ، لیلیٰ سنبل مو ، طرب انگیز ، عذرانہ ملک ، گلنار پری ، فطانت پری ، رونق افزا کے نام ان کے کرداروں کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نذیر احمد دہلوی نے نام سے کسی شخص کا کردار ظاہر کرنے کا فن اسی کتاب سے سیکھا ہے ۔

لیکن 'بوستانِ خیال' کو محض ناموں ، کرداروں اور واقعات کی زنبیل نہ سمجھیے ۔ محمد تقی خیال کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے ہزاروں صفحے کی اس داستان میں واقعات کا سر رشتہ الجھنے نہیں دیا ۔ داستان سے داستان نکلتی چلی آتی ہے ۔ نل میں نل جوڑا جاتا ہے اور قصے کی روانی و انتظام میں فرق نہیں آتا ۔ ریو کو شکایت ہے کہ مصنف نے چند واقعات کو بنیاد بنا کر بار بار ان کا اعادہ کیا ہے اور اس داستان کے تاروپود کو قائم

رکھا[1] ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ داستان کی نظم و ترتیب میں کہیں فرق نہیں آیا اور یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں یہ طویل داستان بے حد مقبول ہوئی ۔

اس کتاب کی فارسی معیاری نہ سہی لیکن صاف اور سلیس ضرور ہے ۔ ہزاروں صفحے کی کتاب میں روانی و سلاست کو قائم رکھنا بجائے خود قابلِ تعریف ہے ۔ جا بجا ہندی الفاظ مثلاً چھپر کھٹ مرصّع ، رانی مہا سندر ، راج رانی وغیرہ استعمال ہوئے ہیں ۔ بعض عبارتیں اور محاورے خالص ہندوستانی محاوروں اور اندازِ بیان کے زیرِ اثر ہیں ۔ اس کے علاوہ داستان کے واقعات میں بھی ضعفِ تالیف پایا جاتا ہے ۔ تاہم داستان کی دلچسپی ان سب خامیوں سے چشم پوشی کی سفارش کرتی ہے ۔

چہار درویش

شمالی ہند کی مختصر داستانوں میں یہ تصنیف بے حد مقبول رہی ہے ۔ اس کا پلاٹ بہت مرتّب ، واقعات نہایت دلکش اور قصے کی تعمیر بہت دل آویز ہے ۔ یہ چار آفت زدہ درویشوں کی الگ الگ داستانوں کا مجموعہ ہے ، جو جوانی میں مختلف ملکوں کے شاہزادے یا رئیس زادے تھے اور عشقِ خانہ خراب کے ہاتھوں در بدر خاک بسر پھرتے پھراتے روم میں ایک جگہ جمع ہوگئے تھے ۔ روم کے بادشاہ آزاد بخت نے ان کی رام کہانیاں سنیں اور پھر اپنا واقعہ بیان کیا ۔ مصنّف نے ان پانچوں داستانوں کو ایک لڑی میں پرو کر اختصار و تفصیل کا بہت دلچسپ امتزاج کیا ہے ۔

میر حسین عطا خاں تحسین ساکن اٹاوہ ، جس نے فارسی 'چہار درویش' کا ترجمہ 'نو طرزِ مرصّع' کے نام سے کیا ہے ، اس داستان کے متعلق لکھتا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کے ایک درباری حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خان نے بادشاہ کو یہ قصہ ہندی زبان میں سنایا تھا ۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے فارسی کا جامہ پہناؤ ۔ چنانچہ اس نے ۱۱۴۶ھ (۱۷۳۳ء) میں یہ قصہ لکھا[2] ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مجموعۂ شیرانی کے نسخہ نمبر Pi 1X 9 کے آخر میں یہ عبارت درج ہے :

"تمت حکایات عجیب و غریب ، ۱۴ شوال ۱۹ جلوس محمد شاہی لراقمہ عبدالکریم"

---

(۱) فہرست برٹش میوزیم ، ج ۲ ، ص ۷۷۱ ۔
(۲) تحسین : حسین عطا خاں نو طرز مرصّع ، ص ۱۷ تا ۲۱ ۔

حافظ محمود شیرانی نے بھی سالنامۂ کاروان ۱۹۳۳ء میں اپنا تحقیقی مضمون لکھ کر محمد علی معصوم خان کو اس کتاب کا مصنّف قرار دیا - سر ولیم اوسلے نے بھی اپنی فہرست کے نمبر ۱۷۴ میں حکیم محمد علی ہی کو اس قصّے کا مصنّف بتایا - لیکن ڈاکٹر گیان چند جین نے ثابت کیا ہے کہ محمد علی سے پانچ سال پہلے یہ کتاب تصنیف ہو چکی تھی - انہوں نے باڈلین لائبریری آکسفورڈ کے نسخہ نمبر ۳۴۴ کے آخر کی عبارت درج کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نسخے کے کاتب یعنی جمال الدین نے یہ کتاب مسمی بہ 'چار[1] درویش' نواب شجاع الدین محمد صوبہ دار اڑیسہ کے عہد میں بتاریخ ۲۷ شعبان ۱۱۴۱ھ (۲۸ مارچ ۱۷۲۹ء) لکھی - فارسی عبارت یہ ہے :

"تمام شد نسخۂ چہار درویش بوقت دو گھری بتاریخ بیست و ہفتم شہر شعبان ۱۱۴۱ھ بہ عمل نواب مستطاب مہارت مرتبت شجاع الدین محمد خان ناظم اڑیسہ لکاتبہ الحرف جمال الدین تحریر یافت -"[2]

اس طرح یہ نسخہ محمد علی والے نسخے کی تصنیف سے ۵ سال مقدّم ٹھہرا - چونکہ محمد علی نے اپنے قصے کا نام 'حکایات عجیب و غریب' لکھا ہے جو ایک طرح کا توصیفی نام بھی سمجھا جا سکتا ہے اور جمال الدین نے اپنے نسخے کا نام صراحتاً 'چار درویش' لکھا ہے ، اس لیے جمال الدین والا نسخہ ہر لحاظ سے مکمل اور مقدّم قرار پاتا ہے - ریو اپنی فہرست میں نسخہ نمبر ۱۸۱۷ کی تفصیل میں لکھتا ہے کہ یہ نسخہ سترھویں صدی عیسوی کے آخر کا ہے - اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو یہ نسخہ باڈلین سے بھی چالیس سال مقدم ٹھہرے گا - غرض صحیح فیصلہ سرِدست ممکن نہیں ، تاوقتیکہ ان نسخوں کا مطالعہ و مقابلہ نہ کر لیا جائے -[3]

دنیا کی مختلف لائبریریوں میں 'چہار درویش' کے متعدد نسخے ہیں جن کی عبارتیں تھوڑے تھوڑے فرق کی حامل ہیں - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف اشخاص نے اس مشہور داستان کو اپنے اپنے الفاظ میں لکھنے کی کوشش کی ہے - پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مجموعۂ شیرانی سے مذکورہ بالا نسخے کے علاوہ ، جس کی زبان بہت اچھی ہے ، اس

---

(۱) اس قصے کو بعض 'چار درویش' لکھتے ہیں اور بعض 'چہار درویش' -

(۲) اینھے و سخاؤ : فہرست باڈلین ، ص ۴۲۴ -

(۳) ریو : فہرست ، جلد دوم ، ص ۷۶۲ -

مجموعے کا ایک اور نسخہ (مخطوطہ نمبر ۱۰۷۸/۱۳۰م) ہے جس کی تاریخِ کتابت ۱۹ رجب ۳۱ جلوسِ شاہ عالم ہے ۔ کاتب نے (جس کا نام کسی نے قصداً مٹا دیا ہے) قصے کا نام 'چہار درویش' ہی رکھا ہے ۔ دونوں نسخوں میں درویشوں اور بادشاہ کے قصوں کی ترتیب مختلف ہے یعنی آگے پیچھے ہے ۔ واقعات میں بھی اختلاف ہے ۔ مثلاً نسخہ نمبر AP1 IX9 میں بادشاہ بخت حکم دیتا ہے کہ خواجۂ سگ پرست کے ساتھ جو نوجوان ہے (وزیر زادی) اسے قتل کر دیا جائے ۔ نسخہ نمبر ۱۰۳۰ میں بادشاہ کا حکم یہ ہے کہ نوجوان کو چھوڑ دیا جائے اور خواجۂ سگ پرست کو قتل کیا جائے ۔ نسخہ اول الذکر میں خواجۂ سگ پرست کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا مذہب تسنّن ہے ۔ نسخۂ آخرالذکر سے وہ شیعی مذہب ظاہر ہوتا ہے جو توحیدِ خدا اور نبوت حضرت محمد مصطفیٰ کے بعد بارہ امام کی محبت کو اپنا ایمان سمجھتا ہے ۔

خطی نسخوں کے علاوہ مطبوعہ نسخوں میں بھی یہ اختلاف ملتا ہے ۔ یہ قصہ مطبع فتح الکریم بمبئی سے ۱۳۰۹ھ (مطابق ۱۸۹۱ء) میں طبع ہوا ۔ قاضی محمد ابراہیم مالکِ مطبع اور مؤلفِ کتاب کا بیان ہے کہ میں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے یہ قصہ چھاپا ہے ۔ اسی میں یہ روایت بھی درج ہے کہ اس قصے کو امیر خسرو نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے زمانے میں تصنیف کیا تھا ۔ مؤلف کا بیان ہے کہ :

> "باعثِ تصنیفِ این داستان از راز پژوہانِ پیشینیان بہ این نوع مفہوم گردید کہ بارے طبعِ مقدسِ جنابِ سالکِ مسالکِ طریقت ، و ناسکِ مناسکِ شریعت ، قدوۃ العارفین ، زبدۃ الواصلین حضرتِ شیخ نظام الدین قدّس سرہ العزیز بہ عارضہ علیل بودند ۔ حضرت امیر خسرو دران دم این قصہ را زیبِ رقم فرمودہ ، بحضورِ پیر و مرشدِ خود خواندے تا آنکہ حضرت موصوف غسل صحت فرمودند و این دعا مے نمودند کہ یا رب ہر کس کہ این قصہ را بخواند یا بشنود ، از امراض نجات یابد[1] ۔"

لیکن اس نسخے سے بہت پہلے ۱۸۰۲ء میں میر امّن یہ روایت درج کر چکے تھے کہ امیر خسرو نے اپنے مرشد کا دل بہلانے کے لیے یہ قصہ لکھا تھا ۔ یہ غلط روایت بہت

---

(۱) قصۂ چہار درویش ، ص ۳ ۔

پھلی - بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات ہندی میں نسخہ نمبر ۸۸ کی تفصیل لکھتے ہوئے یہی روایت درج کی - سر ولیم اوسلے نے اس غلطی کا ازالہ کیا اور (بہ تفصیل ماسبق) محمد علی معصوم خاں کو اس کا مصنّف ٹھہرایا - محمود شیرانی نے اپنے فاضلانہ مضمون سالنامہ کاروان ۱۹۳۳ء میں متعدّد دلائل سے ثابت کیا کہ امیر خسرو اس کے مصنف نہیں ہو سکتے کیونکہ :

(۱) اس کتاب کا کوئی نسخہ اٹھارویں صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں ملتا -

(۲) امیر خسرو کی تصانیف میں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے -

(۳) ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں اپنے زمانے کی تمام مروجّہ داستانوں کا نام درج کیا ہے - 'چار درویش' کا نام نہیں لکھا -

(۴) 'چار درویش' میں جا بجا شیعی عقائد مثلاً بارہ اماموں کی محبّت ، حضرت علی مرتضیٰ کی زیارت وغیرہ کا ذکر آیا ہے حالانکہ امیر خسرو شیعی نہ تھے ، سنّی تھے -

(۵) دوربین اور توپ ، جن کا ذکر اس داستان میں ہے ، امیر خسرو کے زمانے میں رائج نہ تھیں وغیرہ وغیرہ -

ان تمام اختلافات اور مباحث کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس داستان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی - اس کا پلاٹ بہت دلکش ہے ؛ یعنی روم کا ایک بادشاہ اپنے جاہ و جلال کے باوجود اولاد کی نعمت سے محروم ہے - ایک روز وہ رات کے وقت قبرستان میں پھر رہا تھا کہ چراغ کی روشنی دیکھی - قریب گیا تو دیکھا کہ چار فقیر بیٹھے ہیں - ان فقیروں نے اپنی اپنی سرگذشت کہنی شروع کی - معلوم ہوا کہ سب کے سب شہزادے اور رئیس زادے ہیں جو عشقِ خانہ خراب کی بدولت خراب حال پھرتے ہیں - انہوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں خودکشی کی کوششیں بھی کیں لیکن عین آخری لمحے ہر فقیر کے سامنے مولا علی مشکل کشاؓ نمودار ہوئے اور بتایا کہ جس روز تم چار فقیر روم کے بادشاہ کے سامنے آؤ گے تمہاری مشکلیں حل ہو جائیں گی - چنانچہ ایسا ہی ہوا - اسی روز بادشاہ کے گھر کسی کنیز کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں چاروں فقیر بھی اپنی مراد کو پہنچ گئے یعنی ہر ایک کو اس کی معشوقہ مل گئی - اس طرح یہ قصّہ مشرق

کی اکثر داستانوں کی طرح کامیابی و کامرانی پر ختم ہوتا ہے۔

اس قصّے کی دلچسپی کا راز بہت کچھ اس کی ساخت میں مضمر ہے۔ چار فقیروں اور ایک بادشاہ کی الگ الگ داستانوں کو ایک ڈوری میں پرو دینے سے بہت دلکشی اور تنوّع پیدا ہو گیا ہے۔ ان میں پہلا درویش یمن کے ملک التجار کا بیٹا ہے۔ دوسرا درویش فارس کا شاہزادہ ہے۔ تیسرا درویش شاہزادۂ عجم ہے اور چوتھا چین کے بادشاہ کا فرزندِ ارجمند ہے۔ پانچواں شخص خود آزاد بخت بادشاہِ روم ہے۔ مختلف نسخوں میں ان پانچوں کے قصّوں کی ترتیب بن گئی ہے۔ واقعات کی تصویریں یکے بعد دیگرے مسلسل آتی رہتی ہیں۔ بیسیوں کردار اپنی اپنی خصوصیّات کے ساتھ ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں اور اپنی جگہ دوسروں کو دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ کردار دوسری طلسمی داستانوں کی طرح آسمانی یا طلسماتی نہیں معلوم ہوتے بلکہ ہماری تمہاری طرح کے عام انسان ہیں، جن میں شاہانہ طمطراق اور خیرہ کن جاہ و جلال کے بجائے عام آدمی کی سی حسرتیں، آرزوئیں اور کمزوریاں ہیں۔

'چہار درویش' کی مقبولیت کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اس کے ضمن میں مغلیہ عہد کی معاشرت کی تصویریں بہت واضح ملتی ہیں۔ 'الف لیلہ' عبّاسی عہد کے بغداد کی تہذیب و معاشرت کا مرقّع ہے۔ محمد شاہی عہد کی دلی دیکھنا ہو تو وہ اس داستان میں جلوہ گر ہے۔ مغلیہ عہد کی تہذیب و معاشرت اس میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ امراء کے گھروں کے نقشے، شاہی محلوں کے ٹھاٹھ، شہزادیوں اور وزیر زادیوں کے پُر تکلّف، آراستہ نشیمن، نادار فاقہ کش لکڑہارے، فقیر، جوگی، درویش سب اپنی اپنی خصوصیّات کے ساتھ نظر کے سامنے آتے ہیں۔ بیوفا مطلب پرست دوست، نمک حلال نوکر، دلسوز بزرگ، راز دار خواجہ سرا اور دائیاں جن سے محلوں کا کوئی راز چھپا نہیں رہتا، سب اپنی اپنی چلت پھرت دکھاتے، کارگزاریاں کرتے اور داستان کے خاکے میں ان مٹ رنگ بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس داستان کے پردے پر کہیں عیش و نشاط کا جلسہ جمتا ہے، کہیں تعزیت اور غمی کی مجلس ہوتی ہے۔ فاتحہ، چہلم، سیر، سفر، شکار، مہمانداری، میزبانی، بیابان، گلزار، شاہی باغ وغیرہ کے متعدد نقشے فلمی تصویروں کی طرح نظر کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ اس کے کرداروں میں ہر مزاج اور ہر طبقے کے اشخاص ہیں۔ کہیں برادرانِ

یوسف جیسے بھائیوں سے واسطہ پڑتا ہے ، کہیں وہ محبت کی ماری بہنیں ملتی ہیں جو تغافل شعار ، بے پروا ، مفلوک الحال بھائی کے ساتھ مادرانہ شفقت سے پیش آتی ہیں ۔ غریب قلاش لکڑہاروں کے دوش بدوش خوشحال سوداگر ، عیش باز وزیر زادے ، دل پھینک شاہزادے ، عفت شعار شاہزادیاں بھی موجود ہیں ۔ انہی میں وہ شوقین ، طبیعت دار شہزادیاں بھی ہیں جن کے نشیمن میں شربتِ ورق الخیال اور بادۂ گلرنگ کا دور چلتا ہے اور جن کے اشارے پر قصرِ شاہی سے معشوق کے گھر تک سرنگ کھود کر ملاقات کی راہ نکالی جاتی ہے ۔

اس داستان کے واقعات بھی بہت حیرت انگیز اور تاثر خیز ہیں ۔ اگر پروفیسر کلیم الدین احمد کے بقول دلچسپی ہی وہ معیار ہے جس سے کہانیوں کے حسن و قبح کی جانچ کرنا چاہیئے[۱] تو میر امّن اس معیار پر پورے اترتے ہیں ۔ پہلے درویش کا بہن کے گھر سے سفر کر کے مہینوں بعد رات کے وقت دمشق کی فصیل کے نیچے رات بسر کرنا اور وہاں آدھی رات کے سناٹے میں ایک بڑے سے چوبی صندوق کا اترنا ، درویش کا اسے کھولنا اور اس میں ایک ماہ طلعت ، مہر پیکر حسینہ کو لہو میں شرابور پڑے دیکھنا بڑا اثر انگیز واقعہ ہے ۔ خواجہ سگ پرست کا زندانِ سلیمان (کنویں) میں قید رہنا اور رات کے وقت کسی کا اسے اس جان لیوا قید خانے سے نکالنا خود بہت تاثر خیز واقعہ ہے لیکن اس میں انتہائی ڈرامائی رنگ اس وقت پیدا ہو جاتا ہے جب اس کا رہائی دلانے والا محسن صبح کے وقت اس کا منہ دیکھ کر اسے قتل کرنے کے لئے تلوار کا وار کرتا ہے ۔ صورتِ حال یہ ہے کہ یہ محسن جو دراصل مرد نہیں بلکہ زیر باد کے ملک کی نوجوان راج کماری ہے ، اپنے معشوق کو کنویں سے نکالنے کے لئے آئی تھی ۔ جب صبح کی روشنی میں اس نے یہ دیکھا کہ بازیٔ تقدیر کی بدولت اس کے معشوق کی جگہ کوئی دوسرا شخص قید خانے سے نکل آیا ہے تو وہ مقدر کے اس بیہودہ مذاق سے طیش میں آ جاتی ہے ۔ یہ ڈرامائی موڑ اتنا حیرت انگیز ہے کہ پردۂ سیمین پر لمحہ بہ لمحہ بدلنے والی تصاویر بھی اس سے زیادہ تحیّر خیز واقعہ پیش نہیں کر سکتیں[۲] ۔

'چہار درویش' کے کردار اگرچہ داستانی ہیں لیکن ان میں وہ فطری انداز اور نفسیاتی

---

(۱) کلیم الدین احمد : اردو میں فن داستان گوئی ، ص ۹ ۔
(۲) ایضاً ۔

صحت مندی ملتی ہے جو ناولوں کے کرداروں کا خاصہ ہے ۔ ان کی خصوصیات کو بھلانا مشکل ہے ۔ خواجہ سگ پرست کی نیک نفسی ، متانت اور تحمل ناقابلِ فراموش ہیں ۔ اس کے دونوں بھائی جو کسی وقت بھی ظلم و ستم اور احسان فراموشی سے ہاتھ نہیں اٹھاتے ، برادرانِ یوسف کی یاد دلاتے ہیں ۔ چوتھا درویش حس کی پرورش تہ خانے میں ہوئی ہے ، بھولرے میں پلنے والے امیر زادوں کا عمدہ نمونہ ہے ۔ یہ مریل شہزادہ میر حسن کے شہزادۂ بے نظیر سے مشابہ ہے ۔ اس کی سیرت کمزور سہی لیکن اس کا جان نثار رفیق یعنی مبارک حبشی وفاداری اور خلوص کا پیکر ہے ۔

سیرت کے اتنے ہی عمدہ بلکہ اس سے زیادہ جیتے جاگتے نقشے اس داستان کے زنانہ کرداروں میں موجود ہیں ۔ بصرے کی شہزادی تسلیم و رضا اور توکل کا ایسا مظاہرہ کرتی ہے کہ خدا رسیدہ فقیروں کی یاد آ جاتی ہے ۔ دمشق کی شہزادی ان رنگین مزاج دوشیزاؤں کا نمونہ ہے جو محل کی خلوتوں میں چہلیں کرتی اور فکرِ انجام سے غافل ہو کر اس طرف چل دیتی ہیں جدھر دلِ دیوانہ لے چلے ۔ بہ ایں ہمہ اس میں غیرتِ شاہانہ موجود ہے ۔ زخمی ہونے کے بعد وہ صرف اس لئے جیتی ہے کہ اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کر سکے ۔ شاہی محلوں میں پلنے والی یہ نازنین فطرتاً منصوبہ سازی اور سازش کی اہل ہے ۔ چنانچہ بڑی ہوشمندی کے ساتھ منصوبہ بنا کر اپنے بیوفا معشوق اور اس کی بے حیا محبوبہ کو ان کے اعمال کی سزا دیتی ہے ۔ اس شعلہ پیکر شاہزادی کی آنکھوں سے شاہانہ غیظ و غضب کا شعلہ صاف لپکتا محسوس ہوتا ہے ۔

سراندیپ کے دیس کی راج کماری بھی ایسے ہی شاہانہ منصوبوں کا مظاہرہ کرتی ہے ۔ یہ بھی اس حسینہ کی طرح منصوبہ سازی میں ماہر ہے ۔ جب اپنے رنگ محل سے خواجہ سگ پرست کے ساتھ نکلنا چاہتی ہے تو افشائے راز کا پورا انسداد کرنے کے لئے چلتے وقت اس دائی کو بھی زہرِ ہلاہل کا پیالہ پلا دیتی ہے جو اس کی معاون و مددگار اور واحد راز دار ہے ۔ نسوانی کرداروں میں سب سے زیادہ تابناک ، تاثر خیز کردار زیر باد کی راج کماری کا ہے ۔ یہ دوشیزہ اپنے معشوق کو (جسے راجہ نے زندانِ سلیمان میں قید کر دیا ہے) آدھی رات کے وقت کمند لٹکا کر نکالتی ہے ، لیکن معشوق کے بجائے کوئی اور خوش نصیب (خواجہ سگ پرست) نکل آتا ہے ۔ بد نصیب راج کماری تقدیر کے اس مذاق پر صبر کرتی اور خواجہ سگ پرست کی شریکِ حیات بن جاتی ہے ۔ یہاں بھی خواجہ کے دونوں بھائی اس

پر لیت خراب کرتے ہیں اور یہ لاج کی ماری ستونتی سینے میں خنجر گھونپ کر مر جاتی ہے ۔ عصمت و عفّت کے پیچھے جان دینے والی یہ ہندو خاتون داستان کے پردے سے تو غائب ہو جاتی ہے لیکن قاری کے دل پر اپنی شخصیّت کا ان مٹ نقش چھوڑ جاتی ہے ۔

مذکورہ بالا اوصاف کی بدولت یہ داستان گزشتہ دو صدیوں سے بہت ہی مقبول رہی ہے ۔ ہند و پاکستان کے بے شمار مطبعوں سے اس کے اردو ترجمے (میر امّن کے) شائع ہوئے ۔ یورپ میں بھی میر امّن والا اردو ترجمہ بہت مقبول ہوا اور ڈنکن فاربس نے ۱۸۵۷ء ، ۱۸۶۲ء اور ۱۸۷۴ء میں اسے لندن سے شائع کیا ۔ ایسٹ وک نے ۱۸۵۲ء اور ۱۸۷۷ء میں چھاپا ۔ ایل اسمتھ نے ۱۸۱۳ء میں کلکتے سے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ۔ ۱۸۷۸ء میں گارساں دی تاسی نے فرانسیسی ترجمہ پیرس سے شائع کیا ۔ مشرق کی داستانوں میں 'الف لیلہ' کے دوش بدوش 'چہار درویش' ہی وہ داستان ہے جس کی دلچسپی کبھی کم نہ ہو گی ۔

زبان کے اعتبار سے 'چہار درویش' کے مختلف نسخوں کی زبان بھی مختلف ہے ۔ سب سے اچھی عبارت محمد علی معصوم خان کے اس نسخے کی ہے جسے عبدالکریم نے ۱۹ جلوس محمد شاہی (۱۷۳۶ء) میں کتابت کیا تھا اور جس کا ایک اقتباس اوپر درج ہو چکا ہے ۔ باقی نسخوں کی زبان و بیان پر ہندوستانی فارسی کا سایہ پڑتا معلوم ہوتا ہے اور برجستگی و چستی کے بجائے سستی اور تصنّع کا اثر ملتا ہے ۔ میر احمد بن محمد شاہ کے تالیف کردہ نسخے کی زبان میں یہ خرابیاں بہت زیادہ ہیں ۔

بیانِ واقعات میں بھی مختلف نسخوں میں کہیں طول ہے ، کہیں اختصار ، کسی میں واقعے کی صورت کچھ ہے ، دوسرے میں کسی قدر تغیّر ہے ۔ با ایں ہمہ داستان کی دلکشی ہر جگہ قائم ہے ۔

قصۂ حاتم طائی (ہفت سیرِ حاتم)

یہ داستان بظاہر ایک قصّہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخلاق و انسانیت سکھانے کا نہایت اچھا ذریعہ ہے ۔ ساری داستان اخلاق آموزی ، احترامِ آدمیّت ، قربانی و ایثار ، پاسِ عہد اور شرافت و نکوکاری کی تعلیم سے لبریز ہے ۔ اس معاملے میں اور کوئی داستان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔

اکثر داستانوں کی طرح 'قصّہ حاتم طائی' کے واقعات بھی انفرادی ہونے کے بجائے مشترک ہیں ۔ دیو ، جن اور پریاں سب داستانوں کا مشترکہ ورثہ ہیں ۔ انتہائی نازک مواقع پر کوئی نقاب پوش (خواجہ خضر یا مولا علی مرتضیٰ' مظلوم یا مایوس و مضطر آدمی کی مدد کے لئے نمودار ہو جاتا ہے ۔ حسن بانو کو جنگل میں خزانہ ملنے کی داستان وہی ہے جو چہار درویش میں بصرے کی شہزادی کی ہے ۔ ممکن ہے شادی کے لئے نہایت دشوار سوالوں کی شرط لگانا بھی ان دونوں نے ایک دوسری سے سیکھا ہو ۔ ایک بدکار عورت جادو کی کیل اپنے شوہر کے سر میں ٹھونک کر اسے کتا بنا دیتی ہے ۔ اس روایت پر 'الف لیلہ' کی چھاپ لگی ہوئی ہے ۔ تاتاہاں ہیں عظیم الجثہ پرندے اور نیم انسان نیم مچھلی مخلوق جیسی چیزیں ان قصّوں میں جلوہ گر ہیں جو 'الف لیلہ' سے مستعار لی گئی ہیں ۔

لیکن ایک خصوصیت جو اس قصّے کو دوسری داستانوں سے ممتاز کرتی ہے ، اس کی اخلاق آموزی ہے ۔ یہ بنیادی اور آفاقی نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے ۔ کسی سے بدی نہ کرو ورنہ تمہیں بھی روزِ بد دیکھنا پڑے گا ۔ سانچ کو آنچ نہیں ۔ مردم آزاری بری ہے ۔ ''طمع را سہ حرف است و هر سہ تہی'' ۔ ''نیکی کر دریا میں ڈال'' ۔ ''ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا'' وغیرہ وغیرہ ایسے اصول ہیں جو انسان کو ایثار ، نفس کشی ، پاکبازی اور شرافت کی تعلیم دیتے ہیں ۔ مہمان کی مدارات ، ناداروں محتاجوں کی امداد ، مظلوموں کی اعانت ، حق گوئی ، انصاف پسندی ، سخاوت و شجاعت وغیرہ کی خوبیاں داستان کے پردے میں اس طرح جلوہ گر ہیں کہ خود بخود دل پر ان کا اثر پڑتا ہے ۔ مصنّف کی خوبی یہ ہے کہ اس نے مولویوں کی طرح وعظ و پند کرنے کے بجائے ان اوصافِ حمیدہ کی خوبیاں پردے میں ظاہر کی ہیں اور مقصدیّت کو بے نقاب نہیں ہونے دیا ۔ غالباً اسی اخلاقی تعلیم کی بدولت یہ قصّہ بہت مقبول ہوا ۔ فورٹ ولیم کالج کے حیدر بخش حیدری نے اس کا فصیح اردو ترجمہ کیا تھا جو کالج نے ۱۸۰۵ء میں چھاپا ۔

یہ قصہ مقبولیّت کے نقطۂ نظر سے 'چہار درویش' کے شانہ بہ شانہ ہے ۔ اس کے مطبوعہ ایڈیشن اور مخطوطے متعدد ہیں ۔ قاضی محمد ابراہیم نے ڈنکن فاربس کے مہیا کردہ نسخوں کی مدد سے ایک عمدہ ایڈیشن مرتّب کرکے ۱۲۸۸ھ (مطابق ۱۸۷۲ - ۷۱ء) میں اپنے مطبع فتح الکریم سے شائع کیا ۔ اس کے بعد قاضی عبدالکریم نے مطبعِ کریمی بمبئی سے ایک مختلف ایڈیشن ۱۳۲۰ھ (مطابق ۱۸۰۲ء) میں نکالا ۔ مخطوطوں میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

کے دو نسخے Pi X 52A اور Pi X 52 اہم ہیں ۔ اوّل الذکر کو سوبھا رام ساکن بٹالہ نے بیساکھ ۱۸۹۳ بکرمی (مطابق مئی ۱۸۳۶ء) میں بہ مقام کپور تھلہ تحریر کیا تھا ۔ دوسرا سمبت ۱۸۸۱ (۱۸۲۴ء) کا لکھا ہوا ہے ۔ سب سے ضخیم نسخہ انڈیا آفس کا ہے جس کے ایک حصے میں 'ہفت سیرِ حاتم' اور دوسرے میں 'ہفت انصافِ حاتم' ہے[1] ۔ اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر ڈنکن فاربس نے ۱۸۲۸ء میں اسے انگریزی میں ترجمہ کیا ۔ بہت مدت پہلے فورٹ ولیم کالج میں حیدر بخش حیدری نے اس کا نہایت فصیح اور مؤثر ترجمہ کیا تھا جو ۱۸۰۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا ۔

گل بکاؤلی

یہ داستان جس کی فضا ہندوی اور طلسماتی ہے ، ہندوستان کا قصّہ ہے جسے ۱۱۳۴ھ (مطابق ۲۲-۱۷۲۱ء) میں شیخ عزت اللہ بنگالی نے فارسی زبان میں منتقل کیا[2] ۔ اس کی دلچسپی کے پیشِ نظر فورٹ ولیم کالج کے منشی نہال چند لاہوری نے 'مذہبِ عشق' کے نام سے ۱۸۰۳ء میں اس کا اردو ترجمہ کیا ۔ دوسرے ترجموں کا نام 'تحفۂ مجلس سلاطین'، 'خیابان یا گل بکاولی' اور 'گلزارِ نسیم' ہے ۔ یہ آخری منظوم ترجمہ جو آرائشِ لفظ و معنی کا شاہکار ہے ، منشی دیا شنکر نسیم شاگردِ آتش نے ۱۸۳۸ء میں تیار کیا ۔

قصۂ دقیانوس

یہ قصہ سراسر مذہبی رنگ رکھتا ہے ۔ اس سے راست گوئی ، توکل ، توحید اور خدا پرستی کی تعلیم ملتی ہے ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں اس کا جو نسخہ Pi IX 28 ہے ، اس سے مصنف کا نام یا تاریخِ کتابت کا سراغ نہیں ملتا ۔ تاہم اتنا ظاہر ہے کہ قصّے کی بنیاد قرآنِ حکیم کی سورۂ کہف کے واقعات پر ہے ۔

ہیر رانجھا

پنجاب کی یہ المیہ داستانِ معاشقہ پنجاب کی سب سے زیادہ مقبول و معروف کہانی ہے ۔ ڈھائی صدی سے پنجاب کے طول و عرض میں وارث شاہ کی یہ لمبی بحر والی مثنوی پڑھی اور سنی جا رہی ہے ، یہاں تک کہ آس پاس کے علاقوں میں بھی بہت رائج ہے ۔

---

(۱) ڈاکٹر گیان چند جین : اردو کی نثری داستانیں ، ص ۱۴۴ ۔

(۲) ایتھے : فہرست انڈیا آفس ، ص ۱۲۷ ۔

سید الشاہ نے ایک غزل میں اس المیہ قصے کی دلدوزی و تاثیر کا اشارہ کیا :

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا　　　تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

اس قصے کو سب سے پہلے ایک ہندو دامودر نامی نے پنجابی میں نظم کیا تھا، جو شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں تھا۔ بعد ازاں وارث شاہ نے بڑی آرائش، رچاؤ اور دلسوزی سے اس قصے کو مخصوص ولولہ انگیز، پنجابی بحرِ طویل میں نظم کیا۔ سعید سعدی نے، جو شاہجہانی عہد کا شاعر ہے، اسے فارسی میں نظم کیا۔ ٹھٹہ کے شاہ فقیر اللہ آفرین نے بھی مثنوی لکھی۔ غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ میں نے ۱۱۴۲ھ (مطابق ۱۷۲۹ء) میں فارسی میں آفرین کو یہ قصہ نظم کرتے دیکھا ہے [1]۔ منسا رام منشی نے بھی اسے ۱۱۵۷ھ (مطابق ۱۷۴۴ء) میں فارسی میں نظم کیا [2]۔ پیر قمر الدین منت نے جو عہد اکبر شاہ (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) میں ملک الشعراء کہلاتے تھے، اسے فارسی مثنوی کے قالب میں ڈھالا۔ ان کے علاوہ لائق پنجابی، چنابی وغیرہ کے منظوم قصے بھی ہیں۔

وامق و عذرا

یہ داستان ایشیائے کوچک کی سرزمین سے متعلق ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں شہر ساموس (شامس) کے حاکم فلقراطیس کی ایک ماہ طلعت بیٹی عذرا تھی جو زلیخا کی طرح خواب میں وامق کو دیکھ کر عاشق ہوگئی۔ وامق بھی ملذیطس کا شاہزادہ تھا جو اپنی سوتیلی ماں کی سازش سے شہر بدر کیا گیا تھا۔ اس نے فلقراطیس کے محل میں پناہ لی اور اس طرح عذرا کی مراد بر آئی۔

مدتوں بعد انقلابِ زمانہ سے عذرا کے باپ کی بادشاہت چھن گئی۔ وہ کنیز بنا کر فروخت کی گئی۔ ہرلقالیس نے اسے خریدا اور اس کی سرگذشت سن کر اسے اس کے عاشق سے ملا دیا۔

اس قصے کو سب سے پہلے عنصری نے پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کے آغاز میں نظم کیا۔ کئی صدی بعد فصیحی جرجانی اور امیر فرخانی نے اسے نظم کیا۔ ہندوستان میں ارادات خان نے، جس کا سال وفات ۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ ہے، مرصع و پر تکلف

---

(۱) غلام علی آزاد : سروِ آزاد، ص ۲۰۵۔

(۲) ریو ؛ نسخہ برٹش میوزیم، فہرست، ص ۷۷۰۔

نثر میں اسے لکھا (۱)، جس کی عکسی نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ سیف الدین اخوند نے فارسی اور کشمیری عبارتیں مخلوط کرکے ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ میں اسے نثر میں لکھا (۲)۔ مرزا محمد صادق ناسی نے، جس کا سالِ وفات ۱۷۹۰ء/۱۲۰۴ھ ہے، یہ داستان نظم کی ہے۔ (ر۔ک۔ ریو۔ فہرست ص ۲۱۷۔ فہرست کتبخانہ پیرس مخطوطہ نمبر ۲۱۲۰۔ ص ۷۵۔)

سسّی و پنّوں

اس داستان کا کوئی تاریخی ماخذ نہیں۔ افسانوی واقعات ہیں۔ سسّی پنوں کی داستان کو فارسی میں سب سے پہلے جوت پرکاش نے لکھا اور 'دستورِ عشق' نام رکھا۔ پھر اندر جیت منشی نے، جو نواب عبدالصمّد خان کا دبیر تھا، ۱۷۲۸ء/۱۱۴۰ھ میں اسے 'نامۂ عشق' کے نام سے نظم کیا۔ ۹۸۲ شعر ہیں۔ اردو والوں نے بھی اس دل گداز قصے کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا۔ نواب محبت خان ابن حافظ الملک رحمت خان نے 'اسرارِ محبت' کے نام سے (۱۷۸۲ء/۱۱۹۷ھ) اسے نظم کیا ہے۔

مذکورہ بالا قصوں کے علاوہ اور بھی بہت سے قصے اس زمانے میں لکھے گئے۔ 'مرزا صاحباں'، 'سوہنی مہینوال'، 'قصّہ غم زدا'، 'احوالِ باغ ارم'، 'قصّۂ سیف الملوک' (جو 'الف لیلہ' کی ایک داستان ہے)، 'سرود خسروی' ('خسرو شیریں نظامی' کا نثری ترجمہ)، 'گل با صنوبر چہ کرد'، 'قصۂ اگر گل' (عورتوں کی بے وفائی کے دکھڑے)، 'ریاض القصص' وغیرہ اس عہد کی یادگار ہیں جب مسلمان تیغ و سپر سے غافل ہو کر نغمہ و سرود اور افسون و افسانہ کی طرف مائل ہو چکے تھے اور قاضیٔ قضا و قدر نے ان کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ:

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی

☆ ☆ ☆

---

(۱) مولوی محمد شفیع: مثنوی وامق و عذرا، ص ۴۵۔

(۲) رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، مخطوطہ نمبر ۳۲۲۶۔

حصۂ دوم

(۱۸۵۷ء تا ۱۹۷۱ء)

پہلا باب

پس منظر

برصغیر پاکستان و ہند میں انگریزی دور حکومت صحیح معنوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے ، یعنی جب خاندان مغلیہ کے آخری نام لیوا سراج الدین بہادر شاہ ثانی ظفر کو ، معزول کرکے رنگون جلاوطن کر دیا گیا اور انگریزوں نے اس خاندان کے چراغ اقتدار کو ، جو عرصے سے ٹمٹما رہا تھا ، ہمیشہ کے لیے گل کر کے تمام ملک پر بلا شرکت غیرے حکومت شروع کر دی ۔ اس طرح وہ ایسٹ انڈیا کمپنی ، جو ۱۶۰۰ء میں قائم کی گئی تھی اور جس کا مقصد شروع میں محض تجارتی فوائد حاصل کرنا تھا لیکن جس نے جلد ہی ملک کی سیاست میں دخل دینا شروع کر دیا تھا ، رفتہ رفتہ اس برصغیر کو تاج برطانیہ کا سب سے زیادہ درخشندہ نگینہ بنانے میں کامیاب ہوگئی اور چونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اس لیے اسے ۱۸۵۸ء میں ختم کر دیا گیا اور ملکۂ وکٹوریا کے ایک اعلان کے ذریعے ملک کی باگ ڈور براہ راست حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں آ گئی ۔ ہندوستان کے انگریز حاکم اعلیٰ کی حیثیت ، جو اب تک گورنر جنرل کہلاتا تھا ، اس اعلان کے بعد نائب بادشاہ (وائسرائے) کی بھی ہوگئی اور اس کی مدد کے لیے علاوہ اس کی اپنی کونسل کے انگلستان میں ایک وزیر ہند اور اس کے رفقائے کار کا تقرر ہوگیا ۔ برصغیر پاکستان و ہند کی تاریخ میں اب گویا ایک نئے باب کا آغاز ہوا ؛ حالات بدل گئے ، ضروریات زمانہ میں تغیّر پیدا ہوگیا اور مغربی تعلیم کے اثرات سے لوگوں کے خیالات اور رجحانات میں بھی تبدیلی رونما ہوگئی ۔ ان نئے حالات و کوائف کا اس ملک میں فارسی زبان کی حیثیت پر اثر پڑنا ایک قدرتی بات تھی ۔ چنانچہ بتدریج لوگوں کی توجہ اس زبان اور اس کے ادب کی جانب کم ہوتی گئی جس کے اسباب تلاش کرنا چنداں دشوار نہیں ہے ۔

سب سے بڑا سبب تو یہ تھا کہ برصغیر کے باشندوں کا فارسی سے شغف زیادہ تر ادبی اور ثقافتی نوعیّت کا تھا اور اس زمانے تک مضبوطی سے قائم رہا جب تک کہ ایران اور

دوسرے فارسی بولنے والے ملکوں سے سیاسی اور معاشرتی تعلقات مستحکم رہے - رفتہ رفتہ یہ تعلقات ختم ہوتے گئے اور ایران سے ایرانی شعراء اور ادباء کی آمد و رفت میں کمی آتی گئی - مسلمانوں کے بیشتر علوم کا سرچشمہ عربی زبان تھی ، اس میں مذہبی علوم بھی شامل ہیں اور دوسرے علوم بھی - اس لیے مذہبی یا علمی نقطہ نگاہ سے فارسی کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی - اب جب اس زبان کی معاشرتی اہمیت رو بہ زوال ہوگئی تو اس کا رواج بھی کم ہوگیا - یہی وجہ ہے کہ مشرقی طرز کی جو درسگاہیں زیر بحث ہیں یا اس سے کچھ پہلے کے زمانے میں قائم کی گئیں ، مثلاً دارالعلومِ دیوبند یا ندوۃ العلماءِ لکھنؤ ، ان میں فارسی زبان و ادب کی تعلیم کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا -

ایک دوسرا بڑا سبب ایک نئی زبان یعنی اردو کا فروغ تھا - یہ زبان ، جس کی ابتدا چودھویں صدی عیسوی ہی میں ہو چکی تھی ، رفتہ رفتہ مقبولِ عام ہوتی گئی - چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں بھی اردو عام طور پر سمجھی اور بولی جانے لگی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ دارا شکوہ کے خلاف سامو گڑھ کی جنگ میں اس بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کی ہمت اور حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک اردو جملہ "خدا ہے" استعمال کیا تھا[1] - اورنگ زیب کے جانشینوں کے زمانے میں اردو کی اس ترقی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی بول چال کی زبان اور بہت حد تک تحریری زبان بھی بجائے فارسی کے اردو ہوگئی تھی ، اگرچہ بعض صاحبِ ذوق اور وضع دار لوگ اب بھی فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے - بہادر شاہ ظفر کے عہد میں پہنچ کر یہ روایت بھی تقریباً معدوم ہوگئی -

ایک تیسرا اہم سبب یہ تھا کہ انگریزوں کے ابتدائی دورِ اقتدار میں فارسی بدستورِ سابق دفتری اور عدالتی زبان رہی تھی - لہٰذا جو لوگ حکومت کی ملازمت اختیار کرنا چاہتے تھے وہ اس زبان کو ضرورۃً سیکھتے تھے - اس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی کوئی تخصیص نہ تھی ، بلکہ سکندر لودھی کے زمانے سے ہندوؤں نے فارسی زبان میں جو دلچسپی لینا شروع کی تھی وہ برابر قائم رہی تھی - لیکن جب انگریزوں نے ۱۸۳۸ء میں فارسی کی جگہ اردو اور انگریزی کو دفتری اور عدالتی زبان بنا دیا ، تو یہ ضرورت بھی باقی نہ رہی اور فارسی کی کس مپرسی اور کساد بازاری میں مزید اضافہ ہوگیا ، اگرچہ اس کا مطلب یہ

---

(۱) دیکھیے - لین پول (Lane-Poole) : Medieval India -

نہیں ہے کہ اس دور میں سب پڑھے لکھے لوگ فارسی زبان و ادب سے بیگانہ ہوگئے تھے ، بلکہ اس کے برعکس ان میں اب بھی ایسے صاحبِ ذوق لوگ موجود تھے جو فارسی نظم و نثر لکھنے میں پوری قدرت و مہارت رکھتے تھے ۔ لیکن چونکہ عوام میں اب ان چیزوں کے قدردان مفقود ہوتے چلے جا رہے تھے ، اس لیے انہیں بھی مجبوراً اظہارِ خیالات کا ذریعہ فارسی کی جگہ اردو ہی کو بنانا پڑا اور غالب کے سے صاحبِ استعداد فارسی دان نے بھی اپنے بہترین خطوط ، جو اپنے دوستوں کو لکھے ، وہ اردو ہی میں لکھے ، حالانکہ ان کے یہ احباب فارسی دان تھے ۔ چنانچہ ان کے انہیں خطوط کی بدولت اردو میں ایک اعلیٰ پائے کے اسلوبِ نثر کی ابتدا ہوئی ۔

لیکن عوام کے اس متغیّر ادبی و لسانی رجحان اور انگریزی حکومت کی نئی حکمتِ عملی کے باوجود برِّصغیر کے مختلف حصوں ، بالخصوص دیسی ریاستوں ، مثلاً حیدرآباد دکن ، مہاراشٹر ، راجستھان ، پنجاب ، اودھ وغیرہ میں فارسی بہت بعد کے زمانے تک بدستور سرکاری زبان رہی ۔ مرہٹوں کے ہاں درباری مؤرخ یا وقائع نویس کا عہدہ ''وقنیس'' کے نام سے باقی رہا جس پر عموماً کوئی کائستھ مامور ہوتا تھا[1] ، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں حکومتِ پنجاب کے تمام کاغذات فارسی زبان ہی میں لکھے جاتے تھے ۔ علاوہ ازیں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے کاروبار کے لیے فارسی دان لوگوں کی ضرورت پڑتی تھی اور اس کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اس کے انگریز عمّال بھی اس زبان سے واقفیت حاصل کریں ۔ اپنے ملازمین کی فارسی سے ناواقفیت کی وجہ سے شروع میں کمپنی کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا ، چنانچہ مانکٹن جونز نے اپنی تصنیف 'وارن ہیسٹنگز ان انڈیا' میں شکایت کی ہے کہ '' کمپنی کے ملازمین فارسی سے نابلد ہیں اور اس لیے کمپنی کے کاموں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔''[2] ۱۷۸۶ء میں کرنل ایلن میکفرسن نے اپنے بیٹے جیمز میکفرسن کو ایک خط میں لکھا کہ ''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم خوش و خرم ہو اور فارسی تعلیم کی جانب خاص توجہ کر رہے ہو۔''[3] شروع میں ہندوستانی منشیوں ، وکیلوں اور ترجمانوں کے ذریعے کام چلتا رہا لیکن ۱۷۵۷ء میں یہ تجویز ہوئی کہ کمپنی کے انگریز ملازموں کو تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے بصرے بھیج دیا جایا کرے تاکہ وہ وہاں

---

(۱) جادو ناتھ سرکار : شیواجی ، ص ۳۶۵ ۔

(۲) مانکٹن جونز : Warren Hastings in Bengal ۔

(۳) Soldiering in India, 1764-1784, P. 28, 352 ۔

رہ کر فارسی زبان سیکھ سکیں ۔ اس تجویز پر کچھ مدت تک عمل بھی ہوا لیکن بظاہر یہ ترکیب زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی اور اسی لیے وارن ہیسٹنگز کو کلکتے میں ایک اسکول قائم کرنے کا خیال آیا جہاں فارسی کی تعلیم کا معقول انتظام ہو[1] ۔ غالباً یہ اسکول بھی اطمینان بخش نہ معلوم ہوا ۔ لارڈ ولزلی (۱۸۰۲ء تا ۱۸۰۵ء) نے اپنی ایک یادداشت میں ایک باقاعدہ کالج کی تاسیس پر زور دیا ۔ چنانچہ اس کی تحریک سے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح عمل میں آیا ، جس کی ابتدائی غرض و غایت یہ تھی کہ کمپنی کے انگریز ملازموں کو فارسی اور دیگر زبانیں پڑھانے کا انتظام کیا جائے ۔ لیکن یہ جلد ہی فارسی اور اردو علم و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا ۔ کالج میں اس کے سیکرٹری سرجان گلکرسٹ کی نگرانی میں بہت خوش اسلوبی سے کام ہوتا رہا ۔ گلکرسٹ اس کالج میں ۱۸۰۴ء تک ہندوستانی کا پروفیسر رہا اور یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا اس کا منصب پرنسپل یا ڈائرکٹر کا تھا یا نہیں ۔ تاہم بظاہر وہ جب تک اس کالج سے متعلق رہا زیادہ تر علمی کام اسی کی سعی و اہتمام سے انجام پاتا رہا ۔ لیکن فورٹ ولیم کالج میں زیادہ تر علمی کام اردو یا ہندوستانی اور دیگر ملکی زبانوں میں ہوا اور فارسی میں بہت کم ۔ بعض فارسی کتابوں کا ترجمہ ضرور ہوا مثلاً شیر علی ابن مظفر علی افسوس نے 'گلستانِ سعدی' کا اردو میں 'باغِ اردو' کے نام سے ترجمہ کیا اور میرزا لطف علی لطف نے علی ابراہیم خان کے فارسی تذکرۂ شعراء موسومہ 'گلزارِ ابراہیم' کا اردو ترجمہ مع اضافوں کے مرتّب کیا ۔ جن کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے ان میں مشہور انگریزی کتاب 'ایسپز فیبلز' کے بعض حصے شامل ہیں[2] ۔

تاہم فورٹ ولیم کالج زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا جس کی بڑی وجہ انگریزی حکومت کی نئی تعلیمی حکمتِ عملی تھی ۔ ہر چند کہ اس زمانے میں بھی خاص خاص ہندوستانی افراد ، خصوصاً امراء اور رؤسا کے طبقے ، انگریزی زبان سیکھ چکے تھے[3] ، تاہم ابھی تک انگریزی تعلیم کا رواج عام نہ ہوا تھا اور فارسی کی جگہ انگریزی کو دفتری اور عدالتی

---

(۱) مدرسۂ کلکتہ قائم شدہ ۱۷۸۱ء

(۲) تفصیل کے لئے دیکھیے محمد عتیق صدیقی : 'گلکرسٹ اور اس کا عہد' مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ، ۱۹۶۰ء ۔

(۳) بقول ہیبر (Haber) اودھ کے نواب سعادت علی خان انگریزوں کی سی انگریزی بول سکتے تھے اور اسی طرح ڈھاکے کے نواب شمس الدولہ ۔

زبان بنانے کے بعد اس کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی کہ ملک میں ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن میں نہ صرف ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو بلکہ جن میں عربی، فارسی اور سنسکرت کی پرانی درسگاہوں اور گروکلوں کی قدیم ڈگر سے ہٹ کر ایک نئی روش پر تعلیم دی جائے تاکہ عوام میں قدامت پسندی اور اس کے لوازمات یعنی بیجا تعصّب اور تنگ نظری کم ہو جائے اور ان کے خیالات میں بلندی و وسعت اور رواداری پیدا ہو۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان کی عام ترویج سے انہیں اپنے دفاتر میں کام کرنے والے کلرک آسانی سے مل سکیں گے۔ لیکن یہ قول غیر منصفانہ اور خلافِ حقیقت ہے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس زمانے کے کئی روشن خیال ہندوستانیوں نے بھی اس نئی حکمتِ عملی کا پرجوش خیر مقدم کیا اور سرگرمی سے اس کی تائید و حمایت کی۔ ان لوگوں میں سے ایک بنگال کے مشہور رہنما اور برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے تھے جو خود عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے اور جنہوں نے ایک وقت میں ایک ہفتہ وار فارسی اخبار بھی 'مرآۃ الاخبار' کے نام سے جاری کیا تھا[۱]۔ مسلمانوں میں اس نئی حکمتِ عملی کے سب سے زیادہ پرجوش حامی سرسید احمد خان تھے جنہوں نے علی گڑھ کالج قائم کر کے مسلمانوں کی ایک بڑی وقتی ضرورت کو پورا کر دیا، حالانکہ ان کی اپنی تعلیم اس پرانے ماحول میں ہوئی تھی اور عربی اور فارسی سے انہیں وہی شغف تھا جو ان کے بے شمار مخالفین کو تھا۔

جب ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی تو کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اپنے بجٹ میں ایک رقم ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے بھی وقف کر دی۔ اس سلسلے میں راجہ رام موہن رائے کے تعاون سے کلکتے میں ایک ہندو کالج قائم کیا گیا جس میں مغربی علوم اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں سیرام پور کے عیسائی مشنریوں نے وہاں ایک کالج بیپٹسٹ مشن کالج کے نام سے کھولا اور انہوں نے ۱۸۱۸ء میں ایک اخبار بھی جاری کیا جس کا نام 'سماچا درپن' (آئینہ اخبار) تھا۔ پھر ۱۸۲۰ء میں الیگزانڈر ڈف نے ایک اور کالج کی بنیاد رکھی۔ لیکن ابھی تک حکومت نے انگریزی تعلیم کو لازمی قرار نہیں دیا تھا اور یہ نزاع عرصے تک جاری رہا کہ ہندوستانیوں کی تعلیم

---

(۱) اسی زمانے میں ایک انگریزی کمپنی نے بھی ایک اخبار جاری کیا تھا جس میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مضامین ہوتے تھے اور جو ہر دوسرے ہفتے شائع کیا جاتا تھا (دیکھیے ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپلز، ج ۱، ص ۲۲۵)۔

کس زبان میں ہونا چاہیے ۔ اس جھگڑے کا خاتمہ ۱۸۳۵ء میں میکالے کی مبسوط اور مدلّل رپورٹ سے ہو گیا اور اس رقم کو جو تعلیم کے لئے منعیّن کی گئی تھی ، انگریزی تعلیم پر صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ، اگرچہ حکومت نے پرانی طرز کے عربی ، فارسی اور سنسکرت اداروں کو باقی رہنے دیا اور کسی حد تک ان کی سرپرستی اور مالی اعانت بھی کرتی رہی[1] ۔

حکومت کی طرف سے قائم شدہ ایسے تعلیمی اداروں کے علاوہ جن میں قدیم اور جدید علوم کی مخلوط تعلیم ہوتی تھی ، حکومت نے نئی طرز کی یونیورسٹیاں قائم کرنے کا بھی اہتمام کیا ۔ ان یونیورسٹیوں میں سب سے پہلی کلکتہ یونیورسٹی تھی جو جنوری ۱۸۵۷ء میں قائم کی گئی اور اس کے بعد اسی سال جولائی ۱۸۵۷ء میں بمبئی یونیورسٹی اور اگست ۱۸۵۷ء میں مدراس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ۔ ان یونیورسٹیوں کے بعد متعدد اور یونیورسٹیاں الہ آباد ، پنجاب ، ڈھاکہ ، ناگپور وغیرہ میں قائم ہوتی گئیں ۔ ان سب یونیورسٹیوں میں دیگر زبانوں اور علوم کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانوں اور ان کے ادب کی تعلیم کا بھی انتظام تھا ، اگرچہ ان زبانوں کی تعلیم لازمی نہیں بلکہ اختیاری رکھی گئی تھی اور ان کی عام کساد بازاری کی بدولت ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی چلی گئی ، تاہم ان یونیورسٹیوں سے بہت سے قابل فارسی دان نکلتے رہے جنھوں نے گذشتہ فارسی مصنفین کی کتابوں کے مطالعے اور ان کی تدوین و تحقیق میں قابلِ قدر ذہانت اور مہارت کا ثبوت دیا ۔ لاہور اورینٹل کالج کی تاسیس سے ، جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد بنا ، علومِ شرقیہ کے مطالعے کو مزید تقویت پہنچی ۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) نے (جن کے زمانے میں اورینٹل کالج کی بنا ڈالی گئی) محض کالج نہیں بلکہ ایک اورینٹل یونیورسٹی بنانے کا منصوبہ تیار کیا تھا ۔ لیکن اس تجویز کی خود بعض بارسوخ مسلمانوں کی طرف سے ، جن میں سرسیّد احمد خان بھی شامل تھے ، مخالفت کی گئی ۔ چنانچہ صرف کالج قائم کرنے پر اکتفا کیا گیا جسے بعد میں پنجاب یونیورسٹی کا ایک جزو بنا دیا گیا[2] ۔ اسی قسم کی دو اور درسگاہیں کلکتے کا مدرسہ (جو بالعموم کلکتہ مدرسہ کہلاتا ہے) اور دہلی کا اورینٹل یا عربک کالج تھے جو علی الترتیب ۱۷۸۱ء اور ۱۷۸۰ء

---

(۱) اس نوعیت کے مدارس کے لئے دیکھیے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا مقالہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور فارسی ۔'' اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۱۹۳۱ء ۔

(۲) دیکھیے ڈاکٹر غلام حسین : تاریخ اورینٹل کالج ۔

میں قائم کیے گئے اور جن کے ذریعے علومِ شرقیہ کی بقا اور ترویج میں بہت مدد ملی ۔ دہلی کے عربک کالج سے کئی بڑے پایے کے علماء مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد ، شمس العلماء مولوی ضیاء الدین اور مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ کا تعلق رہا ۔ یہ کالج اب تک باقی ہے اگرچہ اس کی نوعیت بہت بدل گئی ہے ۔

یونیورسٹی اور کالجوں کی تاسیس کے علاوہ انگریزی حکومت کا ایک اور قابلِ تحسین اقدام کلکتے میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام تھا ۔ یہ سوسائٹی ۱۷۸۴ء میں قائم کی گئی اور اس کی طرف سے ایک رسالہ (جرنل) شائع ہونا شروع ہوا جس میں مشرقی علوم سے متعلق محققانہ مقالات کے علاوہ فارسی کے ایسے متون بھی بالاقساط شائع ہوتے رہے جو اس وقت تک نہیں چھپے تھے ۔ مقالات اور متون کی طباعت کے اسی سلسلے نے آگے چل کر اس مفید ادارے کی شکل اختیار کر لی جس نے ببلیوتھیکا انڈیکا کے نام سے بیسیوں اہم کتابوں کے متون شائع کئے اور جو اب تک بدستورِ سابق کام کر رہا ہے ۔

انگریزی حکومت کی طرف سے عربی اور فارسی علوم کی اس سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ برِّصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں پرانی وضع کی ایسی متعدّد درسگاہیں بھی سرگرمِ عمل رہیں جہاں اسلامی علوم اور فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی اور جہاں کے بعض ہونہار اور مستعد طلبہ نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد شہرت اور نیک نامی حاصل کی ۔ ان میں شمس العلماء میر حسن اور مولانا شبلی نعمانی بھی شامل ہیں ۔ اس نوعیت کی درسگاہیں زیادہ تر مساجد میں یا ان سے متعلق ہوتی تھیں ، چنانچہ اس ضمن میں دہلی کی مسجد فتح پوری اور لاہور کی مسجد وزیر خان اور نیلے گنبد کی مسجد کا بالخصوص ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ دیسی ریاستوں میں بھی عربی اور فارسی کی تعلیم و تدریس کے لئے درسگاہیں موجود رہیں جن میں رامپور کا مدرسۂ عالیہ ایک ممتاز مقام رکھتا ہے ۔ ان درسگاہوں کے ساتھ اکثر کتب خانے بھی ہوتے تھے جن میں مطبوعہ اور قلمی کتابوں کے بیش قیمت ذخیرے موجود تھے اور ایک حد تک اب بھی موجود ہیں ۔ ان کتب خانوں میں رامپور کی اسٹیٹ لائبریری ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے ۔ ایسے کتب خانوں کے علاوہ جو حکومتوں کی امداد و اعانت سے معرضِ وجود میں آئے ، برِّصغیر میں کئی ایسے کتب خانے بھی موجود رہے ہیں جو کسی ایک صاحبِ ذوق فرد یا خاندان کے جذبۂ خدمتِ علم کے رہینِ منّت ہیں اور جن سے مشرقی علوم کی ترقی اور آبیاری میں گراں قدر

سند ملتی رہی ہے - بانکی پور (پٹنہ) کی خدا بخش لائبریری اور علی گڑھ کے نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر یار جنگ کا کتب خانہ ایسے کتب خانوں کی بڑی اچھی مثالیں ہیں - مؤخر الذکر کتب خانہ ، جو پہلے حبیب گنج لائبریری کے نام سے موسوم تھا ، اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تحویل میں دے دیا گیا ہے اور اس یونیورسٹی کے کتب خانے کا ایک بیش بہا اثاثہ ہے - اس ضمن میں اورینٹل کالج لاہور کے سابق پرنسپل پروفیسر محمد شفیع صاحب کا اور اسی کالج کے ایک سابق پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے - ان دونوں حضرات نے اپنے ذاتی شوق و انہماک کی بدولت فارسی مخطوطات اور نادر مطبوعہ کتابوں کے ایک بڑے ذخیرے کو جمع اور دستبرد زمانہ سے محفوظ کر کے فارسی زبان و ادب کی قابل ستایش خدمت انجام دی ہے - ان میں سے مؤخر الذکر کا ذاتی کتب خانہ اب پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا گیا ہے - انہیں کتب خانوں میں لاہور کی پبلک لائبریری کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے - اگرچہ اس کی تاسیس اور اس کے لئے فراہمی کتب کی ذمےداری زیادہ تر حکومت پر رہی ہے -

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ زمانہ زیر بحث میں ، باوجود عظیم سیاسی اور معاشرتی انقلاب کے جس نے عوام کے نقطۂ نظر اور زندگی کی اقدار میں ایک بڑا تغیّر پیدا کر دیا ، فارسی زبان و ادب سے وابستگی کی پرانی روایت بالکل مردہ نہیں ہو گئی بلکہ اب تک زندہ ہے ، اگرچہ فی الحال سسکتی ہوئی حالت میں ہے - ہماری یونیورسٹیوں میں ، باوجود اس کے کہ ان میں فارسی تعلیم کے عمدہ اور قابل اطمینان انتظامات موجود ہیں اور لائق اساتذہ کی بھی کمی نہیں ہے ، فارسی پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے اور اس کا اندیشہ ہے کہ کم از کم برصغیر کے بعض حصوں میں آگے چل کر یہ روایت یکسر معدوم نہ ہو جائے اور ہماری آیندہ نسلیں ان ادبی ، مجلسی اور ثقافتی قدروں سے بالکل ہی بیگانہ ہو جائیں جو فارسی کتابوں میں محفوظ ہیں - تاہم زمانۂ حال میں ایران و پاکستان کے قریبی تعلقات کی بنا پر یہ امید بھی کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں فارسی تعلیم و تعلّم کی جانب زیادہ توجہ دی جائے گی اور فارسی دانی کی قدیم روایت کا ایک بار پھر احیاء ظہور میں آئے گا -

فارسی دانی کے موجودہ انحطاط کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ زمانۂ زیر بحث میں ، یا کم از کم ۱۹۱۴ء کے بعد سے ، ہمارے علماء نے (ماسواء شاعری کے) فارسی میں کوئی خاص

تخلیقی کام نہیں کیا بلکہ ان کی تمام ہمت و قابلیت محض تدوین و تصحیحِ متون ، کلاسیکی فارسی تصانیف کی تشریح و تنقید اور فارسی کے درسی نصابوں کی تیاری و ترتیب میں صرف ہوتی رہی ہے ۔ جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے اس دور میں دو متضاد رجحان کارفرما نظر آتے ہیں ؛ بعض شعراء مثلاً گرامی جالندھری (جو حیدر آباد دکن کے نظام میر عثمان علی خان مرحوم کے استاد تھے اور حن کے ء (مہ اقبال بہت معترف و مدّاح تھے) اور ان سے پہلے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ، امام بخش صہبائی ، تفتہ ، میر مہدی مجروح ، نواب ضیاء الدین خان نیر رخشاں ، مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی ، مفتی سید محمد عباس لکھنوی (مصنف 'من و سلویٰ') وغیرہ فارسی شاعری کی قدیم وضع اور کلاسیکی اسالیب کے پابند رہے ، لیکن بعض دوسرے شعراء مثلاً غالب ، شبلی نعمانی اور بالخصوص علامہ اقبال کے کلام میں نہ صرف برِصغیر میں اسلامی حکومت کے زوال و انقراض اور مسلمانوں کے ذہنی ، معاشرتی اور اقتصادی انحطاط کا حزن آمیز شعور اور گہرا احساس پایا جاتا ہے بلکہ زمانۂ حال کے مغربی خیالات اور نظریات کا ردّ عمل بھی نمایاں ہے ۔ ان شاعروں نے غزل اور قصیدے کی پرانی روش کو ترک کر کے ایک نئی طرز اختیار کی جس سے ان کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں ان کی پست حالت کا احساس اور اسلامی معاشرے کی اصلاح اور جوشِ ایمانی کا جذبہ پیدا کیا جائے ۔ علامہ اقبال کی مثنویاں 'اسرارِ خودی' ، 'رموزِ بیخودی' اور ''پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق'' عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہیں ، اور شبلی نعمانی کی فارسی شاعری کے بارے میں ان کی فاضلانہ تنقیدی تاریخ یعنی 'شعرالعجم' سے جو اگرچہ ضروریاتِ زمانہ کے پیشِ نظر اردو میں لکھی گئی ہے ، نہ صرف مشرقی ممالک کے بلکہ یورپ کے اہلِ علم بھی ، جن میں مشہور مستشرق پروفیسر براؤن شامل ہیں ، استفادہ کرتے رہے ہیں ۔

فارسی سے متعلق تنقید کے میدان میں جن علماء نے شہرت حاصل کی ، ان میں حافظ محمود شیرانی کا نام سرِ فہرست ہے ۔ انہوں نے باوجود انگریزی تعلیم سے باقاعدہ مستفید نہ ہونے کے تنقید کے جدید مغربی اصولوں کو جس خوبی سے اپنایا اور استعمال کیا ہے ، وہ یقیناً قابلِ داد ہے ۔ حافظ محمود شیرانی کے علاوہ پروفیسر محمد شفیع اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا ہے ۔ ان حضرات کے مضامین زیادہ تر لاہور اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوتے رہے ۔ لیکن بعض صورتوں میں کتابی شکل میں بھی

چھپے[1] ۔ فارسی منظوم و منثور متون کی طبع و تدوین کا کام برِ صغیر کی کئی درسگاہوں ، خصوصاً یونیورسٹیوں میں برابر جاری رہا اور ان لوگوں میں جو اس کام میں پیش پیش رہے ، سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ ہیں : پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد شفیع جنہوں نے عبدالرزاق سمرقندی کی تاریخ 'مطلع السعدین و مجمع البحرین[2]' اور عنصری کی مثنوی 'وامق و عذرا[3]' کو طبع کیا ، اسی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد اقبال ، جنہوں نے الراوندی کی تاریخِ سلاجقہ یعنی 'راحة الصدور' کو ایڈٹ کیا ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر ہادی حسن جنہوں نے 'دیوانِ فلکی شروانی' اور 'دیوانِ قاسم[4]' کی تدوین کی اور کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی جنہوں نے سیف بن محمد الهروی کی تاریخِ ہرات موسومہ 'تاریخ نامہ ہرات' کو طبع کیا[5] ۔

فارسی ادب کا ایک شعبہ جس میں تھوڑا بہت تخلیقی کام زمانہ زیر بحث میں بھی ہوتا رہا ، مذہبی یا صوفیانہ نوعیت کا ہے ۔ چنانچہ اس زمانے میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں ۔ ان کتابوں کے مصنفین میں ایک قابل ذکر نام تھانہ بھون (یو ۔ پی) کے حاجی امداد علی کا ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد حجاز کو ہجرت کر گئے تھے اور وہیں ۱۸۹۹ء میں فوت ہوئے ۔ ان کے شاگردوں میں کئی نامور علماء شامل ہیں ، مثلاً نانوتے کے مولانا محمد قاسم اور سہارن پور کے مولانا فیض الحسن ۔ حاجی امداد علی کی تصنیف کردہ متصوفانہ کتابوں میں سے یہ تین مشہور ہیں : 'غذاء الروح' ، 'ضیاء القلوب' اور 'تحفة العشاق' ۔ اسی ضمن میں جونپور کے مشہور و معروف مصلح اور عالمِ دین مولوی کرامت علی (م ۱۸۶۳ء) کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے ، جنہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بنگال میں بسر کیا اور کئی کتابیں تصنیف کیں ، جن میں 'شمائل الترمذی' اور

---

(۱) نمونے کے لئے دیکھیے پروفیسر محمد حبیب کی 'خزائن الفتوح' کے انگریزی ترجمے پر حافظ محمود شیرانی کی طویل تنقید جو لاہور اورینٹل کالج میگزین میں بالاقساط شائع ہوئی ۔

(۲) یہ کتاب پہلے لاہور اورینٹل کالج میگزین کے ادبی ضمیمے میں بالاقساط شائع ہوئی اور پھر ۱۳۶۰ھ میں مطبع گیلانی لاہور میں کتابی شکل میں چھپی ۔

(۳) یہ مثنوی پروفیسر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے خلف الرشید احمد ربانی کی سعی و اہتمام سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ۔

(۴) یہ دیوان ۱۳۷۵ھ میں کلکتے کی ایران سوسائٹی نے شائع کیا ۔

(۵) مطبوعہ کلکتہ بیپٹسٹ پریس ۱۹۴۳ء ۔

'مشکوٰۃالمصابیح' کے فارسی ترجمے بھی شامل ہیں[1] ۔ علاوہ ازیں فارسی لغت نویسی کا جو سلسلہ برِّ صغیر میں دورِ سلطنت سے شروع ہوا تھا ، یعنی 'فرہنگ اسکندری' کی تالیف سے ، وہ اس دور میں بھی کم و بیش جاری رہا اور کئی مفید لغات مرتب کی گئیں جن میں منشی ٹیک چند بہار کی 'بہارِ عجم' ، سراج الدین علی خان کی 'سراج اللغات' ، رامپور کے محمد غیاث الدین کی 'غیاث اللغات' (سنہ تالیف ۱۸۲۶ء - ۱۸۲۷ء) ، منشی کریم الدین کی 'کریم اللغات' اور مولوی تصدق حسین کی 'لغاتِ کشوری' (جو انہوں نے منشی نولکشور کے نام پر ۱۸۷۱ء کے بعد تالیف کی تھی) خاصی مشہور ہیں ۔ تخلیقی کاموں کے سلسلے میں میرزا اسد اللہ خاں غالب کی بعض منثور فارسی تصانیف کا ذکر بھی ضروری ہے جو خاصی قدر و قیمت کی حامل ہیں ۔ ان میں سے ایک انشاء کی کتاب 'پنج آہنگ' ہے ، جس کے پانچویں باب ''آہنگِ پنجم'' میں غالب نے اپنے فارسی خطوط جمع کئے ہیں ۔ ایک اور کتاب 'دستنبو' میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے حالات خالص فارسی میں بیان کئے ہیں اور تیسری کتاب 'مہرِ نیمروز' کے نام سے مغلیہ سلطنت کی ایک نامکمل تاریخ ہے ۔

اس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جانے کے لئے فارسی کے جو نصاب مرتّب ہوتے رہے ان میں مولانا محمد حسین آزاد کی مرتّبہ ''فارسی کی پہلی کتاب'' (لاہور ۱۸۷۰ء ، ۱۸۷۳ء ، ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۶ء) ، جس کا اُردو ترجمہ ۱۸۹۶ء میں راول پنڈی میں چھپا ، ''فارسی کی دوسری کتاب'' (لاہور ۱۸۷۰ء ، ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۶ء) محمد شبلی نعمانی کا تالیف کردہ 'نصاب فارسی' (الہ آباد ۱۸۹۴ء) ، شمس العلماء مولوی سید امجد علی کا 'فارسی نصاب' (الہ آباد ۱۹۰۴ء) ، علامہ اقبال کی مرتّبہ نصابی کتابیں اور محی الدین کا 'نصابِ فارسی برائے مڈل اسکول' (الہ آباد ۱۸۹۴ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ یہ سب نصاب محنت و کاوش سے تیار کئے گئے تھے اور کلاسیکی فارسی نثر و نظم کے بہترین نمونوں پر مشتمل تھے ۔ بعد کے زمانے میں پروفیسر محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال کی سعی و اہتمام سے پنجاب یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ اور بی ۔ اے کے امتحانوں کے لئے بھی جامع اور مستند نصاب تالیف ہوئے جو پنجاب کے علاوہ برِّ صغیر کی بعض اور درسگاہوں میں بھی رائج رہے ۔

انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں فارسی علم و ادب کی جو سرپرستی کی اس کا

---

(۱) دیکھیے ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپلز ، ج ۱۰ ، ص ۲۱۳ ۔

آغاز زمانے کے اعتبار سے اس دور (۱۸۵۷ء تا ۱۹۷۱ء) سے بہت پہلے ہوا تھا ۔ ان کے ان اقدامات کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ؛ یعنی (الف) فارسی میں ان کی اپنی تصانیف (ب) فارسی کتابوں کے انگریزی ترجمے جو انہوں نے کئے اور (ج) فارسی زبان کی وہ کتابیں جو ان کے ملازمین نے لکھ کر ان کے نام سے منتسب کیں ، یا وہ کتابیں جو ان کی براہِ راست نگرانی میں اور ان کی ترغیب و تحریک سے تصنیف یا طبع کی گئیں ۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ہم محض ان تصانیف کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو برِّ صغیر میں لکھی گئیں یا طبع ہوئیں اور اس لئے انگریز یا دیگر یورپی مستشرقین کی ان تصانیف سے بحث نہیں کی جائے گی جو یورپ کے مختلف ملکوں میں شائع ہوتی رہی ہیں ۔ ان مستشرقین نے مشرقی زبانوں ، عربی ، فارسی اور سنسکرت کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں ، وہ ہر صاحبِ ذوق اور با خبر شخص کو بخوبی معلوم ہیں ، لیکن یہ ادبی کارنامے ہماری اس تاریخ کے مخصوص دائرے سے باہر ہیں اور ان کے ذکر کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

(الف) پہلی قسم کی تصانیف میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف تھامس ولیم بیل (Beale) کی 'مفتاح التواریخ' ہے ۔ بیل آگرے کے بورڈ آف ریونیو کے دفتر میں ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا لیکن اس نے فارسی میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی اور اسے تاریخِ اسلام کے مطالعے کا خاص شوق تھا ۔ اس نے اپنی اس کتاب میں نہایت محنت اور عرق ریزی سے ہجرتِ نبوی صلعم سے شروع کر کے اپنے زمانے (یعنی عہد اکبر شاہ ثانی ، از ۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) تک کے ان مشہور تاریخی واقعات سے متعلق ، جو ایشیا اور بالخصوص برِّ صغیر پاکستان و ہند میں ظہور پذیر ہوئے ، قطعاتِ تاریخ جمع کر دیے ہیں ۔ یہ قطعات جو مسلمان بادشاہوں ، فلسفیوں اور دیگر سرکردہ اشخاص کی تاریخِ پیدائش یا وفات کے بارے میں ہیں ، متعدّد مشہور تواریخ اور نیز ان کتبوں سے لئے گئے ہیں جو اسے جگہ جگہ قدیم محلوں ، تالابوں اور مسجدوں وغیرہ پر ملے تھے ، اور ان میں اس نے اور اس کے بعض احباب نے کئی اپنے تصنیف کردہ قطعات کا بھی اضافہ کر دیا ہے ۔ ان سے نہ صرف ہجری بلکہ عیسوی ، ہندی ، فصلی ، الٰہی اور جلالی سنین کی تاریخیں بھی نکلتی ہیں ۔ جیسا کہ ایلیٹ (Elliot) نے لکھا ہے (ج ۸ ، ص ۴۴) اس قسم کی کتاب کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہو سکتی ، لیکن اس کا ایک بڑا مصرف یہ ہے کہ اس کی مدد سے بعض مشتبہ یا مختلف فیہ تاریخوں کی صحت کے ساتھ تعیین کی جا سکتی ہے ، اس لیے کہ قطعاتِ

تاریخی میں کسی غلطی یا اشتباہ کا امکان نہیں رہتا ۔ یہ کتاب تیرہ ابواب میں منقسم ہے جن میں سے ہر ایک باب سنہ ہجری کی ایک صدی سے متعلق ہے ۔ یہ کتاب ۱۸۴۰ء میں آگرے میں چھپی تھی[1] ۔

اسی قسم کی ایک اور کتاب جس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے (ریو ، ج ۲ ، ص ۸۲۳) 'احوال بی‌بی جولیانہ' (یا جلیانہ) کے نام سے موسوم ہے ۔ جولیانہ ایک پرتگیز لڑکی کا نام تھا جو بنگال کے حاکم قاسم خاں کی ہگلی کے پرتگیزوں کے خلاف تعزیری مہم میں (جو ۱۶۳۲ء میں بادشاہ شاہجہان کے ایماء سے عمل میں آئی) دوسرے بہت سے پرتگیزی اسیرانِ جنگ کے ساتھ دہلی آئی تھی ۔ جولیانہ بعد ازاں شہزادہ معظّم (بہادر شاہ اوّل) کے متعلقین میں شامل رہی اور جب یہ شہزادہ تخت نشین ہوا تو اسے دربار شاہی اور امورِ مملکت میں کافی اثر و رسوخ حاصل ہو گیا ۔ اس کا انتقال غالباً ۱۶۷۶ء/ ۱۰۸۷ھ میں ہوا ۔ اس تذکرے کا (جو بظاہر جولیانہ کی خود نوشت یاد داشتوں پر مبنی ہے) مصنف ایک شخص گارٹن برُوٹ (Garton Bruit) نامی تھا ۔ تقریباً اسی زمانے میں میجر آر ۔ ای ۔ رابرٹس نے ، جو ۱۷۹۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں لفٹیننٹ کرنل ہوگیا تھا ، فارسی اور انگریزی کی ایک ضخیم لغت مرتّب کی جو 'فرہنگِ فارسی' کے نام سے معروف ہے (دیکھیے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی ، ج ۱۳ ، ص ۱۵) ۔

دو اور کتابیں مشہور طالع آزما جیمز اسکنّر کی تالیف کردہ ہیں ۔ جیمز اسکنّر کا باپ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا اور اس نے اپنی تمام عمر زیادہ تر ایک سپاہی کی حیثیت سے گزاری ۔ اس کے خاندان کے لوگ اب تک میرٹھ اور دہلی وغیرہ میں موجود ہیں اور دہلی کے کشمیری دروازے کے قریب ایک قدیم مکان اب بھی اسکنّر کی حویلی[2] کے نام سے موجود ہے ۔ ہندوستانی فوج کا ایک سوار دستہ بھی اسی کے نام سے بنایا گیا تھا ۔ ان دو کتابوں میں سے پہلی کا نام 'تشریح الاقوام' ہے ۔ اس میں برِّ صغیر میں آباد مختلف قوموں کا ذکر ہے اور اودھ کے بادشاہوں اور قصور کے افغانوں کے حالات بھی دیے گئے ہیں ۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس کتاب کی تیاری میں بعض سنسکرت کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ یہ کتاب سر جان میلکم کے نام سے منتسب ہے

---

(۱) مزید تفصیل کے لئے دیکھیے ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۱۴۴ ببعد ۔

(۲) Skinner's House ۔

(تفصیل کے لئے دیکھیے ریو ، ج ۱ ، ص ۲-۳ ، اسی نام کی ایک اور کتاب مصنفہ کیول زام کے لئے دیکھیے ایلیٹ ، ج ۸ ، ص ۱۹۳) ۔

(ب) ان انگریزوں نے جو بسلسلۂ ملازمت وقتاً فوقتاً اس برّ صغیر میں آتے رہے ، متعدد فارسی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ۔ ان کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے اور ان میں سے صرف چند زیادہ اہم کا ذکر کیا جا سکتا ہے :

(۱) پی ۔ ڈبلیو چیپ مین نے مشہور فارسی کتاب 'سیاحت نامہ' یا 'حالاتِ اسد بیگ' قزوینی کا ترجمہ کیا (دیکھیے ریو ، ج ۳ ، ص ۹۸۰) ۔ اسی مصنف نے 'مرآۃِ مسعودی' کا بھی ترجمہ کیا جو سالار مسعود غازی کے حالات پر مشتمل ہے ۔

(۲) ای ۔ پی ۔ ایسٹ وک نے بہمن بن کیقباد کی اس فارسی نظم کا ترجمہ کیا جو 'قصہ سبحان' کے نام سے موسوم ہے اور جس میں پارسیوں کی ہندوستان میں آمد کا ذکر کیا گیا ہے (جرنل ایشیاٹک سوسائٹی ، بمبئی ، ج ۱ ، ص ۱۶۷ تا ۱۹۱ ، ریو ، ج ۱ ، ص ۵۰) ۔

(۳) ایلیٹ اور ڈاؤسن نے خوافی خاں کی معروف تاریخ 'منتخب اللباب' کے کئی حصوں کا ترجمہ کیا جو ان کی تصنیف کردہ تاریخِ ہند میں موجود ہے (ج ۷ ، ص ۲۰۷ ِ ببعد) ۔ اسی کتاب کے ایک حصے کا ترجمہ ولیم ارسکن نے بھی کیا اور دوسری جلد کے حصۂ اول کا اے گووٹرن نے ۔ مؤخر الذکر کے کچھ اجزاء برٹش میوزیم میں موجود ہیں (دیکھیے ریو ، ج ۱ ، ص ۲۳۳) ۔

(۴) ولیم ارسکن نے میرزا حیدر دوغلات کی 'تاریخِ رشیدی' کی انگریزی میں تلخیص کی (ریو ، ج ۱ ، ص ۱۹۶) ۔

(۵) ڈاکٹر جان لائیڈن نے 'تزکِ بابری' کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا جو نا مکمل رہا ۔ بعد ازاں ولیم ارسکن نے اس پر نظر ثانی کر کے اسے مکمل کیا اور ۱۹۲۶ء میں مع ایک مقدمے اور حواشی کے شائع کیا ۔ ایلیٹ نے بھی اس کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا ہے (ج ۴ ، ص ۲۱۸ تا ۲۸۷) ۔

(۶) مسز اے ۔ بیورج نے 'تزکِ بابری' یا 'بابر نامہ' کا ترجمہ کیا جو ارسکن کے

ترجمے سے اس لحاظ سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ اصل ترکی متن پر مبنی ہے جسے بیوریج پہلے شائع کر چکا تھا (گب میموریل سیریز، شمارہ ۱) - یہ ترجمہ دو جلدوں میں ''میمائرز آف بابر'' کے نام سے شائع ہوا تھا -

(۷) میجر چارلس اسٹوارٹ نے جوہر آفتابچی کے 'تذکرۃ الواقعات' (دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن، ج ۵، ص ۱۳۶، اور ج ۶، ص ۱۱۷) کا انگریزی ترجمہ کیا جو ۱۸۳۲ء میں شائع ہوا - یہ ترجمہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے اور اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی مطبوعات میں شامل ہے - بعض لحاظ سے ارسکن کا اسی کتاب کا ترجمہ بہتر ہے (دیکھیے ریو، ج ۱، ص ۲۴۶) - اصل کتاب کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہے -

(۸) فرانسس گلیڈون نے ابوالفضل کے 'اکبر نامہ' کے ایک بڑے حصے کا انگریزی میں ترجمہ کیا (کلکتہ ۱۷۸۳ء) - اسی کتاب کے حصہ اول کا ترجمہ بلاخمن نے کیا جو ۱۸۷۳ء میں کلکتے سے شائع ہوا - اس کا ایک ملخص ترجمہ ولیم ارسکن نے بھی کیا تھا جو برٹش میوزیم میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے (ریو، ج ۱، ص ۲۴۸) -

(۹) 'میجر ڈیوڈ پرائش' نے 'تزکِ جہانگیری' کا ترجمہ کیا جو ۱۸۲۹ء میں لنڈن سے شائع ہوا - اسی کتاب کے شروع کے حصے (پہلے نو برس) کا ترجمہ ولیم ارسکن نے بھی کیا تھا جس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے (ریو، ج ۱، ص ۲۵۳) -

(۱۰) ولیم ارسکن نے معتمد خان کے 'اقبالنامہ جہانگیری' کا ملخص ترجمہ کیا جس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے - علاوہ ازیں ایلیٹ و ڈاؤسن (ج ۶، ص ۴۰۰ تا ۴۳۸) میں بھی اس کے بعض حصوں کا ترجمہ دیا گیا ہے -

(۱۱) سر ولیم فورسائتھ نے گمنام مصنف کی 'تاریخِ احمد شاہی' کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ کیا جو ایک مخطوطے کی شکل میں برٹش میوزیم میں موجود ہے - ایلیٹ و ڈاؤسن کی تاریخ میں اس ترجمے کے بعض اقتباسات دیے گئے ہیں (دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن، ج ۸، ص ۱۰۴ تا ۱۲۳) - (مخطوطے کی کیفیت کے لیے دیکھیے ریو، ج ۳، ص ۹۴۱) -

(۱۲) میجر فلر نے محمد محسن صادق کی تاریخ 'جوہرِ صمصام' کا انگریزی میں ترجمہ کیا - یہ ترجمہ ایلیٹ کی تاریخِ ہند کے لئے کیا گیا تھا اور اس تاریخ کی آٹھویں جلد (ص ۲۷

بعد) میں اس کے کچھ اقتباسات دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں اورنگ زیب کے عہد سے لے کر نادر شاہ کی ہندوستان سے واپسی تک کے واقعات کا ذکر ہے، لیکن زیادہ تفصیلی حالات فرّخ سیر کے عہد سے شروع ہوتے ہیں۔ نادر شاہ کے حملے کا مفصّل بیان ہے لیکن مصنف نے جگہ جگہ مبالغے سے کام لیا ہے (دیکھیے نیز ریو، ج ۳، ص ۹۴۱)۔

(۱۳) میجر فلڈر ہی نے سیّد غلام علی کی تاریخ 'نگار نامۂ ہند' کا ترجمہ کیا۔ یہ تاریخ زیادہ تر احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی جنگ (تیسری جنگِ پانی پت ۱۷۵۷ء) کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ بھی ایلیٹ کی تاریخ کے لیے کیا گیا تھا اور اس کے بعض اقتباسات اس تاریخ کی آٹھویں جلد (ص ۳۹۶ ببعد) میں درج ہیں۔ (دیکھیے نیز ریو، ج ۲، ص ۹۴۳)۔

(۱۴) میجر فلڈر نے ہی ایک اور فارسی تاریخ یعنی علی ابراہیم خان کی 'تاریخ مرہٹہ' کا بھی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی ایلیٹ کے ایماء سے کیا گیا تھا اور اس کے اقتباسات ایلیٹ کی تاریخِ ہند کی آٹھویں جلد (ص ۲۵۷ ببعد) میں موجود ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ کتاب بہت قدر و قیمت کی حامل ہے (دیکھیے نیز ریو، ج ۲، ص ۳۲۸)۔

(۱۵) چارلس ہملٹن نے غلام یحییٰ (م ۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ) کی 'ہدایۂ فارسی' کے ایک حصے کا ترجمہ کیا۔ (دیکھیے ریو، ج ۱، ص ۲۳ - ۲۴)۔

(۱۶) لفٹیننٹ پرکنس (Perkins) نے مستعد خان کی تصنیف 'مآثرِ عالمگیری' کا ترجمہ کیا جس کا ایک ناقص نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے (دیکھیے ایلیٹ و ڈاؤسن، ج ۷، ص ۱۸۱)۔

(۱۷) لفٹیننٹ رچرڈ نے شیوداس منّور قلم کی تاریخ 'شاہنامۂ منّور قلم' کا ترجمہ کیا۔ یہ تاریخ فرخ سیر کے عہد کے پہلے چار سالوں اور عہدِ محمد شاہی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے (دیکھیے نیز ریو، ج ۳، ص ۹۳۸)۔

(۱۸) لفٹیننٹ رچرڈ نے ہی 'خطوطِ فیضی' یعنی فیضی کے ان خطوط کا ترجمہ کیا جو اس نے اکبر بادشاہ کے نام دکن سے لکھے تھے (دیکھیے ریو، ج ۳، ص ۹۳۸)۔

(ج) ان کتابوں کی مختصر فہرست جو ہندوستان میں انگریزی حکام اور اہل علم

کے ایماء یا پاسِ خاطر سے مرتّب و مدّون کی گئی ہیں ، ان میں بعض اہم فارسی متون شامل ہیں اور ان کے طابع بھی اکثر بڑے پائے کے علماء تھے :

(۱) محمد صادق علی رضوی نے ابوالفضل کے 'اکبر نامہ' کا متن مرتّب کیا اور بیورج نے اس کا ترجمہ کیا (ببلیوتھیکا انڈیکا ، ۱۸۳۱ء) -

(۲) آغا احمد علی اور مولوی عبدالرحیم نے بھی 'اکبر نامہ' کا متن تصحیح و تنقید سے تیار کیا (۱۸۴۸ء) -

(۳) سر سید احمد خان نے ابوالفضل کی 'آئینِ اکبری' کا متن مرتّب کیا اور بلاخمن اور جیرٹ نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا (۱۸۵۵ء) -

(۴) مولوی عبدالرحیم اور کبیرالدین نے ملا عبد الحمید لاہوری کے 'بادشاہ نامہ' کا متن تیار کیا جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سلسلۂ ببلیوتھیکا انڈیکا میں ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا -

(۵) سراج الحق بن نورالحق نے کلیاتِ بیدل کو طبع کیا جس کی اشاعت بمبئی میں ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں ہوئی -

(۶) مولوی احمد علی نے ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخِ بدایونی یا 'منتخب التواریخ' کا متن ببلیوتھیکا انڈیکا کے لئے تیار کیا جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا -

(۷) مولوی عبدالکریم نے سید غلام حسین خان طباطبائی کی 'سیر المتاخرین' کا متن مرتّب کیا - اس کا تیسرا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنئو میں ۱۸۹۷ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا - رینالڈز نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا - اس ترجمے کو بھی کیمبرے (Cambray) نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے -

(۸) مولوی عبدالحمید اور کبیر الدین نے ناسو لیز (Nassau Less) کے لیے جامی کی 'نفحات الانس' کا متن تیار کیا (۱۸۵۵ تا ۱۸۷۱ء) -

(۹) شاہ عزیزالحسن نے 'شواہد النبوۃ' کو مرتّب کیا - یہ کتاب ۱۸۷۶ء میں لکھنئو میں چھپی -

(۱۰) محمد ساجد قادری ، فرید الدین احمد اور عبد الحمید نے جامی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' کی شرح کلکتے میں طبع کرائی (۱۸۶۲ تا ۱۸۶۶ء)۔

(۱۱) نور محمد بن عبدالصمد نے اسی مثنوی کو مرتب کرکے بمبئی میں چھپوایا (۱۸۷۵ء)۔

(۱۲) مولوی ابو طاہر ذوالفقار علی مرشد آبادی نے 'ملا' عبدالرشید تتوی کی 'فرہنگِ رشیدی' کو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لئے مرتب کیا اور یہ فرہنگ ۱۸۷۲ء میں بیپٹسٹ مشن پریس میں چھپی۔

(۱۳) مولوی اللہ داد نے 'منتخب اللغات رشیدی' کو مرتب کیا اور یہ کتاب ۱۸۰۸ء میں کلکتے میں شائع ہوئی۔

(۱۴) مولوی عبدالرحیم اور میرزا اشرف علی نے ببلیوتھیکا انڈیکا کے لئے عبدالرزاق صمصام الدولہ شاہنواز خان و عبدالحق بن شاہنواز خان کی مشہور تصنیف 'مآثر الامراء' کی تدوین و تصحیح کی۔ یہ کتاب کلکتے میں ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی اور ۱۹۱۱ء میں ایچ۔ بیورج نے اس کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔

(۱۵) علی ابراہیم نے ہاتفی کی مثنوی 'لیلیٰ و مجنوں' کو مرتب کیا اور مشہور مستشرق سر ولیم جونز نے اس کا دیباچہ لکھا۔ یہ مثنوی کلکتے سے ۱۷۸۸ء میں شائع ہوئی۔

(۱۶) خان بہادر مولا بخش نے ببلیوتھیکا انڈیکا کے لئے 'تذکرۂ شوستر' کو مدوّن کیا جو کلکتے میں ۱۸۴۸ء میں چھپا۔

(۱۷) آغا احمد علی شجاعت علی نے 'رسالہ ترانہ و رباعی' تالیف کیا جسے بلاخمن نے مقدمے اور انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا (کلکتہ ۱۸۶۷)۔

(۱۸) سرسیّد احمد خان نے 'آئینِ اکبری' کے علاوہ (دیکھیے اوپر) مندرجہ ذیل کتابیں مرتب کیں :

(۱) 'تزکِ جہانگیری' (۲) 'کیمیای سعادت' از امام الغزالی اور (۳) برنی کی 'تاریخِ فیروز شاہی'۔ یہ تینوں کتابیں بھی ببلیوتھیکا انڈیکا کے سلسلے میں شائع ہوئیں۔

(۱۹) خان صاحب مولوی عبدالمقدر نے سرڈینی سن راس کے تعاون سے امین احمد رازی کی 'ہفت اقلیم' کا متن مرتّب کیا جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا - اس کتاب سے بہت سے مصنّفین نے استفادہ کیا ہے - ایشیاٹک سوسائٹی کی فرمایش پر لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر صمدی نے اس کتاب کے بعض حصّوں کو حال ہی میں طبع کیا ہے -

ضمیمہ

(الف) فارسی کے ان نصابوں کی فہرست میں (دیکھیے اوپر) جو برّصغیر کے علماء نے مختلف امتحانات کے لئے مرتّب کئے ، مندرجہ ذیل کا اضافہ ہو سکتا ہے :

(۱) فارسی میٹرک کورس برائے الہ آباد یونیورسٹی مرتّبہ حافظ جلال الدّین احمد (۱۸۹۱ - ۱۸۹۲ء) -

(۲) ایف - اے امتحان کے لئے جدید منتخب نصابِ فارسی مرتّبہ مولوی احمد صاحب (کلکتہ ۱۹۰۲) -

علاوہ ان کے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے نصاب ساز اور ممتحن سردار چھجو سنگھ نے بھی کئی فارسی نصاب مرتّب کئے تھے -

(ب) ان انگریزوں کے ناموں میں جنھوں نے فارسی متون کو مرتّب کر کے شائع کیا یا ان کا ترجمہ کیا ، مندرجہ ذیل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے :

(۱) G. Stouchouse جس نے عبداللہ خان اوزبک کے نام اکبر کے خطوط کا ترجمہ کیا (New Asiatic Miscellany ، کلکتہ ۱۷۸۹ء) -

(۲) کیپٹن جی - جاروس Jaruis جنھوں نے جامی کی 'یوسف و زلیخا' کو طبع کرکے چھاپا (بمبئی ۱۸۲۹ء) -

(۳) مسز اے - بیورج جنھوں نے گلبدن بیگم کے 'ہمایوں نامہ' کا فارسی متن مرتّب کیا اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا (رایل ایشیاٹک سوسائٹی ، لنڈن ۱۹۰۲ء) -

(ج) انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تائید و حمایت میں دو مقتدر مسلمان اور ہندو رہنماؤں کے بیانات :

(۱) سرسیّد احمد خان نے اس موضوع پر سب سے پہلے اپنے خیالات کا اظہار ایک

فارسی تحریر میں کیا جو کلکتے میں خان بہادر مولوی عبداللطیف صاحب کے مکان پر ۱۸۶۳ء میں پڑھ کر سنائی گئی ۔ یہ تحریر حسب ذیل ہے :

"۔ ۔ ۔ گویم کہ آن ہمہ علوم بزبانِ انگریزی اند و ہم کشورانِ ما را تا حال بر تحصیلِ آن زبان توجہی کما ینبغی نیست ، دیگر بارہ پرسم کہ چرا نیست ؟ آیا تعصبِ مذہبی را در آن مداخلت است ؟ گویم حاشا و کلا ، کسانیکہ ما را بچشمِ غرض ہمی می بینند و یا از حقیقت حالِ واقف نیند این گونہ سخنهای بی اصل سرائیدہ اند ۔ در آموختنِ زبانِ ہر قومی کہ باشد تعصبِ مذہبی را چہ مداخلت است ؟ ما مسلمان زبانِ فارسی را میخوانیم و آن زبانِ ما نیست و گاہی تعصبِ مذہبی را بآن نسبت نہ کردہ ایم ۔ پس در آموختنِ زبانِ انگریزی چرا تعصبِ مذہبی را گنجایش خواہد بود ۔ ۔ ۔ ۔"[1]

جب ۱۸۸۱ء میں ڈاکٹر لائٹنر وغیرہ کی طرف سے یہ تحریک ہوئی کہ لاہور میں ایک اورینٹل یونیورسٹی قائم کی جائے (دیکھیے اوپر) تو سر سید احمد خان نے اس کی مخالفت میں اپنے اخبار 'تہذیب الاخلاق' میں متواتر تین مضمون لکھے ۔ انہوں نے السنۂ شرقیہ کی اس مجوزہ یونیورسٹی کو ایک ایسا جال بتایا ، جس میں مسلمانوں کو پھانسا جا رہا تھا ۔ چنانچہ ایک مضمون میں وہ فورٹ ولیم کالج ، دہلی کالج اور سائنٹفک ریسرچز سوسائٹی کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم اور ایک تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مقصد سے ؟ اس کا جواب کسی ہی پیرایے اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے ، اس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لئے ۔ ۔ ۔ معمولی عہدے بھی ، جیسے وکالت و منصفی ، سب ججی ہی بغیر انگریزی علوم اور انگریزی زبان کی کافی لیاقت کے ہمیں میسر نہیں آ سکتے ، پھر کیا مردہ مشرقی علوم کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کی ترقی سے

(۱) "علی گڑھ تحریک" مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۸۶۰ء ، ص ۳۶۳ ۔

ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے ؟ یونیورسٹی کالج لاہور ، جواب پوری
یونیورسٹی ہونے والا ہے ، بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے
روکے ، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے ، ہم کو اس لائق نہ ہونے
دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں ، ہمارے حق میں اور کیا کر
سکتا ہے ؟ . . . کیا ہمارے مردہ مشرقی علوم کا زندہ ہو جانا اور
مشرقی زبانوں کا ترقی دینا ، ہماری پرانی شایستگی کو پھر قائم کرنا ،
ہم کو اس قابل بنائے گا ؟ ہرگز نہیں - پس ہم کو مشرقی علوم کو
زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صاف
ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات
کرنے سے روکا جائے - جو لوگ کہ دور اندیش ہیں وہ کبھی ایسی
پالیسی کو پسند نہ کریں گے اور اس میں ہندوستان کی فلاح نہ
تصور کریں گے -''[1]

اسی طرح بنگال کے رہنما راجہ رام موہن رائے نے پنڈتوں کے زیرِ نگرانی ایک ہندو کالج قائم کرنے کے منصوبے کی مخالفت کرتے ہوئے اس زمانے کے گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کے نام ایک زور دار خط لکھا جو کلکتے کے لارڈ بشپ آر - ہیبر (Heber) کی وساطت سے بھیجا گیا - اس میں وہ کہتے ہیں کہ :

''اس درسگاہ کا (جو ایسی ہی ہوگی جیسی کہ یورپ میں لارڈ بیکن
کے زمانے سے پہلے تھیں) نتیجہ محض یہ ہوگا کہ نوجوانوں کے
ذہنوں کو صرف و نحو کی باریکیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں میں
الجھا دیا جائے ، جو نہ تو خود ان کے لئے اور نہ معاشرے ہی کے لئے
سود مند ہو سکتی ہیں - اس کالج میں طلاب وہ چیزیں سیکھیں گے
جو اب سے دو ہزار سال پہلے بھی معلوم تھیں اور ان کے ساتھ بعض
ایسی باریک باتیں بھی جن کا بعد ازاں فلسفیانہ ذوق کے بعض لوگوں
نے اضافہ کر دیا ہے اور جو آج کل بھی عام طور پر ہندوستان کے
مختلف حصوں میں پڑھائی جاتی ہیں . . . ایسی موہوم تعلیم ، جس کی

---

(۱) علی گڑھ تحریک ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، ۱۹۶۰ ، ص ۳۶۳ -

خصوصیات میں نے اوپر بیان کی ہیں ، کے بیکار ہونے کا اندازہ آپ اس وقت بخوبی کر سکیں گے جب آپ علم و ادب کی اس حالت کا ، جو یورپ میں لارڈ بیکن کے زمانے سے پہلے تھی ، اس علمی ترقی سے مقابلہ کریں جو اس کے بعد کے زمانے میں ہوئی ۔ اگر یہ مقصد ہوتا کہ برطانوی قوم کو حقیقی علم و معرفت سے بیگانہ رکھا جائے تو بیکن کے فلسفے کو قدیم معلّمین کے اس نظام تعلیم کی جگہ رائج نہ کیا جاتا جو بطریقِ احسن جہالت کو دائمی بنا سکتا تھا ۔ اسی طرح سنسکرتی نظامِ تعلیم بھی ، اگر حکومت یہی چاہتی ہے ، اس ملک کو ہمیشہ جہالت کی تاریکی میں رکھنے کا بہترین ذریعہ ہوگا ۔ لیکن چونکہ حکومت کی خواہش ہے کہ اس ملک کے باشندوں کی حالت بہتر بنائی جائے ، تو اسے چاہیے کہ وہ ایک زیادہ وسیع مشرب اور روشن خیال نظامِ تعلیم رائج کرے جس میں ریاضیات ، نیچرل سائنس ، فلسفہ ، کیمسٹری ، علم الابدان اور دیگر مفید علوم شامل ہوں ، جس کے لئے اس روپے کو استعمال کیا جا سکتا ہے جو اس کام کے لئے رکھا گیا ہے اور ایک ایسا کالج قائم کیا جا سکتا ہے جس میں چند لائق اساتذہ کو ، جنھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی ، پڑھانے پر مامور کیا جا سکتا ہے ۔''[1]

(د) زمانۂ زیرِ بحث میں فارسی متون کی تصحیح و تنقید کا جو کام برِّ صغیر کی یونیورسٹیوں میں ہوا ، اس کا ذکر مجملاً اوپر کیا جا چکا ہے ۔ اس سلسلے میں حضرت امیر خسرو دہلوی کی تصنیفات کی تدوین و اشاعت کے اس منصوبے کا ذکر ضروری ہے جو نواب اسحاق خان صاحب کی تحریک سے علی گڑھ یونیورسٹی میں بنایا گیا تھا ۔ نواب صاحب کی کاوش و جستجو سے ان تصنیفات کے مخطوطے مختلف کتب خانوں سے حاصل کئے گئے اور ۱۹۱۷ء میں سابق نظامِ حیدر آباد دکن میر عثمان علی خان کی سرپرستی میں ان کی طبع و اشاعت کا کام شروع ہوگیا ۔ تنقید و تحقیق کا کام اس زمانے کے کئی قابل علماء کے سپرد کیا گیا اور علی گڑھ انسٹیٹوٹ پریس میں طباعت کا انتظام ہوا ۔ اشاعت کا یہ سلسلہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۷ء تک جاری رہا اور مندرجۂ ذیل کتابیں شائع کی گئیں :

(۱) مثنوی 'آئینۂ سکندری' ، مرتّبہ مولانا محمد سعید احمد فاروقی ، ۱۹۱۷ء

---

(۱) ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپلز ، ج ۱۰ ، ص ۳۴ - ۳۵ ۔

(۲) 'مثنوی 'دول رانی و خضرخان' (یا عشقیہ) ، مرتّبہ رشید احمد سالم ، ۱۹۱۷ء

(۳) مثنوی 'مجنوں و لیلیٰ' ، مرتّبہ محمد حبیب الرحمان خان شروانی ، ۱۹۱۷ء

(۴) 'ہشت بہشت' ، مرتّبہ سید سلیمان اشرف ، ۱۹۱۸ء

(۵) 'جواہرِ خسروی' ، مرتّبہ رشید احمد سالم ، ۱۹۱۸ء

(۶) 'قران السعدین' ، مرتّبہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی ، ۱۹۱۸ء

(۷) 'مطلع الانوار' ، مرتّبہ مولوی محمد مقتدیٰ خان شروانی ، ۱۹۲۶ء

(۸) مثنوی 'شیریں و خسرو' ، مرتّبہ حاجی علی احمد خان اسیر ، ۱۹۲۷ء

۱۹۲۷ء کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور خسرو کی کئی اور تصانیف بالخصوص ان کے پانچوں دیوان غیر مطبوعہ رہ گئے ، البتہ 'دیوان وسط الحیواۃ' کی طباعت شروع ہوئی اور اس کا پہلا حصہ بھی طبع ہو گیا - ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند و پاکستان کے ہنگامے میں پورا شائع نہ ہو سکا اور طبع شدہ ذخیرہ ضائع ہوگیا - تاہم ۱۹۳۳ء میں سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم نے مجلس مخطوطاتِ فارسیہ ، حیدر آباد دکن کے زیرِ اہتمام خسرو کی ایک اور تاریخی مثنوی 'تغلق نامہ' کا متن مع ایک فاضلانہ تمہید و مقدمہ کے شائع کیا جو مطبع اردو اورنگ آباد میں طبع ہوا - علاوہ ان منظوم تصنیفات کے علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر معین الحق نے خسرو کی منثور تصنیف 'تاریخِ علائی' یا 'خزائن الفتوح' کا متن شائع کیا اور پروفیسر محمد حبیب نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا -

آخر میں بے انصافی ہو گی اگر برِّصغیر کے بعض مطابع ، خصوصاً مطبعِ نولکشور (بنا کردہ منشی نول کشور بھارگوا ، کانپور و لکھنؤ) کی ان مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف نہ کیا جائے جو انھوں نے فارسی کتابوں کی طباعت کے لئے کیں - ان مساعی کی بدولت فارسی نظم و نثر کے بہت سے شاہکار ہمیشہ کے لئے ناپید ہو جانے سے بچ گئے اور ان کی شہرت و مقبولیت میں بہت اضافہ ہوگیا - ان کتابوں کی طباعت کا انتظام زیادہ تر قابل علماء کی زیرِ نگرانی کیا گیا جنھوں نے قارئین کی سہولت کے لئے اُن کے متن سے متعلق مفید حواشی بھی لکھے ہیں -

☆ ☆ ☆

کتابیات

(۱) ایشوری پرشاد : 'تاریخ ہند'، الہ آباد ۱۹۴۰ء -

(۲) History and Culture of the Indian Peoples, Vol·X (British Paramountcy, Part I), Bombay·

(۳) Medieval India : Lane Poole·

(۴) ڈاکٹر محمد یاسین : A Social History of Islamic India ، لکھنؤ ۱۹۵۸ء -

(۵) ڈاکٹر محمد عتیق صدیقی : 'گلکرسٹ اور اس کا عہد'، علی گڑھ ۱۹۶۰ء -

(۶) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ : ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور فارسی'' مقالہ ، اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۱۹۳۱ء -

(۷) جادو ناتھ سرکار : Aurangzeb Alamgir

(۸) Soldiering in India 1764—1784·

(۹) Warren Hastings in Bengal : M· Jones

(۱۰) ڈاکٹر غلام حسین : تاریخ اورینٹل کالج -

(۱۱) History of India : Elliot and Dowson
مختلف جلدیں ، بالخصوص جلد ہشتم ؛ لنڈن ۱۸۷۷ء -

(۱۲) Catalogue of Persian Manuscripts in British Museum : Rieu

(۱۳) Catalogue of Persian Manuscripts in the India office Library · Ethe

(۱۴) نسیم قریشی : ''علی گڑھ تحریک''، علی گڑھ ۱۹۶۰ء -

(۱۵) جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال -

دوسرا باب

شعراء (فصلِ اول)

شاعرِ مشرق علامہ اقبال

وہ شاعرِ کبیر جس نے اپنے پُرتاثیر اور حسین و جمیل کلام سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنایا اور اپنے حیات بخش افکار سے مشرق میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی، جس کے اشعار میں ایک طرف ملتِ بیضا کا سارا فکری اثاثہ موجود ہے اور دوسری طرف اہلِ مغرب کے افکار کا تجزیہ بھی بصیرت افروز انداز میں نظر آتا ہے، بجا طور پر اسلامی ہند کے لئے سرمایہ فخر و مباہات ہے۔ اس کا کلام آزمایش کی ہر گھڑی میں ہمارے دلوں کو امید و آرزو سے معمور کرتا ہے اور بُحران کی ہر ساعت کے دوران ایک نئے ولولے کے ساتھ ہمیں حوادث کے مقابلے میں سینہ سپر کر دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اسلامیانِ ہند مایوسی کے دور سے گذر رہے تھے۔ اپنی اپنی جگہ سرسیّد، حالی، شبلی اور دوسرے اکابر نے ان کے زوال کو عروج میں مبدّل کرنے کے لئے قابلِ تحسین مساعی انجام دیں لیکن اپنے حکیمانہ افکار سے جس عالی قدر شاعر نے مردہ قوم کو زندہ کرنے کا عظیم کارنامہ کر دکھایا وہ یہی شاعرِ مشرق علامہ اقبال ہیں۔ اِس فصل میں ہم ان کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی فارسی شاعری اور ان کے افکار سے خوانندگانِ عزیز کو متعارف کراتے ہیں۔

حالاتِ زندگی

صدیوں سے جموں اور کشمیر کے لوگ معاشی حالات کے تقاضوں سے یا حکومتِ وقت کے ظلم و تشدّد سے تنگ آ کر ہندوستان کی طرف ہجرت اختیار کرتے رہے ہیں۔ ان تارکانِ وطن کا دستور تھا کہ ان کا پہلا قیام سیالکوٹ ہی میں ہوتا تھا۔ بعد میں اکثر

لوگ تو پاک و ہند کے دوسرے شہروں میں چلے جاتے تھے مگر بعض خاندان یہاں ہی کے ہو جاتے تھے - چنانچہ علامہ اقبال کا خاندان بھی ان خاندانوں میں سے تھا جنہوں نے جموں و کشمیر سے نکل کر سیالکوٹ ہی میں سکونت اختیار کر لی - اقبال اس شہر میں ۳ ذی القعد ۱۲۹۴ ہجری (مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء) کو پیدا ہوئے -

علامہ اقبال کے آبا و اجداد میں سے ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے پردادا شیخ جمال الدین تھے ، یا ان کے چار بیٹے جن کے نام شیخ عبدالرحمٰن ، شیخ محمد رمضان ، شیخ محمد رفیق اور شیخ محمد عبداللہ تھے - یہ بھی ممکن ہے کہ شیخ جمال الدین نے اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر ترکِ وطن کیا ہو - بہر حال یہ ثابت ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ یا اس کے قرب و جوار میں سکونت پذیر تھے - ان میں سے اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق اور ان کے دو بھائی شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ محمد رمضان تو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور تیسرے بھائی شیخ عبداللہ موضع جیٹھی کے میں - ان چاروں بھائیوں کی اولاد آج بھی شہر سیالکوٹ اور موضع جیٹھی کے میں آباد ہے -

اقبال کے دادا کی پہلی شادی شہر سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی تھی - اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ان کی وفات کے بعد ان کی دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی - اس خاتون سے شیخ محمد رفیق کے پہلے دس لڑکے ہوئے جو سب کے سب ایامِ طفلی میں ہی فوت ہو گئے - اقبال کے والد شیخ نور محمد شیخ محمد رفیق کی گیارہویں اولاد تھے - علامہ کے والد کی پیدائش کے بعد ایک اور لڑکا پیدا ہؤا جس کا نام غلام محمد تھا اور یہ محکمہ نہر میں اورسیئر ہو گئے تھے اور روپڑ ضلع انبالہ میں متعیّن تھے - شیخ محمد رفیق اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے روپڑ گئے - وہاں ان کو ہیضہ ہؤا اور اس مرض سے اللہ کو پیارے ہو گئے اور روپڑ میں ہی دفن ہوئے - شیخ غلام محمد نے کوئی نرینہ اولاد نہ چھوڑی - وفات کے وقت ان کی دو لڑکیاں حیات تھیں ، جن کی اولاد شہر سیالکوٹ میں آج تک آباد ہے - شیخ نور محمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں وہ خاصے جوان تھے[1] - علامہ صاحب کے والد نے

---

(۱) حسبِ بیان جناب شیخ اعجاز احمد صاحب -

طویل عمر پائی ۔ قمری حساب سے ان کی عمر ۹۶ سال اور شمسی حساب سے ۹۳ سال کی ہوئی[1] ۔

شیخ نور محمد صاحب کے تین لڑکے ہوئے جن میں سے ایک لڑکا ایامِ طفولیت میں ہی انتقال کر گیا اور دو صاحب زادوں نے کافی عمر پائی ۔ ان میں سے بڑے بھائی شیخ عطاء محمد نے ۸۳ سال کی عمر پائی اور چھوٹے لڑکے شہرۂ آفاق حکیم الامت علامہ اقبال تھے ۔ نور محمد کی ان لڑکوں کے علاوہ چار بیٹیاں بھی تھیں ۔

علامہ کے والد بزرگوار کو سب لوگ ''میاں جی'' کہتے تھے ۔ نہایت وجیہہ صورت اور بلند قامت تھے ۔ ان کا چہرہ نورانی تھا ۔ ''میاں جی'' نے کسی مدرسہ یا مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں وہ صرف حروف شناس تھے ، مگر اپنی ذہانت کی وجہ سے اردو اور فارسی کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھ سکتے تھے ۔ علامہ کی جو تصانیف ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں وہ اکثر ان کے زیرِ مطالعہ رہا کرتی تھیں ۔

شیخ نور محمد صاحب کی شادی موضع سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی ۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ان کے سسرال والے بھی سیالکوٹ میں ہی آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے ۔

ان کی بیوی کو سب لوگ ''بے جی'' کہتے تھے ۔ ''بے جی'' لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتی تھیں ، ان کو صرف نماز آتی تھی ، بے جی ذہین اور منتظم خاتون تھیں اور محلہ کی تمام خواتین اپنے معاملات میں ان سے صلاح اور مشورے لیتی رہتی تھیں ۔

تحصیل و اکتساب

علامہ کے بچپن میں سیالکوٹ میں اسلامی مراکزِ درس و تدریس چار تھے :

۱۔ مولوی غلام مرتضیٰ کا مکتب ۔

۲۔ مولانا ابو عبداللہ غلام حسن کی درس گاہ ۔

---

(۱) وحید الدین ، ص ۱۱۶ ۔

۳- مولانا سید میر حسن کا درس -

۴- مولوی مزمل کا درس -

پہلی ، دوسری اور چوتھی درس گاہوں میں صرف عربی اور دینیات کی تعلیم کا انتظام تھا - مولانا میر حسن عربی اور فارسی ادب کا درس دیتے تھے - علامہ کے والد محترم اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں معارف دین کی سماعت کے لئے جایا کرتے تھے - اس تعلق کی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم کے لئے مولانا غلام حسن کی درس گاہ میں بھیجنا شروع کر دیا - مولانا سید میر حسن شاہ بھی اکثر مولانا غلام حسن کے یہاں جایا کرتے تھے - ایک دن وہ تشریف لے گئے تو تدریس کے سلسلے میں اقبال بھی وہاں موجود تھے - مولانا میر حسن اقبال کی ذہانت اور فطانت سے متاثر ہوئے اور پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے - مولانا غلام حسن نے بتایا کہ یہ شیخ نور محمد صاحب کا بیٹا ہے - جب مولانا میر حسن کی شیخ نور محمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان سے فرمایا کہ اس لڑکے کو میرے پاس لاؤ ، اس کو میں پڑھاؤں گا - اس طرح سے اس تعلق کی ابتدا ہوئی جو مولانا میر حسن کے انتقال تک قائم رہا - کچھ عرصہ بعد مولانا میر حسن صاحب نے اقبال کو اسکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں داخل کرا دیا اور اب اقبال مولانا میر حسن کے یہاں تعلیم کے سوا اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں بھی تعلیم پاتے رہے - ان کے علاوہ اقبال کبھی کبھی دینیات کے درس کے سلسلے میں مولانا غلام حسن کے یہاں بھی چلے جاتے تھے - الغرض اس پُر سکون اور علمی ماحول میں اقبال کی تعلیم کے ابدائی دور کٹے اور انہوں نے ۱۸۹۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کا مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا - پھر ۱۸۹۲ء میں انٹرنس کا امتحان اعزاز کے ساتھ فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا - اس امتحان میں ان کا اختیاری مضمون عربی تھا - اب اسکاچ مشن ہائی اسکول کالج بن گیا تھا اور اقبال نے اس کالج میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم شروع کر دی اور ۱۸۹۵ء میں یہاں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا -

بی - اے کی تعلیم کے لئے اقبال کو لاہور جانا پڑا - لاہور میں انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا - بی - اے میں انگریزی ادب ، عربی اور فلسفہ ان کے مضامین تھے - پہلے سال تو اقبال اپنے خاندان کے دوست ، شیخ گلاب دین ایڈووکیٹ کے یہاں رہے ، مگر بعد

میں وہ گورنمنٹ کالج ہاسٹل میں منتقل ہو گئے۔ ۱۸۹۷ء میں اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ زاں بعد ایم۔ اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ فلسفہ میں صرف یہی طالب علم تھے جس نے اس سال ایم۔ اے پاس کیا۔

اب اقبال کی تعلیم کا ابتدائی دور ختم ہو گیا تھا اور اس کے بعد ان کا اورینٹل کالج لاہور میں بطور میکلوڈ ریڈر تقرر ہو گیا۔ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۳ء تک اقبال مختلف تعلیمی کام کرتے رہے، حتیٰ کہ ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کی نائب پروفیسری پر فائز ہو گئے۔

لاہور کے قیام کے دوران جب اقبال ایم۔ اے کے طالب علم تھے تو ان کا تعلق مشہور عالم فلسفہ اور لسانیات سر ٹامس آرنلڈ سے قائم ہو گیا۔ سر ٹامس آرنلڈ نے اقبال کی ذہانت اور استعداد کو دیکھ کر ان کی ذہنی نشو و نما میں دلچسپی لی۔ جب آرنلڈ ۱۹۰۴ء میں انگلستان روانہ ہوئے تو ان کے مشورے سے اقبال بھی تھوڑے عرصہ کے بعد تین سال کی رخصت لے کر تحصیل علم کی خاطر یورپ چلے گئے۔ یورپ پہنچ کر انہوں نے کیمبرج میں تو بی۔ اے میں داخلہ لے لیا اور میونک یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی میں شامل ہو گئے۔ ساتھ ہی آپ نے لندن کی ''لنکس ان[1]'' میں قانون کے مطالعے کے لئے بھی داخلہ لے لیا۔ ان تینوں دانش کدوں میں اقبال نے دو سال کی قلیل مدت میں اپنا مطالعہ بڑی کامیابی کے ساتھ ختم کیا۔ جون ۱۹۰۷ء میں کیمبرج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اکتوبر ۱۹۰۷ء میں میونک سے پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ آپ نے ''ایران میں فلسفہ الٰہیات کی نشو و نما'' پر مقالہ لکھا تھا۔ ''لنکنس ان'' لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی آپ نے اپریل ۱۹۰۷ء میں پاس کر لیا تھا۔ اقبال اکتوبر ۱۹۰۷ء ہی میں اپنی مجوّزہ تعلیم کامیابی کے ساتھ ختم کر چکے تھے، مگر چونکہ ''لنکنس ان'' میں رہائش کی قید تھی ان کو چند ماہ اور یورپ میں قیام کرنا پڑا۔ اس عرصے میں سر ٹامس آرنلڈ کی جگہ جو اس وقت لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے قائم مقام پروفیسری پر بھی کام کیا۔ ایک نوجوان کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ الغرض نہایت کامیابی کے ساتھ اقبال ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے اور لاہور پہنچ کر انہوں نے طے کیا کہ قانون کے پیشہ ہی پر اپنی سعی

---

(۱) Lincoln's Inn -

اور توجہ مرکوز کریں ۔

اقبال کے مطالعات

جہاں تک مطالعات کا تعلق ہے اقبال کی طبیعت ہمہ گیر تھی اور علم کے ہر شعبہ سے ان کو گہری دل چسپی تھی ۔ بی ۔ اے میں ان کو انگریزی ادب اور عربی میں اول آنے پر تمغہ جات ملے تھے ۔ علم المعیشت پر اقبال نے اردو میں پہلی کتاب لکھی ۔ اوریئنٹل کالج میں انہوں نے تاریخ بھی پڑھائی ۔ مگر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ علامہ اقبال کو فلسفے سے گہری دلچسپی تھی ۔ اسی لئے ایم ۔ اے پاس کرنے کے بعد اوریئنٹل کالج میں کچھ مدت تک کام کر کے آپ نے گورنمنٹ کالج میں فلسفے کی نائب پروفیسری قبول کر لی ۔ جب یورپ تشریف لے گئے تو کیمرج میں شعبۂ فلسفہ میں ہی داخلہ لیا اور اس میں بی ۔ اے کی ڈگری لی ۔ ویسے اقبال عمر بھر طالب علم رہے ۔ ذاتی کتب خانہ زیادہ بڑا نہ تھا ۔ اکثر کتابیں یونیورسٹی لائبریری اور پبلک لائبریری لاہور سے عاریتاً منگوا لیا کرتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق کتابیں خریدتے بھی رہتے تھے ۔

زمان اور مکان کے مسئلے سے اقبال کو ہمیشہ سے بے حد دلچسپی تھی ۔ آخر زمانے میں نظریۂ اضافیت میں دلچسپی ہو گئی تھی اور اس نظریہ کے متعلق بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا ۔

انگریزی ، عربی ، فارسی اور اردو کے شعراء کے کلام کا مطالعہ وسیع تھا ۔ ان کے محبوب شعراء میں انگریزی زبان میں ورڈز ورتھ تھا ۔ فارسی میں بیدل ، غالب اور رومی تھے اور اردو کے شعراء میں غالب ، میر اور امیر مینائی کے کلام سے دلچسپی رکھتے تھے ۔

شخصیت

علامہ ایک دلآویز شخصیت کے حامل تھے ۔ رنگ صاف ، بدن گھٹا ہوا ، قد میانہ ، طرزِ گفتگو دل آویز ۔ ان سب چیزوں کا اثر ہر ملنے والے پر ہوتا تھا کم عمری سے ہی علامہ کو کسرت کا شوق تھا ۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں کبھی اکھاڑے میں کشتی بھی لڑا کرتے تھے اور صبح مگدر بھی ہلاتے تھے ۔ بچپن میں وہ ذہانت اور فطانت میں دوسرے ہم سبق بچوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے ۔ ان کی آواز سریلی تھی اور جب اشعار ترنم سے پڑھتے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا ۔

اقبال ایک بڑے مفکر اور ایک جدید عالم ہی نہ تھے بلکہ ساتھ ساتھ قلندر صفت انسان بھی تھے - جن کی تمام عمر فقیرانہ طریقے پر بسر ہوئی - طبیعت میں انکسار تھا ، تواضع حد سے زیادہ تھی - الغرض وہ ایک خود دار فقیر ، پکے مومن اور سچے عاشقِ رسول ؐ تھے -

اقبال ہر شخص سے اس کی قابلیت کے مطابق باتیں کرتے تھے اور کسی ملاقاتی کو احساسِ کمتری نہ ہونے دیتے تھے -

ذہنی اور فنی ارتقاء کے مراحل

فکرِ اقبال کا مرکزی خیال ہمیشہ ارتفاعِ انسانیت اور معراجِ آدمیت تھا - اسی وجہ سے ان کی توجہ تخلیقِ مردِ کامل کی طرف مبذول ہوئی - تخلیقِ مردِ کامل کی خاطر اثباتِ خودی ، تربیتِ خودی اور تکمیلِ خودی پر اقبال نے غور و خوض کیا تو ان کے خیال میں آیا کہ تکمیلِ خودی کا ثمرہ ہی مردِ کامل تھا - فکرِ اقبال کا اساسی تصور فلسفۂ خودی ہے - تربیتِ خودی اور تخلیقِ مردِ کامل کی سرگذشت ہی اقبال کے ذہنی ارتقا کی داستان ہے - جب اقبال نے اپنے لوگوں کی پسماندہ حالت پر غور کیا تو مردِ کامل کی تخلیق ہی میں ملتِ اسلامیہ اور بنی نوعِ انسان کی جملہ مشکلات سے نجات کا راستہ نظر آیا - اس زمانے میں جرمن فلسفیوں کی تصنیفات میں خودی یا ''ایگو'' کی بابت حو بڑھا تو خیال آیا کہ مردِ کامل کی تخلیق کا انحصار انسانی خودی کی تربیت کے تابع تھا - جب اقبال کی مثنوی 'اسرار خودی' کا پروفیسر نکلسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا تو اس وقت مغرب میں نطشے کے فوق البشر کا بہت چرچا تھا - لہٰذا اکثر مغربی فضلاء نے خیال کیا کہ اقبال نے مردِ کامل کا تصور اس مغربی مفکر سے ہی لیا ہوگا -

آخرکار ان بحثوں سے تنگ آ کر اقبال نے پروفیسر نکلسن کو ایک خط میں لکھا کہ ان کا تصورِ مردِ کامل مسلمان صوفیاء کرام کے کلام اور تعلیمات سے ماخوذ تھا - اسی خط میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جس وقت انہوں نے مردِ کامل پر لکھنا شروع کیا اس وقت وہ نطشے کے نام سے بھی آشنا نہ تھے - اس سلسلہ میں اقبال نے اپنے اس مضمون کا ذکر بھی کیا جو انہوں نے ۱۹۰۰ء میں عبدالکریم جیلی پر لکھا تھا - مگر ابھی تک نہ تو مردِ کامل کے خط و خال اقبال کے دماغ میں واضح طور پر متشکل ہوئے تھے اور نہ اس کی تخلیق کے لئے کسی صحیح دستورالعمل یا ضابطہ نے کوئی صورت اختیار

کی تھی -

اقبال ۱۹۰۵ء میں حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گئے - یہاں انہوں نے نطشے کا مطالعہ کیا - کچھ عرصے بعد ۱۹۰۸ء میں نطشے کی تصنیفات کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا اور انہوں نے بامعانِ نظر ان تصنیفات کا مطالعہ کیا - اس سلسلے میں اقبال کے دماغ پر نطشے کے تصور فوق البشر کا بھی اثر ہؤا - اس اثر کی شہادت 'اسرارِ خودی' کے صفحات میں ملتی ہے - شروع سے اقبال کو نطشے کے تصورِ فوق البشر سے اساسی اختلاف تھا مگر بعض امور میں اتفاق بھی تھا مثلاً قوت کی اہمیت اور اس کے اعتراف کا سوال -

جہاں اقبال کے دماغ میں خدمتِ خلق کا خیال ابھر رہا تھا وہاں مسلمانوں کی خصوصاً اور اقوامِ مشرق کی عموماً زبوں حالی کا بھی ان کے دماغ پر گہرا اثر تھا - یہ اثر تو شروع سے تھا مگر یورپ کے قیام کے دوران بہت واضح ہو گیا - کچھ تو شروع ہی سے اور کچھ یورپ کے قیام کے دوران جرمن فلسفیوں کی تصانیف کے زیرِ مطالعہ رہنے سے خصوصاً نطشے کی ، انسانی نفسیات میں "ایگو" (Ego) کی اہمیت واضح ہوئی - اقبال سے پہلے جرمن قوم کی ترقی میں "ایگو" کی اہمیت کی ایک دھندلی سی جھلک فشٹے کے دماغ پر اثر انداز ہوئی تھی مگر فشٹے کو نہ تو کبھی "ایگو" کے تصور کی پوری اہمیت کا احساس ہؤا اور نہ کبھی اس نے استحکامِ "ایگو" اور تربیتِ "ایگو" کے متعلق کوئی دستور العمل مرتب کیا - گو یہ ممکن ہے کہ اقبال نے نطشے اور عبدالکریم جیلی سے کچھ اثر قبول کیا ہو مگر خودی کا استحکام اور تربیت کا تصور اقبال نے اسلامی تعلیمات سے ہی لیا اور اس کی وضاحت کے لئے ان کو مثنوی مولانا روم اور دیگر صوفیاءِ کرام کی تصانیف سے بہت مدد ملی -

یہ تو تھا اقبال کے نظریۂ خودی کے ارتقاء کا ذکر - مگر اس نظریہ کی تشریح سے پہلے بہت سی باتیں جو استحکامِ خودی کے خلاف تھیں ان کا اظہار ضروری تھا - اس طرح اقبال کو تصوّف کے متعلق بھی اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کرنے پڑے - اس کا مطلب یہ تھا کہ وحدت الوجود کے نظریہ پر تنقید کرنی پڑی - اس پر ایک طوفان برپا ہو گیا ، اقبال نے ناقدین کو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی ، مگر صدیوں کی غلط تعلیم کو چند مضامین سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا - یہاں اس طوفان کے تفصیلی تذکرہ کی تو گنجائش نہیں ہے مگر ناقدین میں پیش پیش خواجہ حسن نظامی اور جناب اکبر الہ آبادی تھے اور

اقبال کے ہم خیالوں میں مولانا اسلم جیراج پوری ، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور مولانا سلیمان پھلواری تھے - اقبال نے اپنے ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھا تھا - "میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کون سا تصوف میرے نزدیک قابل اعتراض ہے ، میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے - مجھ سے پہلے حضرت علاء الدین سمنانی یہی بات لکھ چکے ہیں - حضرت جنید بغدادی لکھ چکے ہیں ، میں نے شیخ محی الدین ابن عربی اور منصور حلاج کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سنجانی اور جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ان بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں - ہاں میں نے ان کے عقائد اور خیالات سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے -"[1]

تصوف کے علاوہ جہاں تک فقہ اسلامی کا تعلق ہے اقبال نے اجتہاد کے متعلق بھی اپنے خیالات تفصیل سے ظاہر کئے ہیں -

اقبال کو زمان اور مکان کے نظریے سے ہمیشہ دل چسپی رہی - اقبال نے مسئلۂ زمان کو انسانوں کے لئے موت اور حیات کا سوال قرار دیا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زمان کو ماہیت وجود اور عین خودی سمجھتے تھے - لیکن یہ زمان شب و روز کا زمان نہیں ، بلکہ تخلیقی ارتقاء کا دوسرا نام ہے - آخر میں علامہ کا نظریۂ زمان وہی تھا جو برگسان کا ، مگر اس نظریے تک اقبال کیسے پہنچے ، اس کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے - خلیفہ عبدالحکیم بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے بعض احباب سے بیان کیا تھا کہ "برگسان کا مطالعہ کرنے سے قبل ہی میں حقیقت زمان کے متعلق آزادانہ طور پر ہی تصور قائم کر چکا تھا اور انگلستان میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں میں نے اس پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا ، جس کو میرے پروفیسر نے کچھ قابل اعتنا نہ سمجھا کیونکہ بات بہت انوکھی تھی" - مسئلۂ زمان اور مکان کے متعلق اقبال کا ذہنی ارتقاء بہت دل چسپ ہے اور گو آخر میں ان کے نظریہ اور برگسان کے نظریہ میں بڑی حد تک مماثلت تھی مگر اقبال کو اس میں اولیت کا طرۂ امتیاز حاصل تھا -[1]

ہم نے تصوف کے متعلق اقبال کے خیالات میں تبدیلی کا ذکر اوپر کر دیا ہے - اس تبدیلی کے ساتھ اقبال کے تصور باری تعالیٰ میں بھی تبدیلی رونما ہوئی اور تصور کائنات بھی بدلا اور یہ تصورات ہی ان کے فلسفۂ جد و جہد اور سعیٔ لامتناہی کی اساس بنے -

---

(۱) شرح اسرار خودی از پروفیسر سلم چشتی ، ص ۳۵ -

تصوّرِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں اقبال کو خیر و شر کے مسئلے میں بھی دل چسپی پیدا ہو گئی -

اقبال کے فنی ارتقاء کی سرگزشت بھی بہت دلچسپ ہے - اقبال نے شاعری بچپن ہی میں شروع کر دی تھی - ایک بار انہوں نے اپنا کلام مولانا میر حسن کو سنایا تو مولانا نے کلام کو پسند کیا اور اقبال کی ہمت افزائی کی - جہاں تک اُردو شاعری کا تعلق ہے اقبال نے سیالکوٹ ہی کے قیام کے دوران داغ کی شاگردی اختیار کر لی تھی - سیالکوٹ میں اقبال اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے - جب اقبال لاہور تشریف لے گئے تو یہاں کی فضاء شعر و شاعری کے لئے بہت سازگار تھی - اس فضا میں اقبال کے ملّی رجحانات قائم ہو گئے - یہاں اقبال مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے اور غزلیں اور نظمیں اخبارات اور رسائل میں اشاعت کی غرض سے بھیجتے تھے -

۱۹۰۵ء میں اقبال بغرضِ تعلیم یورپ گئے - وہاں انہوں نے بہت کم نظمیں اور غزلیں لکھیں ، مگر جو نظمیں لکھیں ان میں انہوں نے نظریۂ قومیت سے نفرت اور علاقائی عصبیت کے خلاف احتجاج کا اظہار کیا - یورپ سے واپسی پر اقبال نے بعض بہت عمدہ نظمیں لکھیں مگر یہ سب اُردو میں ہی تھیں - ۱۹۱۲ء میں اقبال نے عطیہ بیگم کو خط میں لکھا کہ انہوں نے اپنے والد کے ارشاد کے مطابق ایک مثنوی فارسی میں شروع کی ہے ، حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کی مثنوی کی طرز پر - اس عرصے میں قوم کی زبوں حالی کے پس منظر میں نظریۂ خودی نے ان کے دماغ میں ایک واضح صورت اختیار کر لی - پہلی نظم جو فارسی میں ان کے قلم سے نکلی وہ 'اسرارِ خودی' تھی - دوسری نظم مثنوی 'رموزِ بیخودی' تھی - ان دو مثنویوں کے بعد 'پیامِ مشرق' شائع ہوئی جو مجموعہ تھا جملہ اصنافِ سخن کا - اس میں رباعیات ، غزلیں ، قطعات وغیرہ سب تھیں -

اب اقبال تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے اور فارسی زبان میں بھی ان کی مہارت اور سلاست اعلیٰ پایہ پر پہنچ گئی تھی - 'پیامِ مشرق' اور اس کے بعد کا زمانہ اقبال کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا -

فارسی تصانیف

۱- اسرارِ خودی

یہ پہلی مثنوی ہے جو اقبال نے فارسی میں لکھی - انہوں نے اس مثنوی کو

اُردو کی بجائے فارسی میں لکھنے کی وجہ یوں بیان کی ہے :

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است | طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت | خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام | در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

یہ مثنوی پہلی بار ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی - 'اسرارِ خودی' کی اشاعت سے چھ ماہ مہینے پہلے انجمن حمایت اسلام لاہور کا اجلاس ہوا تھا ، جس میں انہوں نے فرمایا تھا :

"میں نے اسرارِ خودی کے نام سے ایک مثنوی مرتّب کی ہے جس میں خودی کے متعلق حقائق واضح کئے ہیں - یہ مثنوی عنقریب شائع ہوگی اور اس سے عجمی تصوف کا وہ طلسم پاش پاش ہو جائے گا ، جس نے مسلمانوں کو توفیقِ عمل سے محروم کر کے جامد و منجمد بنا رکھا ہے ۔"[1]

مثنوی کے پہلے ایڈیشن میں ایک دیباچہ بھی تھا - اس میں اقبال نے تحریر فرمایا تھا : "یہ وحدتِ وجدانی کا باشعور روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں - یہ پُراسرار شئے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے - یہ خودی یا انا جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے ، جو تمام مشاہدات کی خالق مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی ، کیا چیز ہے ؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے عارضی طور پر فوری اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخئیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے - اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے - یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس کے جواب کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو - مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا ، جس قدر ان کی افتادِ طبیعت پر - مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر

---

(۱) رسالہ اقبال ، بابت اکتوبر ۱۹۵۶ء ، ص ۶۵ -

اس نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب ِ تخئیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے ۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق انہیں ایسے نتائج کی طرف لے گیا جن کے لئے ان کی فطرت متقاضی تھی ۔''

اقبال نے مثنوی میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ تین عنوانات کے تحت آ سکتا ہے :

(۱) اثباتِ خودی ۔ (۲) استحکامِ خودی ۔ (۳) تربیتِ خودی ۔

استحکامِ خودی کے متعلق اقبال نے ان عوامل کا ذکر کیا ہے جن سے انسان کی خودی کو استحکام ہوتا ہے ۔ سرِ فہرست تو عشق ہے ۔ اقبال نے لفظِ عشق بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ اور اس کا مطلب خواہشِ جذب و تسخیر ہے ۔ اس کی اعلیٰ ترین شکل یہ ہے کہ وہ مقاصد اور اقدار کی تخلیق کرتا ہے اور ان کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے ۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں کو منفرد کر دیتا ہے ۔

دوسرا عامل جو استحکامِ خودی میں موید ہوتا ہے وہ ہمت ہے ۔ بغیر ہمتِ جسمانی اور اخلاق کے انسان کے لئے اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی کارنامہ سر انجام دے ۔ مستحکم خودی ہر طریقے سے شر کا مقابلہ کرتی ہے :

عشق را آتش زنِ اندیشہ کن　　　روبہٗ حق باش و شیری پیشہ کن

تیسرا عمل رواداری ہے ۔ اسان کے خیالات اور اطوار کی رواداری قوت کا مظہر ہے ، لہٰذا رواداری کی ترغیب انسانی معاشرے کے لئے مفید ہے ۔ اقبال نے کہا ہے کہ خودی کی تکریم کا اصول یہ ہے کہ انسان اپنی خودی اور دوسرے کی خودی کا احترام کرے :

حرفِ بد را بر لب آوردن خطا است　　　کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست
آدمیت احترامِ آدمی　　　باخبر شو از مقامِ آدمی

جو عمل استحکامِ خودی میں مدد دیتا ہے وہ تخلیقی کارروائیوں میں حصہ لینا ہے ۔ تخلیقی کارروائیوں میں حصہ لینے سے خودی کا استحکام حاصل ہوتا ہے :

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست　　　پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

ان عوامل کے ساتھ جو استحکامِ خودی میں مدد دیتے ہیں بعض عوامل ایسے بھی ہیں جو خودی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ مثلاً خوف، سوال، غلامی، نسب پرستی۔ جو خودی استحکام کی خواہشمند ہو اس کو ان سے احتراز کرنا واجب ہے۔ الغرض ان عوامل پر عمل پیرا ہو کر جو استحکام میں موید ہوتے ہیں اور ان عوامل سے احتراز کرکے جو استحکام کے راستے میں حائل ہوتے ہیں انسانی خودی روز بروز قوت حاصل کرتی جاتی ہے۔ خودی کو بے مثل و یکتا ہونے کے لئے تین مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں:

(۱) اطاعتِ قانونِ الٰہی۔ (۲) ضبطِ نفس۔ (۳) نیابتِ الٰہیہ۔

نیابتِ الٰہی اس دنیا میں ارتقائے انسانی کی تیسری اور آخری منزل یعنی نائبِ حق خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ وہ کامل ترین خودی ہے جو بنی آدم کا نصب العین ہے۔ اس کامل انسان کے متعلق اقبال نے کہا ہے:

اے سوارِ اشہبِ دوران بیا　　　اے فروغِ دیدۂ امکان بیا
شورشِ اقوام را خاموش کن　　　نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
نوعِ انسان مزرع و تو حاصلی　　　کاروانِ زندگی را منزلی

'اسرارِ خودی' کی زبان نہایت پاکیزہ اور صحیح ہے۔ پروفیسر نکلسن جو جامعہ کیمبرج میں فارسی کے استاد تھے 'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے اکثر حصے اس قدر دلکش زبان میں لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کے لئے ان کو ایک بار پڑھ کر بھولنا ناممکن ہے۔

جب 'اسرارِ خودی' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ اس کے دو وجوہ تھے: ایک تو پڑھنے والوں کا خیال تھا کہ اقبال تصوف کے خلاف تھے۔ دوسرے اقبال نے خواجہ حافظ کے خلاف کچھ اشعار لکھے تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ اشعار حذف کر دیے گئے اور ان کے بجائے ایک نیا عنوان ''حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیات'' شامل کر دیا گیا۔ کتاب کے مفصّل دیباچے کے بجائے ایک مختصر سا دیباچہ شامل ہوا۔ اکثر ناقدین کا خیال تھا کہ اول ایڈیشن میں جو دیباچہ تھا وہ بہت مفید تھا اور اس کو حذف نہ کرنا چاہئے تھا۔

کتاب کے آخر میں ایک دعا ہے جس میں اقبال نے بارگاہِ رب العزت میں اپنی تنہائی کا ذکر کیا ہے اور ایک ہمدم و ہمراز کے لئے دعا مانگی ہے :

دل بدوش و دیدہ بر فرداستم — درمیانِ انجمن تنہاستم
در جہان یا رب ندیمِ من کجاست — نخلِ سینایم کلیمِ من کجاست
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے — از رموزِ فطرتِ من محرمے

۲۔ رموزِ بے خودی

اس مثنوی میں اقبال نے فرد و ملت کے تعلقات کے متعلق اپنا زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے ۔ اقبال کے نزدیک فرد کا جماعت میں گم ہو جانا خودی کو فنا کرنا نہیں بلکہ قطرہ کو قلزم بنانا ہے ۔ فرد کے مضمرات اور ممکنات جماعت سے منسلک ہو کر ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں :

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ او را کمال از ملّت است

اقبال نے 'اسرارِ خودی' کے ساتھ ہی دوسرے حصے کی ترتیب شروع کر دی تھی ۔ اس زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں :

''ایسے ایسے مطالب ذہن میں آتے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لئے موجب حیرت و مسرت ہوں گے ، کیوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا ۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں سے بنا ہؤا ایک ضعیف چیتھڑا ہے ۔ قومیت کے اصولِ حق صرف اسلام نے بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی ۔''[1]

اس مثنوی کی تیاری پر اقبال کو بجا طور پر فخر تھا ، چنانچہ ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خود ستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر

---

(۱) مکاتیب اقبال ۔

اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی[1] -

مثنوی 'رموزِ بے خودی' کا ایک مختصر سا دیباچہ بھی تھا ، اس میں اقبال نے لکھا تھا :

"جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت ، دفعِ مضرت ، تعیّنِ عمل و ذوقِ حقائقِ عالیہ ، احساسِ نفس کی تدریجی نشو و نما ، اس کے تسلسل ، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے ، اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اس احساس یا بالفاظِ دیگر "قومی انا" کی حفاظت ، تربیت اور استحکام سے وابستہ ہے - اس طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر قومی انا کی حفاظت ، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے -"[2]

اقبال کے نزدیک ملّت کی تنظیم توحید اور رسالت پر ہوتی ہے - انسانی وحدت توحید کا ہی نتیجہ ہوتی ہے اور کلمۂ توحید ہی ملّت کے تن میں بطورِ جان ہوتا ہے - ملّت دلوں کی یک رنگی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ بات توحید کی برکت سے ہی ظاہر ہوتی ہے - نیز جس طرح عقیدۂ توحید وحدت آفرین ہے اسی طرح رسالت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ ہزاروں انسانوں کو ہم آہنگی اور ہمنوائی کی سلک میں منسلک کر دے :

از رسالت صد ہزارِ ما یک است　　　جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

جو ملّت توحید اور رسالت کی اساس پر منظم ہو اس میں ہر فرد یا مرد حزن و غم سے پاک ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ کسی قسم کا خوف اس کے دل میں نہیں رہتا - جب خودی سے خوف و حزن کے عناصر ناپید ہو جائیں تو خودی اور بے خودی میں کوئی تضاد نہیں رہتا - مگر ایسی ملّت کے لئے ایک نو قانون ہونا ضروری ہے ، مسلمانوں کے لئے یہ قانون قرآن مجید ہے - دوسرے ایک ملّی مرکز ہونا ضروری ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ مرکز کعبہ ہے -

---

(۱) مکاتیب اقبال ، ص ۳۰ -

(۲) دیباچہ رموزِ بے خودی ، پہلا ایڈیشن ۱۹۱۸ء -

'رموزِ بے خودی' کے ایک باب میں یہ بیان کیا ہے کہ حیاتِ ملّیہ کی توسیع تسخیرِ قوائے نظامِ عالم میں مضمر ہے :

خیز و وا کن دیدۂ مخمور را — دون مخوان این عالمِ مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است — امتحانِ ممکناتِ مسلم است

اقبال نے اس مثنوی میں اُمومت کی اہمیت پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ کسی قوم کا سرمایہ سیم و زر نہیں بلکہ اچھے انسان ہیں جو ماں کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں ۔

مثنوی کے آخر میں اقبال نے حضور رحمۃ اللعالمینؐ کی خدمت میں عرض کی ہے کہ ختم المرسلینؐ مسلمانوں کو کامرانی سے ہمکنار کر اور اگر میرے کلام میں سوائے کلام اللہ کے اور کچھ ہے تو مجھ کو خوار و رسوا کر :

گر دلم آئینۂ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآن مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور — چشم تو بینندۂ ما فی الصدور
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

۳- پیامِ مشرق

جرمن شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھا گیا تھا ۔ 'پیامِ مشرق' پہلی بار ۱۹۲۳ء میں شائع ہؤا ۔ اس میں ایک مفصل دیباچہ ہے ، جس میں اقبال نے جرمن ادبیات کی تاریخ میں اس تحریک کا ذکر کیا ہے جس کو "تحریکِ مشرق" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس تحریک کا آغاز فان ہمبر کے 'دیوانِ حافظ' کے ترجمے کی اشاعت سے ہؤا تھا ۔ ویسے تو گوئٹے فارسی ادبیات کا مداح تھا ، مگر حافظ کا خاص طور پر دل دادہ تھا ۔ گوئٹے حافظ کے علاوہ اپنے کلام میں شیخ عطار ، سعدی ، فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنونِ احسان ہونے کا ذکر کرتا ہے ۔ اقبال لکھتے ہیں کہ 'پیامِ مشرق' کے متعلق جو 'مغربی دیوان' سے سو سال بعد لکھا گیا ہے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاق ، مذہبی اور ملی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے ۔

اقبال نے 'پیامِ مشرق' امیر امان اللہ خان والیٔ افغانستان کے نام پر معنون کی

تھی - پیش کش میں لکھتے ہیں :

پیرِ مغرب شاعرِ المانوی آن قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی
بست نقشِ شاہدانِ شوخ وشنگ داد مشرق را سلامے از فرنگ
او چمن زاد و چمن پروردۂ من دمیدم از زمینِ مردۂ
آشنائے من ز من بیگانہ رفت از خمستانم تہی پیمانہ رفت

'پیامِ مشرق' میں اکثر اصنافِ سخن شامل ہیں - پہلے حصے میں رباعیات ہیں جن کی تعداد ۱۶۳ ہے اور ان میں سے ہر ایک فارسی زبان کے بہترین رباعی گو شعراء کی یاد تازہ کرتی ہے - دوسرے حصے میں افکار ہیں - افکر کے تحت قطعات اور نظمیں ہیں ، جن میں فطرت نگاری کے اتنے اعلیٰ نمونے ہیں کہ ان کی مثال فارسی ہی میں نہیں ، دنیا کی کسی زبان میں مشکل سے ملے گی -

'مئے باقی' میں غزلیات ہیں - فارسی زبان میں یہ اقبال کی غزلیات کا پہلا مجموعہ ہے - حافظ کی زبان میں افکارِ جدید بیان کئے ہیں - ایک غزل سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

صورت نہ پرستم من بتخانہ شکستم من آن سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
از بود و نبودِ من اندیشہ گمانہا داشت از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من
در دھر نیازِ من در کعبہ نمازِ من زنار بدوشم من تسبیح بدستم من

پانچویں حصے میں 'نقشِ فرنگ' ہے جس کے تحت فرنگی سیاست دانوں ، مفکروں اور شاعروں پر مبصرانہ نظمیں موجود ہیں - جمعیت الاقوام کے متعلق کہا ہے :

من ازین بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

ہیگل پر نہایت دلچسپ نظم ہے - مگر برگساں پر ایک بصیرت افروز شعر ہے :

نہ مے از ازل آورد نہ جامے آورد لالہ از داغِ جگر سوزِ دوامے آورد

الغرض 'پیامِ مشرق' فارسی اشعار کا ایسا مجموعہ بے نظیر ہے جس کی مثال ادبِ عالم میں مشکل سے ملے گی -

۴- زبورِ عجم

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی - کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ اقبال نے پہلے تو کتاب کے پڑھنے والوں کو نصیحت کی ہے اور اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے - کتاب کے تین حصے ہیں : پہلے حصے میں غزلیات ہیں ، دوسرے میں 'مثنوی گلشن رازِ جدید' ہے اور تیسرے میں ایک مثنوی 'بندگی نامہ' ہے جس کی تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی -

پہلے حصے میں غزلیات ہیں اور ان میں شاعر نے افکارِ عالیہ اور تصوراتِ مجردہ سے بحث کی ہے - اس حصے کی اقبال نے دو فصلیں قائم کی ہیں : پہلے حصے میں ۶۶ غزلیں ہیں اور ان میں خدا تعالیٰ سے خطاب کیا ہے - دوسرے حصے میں ۷۵ غزلیات اور نظمیں ہیں - پہلا حصہ شروع ہونے سے پہلے ایک دعا ہے جس میں نہایت رقت آمیز لہجے میں بصیرت اور کلام میں اثر آفرینی کی دعا مانگی ہے :

یا رب درونِ سینہ دلی با خبر بدہ　　　در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ
خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد بر فروز　　　ہر ذرۂ مرا پرو بالِ شرر بدہ

تیسرے حصے کا عنوان ہے 'گلشن رازِ جدید' - یہ نظم شیخ سعد الدین محمود شبستری کی 'گلشنِ راز' کا جواب ہے - خود اقبال کہتے ہیں :

بطرزِ دیگر از مقصود گفتم　　　جواب نامۂ محمود گفتم

'گلشن رازِ جدید' میں ۹ منظوم سوالات اور ان کے جوابات ہیں - اقبال نے تمہید میں کہا ہے اور یہی اس کے افکار کا حاصل ہے :

تجلیّ را چنان عریان نخواہم　　　نخواہم جز غمِ پنہان نخواہم
گذشتم از وصالِ جاودانی　　　کہ ریزم لذتِ آہ و فغانی
مرا ناز و نیازِ آدمی دہ　　　بجانِ من گدازِ آدمی دہ

کتاب کے تیسرے حصے کا عنوان ہے 'بندگی نامہ' - اس میں غلاموں کے فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی ، مصوّری اور مذہب پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ غلامی کی وجہ سے یہ

سب بے جان اور بے اثر ہوتے ہیں ۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد ایک نظم ہے آزاد مردوں کا فنِ تعمیر ۔ اس نظم میں تاج محل کا ذکر بڑے دلکش انداز میں کیا ہے :

یک نظر آن گوہرِ نابے نگر ۔۔۔ تاج را در زیرِ مہتابے نگر
مرمرش زابِ روان گردندہ تر ۔۔۔ یک دم آنجا از ابد پائندہ تر
عشقِ مردان سرِ خود واگفتہ است ۔۔۔ سنگ را بانوکِ مژگان سفتہ است

'زبورِ عجم' کی غزلیں سوز و مستی سے بھری ہیں ۔ ملاحظہ ہو :

من بندۂ آزادم ، عشق است امامِ من ۔۔۔ عشق است امامِ من ، عقل است غلامِ من
ہنگامۂ این محفل از گردشِ جامِ من ۔۔۔ این کوکبِ شامِ من این ماہِ تمامِ من
اے عالمِ رنگ و بو این صحبتِ ما تا چند ۔۔۔ مرگ است دوامِ تو عشق است دوامِ من

۵۔ جاوید نامہ

بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'جاوید نامہ' اقبال کا شاہکار ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اور اس کی تیاری میں اقبال نے تین سال صرف کئے تھے ۔ یہ ایک طویل تمثیلی نظم ہے جس کے ہر شعر میں رمز ، ایماء ، مجاز اور استعارہ کارفرما ہیں ۔ معراجِ نبوی ؐ کے اسرار و حقائق پر کچھ لکھنے کا خیال اقبال کو مدت سے تھا اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ ایک معراج نامۂ جدید لکھیں ۔ اسی زمانے میں اٹلی کے شہرۂ آفاق شاعر ڈانٹے کی نظم 'طربیہ خداوندی'[1] پر محققوں کی تحقیقات نے ثابت کیا کہ اس نظم کے بیشتر تفصیلی مناظر دراصل ان واقعات پر مبنی ہیں جو اسلام میں معراجِ محمدیہ ؐ کے متعلق بعض احادیث اور روایات میں مذکور ہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ 'جاوید نامہ' لکھتے وقت اقبال کے سامنے ڈانٹے کی 'طربیۂ خداوندی' ، ابن العربی کی 'فتوحاتِ مکیہ' اور ابوالعلا معرّی کی 'الغفران' تھی ۔ مگر 'جاوید نامہ' ان تینوں تصنیفات سے بالکل مختلف ہے ۔ خود اقبال نے لکھا ہے :

آن چہ گفتم از جہانے دیگر است ۔۔۔ این کتاب از آسمانے دیگر است

کتاب مناجات سے شروع ہوتی ہے ۔ اس میں تجلیٔ ذات کے لئے بے تابی ہے :

روئے تو ایمانِ من قرآنِ من ۔۔۔ جلوۂ داری دریغ از جانِ من

---

(۱) Divine Comedy ۔

از زبانِ صد شعاعِ آفتاب کم نمی گردد متاعِ آفتاب

مناجات میں جاودانی زندگی کی آرزو کا اظہار اقبال نے بار بار کیا ہے :

آنیم من جاودانی کن مرا از زمینی آسمانی کن مرا

مناجات کے بعد تمہیدِ آسمانی آتی ہے اور اس کے بعد تمہیدِ زمینی ہے - یہاں روحِ رومی نظر آتی ہے :

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید از پسِ کُہ پارۂ آمد پدید

روحِ رومی اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ :

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگیست
مردِ مومن در نسازد با صفات مصطفیؐ راضی نشد الا بذات

اس پر شاعر کی روح بھڑک اٹھتی ہے اور سوال و جواب ہوتے ہیں ، جن میں معراج کی تشریح ہے :

چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور

اس کے بعد شاعر کی معراج شروع ہوتی ہے - سب سے پہلے فلکِ قمر آتا ہے - یہاں پیغمبروں کی طواسین دکھائی ہیں - اس کے بعد شاعر مع اپنے رہنما کے فلکِ عطارد پر پہنچتے ہیں - عطارد کے بعد فلکِ زہرہ پر پہنچتے ہیں - جہاں وہ کچنر اور فرعون سے ملتے ہیں - فلکِ زہرہ کے بعد فلکِ مریخ پر پہنچتے ہیں ، جہاں حکیمِ مریخی سے ملتے ہیں اور نبیہؑ مریخی کی تقریر سنتے ہیں - فلکِ مریخ سے چل کر فلکِ مشتری پر پہنچتے ہیں جہاں ارواحِ جلیلہؑ منصور حلاج ، غالب اور ایران کی شاعرہ قرۃ العین سے ملتے ہیں اور اخیر میں ابلیس نمودار ہوتا ہے جسے شاعر نے ''خواجہ اہلِ فراق'' کا لقب دیا ہے -

فلکِ مریخ سے چل کر شاعر فلکِ زحل پر پہنچتا ہے - اس فلک کو شاعر نے ان ارواحِ رذیلہ کا مسکن بتایا ہے جنھوں نے ملک و ملّت سے غداری کی تھی - یہاں دو طاغوت دکھائے گئے ہیں :

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم ننگِ دین ننگِ وطن

فلکِ زحل سے چل کر شاعر اور رومی آنسوئے افلاک جاتے ہیں - یہاں پہلے اقبال جرمن حکیم نطشے سے ملتے ہیں - اس کے بعد جنت الفردوس میں داخل ہوتے ہیں - وہاں پہلے قصرِ شرف النساء دیکھتے ہیں - اس کے بعد حضرتِ سید علی ہمدانیؒ کی زیارت سے سرفراز ہوتے ہیں ، اور طاہر غنی کشمیری سے ملتے ہیں - اس کے بعد ہندی شاعر برتری ہری سے ملاقات کرتے ہیں - اس کے بعد کاخِ سلاطینِ مشرق میں جاتے ہیں ، جہاں ان کی ملاقات نادر شاہ ، احمد شاہ ابدالی ، اور ٹیپو سلطان سے ہوتی ہے - آخر میں جب زندہ رود فردوسِ بریں سے رخصت ہوتے ہیں تو حورانِ بہشتی ان سے ایک غزل سنانے کے لئے درخواست کرتی ہیں - حوروں کے اصرار سے شاعر ایک غزل سناتا ہے - اس کے بعد عینِ حضوری میں حاضری ہوتی ہے اور تجلیٔ جلال نمودار ہوتی ہے اور کائنات نورِ شفق میں غرق ہو جاتی ہے اور عالمِ بے چون و چند کے ضمیر سے ایک نوائے درد ناک آتی ہے :

بگزر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو   کہ نیرزد بجوے این ہمہ دیرینہ و نو

'جاوید نامہ' گنجینۂ معانی و حقائق ہے اور اس کی تشریح کے لئے ایک دفتر درکار ہے - اقبال نے اپنی سیاحت صرف چھ ستاروں تک محدود رکھی ہے اور دوزخ و اعراف کی سیر نہیں کی -

طرزِ بیان کی بو قلمونی اور تنوع نے اس کو ایسا شاہکار بنا دیا ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی -

۶- مثنوی مسافر

امان اللہ خان کے بعد جب غاصب بچہ سقہ کو ختم کر کے نادر شاہ نے افغانستان میں امن و امان قائم کیا تو نصابِ تعلیم کے اصلاح کے لئے اس نے سر راس مسعود ، مولانا سلیمان ندوی اور اقبال کو افغانستان مدعو کیا - فرائضِ منصبی سے فارغ ہو کر اقبال نے غزنی اور قندھار کی سیاحت کی - لاہور واپسی پر اقبال نے اپنے تاثرات کو مثنوی کی صورت میں قلمبند کر کے 'مسافر' کے نام سے شائع کیا -

تمہید میں اقبال نے نادر شاہ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا ہے - دوسری فصل میں اقوامِ سرحد سے خطاب کیا ہے اور ان کو قرآن اور حدیث کے مطالعے کی

دعوت دی ہے ۔ تیسری فصل میں نادر شاہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے ۔ چوتھی فصل میں شہنشاہِ بابر کے مزار پر حاضری کا ذکر ہے ۔ اس میں لکھا ہے :

ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دلیؔ است　　　　که آن عجوزه عروسِ ہزار داماد است

پانچویں فصل میں سفرِ غزنی کا حال ہے اور مزارِ حکیم سنائیؒ کی زیارت کا ذکر ہے ۔ چھٹی فصل میں حکیم سنائیؒ کے ارشادات قلمبند کئے ہیں ۔ ساتویں فصل میں سلطان محمود غزنوی "بت شکن" کے مزار پر حاضری کا بیان ہے ۔ آٹھویں فصل میں ایک مردِ شوریدہ سر کی زبانی مسلمانوں کی حالتِ زار کا ذکر کر کے خدا تعالیٰ سے عرض کی ہے کہ ان کے دلوں کو حُبِ رسولؐ سے گرما دے ۔ نویں فصل میں قندھار اور خرقہؑ مبارک کی زیارت کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ قندھار کے روح افزا مناظر کا حال نہایت دل کش پیرایہ میں بیان کیا ہے ۔ دسویں فصل میں احمد شاہ درانی ، موسّسِ ملّتِ افغانیہ کے مزار کی زیارت کا حال ہے ۔ احمد شاہ کی بابت لکھتا ہے :

ملتے را داد ذوقِ جستجو　　　　قدسیاں تسبیح خواں بر خاکِ او

گیارھویں فصل میں امیر ظاہر شاہ کو خطاب کیا ہے ، اور اس میں وہ نصائح اور مشورے قلمبند کئے ہیں جن سے ملت کا ہر راہبر نفع اندوز ہو سکتا ہے ، اس خطاب میں لکھتے ہیں :

حرفِ شوق آوردہ ام از من پذیر　　　　از فقیرے رمزِ سلطانی بگیر

الغرض اس سفر نامہ میں اقوام اور حکمرانوں کو ایسی نصائح قلمبند کر دی ہیں کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

۷۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

یہ مثنوی پہلی بار ستمبر ۱۹۳٦ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اقبال علاج کی غرض سے بھوپال میں مقیم تھے کہ ایک رات خواب میں سرسید احمد خان کو دیکھا ۔ ان سے کہا کہ تم اپنی بیماری کا حال حضور سرورِ کائناتؐ سے کیوں نہیں عرض کرتے ۔ اس خواب کے زیرِ اثر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عرضِ حال کے لئے چند اشعار لکھے ۔ رفتہ رفتہ واقعاتِ عالم نے اقبال کو اتنا متاثر کیا کہ ان اشعار نے ایک مستقل مثنوی کی شکل اختیار کر لی ۔ اس مثنوی میں اقبال نے اپنی ساری عمر

کے غور و فکر کا خلاصہ پیش کر دیا ہے ۔ یہ کہنا درست ہے کہ یہ مثنوی اقبال کی تمام تصالیف میں وہی مرتبہ رکھتی ہے جو دل کو جسمِ انسانی میں حاصل ہے ۔ یہ تو فکر کی حد تھی ۔ زبان کے لحاظ سے ناقدین کی یہ رائے ہے کہ اقبال کو اب فارسی زبان میں شعر کہتے ہوئے تقریباً ربع صدی کا عرصہ ہو گیا تھا اور زبان میں بڑی سلاست اور برجستگی پیدا ہو گئی تھی اور یہ صفت مثنوی کے ہر شعر میں نمایاں ہے ۔

مثنوی میں دین اور سیاست کے ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں کہ جن سے آگاہ ہو کر قومیں دنیا میں سر بلندی بھی حاصل کر سکتی ہیں اور منشائے ایزدی کی تکمیل بھی کر سکتی ہیں ۔ اس کے شروع میں بعض اشعار ہیں جن کی سرخی ہے 'بخوانندۂ کتاب' ان کو چھوڑ کر کتاب بارہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے ، جن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) تمہید ۔ (۲) خطاب بہ مہرِ عالم تاب ۔ (۳) حکمتِ کلیمی ۔ (۴) حکمتِ فرعون ۔ (۵) لا الہ الا اللہ ۔ (٦) فقر ۔ (۷) مردِ حر ۔ (۸) در اسرارِ شریعت ۔ (۹) اشکے چند بر افتراقِ ہندیان ۔ (۱۰) سیاسیاتِ حاضرہ ۔ (۱۱) حرفے چند با امتِ عربیہ ۔ اور (۱۲) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ۔

حکمتِ کلیمی سے اقبال کی مراد ہے تعلیمِ نبوی ؐ ، جو معراجِ انسانی کے حصول میں ممد اور مددگار ثابت ہوتی ہے اور حکمتِ فرعونی سے وہ مفاسد مراد ہیں جو بنی نوع انسان کو قعرِ مذلت کی طرف لے جاتے ہیں ۔ ''لا الہ الا اللہ'' کے ضمن میں اسرارِ توحید کی توضیح کی گئی ہے ۔

خودی کی تربیت اور توسیع میں فقر ایک موثر اور ذیقدر عامل ہے اور اس کا ذکر اقبال نے اپنے کلام میں بارہا کیا ہے مگر فقر کے متعلق ایک علیحدہ باب صرف اس مثنوی ہی میں قائم کیا ہے ۔ چونکہ اقبال نے فقر کی اصطلاح خاص معنوں میں استعمال کی ہے ۔ اس لئے اس کی تشریح ضروری تھی ، فرماتے ہیں :

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل ۔۔۔ یک نگاہِ راہ بین یک زندہ دل
اے کہ از ترکِ جہان گوئی مگو ۔۔۔ ترکِ این دیرِ کہن تسخیرِ او
فقرِ مومن چیست تسخیرِ جہات ۔۔۔ بندہ از تسخیرِ او مولا صفات

نویں باب میں اقبال نے اسرارِ شریعت بیان کئے ہیں ، اور بتایا ہے کہ

شریعتِ اسلامیہ کی ترویج سے ہی دنیا میں وہ معاشرہ قائم ہو سکتا ہے جس میں کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہیں رہتا ۔ دوسرے بابوں میں اہلِ ہند اور امتِ عربیہ کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے ، اور ان کو اصلاح کے راستے بتائے ہیں ۔ سیاستِ حاضرہ کے تحت اقبال نے جمہوریت کو بے نقاب کر دیا ہے ، لکھتے ہیں :

می کند بندِ غلامان سخت تر　　　حریّت می خواند او را بے بصر
گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید　　　پردہ بر روئے ملوکیت کشید

غور سے دیکھا جائے تو اصلی آزادی کچھ اور ہی چیز ہے ۔ مغرب کی جمہوریت تو درپردہ ملوکیت ہی ہے ، جس میں انسانوں کا لہو چوسا جا رہا ہے ۔

مثنوی کا باب ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' مثنوی کی جان ہے ۔ اس باب میں اقبال نے فرنگی استعماریت کی غرض و غایت کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق　　　باز روشن می شود ایامِ شرق
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد　　　زیرِ گردون رسمِ لادینی نہاد
مشکلاتِ حضرتِ انسان ازوست　　　آدمیت را غمِ پنہاں ازوست
تختۂ دوکان شریکِ تخت و تاج　　　از تجارت نفع و از شاہی خراج

ان کی رائے میں انسانیّت کی نجات اس میں ہے کہ فرنگی استعماریت سے نبرد آزما ہو کر اس کا قلع قمع کر دیا جائے ۔

۸۔ ارمغانِ حجاز

یہ اقبال کی آخری تصنیف ہے اور متعدد خصوصیتوں کی حامل ہے ، ایک تو یہ کہ کتاب دو زبانوں میں ہے ۔ پہلا حصہ فارسی میں ہے ، اور دوسرا حصہ اردو میں ۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب نومبر ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی ۔ اس کتاب کے اس حصے میں جو فارسی زبان میں ہے پانچ ابواب ہیں جو رباعیات اور قطعات کی شکل میں ہیں ۔ جس وزن میں بیشتر رباعیات لکھی گئی ہیں ان کو اہلِ عجم نے قطعات کہا ہے ۔ مگر اقبال کا خیال تھا کہ ان کو رباعیات کہنا غلط نہیں ہے ۔ بابا طاہر عریانی

کے قطعات کو اکثر اہلِ زبان اور خود شاعر نے رباعیات ہی کہا ہے ، حالانکہ وہ رباعی کے مخصوص وزن میں نہیں ہیں ۔ اقبال نے دو شعر کے قطعات بکثرت لکھے ہیں ، جن کی ابتدا 'پیامِ مشرق' سے ہوئی اور خاتمہ 'ارمغانِ حجاز' میں ہؤا ۔

اقبال نے اس کتاب میں خدا ، رسولؐ ، خودی ، موازنہ عقل و دل ، جبر و اختیار ، تقدیر و تدبیر ، صدق و یقین ، مکان و لا مکان ، فوق البشر ، ملوکیت ، خلافت ، دخترانِ ملت ، موت و حیات ، فقر وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار دلآویز انداز میں کیا ہے ۔ کتاب کے پہلے حصہ میں پانچ ابواب حسب ذیل ہیں :

(۱) حضورِ حق ۔ (۲) حضورِ رسالت ۔ (۳) حضورِ ملت ۔ (۴) حضورِ عالمِ انسانی ۔ (۵) بہ یارانِ طریق ۔

حضورِ حق کے تحت دو رباعیات ہیں ۔ ایک میں اقبال اپنے مشن کو بڑے پاکیزہ اور دل کش انداز میں بیان کرتے ہیں :

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ این فقیرے　　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

حضورِ رسالت کے تحت جو رباعیات لکھی ہیں ان کے ہر شعر سے عشقِ رسولؐ کا سوز و گداز اور جذب و شوق عیاں ہے ۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں :

بکوئے تو گدازِ یک نوا بس　　　مرا این ابتدا این انتہا بس
خرابِ جرأتِ آن رندِ پاکم　　　خدا را گفت ما را مصطفیٰؐ بس

''حضورِ ملت'' کے عنوان کے تحت جو رباعیاں لکھی ہیں ان کی ابتداء اس قطعے سے کی ہے :

مجو از من کلامِ عارفانہ　　　کہ من دارم سرشتِ عاشقانہ
سرشکِ لالہ گون را اندرین باغ　　　بافشانم چو شبنم دانہ دانہ

مولانا روم کی بابت کہا ہے کہ ان کے کلام نے مجھے عشق و مستی سے آشنا کیا ۔ میں غبارِ راہ تھا اور اس طرح کیمیا بن گیا ۔ ''حضورِ عالمِ انسانی'' کے تحت فرمایا ہے

کہ وجودِ حق سے ہی وجودِ خودی ممکن ہے یعنی انسانی ممکناتِ کار صحیح معنوں میں ظاہر نہیں ہوتیں جب تک ہماری عملی زندگی میں توحیدِ حق کار اقرار پوری طرح کارفرما نہ ہو ۔ اور ''بہ یارانِ طریق'' کی ابتدا اس قطعے سے کی ہے :

بیا کہ کارِ این امت بسازیم قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چنان نالیم اندر مسجدِ شہر کہ دل در سینۂ مُلاّ گدازیم

الغرض قطعات اور رباعیات میں اقبال نے ایسے حقائق اس خوبی سے بیان کئے ہیں جو بنی نوعِ انسان کی ہمشیہ راہبری کرتے رہیں گے ۔ ان کے مطالعے سے اقبال کے خیالات کے تنوع اور وسعت کا انداز ہو سکتا ہے ۔

اقبال کی شاعری کے خصائص

(ا) افکار ، ان کے ماخذ اور تفصیل

اقبال کی تصنیفات میں اگرچہ ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں مگر ان کے فلسفۂ حیات میں تصوّرِ خودی ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے ۔ ان کے خیال میں زندگی کا اصل محرک ہی اثباتِ خودی کا جذبہ ہے ۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے ، جو عملِ پیہم اور آرزوؤں اور مقاصد کی کشمکش سے خودی کی تکمیل کرتی ہے ۔ مقاصد کی تخلیق میں خودی کے استحکام کا راز مضمر ہے اور جب تک مقاصد اور آرزوؤں کی تخلیق جاری رہتی ہے اس وقت تک انسانی زندگی کی نمو پذیری بھی جاری رہتی ہے ۔ فرد کی خودی گو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے لیکن اس کے باوجود یہ اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے اور عمل کے ذریعے لازوال بن سکتی ہے ۔

خودی کے مقابلے میں غیرِ خودی کی علّت غائی یہ ہے کہ وہ خودی کی توسیع اور ارتقاء کے لئے معمول کا کام دے ۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیرِ خودی سے متصادم ہوتی ہے اور اس تصادم سے اس کی قوتیں اور صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں اور اس طرح سے غیرِ خودی اس کے ارتقاء میں ممد ہوتی ہے ۔

عرصۂ کائنات میں ہر چیز کے مقام کا تعیّن اس کی خودی کی تکمیل اور توسیع کے لحاظ سے ہوتا ہے ۔ کائنات کی ہر چیز انفرادیت کی حامل ہے اور یہ انفرادیت انسان میں

شخصیت کا مقام حاصل کر لیتی ہے - کائنات میں انسان اس لئے ایک مقامِ اعلیٰ پر فائز ہے کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کا شعور حاصل ہے - جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے - اسی طرح اس کی منزلِ مقصود یہ ہے کہ خودی کو مستحکم اور مضبوط کرنا چاہئے - تخلیقِ مقاصد سے ایک بے چینی اور بے قراری پیدا ہوتی ہے جو خودی کو سعیٔ پیہم اور جہدِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے لئے آمادہ رکھتی ہے اور اس سے اس کی توسیع اور تکمیل کی راہیں کھلتی ہیں -

ہم بتا چکے ہیں کہ خودی کی تربیت ، توسیع اور تکمیل میں بعض عوامل موید اور معاون ثابت ہوتے ہیں اور بعض عوامل اس کی نشو و نما کے راستے میں سدِّ راہ ہوتے ہیں - ہر فرد معاون عوامل پر عمل کر کے اپنی خودی کو مستحکم کر سکتا ہے -

جو عوامل خودی کی تکمیل میں مدد ہوتے ہیں ان میں سرِ فہرست عشق ہے - جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اقبال نے لفظِ عشق نہایت وسیع معنوں[1] میں استعمال کیا ہے مگر

---

(۱) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ اس بنیادی تصور کا ذکر کر دیا جائے جو اقبال نے لفظِ عشق کے ذریعے پیش کیا ہے - اقبال کے خیال کے مطابق عشق ایک عظیم قوت ہے جو محیرالعقول کارنامے انجام دیتی ہے - اس میں بے پناہ جوشِ عمل موجود ہوتا ہے جو خطرات اور مہالک سے بالکل بے پروا ہو کر جرات ، استقامت اور جانبازی کا اظہار کرتا ہے - اسی بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ عشق مشکل سے مشکل کام کو انجام دے دیتا ہے اور وہ کام جو ویسے برسوں میں کرنا محال ہوتا عشق بالکل مختصر مدت میں کر لیتا ہے :

کوہ پیش عشق چون کاہ ہے بود   دل سریع السیر چون ماہ ہے بود

عشق اپنی بے سرو سامانی سے بھی نہیں گھبراتا اور عقل جہاں تلوّن اور تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے عشق بے خطر ہو کر آگے بڑھتا ہے اور مہمّات سر کرتا ہے - صاف ظاہر ہے جو قوت دنیا میں معجزات کر دکھاتی ہے وہ اقبال کے نزدیک عشق میں پنہاں ہے -

خودی یعنی اپنی ذات کا مشاہدہ بھی عشق کا کام ہے - یہ خود نگری خود گری کی صورت اختیار کر لیتی ہے - دوسرے الفاظ میں انسان اپنی تمام فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے - اس طرح انسان ایک عظیم قوت کا مخزن بن جاتا ہے - یہ عشق کا تخلیقی کارنامہ ہے جو بالآخر دنیا میں انقلاب آفرینی کرتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کے تصوّرِ عشق میں ہر لحاظ سے بنیادی حیثیت عمل کو حاصل ہے - (ادارہ)

خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ خودی کی تادیب بھی ضروری ہے۔ اس کی تادیب کے لئے تین مراحل سے گزرنا ضروری ہے: پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے، دوسرا ضبطِ نفس کا۔ ان دونوں مرحلوں سے گذر کر فرد نیابتِ الٰہی کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔

اثباتِ خودی کے مقابلے میں اقبال نفیٔ خودی کی مخالفت کرتا ہے۔ ہر وہ عمل جو فرد کو سکون سے آشنا کرتا ہے، خودی کے لئے مضر ہے۔ اس وجہ سے اقبال نے رہبانیت کی مخالفت کی ہے اور اس تصوّف کی بھی جو رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے افلاطون کی سخت تنقید کی ہے۔ عجمی تصورات نے ایک حد تک اسلامی شاعری اور ادبیات کو بھی ذوقِ عمل سے محروم کر دیا تھا اور اس وجہ سے اقبال نے شاعری اور ادبیات کی بھی مذمت کی ہے۔ اس سلسلے میں حافظ کے خلاف بھی اقبال نے ابتدا میں چند اشعار لکھے تھے مگر ان کے خلاف ایسا ہنگامہ برپا ہؤا کہ ان کو بعد میں حذف کر دیا۔

خودی کے سلسلے میں اقبال نے ماہیتِ زمان کے مسئلے کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال زمانے کو ماہیتِ وجود اور عینِ خودی سمجھتے ہیں۔ یہ زمان شب و روز کا زمان نہیں بلکہ دراصل تخلیقی ارتقاء کا ہی دوسرا نام ہے۔ اقبال کے حیات بخش فلسفے کو سمجھنے کے لئے انفرادی خودی کے ساتھ اس کے نظامِ اجتماعی کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ دراصل فرد اور جماعت کا ایک گہرا تعلق ہے اور دیکھا جائے تو فردِ ملّت کے لئے اور ملّتِ فرد کے لئے ضروری ہے۔ انفرادی خودی کے لئے حریّت کی ضرورت ہے، یورپ کی تاریخ حریت کے خواستگاروں اور مساوات کے دعویداروں میں ایک الدوہناک تصادم کی داستان ہے۔ اسلامی تمدّن میں فرد اور جماعت کے تضاد کو نہایت خوبی سے رفع کیا گیا ہے۔ یہاں خودی کے ساتھ بے خودی پر بھی زور دیا گیا ہے۔ الغرض انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی خودی کی توسیع اور تکمیل کرکے، یعنی خودی کے ساتھ بے خودی بھی شامل کرکے، انسان کے ایجابی اخلاق کو ابھارتا ہے اور سلبی اخلاق کو دباتا ہے۔ بنی نوع انسان کے لئے یہ ہی راستہ فلاح اور کامرانی کا ہے۔ اس طرح انسان کی ذات میں جلال و جمال کا ایک حسین امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے حیات بخش فلسفے کی اساس انسانی شرف اور فضیلت پر ہے۔ مگر انسانی فضیلت کے خلاف جدید تمدن میں اس مصنوعی فضیلت کا قیام عمل میں آیا

جس کی بنا رنگ اور زبان پر تھی جن سے نظریہ وطنیت ظہور پذیر ہؤا ۔ حتیٰ کہ آج سیاست کا یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ مملکت اور وطنیت ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں ہو سکتے ۔ جب اقبال نے وطنیت کے خلاف آواز بلند کی تو یورپ میں اس کے خلاف سخت ردعمل ہؤا ، مگر اس نظریے نے یورپ میں جب سے جنگ و جدل کی ہمت افزائی کی ہے ۔ اس کو دیکھتے ہوئے اسلام کی تعلیمات اور اقبال کے انقلاب انگیز پیغام کی سچائی پر دنیا کے ماہرین کو یقین آتا جا رہا ہے ۔

افکارِ اقبال میں تقریباً ہر اس مسئلے کا ذکر ہے جس پر انسانی بہبود کا انحصار ہے جیسے مسئلہ خیر و شر ، دین و سیاست کی ہم آہنگی وغیرہ ۔ جدید مغربی تمدن میں مادی زندگی کی قدر و قیمت میں جو غلو برتا جا رہا ہے اس میں اقبال اسلام کی روحانیت پر زور دیتا ہے تا کہ انسانی زندگی میں توازن قائم ہو سکے ۔ جہاں اقبال نے مغربی تمدن کے بعض پہلوؤں کی نہایت شد و مد سے نکتہ چینی کی ہے ، وہاں تسخیرِ فطرت کی راہ میں اس کی مساعی کی بھی تعریف کرتا ہے اور تسخیرِ فطرت کو اجتماعی خودی کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتا ہے ۔ مگر اقبال عالمِ محسوس کی تسخیر کے ساتھ ساتھ معنوی زندگی کے تقاضے بھی نظر انداز نہیں کرتا ۔

اقبال نے اپنے کلام میں قوموں کے عروج اور زوال کے متعلق بھی جابجا اشارے کئے ہیں اور ایک وقت تو ان کا خیال تھا کہ 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بےخودی' کے بعد اس موضوع پر ایک مستقل مثنوی ہی لکھیں ۔ گو یہ ارادہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ، مگر اس اہم مسئلے پر انہوں نے اپنی آئندہ تصنیفات میں کافی روشنی ڈالی ہے ۔

جب اقبال نے اپنا حیات بخش فلسفہ اور انقلاب انگیز پیغام اپنی مثنوی 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بےخودی' میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور خصوصاً جب پروفیسر نکلسن نے 'اسرارِ خودی' کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا ؛ تو دنیا کے فلسفیوں میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ ان افکار کا ماخذ کیا ہے ۔ جس وقت انگریزی ترجمہ شائع ہؤا تو مغرب میں نطشے کے فوق البشر کا بہت شہرہ تھا ۔ اس وجہ سے یورپ کے ناقدین نے فوراً یہ خیال کیا کہ اقبال کا فلسفۂ خودی اور مردِ کامل کا تصور نطشے سے ماخوذ ہیں ۔ ان سب تبصروں کو پڑھ کر اقبال نے پروفیسر نکلسن کو ایک خط لکھا جس میں کہا :

"بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو

میرے اور نطشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے ، دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں . . . میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسانِ کامل کے متصوّفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں ۔''[1]

ایک جگہ اس کی توضیح کرتے ہوئے اقبال نے لکھا :

''اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیاء اور حکماء کے افکار اور مشاہدات سے ماخوذ ہے ۔ اور تو اور وقت کا برگساں کا تصّور بھی ہمارے صوفیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ۔''

دوسری طرف اقبال نے بار بار قرآنی تعلیمات سے مستفیض ہونے کا ذکر کیا ہے ۔ اس سلسلے میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم سحر کردم ازو صد سالہ شب را

ایک صاحب نے اقبال سے ایک بار دریافت کیا کہ آپ کے فلسفۂ خودی کی قرآنی بنیاد کیا ہے ، تو انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۱۱ء میں جب میں نے قرآن کی اس آیۂ کریمہ پر تدبر کیا :

''یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذ اھدیتم ۔''

(المائدہ ۱۰۵ : ۵)

تو یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی کہ ہر مسلمان پر اپنی خودی کا استحکام فرض ہے ۔ پس میں نے اس آیۂ کریمہ کو اپنے فلسفے کا سنگِ بنیاد بنایا ۔

عشق کا تصّور تو اقبال نے مولانا رومی ہی سے لیا ہے گو تصّور عشق کو فلسفۂ خودی سے اس طرح وابستہ کرنا جس طرح اقبال نے اپنے فلسفہ میں کیا ہے صرف اقبال کا ہی حصہ ہے ۔ دراصل اقبال کے یہاں عشق ، جذبۂ ارتقاء ، ذوقِ تخلیق اور ذوقِ تسخیر ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں ۔

---

(۱) اقبال نامہ ، ص ۳۵۷ ۔

عشق کے علاوہ مسئلہ خیر و شر ، جبر و اختیار اور بہت سے مسائل پر اقبال نے رومی کی تعلیمات سے فیض حاصل کیا ہے ۔ تصوف کے نظریات میں اقبال مجدد الف ثانیؒ کا مرہون منت ہے ۔ عام طور پر اور خصوصاً تصور باری تعالیٰ میں اقبال کو محی الدین اکبر ابن عربی سے سخت اختلاف ہے ۔ مگر دوزخ اور جنت کے تصور میں ان دونوں مفکرین کے خیالات میں مماثلت ہے ۔

مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اقبال نے فلسفۂ مغرب کا وسیع مطالعہ کیا تھا ۔ 'اسرارِ خودی' کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں خود اقبال نے لکھا ہے :

''سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا ۔''

اور ناقدین کی رائے ہے کہ اقبال نے احساسِ خودی کا تصور جرمن فلسفی فشٹے سے لیا ہے ۔ مگر جس تفصیل سے اقبال نے خودی کی نشو و نما کے لئے لائحۂ عمل پیش کیا ہے اس کا فشٹے کے یہاں ذکر نہیں ہے ۔ نطشے کے افکار کا اثر خودی کے اشعار سے ظاہر ہے مگر یہ اثر بھی استحکامِ خودی اور قوت کی تعریف تک محدود ہے ۔ نطشے کے یہاں بیخودی کے فلسفے کا ذکر ہے ہی نہیں اور وہ ملّت کے تصور سے نا آشنا ہے ۔ لہٰذا اس کے یہاں فرد اور ملت کا رشتہ نہایت مبہم اور غیر معیّن رہ جاتا ہے ۔ اقبال کے بار بار انکار کے باوجود بعض ناقدین کو اور خصوصاً مغربی مستشرقین کو نطشے کے اثر پر اس لئے زیادہ اصرار ہے کہ 'اسرارِ خودی' میں بعض قصے کہانیاں اقبال نے نطشے سے لئے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان قصوں کو اپنے کلام میں شامل کرنے کی غرض بالکل مختلف تھی ۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ 'اسرارِ خودی' لکھتے وقت نطشے کی تصنیفات اقبال کے زیرِ مطالعہ تھیں ۔ اقبال کا نظریۂ زمان وہی ہے جس کو برگساں نے اپنے نظریۂ حیات کا جزو بنایا ہے اور ویسے بھی اقبال برگساں کے مداح تھے ۔ نظریۂ زمان کی حد تک تو اقبال نے اپنے علم دوست احباب سے ایک بار بیان کیا تھا کہ کیمبرج کے دورانِ قیام میں وہ نظریۂ زمان آزادانہ طور پر خود بخود قائم کر چکے تھے اور اس پر انہوں نے ایک مقالہ بھی لکھا تھا ، جس کو ان کے استاد نے اس وقت قابلِ اعتنا نہ سمجھا تھا ۔ اس سب شہادت کے ہوتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ گو برگساں اور اقبال کے خیالات میں مماثلت ضرور ہے مگر اس میں اولیت کا طرۂ امتیاز

اقبال کے سر ہی ہے -

یہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ اقبال کے نظریۂ جمالیات اور افلاطون کے تصورات میں بھی مماثلت نظر آتی ہے -

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن مغربی فلسفیوں کے خیالات اور اقبال کے خیالات میں کہیں کہیں مماثلت ملتی ہے وہ فشٹے ، نطشے اور برگسان ہیں ، مگر اقبال کے خیالات کا سرچشمہ دراصل قرآنِ پاک اور اسلامی روایات ہی ہیں اور ایک حد تک یہ ابتکار آمیز ہیں -

(ب) زبان و بیان

فارسی زبان ہند و پاکستان کے برِّ صغیر میں مسلم فاتحین کے ہمراہ آئی - اس کی اشاعت تورانی اور ایرانی جنگجوؤں اور صوفیاء کرام کے ذریعے ہوئی - جب دہلی میں مسلم حکومت قائم ہوئی تو فارسی زبان عام ہو گئی - مغلوں کی سلطنت قائم ہوئی تو علم دوست بادشاہوں اور ان کے وزیروں کی سرپرستی نے فارسی شعراء اور ادیبوں کو اس طرح نوازا کہ ہند و پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہر فارسی ادب کا گہوارہ بن گئے - اور یہ صورتِ حال انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک کم و بیش قائم رہی - اس کے بعد ایران و توران سے ہندوستان کا قطعِ تعلق کا زمانہ تھا - ایرانی محاورات اور روزمرہ کی زبان ہندوستان کی فارسی سے مختلف ہو گئی - مگر اس زمانے میں بھی برِّ صغیر میں فارسی شعراء پیدا ہوئے - اگرچہ فارسی زبان کا تسلّط مٹ چکا تھا ، تاآنکہ بیسویں صدی نے یہاں دو معرکۃ الآرا فارسی شعراء پیدا کئے یعنی گرامی اور اقبال - اقبال کی بابت محمد حسین مشائخ فریدانی بجا طور پر لکھتے ہیں کہ انہوں نے فارسی کو برِّ صغیر میں دوبارہ ادبی زبان کی صورت میں زندہ کیا اور فارسی زبان کے بجھتے ہوئے چراغ کو از سرِ نو روشن کر دیا[1] -

الغرض اقبال نے کچھ اپنی طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ فارسی زبان کی دلآویزی کی وجہ سے فارسی میں شاعری شروع کی - بغرضِ تعلم انگلستان کے جانے سے قبل اقبال نے ایک دو نظمیں اور انگلستان کے قیام کے دوران (سر عبدالقادر کے بیان کے مطابق) دو

---

(۱) اقبال ایرانیوں کی نظر میں ، ص ۲۳۶ -

غزلیں فارسی میں لکھیں مگر ابھی تک اقبال کا بشتر کلام اردو میں ہوتا تھا ۔ انگلستان سے واپسی پر اقبال نے حضرت بو علی شاہ کی مثنوی کے نمونے پر ۱۹۱۰ء میں ایک مثنوی لکھنا شروع کی ۔ اس مثنوی کے چند اشعار ہم تک پہنچے ہیں ۔ اس عرصے میں ۱۹۱۲ء میں اقبال نے فارسی زبان میں اپنی مثنوی 'اسرارِ خودی' شروع کر دی ۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں فارسی میں مثنوی 'رموزِ بیخودی' شائع ہوئی ۔ بعض ناقدین نے مثنوی 'اسرارِ خودی' کی زبان کی بابت لکھا کہ یہ نہایت دل کش ، صحیح اور موثر ہے مگر ان دونوں مثنویوں میں ان حقائق کا ذکر تھا کہ بہت سے لوگ ان سے بہرہ ور نہ ہو سکے ۔ ۱۹۲۳ء میں اقبال کے کلام کا ایک مجموعہ 'پیامِ مشرق' شائع ہوا ۔ یہ اہلِ زبان میں نہایت مقبول ہوا ۔ اس کی بعض غزلیں اقبال نے حافظ کی غزلوں کے جواب میں لکھی تھیں ۔

الغرض اقبال کے قلم سے سات کتابیں فارسی میں شائع ہوئیں اور ایران کے ناقدین نے ان کی زبان کو عموماً صحیح ، فصیح اور مؤثر قرار دیا ہے ۔ اقبال کی زبان کے متعلق اہلِ ایران کی رائے ملک الشعراء بہار کے ان اشعار سے ظاہر ہے :

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت — واحدی کز صد ہزاران بر گذشت
شاعران گشتند جیش تار و مار — وین مبارز کرد کارِ صد ہزار

ڈاکٹر حسین خطیبی ، جو تہران یونیورسٹی کے پروفیسر اور ایک مشہور شاعر اور ادیب ہیں اقبال کے متعلق فرماتے ہیں :

"میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان مشکلات کے ہوتے ہوئے جو فارسی زبان کی ترقی کے راستے میں حائل ہیں ، اس ملک میں اتنا بلند طبع اور پُر مغز شاعر پیدا ہو سکتا ہے ، ایسا شاعر جس کی نظیر آخری چند صدیوں میں ایران سے باہر یقیناً نہیں ملتی ۔"[1]

ڈاکٹر خطیبی اپنے ایک مقالے "سبکِ اقبال" میں فرماتے ہیں :

"اس کے اشعار میں کوئی لفظ یا ترکیب یا طرزِ استعمال نہیں پائی جاتی جس پر اصول اور قواعد زبان فارسی کے لحاظ سے اعتراض کیا جا سکے ۔"

(۱) رومی عصر ناشر کانون معرفت تہران ، ص ۲ ۔

الغرض ایران کے ادیب شعراء اور فضلاء اقبال کی زبان کو فصیح اور صحیح قرار دیتے ہیں گو اس میں قدیم رنگ نمایاں ہے ۔ پھر بھی اقبال کی زبان پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے ان کے خلاف بڑی شکایت یہ ہے کہ یہ نئی ترکیبیں خود بنا لیتے ہیں اور بعض جگہ محاورات خود گھڑ لیتے ہیں ۔ ان کے کلام میں صرفی اور نحوی غلطیوں کی بھی نشان دھی کی گئی ہے ۔

نئی تراکیب گھڑنے کی جو شکایت کی گئی ہے اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ قادرالکلام شعراء کے لئے بعض وقت ترکیب سازی ناگزیر ہو جاتی ہے ۔ وہ شاعر جس کے اشعار کی اساس اس کے افکار ہوتے ہیں اپنے خیالات کی تشریح کے لئے نئی تراکیب کے ذریعے زبان کو وسعت دینا ضروری سمجھتا ہے ۔ اقبال کی نئی تراکیب میں یہ خوبی ہے کہ عرفی اور خاقانی دونوں کی ترکیبوں سے زیادہ عام فہم اور آسان ہیں ۔ صرفی اور نحوی غلطیوں کی بابت اتنا کہنا کافی ہے کہ موجودہ دور کے شاعروں اور ادیبوں نے اقبال کی زبان کو صرفی اور نحوی غلطیوں سے پاک قرار دیا ہے ۔ اگر چند غلطیاں ہوں بھی تو رودکی سے لے کر قاچاری دور کے شاعروں تک شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس کے کلام میں کسی نہ کسی پہلو سے صرف اور نحو کی غلطیوں کی نشان دھی نہ کی گئی ہو ۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ برصغیر پاک و ہند میں جو فارسی صدیوں تک رائج رہی وہ دراصل اس ملک میں ترکستان اور خراسان سے آئی اور دراصل یہ ایک لہجہ تھا ۔ اقبال کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے اس شاعری کے بعض قابلِ اعتراض پہلوؤں سے انحراف کیا ، اس کا ذکر ہم آگے کریں گے ۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات اقبال نے اپنے اشعار میں علومِ جدیدہ کا تذکرہ بھی کیا ہے ۔ اس سلسلے میں بھی حتی‌الوسع پرانے الفاظ ہی نئے معنوں میں استعمال کئے ہیں ان الفاظ کے معنوں میں معمولی تصرّف ضروری تھا جو اقبال نے کیا ۔

اقبال نے جو الفاظ اختراع کئے ہیں ان میں وہ الفاظ بھی ہیں جن کا تعلق رجال اور مقامات سے ہے مثلاً وادیٔ یرغمید ، وادیٔ طواسین ، شہرِ مرغدین ، جہان دوست وغیرہ ۔ یہاں اقبال کے لئے اختراع کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔

الغرض نئے الفاظ نئی تراکیب یا بعض مقامی تصرّفات کی بنا پر اقبال کی زبان کو غیر فصیح قرار دینا بڑی بےانصافی ہوگی ۔ اقبال کی زبان کو ایران کے ادیب اور شعراء

سے صحیح اور فصیح قرار دیا ہے ۔ ان کے طرزِ بیان میں جدت ، ایجاز اور سگفتگی ہے اور اس پر ہم اس نقطۂ بحث کو ختم کرتے ہیں ۔

اقبال کا درجہ فارسی شاعری میں

ہند و پاکستان میں شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں فارسی ادب اور شاعری نے بے حد ترقی کی اور یہاں ایک نئے سبک کی بنیاد پڑ گئی جس کا نام سبک ہندی مشہور ہوا ۔ اس سبک میں جدت ، ذوقِ تنوع ، مبالغہ اور خیال بافی زیادہ نمایاں تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ بالخصوص ایرانی شعراء کے لئے یہ سبک ناقابلِ تحمل ہو گیا ۔ علامہ اقبال نے فارسی زبان میں شعر گوئی کی تو ڈاکٹر حسین خطیبی پروفیسر تہران یونیورسٹی کی زبان میں انہوں نے کافی حد تک سبکِ ہندی سے انحراف کیا اور اپنے اکثر اشعار قدیم اسلوبوں کی تقلید میں کہے ۔ انہوں نے نہ صرف پیچیدہ مضامین ، سست الفاظ اور مبہم تراکیب سے اجتناب کیا بلکہ چند مواقع چھوڑتے ہوئے لفظی اعتبار سے بھی اپنے سبک کو قدیم اسالیب کی بنیاد پر استوار[1] کیا ۔ اس لئے فارسی شاعری میں اقبال کے درجہ کا تعین کرتے وقت ہم کو اقبال کا یہ کارنامہ نہیں بھولنا چاہئے ۔ کلامِ اقبال کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ اس قادرالکلام شاعر نے سبکِ ہندی کے بعض شعراء مثلاً عرفی ، فیضی ، نظیری ، غنی ، صائب اور غالب وغیرہ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ایک عرصے تک ان کے اشعار کو اپنے لئے دلیلِ راہ بھی قرار دیا ہے لیکن بعد میں وہ ان کے سبکِ شاعری سے کنارہ کش ہوگئے اور سبکِ عراق و خراسانی کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ متصوفین مثلاً سنائی ، عطار ، رومی ، عراقی ، حافظ ، محمود شبستری اور جامی کی طرف مائل ہوگئے ۔ انہوں نے ہر قسم کی غرابت کو چھوڑ کر واضح اور صریح اور ساتھ ہی فصیح ، بلیغ اور مؤثر اسلوب میں اپنے افکار کو بیان کیا ۔ جنابِ احمد احمدی بیرجندی نے ایک گراں قدر کتاب 'دانائے راز' لکھی ہے جو ۱۹۷۰ء میں مشہد سے شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ ان کو اقبال کے کلام میں سعدی اور حافظ کی حلاوت اور رومی کے عمق کا احساس ہوتا ہے[2] ۔

اقبال نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ، مثنوی ، غزل ، قصیدہ اور دو بیتی جن کو اقبال نے رباعی کہا ہے ۔ ویسے تو رومی ، حافظ ، افغانی اور نظیری کا اثر ان

---

(۱) مجلہ دانش کدہ ادبیات تہران ۱۳۳۲ ، ص ۵۹-۶۰ ، جلد ۱ ، شمارہ ۱ ۔
(۲) دانائے راز ، ص ۹۶-۹۷ ۔

کے کلام پر ہے اور اقبال نے فارسی کے قدیم و جدید بیشتر شعراء کا کلام پیشِ نظر رکھا ہے ۔ مگر امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو ان کا سبک علیحدہ ہے اور اس کو سبکِ اقبال ہی کہنا بجا ہوگا ۔ اس کے متعلق جو کچھ ڈاکٹر حسین خطیبی نے فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے :

''اگر خواستہ باشیم سبکِ اشعارِ علامہ محمد اقبال لاہوری را در چند کلمہ خلاصہ کنیم باید بگوئیم این شاعر سبکِ مخصوص بخود ساخت کہ شاید مناسب باشد آنرا بنامِ سبکِ اقبال بخوانیم ۔''[۱]

حقیقت یہ ہے کہ اقبال فارسی شعراء میں اس لئے منفرد اور اپنے انداز کے موجد ہیں کہ انہوں نے فکر و نظر ، لفظ و معنی ، بیان و اقتباس ، تضمین و تنقید غرض کہ ہر معاملے میں جدت کا ثبوت دیا ہے ۔ غزلیات میں ان کا مقابلہ مولانا رومی اور حافظ سے کیا جا سکتا ہے اور مثنوی میں سنائی ، رومی اور محمود شبستری سے ۔ رومی کے تو وہ مرید ہیں ۔ رباعیات میں عمر خیام ، ابو سعید ابوالخیر اور بابا طاہر کے ہم پلہ ہیں ۔ اقبال کی غزلیات کے متعلق ہمارے پاکستانی ناقد ڈاکٹر سید عبداللہ بجا طور پر تحریر فرماتے ہیں :

''اگرچہ مجموعی لحاظ سے اقبال کو بحیثیت غزل گو حافظ کے برابر کھڑا نہیں کیا جا سکتا مگر حق یہ ہے کہ جہاں فارسی کے بڑے بڑے شاعر سر جھکا کر آگے بڑھے ہیں وہاں اقبال کو یہ توفیق ملی ہے کہ وہ حافظ کی زمین پر متصرّف ہو کر اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر شرمندہ نہیں ہوئے ۔ بلکہ انہوں نے اپنے انفرادی انداز اور مخصوص فلسفۂ زندگی کے طفیل حافظ کے نغمۂ خواب آور کو نوائے جبرئیل آشوب بنا دیا ہے ۔''[۲]

یہ درست ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے بعد ادبیات فارسی نے اقبال کے پایہ کا شاعر پیدا نہیں کیا ہے ۔ فارسی شاعری میں یہ عصر عصرِ اقبال ہے ، ملک الشعرا بہار نے سچ کہا ہے :

''عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت''

---

(۱) اقبال ایرانیوں کی نظر میں ، ص ۱۳۴ ۔
(۲) اقبال ، جلد ۲ ، شمارہ ۴ ۔

(ج) ہیئت کے لئے تجربے

علامہ اقبال فلسفی تھے - امتوں کا عروج و زوال ان کا خاص موضوع تھا - جہاں مشرق کے فلسفے سے آپ اچھی طرح باخبر تھے ، وہاں فلسفۂ مغرب سے بھی پوری طرح آگاہ تھے - ان تمام افکار کو اپنے موضوع کے مطابق ڈھالنا اور پھر انہیں زبانِ شعر سے ادا کرنا معمولی کام نہیں تھا - بنا بریں اظہار و ابلاغ کے لئے انہوں نے کلاسیکی اسالیب بھی استعمال کئے اور ان کے ساتھ جدید اسالیب بھی اختراع کئے - اسی طرح مثنوی ، غزل ، قصیدہ ، ترکیب بند ، مخمس وغیرہ قدیم اصنافِ سخن بھی آپ نے پرانے انداز کے مطابق برتیں مگر ساتھ ہی ان میں انہوں نے جدتیں بھی پیدا کیں - نئے افکار و خیالات تھے ، اس لئے ہیئت میں جدتوں کا ظہور لازمی تھا - یہ موضوع بڑا وسیع ہے ، مگر ہم اس سے متعلق دو ایک خاص نکات بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں -

فارسی میں 'پیامِ مشرق' کی اشاعت ۱۹۲۳ء میں ہوئی - اس سے پہلے 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' چھپ چکی تھیں - یہ دونوں مثنویاں تھیں - صنفِ مثنوی میں اقبال نے جدید افکار بیان کئے تھے - مثنوی میں اسی طرح متقدّمین بھی اپنے اپنے افکار بیان کر چکے تھے - ہیئت میں نئے تجربوں کا آغاز در اصل علامہ نے 'پیامِ مشرق' سے کیا اور اس لحاظ سے جو چیز سب سے زیادہ جالبِ توجہ ہے وہ ان کے جدلیاتی مکالمے ہیں - انہیں وہ محاورہ کا نام دیتے ہیں مثلاً 'محاورۂ علم و عشق' ، 'محاورہ مابین خدا و انسان' - اسی طرح 'تسخیرِ فطرت' بھی ایک جدلیاتی مکالمہ ہے جس کے کردار ابلیس اور آدم ہیں جس میں ابلیس اگر بصد تفاخر یہ کہتا ہے کہ :

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات

تو آدم اپنے سوزِ ناتمام اور دردِ آرزو پر فخر کرتا نظر آتا ہے اور حضور باری تعالٰی میں اپنی تمام تر لغزشوں کی بڑی عمدہ توجیہ پیش کرتا ہے :

رام نگردد جہان تا نہ فسونش خوریم

نظم 'تسخیرِ فطرت' کی طرح 'صحبتِ رفتگان' بھی عظیم جدلیاتی مکالمہ ہے - اس کے کردار

ٹالسٹائی ، کارل مارکس ، ہیگل ، مزدک اور کوہکن ہیں ۔ اس میں جہاں ہیگل دنیا میں ہنگامۂ اضداد کی وجہ سے صرف لذتِ پیکار سے خوش نظر آتا ہے وہاں ٹالسٹائی ، کارل مارکس اور مزدک سرمایہ اور ملوکیت کی مخالفت کرتے ہیں اور مزدک کہتا ہے :

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز

ان کے درمیان کوہکن جو مزدوروں کا نمائندہ ہے کہتا ہے "میں نے پہاڑوں کے پرخچے اڑا دیے لیکن افسوس میری قسمت نے ابھی تک کوئی پلٹا نہیں کھایا :

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد ہنوز گردشِ گردون بکامِ پرویز است"

مکالموں کا یہ انداز علامہ نے 'جاوید نامہ' میں بھی جاری رکھا ، مثلاً اپنی اس تصنیف میں فلکِ مشتری پر زندہ رود اپنی مشکلات یکے بعد دیگرے حلّاج ، قرۃ العین طاہرہ اور غالب کی ارواح کے سامنے بیان کرتا ہے ۔ اِن کے بعد خواجۂ اہلِ فراق یعنی ابلیس نمودار ہوتا ہے اور خدا کے سامنے التجا پیش کرتا ہے کہ جو آدم اس وقت میرے سامنے موجود ہے یہ تو سخت کمزور ہے ۔ ایسا آدم پیدا کر جو پتھر کی طرح سخت ہو اور میرا منکر ہو پھر اسے ورغلاتے ہوئے مجھے بھی لطف آئے :

منکرِ خود از تو می خواہم بدہ سوی آن مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم لرزہ اندازد نگاہش در تنم

اب غور فرمائیے جدلیاتی مکالمے علامہ مرحوم کے ہیئتی تجارب میں کیا مقام رکھتے ہیں ۔ یورپ کی ادبیات میں ڈرامائی خود کلامی کے ذریعے براؤننگ نے اپنے تصوّرات پیش کئے تھے ۔ اب علامہ بھی خاص افکار بیان کرنا چاہتے تھے ۔ انہیں اگر وہ ویسے بیان کرتے تو طبایع یقیناً اکتا جاتیں ۔ ان کے سامنے براؤننگ کا تجربۂ ہیئت تھا ۔ اس لئے انہوں نے ڈرامائی انداز سے تاثر پیدا کیا ۔ مختلف کردار سامنے آتے ہیں جو اپنی اپنی فطرت اور شخصیت کے مطابق بات کرتے ہیں اور پھر علامہ وہ نکتہ ذہن نشین کرا دیتے ہیں جو مقصود و مطلوب ہوتا ہے ۔ ہیئت کا یہ تجربہ ہمارے ادب کے لئے واقعی انوکھا اور بے حد اثر انگیز تھا ۔ اقبال نے اس طرح مخاطبہ اور مکالمہ سے فکر و حکمت کو نہایت مؤثر اور دل نشین انداز میں بیان کیا ۔

اسی طرح 'پیامِ مشرق' ہی سے علامہ نے مخمّس اور مسدس کی قدیم اصناف کو بھی نغموں اور گیتوں کی ہیئت میں پیش کرنا شروع کیا ۔ اس سلسلے میں ان کی ان نظموں کا مطالعہ کیا جائے :

نوائے وقت ، فصلِ بہار ، سرودِ انجم ، کرمکِ شب تاب اور حُدی ۔

ان میں موسیقیت کے ساتھ ساتھ متانتِ فکری بھی ہے ۔ جدید صنف ''تصنیف'' کے ذریعے اہلِ ایران نے بھی کام لیا ہے مگر وہاں اس میں رکاکت کا عنصر غائب نہیں ۔ مسدس اور مخمس کے علاوہ اقبال نے مثلث کو بھی اس غرض کے لئے بڑی کامیابی سے استعمال کیا ۔ اصناف کا یہ استعمال ان کی 'زبور عجم' میں بھی نظر آتا ہے ۔ الغرض اپنے افکار کے ابلاغ کے لئے اقبال نے ڈرامائی تاثر اور موسیقیت سے کامیابی کے ساتھ استفادہ کیا ۔ وہ کسی خاص اسلوب یا خاص صنف کے قائل نہیں تھے بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اپنا پیغام اثر انگیز اور بصیرت افروز طریقے سے لوگوں تک پہنچائیں ۔

اقبال کی عظمت کی بنیادیں

اقبال شاعر بھی ہے اور مفکّر بھی ۔ اس نے اپنے تنوعِ افکار اور ثروتِ تصورات سے اپنے کلام میں آدم گری کا کام کیا ہے ۔ افکارِ عالیہ کو اپنے کلام میں اس طرح سمویا ہے کہ اس کی مثال دنیا کے شعراء میں بمشکل ملے گی ۔ اس کی عظمت کی بنیاد یہی ہے ۔ اس کے فکر کا مقصد ارتفاعِ بشریت ہے ۔ اس کی نظر میں شاعر کا جو اعلیٰ مقام ہے اس کو یوں بیان کرتے ہیں :

فطرتِ شاعر سراپا جستجوست   خالق و پروردگارِ آرزوست
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل   ملتے بے شاعرے انبارِ گل
شعر را مقصود اگر آدم گری است   شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

الغرض اقبال کے افکار میں ذکر و فکر اور نظر و خبر کا حسین امتزاج ہے ۔ شاعری کی حدود تک تو فطرت نے اس کو تلمیذ الرحمٰن بنایا تھا ۔ افکار کی حد تک وہ مشرق اور مغرب کے افکار کا وارث تھا ۔ جو کچھ اس نے ورثے میں پایا اس کو اس نے اپنے الہامی کلام میں پیش ہی نہ کیا بلکہ اس میں قابلِ قدر اضافہ بھی کیا ۔ مشرق اور مغرب کے

فکری ورثے اور اپنے اضافے کے علاوہ اقبال نے قرآنی تعلیمات سے بھی استفادہ کیا اور مسلم صوفیاءِ کرام خصوصاً رومی کے ارشادات اور روحانی تجربوں سے فائدہ اٹھایا ۔ شائد یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اقبال کے کلام میں تیرہ سو سالہ اسلامی روایات اور افکار کی عکاسی ہے اس نے ان کے کلام کو وہ عظمت بخش دی ہے جو دوسرے شعراء اور مفکّرین کو میسر نہ تھی ۔

اس اعلیٰ مقام پر پہنچ کر اس عظیم انسان نے اپنا فلسفۂ حیات تدوین کیا ، جس کی اساس فلسفۂ خودی اور بیخودی ہے ۔ یہ فلسفہ اتنا مشہور ہوا کہ اس کے متعلق یہاں زیادہ لکھنا غیر ضروری ہے مگر یہ اقبال کی عظمت کی دوسری بنیاد ہے ۔

اقبال کی عظمت کی تیسری بنیاد ان کا نظریۂ فن ہے اس سلسلے میں اقبال نے شاعری کو مقصود بالذات کبھی نہیں سمجھا ۔ بلکہ اس کو ہمیشہ زندگی کا تابع سمجھا وہ فن برائے زندگی کے نظریہ میں اعتقاد رکھتے تھے :

نغمہ کجا و من کجا ، سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اقبال اپنے فن کے ذریعے اجتماعی وجدان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے تھے ۔ ظاہر ہے جو شاعر اپنے فن کو برائے زندگی استعمال کرے گا وہ انسانی زندگی کے جملہ مسائل سے دو چار ہوگا ۔ اس کی نظر ہر وقت ممکناتِ حیات پر رہے گی ۔ جن تین بنیادیں کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے ان میں گہرا تعلق ہے شائد یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں ۔

اقبال کی عظمت کی چوتھی بنیاد یہ ہے کہ بغیر گہرے ذاتی تاثّر کے شعر نہ کہتے تھے لہٰذا ان کے کلام میں اثر ہے ، اخلاص ہے ، سوز ہے اور درد اور گداز ہے ۔

اقبال کی عظمت کی ایک اور بنیاد ان کی جرأت اور بےباکی ہے ۔ مدت سے فکرِ یونانی انسان دماغ پر مسلّط ہے ۔ سقراط ، افلاطون اور ارسطو کی نگارشات کو فکرِ انسان نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے ۔ مگر جب اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ افلاطون کی تعلیمات نے ملّتِ اسلامیہ پر صحت مند اثر نہیں کیا ہے تو انہوں نے نہایت بےباکی سے کہہ دیا :

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم   از گروہِ گوسفندانِ قدیم

گفت سّرِ زندگی در مردن است　　شمع را صد جلوہ از افسردن است
قومہا از سکرِ او مسموم گشت　　خفت واز ذوقِ عمل محروم گشت

اکثر لوگ حافظ کو ایک بڑا شاعر ہی نہیں مانتے بلکہ ان کو ایک حقیقت شناس بزرگ اور بزرگ صوفی بھی خیال کرتے ہیں ۔ ان کی عظمت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکثر لوگ ان کو لسان الغیب گردانتے ہیں مگر جب اقبال نے سوچا کہ ان کی دلآویز شاعری کے بعض اثرات معاشرے کے لئے مضر ہیں تو اس نے بڑی جرأت سے کہہ دیا :

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار　　جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر　　الحذر از گوسفندان الحذر

جب مرقومہ بالا اشعار شائع ہوئے تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ آخرکار اقبال نے یہ اشعار دوسرے ایڈیشن سے حذف کر دیئے ۔ تاہم ان کی جرأت فکری عیاں ہے ۔

پانچویں بنیاد اقبال کی عظمت کی یہ ہے کہ اس زمانے میں جب مغربی تمدن کا اثر غالب تھا ، اقبال نے دنیا کو بتایا کہ جس تمدن کو وہ ترقی کی معراج تصور کر رہے ہیں وہ دراصل ترقی نہیں بلکہ ایک قریب المرگ مریض کا ہذیان ہے ۔ اقبال نے مغرب کو بتایا کہ انسانیت کی تعمیر صرف صحیح اقدار پر ہو سکتی ہے ۔ اصل ترقی کی بنیادیں روحانی اور اخلاقی ہونا چاہئیں ۔ اس کے لئے نورِ بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ نورِ بصیرت ذکر و فکر کے امتزاج سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

اقبال کی عظمت کی ایک بنیاد اس کی رفعتِ تخیّل اور عزم و ہمت ہے ۔ ہمارے صوفی شاعر عام طور پر اپنے کلام میں انکساری ، فروتنی ، خاکساری ، توکل اور قناعت کی تعلیم دیتے ہیں ۔ اقبال نے اس کے خلاف عزم و استقلال ، عزتِ نفس اور بلند ہمتی کی تعلیم دی جو مشرقی ادب میں نادر چیز تھی ۔

اقبال کی عظمت کی حقیقی بنیاد در اصل عشقِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ اسی لئے ان کے کلام میں نعتوں کا خاص مقام ہے ۔ فارسی ، عربی اور اردو میں نعتوں کا بڑا ذخیرہ ہے اور بڑے بڑے شاعروں نے عشقِ رسولؐ کے زیرِ اثر اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ مگر اقبال کی نعتوں کا ایک خاص رنگ ہے ۔ آخر عشقِ رسولؐ سے سرشار ہو کر اقبال نے جرأت رندانہ سے پیش حق عرض کر دیا :

تو باش این جا و با خاصان بیامیز　　کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

اقبال کا عشقِ رسول ہی وسعت پذیر ہو کر عشقِ ملّت کی صورت اختیار کر گیا ۔ انہوں نے ملت کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کا پیغام دیا جو پھر آگے بڑھ کر ان کے نصب العین اخوتِ انسانی کا پیش خیمہ بنا اور ان کے کلام کو آفاقیت کا جوہر عطا کیا ۔ یہ ہیں اقبال کی عظمت کی بنیادیں اور ان کے زیرِ نظر کہا جا سکتا ہے :

دگر دانائے راز آید کہ ناید

۱۸۵۷ء کے بعد دیگر شعرائے فارسی[۱] (فصل ب)

شبلی نعمانی

محمد شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ متموّل آدمی تھے ۔ انہوں نے شبلی کو تعلیم کے حصول کے لئے سہولتیں فراہم کیں ۔ پہلے کلامِ مجید اور چند کتابیں بندول میں پڑھیں ۔ پھر اعظم گڑھ کے عربی مدرسے سے تعلیم حاصل کی ۔ ازاں بعد مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے غازی پور میں اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے اوریئنٹل کالج لاہور میں کچھ مدّت تک پڑھتے رہے ۔ ان دونوں اساتذہ کے شبلی پر دائمی اثرات ہوئے ۔ تعلیم کے بعد پہلے وکالت پاس کر کے یہی پیشہ اختیار کر لیا مگر خلافِ مزاج ہونے کی وجہ سے ترک کیا ۔ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ گئے ۔ سر سید احمد خان کے حلقے میں شامل ہوگئے اور ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں استاد مقرر ہوئے ۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کر لیا ۔ ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد (دکن) میں ملازم ہوئے ۔ ۱۹۰۴ء میں ندوۃ العلماء کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا ۔ ۱۹۱۳ء میں ندوے سے دل برداشتہ ہو کر اعظم گڑھ چلے گئے ۔

---

(۱) ۱۸۵۷ء سے لے کر علامہ اقبال تک فارسی کے بہت سے شعراء ہو گزرے ہیں ۔ مگر ہم نے صرف شبلی اور گرامی کا ذکر کیا ہے کیونکہ نمایاں حیثیت ان دونوں کو ہی حاصل ہے ۔ باقی شعراء بھی اکثر و بیشتر بخن گو تھے ۔ ان میں عبدالاحد وارث ، عبدالغفور نساخ ، احمد خان صوفی ، برکت اللہ عشقی ، بسم اللہ خان صوفی ، غلام امام شہید ، خدا بخش شائق ، محمد علی صابر ، منظور احمد ، طالب چشتی ، محمد حسین تمنا ، سلامت اللہ کشفی ، ولایت علی عزیز اللہ ، واحد علی واحد ، یحییٰ خان سرخوش ، احمد مکھڈوی ، غلام علی شاہ میروی ، شعری ، عظامی اور عزیز لکھنوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ سندھ میں بھی فارسی گو شعراء موجود تھے ۔ دیکھئے ۔ 'تذکرہ شعرائے سندھ' مؤلفہ اسد اللہ نور اور انگریزی میں سدا رنگانی کا مقالہ' دکتوری ۔

ازاں بعد دارالمصنّفین کی بنیاد ڈالی ، جس نے مدت تک تصنیفی کاموں سے اہلِ علم کو متوجہ کئے رکھا - ۱۹۱۴ء میں وفات پائی -

شبلی کا کام زیادہ تر اُردو نثر میں ہے مگر انہوں نے اُردو اور فارسی دونوں میں اپنا شعری کلام بھی یادگار چھوڑا ہے - فارسی میں ان کے کلام کے چار نہایت مختصر مجموعے چھپ چکے ہیں ، جو بیس بیس پچیس پچیس صفحات پر مشتمل ہیں - ان کے نام تاریخی ترتیب سے یہ ہیں :

(۱) دیوانِ شبلی - (۲) دستۂ گل - (۳) بوئے گل - (۴) برگِ گل -

یہ چاروں مجموعے ایک جلد میں کلیاتِ شبلی کے نام سے بھی شائع ہو چکے ہیں - ان مجموعوں میں ۴۸ مکمل غزلیں ، ۲۳ نامکمل غزلیں (جو دو دو چار چار اشعار پر مشتمل ہیں) اس کے علاوہ قصیدے ، مرثیے ، ترکیب بند اور مختصر نظم نما مثنویاں ہیں -

'دیوانِ شبلی' جو ابتدائی کلام کا مجموعہ ہے بعد کے دو مجموعوں سے بہت مختلف ہے - اس میں غزلوں کے علاوہ قصیدے ، مرثیے ، ترکیب بند ، مثنویاں اور قطعے موجود ہیں جب کہ 'بوئے گل' اور 'دستۂ گل' صرف غزل کی صنف تک محدود ہیں - 'دیوانِ شبلی' کی غزلیات میں روایتی عشقیہ مضامین دکھائی دیتے ہیں - قصائد اور ترکیب بند سے ان کے سیاسی رجحانات معلوم ہوتے ہیں - قصائد کی تشبیبیں مناظرِ فطرت اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں - ان میں وہ زورِ کلام اور قوتِ شاعری تو نہیں ہے جو ایرانی قصیدہ نگاروں کا طرّۂ امتیاز ہے تاہم ان میں روانی اور برجستگی ہے - مدح کے حصے عموماً معمولی درجے کے ہیں - ترکیب بند کی صنف کو شبلی نے سیاسی شاعری کے لئے وقف کر دیا تھا - شبلی کے زمانے میں ان کے ہم عصر اُردو شعراء مثلاً حالی ، اسمٰعیل اور بعد ازاں اقبال نے بھی اس صنف کو سیاسی موضوعات کے لئے استعمال کیا ہے - ان کے ترکیب بند سر سید احمد خان سے متاثر ہونے اور علی گڑھ کالج میں پڑھانے کے زمانے میں لکھے گئے ہیں - ان میں مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی تنزل کو موضوع بنایا گیا ہے اور سر سید احمد خان کی پیروی میں جدید تعلیم کو اس کا علاج قرار دیا گیا ہے - ایک ترکیب بند (۱۸۹۰ء) میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

فرصتی بیش نرفت است کہ با شوکت و جاہ | ما درین ملک نمودیم بہر پایہ فراز
تیغ اگر بود وگر نامہ و قرطاس و قلم | ہمہ را بود ہم از نسبتِ ما زیب و طراز

بازیٔ چرخ بدستِ دگری داد عنان | رفت یکبارہ ز ما خسرویٔ نعمت و ناز
ما ازان جملہ باین مرتبہ راضی بودیم | کز پسِ پردہ فلک بازیٔ نو کرد آغاز
بہ علومی کہ جدید اند سروکار افتاد | درسِ پارینہ بہ تقویمِ کہن گشت انباز
فکر کردند بہ اسبابِ عرض پی بردند | زان سپس چارۂ آں درد نمودند اظہار
کیں مرض را بہ جہان ہست اگر درمانے | غیرِ تعلیم نبودست و نباشد زنہار
حالیا چارہ جز این نیست کہ بنیاد نہند | بیتِ علمی کہ کسان را بود از جہل حصار

اس دیوان میں چند مرثیے بھی ہیں جس میں ضیاء الدین نیّر اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے مرثیے پر اثر ہیں ۔ نیر کے مرثیے میں اُردو کے مشہور مرثیہ نگاروں مثلاً انیس و دبیر کے انداز میں مسدّس کی ہیئت اختیار کی گئی ہے ۔ مولانا فیض الحسن کا مرثیہ محتشم کاشی کے طرز میں ترکیب بند کی ہیئت میں لکھا گیا ہے ۔ یہ شخصی مرثیے ہیں اس لئے انیس یا محتشم کے مرثیوں سے ان کا کوئی گہرا تعلق نہیں جو کہ واقعاتِ کربلا کے بیان میں لکھے گئے ہیں ۔ مثنویاں مصر و ترکی کے سفر کے دوران بعض تاثرات کے اظہار کے لئے لکھی گئی ہیں ۔ 'دیوانِ شبلی' کی اس شاعری میں ترکیبوں کی دلآویزی اور بندشوں کی چستی موجود ہے لیکن یہ کوئی اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں ہے ، کیونکہ اس کی کوئی مستقل اہمیت نہیں ۔

'دیوانِ شبلی' کے بعد شبلی کی توجہ فارسی شاعری سے ہٹ گئی اور کئی برس تک وہ نثر نگاری میں مشغول رہے ۔ پھر ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے ذوقِ غزل سرائی کو تازہ کر دیا اور اب انہوں نے جو غزلیں کہیں وہ روایتی تغزل کا نمونہ نہ تھیں ۔ ان میں ان کی قلبی کیفیتیں جلوہ گر ہو رہی تھیں ۔ اس واقعے نے 'دستۂ گل' ، 'بوئے گل' اور 'برگِ گل' کی بعض غزلیات کو جنم دیا ۔ مہدی حسن (الافادی) کو ۱۱ ستمبر ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں بمبئی سے لکھتے ہیں :

> ''بیس برس بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا ۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرّک ہیں ۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا ۔ 'اپالو' یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہے اور 'چوپاٹی' اس کا جواب ہے ۔ خواجہ حافظ کے مصرعے کو یوں بدل دیا ہے :

کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

اس غزل کا ایک شعر یہ ہے :

ہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخ و بے پروا
گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہرو را

تین چار غزلیں لکھیں جو کبھی آپ کی نظر سے گزریں گی ۔''[1]

دراصل قصہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ کے سفر کے دوران شبلی کی ملاقات نواب حسن آفندی کے ساتھ ہوئی ۔ حسن آفندی نے ان کی بہت عزت و تکریم کی اور انہیں بمبئی میں اپنے ہاں مدعو کیا ۔ ہندوستان آ کر شبلی بمبئی گئے جہاں وہ حسن آفندی کی بیٹیوں سے بھی ملے ۔ یہ خواتین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں ، پردہ نہ کرتی تھیں اور قومی کاموں میں دلچسپی رکھتی تھیں ۔ مولانا ان کے حسنِ صورت اور اسعال سے بہت متاثر ہوئے ۔ نازلی بیگم ، زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم سے ملاقاتوں کے بعد شبلی کی ان سے خط و کتابت بھی شروع ہو گئی ۔ خصوصاً وہ عطیہ سے بہت متاثر ہوئے ۔ خطوط میں وہ اشارے کنایے سے اظہارِ محبت کی کوشش بھی کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ وہ عطیہ کو جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے ۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا ، ایک تو عمروں کا تفاوت ، شبلی کی عمر پچاس سال تھی اور عطیہ کی بیس سال ۔ دوسرے اسی زمانے میں ایک حادثے کی وجہ سے ان کا ایک پاؤں ضائع ہو گیا ۔ بہرحال شبلی اپنے طور پر یہ سمجھتے تھے کہ عطیہ ان کی طرف مائل ہے ۔ غالباً عطیہ کے خطوط نے بھی اس خیال کو تقویت پہنچائی ہوگی ۔ ان دو تین برسوں کی مدت میں شبلی نے بڑی رنگین ، مرصّع اور پُرکیف غزلیں لکھیں ، ان کا زہد اور تقشّف جو ان کے مزاج پر سخت عقلی پابندیوں کا نتیجہ تھا عشق کے ہاتھوں شکست کھا گیا ۔ چنانچہ خود کہتے ہیں :

پست چل سالہ کہ بیہودہ نگاہ داشتمت   تا نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقویٰ چہ کنم

'دستۂ گل' اور 'بوئے گل' کے مجموعے ان تین برسوں کی یادگار ہیں ، جب شبلی کے دل میں از سرِ نو جوشِ شباب پیدا ہؤا اور وہ واردات سے مملو غزلیں کہنے لگے ۔ چونکہ یہ غزلیات سراسر حال تھیں ، سنی سنائی نہ تھیں ، اس لئے ان میں اصلیت اور تاثیر جھلکتی تھی ۔ یہ روایتی غزلیں نہیں ہیں ، دلی کیفیت کا اظہار ہے ، اس لئے ان میں خیالات کا اظہار بڑی

(۱) مکاتیب شبلی حصہ دوم ، ص ۲۰۷ ۔

روانی ، سلاست اور صداقت سے کیا گیا ہے ۔ ان میں نہ دور از کار تشبیہیں اور استعارے ہیں ، نہ گنجلک تراکیب نہ مشکل الفاظ ۔ 'دستۂ گل' میں پانچ ابتدائی غزلیں ہیں ، مگر اس کے بعد کی تمام غزلیں وہ ہیں جو بمبئی جا کر لکھی گئیں ۔ یہ شبلی کے لئے نئی امنگوں کا زمانہ تھا ۔ دل جلوۂ دوست سے معمور تھا ، طبیعت بشاش تھی ، اس لئے اس مجموعے کی شاعری میں سرخوشی اور رجائیت کی فضا ملتی ہے :

گرچہ رندی و ہوس شیوۂ دانا نبود — حاجتم نیست کہ فرزانہ و دانا باشم
ای خوش آن روز کہ رازم از پردہ برون — از دو سو حلقہ و من مے زدہ رسوا باشم
بمبئی بود مرا منزلِ مقصود و عبث — پیش ازین گام طلب در رہِ حرمان زدہ ام
ساغرِ زندگیم حیف کہ جز دُرد نداشت — جز ہمین جرّۂ آخر کہ بپایان زدہ ام
من کہ در سینہ دلی دارم و شیدا چہ کنم — میل با لالہ رخان گر نکنم تا چہ کنم
ساغرِ بادہ و طرفِ چمن و لالہ رخے — چون بہ اینہا فتدم کار بفرما چہ کنم
روئے و چنین روئے شایانِ نہفتن نیست — بگزار کہ این بردہ از روی تو بردارم
از زہدِ دروغِ خود بفریفتہ ام حاقی — ای دوست چہ می پرسی تا من چہ ہنردارم

لیکن 'بوئے گل' کی غزلوں میں تمنائیت ، انفعالیت میں اور رجائیت یاسیت میں تبدیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء میں عطیہ کو یورپ کا سفر پیش آیا ۔ واپسی کے کچھ عرصہ بعد عطیہ کے خطوط کا لہجہ یک بیک بدل گیا ۔ شبلی کے ایک خط بنام عطیہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے :

''میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بالاتر کر دیا ہے ، اس لئے یہ توقع کہ آپ اسی طرح ہم سے ملیں یا ان اطراف کا قصد کریں جیسا کہ وعدہ کیا تھا ، اب صحیح نہیں ۔ خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خود دارانہ ہے ۔''[1]

پھر رفتہ رفتہ عطیہ کی شکایتیں بڑھتی گئیں اور بعض نا معلوم وجوہ کی بنا پر وہ اب ان باتوں سے ناراض ہونے لگیں جن پر پہلے کبھی معترض نہ ہوئی تھیں ۔ چنانچہ غزلیات میں بھی مایوسی ، رنج اور افسوس کے جذبات ظاہر ہونے لگے ۔ 'بوئے گل' کی ترکیب ہی یہ

۱۔ خطوطِ شبلی ، ص ۶۳

ظاہر کرتی ہے کہ گل تو رخصت ہو چکا اب فقط بو باقی رہ گئی ہے۔ 'بوئے گل' کی شعری فضا غم و آلام کے ذکر سے بنتی ہے :

فراق و ہجر دیارِ خوشی بود کہ درو
پس از گزشتن شب ہم سحر نمی آید

نہ خواری کہ زکوی تو رفت نعانی
گمان برم کہ ازیں بس دگر نمی آید

یک سر و صد گونہ سودای نہانی داشتم
یاد آن روزی کہ من با خود جہانی داشتم

یاد آن روزی کہ دست افشاں گزشتم ازحرم
از غروری آن کہ من ہم آستانی داشتم

ہیچ باک از گردشِ گردونِ گردانم نبود
کز زمینِ کوچہ او آسمانی داشتم

'برگِ گل' آخری مجموعہ ہے لیکن اس میں تین چار تازہ غزلوں کے سوا باقی ماندہ کلام وہ ہے جو شبلی نے بہت پہلے کہا تھا مگر 'دیوانِ شبلی' میں چھپنے سے رہ گیا تھا۔ گویا یہ پھولوں کی مختلف پتیاں ہیں جو ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی شبلی ہندوستان کے ان معدودے چند فارسی گو شعراء میں شامل ہیں جنہوں نے سبکِ ہندی جیسے مرغوبِ طبع رنگِ سخن کی پیروی نہیں کی۔ اس لئے ان کا کلام ان تمام پیچیدگیوں سے پاک ہے جو ہندوستان کے فارسی گو شاعروں کا خاصہ ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زیادہ تر آپ بیتی بیان کی ہے۔ یہ اشعار پُر اثر ضرور ہیں لیکن ان میں مضامین کا دائرہ یقیناً تنگ ہے۔ عشقیہ شاعری کے حدود یوں بھی زیادہ وسیع ہونے مشکل ہوتے ہیں اس لئے شبلی ایک خوش ذوق اور اصلیت پسند شاعر ضرور معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے ہاں شاعری کی وہ قوت نہیں جو مفکر شاعروں کے ہاں ہوتی ہے اور جو قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔

مولانا گرامی جالندھری

غلام قادر[1] نام، 'گرامی تخلص'، ۱۸۵۶ء[2] میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے

---

(۱) غلام صمدانی گوہر مصنف ''تزک محبوبیہ'' نے نام عبدالقادر لکھا ہے جو غلط ہے۔ گرامی نے خود لکھا ہے :

غلامِ قادرم فرخندہ نامم
گرامی غوث الاعظم را غلامم

(۲) یہ تاریخ ملک محمد باقر نسیم رضوانی (یعنی ڈاکٹر محمد باقر) نے شعرائے پنجاب میں لکھی ہے (ص ۲۹)۔ اکرام الحق مصنف شعرالعجم فی الہند ۱۸۵۷ء کو سنہ ولادت قرار

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

والد شیخ سکندر بخش نیل کی رنگائی کا کام کرتے تھے ۔ گرامی نے رواجِ زمانہ کے مطابق پہلے ایک مسجد میں تعلیم حاصل کی ۔ پھر ایک مکتب میں داخل ہوئے اور خلیفہ ابراہیم سے تعلیم حاصل کی ۔ گرامی اسی زمانے میں شاعری سے دلچسپی لینے لگے تھے ، چنانچہ خلیفہ ابراہیم انہیں ''ملک الشعراء'' کہا کرتے[1] تھے ۔ جالندھر میں ابتدائی تعلیم کے بعد شوقِ تعلیم انہیں لاہور لے آیا ۔ چودہ برس کی عمر میں لاہور آ کر اورینٹل کالج میں داخل ہوئے ۔ پہلے منشی عالم اور پھر فاضل کے امتحانات پاس کئے ۔ یہاں مولانا محمد حسین آزاد بھی ان کے اساتذہ میں تھے[2] ۔ پھر انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا ۔ مگر اس پیشے سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا ، اس لیے جالندھر لوٹ گئے ۔ کچھ مدت کے بعد ایم ۔ اے ۔ او ہائی سکول امرتسر میں فارسی کے مدرس ہوگئے ۔ اس کے بعد کپورتھلہ کے ایک مدرسے میں ملازم ہوئے ۔ پھر لدھیانہ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ملازمت کر لی ۔ یہاں سے اکتا گئے تو لدھیانہ کے ایس ۔ پی وار برٹن کے کہنے پر پولیس میں سارجنٹ ہو گئے ۔ یہ نوکری ان کی طبیعت کے خلاف تھی ، اس لئے جلد چھوڑ دی ۔ اس کے بعد ملازمت کی تلاش میں لاہور ، پٹیالہ ، رامپور اور مالیر کوٹلہ وغیرہ میں گئے ، مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی ۔ پٹیالہ کے وزیرِ اعظم خلیفہ محمد حسین کے توجہ دلانے پر اور ان کی سفارش سے حیدرآباد دکن گئے ۔ اس وقت میر محبوب علی خان نظامِ حیدرآباد تھے ۔ ایک قصیدہ پیش کرنے پر انہوں نے گرامی کو ''شاعرِ خاص'' مقرر کیا ۔ یہ واقعہ ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء کا ہے ۔ پھر ملک الشعراء کا خطاب ملا ۔ تقریباً پینتیس چھتیس سال دکن میں مقیم رہے ۔ اس عرصے میں

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

دیتے ہیں ص ۳۶۱) مگر عبداللہ قریشی مکاتیبِ اقبال بنامِ گرامی کے دیباچے میں جو استدلال کرتے ہیں ان سے دونوں سنین مشکوک ہو جاتے ہیں (ص ۱۴ ، ۱۵) مگر خود کسی قطعی سنِ پیدائش کا تعین نہیں کرتے بلکہ لکھتے ہیں غدر سے چند سال قبل پنجشنبہ کو چار بجے صبح جالندھر میں پیدا ہوئے ۔ مگر عبد اللہ قریشی کا استدلال بھی قیاسی ہے ۔ اس سلسلے میں شعرائے پنجاب کو قدیم ترین ماخذ ہونے کی وجہ سے ترجیح حاصل ہے ۔ خصوصاً اس لئے کہ اس کے مصنف اس بات کے مدعی ہیں انہوں نے شعراء کو خطوط لکھ کر ان سے حالات معلوم کئے ہیں ۔ بہر صورت کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے ۔

(۱) ماہنامہ ''ہلال'' کراچی دسمبر ۱۹۵۸ء مضمون ڈاکٹر محمد جہانگیر خان ۔

(۲) مکتوبات . . . آزاد میں ایک خط میں گرامی کا ذکر آیا ہے جہاں آزاد نے انہیں اپنا شاگرد قرار دیا ہے ، ص ۳۶ ۔

ہوشیار پور میں شادی بھی کر لی ، لیکن بے اولاد رہے ۔ حیدر آباد سے ۱۹۱۶ - ۱۷ء میں واپس آئے اور ہوشیار پور میں بس گئے ۔ ہوشیار پور میں ان کی دلچسپیاں شعر و شاعری تک محدود رہیں ۔ احباب اور تلامذہ ان کے پاس آ جاتے تھے اور شعر و سخن کی مجالس منعقد ہوتی تھیں یا کبھی کبھی علامہ اقبال کے ہاں لاہور چلے جاتے تھے ۔ ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو بروز پنجشنبہ ۳ بجے صبح فوت ہوئے ۔

ان کے شاگردوں میں حفیظ جالندھری اور مولانا عزیز الدین عظامی زیادہ مشہور ہیں ۔ علامہ اقبال ان کے عزیز دوستوں میں تھے ۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے فارسی شاعری میں گرامی کے مشوروں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے[1] ۔

گرامی کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں (۱) 'دیوان گرامی' (۲) 'رباعیات گرامی' ۔ 'دیوان گرامی' دو سو سولہ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں زیادہ تر غزلیات ہیں اور وہ دیوان کے شروع کے ایک سو دو صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں اور ردیف وار ترتیب دی گئی ہیں مگر اس سے ان کے ذہنی ارتقاء کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کس زمانے کا کلام ہے ۔ اس کے بعد مثنویاں ہیں جو اکثر نامکمل ہیں ۔ ایک مثنوی بطرز مثنوی مولانا روم ہے مگر تقریباً ایک سو اشعار سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ اسی طرح ایک مثنوی غنیمت کنجاہی کی مثنوی 'نیرنگ عشق' کے جواب میں شروع کی ۔ وہ بھی چند اشعار سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ کچھ مختصر نظمیں مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہیں ۔ کچھ نظمیں بزرگان دین اور اولیاء اللہ کی منقبت میں ہیں ۔ ایک ترجیع بند ، دو مسدس اور ایک ساقی نامہ ہے ۔ اس کے بعد کچھ قصائد ہیں اور آخر میں چند قطعات و فردیات ۔

'رباعیات گرامی' اس سے بھی مختصر مجموعہ ہے اور یہ آخری عمر کا کلام ہے ۔ مگر گرامی کے جاننے والوں کا خیال یہ ہے کہ ان کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا ہے ۔ انہیں کلام جمع کرنے سے زیادہ دلچسپی نہ تھی ۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ انہیں ہزار ہا شعر زبانی یاد تھے ۔ اپنے اشعار بھی اکثر زبانی سناتے تھے ۔ دلی کے قیام کے دوران انہوں نے بہت کچھ لکھا مگر کبھی جمع نہیں کیا ۔ وہاں سے واپس آ کر جب وہ ہوشیار پور میں

---

(۱) تقریباً ہر خط میں اقبال نے اپنا کلام بغرض مشورہ گرامی کو بھیجا اور ان کے بیشتر مشورے قبول کئے ہیں ۔

جلا بسے تو ان کے عقیدت مندوں نے کچھ چیزیں جمع کیں ، لیکن بہت سا کلام محفوظ نہ رہ سکا ۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں :

"ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ حافظہ نہایت قوی تھا ۔ فارسی کے ہزاروں اشعار انہیں از بر تھے ۔ اپنا کلام بھی سارے کا سارا یاد تھا ۔"

چند سطروں کے بعد اس اندیشے کا اظہار کرتے ہیں :

"مجھے اندیشہ ہے کہ اپنے کلام کا ایک حصہ وہ ضرور اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں ۔"[1]

عبداللہ قریشی بھی اقبال کے ہم خیال ہیں :

"کتنا ہی کلام گرامی کی بے پروائی سے ضائع ہو گیا ۔"[2]

بہر صورت مرورِ ایام سے جو کچھ بچ رہا ہے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے ۔ اس میں سب سے اہم غزلیات ہیں پھر قصائد اور مثنویاں ، بعض رباعیات بھی پختہ اور رواں ہیں ۔

گرامی نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا ، وہ ہندوستان میں فارسی شاعری کے زوال کا زمانہ تھا ، البتہ اردو شاعری بڑے زور شور سے جاری تھی ۔ اس زوال کے زمانے میں فارسی زبان میں طبع آزمائی کرنا کارے دارد تھا ۔ مگر گرامی کو قدرت نے فارسی کی اہلیت دی تھی اور اسی زبان کے لئے پیدا کیا تھا ۔ اس لئے انہوں نے اردو میں ایک دو شعروں سے زیادہ کچھ نہیں لکھا ۔ مولانا گرامی نے فارسی کی کلاسیکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا ۔ ان کا حافظہ بے حد قوی تھا اور انہیں ہزاروں اشعار از بر تھے[3] ۔ ان کی

---

(۱) مخزن لاہور ، گرامی نمبر ، جون ۱۹۲۷ء ۔

(۲) مکاتیب اقبال بنام گرامی ، ص ۴۱ ۔

(۳) اسد ملتانی نے ان کے حافظے کے متعلق ایک واقعہ نقل کیا ہے (اقبال نامہ ، مرتبہ شیخ عطا اللہ ، ج ۱ ، ص ۳۴۴) کہ ایک دفعہ علامہ اقبال کے ہاں گرامی آئے ہوئے تھے ۔ اقبال نے کہا کہ لوگوں کو تو غزلیں یاد ہوتی ہیں ، گرامی کو مثنویاں تک مسلسل یاد ہیں ۔ پھر گرامی کو آواز دی اور نظامی گنجوی کی مثنوی سے ایک مصرع پڑھ کر کہا "نظامی نے کیا فرمایا ہے" ؟ اس پر انہوں نے وہیں سے مثنوی سنانی شروع کردی اور جب تک اقبال نے بات کا رخ نہ بدلا اشعار سناتے رہے ۔

عزلیات کے مقطعوں میں فارسی شعراء کے نام کثرت سے آتے ہیں جیسے :

خوش نظیری[1] نکتہ آوردی گرامی شد ر کار	پارسا آداب ِ مے خوردن نمیداند کہ چیست
گرامی دماغ ِ ظہوری نداشت	خمر را ز خود بیخبر ساختیم
اے گرامی در جواب ِ 'صائب ِ' آتش زبان	اینک ار کلکم جواب ِ لاجواب آید برون
گر رسد آوازۂ این پارسی در ہند و پارس	خسرو از دہلی ، ظہیر از فاریاب آید برون

ان دونوں باتوں میں اگر ایک تیسری بات اور شامل کر لی جائے تو گرامی کے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ وہ یہ ہے کہ گرامی نے تقریباً سبھی غزلیں فارسی غزل کے اساتذہ کی زمینوں میں کہی ہیں ۔ بہت سے اشعار یاد ہوں تو اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ قافیہ فوری طور پر ذہن کو کسی روائتی خیال کی طرف منتقل کر دے گا ۔ گرامی کے ہاں یہ اندیشہ حقیقت بن جاتا ہے ۔ ان کی زمینیں تقلیدی ہیں ، وہ بعض فارسی شعراء کے اسلوب میں لکھنے پر فخر کرتے ہیں اور ان کا حافظہ قوی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں کوئی نیا یا گہرا خیال مشکل ہی سے ملتا ہے ۔ وہ فارسی شعراء کے بیان کئے ہوئے عام موضوعات کو اپنے انداز میں پیش کر دیتے ہیں ۔ البتہ انہیں زبان پر عبور حاصل ہے ، اس لئے اشعار گوارا ہو جاتے ہیں ۔ ان کے ہاں فارسی غزل کے وہی عام مضامین ہیں جو سعدی سے شروع ہوئے ، پھر حافظ کے زبردست تخیّل اور ذاتی محسوسات کی بدولت موثر ترین انداز میں پیش ہوئے اور کلاسک بن گئے اور رفتہ رفتہ ہندوستان کے فارسی شاعروں کے زیر ِ اثر واہمے اور مبالغے میں بدل گئے ۔ ان کے ہاں تصوف ، خمریات ، عشق و عاشقی ، اخلاقیات وغیرہ کے روایتی اور تقلیدی مضامین ہی تخلیق کے تار و پود مہیا کرتے ہیں ۔ اس لئے اگر ان کے دیوان میں فارسی غزل کی آواز ِ باز گشت سنائی دیتی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں :

ز ذوق ِ بیخودی از من مپرس تا چند است	کہ سینہ چاک نظر ہائے فتنہ پیوند است
اے سرت گردم بگردان جام را	شیشہ بشکن گردش ِ ایام را
شکوہ بر نمی تابد نالہ بے زبانی ہاست	مدعا نمی فہمد گریہ ترجمانی ہاست
آنچہ شبخون بر تغافل ریخت فریاد ِ من است	و انچہ نسیان را بفریاد آورد یاد ِ من است

---

(۱) نظیری کا ذکر کئی مقطعوں میں کیا ہے ۔

شدم بسمل ز چشمش ترکِ خونخوار این چنین باید
بجانم آتشی زد شعلہ رحسار این چنین باید

فارسی اسالیب میں گرامی کو سبکِ ہندی سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے ۔ نظیری ، صائب ، ناصر علی وغیرہ کا ذکر اپنے دیوان میں کئی جگہ کرتے ہیں ۔ اگرچہ یہ سب شعرا سبکِ ہندی کے ماتحت شمار کئے جاتے ہیں مگر سبکِ ہندی کے بھی دو روپ ہیں ۔ ایک روپ نظیری ، صائب اور طالب آملی کا ہے ۔ ان لوگوں کے ہاں دور ازکار تخیئل اور مضمون آفرینی کثرت سے ملتی ہے ۔ لیکن ان کے بہت سے شعر ایسے بھی ہیں جن میں عمیق جذبات اور بلند افکار بیان کئے گئے ہیں ۔ دوسرا روپ وہ ہے جو ناصر علی سرہندی ، غنی کاشمیری ، جلال اسیر ، شوکت وغیرہ کے ہاں ملتا ہے ۔ ان کے ہاں عمیق جذبات اور بلندیٔ فکر بہت کم ہیں ۔ خیال آفرینی ، دور ازکار تشبیہیں ، استعارے اور تمثیلیں کثرت سے ملتی ہیں ۔ یہ تو مسلّم ہے کہ گرامی سبکِ ہندی کے شعراء کے انداز میں لکھتا ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں اسالیب میں وہ کس کے زیادہ قریب ہے ۔ محمد حسین آزاد نے ایک خط میں میجر سیّد حسن بلگرامی کو لکھا ہے :

> ”گرامی کو میں خوب جانتا ہوں ، یونیورسٹی پنجاب میں پڑھتا رہا ہے ۔ وہاں سے نکل کر بھی کئی سال مجھ سے ملتا رہا ۔ بارہ برس کا مسلسل مشّاق ہے اور جس رنگ میں لکھتا ہے ، اس میں آج اول درجے کا شاعر ہے ۔ اس کی طبیعت خیال بند ہے ۔ جلال اسیر ، قاسم مشہدی ظہوری وغیرہ ہند میں اسی طرز میں کہتے تھے ۔“[1]

علامہ اقبال کی رائے ان سے مختلف ہے :

> ”میرے نزدیک اصنافِ سخن میں ان کو غزل کے ساتھ خاص شغف تھا ۔ فارسی لٹریچر میں جو تازہ گوئی کا شوق اکبر کے عہد سے شروع ہوا تھا ، مولانا گرامی کو اس دور کا آخری شاعر سمجھنا چاہئے ۔ ان کا کلام بحیثیتِ مجموعی بالخصوص غزل میں نظیری

---

(۱) مکتوبات آزاد ، ص ۳۶ ۔

کے کلام سے ایک خاص نسبت رکھتا ہے۔"[1]

حقیقت ہے کہ گرامی کے ہاں وہ غرابت ، ابہام ، مبالغہ اور تصنّع نہیں ہے جو غنی اور ناصر علی وغیرہ کے ہاں ہے مگر وہ بلندی اور عمق بھی نہیں جو نظیری کا حصہ ہے۔ ان کا اسلوب البتہ سبکِ ہندی کے بیشتر شعراء سے زیادہ رواں اور ہموار ہے۔ انہیں محاورہ بندی کا بہت شوق ہے۔ ان کی بیشتر غزلیات میں جو روانی اور سلاست ہے وہ بعض کمیوں کی تلافی کر دیتی ہے اور وہ اس طرح کے شعر لکھنے پر قادر دکھائی دیتے ہیں :

ما غلط ، عقل غلط ، کار غلط ، راہ غلط	خطِ پیشانیٔ ما سر خطِ گمراہیٔ ما
کار از دست شد و دست بکارے نزدیم	داد از غفلتِ ما آہ ز کوتاہیٔ ما
شبہائے وصل و گوشۂ چشمِ عنایتی	مائیم و زلفِ یار و مسلسل حکایتی
عصیانِ ما و رحمتِ پروردگار ما	این را نہایتی است نہ آن را نہایتی
تا چند امتحانِ تغافل تبسمی	دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتی
دلم آفت بجان آورد حرف از جان چہ می رانی	بجان افتاد کارم ماجرائے دل چہ می پرسی

آخری زمانے میں ان کی بعض غزلیات میں اقبال کے زیرِ اثر تفکّر کا میلان ملتا ہے لیکن اس وقت تک وہ عمر کے اس مرحلے میں پہنچ چکے تھے جب اپنے آپ کو بدلنا ممکن نہیں رہتا۔

غزلیات کے بعد 'دیوانِ گرامی' میں منقبتوں کا درجہ بلند ترین ہے۔ تصوّف کی طرف میلان رکھنے کے باعث صوفیوں اور مذہبی بزرگوں سے انہیں جو دلی عقیدت تھی ان کا اظہار منقبتوں میں خلوص اور سلاست کے ساتھ ہوا ہے۔ حضرت علیؓ اور خواجہ معین الدینؒ اجمیری کی منقبتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے بعد دوسری قابلِ ذکر صنف قصیدہ ہے۔ قصیدے انہوں نے بہت کم لکھے ہیں۔ 'دیوانِ گرامی' میں صرف چار قصیدے ہیں۔ ان میں سے دو بالکل مختصر اور خطابیہ طرز کے ہیں۔ البتہ باقی دو قصیدے جو نظام کی سالگرہ کے موقع پر بطورِ مبارکباد لکھے

---

(۱) مخزن لاہور جون ۱۹۲۷ء (اقبال کا انٹرویو از پنڈت ہری چند اختر)۔

گئے تھے ، قدرے بہتر ہیں۔ ان میں قصیدہ نگاری کے عام فن کی پیروی کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور تمام اجزائے قصیدہ کی مدد سے کلاسیکی قصیدے کی فضا بنائی گئی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ فارسی کے کسی اوسط درجے کے قصیدہ گو کا کلام بھی اس سے بہتر ہوتا ہے۔ گرامی طبعاً قصیدہ گو ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو دربارِ حیدر آباد سے وابستگی کی مجبوری تھی جس کی وجہ سے انہیں قصیدے لکھنے پڑے ، ورنہ وہ ادھر کبھی متوجہ نہ ہوتے۔ 'دیوانِ گرامی' کی دیگر اصناف بھی چنداں قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ مثنویوں میں اچھے شعر یقیناً موجود ہیں مگر وہ بالکل نامکمل ہیں۔

'رباعیاتِ گرامی' کے نام سے ان کا جو دوسرا مختصر مجموعہ چھپا ہے وہ غزلیات کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مولانا کا آخری عمر کا کلام ہے۔ بقولِ اقبال :

> ''اپنی عمر کے آخری دو تین برسوں میں انہوں نے رباعی کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔''[1]

یہ رباعیاں زیادہ تر واردات و مسائلِ تصوف کے بیان تک محدود ہیں۔ بعض رباعیوں میں منقبت اور نعت بھی لکھی ہے۔ کچھ رباعیاں بعض واقعات کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ چند رباعیاں دوست احباب کے متعلق ان کے تاثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔ صوفیانہ رباعیات تعداد میں زیادہ ہیں۔ انہوں نے خود ایک رباعی میں فارسی کے مشہور رباعی نگار صوفی ابوسعید ابوالخیر کے تتبّع کا دعویٰ کیا ہے۔ گرامی کی رباعیات محض صوفیانہ موضوعات کا غیر شاعرانہ اظہار نہیں ہیں۔ ان میں فنِ رباعی نگاری کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔ چاروں مصرعوں کا ربط اور مصرع بہ مصرع خیال کی چڑھتی ہوئی لَے اور آخری مصرعے میں خیال کا نقطۂ عروج ، اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ان کی رباعیات کی ایک خاص اہمیت :

یک قطرہ ز خمخانۂ رازم دادی	یعنی خبر از ناز و نیازم دادی
صورت گیرد چگونہ عصیان از من	کز صورتِ خویش امتیازم دادی

چترال کے فارسی گو شعراء

عہدِ قدیم میں چترال کی وسعت کابل کے نواح سے لے کر گلگت تک پھیلی ہوئی تھی۔

---

(۱) مخزن لاہور ، جون ۱۹۲۷ء۔

لیکن اب اس کی حدود سمٹ کر ضلع چترال کی صورت اختیار کر چکی ہیں ۔ اس کو کھوستان یا کوہستان کہتے ہیں کیونکہ یہ کھوہ قبائل کا مسکن ہے ۔ چترال میں بولی جانے والی زبان کو کھوار کہتے ہیں ۔ اس لئے اس کا نام بھی کھوستان پڑ گیا ۔ عرفِ عام میں اسے قاشقار بھی کہتے ہیں ۔ چترال اپنی تہذیب و تمدن اور معاشی خوشحالی کی بنا پر کاشغر کی ٹکر کا علاقہ تھا اور پرانے زمانے کے لوگ کاشغر اور چترال میں باہمی مناسبت کے پیشِ نظر چترال کو کاشغرِ خورد کہا کرتے تھے اور یہ کاشغر سے ہو رفتہ رفتہ قاشقار بن گیا ۔

فارسی زبان یہاں ماوراء النہر ، افغانستان اور ترکستان سے پہنچی ۔ وہاں کے شہروں سے چترال والوں کے تجارتی اور دیگر مراسم ہوئے ۔ ان ممالک کی تجارت کے لئے وادیٔ چترال ایک شاہراہ کا کام دیتی تھی ۔ بہت سے خاندان اور قبیلے بھی چترال میں ایسے ہیں جو عہدِ قدیم میں تبدیلِ سکونت اور نقلِ مکانی کرکے ان علاقوں سے چترال آئے اور آباد ہوئے اور اپنے ساتھ فارسی زبان بھی لائے ۔ آہستہ آہستہ فارسی زبان یہاں کی علمی اور سرکاری زبان بن گئی ۔ کھوار زبان کا اگر لسانی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ فارسی کا چترالی زبان میں بڑا عمل دخل ہے ۔

فارسی زبان سرکاری زبان کی حیثیت سے چترال میں ۱۹۵۲ء تک رہی ۔ اس کے بعد اس کی جگہ اردو نے لے لی ۔ پہلے خواص اور عام سب کی نامہ و پیام کی فارسی زبان تھی ۔ مدرسوں اور مکتبوں میں ذریعۂ تعلیم یہی تھی ۔ فارسی ادب ان مدرسوں میں پڑھایا جاتا تھا ۔ چترال کی زندگی میں فارسی نے اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ نماز کی نیتیں اور نکاح کے خطبے تک فارسی میں ادا کئے جاتے تھے ۔

چترال میں فارسی زبان کے بہت سے شعراء اور ادباء پیدا ہوئے جنہوں نے نظم اور نثر دونوں میں تصنیفات چھوڑی ہیں ۔ افسوس ہے کہ یہ تمام کی تمام کبھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں سوائے ایک یا دو کے ۔ ہم نے یہاں صرف ان شعراء کے حالات درج کئے ہیں جن کی تصنیفات کے قلمی نسخے اب موجود ہیں ۔ ان شعراء کو شامل نہیں کیا گیا جو افغانستان سے آئے اور یہاں کچھ مدت رہ کر واپس چلے گئے اور اپنے پیچھے کوئی ادبی کارنامہ چھوڑ گئے ۔ مثلاً مرزا شیر احمد خان ملک الشعرائے امیر کابل جنہوں نے مرزا محمد غفران کی تالیف 'تاریخِ چترال' کو نظم کا جامہ پہنایا[1] ۔ شعراء کے حالات معلوم کرنے کے لئے ان

(۱) یہ کتاب ''شاہ نامہ چترال'' کے نام سے انجمن جنرال کے زیر اہتمام چھپ چکی ہے ۔

کے دواوین کے علاوہ 'تاریخِ چترال' سے مدد لی گئی ہے۔

۱۔ محمد شکور غریب

چترال میں ایک مشہور قبیلہ حاتم بیگے آباد ہے۔ محمد شکور کا تعلق اس قبیلے سے ہے۔ اس قبیلے کا نام محمد شکور کے والد حاتم بیگ کے نام سے حاتم بیگے پڑ گیا۔ محمد شکور کے ابتدائی حالات نہیں ملتے۔ محمد شکور کے خاندان میں اتالیقی کا عہدہ چلا آ رہا تھا، جس کے ذمے شاہی خاندان کے افراد کی تربیت کے علاوہ فوجی اور انتظامی امور کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ محمد شکور کا دادا گرگ علی اس منصب پر فائز تھا اور اس کے بعد اس کا باپ اور وہ خود بھی اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۷۶۰ء میں ایک جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے اور چترال خاص میں دفن ہوئے۔

چترال کے فارسی گو شعراء میں محمد شکور قدیم ترین شاعر ہے جس کا سراغ مل سکا ہے اور جس کے دیوان کا نسخہ موجود ہے۔ غریب تخلص تھا۔ اس کے دیوان میں کوئی سو کے قریب غزلیات ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی، قطعات، رباعیات، مخمسات اور چند قصائد بھی ہیں۔ نمونۂ کلام:

باغبان را میلِ گفتارم درین گلزار نیست ورنہ بلبل میشدی خاموش از آوازِ ما
ہوای شمع رخش چون فتاد بر سرِ ما شرارہ ریخت نفس مغزِ استخوانم سوخت

محمد شکور غریب فلسفیانہ مسائل پر بھی غور کرنے کے عادی تھے۔ مثلاً ان کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل دو شعر ملاحظہ ہوں:

نیست اندر دھر معلومم کہ من خود کیستم خود نمی دانم کہ ہستم در جہان یا نیستم
درمیانِ دو عدم دعوایٔ ہستی چون کنم ور بگویم نیستم اینک بعالم زیستم

۲۔ مولانا محمد سیَر، سیر

محمد شکور غریب کے بعد سب سے نامور شاعر اور عالم مرزا محمد سیر ہیں۔ ان کے والد صاحب کا نام دوست محمد تھا۔ ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ شاہ محترم شاہ کٹور ثانی (۱۷۸۸ء - ۱۸۳۸ء) کے دور کے شاعر ہیں۔ انہوں نے سمرقند، بخارا، قندھار اور بغداد کا سفر کیا۔ سرہند میں کافی مدت رہے۔ سیر و سیاحت کا اس قدر شوق

تھا کہ گھر لوٹتے تو پھر کہنا شروع کر دیتے :

بدہن آتش بیانی اے سیر ،نشیں بکوہستان زدل تنگی درونِ سنگ پنہاں چون شرار اینجا

چترال سے ۴۰ میل دور شمال کی طرف اپنے آبائی گاؤں شوگرام میں ان کا مزار ہے ۔

سیر کی تصنیفات میں سے دو بہترین کارنامے موجود ہیں ۔ ایک ان کی فارسی غزلیات کا دیوان ہے اور دوسرا "شاہنامہ" ہے جسے ۶۰ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا اور جو ۱۵۲۰ء سے ۱۸۳۸ء تک کے دور کی بڑی اچھی تاریخ ہے ، جس میں نہ صرف جنگی واقعات بیان ہوئے ہیں بلکہ عام معاشرتی حالات بھی لکھے ہیں جن سے اس دور کی چترالی معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ بہت سی جنگوں میں وہ خود بھی شریک رہے ۔ ہم ان کی ایک غزل اور شاہنامہ سے چند شعر پیش کرتے ہیں :

غزل

اے دردِ عشق را نوی درمان بیا بیا بر لب رسید بے تو مرا جان بیا بیا

بے آفتاب روی تو شب گشتہ روزِ من ای ہمچو صبح چاک گریبان بیا بیا

ہر زخمِ دل بیادِ تو چون گل شگفتہ است ای نازنین بسیرِ گلستان بیا بیا

جای تسلّیٔ تو بود کلبۂ سیر چون زلفِ خود مباش پریشان بیا بیا

شاہنامہ

زبان را چو آتش بر آورد تیز شد از قہر ہمچو فلک گرم خیز

بگفتا منم شاہِ فیروز بخت بجز من کہ باشد سزاوارِ تخت

ندالند قہرِ جہان سوزِ من سر لیزۂ تیز و دلدوزِ من

۳۔ شہزادہ تجمل شاہ محوی

آپ شاہ کٹور ثانی متوفی ۱۸۳۸ء کے فرزند ہیں ۔ 'تذکرۂ شعرائے کوہستان' از غلام مرتضی مرحوم میں آپ کے بارے میں درج ہے کہ سرآمدِ فضلاء تھے ۔ ان کی بہترین تصنیف 'قصیدۂ امالی' کی شرح ہے ۔ اس سے ان کے علم کا اندازہ ہوتا ہے ۔ سلوک اور معرفت میں بھی دسترس رکھتے تھے ۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھی ۔

'شرحِ قصیدۂ امالی' کا آغاز اس طرح سے کرتے ہیں :

''الٰہی غنچۂ امید بکشای گلی از روضۂ تحقیق بنمائی''

شعر و شاعری میں محوی تخلص تھا کلام کا دیوان موجود ہے جو ایک مرتبہ طبع بھی ہوا تھا ۔ آج کل صرف ایک ہی مطبوعہ نسخہ موجود ہے جسے ''انجمن چترال'' کے زیرِ اہتمام منعقد شدہ ''جشنِ چترال'' اکتوبر ۱۹۶۳ء میں پرانی کتب کی نمائش کے سلسلے میں پیش کیا گیا تھا ۔ یہ نسخہ اب شہزادہ محمد حسام الملک کے پاس موجود ہے ۔

۴۔ معظم خان اعظم

چترال سے آٹھ میل شمال مغرب کی طرف موضع سالی میں وزیر زادہ مظفر خان کے ہاں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی ۔ اجداد شاہانِ چترال کے وزراء تھے اور شاہی خاندان کے افراد کی تربیت ان کے ذمے تھی ۔ ۱۹۱۳ء میں وفات پا گئے ۔ شعر و شاعری میں اعظم تخلص کرتے تھے ۔ ان کا مجموعۂ کلام ملتا ہے ۔ بلند ہمت انسان تھے ۔ کلام میں بھی تمکنت اور وقار ہے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

ہیہات چو مجنون رہِ صحرا نگرفتم مقصودِ دلِ خویش ز لیلا نگرفتم
مانند درختی کہ بود بر سر کہسار شوقِ چمن و منت دریا نگرفتم
روزیکہ شدم معتکفِ گوشۂ ہستی غیر از غمِ تو در دلِ شیدا نگرفتم

۵۔ مرزا محمد غفران غفران

چترال کی تاریخ میں انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے ربعِ اول تک مرزا محمد غفران کی ہمسری کا دعویٰ شعر و ادب میں کوئی نہیں کر سکتا ۔ وہ بہترین شاعر اور ادیب تھے ۔ لمبی عمر پائی اس لئے چترال کے نہایت اہم واقعات ان کے سامنے ظہور میں آئے جنہیں نظم و نثر دونوں طرح سے انہوں نے اپنی تصانیف میں محفوظ کر لیا ۔ ان کی تاریخِ وفات ۳ نومبر ۱۹۲۶ء ہے ۔ وفات کے وقت عمر ۷۵ برس تھی ۔ شاہ امان الملک مہترِ چترال متوفی ۱۸۹۲ء سے لے کر اپنی وفات تک چترال کے والیان کے میر منشی اور مشیرِ خاص تھے ۔ عدلیۂ چترال کے صدر بھی رہے ۔ کئی اور حیثیتوں سے بھی ملازمت کی ۔ شاہ شجاع الملک (۱۸۹۶ء تا ۱۹۳۶ء) کے استاذ بھی رہے ۔

شاعری میں فارغ تخلص کرتے تھے ۔ تصنیفات درج ذیل ہیں :

۱۔ 'تشریح الاقاویل' : ذوالقرنین کی شخصیت اور یاجوج ماجوج پر تحقیقی رسالہ ہے ۔ غیر مطبوعہ ۔

۲۔ 'درج لآلی فی شرح الامالی' : قصیدہ امالی کی شرح ہے فارسی میں ۔

۳۔ 'توضیح ملائیہ چترال' : اسماعیلیہ فرقہ' چترال کے حالات پر تحقیقی رسالہ ہے ۔ غیر مطبوعہ ۔

۴۔ 'تاریخ چترال' : چترال کے قدیمی تاریخی حالات و واقعات پر فارسی میں بہترین کتاب ۔

۵۔ 'سفرنامہ' ہندوستان' : یہ مہتر شجاع الملک کے حکم سے لکھا گیا تھا ۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار کا مجموعہ بھی ہے ۔ انہوں نے معظم خان اعظم کا مرثیہ لکھا تھا ۔ اس کے تین اشعار ملاحظہ ہوں :

دریغا بلبل باغ فصاحت — کہ یعنی اعظم فرخندہ گفتار
برفت از دار فانی با دل ریش — چو بلبل از چمن یا گل ز گلزار
دریغا آن سخن سنج شکر ریز — بکرد احباب را محروم دیدار

۶۔ محمد ناصر الملک ناصر

سر شجاع الملک مہتر چترال کے سب سے بڑے لڑکے ہیں ۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۹۷ء مطابق یکم جمادی الاول ۱۳۱۵ھ کو پیدا ہوئے ۔ مرزا غفران نے تاریخ کہی ''گل خندن از گلزار شاہی'' یعنی ۱۳۱۵ھ ۔ ابتدائی تعلیم چترال میں حاصل کی اور اسلامیہ کالج پشاور سے بی ۔ اے کی ڈگری لی ۔ برطانوی فوج میں کپتان ہوئے اور بعد میں انڈین سول سروس میں بھی رہے ۔ صوبہ سرحد میں اسسٹنٹ کمشنر تھے ۔ ۱۹۳۶ء کو مہتر شجاع الملک کی وفات پر چترال کے مہتر بنے ۔ برطانیہ سے سی ۔ آئی ۔ ای کا خطاب بھی حاصل کیا ۔ ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے رکن تھے ۔ ۲۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو فوت ہوئے ۔ انتظام حکومت میں ہمیشہ عدل و انصاف کو پیش نظر رکھا اور چترال کی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ۔ موجودہ ہائی سکول چترال کے بانی ہیں ۔

آپ فارسی ، عربی اور انگریزی کے عالم تھے۔ آپ کی تصنیفات طبع ہو چکی ہیں۔ 'تحفۃ الابرار' اور 'مشرق الانوار' نظم میں دو چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ 'صحیفۃ التکوین' ان کی مثنوی ہے جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں۔ اس میں جدید یورپین فلاسفی اور سائنسی نظریات و اختراعات کے ساتھ رموزِ حکمت اور اسرارِ قرآنی کی تطبیق پیش کی ہے۔ یہ مثنوی اتحاد پریس لاہور میں طبع ہوئی۔ ہر فصل کی ابتدا آیۂ قرآنی سے کی ہے۔ موضوع خشک تھا لیکن انہوں نے اپنے تخیّل سے اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :

غور باید کرد اندر امرِ کُن — شرک را بر کند آن از بیخ و بن
مادہ خود باشد چو محکومِ خدا — امرِ کُن کافیست بہرِ ارتقا
پس شریکے را نماند احتیاج — امرِ کن داروی دردِ لا علاج
در جہان مانند منّور تا ابد — نامِ احمد ختمِ توحید احد
گرچہ او با خاکیان در خاک بود — رتبتِ او بر تر از افلاک بود

آخری عمر میں مرضِ فالج میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس وقت ایک مناجات لکھی۔ ملاحظہ فرمائیے کیا روانی اور سوز و گداز ہے :

بحقِ جملہ خاصانِ یگانہ — ز وقتِ مصطفیٰ تا این زمانہ
بمن دہ صحتِ گم کردۂ من — بدہ جانم بجسمِ مردۂ من
خداوندا عطا کن تندرستی — نجاتم دہ ز رنج و ضعف و سُستی
تنم رنجور و مفلوج و ضعیف است — ز پا افتادہ چون مورِ نحیف است
خداوندا چہ علت رو بمن شد — کہ حالم عبرتِ اہلِ وطن شد
مرا دہ باز آن تاب و توانم — میاور نقص در نطقِ لسانم
خداوندا ز الطافِ نہانی — مکن شل دست و پایم در جوانی

۷۔ حبیب اللہ فدا

حبیب اللہ فدا برنس (چترال) کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ مقامی مدرسے میں کئی سالوں تک معلم دینیات رہے۔ ابتدائی تعلیم چترال میں اور مزید تعلیم پیشاور کے بعد

علمائے ہند سے حاصل کی ۔ فدا تخلص کرتے تھے ۔ غزلیات کا دیوان موجود ہے جو غیر مطبوعہ حالت میں ہے ۔ اوائل ۱۹۷۰ء میں فوت ہوئے ۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :

معی میدارد زمان دائم چو در آزار من — پس چہ سان گرمی دھد خود را زہی بازار من
نزد ہموطنان بود کمتر ز حنظل‌های خشک — آہ! جملہ غیرت شہد و شکر گفتار من
بر خلافم گر ہمہ عالم شود یکسر فدا — دانہ ہم کم نیارد گرد از انبار من

۸۔ شہزادۂ عزیز الرحمان بیغش

ہز ہائی نس محمد ظفر الملک مہتر چترال کے تیسرے فرزند ہیں ۔ ۱۷ مارچ ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم شاہی قلعے میں حاصل کی ۔ بعد میں مقامی ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ۔ شعر و شاعری میں بیغش تخلص کرتے تھے ۔ ان کے کلام میں سوز ہے ۔ آج کل چترال میں مقیم ہیں ۔ نمونۂ کلام :

نمی خواہم نقاب ار صورت احوال من افتد — کہ در جمعیت دلہا خلل از حال من افتد
مرا بے حاصلی برداشت از یاد چمن ہمدم — مگر ابری بفکر سبزۂ پامال من افتد

چترال نے فارسی کے نثر نگار بھی پیدا کئے ہیں ۔ ایک قاضی اقرار الدین ہیں جنھوں نے مسائل فقہ پر ایک کتاب فارسی میں لکھی ۔ ۱۹۳۸ء میں چترال کے قاضی القضاۃ تھے ۔ دوسرے غلام مرتضی ہیں ۔ مرزا محمد غفران کے فرزند تھے ۔ پہلے ان کی 'تاریخ چترال' کی تکمیل کی اور حالات کو ۱۹۶۱ء تک لائے ۔ ۱۹۶۲ء میں اس کا اردو ترجمہ شائع کیا ۔ ۱۹۷۱ء میں فوت ہوئے ۔

☆ ☆ ☆

تیسرا باب

تاریخ

اس جلد کے پہلے حصے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے برِ صغیر پاکستان و ہند میں فارسی کا چلن روز بروز کم ہونا شروع ہو گیا تھا ، جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۳۴ء سے فارسی سرکاری اور عدالتی زبان نہ رہی تھی بلکہ اس کی جگہ اردو اور انگریزی نے لے لی تھی ۔ فارسی اب عام بول چال کی زبان بھی نہیں تھی اور ایسے لوگوں کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی جنہیں اس سے کوئی خاص شغف ہو یا جو اس میں کافی مہارت رکھتے ہوں ۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس زمانے کی کئی ایک ایسی کتابیں جو فارسی میں لکھی جا سکتی تھیں اردو میں لکھی گئیں کیونکہ ان کے مصنفین کو یہ حقیقت معلوم تھی کہ ان قارئین کا حلقہ جو فارسی پر عبور رکھتے ہوں اب تنگ ہو چلا تھا اور فارسی کتب بینی کا شوق تقریباً ختم ہوتا جا رہا تھا ۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی ضخیم 'تاریخِ ہند' اردو میں لکھی حالانکہ وہ فارسی کے مستند عالم تھے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برِ صغیر کے پڑھے لکھے لوگ اب فارسی سے کلیۃً نابلد ہو گئے تھے ۔ ان میں اب بھی بہت سے اچھے فارسی دان موجود تھے جو فارسی میں تصنیف و تالیف کی اہلیت رکھتے تھے اور جن میں سے بعض نے اس زبان کی عام کساد بازاری اور کس مپرسی کے باوجود اس میں چند کتابیں تصنیف کیں لیکن حالاتِ زمانہ کے زیرِ نظر یہ بات اب ایک ادبی تعیش سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی یا محض تفنّنِ طبع کا ایک مظاہرہ بن کر رہ گئی تھی ۔

تاہم فارسی کی جانب عوام کی اس فی الجملہ بے اعتنائی اور بے رخی کے مقابلے میں اس دور میں ایک غیر متوقع قوت برسرِ کار تھی اور وہ برِّ صغیر کے نئے حاکموں یعنی انگریزوں کی فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں سے دلچسپی تھی ، جس کی بنا پر انہوں نے جدید طرز کی یونیورسٹیوں کے پہلو بہ پہلو ۱۸۸۱ء میں کلکتہ مدرسے کی ، ۱۸۰۰ء میں

کلکتہ فورٹ ولیم کالج کی ، ۱۸۶۴ء میں دہلی عربک کالج اور ۱۸۷۰ء میں لاہور یونیورسٹی (اورینٹل) کالج کی بنیاد رکھی - انگریزوں نے فارسی زبان کو شروع میں ضرورتاً (اس لئے کہ حکومت کے تمام سابقہ کاغذات فارسی میں تھے اور بر صغیر کے والیانِ ریاست سے خط و کتابت کا وہی ایک واحد ذریعہ تھی) اور بعد ازاں شوقیہ طور پر سیکھنا شروع کیا اور بہت سے انگریزی حکام ایسے تھے جنھوں نے فارسی زبان و ادب کی سرپرستی کی اور یہاں کے باشندوں کو فارسی میں کتابیں تصنیف کرنے کی ترغیب دی - اس جلد کے پہلے حصے میں ہم کئی ایک ایسی کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں جو انگریزی حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے یا ان کے براہِ راست ایماء و اشارے سے مرتب کی گئیں ، مثلاً 'تاریخِ ہنری' از سید محمد باقر خان ولد حضرت شاہ کلیم اللہ بخاری جو ایک انگریز افسر دیوانی ہنری پڈکاک[1] کے نام پر لکھی گئی تھی ، یا 'عماد السعادت' از سید غلام علی رضوی ولد سید محمد اکمل خان جو لکھنؤ کے مشہور انگریز ریزیڈنٹ جان بیلی[2] کی فرمائش پر تصنیف ہوئی ، یا 'حقیقتہای ہندوستان' از لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی جو ایک اور انگریز افسر ولیم کرک پیٹرک[3] کے نام سے منتخب ہے ، اور یا 'حدیقۃ الاقالیم' از مرتضیٰ حسین جو وارن ہیسٹنگز کے فارسی سیکرٹری جوناتھان سوفٹ[4] کا منشی تھا - اس کے علاوہ ہم فارسی کی ایک ایسی تاریخی کتاب کا بھی ذکر کر چکے ہیں جسے خود ایک انگریز نے بڑی محنت و کاوش سے تالیف کیا تھا ، یعنی 'مفتاح التواریخ' از تھامس ولیم بیل جو قطعاتِ تاریخی کا ایک کارآمد اور دلچسپ مجموعہ ہے ، جنھیں زمانے کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے اور جس میں خود مولفِ کتاب اور اس کے بعض احباب نے کئی طبع زاد قطعات کا بھی اضافہ کیا ہے - اسی طرح ہندوؤں کو سکندر لودھی کے عہدِ حکومت سے جو شوق و شغف فارسی سے پیدا ہو گیا تھا وہ بھی ایک حد تک تاحال باقی تھا ، جس کی مثال یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء کے قریب مشہور بنگالی مصلح راجا رام موہن رائے نے فارسی میں ایک رسالہ 'تحفۃ الموحدین' کے نام سے لکھا -

زمانۂ زیرِ بحث میں نہ صرف یہ کہ بہت کم ایسی کتابیں ملتی ہیں جو تاریخ سے

---

(1) Henry Pidcock

(2) John Baillie.

(3) William Kirkpatrick.

(4) Jonathan Swift.

متعلق ہوں اور فارسی میں لکھی گئی ہوں ، بلکہ جن تھوڑی بہت کا پتا چلتا ہے ان کا موضوعِ سخن اور دائرۂ بحث بھی تنگ سے تنگ تر ہوتا جاتا ہے ۔ ان میں سے زیادہ تر برِّ صغیر کے کسی ایک صوبے یا شہر ، کسی ایک حکمران خاندان یا کسی ایک بادشاہ کے عہد حکومت سے متعلق ہیں ، اور یا پھر کسی ایسے بڑے واقعے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں جسے برِّ صغیر کی متأخر تاریخ میں کوئی خاص مقام حاصل ہے ، چنانچہ اس جلد کے پہلے حصے میں ہم ایک سے زائد ایسی کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں ۔ زمانہ زیرِ بحث میں ایک ایسا واقعہ جس کی صدای باز گشت برِّ صغیر کے طول و عرض میں سنائی دی اور جس کا اثر یہاں کے باشندوں کے دل و دماغ پر عرصے تک رہا ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تھا ، جسے برطانوی حکام نے غدر یا بغاوت کا نام دیا لیکن جسے محبِّ وطن باشندے جنگِ آزادی کہتے ہیں ۔ اس واقعے کے اسباب کیا تھے اور اس کے محرّکات کی حقیقی نوعیت کیا تھی ؟ یہاں ان سوالوں پر بحث کی گنجائش نہیں ہے لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے برِّ صغیر کے ایک بڑے حصے میں تہلکہ مچا دیا تھا اور اس کے نتیجے میں افسوسناک خونریزی اور لاکھوں افراد کی خانماں بربادی کے علاوہ برِّ صغیر میں اسلامی حکومت کے باقی ماندہ دھندلے آثار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا ۔ جن لوگوں نے اس ہنگامے کے حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان میں سے بعض کو قدرتی طور پر انہیں قلم بند کرنے کا خیال پیدا ہوا ، چنانچہ ہم اس ضمن میں پنڈت کنہیا لال کی تاریخ 'بغاوتِ ہند یا محاربۂ عظیم' کا ذکر کر چکے ہیں جو بعض مصلحتوں کی بنا پر فارسی کی بجائے اردو میں لکھی گئی تھی ۔ اسی نوعیت کی ایک اور کتاب سرسیّد احمد خان نے بھی 'اسبابِ بغاوت ہند' کے نام سے تصنیف کی اور یہ بھی اردو میں لکھی گئی ۔ لیکن اس ہنگامے سے متعلق ایک کتاب عربی میں لکھی گئی ۔ یعنی مولوی فضل الحق خیر آبادی کی 'مقدمۃ الشّورہ الہندیہ'[۱] ۔ مولوی صاحب موصوف کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جلا وطن کر کے جزائر انڈمان بھیج دیا گیا تھا ۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے لوگوں کو انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا ۔ مولوی صاحب ایک طویل عرصے تک شدید مصائب برداشت کرنے کے بعد ۱۸۶۱ء میں

---

(۱) اس کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی فضل الحق کا ارادہ ایک زیادہ مبسوط تاریخ لکھنے کا تھا جو پورا نہ ہو سکا ۔

بحالت جلاوطنی انتقال کر گئے اور اپنے پیچھے اپنے مشاہدات اس تصنیف کی شکل میں چھوڑ گئے - کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ردی کاغذوں پر کوئلے سے لکھی تھی اور ان کے انتقال کے بعد ان کا ایک رفیقِ قید و بند اس کا نسخہ اپنے ہمراہ لایا تھا جو ۱۹۳۰ء میں بجنور میں چھپ چکا ہے - دوسری ایک اور کتاب جو اسی موضوع پر ہے میرزا اسد اللہ خان غالب کی 'دستنبو' ہے جو فارسی میں لکھی گئی تھی - غالب نے ۱۸۵۷ء کے پُرآشوب واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور انہیں خود انگریزی حکومت کی جانب سے دار و گیر کے اندیشے سے کچھ عرصہ اپنے گھر میں روپوش رہنا پڑا تھا - اس کتاب کا مفصل ذکر ہم آگے کریں گے[1] -

۱۸۵۷ء کی ناکام تحریکِ آزادی کے بعد ایک اور بڑا واقعہ جو زمانہ زیر بحث میں ظہور پذیر ہوا وہ ۱۹۴۷ء میں برِ صغیر کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں قیامِ پاکستان تھا - اس سلسلے میں جو کشت و خون ، قتل و غارت ، لاکھوں انسانوں کا ترکِ وطن اور دوسرے ہولناک اور لرزہ خیز واقعات دیکھنے میں آئے ان کی یاد ابھی تک زندہ ہے - بہت سے ادیبوں اور مؤرخوں نے اس ہنگامے کو اپنا موضوعِ سخن بنایا - لیکن اس وقت فارسی کی جانب بے اعتنائی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کسی کو اس زبان میں کچھ لکھنے کا خیال تک نہ آیا اور جتنی کتابیں تقسیمِ برِصغیر اور تاسیسِ پاکستان پر اب تک لکھی گئی ہیں وہ یا تو انگریزی میں ہیں اور یا اُردو اور برِ صغیر کی دیگر زبانوں میں - واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک راقمِ حروف کو علم ہے زمانۂ حال میں نہ صرف تاریخ کی بلکہ فارسی نثر کی کوئی بھی قابلِ ذکر[2] کتاب تصنیف نہیں ہوئی اور فارسی دانی کی روایت تقریباً ختم ہوتی جا رہی ہے - یہ ضرور ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے فارسی زبان بولنے والی اقوام ، بالخصوص ایرانیوں سے علمی اور ثقافتی تعلقات کا از سرِ نو احیاء ہؤا ہے اور نوجوان طبقے کے بعض افراد میں فارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہوتا جا رہا ہے لیکن آج کل جس زبان کی طرف زیادہ تر توجہ ہے وہ ''جدید'' فارسی ہے جو اس قدیم یا کلاسیکی زبان سے دور اور دور تر ہوتی جا رہی ہے جس کی روایت برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد پر قائم ہوئی اور جس کی نشو و نما میں یہاں کے باشندوں نے ایرانیوں کے دوش بدوش حصہ لیا تھا - چنانچہ یہ

---

(۱) اس کتاب کے علاوہ بعض اور کتابوں کا بھی مختصر ذکر کیا جائے گا -

(۲) فارسی نثر میں بعض بڑے قابلِ دید تذکرے لکھے گئے ہیں - ان کا ذکر بعد میں آ رہا ہے - (ادارہ)

بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان دنوں جو لوگ اس فارسیٔ جدید کا تھوڑا بہت علم حاصل کر بھی لیتے ہیں وہ فارسی کی کلاسیکی نظم و نثر کی کتابوں کو کماحقہ سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ۔ انوری اور خاقانی کے قصائد بعض درسگاہوں کے فارسی نصابِ تعلیم میں اب بھی شامل ہیں ، لیکن کتنے لوگ ہیں جو ان سے پوری طرح مستفید اور بہرہ یاب ہو سکتے ہیں اور ان کے معانی و مطالب پر پورا عبور حاصل کر سکتے ہیں یا 'تاریخِ وصّاف' ، 'انشای ابوالفضل' اور 'وقائع نعمت خان عالی' کو سمجھنے کی قدرت رکھتے ہیں ؟ رفتارِ زمانہ کے اس رجحان کو غالب اپنے زمانے میں ہی بخوبی بھانپ گئے تھے اور اگرچہ وہ کم از کم شروع میں ، اپنے فارسی کلام کو اپنا سرمایۂ ناز سمجھتے رہے اور کہتے ہیں کہ :

فارسی بین تا ببینی نقشہای رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منِ است

تاہم انہوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں توجہ زیادہ تر اردو شاعری کی جانب مبذول رکھی اور عجیب بات یہ ہے کہ یہی شاعری ان کی دوامی شہرت کا باعث بنی ۔ ان کی یہ پیش گوئی کہ :

ہی چہ میگویم اگر اینست وضعِ روزگار دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن
چشمِ کور آئینۂ دعویٰ بکف خواہد گرفت دستِ شل مشاطۂ شعر و سخن خواہد شدن

حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور فارسی دانی کی قدیم اور شاندار روایت اس آخری دور میں آ کر دم توڑ گئی ۔

ایک اور بات جو اس دور کی معدودے چند فارسی تواریخ کے مطالعے سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سلیس اور سادہ زبان لکھنے کا رجحان بڑھتا گیا ہے ، لیکن اس کے ساتھ ہی زبان کی وہ متانت اور فصاحت ، وہ شیرینی اور دلکشی جو کسی زمانے میں اس کا طرۂ امتیاز تھی کم ہوتی گئی ہے ۔ تاریخ نویسی میں بے جا شکوۂ الفاظ ، عبارت آرائی اور رنگینیٔ اسلوب چنداں ضروری نہیں اور عبارت کی سادگی بہرحال ایک خوش آیند چیز سمجھی جا سکتی ہے ، لیکن اگر سادگی کے ساتھ اس میں بے ربطی ، بدمزگی اور محاورۂ زبان سے انحراف بھی پیدا ہو جائے تو اسے یقیناً مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس قسم کے عیوب ان متاخّر تاریخی کتابوں میں خاصے نمایاں ہیں ، جس کا اندازہ ان اقتباسات سے ہو جائے گا جو ہم آگے چل کر دیں گے ۔ تاہم ہمارا اصل مقصد یہاں ان کتابوں کی ادبی قدر و قیمت کو پرکھنا

نہیں ہے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے ان کی افادیت اور اہمیت کا جائزہ لینا ہے ، لہٰذا ہم اپنی بحث کو زیادہ تر اسی نقطۂ نظر کا پابند رکھیں گے ۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم اس زمانے کی بعض معروف تاریخی کتابوں کا حال فرداً فرداً لکھتے ہیں ، مگر اس سے پہلے یہ جتا دینا ضروری ہے کہ ان میں سے کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن کا زمانۂ تصنیف ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے ، لیکن چونکہ مقالے کے پہلے حصے میں ان کا ذکر نہیں کیا جا سکا اس لئے انھیں اس حصے میں شامل کر لیا گیا ہے ۔ ان میں صرف ایک کتاب (نمبر ۱) ایسی ہے کہ جسے علمی یا عمومی تاریخ کی ذیل میں جگہ دی جا سکتی ہے ۔ باقی سب کے موضوع بحث مخصوص اور دائرۂ بیان محدود ہے ۔

(۱) **یادگارِ بہادری** ۔ مصنفہ بہادر سنگھ ولد ساری مل جو گنڈیوال بھٹناگر کائستھ تھا ۔ یہ ضخیم تاریخ ۲۰۸۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ مصنف غازی الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ گیا اور وہاں اسے اس شہر کے کتب خانوں میں تاریخی کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا اور ایک مفصل تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا ۔ اس نے کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ کتاب تیار کی اور اس کا نام اپنے ہی نام پر 'تاریخِ بہادری' رکھا ۔ وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس نے اس تاریخ کا سب مواد سابقہ کتابوں سے لیا ہے اور کہیں اپنی رائے کا اظہار یا اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ، باوجود اس کے کہ وہ کہتا ہے کہ ان کتابوں کے مطالعے سے پتا چلا کہ تواریخ میں سچ کے ساتھ بہت سی باتیں جھوٹ بھی لکھی گئی ہیں ۔ اس وجہ سے اس تاریخ میں بمشکل ہی کوئی چیز ایسی ملتی ہے جو اس سے پہلے کی تاریخوں میں موجود نہ ہو ۔ تاہم اودھ کے نوابوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بعض نئے اور چشم دید حالات و واقعات کا بھی اضافہ کیا ہے ، لیکن اس کتاب میں تاریخی واقعات کے علاوہ کئی اور قابلِ قدر معلومات موجود ہیں ۔ مثلاً ہند و مذہبی فرقوں کے بارے میں ، برِّ صغیر اور دیگر ممالک کے شعراء کے متعلق اور کارآمد فنون اور جغرافیے کے سلسلے میں ۔ کل کتاب چار جلدوں میں منقسم ہے بہ ترتیبِ ذیل : جلد اول : پیغمبروں کی تاریخ ، جلد دوم :

(۱) اسٹوری (سیکشن ۲ ، کراسہ ۱) نے یہ نام گوبند ایوال لکھا ہے ۔ منشی سدا سکھ لال نے تاریخ بہادری کے ایک معتدبہ حصے کا انگریزی ترجمہ کیا تھا جو برٹش میوزیم میں موجود ہے (وہی کتاب ، ص ۱۴۹) ۔

(سات ابواب) خلفای راشدین ، بنو امیہ ، بنو عباس ، اسماعیلیوں ، سید خاندانوں اور شرفای مکہ و مدینہ کے حالات ، جلد سوم : (سات ابواب) یونان اور یورپ کے دیگر ممالک نیز ہندوستان اور ایران کے فلاسفہ و حکماء (بشمول زرتشت) ، اصحاب رسول صلعم ، تابعین ، صوفی ، مشائخ اور ہندو رشیوں اور شعرای عرب کا ذکر ، مختلف رسوم خط ، شعرای ہندوستان ، علم عروض ، علم قیافہ ، علم تعبیر رویا ، ہندوستان کے علم حبس دم ، علم نجوم اور نجومیوں ، موسیقی ، زراعت ، معماری ، آہن گری ، نجاری ، تجارت ، مصوری ، طلسمات و سحر ، مختلف قسم کی صنعتوں (جس میں کھانا پکانے کا فن بھی شامل ہے) حکماء اور بذلہ سنج ظرفاء کے اقوال ، مشاہیر اسلام وغیرہ کا حال ، جلد چہارم : (مقدمہ اور آٹھ ابواب) مقالے میں مصنف نے پرانی اور نئی دنیا کی کیفیت بیان کی ہے اور یہاں کے شہروں کا ذکر کیا ہے ۔ آگے چل کر اس نے شاہان ایران ، سلاطین عرب و روم ، فرمانروایان مصر و شام و ترکستان ، بادشاہان یورپ ، برصغیر میں انگریزوں کی حکومت اور ان کے نظم و نسق ، ہندوستان کے حکمرانوں ، اور یہاں کے مختلف صوبوں اور باشندوں کا حال تحریر کیا ہے ۔ آخری باب میں برہمنوں ، ہندو رسوم ، اوتاروں ، قدیم ہندو راجاؤں ، دہلی کے مسلمان بادشاہوں (قطب الدین ایبک سے لے کر اکبر شاہ ثانی تک) مالوا ، دکھن ، کشمیر ، بنگال ، جونپور ، سندھ ، اودھ اور مرہٹوں کا حال لکھا ہے ۔ ایلیٹ نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں اس کتاب کا صرف ایک نسخہ معلوم تھا اور وہ اس نے لکھنؤ میں اپنے کتب خانے کے لئے خریدا تھا ۔ اس نے اپنی تاریخ ہند کی آٹھویں جلد میں اس کتاب کے کئی اقتباسات کا انگریزی ترجمہ دیا ہے جو قنوج اور نوابان اودھ سے متعلق ہیں ۔ 'تاریخ بہادری' کے اس مختصر سے تجزیے سے اس کی جامعیت اور متنوع حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اور اگر بالفرض اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے تو بھی اتنی متفرق معلومات کو یک جا جمع کر دینا اور اس آخری دور میں فارسی کی ایک اتنی ضخیم کتاب تصنیف کرنا بجائے خود قابل داد ہے ۔ مصنف کو بظاہر کشمیری پنڈتوں سے کوئی ذاتی عناد تھا کیونکہ اس نے ان کے بارے میں بہت بری رائے کا اظہار کیا ہے[1] ۔

(۲) 'جونپور نامہ' تاریخ جونپور ۔ از مولوی خیر الدین محمد الہ آبادی ۔ مصنف نے

---

(۱) دیکھیے ایلیٹ ، ج ۸ ، ص ۱۷۴ ببعد (مطبوعہ الہ آباد ۱۹۶۴ء) ۔

جونپور کی یہ مفصل تاریخ ایک انگریز ڈسٹرکٹ جج[1] کی فرمائش پر لکھی اور ۱۸۹۶ء میں اسے مکمل کیا ، لیکن اس کی تکمیل سے پہلے اس جج کا تبادلہ ہو گیا اور وہ جونپور سے چلا گیا ۔ چنانچہ مصنف نے اسے اس کے جانشین[2] کے نام منتسب کیا ہے ۔ وہ دیباچے میں لکھتا ہے کہ :

''چون در سنہ یک ہزار و ہفصد و نود و شش عیسوی مسٹر ابراہیم ولند صاحب جہت عدالت شہر جونپور مامور شدہ رسید بتماشای حیرت افزای گزشتگان این شہر متحیر گردید ، بقول شخصی :

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانہ
ہست خود آن دفتر احوال صاحب خانہ

از اکثر اعزہ شہر آغاز بنای این شہر و احوال عمارات شکستہ و مساجد و مقابر آن پرسید ، سخنی کہ موجب تسلی خاطرش می شد از کسی نہ شنید ، ناگزیر ازین فقیر برای تحریر سوانح فرمانروایان جونپور و کوائف این عمارات و آغاز بنای ہر محلہ و حدود آن مع طول و عرضش تمنای بلیغ ظاہر ساخت و دوبوال شہر را با چند متصدی و معمار بفرمان پذیریم برگماشت ، ناگزیر روی تحقیقات این حالات افتادم و از کتب تواریخ و سفائن سخنوران و وسائل دانشمندان و ارشادات بزرگان و مکتوبات نواحی عمارات و مقابر ہر چہ از ہر جای یافتم در سلک تحریر می کشیدم ۔''

جب کتاب کی تکمیل سے پہلے مسٹر ولند چلے گئے اور ان کی جگہ مسٹر جان ڈین آ گئے تو مصنف نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ :

چہ شد گر نیکوئی رفت از بر تو
ازو نیکو تر آمد بر سر تو

اور اپنا کام جاری رکھا ۔

---

(۱) مصنف نے اس کا نام ابراہیم ولند لکھا ہے اسی Abraham Welland کی فرمائش پر مولوی خیرالدین نے تحفہ تازہ یا بلونت نامہ بھی لکھا تھا (دیکھئے اسٹوری ، سیکشن ۲ ، کراسہ ۳ ، ص ۷۰۲) ۔

(۲) مسٹر جان ڈین (John Deane) ہے۔

کتاب میں ایک مختصر سا مقدمہ (در بیان شہرت و عزت شہر جونپور ، ۴۲ صفحات) اور چار ابواب بہ تفصیل ذیل ہیں : باب اول در احوالِ سلاطین جونپور و حکامِ آن تا عہدِ فیروز شاہ (۲۸ صفحات) ، باب دوم : در بیانِ ابتدای بنای ہر یک از اماکنِ باستانی باب سوم ، در آغازِ آبادیٔ ہر یکی از محلاتِ این شہر و برخی از حالاتِ کدخدایانِ آن ، باب چہارم : در بیان محالاتِ قدیم سرکارِ جونپور و پرگناتی کہ الحال شامل این ضلع شدہ - باب دوم میں جو خاصا طویل ہے ، جن قدیم عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں مندرجۂ ذیل شامل ہیں : قلعۂ کرارکوٹ ، مسجدِ آٹالہ ، مسجدِ جامع الشرق (بنا کردۂ ابراہیم شرقی) ، مسجدِ خالص مخلص ، مسجدِ چاچک پور ، مسجدِ بی‌بی راجی (زوجۂ محمود شرقی بن ابراہیم شرقی) ، مسجدِ نواب محسن خان ، مسجدِ شاہ کبیر ، مسجدِ مستجاب الدعوات ، مسجدِ عیدگاہ وغیرہ - مصنف نے اس پل کا بھی ذکر کیا ہے - (ص ۶۰) جو اکبر کے عہد میں منعم خان خان خانان کے اہتمام سے دریای گومتی پر تعمیر کیا گیا تھا - اس کے علاوہ اس نے اطرافِ جونپور کے کئی اور پلوں کا حال بھی لکھا ہے - تیسرے باب میں شہر کے متعدد محلوں کا خاصا تفصیلی ذکر ہے اور ہر محلے کی جاذبِ توجہ عمارتوں کی کیفیت بھی بیان کی گئی ہے - صفحہ ۱۰۰ پر سکھوں کی ایک ''سنگت[1]'' کا ذکر ہے جہاں وہ دسہرہ ، دیوالی اور ایکادشی[2] کے تہواروں پر جمع ہوتے تھے اور اسی ضمن میں سکھوں کی مختصر سی تاریخ بھی دی گئی ہے -

مطبوعہ کتاب کے آخر میں دریای گومتی کی دو بڑی طغیانیوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو ۱۸۷۱ء اور ۱۸۹۴ء میں آئی تھیں - یہ بیان اردو میں ہے[3] - 'تاریخ جونپور' کل ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے - اسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہے اور مصنف نے بے جا عبارت آرائی سے اجتناب کیا ہے - ۱۷۹۴ء میں بقولِ مصنف شہرِ جونپور میں ۶۸۹ مکان تھے ، کل آبادی ۲۵۵۳۱ تھی اور اس میں ۶۷ محلے آباد تھے - اس تاریخ کا ایک مطبوعہ نسخہ (جس سے راقمِ حروف نے استفادہ کیا ہے) پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں جومود ہے - یہ ۱۸۹۹ء/۱۳۱۷ھ میں جادو پریس جونپور میں طبع ہؤا تھا - اس کی چھپائی لیتھو

---

(۱) جای اجتماع ، عبادت گاہ ، مراد گوردوارے سے ہے -

(۲) چاند کے مہینے کی گیارھویں تاریخ -

(۳) یہ یقیناً بعد کا اضافہ ہے -

اور کاغذ حمائی ہے - بعض جگہ غلطیاں بھی ہیں -

جونپور نامہ کا مسٹر پوگسں[1] نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا (دیکھئے ایلیٹ و ڈاؤسن ، ج ۸ ، ص ۲۳۷) - خیر الدین الہ آبادی دو اور معروف کتابوں کا بھی مصنف ہے جن کا ذکر ہم اس جلد کے پہلے حصے میں کر چکے ہیں ، یعنی 'بلونت نامہ' ، جو بنارس کے ہندو راجاؤں کی تاریخ پر مشتمل ہے اور 'عبرت نامہ' جس میں ۱۷۹۰ء تک کے تاریخی حالات بیان کئے گئے ہیں - اور جو زیادہ تر اکبر شاہ ثانی اور شاہ عالم کے عہدِ حکومت کے واقعات پر مشتمل ہے - خیر الدین نے مرہٹوں اور مسٹر اینڈرسن[2] کے مابین گفت و شنید میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں جن کے صلے میں اسے انگریزی حکومت کی طرف سے پنشن ملی - بعد ازاں وہ لکھنؤ چلا گیا اور نوابِ اودھ سعادت علی خان کا حاشیہ نشین ہو گیا - 'جونپور نامہ' کا وہ حصہ جس میں شہر کی تاریخی عمارتوں کا حال ہے یقیناً بہت کار آمد ہے اور غالباً ان عمارتوں کا اس قدر مفصل حال کسی اور کتاب میں نہیں مل سکتا - نذیر الدین احمد نے اس کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جو ۱۹۲۱ء میں جونپور میں چھپا[2] -

(۳) 'تاریخِ گلزار آئینہ' (تاریخ دکھن) - از خواجہ غلام حسین خان المخاطب بہ خان زمان خلف محمد باقر خان مسیح الملک حکیم الممالک جو میر نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کے معالجِ خاص تھے - یہ کتاب ایک مقدمہ (در اصلِ مؤلف) اور چار ابواب پر مشتمل ہے ، بہ تفصیلِ ذیل : باب اول در ذکرِ سلاطین منتسب شاہیہ (ص ۸ تا ۵۵) باب دوم : در ذکرِ احوالِ سریر آرایانِ دکھن (ص ۵۵ تا ۱۵۷) ، باب دوم : در ذکرِ احوالِ وزیران و امیران و سروران و منصبدارانِ دربارِ جہان مدارِ آصفیہ (از ص ۱۵۷ تا ۵۱۰) ، باب چہارم : در ذکرِ جمیع کامل شش جہت صوبہ' مملکتِ دکھن (ص ۵۱۰ تا ۵۸۹) - آخر میں ایک ''تماشا'' ہے جو مندرجہ' ذیل دو فصلوں پر مشتمل ہے : فصل اول در ذکر وکلای انگریز بہادر ، فصل دوم در بیان آبادی بیگم بازار - پوری کتاب ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے -

---

(۱) W. R. Pogson (2) Anderson

(۲) جونپور نامہ کے لئے دیکھئے نیز C. A. Storey : Persian Literature سیکشن ۲ ، کراسہ ۳ ، لنڈن ۱۹۳۹ء (ص ۶۹۸ تا ۶۹۹) - اس کے مطابق پہلا ایڈیشن ۱۸۷۸ء میں چھپا تھا -

مقدمے میں مصنف نے اپنے خاندان کے جو حالات بیان کئے ہیں ، ان کی رو سے وہ حکیموں کے ایک قدیم اور مشہور خاندان سے تھا ۔ اس کے دادا حکیم محمد صابر خان اور والد حکیم الملک مسیح الدولہ خواجہ محمد باقر خان نظام علی خان آصف جاہ کے معالج تھے اور نظام نے انہیں جاگیر ہفت ہزار ذات اور دیگر جاگیریں عطا کر رکھی تھیں ۔ اس کے والد ۱۷۸۸ء/۱۲۰۳ھ میں انتقال کر گئے تھے اور انہوں نے چار بیٹے اپنی یادگار چھوڑے یعنی خواجہ عبدالقادر خان ، خواجہ احمد خان ، خواجہ غلام حسین خان مشہور بہ خان عالم اور مصنف کتاب غلام حسین خان المخاطب بہ خان زمان جو چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا ۔ والد کے انتقال کے بعد اس نے اور اس کے بھائیوں نے ایک زمانہ تنگی و عسرت میں بسر کیا اس لئے کہ ملازمتِ دربار کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا لیکن ۱۸۱۳ء/ ۱۲۲۸ھ میں میر اکبر علی خان کی مسند نشینی کے بعد اسے معالجِ خاص مقرر کر دیا گیا اس نظام کو طب کا بذات خود بہت شوق تھا اور اس نے طرح طرح کی نئی دوائیں تیار کروانے کے لئے اپنے دربار میں کئی طبیبوں کو جمع کر لیا تھا ، مصنف کا خاص منصب شاہی دواخانے کی غور و پرداخت (تعاقداری) تھا ۔ میر اکبر علی خان کا ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ میر فرخندہ علی خان فتح جنگ آصف جاہ مسند نشین ہؤا ۔ اس نظام نے مصنف اور اس کے بھائیوں کو ان کے سابقہ عہدوں پر برقرار رکھا اور ان کی جاگیریں وغیرہ بھی بدستور ان کے تصرف میں رہیں ۔

کتاب کا پہلا باب سلطان علی قطب شاہ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور اس میں اس خاندان کے فرمانرواؤں کی تاریخ سلطان ابوالحسن خان ثانی (تانا) شاہ کے عہد تک خاصی تفصیل سے بیان کی گئی ہے ۔ آخر میں اورنگ زیب کے عہد میں اس سلطنت کے خاتمے اور مغل سلطنت میں انضمام اور شہزادہ کام بخش کے صوبیدار مامور ہونے کا ذکر ہے ۔ دوسرے باب میں آصف جاہی خاندان کے قیام اور اس خاندان کے پہلے سات حکمرانوں ، یعنی نظام الملک آصف جاہ اول (جو شاہجہان کے مشہور وزیر سعد اللہ خان کا نواسا تھا اور جسے آصف جاہ کا خطاب محمد شاہ نے عطا کیا تھا) میر احمد خان بہادر ناصر جنگ ، غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ ، آصف الدولہ محمد خان بہادر صلابت جنگ ، نظام الدولہ میر نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی ، سکندر جاہ اور نظام الملک آصف جاہ رابع میر فرخندہ علی خان کا ذکر ہے ۔ تیسرے باب کا پورا عنوان یہ ہے :

”در ذکر احوال وزیران و امیران و سروران و منصبداران ، نیز در

احوال فقراء و علماء و فضلاء و حکماء و شعراء مع اشعار ایشان ، و منجمان ہیئتی و رمال و خوشنویسان و حفاظ کامل القرأۃ شیریں مقال و سرداران قوم افغانان سنت و جماعت و افغانان قوم دائم خانی و مہدوی ۔"

مصنف نے امراء اور وزراء کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے اور ان میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل ہیں (ص ۱۵۷ تا ۲۳۶) ۔ جن مشائخ ، علماء اور فضلاء کے حالات بیان کئے گئے ہیں ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں : حضرت حسین شاہ ولی صاحب ، سید شاہ راجو صاحب ، سید حسن برہنہ صاحب ، شاہ شبلی صاحب ، بابا شرف الدین صاحب ، حضرت میراں صاحب کاروانی ، حضرت شاہ میر محمود ، شمس مولانا قدس ، سید شاہ علی رضا حسینی ، حضرت شاہ میراں صاحب ، مدار شاہ دھوتی (یہ دھوتی باندھے رہتے تھے) ، سید احمد صاحب گوسفند والا (انہیں بکریاں پالنے کا شوق تھا) ، حضرت شاہ خاکی صاحب ، حضرت شاہ علی عباس ثانی ، حضرت دادو بادشاہ وغیرہ (ص ۴۲۹ تک) ۔ حکیموں میں حکیم معالج خان ، حکیم الحکماء محی الدولہ وغیرہ کا ذکر ہے (ص ۴۴۹ تک) اس کے بعد شعراء کا ذکر ہے جن میں سے زیادہ تر دکھنی اردو میں شعر کہتے تھے اور ان کے کلام کے نمونے دئے گئے ہیں ۔ ان میں سے حسب ذیل نام ملتے ہیں : شیر محمد خان ایمان (مصنف مثنوی برسات اور رسالۂ ضلع جگت ، وہ فارسی میں بھی شعر کہتا تھا) ، میر حسین علی خان ایماء اورنگ آبادی (ہندی یا اردو میں شعر کہتا تھا) ، شیخ حفیظ حفیظ ، میرزا علی خان لطف ، شاہ نصیر شاہجہان آبادی[1] ، وغیرہ (ص ۴۶۳ تک) ۔ نجومیوں اور رمالوں میں محمد شمس الدین خان ، میر بہادر حسین خان ، مدار خان ، بھوانی شنکر وغیرہ کا حال لکھا ہے اور خوش نویسوں میں نادر قلم خان ، تجمل رقم خان ، علام محی الدین خان وغیرہ کا ۔

اسی تیسرے باب میں آگے چل کر مصنف نے ملازمین فوج کا ذکر کیا ہے جن میں اس کے بیان کے مطابق عرب ، سندھی اور سکھ وغیرہ شامل تھے اور پھر سرکار کے شاگرد پیشہ لوگوں کا (چوبدار ، خدمتگار ، فراش ، ہرکارے ، داروغہ وغیرہ) ۔ بعد ازاں دربار کے بعض مقربان خاص ، پہلوانوں اور کارخانہ جات سرکار کا ذکر ہے (ص ۵۰۰ سے) اور پھر مطبخ شاہی ، گھوڑوں (عربی ، عراق ، دکھنی ، کاٹھیاواڑی) شتر خانے ، فیل خانے ،

(۱) ان کے دکھن جانے کے بارے میں دیکھیئے مولانا محمد حسین آزاد : "آب حیات" ۔

رتھ خانے اور توپ خانے کے بارے میں دل چسپ معلومات دی ہیں اور آگے چل کر ان ''امرای رالای'' کا ذکر ہے جو ایران سے دکھن میں آ کر آباد ہو گئے (ص ۵۰۸ سے) ۔

چوتھے باب میں پہلے دکھن کے چھ صوبوں کا خاص تفصیلی بیان دیا گیا ہے ، یہ صوبے حسب ذیل تھے : (۱) اورنگ آباد (مع سرکار ہای دولت آباد ، احمد نگر ، پٹن ، پربنڈا ، بیڑ وغیرہ) ۔ (۲) خاندیس ۔ (۳) برار ۔ (۴) محمد آباد و بیدر ۔ (۵) دارالظفر بیجاپور ۔ (۶) حیدرآباد فرخندہ بنیاد (ص ۵۴۹ تک) ۔ اس کے بعد اس عرس کا حال بیان کیا ہے جو رجب کے مہینے میں امیرالمؤمنین حضرت علیؑ بن ابی طالب کی تخت نشینی کی یادگار کے طور پر منایا جاتا تھا ۔ یہ عرس ایک پہاڑی پر جسے مصنف نے کوہ شریف لکھا ہے اور جو حیدرآباد سے پانچ کوس (کروہ) کے فاصلے پر تھی منعقد ہوتا تھا اور اس میں ہزاروں افراد بہت عقیدت و احترام سے شریک ہوتے[1] ۔ آگے چل کر ص ۵۵۹ پر ہندوؤں کی بعض یاتراؤں (جاترہ ہا) کی کیفیت بیان کی ہے ، اور پھر ص ۵۸۶ تا ۵۸۸ پر حیدر آباد کے عشرۂ محرم کے دلچسپ حالات بیان کئے گئے ہیں ۔ مراسمِ محرم کے سلسلے میں مصنف نے ایک خاص علَم کا بھی ذکر کیا ہے جو علَمِ خاتون (حضرت فاطمہ زہراءؓ) کے نام سے دسویں تاریخ کو اٹھتا تھا ۔ اس کے متعلق وہ یہ لکھتا ہے کہ :

''روز دہم محرم روزِ حشر و نشرِ حیدرآباد است ، و بہمین صورت علَمِ مبارک قریب سہ پہر روز از زیر چار منار و چار کمان در مکان قدم رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرسد و زن و مرد جمع شوند (و گویند) کہ علمِ خاتونِ محشر علیہا السلام در مکانِ قدمِ مبارک پدر عالی مقدار خود ، یعنی جناب رسالت مآب صلعم برای فریاد و استغاثہ از دست امّت آمدہ است کہ فرزندانِ مرا ناحق با اولادِ صغیر و برادران و خویشان و رفیقان کشتہ ، سرِ عالیش را شہر بشہر ، کوچہ بکوچہ ، در بدر گردانیدہ و آب و طعام یک لخت ندادہ تشنہ و گرسنہ او را و فرزندان و موالیان او را ذبح نمودند و حیران و پریشان ساختند ، و خیمہ ہای سرادقِ عصمت را آتش زدہ تاراج و غارت کردند و بی پردہ و سر و پا برہنہ نمودند و طفلانِ صغیر بی تقصیر را در یک رسن و

---

(۱) اسی جگہ ایک قدم رسول اللہ صلعم کے پای مبارک کا نشان بھی تھا (دیکھئے آگے) ۔

زنجیر کشیده ، و سید سجاد بیمار ناتوان را در طوق و زنجیر در گرفته
مهار شتران بدست مبارکش داده پا برهنه پیش پیش قطار شتران بردند ،
آیا کدام تقصیر شما کرده بودند ؟ امروز که روز نمونۂ حشر است
و من در جناب شما فریادی و مستغاثی (کذا) داد خواه آمده ام تا بفریاد
من رسند -- پس بانی خیال علم را خم کرده گوشه بگوشه میگردانند
گویا کسی تلاش کسی می کند و می جوید ، پس خلائق از دیدن
این حالی فریب می شود که خود را از دست خویش بکشند ، خصوصاً
در آن مقام مستورات پردہ نشین بی پردہ حالتی میکنند که شور حشر
نیز ازین قسم خواہد بوده ، معاذ اللہ ، معاذ اللہ ، ہر کس که این
معامله بچشم خود بیند او تمام عمر این غم و الم را فراموش نخواهد کرد -''

خاتمۂ کتاب دو فصلوں پر مشتمل ہے جن میں سے پہلی فصل میں انگریزوں کی حیدر آباد میں آمد اور ریاست میں بحیثیت ریذیڈنٹ ملازمت اختیار کرنے کا ذکر ہے (ورود وکلای انگریزی در سرکار و ملازم شدن جمعیت انگریزی ، ص ۵۸۵ تا ۵۹۴) دوسری فصل میں پہلے بعض عجائب و غرائب کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ایک بڑا ''الماس نا تراشیدہ'' بھی شامل ہے ، بعد ازاں حیدر آباد کے گویوں اور سازندوں ، بوہروں اور ان کی سراؤں کا حال بیان کیا گیا ہے ، اور آخر میں ہندوؤں کے بعض تہواروں مثلاً ہولی ، دیوالی ، بسنت ، پنچھمی وغیرہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو بظاہر اس زمانے میں حیدر آباد میں بہت دھوم دھام سے منائے جاتے تھے (ص ۶۶۴ تک) -

اسی خاتمے میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس نے یہ کتاب تین سال کی مدت میں تیار کی تھی اور اس کا سنہ تکمیل ''بہ از باغ ارم'' (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء)[1] ہے - مطبوعہ نسخہ مصنف کے خود نوشت مخطوطے سے نقل کیا گیا تھا اور میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس کے عہد میں ملک التجار رستم علی صاحب کی نگرانی میں میر احمد علی خان صاحب نے اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا - اس زمانے کے ایک عالم مولوی سید فیض حسین صاحب

---

(۱) کتاب میں ایک جگہ سنہ تالیف ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میر محبوب علی خان دیا گیا ہے ، لیکن ''بہ از باغ ارم'' کے اعداد ۱۲۵۸ ہی ہوتے ہیں -

نے اس پر تقریظ لکھی تھی جس میں وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

''انحق کہ کتاب مسطور نسخۂ معجونِ غم زدای مرکب مفرّح دلکشائیست ، و تا حال ہمچنین کتابی کہ مشتمل بر حالات تفصیلی ساکنانِ بلدہ (حیدر آباد) باشد نوشتہ نشدہ . . . .''

جس نسخے سے راقمِ حروف نے استفادہ کیا ہے وہ یہی ہے اور مطبع مہدی ، بمبئی میں ۱۸۹۰ء - ۱۸۹۱ء/۱۳۰۸ھ میں چھپا تھا ۔[1]

'تاریخِ گلزارِ آصفیہ' سادہ اور سلیس فارسی میں لکھی گئی ہے ، لیکن ادبی اعتبار سے کسی خاص تعریف کی مستحق نہیں ہے ، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اس میں تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ بعض ایسی اہم اور دلچسپ معلومات جمع کر دی گئی ہیں جو دکن کی کسی اور تاریخ میں بمشکل ہی ملیں گی ۔ مصنف نے یہ کتاب غالباً اپنے شوق سے لکھی ہے ، کیونکہ اس نے کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ کسی نے اس کے لکھنے کی فرمایش کی تھی ۔

(۴) 'نشانِ حیدری' معروف بہ ٹیپو سلطان ، از میر حسین خان کرمانی بن سعد عبدالقادر ، حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان والئے میسور کی تاریخ ۔ مصنف حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں سرکاری ملازم تھا اور اس نے جو واقعات قلم بند کئے ہیں وہ زیادہ تر چشم دید ہیں ۔ 'نشانِ حیدری' کے علاوہ اس نے دو اور کتابیں بھی لکھی ہیں ، یعنی ''تذکرۃ البلاد و احکام'' اور 'بدیع المعانی' جو ولی اللہ بابا فخر الدین حسینی کی سیرت پر مشتمل ہے ، دیکھئے اسٹوری ، سیکشن ۶ ، کراسہ ۳ ، ص ۷۷۴ ۔ خاتمۂ کتاب میں وہ لکھتا ہے کہ چونکہ یہ تاریخ دو حکمرانوں یعنی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے زمانے کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اس لئے اس نے اس کا نام بجائے تاریخ کے تواریخ رکھا ہے اور اس لفظ کے اعداد سے اس کا سنہ تالیف (۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ) بھی برآمد ہوتا ہے ۔ اس نے یہ کتاب کسی بڑے آدمی کی فرمایش پر لکھی تھی جس کا نام اس نے نہیں بتایا ۔ ممکن ہے کہ وہ ٹیپو سلطان کے بیٹوں میں سے کوئی ہو ، یا کوئی انگریز حاکم ہو

---

(۱) بقول اسٹوری (۳ ، ۷۵۶ ، حاشیہ ۲) آصفیہ کتب خانے کی فہرست میں مقام طباعت لکھنؤ دیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے ۔

جسے میسور کی تاریخ سے دلچسپی تھی - کتاب کا جو حصہ حیدر علی کے عہد کے واقعات پر مشتمل ہے وہ نسبتاً مختصر ہے اور اس کا زیادہ اہم حصہ وہی ہے جو ٹیپو سلطان کے زمانے سے متعلق ہے - اس حصے کا کرنل ڈبلیو مائلز[1] نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو ۱۸۶۴ء میں لنڈن میں چھپا (۲۹۱ صفحات) اور جس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے - ہم یہاں اپنی بحث اس حصے سے متعلق رکھیں گے -

کتاب کے اس حصے میں کل ۲ ابواب اور ایک خاتمہ ہے - پہلے باب میں ٹیپو سلطان کی تخت نشینی ، انگریزوں سے اس کی آن بن اور ان کی فوج کی وندیواس پر چڑھائی - نیز ۱۷۸۱ء - ۱۷۸۲ء/۱۱۹۷ھ کے بعض دیگر واقعات کا ذکر ہے - دوسرے باب میں زیادہ تر ٹیپو سلطان کی بعض ابتدائی کامیابیوں ، مثلاً نگر ، گوریال بندر اور منگلور کی تسخیر کی کیفیت بیان کی گئی ہے ، اس کے علاوہ انگریزوں سے صلح اور مشہور کماندان[2] محمد علی کی وفات (۱۷۸۲ء/۱۱۸۷ھ) کا ذکر ہے - تیسرے باب میں اسی سال کے دوران سپہ سالار میر معین الدین کی پایان گھاٹ کے خلاف مہم کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے - چوتھے باب میں لالہ میاں (سلطان کے برادر نسبتی) کی ناگور کے فوجدار بدر الزمان خان کی بیٹی سے شادی کے حال کے علاوہ اس تادیبی مہم کا بھی ذکر کیا ہے جو پنگانور کے خلاف بھیجی گئی تھی (۱۷۸۷ء/۱۱۹۸ھ) - پانچویں باب میں ۱۷۸۴ء میں قمر الدین خان کے ہاتھوں لرگوندا کے پہاڑی قلعے کی تسخیر کا ذکر ہے - چھٹے باب میں اس مہم کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو سلطان نے ضلع کورگ کے باغی باشندوں کی سرکوبی کے لئے اپنے ذمے لی ، اور جس میں بقول مصنف اسّی ہزار باشندگانِ کورگ ، جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے ، گرفتار کئے گئے (۱۷۸۲ء/۱۱۹۸ھ)- ساتویں باب میں نظام حیدرآباد سے ساز باز کر کے مرہٹوں کی میسور پر تاخت اور ان کے مقابلے کے لئے سلطان کی روہونی کے راستے روانگی اور مناسب جوابی کارروائی کا حال ہے (۱۷۸۵ء/۱۱۹۹ھ) - آٹھویں باب میں مرہٹوں سے مزید جنگ ، تنگا بھدرا کے پار کے علاقے کی تاراجی ، اور کنچن گڑھ اور کوپلی کی تسخیر کا ذکر ہے (۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ) - نویں باب میں بھی اسی سال کے دوران مرہٹوں سے مزید جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے - دسویں باب میں بالآخر مرہٹوں کی شکست اور

---

(۱) مائلز (Miles) نے اس کتاب کے پہلے حصے کا بھی ترجمہ کیا تھا جو لنڈن میں ۱۸۴۲ء میں چھپا تھا ، دیکھئے وہی کتاب ، ص ۱۴ -

(۲) Commandant -

سنہ ۱۷۸۵ء - ۱۷۸۶ء/۱۲۰۰ھ میں ان سے صلح کا بیان ہے - گیارھویں باب میں کئی متفرق باتوں کا ذکر ہے - مثلاً نظم و نسقِ حکومت میں بعض اہم تبدیلیاں ، دیوان میر صادق کی برطرفی ، جو سفارت سلطان روم کو بھیجی گئی تھی اس کی واپسی اور حیدر آباد میں سفیر کا تقرر (۱۷۸۷ء/۱۲۰۲ھ) - بارھویں باب میں سلطان کی کالی کوٹا (کالی کٹ) پر یلغار اور کوچ بندر (کوچین) پر حملے کی کیفیت بیان کی گئی ہے جس میں بھاری نقصانات اٹھانے کے بعد سلطان کو بالآخر فتح نصیب ہوئی (۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ) - تیرھویں باب میں مالیوار (کوچین وغیرہ) کے راجا کی مدد کے لئے انگریزی جنرل میڈوز[1] کی آمد ، انگریزوں سے سلطان کی جنگ ، سپہ سالار برہان الدین کی شہادت اور پایان گھاٹ کی جانب سلطان کی پیش قدمی کا ذکر ہے - چودھویں باب میں لارڈ کارنوالس کی بنگال سے آمد ، نظام اور مرہٹوں سے انگریزوں کی ساز باز ، میسور پر ان کا حملے ، نور بالا گھاٹ کے قلعوں پر ان کے قبضے کی کیفیت بیان کی گئی ہے (۱۷۹۱ء/۱۲۰۶ھ) - پندرھویں باب میں غدر اور راجا کشن راؤ کی تادیب ، میسور علاقوں پر مغلوں اور مرہٹوں کی تاخت وغیرہ کا حال ہے (۱۷۹۱ء/۱۲۰۶ھ) - سولھویں باب میں نظامِ حیدر آباد کے بیٹوں کی میسور کی فوج کشی اور ان کے خلاف جنگ میں سلطان کے لئے فتح حیدر کی کامیابی ، حافظ فرید الدولہ کی وفات ، انگریزوں کی سرنگا پٹم پر دوبارہ چڑھائی اور بالآخر ۱۷۹۲ء/ ۱۲۰۷ھ میں ایک صلح نامہ طے پانے کا حال بیان کیا گیا ہے - سترھویں باب میں پالی گاؤں کے خلاف تادیبی کارروائی ، سرنگا پٹم کے قلعے کی مرمت اور نظم و نسق حکومت میں بعض مزید اصلاحات کی کیفیت لکھی گئی ہے (۱۷۹۱ء/۱۲۰۷ھ) - اٹھارھویں باب کا موضوعِ بحث سلطان کے بیٹوں کی مختلف ممالک سے واپسی ، میر مہران کے خطاب کا قیام ، ایران کے ایک شاہزادہ کی میسور میں آمد اور سلطان کی شادی کا حال درج ہے (۱۷۹۳ء تا ۱۷۹۷ء) - انیسویں باب میں جنرل ہیرس[2] کی قیادت میں انگریزی فوج کی سرنگاپٹم پر چڑھائی ، اس شہر کے محاصرے اور سلطان کی شہادت کا حال بیان کیا گیا ہے[3] - بیسویں باب میں ٹیپو سلطان کے ذاتی کردار اور اس کی بعض مخصوص صفات کا ذکر ہے اور اسی باب پر کتاب ختم ہو جاتی ہے -

---

(۱) Meadows -

(۲) Harris -

(۳) یہ واقعہ مئی ۱۷۹۹ء کو ظہور میں آیا -

میر حسین علی خان کے بیان سے جہاں ٹیپو سلطان کی جنگِ سرنگاپٹم میں شجاعت اور بسالت کا اظہار ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے قلعے سے نکل کر انگریزی فوج پر حملہ کرنے میں بلا ضرورت عجلت سے کام لیا ، کیونکہ شہر میں خوراک اور دیگر ضروریات کے کافی ذخیرے موجود تھے اور محاصرہ اگر زیادہ طول کھینچتا تو بالکل ممکن ہے کہ انگریز جن کے پاس کھانے پینے کی اشیاء کی بہت قلت تھی آخر تنگ آ کر واپس چلے جاتے ۔ اس کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کے فرانسیسی افسروں اور سپاہیوں نے اس جنگ میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا بلکہ زیادہ تر تماشا دیکھتے رہے اور اسی طرح سلطان کے بڑے بیٹے اور ولی عہد فتح حیدر نے قبل از وقت ہمت ہار دی اور انگریزوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر جنگ بند کرنے اور صلح کرنے پر تیار ہو گیا ، حالانکہ اس کے مخلص اور وفادار امراء جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے ۔ بہرحال سرنگاپٹم کے قلعے کے باہر سلطان بڑی بہادری سے لڑتا ہؤا شہید ہو گیا اور اس کی لاش میدانِ جنگ میں پڑی ہوئی ملی اور بعد ازاں ایک ڈولی میں ڈال کر شہر میں لائی گئی اور دفن کر دی گئی ۔ انگریزوں نے فتح حیدر سے جو وعدے کئے تھے وہ ان سے منحرف ہو گئے اور انہوں نے میسور کے سابق ہندو راجاؤں کے ایک لڑکے کو میسور کی گدی پر بٹھا دیا اور اس طرح میسور کی اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا ۔

مصنف نے ٹیپو سلطان کی سیرت سے متعلق بعض بہت دلچسپ باتیں لکھی ہیں مثلاً یہ کہ سلطان کو دربار کی شان و شوکت کا خاص خیال تھا ، مذہب سے بے انتہا شغف تھا اور یہ کہ غیر مسلموں سے وہ نفرت کرتا تھا ، یہاں تک کہ اس نے نہ تو کبھی کسی غیر مسلم کو سلام کیا اور نہ اس کے سلام کا جواب دیا[۱] ۔ ارکانِ مذہبی کی ادائیگی کا بہت پابند تھا ، صبح سویرے بیدار ہو کر تلاوتِ قرآن کرتا تھا اور اکثر اوقات اس کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی تھی ، دن رات میں صرف چند گھنٹے سوتا تھا اور محض دو دفعہ کھانا کھاتا تھا ۔ کھانے میں اس کے دربار کے سب امراء اور وزراء شریک ہوتے تھے ۔ لارڈ کارنوالس سے مجبوراً صلح کر لینے کا اسے اتنا ملال تھا کہ اس کے بعد سے اس نے پلنگ پر سونا ترک کر دیا

---

(۱) تاہم وہ اپنی ہندو رعایا سے بہت رواداری کا سلوک کرتا تھا اور اس نے کئی ہندو مندروں کو گراں قدر عطیات دئے تھے (دیکھئے ایشوری پرشاد : تاریخ ہند ، الہ آباد ، ص ۵۰۰) ۔

اور زمین پر ایک معمولی سا کپڑا (کھادی) بچھا کر سو جاتا تھا[1] ۔ اخلاقی قدروں اور آدابِ معاشرت کا بہت لحاظ رکھتا تھا ، چنانچہ ایک روز جب وہ شاہی محل میں سو رہا تھا تو اس کے والد کی دو نوجوان حرمیں زنان خانے سے نکل کر آئیں اور اس کے پاؤں دبانے لگیں ۔ سلطان کی آنکھ کھل گئی اور اسے ان کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری ، اس نے انہیں ڈانٹا اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ ان کی قرار واقعی سرزنش کی جائے ۔ علم و ادب سے اسے کافی لگاؤ تھا ۔ کئی زبانیں جانتا تھا اور ان میں لکھنے کی قدرت رکھتا تھا ۔ تاریخ پڑھنے اور سننے کا بہت شوقین تھا ، غیر سنجیدہ مذاق اور یاوہ گوئی سے متنفر تھا ۔ چنانچہ اس کے دربار میں بھانڈوں اور مسخروں وغیرہ کی رسائی نہ تھی ۔ البتہ کبھی کبھی رقص دیکھ لیا کرتا تھا ۔ لباس بہت سادہ اور سفید پہنتا تھا ۔ پگڑی پر ایک سفید رومال باندھ کر اسے ٹھوڑی کے نیچے گرہ دے لیتا تھا ۔ اور کسی کو اس طرح کا رومال باندھنے کی اجازت نہ تھی ۔ بہت باحیا اور غیرت مند تھا ۔ اس زمانے میں میسور کی ہندو عورتیں سر اور سینہ کھلا رکھتی تھیں ۔ اس نے اس مذموم رسم کو سختی سے بند کر دیا اور حکم دیا کہ عورتیں جب باہر نکلیں تو مناسب لباس میں ملبوس ہوں ۔ وہ شہسواری میں ماہر اور نیزہ بازی میں طاق تھا اور بے انتہا جدت پسند واقع ہوا تھا ، چنانچہ اس نے ہندوستانی (فصلی) مہینوں کے حروفِ ابجد کے حساب سے نئے نام رکھے ۔ نئے سکے مثلاً صدیقی ، فاروقی ، امامی ، باقری ، جعفری وغیرہ جاری کئے ۔ اسی طرح پیمانوں میں بھی تبدیلیاں کیں ، توپوں اور بندوقوں کو خاص لوہے سے بنوانے کا اہتمام کیا اور ساتھ ہی اور قسم کے ہتھیاروں اور اوزاروں کی جانب بھی توجہ کی ۔ کپڑوں کے نئے اور بہتر نمونے تیار کروائے اور پارچہ بافی کے کارخانوں کی غور و پرداخت کی ۔ زود رنج اور سخت گیر تھا لیکن معاف بھی بہت جلد کر دیتا تھا ، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی اہلکار کو برطرف کیا اور کچھ ہی عرصے بعد اسے دوبارہ ملازمت دے دی ، مصنف کے خیال میں اس کی یہ عادت حکام کی سرکشی اور غداری کا باعث بن گئی ۔

تاریخ 'نشان حیدری' ۱۸۹۰ء/۱۳۰۷ھ میں بمبئی میں طبع ہوئی ۔ قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں (دیکھئے اسٹوری ، کراسہ ۳ ، ص ۷۷۶) ۔

---

(۱) یہ صلح نامہ لارڈ کارنوالس کے زمانے میں طے ہوا تھا اور اس کی رو سے ٹیپو سلطان کو تین کروڑ روپے بطور تاوان جنگ اور ایک کروڑ روپے سالانہ آمدنی کا ایک علاقہ انگریزوں کو دینا پڑا تھا ۔ اس کے علاوہ اسے اپنے دو بیٹوں کو بھی بطور یرغمال ان کے حوالے کرنا پڑا تھا ۔

(۵) 'دستنبو' از میرزا اسد اللہ خان غالب ۔ یہ مختصر سی کتاب (کل ۵۰ صفحات) ان حالات و واقعات کے بیان پر مشتمل ہے جو دہلی میں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک رونما ہوئے ۔ کتاب کے شروع میں حمد باری تعالیٰ ہے جو بہت رنگین و مرصّع عبارت میں لکھی گئی ہے اور یوں شروع ہوتی ہے :

"بنام خداوندِ پیروزگر مہ و مہر ساز و شب و روز گر

توانا داوری نہ سپہر فراز ہفت اختر فروز و دانا خدای روان باتن آمیز و دانش و داد آموز کہ این ہفت و نہ را پیمانہ واقر از فراز آورد و کارہای آسان و دشوار را روائی و بندہای سست و استوار را کشایش بکشش و کشایش ایشان در بست ۔"

تمہید کے بعد ایران کے بادشاہ یزدگرد کے زمانے میں عربوں کی ایران پر یورش اور ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف بغاوت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عربوں کے حملے کا یہ نتیجہ ہؤا کہ ایرانی آتش پرستی سے روگردان ہو گئے اور اسلامی تعلیمات قبول کرکے ایک خدا کے پرستار بن گئے لیکن ہندوستانیوں کی بغاوت سے سوائے تباہی و بربادی کے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہؤا :

"ہندیان از کدام آئین تازہ شادمان باشند ۔ ہمدیان دامنِ دادگران از دست دادند و بشکنجہ دوامِ ہمدمیٔ ددان افتادند ۔"

اس کے بعد وہ دہلی میں ۱۱ مئی ۱۸۵۸ء کو باغیوں کے میرٹھ سے ورود اور شہر میں ہنگامے کے آغاز کا ذکر کرتے ہیں اور لال قلعے میں انگریز ایجنٹ اور قلعدار اور سینکڑوں بے گناہ انگریز مردوں ، عورتوں اور بچوں کے باغیوں کے ہاتھوں قتل ہونے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"ہیچ مشت خاکی نماند کہ از خون گل اندامان ارغوان زار نشد ، و

(۱) غالب نے یہ پوری کتاب ایک مخصوص اسلوب میں لکھی ہے جو ابوالفضل کی طرزِ تحریر کے مشابہ ہے اور انہوں نے اس میں کوئی عربی لفظ استعمال نہیں کیا ۔ چنانچہ فارسی میں جو عربی الفاظ عام طور پر مستعمل ہیں ان کی جگہ بھی غیر مانوس فارسی الفاظ تلاش کر لئے ہیں ۔

ہیچ کنج باغی نبود کہ بی برگی مانا بہ نوبہار نشد ، ہای آن جہانداران داد آموز دانش اندوز نکو خوی و نکو نام و آہ از آن خاتونان پری چہرہ نازک اندام با رخی چون ماہ و تنی چون سیم خام ، دریغ آن کودکان جہان نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بر لالہ و گل می خندیدند و در حوش خرامی بر کبک و تذرو آہو می گرفتند کہ ہمہ یکبار بگرداب خون فرورفتہ . . . :

ای نو بہار چون من بسمل بخا دہ غلط   ای روزگار چون شب بی ماہ تار شو
ای آفتاب روی بسیلی کبود کن   ای ماہتاب داغ دل روزگار شو"

اس کے بعد غالب باغی سپاہیوں کے ساتھ دہلی کے شہریوں کی شمولیت ، شہر میں لوٹ مار ، شرفاء کی خراب و خستہ حالت اور بے بسی و مجبوری کی کیفیت بیان کرتے ہیں اور باغیوں کے بہادر شاہ ظفر کو ان کا ساتھ دینے پر مجبور کرنے کا ذکر کرتے ہیں :

"شاہ را درمیان گرفت سپاہ   زین گرفتن بود گرفتن ماہ
ماہ نو ہیچگہ نمی گیرد   جز مہ چاردہ نمی گیرد
شاہ ماہ گرفتہ را ماند   نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند"

بادشاہ کے بعض خاص مشیروں اور مقربوں سے باغیوں کی بدظنی کا ذکر کرتے ہوئے غالب حکیم احسن اللہ خان کے مکان کی تاراجی و بربادی کی کیفیت بیان کرتے ہیں ، اور پھر آخرکار ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوج کے کشمیری دروازے سے شہر میں داخلے اور باغی سپاہیوں کے فرار کا ذکر کرتے ہیں : "کہ سپاہ سیاہ چہرہ را از گریز نماند" ۔ انگریزوں کی اس کامیابی سے غالب بظاہر خاصے خوش معلوم ہوتے ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :

"مئی گر ز دہلی برون برد داد   ستم بر ستم برد و آورد داد
پس از چار ماہ و پس از چار روز   فروزندہ شد مہر گیتی فروز
تہی گشت دہلی ز دیوانگان   بمردی گرفتند فرزانگان"

اسی ضمن میں وہ شورش کے بعض اور شہروں ، مثلاً فرخ آباد ، رام پور اور لکھنؤ میں پھیلنے کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔

انگریزی فوج کے شہر میں داخلے کے کئی روز بعد تک قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا ، اگرچہ غالب اور ان کے دوسرے اہل محلہ کے گھروں پر کوئی آفت نہیں آئی کیونکہ پٹیالے کے راجا نرندر سنگھ نے جو شریف خانی حکیموں کی بہت قدر کرتا تھا ، گلی کے دروازے پر حفاظت کے لئے اپنے سپاہی متعین کر دیئے تھے۔ غالب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجود یہ زمانہ بہت سختی اور دشواری میں بسر ہوا ، کھانے پینے کی چیزیں بمشکل میسر آتی تھیں اور لوگ پینے کے پانی تک کو ترستے تھے۔ اگر اتفاق سے کبھی بارش ہو جاتی تھی تو برتنوں میں پانی بھر لیا جاتا تھا ، ایک دن بڑی ہمت کرکے اور راجا کے دو تین سپاہیوں کو ہمراہ لے کر ان کا ایک ملازم کسی کنویں سے پانی لایا لیکن وہ بھی کھاری نکلا۔ اسی کو زہر نوش کرنا پڑا۔

اس کے بعد غالب اپنے خاندان کے بعض حالات بیان کرتے ہیں اور اپنے حقیقی بھائی میرزا یوسف خاں کی ، جو ان دنوں مجنون تھے ، خاص طور پر خراب اور خستہ حالت کا ذکر ان رقت آمیز الفاظ میں کرتے ہیں :

> "برادر کہ دو سال کوچک از من است در سی سالگی خرد بباد داد و دیوانگی[1] و کالیوگی گزید ، سی سال است کہ آن دیوانہ کم آزار بی خروش مست و مدہوش می زید خانہ وی از خانہ من جداست و کما بیش دوری دو ہزار گام درمیان ، زن و دخترش با فرزندان و کنیزان زندگی در گریختن پنداشتند و خانہ خداوند را باخانہ و کاچال[2] و دربانی کہن سال و کنیزی پیرزال بجا گذشتند ، کس فرستادن و آن سہ تن وکالا رابدینجا آوردن اگر جادو دانستمی نتوانستمی ، این خود گران اندوہی دیگر و بر دل از باد این اندوہ کوہی دیگر است . . . در بند آنم کہ برادر بشب چون خفت و بروزچہ خورد و نا آگہی بدان پایہ کہ نمی توانم گفت زندہ است یا بسختی مرد . . . "۔

اسی سلسلے میں وہ اس قصیدے (چکاما[3]) کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے ملکہ

---

(۱) کالیوگی یعنی جنون۔

(۲) کاچال یعنی ساز و سامان۔

(۳) قصیدے کے لئے لفظ چکاما کا استعمال غالب کی فارسیت پسندی کی ایک قابل توجہ مثال ہے۔

وکٹوریا کی تعریف میں کہا تھا اور لارڈ ایلن برا کے توسط سے انگلستان بھجوایا تھا۔ یہ قصیدہ ملکہ کی خوشنودی کا باعث ہؤا اور تین ماہ بعد غالب کو یہ خوش خبری ملی کہ انہیں اس کے صلے میں پنشن دی جائے گی۔ لیکن پنشن کے اجراء سے پہلے ہی ہنگامہ شروع ہو گیا اور کچھ نہ ہو سکا، چنانچہ کہتے ہیں کہ:

''اینک آن ہمایون نامہ کہ سیاہۂ آرزوی سرحوشِ من و کاہۂ بازوی خرد و ہوشِ من است با من است پرکالۂ چند از جگر کہ در جوشِ گریہ از مژہ برون ریختہ ام بہر نشان خون پالای مرا در دامن است۔''

پھر لوٹ مار کے سلسلے میں وہ میرزا یوسف خان کے مکان پر حملے کا بھی ذکر کرتے ہیں جس میں ان کے گھر کا مال و متاع حملہ آوروں کی نذر ہو گیا۔ لیکن ان کی اور ان کے دونوں ملازموں کی جان بچ گئی۔ اسی ضمن میں وہ انگریزوں کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے اور اگر کوئی ان کا مقابلہ نہ کرے تو اس سے تعرض نہیں کرتے:

''ای خدا پرستانِ دادستای ستم نکوہ، اگر درستائش داد و نکوہش ستم زبانِ شما بادل یکیست کردارِ ہندوستانیان را یاد آورید کہ بی آنکہ دشمنی را از پیش مایہ و کین را از نخست پیرایہ بودہ باشد، و ہمہ کس داند کہ خداوند کشی گناہ است، برخداوندانِ خود تیغ آختند و زنانِ بیچارہ و کودکانِ در خور گہواہ را تن از روان پرداختند، اینک انگلستانیان را نگوید کہ چون از روی کین خواہی بجنگ برخاستند و برگوشمالِ گنہگاران لشکر آراستہ از آنجا کہ در شہریان نزولی برداشتند جای آن بود کہ پس از چیرہ دستی در شہرِ دہلی سگ و گربہ را زندہ نمی گزاشتند، آن چنان خشمی کہ پنداری آتش در جگر زبانہ می زد فرو خوردند و برالدامِ زنان و کودکان نار موئی نیازردند . . .''

اب تک غالب کا گھر اور ان کا محلہ محفوظ رہا تھا۔ لیکن ایک دن چند سپاہی دیوار پھاند کر ان کے مکان میں گھس آئے اور انہیں، ان کے دونوں متبنّی بچوں اور ملازموں کو اور ان کے ساتھ ان کے چند ہمسایوں کو بھی گرفتار کرکے کرنل براؤن کے سامنے لے گئے۔ اس نے غالب سے ان کا نام دریافت کرنے اور بعض اور لوگوں سے چند سوالات

کرنے کے بعد انہیں رہا کر دیا (۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء)۔ اس واقعے کے چند روز بعد ہی (۱۹ اکتوبر کو) یہ خبر ملی کہ ان کے بھائی میرزا یوسف خان کا انتقال ہوگیا ہے۔ ان کی تجہیز و تدفین کے سلسلے میں سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر انہیں دو ایک سفید چادروں میں لپیٹ کر راجا کے سپاہیوں کی حفاظت میں قریب کی ایک نماز گاہ میں لے جا کر دفن کر دیا گیا۔ اس واقعے نے غالب کو بہت متاثر کیا اور انہوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ درد ناک اشعار لکھے ہیں :

دریغ آنکہ اندر درنگِ سہ بیست | سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
تہِ خاکِ بالین ز خشتش نبود | بجز خاک در سر نوشتش نبود
خدایا برین مردہ بخشایشی | کہ نادیدہ از زیست آسائشی

اسی عرصے میں دو تین اور ناخوشگوار واقعات پیش آئے ۔ لوھارو کے امین الدین خان اور ضیاء الدین خان جو ان دنوں بریلی میں تھے ، حفاظت کے خیال سے اپنی ریاست کی جانب روانہ ہوئے ، لیکن راستے میں مہرولی میں ان کے پڑاؤ پر حملہ ہؤا اور جتنا سازوسامان ساتھ تھا بہت سا تاراج ہو گیا ۔ بے سروسامانی کی حالت میں دوجانہ کا رخ کیا جہاں کے رئیس علی حسن خان نے ان کا شایانِ شان استقبال کیا ("سرور در سروری با ہمسران آن کرد کہ کہ خسروِ ایران در خسروی با ہمایوں کرد'') ۔ کمشنر دہلی کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو انہیں دہلی واپس بلوا کر قلعے میں نظر بند کر دیا ۔ اس اثنا میں دہلی میں ان کے مکانات بھی لٹ چکے تھے ۔ اس کے دو تین روز بعد ہی حکم ہؤا کہ جھجھر کے نواب عبدالرحمان خان کو گرفتار کر کے دہلی لایا جائے ۔ چنانچہ انہیں لایا گیا اور لال قعلہ میں نظر بند کر دیا گیا ۔ اسی طرح ۳ اکتوبر کو فرخ نگر کے رئیس احمد علی خان کو ، دو نومبر کو بہادر گڑھ کے نواب بہادر خان کو اور ۷ نومبر کو بلب گڑھ کے راجا ناہر سنگھ کو بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا اور ان کا گھر بار لوٹ لیا گیا ۔ گویا ان سات ریاستوں (جھجھر ، بہادر گڑھ ، بلب گڑھ ، فرخ نگر ، لوہارو ، دوجانہ اور پاٹودی) میں سے جو دہلی کی ایجنسی سے تعلق رکھتی تھیں صرف دو (دوجانہ اور پاٹودی) برقرار اور محفوظ رہیں ۔ اسی عرصے میں غالب کے دو مقتدر ہمسایے مظفر الدولہ سیف الدین احمد خان اور ذوالفقار الدین حیدر خان ہنگامۂ گیرو دار سے گھبرا کر شہر سے چلے گئے اور ان کی

---

(۱) مراد شاہ طہماسپ بن شاہ اسماعیل صفوی سے ہے۔

غیر حاضری میں ان کے گھر لوٹ لئے گئے ، بلکہ ایک رات انہیں نذرِ آتش کر دیا گیا ۔ ان کا مکان غالب کے مکان سے بہت قریب تھا ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

''آن ہیت[1] باختر سوی سرای من بدان نزدیکی است کہ در آن نیم شب فروغِ آتشِ فروزان از فرازِ بام ہمی نگرستم و گرمی دود بچشم و رخ ِ من رسید و از آن روکہ در آن دم بادِ برین[2] می وزید خاکستر بسراپای من ہمی افتاد ، آری سرود خانہ ہمسایہ گلبانگ رہ آورد آرد ، آتش خانہ ہمسایہ خاکستر چرا نبارد ۔''

اس کے بعد غالب (ص ۳۱) شہزادوں کے قتل اور بادشاہ کے خلاف مقدمے کی تیاری کا ذکر کرتے ہیں (''بر بادشاہِ ارک[3] آرام گاہ کہ ماتم زدۂ تاب و توالست فرمانِ گیر ودار باندازہ باز پرس روان است'') ۔ ان کے بیان کے مطابق جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کو عام امان دے دی گئی اور وہ شہر میں آ کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے ۔ لیکن مسلمان بدستور معتوب رہے ۔ بالآخر ان میں سے بعض کو شریف خانی حکیموں کے محلے میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی ۔ لیکن چند ہی دن بعد اس شبہے میں کہ کہیں ان کے ساتھ باغی بھی نہ آ گئے ہوں ، فوجی سپاہیوں نے گھروں کی تلاشی لی اور کم و بیش ساٹھ آدمیوں کو گرفتار کر کے حوالات لے گئے ۔ پانچ فروری کو ان سے حکیم محمود خان اور مرتضیٰ خان کو رہا کر دیا گیا لیکن اور لوگوں کی گلو خلاصی بہت بعد میں ہوئی ۔ اپنے محلے میں ان ناخوشگوار واقعات کے ظہور سے غالب بہت دل گرفتہ ہو گئے اور کہتے ہیں کہ :

''این درویشِ دلریش را نیز دل برجای نماند ، با آنکہ در آن دارو گیر امن پژوہشی نرفت ہنوز آن بروز دودلہ بودن و بشب دلشاد نغنودن کہ نہ بیجاست ہمچنان بجاست ۔''

اس مہینے میں چیف کمشنر دہلی سرجان لارنس کی آمد کی خبر ملی اور غالب نے ان کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر روانہ کیا ۔ ۲۰ فروری کو توپیں چلائی گئیں اور

---

(۱) ہیت بمعنی حویلی ہے ۔

(۲) بادِ برین بمعنی پچھوا ہوا ۔

(۳) ارک بمعنی قلعہ ۔ لال قلعے سے مراد ہے ۔

سننے میں آیا کہ لکھنؤ فتح ہو گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہؤا کہ یہ خبر غلط تھی اور وہاں ابھی جنگ جاری ہے۔ ۲۴ فروری کو سر جان لارنس شہر میں داخل ہؤا اور بقول غالب :

''در کالبدِ شہر روان باز آمد　　فرمانفرمایی شہ نشان باز آمد
این شادی و خوشدلی کہ روداد بشہر　　گوئی کہ مگر شاہِ جہان باز آمد''

اس کے آنے کے بعد عام امان کا اعلان ہو گیا (۲۷ فروری)۔ لیکن اس وقت تک ہزاروں مسلمان شہید ہو چکے تھے اور ہزاروں گھر بار چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ چنانچہ اس وقت اگرچہ دہلی میں باہر سے آنے والوں کا ازدہام تھا، مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار سے زاید نہ تھی اور وہ بھی خراب و خستہ حال میں تھے :

''کوتاہیٔ سخن آزارہاست کہ پنداری خارہاست، اگر روی براہ آوری در راہ نگری و اگر ننشینی بہ پیرہن بینی۔''

غالب نے جو قصیدہ سرجان لارنس کی تعریف میں لکھ کر بھیجا تھا، اس کی رسید کا خط ۸ مارچ کو موصول ہؤا، جس میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ قصیدہ کمشنر دہلی چارلس سانڈرس[1] کی معرفت بھیجا جائے۔ انہوں نے تعمیلِ حکم کی اور قصیدے کے ساتھ ایک خط اپنی موعودہ پنشن کے بارے میں بھی بھیجا۔ مگر جواب یہ ملا کہ : ''فرستادنِ این نامہ کہ جز ستایش و چشم روشنی ہیچ ندارد ہیچ گونہ ناگزیر نیست۔'' چنانچہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ ۱۸ مارچ کو تسخیرِ لکھنؤ کی خبر آئی۔ اپریل میں حکیم محمود خان کے وہ رشتے دار جو ابھی تک نظر بند تھے رہا کر دیئے گئے اور وہ پٹیالے چلے گئے۔ اس کے بعد مراد آباد کی فتح کی خبر ملی جسے نواب یوسف علی خان کے سپرد کر دیا گیا، اور بعد ازاں بریلی کی۔ ۱۳ مارچ کو بہادر گڑھ کے بہادر خان کو رہا کر دیا گیا اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن مقرر کر کے بھیج دیا گیا۔ ۲۲ مارچ کو توپوں کی سلامی سے گوالیار کی فتح کا اعلان ہؤا۔ غالب یہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ عنقریب پورے ہندوستان میں امن قائم ہو جائے گا اور دہلی کی گذشتہ رونق لوٹ آئے گی، لیکن چونکہ ان کی عمر اب ۶۳ سال کی ہو چکی ہے، اس لئے کیا معلوم کہ انہیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا یا نہیں، کیونکہ بقول حافظِ شیرازی :

''دریغا کہ بی ما بسی روزگار　　بروید گل و بشکفد نو بہار

بسی تیر و دی ماہ و اردی بہشت　　بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت"

ایک اور پریشانی جو غالب کو اس زمانے میں لاحق رہی وہ "فرنچ" یعنی فرانسیسی شراب کی نایابی تھی ۔ ان کا معمول تھا کہ وہ روز شام کو یہ شراب ضرور پیتے تھے ۔ ان کے ایک دوست مہیش داس نے اس کمی کو ایک دیسی شراب (بادۂ شکری ہندی) فراہم کر کے دور کر دیا ۔ چنانچہ غالب اس کی اور بعض اور دوستوں ، مثلاً ہیرا سنگھ ، شیوجی رام برہمن اور اس کے بیٹے بالمکند اور ہرگوپال تفتہ کی امداد و ہمدردی کا اعتراف کرتے ہیں ، ورنہ مسلمانوں میں سے تو اب کوئی مددگار رہا ہی نہ تھا :

"شہر از مسلمانان تہی است ، شبانہ خانہای این مردم بی چراغست و روزانہ روزنِ دیوار ہا بی دود ، غالب شہر آشنائی ہزار دوست کہ در ہر کاشانہ یگانۂ و در ہر سرای آشنائی داشت درین تنہائی جز خامہ ہمنوای وی و جز سایہ کسی ہمپای وی نیست ۔"

غالب کا گھر ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ، اس پُر آشوب زمانے میں محفوظ رہا ۔ لیکن ان کی بیوی نے انہیں خبر کئے بغیر گھر کا زیادہ تر قیمتی اثاثہ پیرزادہ کالے صاحب کے گھر بھجوا دیا تھا اور اب حالت یہ ہو گئی کہ پہننے کے کپڑے بیچ بیچ کر کھانے پینے کی اشیا خریدی جانے لگیں :

"گوئی دیگران نان میخورند و من جامہ ہمی خورم ، ترسم کہ چون پوشیدنی ہمہ خوردہ باشم در برہنگی از گرسنگی مردہ باشم ۔"

آخر میں اپنی امید و بیم کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے کتاب میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر آخر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روبداد قلم بند کی ہے اور اب اگست ۱۸۵۷ء میں اسے ختم کرتے ہیں ۔ اس کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک ۱۷ اشعار کی مثنوی ہے اور پھر کہتے ہیں کہ :

"این نامہ را پس از انجامیدن 'دستنبوی' نام نہادہ آمد و دست بدست و سوی بسوی فرستادہ آمد تا دانشوران را روان پرورد و سخن گستران را دل دست برد ، امید کہ این دانشی دستنبوی بدستِ یزدانیان گلدستہ رنگ و بوی و در دیدۂ اہرمن منشان آتشین گوی بادَ ۔"

کتاب کے آخر میں وہ قصیدہ درج ہے جو غالب نے ملکہ وکٹوریہ کے لئے لکھا

تھا اور جس کا مطلع ہے :

”در روزگارہا نتوانند شمار یافت　　خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت“
(کل ۶۰ اشعار)

اور ایک چھوٹا سا قطعہ جس میں اس چراغاں کا ذکر ہے جو کمشنر دہلی سانڈرس کے حکم سے کیا گیا تھا - ۱۵ اشعار ہیں -

’دستنبو‘ تقریباً سوا سال کے ان واقعات کی ایک دلچسپ ڈائری ہے جو دہلی میں وقوع پذیر ہوئے اور جن سے غالب براہِ راست اثر اندوز ہوئے یا جنھوں نے ان کے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا - اسے پڑھنے سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ غالب انگریزوں کے بے حد مدّاح اور باغیوں یا جنگِ آزادی میں شرکت کرنے والوں کے سخت مخالف تھے - اس کے ساتھ ہی یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر انگریزی حکام کی خوشنودی حاصل کرنا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ جس پنشن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا وہ انہیں مل جائے - لیکن یہ خیال کرنا کہ غالب نے یہ کتاب بعض لالچ یا چاپلوسی میں لکھی تھی صحیح نہ ہوگا - غدر کے زمانے میں اور اس کے بعد بہت عرصے تک ہزاروں لوگ ایسے تھے جو انگریزوں کے خلاف اس بغاوت کو خلافِ مصلحت اور بے سود خیال کرتے تھے - انہیں ملک یا قوم کا غدّار سمجھنا بے انصافی ہوگی - چنانچہ انہیں لوگوں میں بہادر شاہ ظفر کے بعض قریبی عزیز اور متوسّلین مثلاً ملکہ زینت محل ، حکیم احسن اللہ خاں اور میرزا الٰہی بخش وغیرہ شامل تھے اور انہیں میں ایک غالب بھی تھے - ان کا نقطۂ نظر اس عبارت سے واضح ہو جاتا ہے جو انہوں نے لکھنؤ میں انگریزوں کی کامیابی کے سلسلے میں لکھی ہے (ص ۳۳ - ۳۴) :

”آری فرۂ ایزدی ہر کرا شہریاری بخشد ناگزیر ہر کہ گردن از فرمالدہان پیچد سرش در خورِ کفش است و ستیزۂ زیردست یا زبردست ہان مشت است و درفش جہانیان را سزد کہ باخداوندانِ بختِ خداداد بخوشنودی سرفرود آرلد و بردن فرمان جہانداران را پذیرفتن فرمان جہان آفرین انگارند ، چون دانیم کہ تیغ و نگین و بخت و تخت بخشندۂ کیست دیگر سرکشی و ناخوشی از چیست -“

عافیت پسند لوگوں کا ہمیشہ سے یہی نقطۂ نظر رہا ہے اور بے شمار زمانہ شناش معلّمین

اخلاق مثلاً شیخ سعدی شیرازی بھی تعلیم دیتے رہے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ غالب نے انگریزوں کی شاید ضرورت سے زیادہ تعریف کر دی ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انہوں نے ان زیادتیوں کی بھی پردہ پوشی نہیں کی ہے جو انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضے کے بعد شہریوں پر روا رکھیں ۔ اس لحاظ سے دستبو کو ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق ایک مستند اور بیش قیمت دستاویز تصور کیا جا سکتا ہے ۔ یہ کتاب پہلے مفیدِ خلائق پریس آگرہ میں چھپی تھی، پھر ۱۹۶۹ء میں صد سالہ یادگار غالب کمیٹی دہلی کی جانب سے بمبئی میں طبع ہوئی[1] اور ابھی حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور نے شائع کی ہے ۔ مخطوطات کئی کتب خانوں میں محفوظ ہیں[2] ۔

(۶) 'صحیفہ' والا قدری آئینہ حیرت نما یا تذکرۂ غدر ہند' از محمد بشیر لکھنوی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے حالات، مصنف کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن اس نے یہ کتاب غالباً ۱۸۵۷ء کے کچھ ہی عرصے بعد لکھی ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے اور یہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں لکھنؤ میں چھپی تھی[3] ۔

(۷) 'ظفر نامہ وقائع غدر' از گمنام منصف جو ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ میں وزیر امور ہند اور اس کی مشاورتی مجلس کی اطلاع کے لئے لکھی گئی ۔ اس کا ایک مخلوط مؤرخہ ۱۸۶۵ء/ ۱۲۸۲ھ انڈیا آفس کی لائبریری میں موجود ہے[4] ۔

(۸) 'تاریخ دکن' (صوبہ دکن کی تاریخ از ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۸ء) از عبدالعلیم محمد نصراللہ خان نصر بن حکیم عمر خان احمد خویشگی ۔ مصنف خورجہ کا رہنے والا تھا ۔ دس سال کی عمر میں اپنے والد کے انتقال پر اپنے ماموں کے پاس نظام آباد (ضلع اعظم گڑھ) میں چلا گیا ۔ جہاں اس نے تعلیم حاصل کی ۔ اس کے استادوں میں مشہورِ عالم مولوی احمد علی چڑیا کوٹی بھی تھے ۔ ۱۸۳۸ء میں وہ سرکاری ملازمت میں منسلک ہوا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک ترقی کی ۔ ۱۸۶۵ء میں سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ حیدر آباد چلا گیا اور وہاں پندرہ سال تک مقیم رہا ۔ اس اثنا میں وہ پہلے عدالتِ

---

(۱) میں نے اسی ایڈیشن سے استفادہ کیا ہے اور صفحات کے حوالے بھی اسی کے مطابق دیئے ہیں ۔

(۲) دیکھئے استوری : وہی کتاب، ص ۶۴۷ ۔

(۳) ایضاً، ص ۶۴۸ ۔

(۴) دیکھئے استوری : وہی کتاب، ص ۶۴۷ - ۶۴۸ ۔

فوجداری کے ناظم اور پھر صدر تعلق دار (ریونیو کمشنر) کے عہدوں پر مامور رہا۔ بعد ازاں وہ خورجہ واپس آ گیا اور وہیں ۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ (۱۹ دسمبر ۱۸۸۱ء) کو فوت ہؤا۔ وہ نہ صرف ایک قابل اہلکار کے طور پر بلکہ ایک صوفی کی حیثیت سے بھی مشہور تھا۔ ۱۹ کتابیں اس کی طرف منسوب ہیں جن میں سے ایک یہ 'تاریخ دکن' بھی ہے[1]۔ (اس نام سے کتاب کی تاریخ تصنیف نکلتی ہے : ۱۲۶۵ھ (۱۸۶۸ء - ۱۸۶۹ء)۔ 'تاریخ دکن' میں مصنف نے حیدر آباد کی جغرافیائی کیفیت اور یہاں کی حکومت، باشندوں اور بعض مشاہیر کے حالات لکھے ہیں اور ضمناً ۱۸۶۵ء میں یہاں اپنے آنے اور اپنے تجربات اور مشاہدات کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب لکھنؤ میں پہلی بار ۱۸۷۰ء میں اور دوبارہ ۱۸۷۹ء میں چھپی تھی[2]۔

(۸) 'وزیر نامہ (تاریخ اودھ)' از نواب امیر علی بہادر، مصنف پٹنہ کے قریب ایک قصبے باڑھ میں ۱۸۱۰ء میں پیدا ہؤا۔ ۱۸۲۹ء میں وہ بادشاہ اودھ نصیرالدین حیدر کے سفیر کا معاون یا نائب مقرر ہؤا۔ ۱۸۴۵ء میں دیوانِ عدالت میں وکیلِ سرکاری اور ۱۸۵۷ء میں پٹنے کے کمشنر کا معاونِ خصوصی مامور ہؤا اور ۱۸۶۳ء میں اسے انگریزی حکومت کی جانب سے خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور وہ بنگال کی مجلسِ قانون ساز کا رکن بنا دیا گیا۔ ۱۸۶۷ء میں وہ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کا جو اس زمانے میں کلکتے کے قریب مٹیا محل میں مقیم تھے، مدار المہام مقرر ہؤا اور ان کے قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں اس نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ بادشاہ موصوف نے اسے وزیرالسلطان کا خطاب عطا کیا اور ۱۸۷۵ء میں اسے نواب کا خطاب بھی دے دیا گیا۔ اس نے نومبر ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ اس کی ایک کتاب 'امیر نامہ' بھی ہے جس میں اس نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مختصر تاریخ اور اپنے سوانحِ حیات لکھے ہیں۔

'وزیر نامہ'، جسے مصنف نے غالباً ۱۸۷۱ - ۱۸۷۲ء/۱۲۸۸ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں مکمل کیا، چار ابواب میں بہ تفصیلِ ذیل منقسم ہے : (۱) اودھ کے قرہ یوسفی خاندان کی مختصر تاریخ واجد علی شاہ کے عہد تک۔ (۲) بیگم حضرت محل کا سفرِ انگلستان جہاں وہ اودھ کی ریاست کے الحاق کے خلاف ملکۂ وکٹوریہ سے

---

(۱) باقی کتابوں کے ناموں کے لئے دیکھئے اسٹوری، وہی کتاب، ص ۷۵۶۔

(۲) دیکھئے سٹوری، وہی کتاب، ص ۷۵۶ - ۷۵۷۔

احتجاج کرنے گئی تھیں ۔ (۳) واجد علی شاہ کی جای سکونت مٹیا محل (کلکتہ) کا حال اور مصنف نے اس بادشاہ کی جو خدمات انجام دیں ان کا ذکر ۔ (۴) واجد علی شاہ کی تصانیف میں سے منثور اور منظوم اقتباسات اور خود مصنف کی اپنی اور بعض دیگر شعراء کی نظمیں ۔ یہ کتاب ۱۸۷۰ء/۱۲۹۲ھ میں کانپور میں چھپی تھی ، قلمی نسخے بھی موجود ہیں[1] ۔

(۹) 'لبِ تاریخِ سندھ' از خدا داد خان ولد رضا محمد خان معروف بہ راضو خان ۔ مصنف ترین قبیلے کا افغان تھا اور ۱۸۵۳ء میں اس نے انگریزی حکومت کی ملازمت اختیار کی ۔ ۱۸۵۵ء میں وہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سے منسلک تھا اور کئی سال تک سندھ کے کمشنر کے منشی کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دیتا رہا ۔ ۱۸۹۶ء میں اسے خان بہادر کا خطاب عطا ہؤا اور جب ۱۸۹۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن مالوف سکھر چلا گیا تو اسے حکومت کی جانب سے ایک جاگیر بھی مل گئی ۔ اس تاریخ کے علاوہ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے ۱۸۶۲ء میں ایک 'مکران نامہ' اور ۱۸۶۷ء میں ایک 'خلیج نامہ' (خلیج فارس کے متعلق) بھی شائع کیا تھا ۔ اس کے علاوہ اس نے سندھ کے شکستہ آثار اور 'وقائع السّیر جیسلمیر' کے نام سے اپنے دورۂ راجپوتانہ کے حالات بھی لکھے تھے ۔ یہ دوسری کتاب ۱۸۷۵ء میں کراچی میں طبع ہوئی تھی ۔

'لب تاریخ سندھ' میں شروع زمانے سے لے کر ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ تک کے (جو کتاب کی تاریخ تکمیل ہے) حالات بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں کتاب کا خلاصہ انگریزی میں دیا گیا ہے ۔ کتاب میں مصنف کے سوانحِ حیات بھی مذکور ہیں ۔ لیکن زیادہ مفصل حالات پنڈت پراگ ناراین بھارگوا کی تصنیف 'صحیفہ' زرین' (اردو) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۰۲ء میں درج ہیں ۔ 'لبّ تاریخ سندھ' ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ میں امرتسر میں چھپی[2] تھی ۔

(۱۰) 'فتح نامہ کافرستان' ، از میرزا شیر احمد جلال آبادی ، افغانوں کی فتح کافرستان کی کیفیت نظم میں ۔ یہ نظم لاہور میں ۱۸۹۶ء اور پھر ۱۹۱۳ء/۱۳۳۱ھ میں محفل کے 'جنگ نامہ حضرت امام محمد حنیفہ' کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوئی[3] ۔

---

(۱) دیکھئے سٹوری : وہی کتاب ، ص ۶۴۸ - ۱۲ - ۷ ۔ اسی مصنف کی ایک اور کتاب ہیرنگ نامہ لارڈ نارتھ بروک کے سوانح حیات پر مشتمل ہے ۔

(۲) دیکھئے سٹوری : وہی کتاب ، ص ۶۵۹ ۔

(۳) دیکھئے سٹوری سیکشن ۲ ، کراسہ ۲ ، ص ۴۰۵ ۔

(۱۱) **'تواریخِ خورشید جہان'** ، از شیر محمد خان ، افغانوں کی اصل و نسل کی تاریخ (۳۲۰ صفحات) - یہ کتاب لاہور میں ۱۸۹۴ء میں چھپی تھی[1] - 'خورشید جہان نما' نام کی ایک اور کتاب سید الٰہی بخش بن علی بخش حسینی اورنگ آبادی (متوفی ۱۸۹۲ء) نے بھی لکھی تھی جو عمومی نوعیت کی ہے اور جس میں دنیا کے مختلف ممالک کے جغرافیائی حالات کے علاوہ انبیاء ، فلاسفہ ، اولیاء اور شعراء کے حالات بھی مندرج ہیں - آخر میں مختلف صوفی دبستانوں کا اور مصنف کے اپنے خاندانی حالات کا ذکر ہے - مصنف کا خود نوشتہ نسخہ بوہار لائبریری میں موجود ہے اور اس پر ایچ ، بیوریج نے ایک مقالہ لکھا تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے مجلے میں ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا تھا[2] -

مندرجہ بالا تواریخ کے علاوہ ہندوستان کی عام تاریخ سے متعلق زمانہ زیرِ بحث میں کئی اور کتابیں تالیف ہوئیں جن میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں : 'مجمع السلاطین' از نواب غوث محمد خان (نواب جاورہ) - 'داستانِ ترکتازانِ ہند' از میرزا نصراللہ خان فدائی ، نواب دولت یار جنگ بہادر (محمد بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی وفات تک) - مصنف ایرانی تھا اور حیدر آباد دکن میں نظام میر محبوب علی خان کا اتالیق رہا تھا - ۱۸۹۲ء میں بمبئی میں طبع ہوئی - 'گلستانِ ہند' از کنور درگا پرشاد مہر سندیلوی جو ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی (۱۸۹۷ء) کی یادگار میں لکھی گئی - 'زینۃ الزمان فی تاریخ ہندوستان' از ملک الکتاب خان صاحب میرزا محمد بن میرزا محمد رفیع ، مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء - ۱۸۹۳ء[3] -

مخصوص موضوعات پر جو اور کتابیں اس زمانے میں لکھی گئیں ، ان میں سے محمد آل حسین مودودی کی 'نخبۃ التواریخ' کا ذکر کیا جا سکتا ہے ، جو مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں شہر امروہہ کے تاریخی حالات و واقعات اور وہاں کی بعض مشہور شخصیتوں کے ذکر پر مشتمل ہے - یہ کتاب امروہے میں ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی تھی -

☆ ☆ ☆

---

(۱) اسٹوری : وہی کتاب ، ص ۴۰۷ -

(۲) اسٹوری : سیکشن ۲ ، کراسہ ۱ ، ص ۱۵۲ -

(۳) ان کتابوں کے لئے دیکھئے اسٹوری : سیکشن ۲ ، کراسہ ۳ ، ص ۴۹۰ - ۴۹۲ -

کتابیات

1. Storey, C. A , Persian Literature.
   (Section II, Fascicules 1, 2 and 3, London, 1835-39).

2. Elliot and Dowson : A History of India as told by its own historians (Vol. 8, Allahabad 1964)

3. Browne, E. G , and Nicholson, R. A.: A Descriptive Catalogue of the Oriental MSS Cambridge, 1932.

4. Ivanow : Concise Descriptive Catalogue of the Persian MSS. in the collections of the Asiatic Society of Bengal. Calcutta, 1927

5. Asafiya Library (جلد سوم فہرست کتب عربی و فارسی و اردو مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی) Hyderabed 1928-29/1347 H.

6. Abdul Muqtadir Khan : Catalogue of the Bankipur Library.

7. Rieu : Catalogue of the Persian MSS in the British Museum.

8. دراگ ناراین بھارگوا ۔ صحیفۂ زریں ، لکھنؤ ۱۹۰۲ء

9. Sachau and Ethe : Catalogue of persian Manuscripts in the Bodleian Library, Oxford

10. Abdul Muqtadir : Catologue of the Buhar Library.

11. Stewart, Descriptive Catalogue of the Oriental Library of Tippo Sultan of Mysore, Cambridge, 1809.

12. Sprenger : A Catalogue of Arabic, Persian and Hindustany Manuscripts of the Libraries of the Kings of Oudh, Calcutta, 1854.

چوتھا باب

تذکرے

(الف) شعراء کے تذکرے

دورِ اول ۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۰ء

اس دور کے حالات کا مختصر جائزہ

اس دور میں رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ انگریزی ، اُردو اور دیگر مقامی زبانوں نے لے لی ۔ اس سے پہلے ولیم بینٹنک (۱۸۲۸ء - ۱۸۳۵ء) کے زمانے میں انگریزی سرکاری زبان قرار دے دی گئی تھی ۔ اس کی تعلیم کے لئے اس سرزمین کے بعض حصوں میں انگریزی مدرسے قائم کر دیے گئے ۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں لندن یونیورسٹی کے نمونے پر قائم کی گئیں ۔ اس کے بعد بتدریج دوسرے حصوں میں بھی انگریزی اسکول اور یونیورسٹیاں قائم کر دی گئیں اور اس طرح انگریزی زبان کا رواج اور نفوذ روز بروز بڑھتا گیا ۔ تھوڑی دیر ہی میں اس برّصغیر کے بعض شہروں سے انگریزی اخبارات ، انگریزوں کی ادارت اور اکثر انگریز حکومت کی امداد اور پشت پناہی سے شائع ہونا شروع ہوگئے ، جن سے انگریزی زبان کی اشاعت میں بہت مدد ملی ۔

آئندہ چل کر اہالیٔ ہند کے اصرار پر انگریزی حکومت نے بعض مقامی زبانوں کو مقامی طور پر سرکاری زبان قرار دینا تسلیم کر لیا ، چنانچہ بعض علاقوں میں اُردو ، ہندی ، بنگالی اور بعض مقامی زبانیں عدالتوں اور بعض سرکاری دفاتر میں استعمال ہونے لگیں ۔

اس دور میں اگرچہ فارسی کو رفتہ رفتہ سرکاری زبان کے درجے سے خارج کر دیا گیا لیکن ابھی تک اس کو بحیثیت ایک ادبی زبان کے محدود مقبولیت حاصل رہی ، چنانچہ بعض ریاستوں میں خاص طور پر وہاں کے حکام اور امراء کی سرپرستی کے سبب فارسی میں بعض ادبی کتابیں تالیف کی گئیں ۔ اس سلسلے میں حیدر آباد دکن اور بھوپال نے خاص خدمات انجام دیں ۔ اس کا سبب حیدر آباد کے آصف جاہی خاندان کی ادب نوازی

اور بھوپال کے امراء ، خاص طور سے نواب شاہجہان بیگم اور ان کے فاضل شوہر نواب صدیق حسن خان کی ادب پروری تھی ۔ اگرچہ نواب سکندر بیگم نے ۱۸۵۹ء میں فارسی کے بجائے اُردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا تھا لیکن اس مسلم ریاست میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا ۔ چنانچہ اس دور کے جملہ تیرہ فارسی تذکروں میں سے چھ تذکرے صرف بھوپال میں تالیف کئے گئے ، جن میں سے ایک خود نواب صاحب اور دو ان کے بیٹوں نے لکھے ہیں ۔ اس طرح دو تذکرے (اختر تاباں اور تذکرۃ الخواتین) نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے نام معنون ہیں اور ایک تذکرہ صبا گوباموی نے جو ریاست کی ملازمت میں تھے ، تالیف کیا ہے ۔ ان تذکروں میں سے 'شمع ِ انجمن' میں ۱۴ ، 'نگارستان ِ سخن' میں ۱۰ ، صبح ِ گلشن میں ۱۶ ، 'روز ِ روشن' میں ۲۸ ایسے شعراء کا ذکر ہے جو صرف بھوپال سے تعلق رکھتے تھے ۔ علاوہ ازیں 'اختر ِ تاباں' اور 'تذکرۃ الخواتین' میں نواب سکندر بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کا ذکر فارسی شاعرات کی حیثیت سے آیا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی ابھی تک فارسی میں شعر کہتی تھیں ۔

اسی طرح تکملہ 'مقالات الشعراء' میں ۸۲ ایسے شعراء کا ذکر ہے جو اکثر اس زمانے میں سندھ میں رہتے تھے اور 'سخنوران ِ چشم دیدہ' میں ۲۲۰ ایسے معاصر شعراء کا ذکر ہے جن میں سے اکثر دکن سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس زمانے کے تذکروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس وقت کے متعدد نوابین و امراء فارسی میں شعر کہہ لیتے تھے جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں اور ان کے دو فرزندوں کا 'شمع ِ انجمن' ، 'نگارستان ِ سخن' اور 'صبح ِ گلشن' میں بحیثیت فارسی شعراء کے ذکر آیا ہے ، یا 'سخنوران ِ چشم دیدہ' میں میر محبوب علی خان نظام ِ دکن ، میر حسین میاں نواب قصبہ مانگرول ، نواب جعفر حسین خان ، میر رحمٰن علی سیف الملک ، نواب صبغۃ اللہ خان ، نواب عزیز یار جنگ (جن میں سے ایک حیدر آباد کے امراء میں سے تھا) اور نواب کلب علی خان والیٔ رامپور کا فارسی شعراء کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے ۔

اسی طرح اس زمانے کے تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں بعض ہندو بھی فارسی میں شعر کہتے تھے ، مثلاً 'سخنوران ِ چشم دیدہ' میں راجا نیم چند رام احقر ، نیرنگ پرشاد بزمی ، گوپال سہای تفتہ ، بہاری لال رمز ، مہاراجا کشن پرشاد شاد ، سورج بھان میکش اور گوری شنکر مجذوب کا ذکر فارسی شعراء میں کیا گیا ہے ۔

اس دور کے تذکروں کی حسب ذیل تقسیم بندی کی جاسکتی ہے :

۱۔ **'عام تذکرے'** جن میں فارسی کے عام شعراء کا ذکر بغیر کسی خاص تخصیص یا قید کے دیا گیا ہے : 'ریاض الشعراء'، 'شمع محفل سخن'، 'شمع انجمن'، 'نگارستان سخن'، 'صبح گلشن'، 'روز روشن'، 'تذکرۃ الشعراء غنی'۔

۲۔ **کسی خاص عہد کے تذکرے :** 'سخنوران چشم دیدہ'، مؤلف کے معاصرین کا تذکرہ ہے۔

۳۔ **کسی خاص علاقے کے تذکرے :** 'تکملۂ مقالات الشعراء' سندھ کے شعراء کا تذکرہ ہے۔

۴۔ **خواتین کے تذکرے :** 'اختر تاباں'، 'تذکرہ الخواتین'، 'حدیقۂ عشرت'۔

۵۔ **کسی خاص صنف شاعری کے تذکرے :** 'ہفت آسمان'، مثنوی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔

گذشتہ دور کے برخلاف جس میں چار تذکرے ایرانیوں نے لکھے تھے اس دور میں صرف ایک تذکرہ (تذکرۃ الخواتین) ایک ایرانی (ملک الکتاب شیرازی) کی تالیف ہے۔ اسی طرح پچھلے دور میں آٹھ تذکرے ہندوؤں نے لکھے تھے۔ اس دور میں صرف ایک تذکرہ (حدیقۂ عشرت) ایک ہندو نے لکھا ہے۔

اس دور کے تذکروں کا مختصر جائزہ

۱۔ **'ریاض الفردوس'**۔ مولوی محمد حسین خان نے ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ میں لکھا۔ اس میں ۱۵۶ شعرای فارسی کا ذکر تاریخی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ اس کی جلد اول میں عربی شعراء، جلد دوم میں فارسی شعراء اور جلد سوم میں اردو شعراء کا ذکر ہے۔ جلد دوم کے باب اول میں نظم اور باب دوم میں نثر پر بحث ہے۔ باب اول میں پانچ فصلیں ہیں۔ فصل اول میں حمد و نعت و منقبت ہے، فصل دوم واسوخت اور مخمس پر ہے، فصل سوم غزلیات و مقطعات پر ہے۔ فصل چہارم میں صنائع لفظی و معنوی، رسول کریمؐ، خلفای راشدینؓ، حضرت فاطمہؓ و حضرت حسینؓ اور دوسرے بزرگان دین کی تاریخ فوت اور وہ اشعار دئے گئے ہیں جو مکاتبات میں کام آتے ہیں اور نثر کو آراستہ کرتے ہیں۔ فصل پنجم

میں شعراء کا تذکرہ دو قسمت میں دیا گیا ہے - قسمتِ اول میں ۱۴۰ شعرای متقدم اور قسمتِ دوم میں شاعرات کا ہے - اس کتاب کا وہ حصہ جو تذکرۂ شعرا پر مشتمل ہے بالکل مختصر ہے (اور اس میں کل ۳۰ صفحے ہیں) - یہ کتاب نونکشور لکھنو سے ۱۸۶۷ء/۱۲۸۴ھ میں شائع ہوئی -

۲- شمعِ محفلِ سخن - سید عبداللطیف الطاف حسنی نے ایرانی اور ہندوستانی شعراء کے ذکر پر لکھا ہے - اس کا قلمی نسخہ، فہرست کتاب خانہ مدراس میں (نمبر ۱۲۷۹ پر) موجود ہے -

۳- ہفت آسمان - احمد علی احمد نے ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں لکھا - مؤلف ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوا اور مدت تک کلکتہ کے گورنمنٹ سکول میں مدرس رہا - وہاں اس نے متعدد فارسی کتب کے متون کی تصحیح کرکے ان کو شائع کرایا - ۱۸۷۳ء میں فوت ہوا - جیسا کہ کتاب کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے - مؤلف نے یہ کتاب مثنوی کی سات بحروں میں لکھنے والوں کے حالات اور کلام پر لکھی ہے لیکن اس کا صرف ایک حصہ (آسمانِ اول) شائع کر سکا - باقی چھ 'آسمان' معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ناگہانی موت کی وجہ سے ناتمام رہ گئے - مؤلف نے اس کتاب کی ترتیب میں اکثر معتبر کتبِ تاریخ و تذکرہ وغیرہ سے استفادہ کیا ہے - کتاب کے مقدمے میں مثنوی کی تعریف اور ۱۵ مثنوی گو شعراء کے حالات دیے ہیں - پھر آسمانِ اول کے تحت "بحر سریع" کی ۸۷ مثنویاں دی ہیں - یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے لیکن افسوس کہ اس کے باقی چھ حصے شائع نہیں ہو سکے - 'ہفت آسمان' (جس میں صرف آسمانِ اول ہے) ۱۸۷۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی -

۴- شمعِ انجمن - اس دور کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خان نے ۱۸۷۵ء/ ۱۲۹۲ھ میں لکھا - نواب صدیق حسن قنوج میں پیدا ہوئے - قنوج سے وہ بھوپال چلے گئے جہاں وہ نواب شاہجہاں بیگم کے استاد رہے - پھر انہوں نے نواب شاہجہاں بیگم سے شادی کر لی اور ان کے معتمد المہام مقرر ہوئے - ۱۸۸۵ء میں انگریزوں نے ان کو اہل حریت ہونے اور ان کے مذہبی تعصب کے سبب ان کے عہدے سے معزول کر دیا - ان کا شمار اس وقت کے ممتاز علماء و فضلاء میں ہوتا ہے - انہوں نے متعدد کتابیں عربی اور فارسی میں لکھی ہیں - وہ ۱۸۸۹ء میں بھوپال میں فوت ہوئے -

'شمع انجمن' میں ۹۷۸ شعرای متقدّم و متاخرّ کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں اکثر کتب تاریخ و تذکرہ سے استفادہ کیا ہے۔ اکثر شعراء کے حالات مختصر ہیں۔ بعض ایسے معاصر شعراء کا ذکر ہے جو دوسرے تذکروں میں نہیں ملتے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ میں مطبع شاہجہانی بھوپال سے شائع ہوئی۔

۵۔ **نگارستان سخن**۔ یہ کتاب نواب صدیق حسن کے صاحبزادے سید نور الحسن خان نے ۱۸۷۵ء میں لکھی۔ مؤلف نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی 'طور کلیم' کے نام سے لکھا ہے۔ مؤلف نے ۳۳ ایسی کتابوں کے نام خاتمے میں دیے ہیں جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے۔ اس میں ۶۵۱ شعرای متاخرّ و معاصر کا ذکر ہے۔ بعض شعرای متقدّم کا بھی ذکر ہے۔ یہ مختصر سا تذکرہ ہے اور اکثر شعراء کا تعارف ایک جملے میں کرایا گیا ہے اور ان کے دو تین شعر دیے گئے ہیں۔ تالیف کے وقت مؤلف کا سن صرف ۱۴ سال تھا، لہٰذا بچپنے میں اس موضوع پر کتاب لکھنا ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ ظاہراً یہ خود نواب صدیق حسن خان کی تالیف ہے، جو انہوں نے اپنے بچے کے نام منسوب کر دی، جیسا کہ 'مآثر صدیق' کے ضمیمے میں ان کے دوسرے صاحبزادے سید علی حسن خاں نے اپنے والد نواب صدیق حسن خان کی تصنیف و تالیف کی ایک فہرست دی ہے۔ اس کے حاشیے میں لکھا ہے کہ کتاب زیر بحث اصل میں نواب صدیق حسن کی ہی تالیف و تصنیف ہے جو انہوں نے اپنے لڑکے کے نام سے شائع کی۔ یہ کتاب مطبع شاہجہانی بھوپال میں ۱۸۷۶ء طبع ہوئی۔

۶۔ **صبح گلشن**۔ نواب صدیق حسن کے بیٹے سید علی حسن خاں نے ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ میں لکھی جب کہ مؤلف کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب بھی شاید ان کے والد ہی کی تصنیف ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کے نام سے شائع کر دی۔ اسی مؤلف کا ایک اردو شعراء کا تذکرہ 'بزم سخن' بھی ہے جو اس نے فارسی میں لکھا ہے۔ مؤلف نے نواب صدیق حسن کی سوانح عمری پر ایک مفصل کتاب 'مآثر صدیق' لکھی ہے۔ اسی مؤلف کی ایک دوسری اہم کتاب 'نوادر المصادر' ہے جو اس نے نواب شاہجہاں بیگم کی فرمائش پر لکھی۔

اس کتاب میں ۲۰۲۴ شعرائی متقدم و متاخرّ کا ذکر ہے، جن میں سے اکثر متاخرّ

ہیں ۔ مؤلف نے دیباچے میں 'آفتاب عالمتاب'، 'نشتر عشق'، 'شمع انجمن' اور 'نگارستان سخن' کے نام دیے ہیں جن سے اس کتاب کی تالیف میں استفادہ کیا گیا ہے ۔ اصل میں کتاب 'شمع انجمن' اور 'نگارستان سخن' کا تکملہ ہے ۔ اس کی خاص اہمیت بھی صرف معاصر شعراء کے سلسلے میں ہے ۔ اس کتاب کے متعلق بھی 'مآثر صدیقی' کے ضمیمے کے حاشیے میں لکھا ہے کہ اصل میں نواب صدیق حسن ہی کی تالیف ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کے نام شائع کی ۔ ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ میں مطبع شاہجہانی بھوپال سے شائع ہوئی ۔

۷۔ **روز روشن** ۔ یہ کتاب مظفر حسین صبا گوپاموی نے ۱۸۷۸ء میں ۱۷ سال کی عمر میں شروع کرکے ایک سال بعد مکمل کی ۔ مؤلف لکھنؤ میں پیدا ہوا ۔ بعد میں بھوپال چلا گیا جہاں وہ ریاست بھوپال کی ملازمت میں رہا ۔ اس کتاب میں ۱۴۳ شعرای متقدم و متاخر کا ذکر ہے ۔ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں نواب صدیق حسن کی تینوں مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ 'آفتاب عالمتاب'، 'نشتر عشق' اور 'ید بیضا' سے استفادہ کیا ہے ۔ زبان مذکورہ تینوں کتابوں کی طرح مصنوع ہے ۔ اس کے اکثر مطالب دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں ، لہٰذا اصالت کے لحاظ سے یہ کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ۔ یہ کتاب ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ میں مطبع شاہجہانی بھوپال میں طبع ہو کر شائع ہوئی ۔

۸۔ **اختر تابان** ۔ ابوالقاسم محتشم نے ۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ھ میں لکھی ۔ اس کتاب میں ۸۴ فارسی شاعرات کا ذکر ہے جو مؤلف نے ۳۴ کتابوں سے استفادہ کرکے لکھا ہے ۔ اس کے بعض مآخذ ناپید ہیں ۔ مثلاً 'حیات الشعراء'، 'باغ ارم' وغیرہ ۔ یہ کتاب بھی مطبع شاہجہانی میں ۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ میں طبع ہو کر شائع ہوئی ۔

۹۔ **تذکرۃ الخواتین** ۔ میرزا محمد ملقب بہ ملک الکتاب نے اسے ۱۸۸۸ء/۱۳۰۲ھ میں نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے نام پر لکھا ۔ مؤلف نے اپنے مآخذ میں صرف 'مشاہیر النساء' تالیف محمد ذہینی آفندی کا نام دیا ہے ، جب کہ اصل میں یہ کتاب 'خیرات جان' تالیف محمد حسن خان مطبوعہ تہران کی من و عن نقل ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں مؤلف نے 'اختر تابان' کا جو اس کتاب سے سات سال پہلے بھوپال سے شائع ہوچکی تھی ، نام نہیں دیا ہے ۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں کل ۵۳ شاعرات کا ذکر ہے جب کہ اس سے سات سال پہلے شائع ہونے والی 'اختر تابان' میں ۸۲ شاعرات کا ذکر ہے ۔ مؤلف نے ملکۂ وکٹوریہ کے ذیل میں اس کے زمانے کے بعض

اہم تاریخی واقعات لکھے ہیں ۔ شاعرات کا کلام اور حال دونوں نہایت مختصر ہیں ۔ بھوپال میں ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ میں طبع ہو کر شائع ہوئی ۔

۱۰۔ **تکملۂ مقالات الشعراء** ۔ محمد ابراہیم متخلص بہ مسکین و خلیل نے تقریباً ۱۸۸۸ء/ ۱۳۰۲ھ میں لکھی ہے ۔ مولف نے اس کتاب کے علاوہ فارسی میں دو دیوان بھی ترتیب دیے ہیں ۔ مؤلف نے اس کتاب کو قانع کے 'مقالات الشعراء' کے تکملے کے طور لکھا ہے جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے ۔ اس کی تالیف میں 'کلمات الشعراء'، 'ید بیضا' اور 'مقالات الشعراء' سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ اس میں ۸۲ شعراء کا ذکر ہے جو اصلاً سندھی تھے یا سندھ سے ان کا تعلق تھا ۔ یہ کتاب فارسی تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کے وقت تک سندھ میں فارسی شاعری کا رواج اس قدر تھا کہ بیسیوں فارسی شعراء وہاں موجود تھے ۔ یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے ۱۹۵۷ء میں پیر حسام الدین راشدی کی تصحیح و مفید حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی ۔

۱۱۔ **حدیقۂ عشرت** ۔ درگا پرشاد مہر سندیلوی نے ۱۸۹۳ء میں لکھی ۔ اس کتاب میں ۴۹ سے زیادہ شاعرات کا ذکر ہے ۔ اس لحاظ سے یہ اس وقت تک کا مفصّل ترین تذکرۂ شاعرات ہے ۔ کوین پریس سندیلہ میں ۱۸۹۴ء میں طبع ہو کر شائع ہوا ۔

۱۲۔ **تذکرۃ الشعراء** ۔ محمد عبدالغنی غنی فرخ آبادی نے ۱۹۰۷ء میں مکمل کیا ۔ اس کے مقدمے میں گیارہ ایسی کتابوں کے نام دیے ہیں جن سے مؤلف نے اس کی تالیف میں مدد لی ہے ۔ اس تذکرے میں ۱۰۴۱ شعرای متقدّم و متاخّر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ ہر شاعر کا حال اس کے تخلص ، نام ، سالِ وفات ، وطن ، مسلک ، عہد (اس کے عہد کے بادشاہ کا نام) کے عنوانات کے تحت ایک جدول کی صورت میں دیا گیا ہے ۔ اس کتاب میں کوئی نمونۂ کلام نہیں ۔ یہ تذکرہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پریس علی گڑھ میں طبع ہو کر شائع ہوا ۔

۱۳۔ **سخنورانِ چشم دیدہ** ۔ یہ کتاب مولوی ترک علی شاہ قلندر نور محلی نے ۱۹۱۳ء/ ۱۳۳۲ھ میر عثمان علی خان نظام دکن کے زمانے میں لکھی ۔ اس میں مؤلف نے ۲۳۰ معاصر شعراء کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک بڑی تعداد ایسے شعراء کی ہے جو مؤلف کے شاگرد تھے ۔ یہ کتاب اس زمانے کی ادبی تاریخ کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے ۔ اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی اتنی کثیر تعداد میں فارسی گو شعراء دکن میں موجود تھے ۔ مؤلف نے دکن سے باہر کے بعض شعراء کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اسی طرح ایک یہودی اسحاق نامی کا بھی ذکر ہے جو اصلاً مصری تھا اور فارسی میں شعر کہتا تھا ۔ یہ کتاب شمس الاسلام پریس (حیدر آباد دکن) میں ۱۹۱۳ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی ۔

اس زمانے کے اردو تذکرے

اس دور کے اردو تذکروں کے لئے ملاحظہ ہو گذشتہ دور کے اردو تذکروں پر بحث کا آخری حصہ ۔

دور دوم ۱۹۳۰ء تا ۱۹۷۰ء

اس دور کے حالات کا مختصر جائزہ

اس دور سے پہلے ہی انگریزوں کا اس سرزمین پر مکمل تسلط ہو چکا تھا ۔ انگریزی ، اردو اور دوسری مقامی زبانوں کے سبب فارسی کا رواج حد درجہ کم ہو گیا ۔ اس دور میں ۱۹۴۷ء تک اگرچہ فارسی اکثر یونیورسٹی اور کالجوں میں پڑھائی جاتی تھی لیکن ایران اور اس برصغیر کے درمیان آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوگئی تھی ۔ غیر ملکوں کے تسلط اور ان کے سیاسی عزائم کی وجہ سے ایران اور اس سرزمین کا تعلق برائے نام ہی رہ گیا تھا ۔ فارسی کی عدم سرپرستی کے سبب تمام تر کتابیں انگریزی ، اردو اور دوسری مقامی زبانوں میں لکھی جاتی تھیں ۔ غیر ملکی تسلط کے آخری زمانے میں ایران اور اس برصغیر کے درمیان آمد و رفت پر پابندی کم ہوگئی ، چنانچہ دونوں حصوں میں دوبارہ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ اس کے نتیجے میں ڈاکٹر اسحاق نے ایران سے واپسی پر 'سخنوران ایران در عصر حاضر' اور بمبئی کے ڈنشاجی بھائی نے 'شعرای عصر پہلوی' لکھی ۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان و ہند کی آزادی کے بعد اس سرزمین کے لوگوں اور ایرانیوں کا باہمی ارتباط نزدیک تر ہوگیا ۔ خاص طور سے پاکستان اور ایران میں آمد و رفت کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا ۔ ان دونوں ملکوں میں روز افزوں دوستی اور تعاون کے سبب پاکستانی اور ایرانی لوگ ایک دوسرے کے نزدیک تر آتے جا رہے ہیں اور عام آمد و رفت کی سہولتوں اور تعلیمی وظائف کے سبب اساتذہ اور طلباء کا مبادلہ ہو رہا ہے ۔ طلباء کو

تعلیمی سہولتیں مہیا ہونے کے سبب لوگ کافی تعداد میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں حصول تعلیم کے لئے جا رہے ہیں ۔ فارسی کا رواج غیر ملکی تسلط ختم ہونے سے روز بروز بڑھ رہا ہے ۔ چنانچہ اس زمانے میں ڈاکٹر عرفانی ، برلاس اور ڈاکٹر رضوی نے اپنے تذکرے ایران کے قیام کے دوران میں لکھے ہیں ۔ ان میں سے اول الذکر پاکستانی سفارت سے وابستہ تھے جب کہ مؤخر الذکر دونوں حضرات تہران یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کرنے گئے تھے ۔ اسی طرح ہندوستان کے ڈاکٹر نیکو نے بھی اپنا تذکرہ ایران ہی میں لکھا ہے ۔ وہ بھی تہران یونیورسٹی کے وظیفے پر وہاں ڈاکٹریٹ کرنے گئے تھے ۔ اس زمانے میں ایک ایرانی آقای خاشع نے بمبئی میں رہ کر شعرای یزد پر ایک تذکرہ لکھا ہے ۔

اس دور کے تذکروں کی تقسیم بندی

اس دور کے تذکروں کی حسب ذیل تقسیم بندی کی جا سکتی ہے :

۱۔ 'کسی خاص عہد کے تذکرے': 'سخنوران ایران در حاضر'، 'شعرای عصر پہلوی'۔

۱۔ 'کسی خاص علاقے کے تذکرے' : 'ایران صغیر' ، 'تذکرہ شعرای فارسی زبان پشاور' ، 'تذکرہ شعرای یزد' ، 'برگزیدہ از پارسی سرایان کشمیر' ، 'تذکرۂ شعرای پنجاب' ، 'تذکرۂ شعرای کشمیر' ، 'شاعران پارسی گوی معاصر پاکستان' ۔

اس دور کے تذکروں کا مختصر جائزہ

۱۔ **سخنوران ایران در عصر حاضر** ۔ یہ کتاب ڈاکٹر محمد اسحاق نے ۱۹۳۰ء میں لکھنا شروع کی ۔ اس کی جلد اول کو دہلی سے ۱۹۳۲ء میں اور جلد دوم کو ۱۹۳۶ء میں شائع کیا گیا ۔ ڈاکٹر اسحاق پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں فارسی زبان و ادب کے بارے میں تحقیق کی غرض سے ایرانی حکومت کی دعوت پر ایران گئے اور واپسی پر انہوں نے اس کتاب کی جلد اول شائع کی ۔ دوبارہ ۱۹۳۴ء میں ایرانی حکومت کی دعوت پر پھر ایران گئے اور واپسی پر اس کتاب کی جلد دوم شائع کی ۔ اس وقت ڈاکٹر اسحاق کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی و عربی کے شعبہ میں پروفیسر ہیں ۔ اس کتاب کی جلد اول میں ۳۳ اور جلد دوم میں ۵۱ جدید ایرانی شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ پروین اعتصامی کا ذکر دونوں جلدوں میں ہے ، لہٰذا کل ۸۳ شعراء کا ذکر ہے ۔ پہلی جلد میں صرف ایک شاعرہ (پروین اعتصامی)

کا ذکر ہے لیکن دوسری جلد میں دو شاعرات (پروین اور جنت) کا ذکر ہے ۔

اس تذکرے میں تقریباً تمام تر شعراء دورۂ مشروطیت یا اس کے بعد کے شعراء ہیں ۔ جدید فارسی شعراء پر یہ پہلا تذکرہ ہے ۔ اس میں بعض شعراء کی ''تصانیف'' یعنی نغمات بھی دیے گئے ہیں ۔ ہر شاعر کا فوٹو دیا گیا ہے ۔ صرف پہلی جلد میں اس وقت تک عورتوں کی تصویروں کی اشاعت پر پابندی ہونے کے سبب پروین اعتصامی کی تصویر شائع نہیں کی جا سکی تھی جو بعد میں پابندی اٹھ جانے کے سبب دوسری جلد میں شائع کر لی گئی ہے ۔ مؤلف نے خاص طور سے فرانسیسی زبان کے ان الفاظ کی تشریح کی ہے جو اس زمانے میں بعض فارسی شعراء نے استعمال کئے ۔ حاشیے میں بعض دوسرے مشکل الفاظ کی بھی تشریح کی ہے اور بعض تاریخی وقائع کی طرف جو اشارہ ملتا ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے ۔ اس کتاب میں پہلی دفعہ بعض فارسی اشعار کے لئے موسیقی کے نوٹ دیے گئے ہیں ۔ اکثر شعراء کے حالات مفصل دیے ہیں اور ان کی زندگی سے متعلق اکثر ضروری معلومات دے دی ہیں ۔ یہ حالات اس نے خود شعراء سے مل کر حاصل کئے یا بعض معتبر رسالوں سے لئے ۔ انتخاب اشعار میں مؤلف نے نہایت دقت سے کام لیا ہے ۔ قصداً کسی شاعر کے ادبی مقام پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا ، چونکہ بقول مؤلف اس سے بعض شعراء کی دل آزاری کا خوف تھا ۔

مجموعی طور پر یہ کتاب جامعیت اور طرز تحریر کے لحاظ سے فارسی کے بہترین تذکروں میں سے ہے ، بلکہ اس وقت تک کا بہترین تذکرہ ہے ۔ اس کتاب کے ذریعے پہلی دفعہ اس سرزمین کے لوگوں کو جدید فارسی سے ، جو اس وقت ایران میں معمول تھی ، روشناس کرایا گیا ہے ، ورنہ اس سے قبل یہاں کے لوگوں کو ان تبدیلیوں کے متعلق ، جو مغلوں کے بعد ہمسایہ ملک ایران کی زبان اور طرز تحریر میں آ گئی تھیں ، بالکل خبر نہیں تھی ۔

۲۔ **شعرای عصر پہلوی** ۔ دنشاجی بھائی ایرانی (پارسی) نے ۱۹۳۳ء میں بمبئی میں لکھی ۔ اس میں بعض جدید عہد (پہلوی) کے شعراء کا کلام مع انگریزی ترجمے کے دیا گیا ہے ۔ اسی طرح ان کے حالات بھی فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں دیے گئے ہیں ۔ یہ کتاب بمبئی میں ۱۹۳۳ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی ۔

۳۔ **ایرانِ صغیر یا تذکرۂ شعرای پارسی زبان کشمیر** ۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے ۱۹۵۵ء میں تہران میں لکھ کر وہیں سے ایک سال بعد شائع کرائی ۔ ڈاکٹر عرفانی

مدت تک ایران میں مختلف سرکاری عہدوں پر شروع میں انگریزوں کی طرف سے اور آزادی کے بعد پاکستانی حکومت کی طرف سے فائز رہے ۔ کتاب کی تالیف کے وقت وہ پاکستانی سفارت میں پریس اتاشی تھے ۔ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں مختلف منابع سے استفادہ کیا ہے ۔ اس کتاب میں کشمیر کے کل ۳۲ شعراء کا ذکر ہے ۔ تقریباً آدھی کتاب ''غنی اور جویا'' کے حالات اور منتخب کلام پر مشتمل ہے ۔ کتاب کی ابتدا میں مؤلف نے کشمیر ، کشمیری زبان ، اسلام کی کشمیر میں اشاعت ، سکھوں اور ڈوگروں کے زمانے میں کشمیر کے حالات اور تالیف کتاب کے وقت تک کشمیر کے سیاسی حالات پر بحث کی ہے ۔ بعد ازاں ''کشمیر در ادبیات فارسی'' کے عنوان سے فیضی ، عرفی ، قدسی ، کلیم ، طالب ، احسان اللہ اور جویا کے وہ اشعار دیے ہیں جو انہوں نے کشمیر کی تعریف میں کہے ہیں ۔ پھر ''کشمیر در نظر اقبال'' کے تحت علامہ اقبال کے وہ اشعار دیے ہیں جو انہوں نے کشمیر کی تعریف میں کہے ہیں ۔ تقریباً ایک تہائی کتاب میں ان موضوعات پر بحث کی گئی ہے ۔

یہ کتاب گذشتہ دو کتابوں کی طرح جدید فارسی میں لکھی گئی ہے اور ایرانیوں اور فارسی زبان بولنے والے لوگوں کو کشمیر اور کشمیر میں فارسی شاعری کے رواج سے روشناس کرانے کے لئے ایک مفید کتاب ہے ۔ یہ کتاب تہران سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ۔

۴۔ **شعرای فارسی زبان پشاور** ۔ یہ کتاب ڈاکٹر نذیر حسن میرزا برلاس نے ۱۹۵۷ء میں فارسی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی مقالے کے طور پر لکھی ہے ۔ مؤلف آج کل اسلامیہ کالج پشاور میں صدر شعبۂ فارسی ہیں ۔ اس کتاب کو مؤلف نے مختلف کتبِ تذکرہ و تاریخ و کلیات و دواوین و آثار منظوم شعراء و جراید و مجلّات اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرکے لکھا ہے ۔ اس کتاب میں پشاور کے ۱۱ فارسی گو شعراء کا ذکر ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں ایران و پاکستان کے ادبی تعلقات ، پشاور کے ایرانی خاندان ، اس شہر کا پہلا فارسی گو شاعر (خوشحال خان خٹک) اور پشاور میں فارسی شاعری کی مختصر تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ بعد ازاں فصل اول میں پشاور میں فارسی زبان اور شاعری کا ارتقا ، فصل دوم میں ایران کے اجتماعی حالات کا پشاور پر اثر ، فصل سوم میں پشاور کی فارسی شاعری کی خصوصیات پر بحث کرکے فصل چہارم میں پشاور کے مشہور شعراء کے حالات اور منتخب کلام دیا ہے ۔ اس حصے میں خوشحال خان خٹک ، قاسم علی خان آفریدی ،

سید احمد پشاوری ، رعنای کاظمی ، میرزا دلاور خان ، جگر کاظمی ، شاہ برق ، ناصر ، ضیاء جعفری ، سمل بخاری اور رضا ہمدانی کے مفصل حالات اور کلام کا مفصل انتخاب دیا گیا ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مؤلف نے اپنے مقالے میں متعدد شعراء کا نام دیا ہے لیکن ان کے حالات اور منتخب کلام کا اندراج نہیں کیا ، جیسے سائیں احمد علی ، خادم ، مسگر ، بیدل ، برق گنجوی ، قضا روحی ، خلاص مکّی ، میر ، پروفیسر عبدالرحیم اور جعفر علی خان ۔ ان کے بقول مصنف قضا روحی ابھی تک بقید حیات ہیں اور فارسی میں شعر کہتے ہیں ۔ پشاور کے فارسی گو شعراء پر یہ ایک اچھی کتاب ہے ۔ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔

۵- **تذکرۂ سخنوران یزد** ۔ اسے اردشیر بور مرزبان متخلص بہ خاضع (یزدی) نے ۱۹۶۲ء میں مکمل کرکے حیدر آباد دکن سے شائع کیا ہے ۔ مؤلف کتاب کی تالیف کے وقت بمبئی میں بسلسلۂ تجارت مقیم تھا ۔ اس کتاب کی تالیف میں ۴۳ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے جن کا نام مقدمے میں درج ہے ۔ شعراء کے حالات کے ذیل میں ۱۲ مزید کتابوں کا نام دیا گیا ہے جو اس کی کتاب کے مآخذ میں سے ہیں ۔ مؤلف نے اس کتاب میں یزد ، نائین اور جندق کے ۸۵۱ شعرای متقدم و متاخر و معاصر کا ذکر دیا ہے ۔ کتاب کی دو جلدوں میں ترتیب الفبائی ہے لیکن "ملحقات" میں کوئی خاص ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی ۔ جگہ جگہ مؤلف کی کم علمی کے نمونے کتاب میں موجود ہیں ۔ مجموعی طور پر یزد ، نائین اور جندق کے شعراء کے حالات پر مفید کتاب ہے ۔

۶- **برگزیدہ از پارسی سرایان کشمیر** ۔ ڈاکٹر گردھاری ٹیکولال نے ۱۹۶۳ء میں تہران سے شائع کی ۔ ڈاکٹر ٹیکو ۱۹۲۵ء میں کشمیر میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے تہران یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ۔ کتاب کی تالیف کے زمانے میں وہ کیلیفورنیا یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے استاد تھے ۔

مؤلف نے شعراء کے حالات کے ذیل میں ۴۳ ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے ۔ مقدمے میں کشمیر میں فارسی شاعری کی تاریخ ، اہمیت ، انواع اور خصوصیات پر بحث کی ہے ۔ فارسی الفاظ کا کشمیری زبان میں ورود اور فارسی میں بعض کشمیری اور سنسکرت کی اصطلاحات کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اس کتاب میں کشمیر کے صرف ۹۱ فارسی گو شعراء کا ذکر ہے جن میں خود مؤلف بھی شامل ہے ۔

آکثر شعراء کے حالات مختصر لیکن جامع دیے ہیں اور ان کی تالیفات کا نام بھی دیا ہے ۔ کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جن میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے معلومات مل سکتی ہیں ۔ مؤلف نے بعض کشمیری اور سنسکرت کی اصطلاحات کی حاشیے میں تشریح کی ہے ۔ مقدمے میں وضاحت کی ہے کہ ساطع اور مشتاق سے متعلق اس کی یادداشتیں کشمیر سے تہران جاتے وقت گم ہوگئیں ۔ لہذا ان دو شاعروں کو وہ اس کتاب میں شامل نہیں کر سکے ۔ یہ کتاب تہران سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی ۔

۷۔ **تذکرۂ شعرای پنجاب** ۔ یہ کتاب کرنل خواجہ عبدالرشید نے ۱۹۷۷ء میں لکھی ۔ اس کتاب میں پنجاب کے کل ۴۸۶ شعرای متقدم و متاخر کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے ۔ ان میں سے ۴۶۷ کا ذکر اصل کتاب میں اور باقی کا ذکر ضمیمۂ کتاب میں ہے ۔ فہرست منابع و مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں ۹۷ کتب تذکرہ و تاریخ و دواوین و مجلات وغیرہ سے استفادہ کیا ہے ۔ جامعیتِ مطالب کے لحاظ سے یہ کتاب بہت اہم ہے ۔ شعراء کا انتخاب مؤلف نے اپنے ذوق کے مطابق خود کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ مؤلف ایک بلند ادبی ذوق کا حامل ہے ۔ اس میں بعض معاصر شعراء کا بھی ذکر ہے ۔ اقبال اکیڈمی کراچی نے ۱۹۶۷ء میں جشنِ تاج گذاریِ شاہنشاہِ ایران کے موقع پر اسے شائع کیا ۔

۸۔ **تذکرۂ شعرای کشمیر** ۔ یہ کتاب پیر حسام الدین راشدی نے ۱۹۶۷ء میں ۴ جلدوں میں لکھی ہے ۔ مؤلف اس وقت کے مشہور و معروف فارسی ادبیات کے عالم ہیں اور متعدد کتابیں اپنی تصحیح و تحشیہ سے بطرز احسن شائع کرا چکے ہیں ۔ ان میں سے متعدد کتابیں فارسی تذکرہ و تاریخ و دیوان شعرا سے متعلق سندھی ادبی بورڈ سے شائع ہوئی ہیں ۔ اس کتاب میں کل ۳۷۳ کشمیری شعراء کا ذکر الفبائی ترتیب سے دیا گیا ہے جو مؤلف نے نہایت دیدہ ریزی اور دقّت نظر سے مختلف منابع سے جمع کیا ہے ۔ مؤلف نے بعض شعرا ، ان کے مزاروں ، خطوط اور دوسری متعلقہ عمارات کی تصویریں بھی دی ہیں ، جو ظاہر ہے نہایت زحمت کے بعد حاصل ہو سکی ہیں ۔ یہ کتاب کشمیر کے فارسی شعرا پر جامع ترین کتاب ہے ۔ اس سے قبل مؤلف نے 'تذکرۂ اصلح' کو ، جو تقریباً تمام تر کشمیری شعراء پر مشتمل ہے ، اپنی تصحیح و تحشیہ سے شائع کیا تھا ۔ اسی کتاب کی تصحیح کے وقت فاضل

مؤلف کو ایک جامع تذکرہ کشمیر کے فارسی شعرا پر لکھنے کا خیال آیا ۔ یہ کتاب اسی خیال کی عملی شکل ہے ۔ اقبال اکیڈمی کراچی نے ۴ جلدوں میں ۱۹۶۷ء میں جشن تاج گذاری شاہنشاہ ایران کے موقع پر اسے شائع کیا ۔

۹۔ **شاعران پارسی گوی معاصر پاکستان** ۔ اس کتاب کو ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی نے ۱۹۶۸ء میں تہران میں فارسی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کے طور پر ترتیب دیا ہے ۔ ڈاکٹر رضوی آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج راولپنڈی میں فارسی کے استاد ہیں ۔ وہ پہلی دفعہ ۱۹۴۲ء میں تہران یونیورسٹی کے وظیفے پر ایران گئے اور وہاں چند ماہ رہ کر اپنے تحقیقی مقالے کے لئے ضروری مواد جمع کرنے کی غرض سے واپس پاکستان تشریف لے آئے ۔ ایک مدت تک یہاں کے فارسی شعراء پر تحقیق کرتے رہے ۔ بالآخر دسمبر ۱۹۶۵ء میں دوبارہ تہران گئے اور تین سال بعد یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں ایران اور پاکستان کے قدیم روابط کے تحت پاکستان میں غزنویوں کے زمانے سے جو فارسی کا رواج رہا اور اس خطے نے جو اس زبان کی خدمات انجام دی ہیں اس پر مفصل بحث کی ہے ۔ پھر موجودہ زمانے میں پاکستان میں فارسی شاعری اور اس کے طرز پر بحث کی ہے ۔ بعد ازاں پاکستان کے کل ۹۵ معاصر شعرای فارسی کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے ۔ مؤلف نے کتاب کے آخر میں ۹۹ ایسے دوسرے شعراء کا نام دیا ہے جن کا مفصل ذکر اس کتاب کی جلد دوم میں آئے گا ۔ آخر میں مؤلف نے فہرست مآخذ و منابع کے تحت ۱۵۰ عربی و فارسی کی ، ۵۱ اردو کی ، ۳۲ انگریزی کی کتابوں اور ۲۶ اردو اور فارسی کے رسالوں کے نام دیے ہیں جن کا مطالعہ کر کے مؤلف نے یہ کتاب لکھی ہے ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مؤلف اس کتاب کی تالیف میں کس قدر زحمت کا متحمل ہوا ہے ۔

یہ کتاب اس برصغیر میں فارسی ادبیات کے لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی پاکستان میں کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو فارسی میں شاعری کرتے ہیں ۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے فارسی کے شعراء صاحب دیوان ہیں ۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔

(ب) دیگر تذکرے

تمہید

اس عہد (یعنی ۱۷۰۷ء - ۱۹۷۱ء) میں بھی معاشرہ طبقات میں منقسم نظر آ رہا ہے - عوام ، مزدوروں ، کسانوں اور پیشہ وروں کے مختلف طبقے ، اگرچہ معاشی زندگی کا جزو لاینفک ہوتے ہیں ، لیکن مؤرخ اور سوانح نگار ان بے چاروں کو کسی شمار میں نہیں لاتے - البتہ سربرآوردہ اشخاص و رجال ان کے منظورِ نظر ہوتے ہیں ، جن کے دم قدم سے حکومتیں استوار ہوتی ہیں ، یعنی سلاطین و امراء ؛ یا جن سے لوگوں کی ذہنی و روحانی تربیت ہوتی ہے ، یعنی علماء و مشائخ ؛ یا وہ جو قوم کی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں ، یعنی اطباء - صوفیہ و مشائخ جن کی گرفت عوام کے ذہن پر رہی اور وہ ان کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں بندھے رہے ، ان کے متعلق بڑی کوشش و کاوش سے تذکرے مرتّب کئے گئے - ان کا ذکر ہم پہلے حصے میں کر آئے ہیں - اس حصے میں دوسرے درجے پر امراء و حکام آتے ہیں ؛ ان کے متعلق صرف دو تذکرے مرتّب ہوئے - تیسرے نمبر پر علماء ہیں ؛ چونکہ تعلیم و تدریس معاشرے کی اہم ضرورت ہے اور معلمین اور مدرسین کا احترام بھی ملحوظ خاطر رہا ہے اور اس عہد میں علم دین کے بڑے بڑے اہم مراکز بھی قائم رہے ہیں ، اس لئے ان علماء کے سوانحی تذکرے مرتّب کرنے کی طرف بھی توجہ کی گئی - چنانچہ ان دو تین تذکروں کے علاوہ جن کا ہم تفصیلی ذکر کریں گے اور بھی تذکرے لکھے گئے ، مثلاً :

آثار المحدثین از ولی اللہ - ۱۷۶۰ء - ۱۷۶۲ء/۱۱۷۴ھ - ۱۱۷۶ھ

'اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین' از نواب صدیق حسن - چوتھے درجے میں اطباء کا نام آتا ہے ؛ ان کے متعلق الگ تذکرہ نہیں لکھا گیا - طب کی اہم اور مفید کتابیں مرتّب ہوئیں - ان میں معروف اطباء کا ذکر آیا ہے - کم تر درجے میں خطّاط اور منشی آتے ہیں - چونکہ ملک کی اداری زندگی میں ان کا بھی مقام رہا ہے اس لئے ان کے متعلق بھی دو تین کتابیں لکھی گئی ہیں -

اگرچہ یہ تذکرے ، آج کل کے علمی و تنقیدی انداز پر مرتّب نہیں ہوئے اور ان کو معاصرین نے بھی مرتّب نہیں کیا ، پھر بھی یہ بہت غنیمت ہیں کیونکہ ان کی موجودگی سے ملک کی سیاسی ، علمی ، تعلیمی اور معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے -

ماثرالامراء

طلبہ تاریخ کے نقطۂ نظر سے یہ ایک نہایت مفید تذکرہ ہے۔ شہنشاہ اکبر کی تخت نشینی یعنی ۱۵۵۶ء/۹۶۳ھ سے لیکر تاریخِ تکمیل یعنی ۱۷۸۱ء/۱۱۹۴ھ تک کے زمانے میں تیموری بادشاہوں کے درباروں سے متعلق امیروں، منصبداروں، عہدہ داروں، صوبیداروں اور دوسرے نامور اور برگزیدہ اشخاص کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کتاب کے اولین مؤسس و مؤلف امیر عبدالرزاق شاہنواز خان صمصام الدولہ (۱۶۹۹ء - ۱۷۵۷ء/۱۱۱۱ - ۱۱۷۱ھ) ہیں۔ وہ دکن میں نظام الملک آصف جاہ کے دیوان سرکار تھے۔ وہ بڑے مخلص اور نیک دل انسان تھے۔ فاضل اور لائق تھے۔ شعر فہم اور ادب و تاریخ سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ ۱۷۴۲ء/۱۱۵۵ھ میں سیاسی اختلافات اور حسد و رقابت کی بنا پر منصب سے الگ ہو گئے اور پانچ سال تک یعنی ۱۷۴۷ء/۱۱۶۱ھ تک خلوت نشین رہے۔ اسی مدت میں انہوں نے 'ماثرالامرا' کی تالیف و تدوین کا کام کیا۔ جب وہ دوبارہ منصب پر متعین ہوئے تو یہ کام نامکمل پڑا رہا اور بارہ سال تک اس کی تکمیل کی انھیں فرصت نہ ملی۔ ۱۷۵۷ء/۱۱۷۱ھ میں ان کے قتل کے بعد ان کا گھر تاخت و تاراج ہوا، جس میں اس کتاب کا مسودہ بھی گم ہوگیا۔

غلام علی آزاد، مشہور مؤرخ، تذکرہ نگار اور شاعر، شاہنواز خان کے گہرے دوست تھے۔ ان کی کدوکاوش سے 'ماثرالامرا' کے اوراق پریشان مل گئے۔ اصل کتاب میں سے قطب الملک عبداللہ خان وزیر اعظم فرخ سیر کا تذکرہ ضائع ہو گیا۔ امیرالامراء سید حسین علی خان برادر قطب الملک کا سوانحی خاکہ ناقص تھا۔ غلام علی آزاد نے قطب الملک، آصف جاہ اور نظام الملک کے حالات 'سرو آزاد' سے نقل کر کے اس میں شامل کئے، حسین علی خان کے حالات بھی مکمل کر کے شامل کئے اور شاہنواز خان کے سوانح زندگی ثبت کرکے 'ماثرالامراء' کا پہلا نسخہ مرتب کیا۔ اس میں ۲۶۱ امراء کا تذکرہ تھا۔

شاہنواز خان کی وفات کے بعد اس کے فرزندِ ارجمند میر عبدالحی خان صمصام الدولہ صمصام جنگ (۱۷۲۹ - ۱۷۸۲ء/۱۱۴۲ - ۱۱۹۶ھ) نے ۱۷۶۲ - ۱۷۸۰ء/۱۱۸۲ - ۱۱۹۴ھ تک اس تذکرے کو مکمل کیا اور اپنے زمانے تک کے امراء کا ذکر شامل کیا اور کل مذکورہ اشخاص کی تعداد ۷۳۱ تک پہنچ گئی۔

تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ سال وفات کا خیال رکھ کر تقدم و تأخر کیا گیا ہے ۔ جس کا سالِ وفات معلوم نہیں تھا ، اس کے تذکرہ میں جس سال تک اس کے حالات مل سکے ہیں اسے ہی آخری سال تصور کیا گیا ہے ۔ شاہنواز خان نے اپنے دیباچے میں لکھا تھا کہ اس تذکرے سے پہلے اسی قسم کی ایک کتاب 'ذخیرۃ الخوانین' مؤلفہ شیخ فرید بھکری موجود ہے ۔ لیکن اس میں سماعی خبریں مندرج ہیں اور یہ امر فن تاریخ کے خلاف ہے ۔ مؤلف نے عہد اکبری کے پانصدی منصب رکھنے والوں کا ذکر کیا ہے ۔ جہانگیر اور شاہجہان کے عہد وسطیٰ تک تین ہزاری منصب پانے والوں اور صاحبانِ طبل و علم کو شامل کیا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب سے لے کر مؤلف کے زمانے تک کئی پنج ہزاری ہفت ہزاری زمانے کی خاک چھان رہے ہیں اور ان کی اولاد و احفاد نے کوئی ترقی نہیں کی ۔ ان کا ذکر ان کے آباء و احداد کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ لیکن بعض کا ذکر تقید منصب کے بغیر ان کے ذاتی کمالات کے باعث بھی کیا گیا ہے ۔

میر عبدالحی نے اپنے دیباچے میں تاریخ کی تیس کتابوں کا نام لیا ہے جن سے تذکرہ مرتب کرنے میں استفادہ کیا گیا ہے ۔ تقریباً تمام مشہور تواریخ کا ذکر آ گیا ہے ۔ بعض مذکورہ کمیاب تاریخیں یہ ہیں : 'مجمع الافغانی' جو خان جہان لودھی کے لئے لکھی گئی ۔ 'وقائع قندھار' ۔ 'تاریخ آسام' (؟) ۔ 'تاریخ دلکشا' ۔ ایک ہندو کی تالیف ۔ 'تاریخ محمد شاہی' ۔ 'فتحیہ' از یوسف محمد ۔ 'مرآتِ وارداب' از محمد شفیع وارد ۔ 'مرآت الوفا' از محمد علی برہانپوری ۔ اور 'تاریخ بنگالہ (؟) ۔

تیموری بادشاہوں کی وفات کے بعد ان کے لئے جو القاب تجویز ہوئے اور اکثر تواریخ میں جن کا ذکر آتا ہے ، مؤلف نے بھی اپنے تذکرے میں ان کو استعمال کیا ہے اور ان کی فہرست بھی دی ہے تاکہ ضرورت کے وقت اس سے کام لیا جا سکے ۔ استفادے کی غرض سے ہم انہیں دہراتے ہیں :

'صاحبقران' : تیمور ۔ 'فردوس مکانی' : بابر ۔ 'جنت آشیانی' : ہمایوں ۔ 'عرش آشیانی' : اکبر ۔ 'جنت مکانی' : جہانگیر ۔ 'فردوس آشیانی' : شاہجہان ۔ 'خلد مکان' : اورنگ زیب ۔ 'خلد منزل' : محمد معظم بہادر شاہ ۔

حمیدہ بانو بیگم والدۂ اکبر بادشاہ : مریم مکانی ۔ جہاں آرا بنت شاہجہان : بیگم صاحبہ ۔

مؤلف نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں عجیب و غریب واقعات و کوائف ، سیاسی عیاریوں ، فوج کشیوں اور شجاعت و مردانگی کے کارناموں کا ذکر آ گیا ہے ۔ تاریخ افراد سے بنتی ہے اور افراد بھی وہ جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت ہو یعنی بادشاہ ، شاہزادے ، امراء ، وزراء یا مذہبی ، ادبی اور معاشرتی تحریکوں کے راہنما ۔ چنانچہ تاریخ کی تمام سربرآوردہ شخصیتوں کا ذکر آ جانے سے اس تذکرے کے صفحات میں دو سو سال کی تاریخ محفوظ ہو گئی ہے ۔

مؤلف کو انساب پر خاصا عبور ہے ۔ اس نے امراء کے آباء و اجداد اور ان کے اولاد و احفاد کے سلاسل کا جابجا ذکر کیا ہے جس سے باہمی رشتوں کا تسلسل سمجھ میں آتا ہے ۔ انھی رشتہ داریوں کی بنا پر سیاسی رقابتوں اور کشمکشوں ، باہمی حمایتوں اور مخالفتوں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔

مسلمان امراء کے ساتھ ساتھ ہندو امراء کا تذکرہ بھی موجود ہے ، جنھوں نے تیموری سلطنت میں اعزازات حاصل کیے اور حکومت کے استحکام میں کوششیں کیں ۔

تذکرۂ امرا از کیول رام شاہجہان آبادی

یہ تذکرہ ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں مرتّب ہوا ۔ یہ دو ابواب میں منقسم ہے ۔ ہر باب میں دو فصلیں ہیں ۔ پہلے باب میں اکبر سے لے کر عالمگیر تک کے ان مسلمان امراء کا ذکر ہے جو خان یا دوسرے خطابات سے سرفراز تھے اور دوسری فصل میں ان امراء کا ذکر ہے جنھیں کوئی خطاب نہیں ملا تھا ۔ اول الذکر میں تقریباً ۱۵۸۸ اشخاص کا ذکر ہے اور دوسری فصل میں ۳۴۸ افراد کا ذکر آگیا ہے ۔ دوسرے باب میں بھی اسی طرح ان ہندو راجاؤں کا ذکر ہے جو راجہ یا رائے کے خطابات سے سرفراز تھے ۔ ان کی تعداد ۴۰۵ تک پہنچتی ہے ۔ دوسری فصل میں ان ہندو امراء کا ذکر ہے جنھیں کوئی خطاب تو نہیں ملا تھا لیکن وہ منصبدار تھے ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطے میں اس فصل میں الف و ب ردیف میں کسی شخص کا ذکر نہیں ۔ قیاس ہے کہ وہ نقل ہونے سے رہ گئے ہیں ۔ باقی افراد مذکورہ کی تعداد ۱۷ تک پہنچتی ہے ۔

خطاب یافتہ امراء میں نو ہزاری سے لے کر پانصدی منصب تک کے منصبداروں ا[illegible]

خطاب یافتہ امراء میں شش ہزاری سے لے کر یک ہزاری تک کے عہدیداروں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اسی طرح سرزمینِ پاک و ہند کے زمیندار ۔ راجپوت اور وہ امرائے دکن جو بارگاہ سلطانی کے ملازم تھے اور جو ہفت ہزاری سے پانصدی تک کا منصب رکھتے تھے ، اس کتاب میں شامل ہو گئے ہیں ۔

مؤلف نے اکبر سے لے کر عالمگیر کے عہد تک کی اہم سرکاری کتب تواریخ سے استفادہ کیا ہے اور ان کے نام بھی دے دیے ہیں ۔ مثلاً 'اکبر نامہ' ، 'طبقات اکبری' ، 'اقبال نامہ' ، 'توزک جہانگیری' ، 'بادشاہ نامہ' ، 'عالمگیر نامہ' ، 'مآثر عالمگیری' ، 'کلمات طیبات' اور 'رقائم کرائم' ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے اور ان تواریخ کے ایک ایک ورق کو کھنگالا ہے ۔ جہاں کہیں بھی ان برگزیدہ شخصیتوں کے متعلق اطلاعات فراہم ہوئی ہیں ان کو اکٹھا کیا ہے ۔ بعضوں کے متعلق تو صفحے ، آدھے صفحے کی تفصیل موجود ہے اور بعض کے متعلق ایک ایک سطر بھی ملی ہے تو اسے بھی لے لیا گیا ہے ۔ مؤلف نے دیباچے میں خود بتایا ہے کہ اس نے ہر شخص کے وطن ، قوم ، منصب ، خطاب ، خدمت اور سال وفات کے بارے میں تحقیق کی ہے ۔ اس کوشش و کاوش کے نتیجے میں تقریباً ۲۳۱۲ اشخاص کے متعلق معلومات فراہم ہوگئی ہیں ۔

یہ تذکرہ تیموری سلطنت کے دورِ عروج کا ہے ۔ اس سے پیشتر اور بعد میں بھی اتنی بڑی تعداد میں اس دور کے اشخاص کے متعلق معلومات یکجا نہیں ملتیں ۔ اس عہد میں مغلیہ سلاطین کے ادوار میں ایک ہی خطاب کے کئی اشخاص موجود ہیں ۔ مثلاً آصف خان ، خانخانان ، لشکر خان ، مظفر خان ، مخلص خان ۔ قاسم خان ، مرشد خان ، ہادی خان ۔ مؤلف نے اس قسم کے تمام افراد کا ذکر ایک ردیف میں کیا ہے ۔ اس طرح ایک فرد کو متشخص کرنے کی سہولت ہوگئی ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے یہ نہایت مفید اور اہم کتاب ہے ۔ اگرچہ تمام نام حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتّب کیے گئے ہیں لیکن اکثر جگہ بے ترتیبی سے بھی نام آ گئے ہیں ۔

تذکرے کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مصنّف بھی اسلامی روایات و تہذیب میں سمو گئے تھے کہ وہ کسی تعصب کے بغیر اپنی کتاب کو اللہ کے نام سے شروع کرنے

کے بعد رسولؐ خدا کی نعت میں بھی چند کلمات لکھتے تھے - چنانچہ کیول رام لکھتے ہیں :

''پس از صفت پیمبری کہ بیک حکم فاتبعونی ، گمراہان بادیہ ضلالت را سالک مسالک ہدایت نمود ۔''

تذکرۂ علمائے ہند - مؤلفہ ۱۸۸۷ء - ۱۸۹۰ء/۱۳۰۵ھ - ۱۳۰۸ھ

اس کے مؤلف رحمان علی تھے - اصلی نام محمد عبدالشکور تھا - سال پیدائش ۱۸۲۸ء/ ۱۲۴۴ھ ہے - اس تذکرے میں ۶۴۹ علماء کا حال ، بعض کا تفصیلی ہے اور بعض کا اختصار سے ، موجود ہے - مؤلف نے کتاب کے آخر میں ۷۹۴ علماء کے نام درج کیے ہیں اور امید ظاہر کی ہے کہ دوئی اور صاحب ان کے متعلق تفصیلی حالات جمع کریں گے - انہوں نے ۳۸ کتابوں کے نام لکھے ہیں جن سے اس تذکرے کی تالیف و تدوین میں استفادہ کیا ہے - بعض اصحاب کے نام بھی دیے ہیں جن سے انہوں نے زبانی یا تحریری ، بعض علماء کے متعلق معلومات حاصل کیں - ان کتابوں میں ۱۹ کتابیں وہ ہیں جن میں علماء و مشایخ کا عام ذکر موجود ہے - ۹ تذکرے خاص طور پر علمائے اودھ کے متعلق ہیں - کچھ تذکرے یا تاریخیں گجرات ، کشمیر ، سندھ اور بہار کے علماء کے لیے مخصوص ہیں - ان مذکورہ ماخذ کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا تھا - لیکن نہ معلوم وہ کیسے مؤلف کی دسترس سے باہر رہیں - اس تذکرے میں وسط ہند مدراس ، بنگال ، پنجاب کے بیشتر علماء کا ذکر نہیں آ سکا - اب تو اس تذکرے میں مذکورہ ۵۰ علماء کے متعلق مستقل کتابیں شائع ہو چکی ہیں - سید معین الحق نے 'تذکرۂ علمائے ہند' کے اردو ترجمے کے دیباچے میں ان کی فہرست دی ہے[۱]-

پاک و ہند میں صوفیہ و مشائخ کے متعلق تو بہت سے تذکرے لکھے گئے اور بعض جامع و مبسوط بھی ہیں لیکن خاص طور پر علماء کے حالات مرتب کرنے کے لیے انفرادی کوشش نہیں ہوئی - تواریخ کے آخر میں عموماً مشائخ و علماء کے اسماء ضرور مندرج ہوتے رہتے ہیں - پہلی کوششوں میں سے شیخ عبدالحق کی 'اخبار الاخیار' ، عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' ، بختاور خان کی 'مرآت العالم' ایسی کتابیں ہیں جن میں خاص طور پر علماء کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے - فارسی میں سب سے پہلی کوشش غلام علی آزاد

۱- رحمان علی : تذکرۂ علمائے ہند ، ترجمہ محمد ایوب قادری ، دیباچہ - ص ٦٧ - ٧٠ -

بلگرامی کی ہے جنھوں نے 'مآثر الکرام' کے نام سے بلگرام کے علماء و مشائخ کا الگ تذکرہ مرتب کیا۔

رحمان علی صاحب کی کوشش قابل تعریف ہے کہ انھوں نے محنت و کاوش سے اتنی بڑی تعداد میں علماء کے متعلق معلومات یکجا کر دی ہیں جو حوالے کے لئے بہت اچھا ماخذ ہیں۔

اس تذکرے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لاہور، لکھنؤ، احمد آباد، فرنگی محل، چڑیا کوٹ، کشمیر، دہلی، سندیلہ، بدایوں، جونپور وغیرہ ایسے علمی مراکز تھے اور وہاں دینی تعلیم کے ایسے چشمے جاری تھے جن سے ہزاروں طلبہ مستفیض ہوتے رہے۔ اسی سر زمین میں دینی علم کے ایسے تناور درخت قائم ہوئے جن کی گھنی شاخوں کے نیچے آئندہ نسلیں دل و دماغ کا سکون حاصل کرتی رہیں۔ ایک عالم کے ہاتھوں ایسے مدرسے کی بنیاد پڑی اور پھر وہاں درس تدریس کا ایسا سلسلہ زریں چلا کہ ایک جہان اس سے سیراب ہوتا رہا۔ یہاں کے علماء نے اپنے شاگردوں اور دوسرے طالب علموں کے لئے قرآن، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق اور تصوف کے متعلق بیش بہا تصانیف لکھیں۔ اس کتاب میں سترہ اٹھارہ ایسے علماء کا ذکر ہے جن میں سے ہر ایک کی دس سے زیادہ تصانیف مذکور ہیں۔ مثلاً سید مرتضیٰ حسین زبیدی کی ٦٦ تصانیف، نصرت علی خان دہلوی کی ٢٦ تصانیف، نقی علی خان بریلوی کی ١۵ تصانیف، شیخ نور الدین احمد آبادی کی ١٧٠ سے اوپر تصانیف، احمد رضا خان کی ۵٠ تصانیف مذکور ہیں۔

مسلمانوں کی علمی و دینی تاریخ اور علماء کے کارہائے نمایاں کا جائزہ لینے کے لئے یہ تذکرہ مفید ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔

تذکرۂ علمائے جونپور۔ سال تالیف ١٨٠١ء/١٢١٦ھ۔ مؤلف خیرالدین محمد۔

اگرچہ یہ مختصر تذکرہ ہے اور تیس اوراق پر مشتمل ہے، لیکن اپنی معلومات کے اعتبار سے اہم ہے۔ یہ تین فصلوں میں منقسم ہے، آخر میں خاتمہ اور احوال مؤلف کا تتمہ ہے:

١- در احوال بلدۂ جونپور۔

٢- در احوال بعضی فضلائے ہر طبقہ۔

٣- در تاسیس مدرسہ در جونپور و تدبیر فراہم آمدن طالبان علم و کاسبان کمال

درین بلده ـ

جونپور کی بنیاد ۱۳۷۲ء/۷۷۴ھ میں سلطان فیروز شاہ کے عہد میں رکھی گئی۔ اس کے بعد جن سلاطین عظام کے عہد میں اس کی آبادی و رونق میں اضافہ ہوا اور جن کے عہد میں خاص طور پر علمی و تعلیمی ترقی ہوئی ، ان کا ذکر کیا گیا ہے ۔ مثلاً سلطان محمود ، سلطان حسین ، سلطان ابراہیم شرقی ، سلطان بہلول ، سلطان سکندر ، بابر ، ہمایوں ، علی قلی خان اور اکبر سے محمد شاہ تک کے بادشاہ ـ

اس تذکرے میں بائیس نامی گرامی علماء کا ذکر آگیا ہے جنہوں نے اپنے علم و فضل سے دوسروں کو فیض یاب کیا اور اپنے شاگردوں کا ایک وسیع سلسلہ چھوڑا جن کی برکت سے یہ شہر علم و دین کا مرکز بنا ۔ ان علماء میں چند برگزیدہ علماء مندرجہ ذیل ہیں :

علاءالدین دہلوی ، شرف الدین لاہوری ، قاضی شہاب الدین دولت آبادی ،
عبدالمقتدر شریح ، شیخ عیسیٰ ، شیخ مبارک ، مولانا غزالی مشہدی ،
شیخ علی متقی ، ملا فراہی ، ملا محمود ، شیخ محمد شاہ ، ملا محمد علی وغیرہ

اس کتاب کی مندرجہ معلومات کے مآخذ مستند تواریخ ہیں ۔ مثلاً تاریخ 'فیروز شاہی' ، 'طبقات ناصری' ، 'طبقات اکبری' اور 'مآثرالکرام' ۔

مؤلف کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور انہیں ایسے لوگ میسر آ گئے تھے جن کے دلوں پر ان کی علم پروری اور جوہر شناسی کا سکہ بیٹھ چکا تھا ۔ چنانچہ مؤلف انگریزوں کی تعریف میں لکھتے ہیں :

"سرداران انگریز بہادر باوجود مخالفت دینی و عدم موانست دنیوی در
ہر باب اعزاز و احترام ارباب فضل میفرمایند ـ"

جیسا کہ تعارفی عبارت میں ہے مؤلف نے گورنر جنرل لارڈ مارکویس ولزلی کے حضور میں شرفیابی کے لئے یہ تذکرہ تالیف کیا ـ

بستان المحدثین

اس کتاب کے مؤلف شاہ ولی اللہ کے فرزند عالی مقام شاہ عبدالعزیز مفسر و محدث (م ۔ ۱۸۲۳ء/۱۲۳۹ھ) ہیں ۔ اس خاندانِ جلیلہ کی خدمات کا تفصیلی تعارف ، مذہب اور تصوف کے ابواب میں دیکھیے ـ

اس کتاب میں تقریباً بانوے کتب حدیث کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی کتابوں کے مؤلفین یعنی محدثین کے سوانح زندگی ؛ سلسلۂ جمع و تدوین ، حدیث میں ان کی خدمات اور ان کی دیگر تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب گویا تذکرۂ کتب و رجال حدیث اور فارسی میں اہم اور مفید تالیف ہے ۔

صحاح ستہ کے مؤلفین یعنی بخاری ، مسلم ، ابی داؤد ، نسائی ، ترمذی اور ابن ماجہ کے علاوہ امام مالک ، حاکم ، طبرانی ، عبداللہ بن مبارک ، خطیب بغدادی ، ابوالقاسم قشیری ، ابو موسیٰ محمد بن ابوبکر وغیرہم کے بھی تفصیلی حالات لکھے ہیں ۔ بعض کتابوں کے مختلف اور متداول نسخوں کو بیان کیا ہے ۔ مثلاً خاص طور پر مؤطا کے تمام مروجہ نسخوں کی تفصیل بتائی ہے ۔

اس کتاب میں تقریباً تمام اصناف حدیث کی کتابوں کا ذکر ہے اور مصنف نے کہیں کہیں اقسام احادیث کی تعریف بھی کی ہے ۔ مثلاً صفحہ ۳۵ پر لکھتے ہیں :

۱۔ وہ کتاب جسے ابواب فقہ پر مرتب کریں ، مثلاً ایمان ، طہارت ، صلوۃ و صوم وغیرہ پر ، اسے سنن کہتے ہیں ۔

۲۔ اگر صحابہ کی روایات کے مطابق مرتب کریں ، مثلاً روایات ابوبکر صدیقؓ یا روایات عمر بن الخطابؓ وغیرہ تو اسے مسند کہتے ہیں ۔

۳۔ اگر شیوخ کے نام پر مرتب ہوں ، مثلاً وہ احادیث جو احمد سے سنیں وہ الگ اور جو محمد سے سنیں وہ الگ لکھیں تو اسے معجم کہتے ہیں ۔

ان تینوں کے علاوہ احادیث کے ایک مجموعے کا نام مستخرج بھی ہوتا ہے ۔ محدثین کی اصطلاح میں یہ وہ کتاب ہے جو دوسری کتاب کی احادیث ثابت کرنے کے لئے لکھی جائے اور اس میں ترتیب متون و طرق اسناد اس کتاب کے ملحوظ رکھے جائیں ۔ ایک اور قسم کے مجموعے کا نام اربعین یا چہل حدیث بھی ہے ۔ احادیث کے بعض مجموعوں کا نام منتقی بھی ہے یعنی یہ گویا موضوعات کے لحاظ سے احادیث کا انتخاب ہے ۔

مجموعۂ احادیث کے علاوہ احادیث کی شروح ، حواشی ، رجال اور فرہنگ لغات پر مرتبہ کتابوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ مثلاً 'صحیح البخاری' کی شروح میں سے 'فتح الباری' از ابن حجر ۔ حواشی میں سے 'توشیح شرح الجامع' للسیوطی اور 'تنقیح الفاظ الجامع الصحیح'

کا ذکر کیا ہے ۔ رجال میں کتاب 'الکُنٰی والاسامی للنسائی' اور 'الاستیعاب فی معرفة الاصحاب' لابی عمر بن عبداللہ مشہور و معروف کتابیں مذکور ہیں ۔

بعض بزرگوں نے صرف موضوعات کے اعتبار سے بھی احادیث مرتّب کیں ۔ مثلاً

'کتاب المأتین' للصابونی ۔ اس میں دو سو احادیث ، دو سو کہانیاں اور دو سو شعر مندرج ہیں ۔

'کتاب المجالسة' للدینوری

'سلاح المؤمن' ۔ جزء فضائل اہل البیت

'کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ

حدیث ، اس کے متعلقات اور محدثین کے بارے میں مصنف کی نظر گہری ہے ۔ وہ ہر زمانے کے محدثین سے آشنا ہیں ۔ ایک موقع پر بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں چار محدث ہم عصر تھے اور چاروں کسی نہ کسی صنفِ حدیث میں مہارت رکھتے تھے ، مثلاً انھو نے ذکر کیا ہے :

دارقطنی بغداد میں تھے اور وہ معرفت علل حدیث میں ممتاز اور مستثنیٰ تھے ۔

حاکم نیشاپوری تھے اور وہ فن تصنیف و ترتیب میں ماہر تھے ۔

ابن مندہ اصفہان میں تھے اور وہ کثرتِ احادیث اور معرفت واسطہ کے لئے نامور تھے ۔

عبدالغنی مصر میں تھے اور معرفت انساب میں دستر رکھتے تھے ۔ مصنف نے کتابوں کی اہمیت پر بھی تبصرہ کیا ہے اور معتبر و غیر معتبر ہونے کے متعلق بھی اپنی رائے دی ہے ۔ انھوں نے جامع کبیر ترمذی کو احادیث کی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب کہا ہے اور وجوہ یہ بتائی ہیں :

۱۔ از جہت ترتیب و عدم تکرار ۔

۲۔ ذکر مذاہب فقہا و وجوہ استدلال ہر یک از اہل مذاہب ۔

۳۔ بیان انواع حدیث در صحیح و حسن و ضعیف و غریب معلل بعلل ۔

۴۔ بیان اسماء رواۃ و القاب و کنیت و دیگر فوائد متعلقہ بعلم رجال ۔

تذکرۂ خوش نویسان از غلام محمد راقم

اس تذکرے میں ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ تک کے حوالے ملتے ہیں - لیکن یقین نہیں کہ یہی اس کا سال تالیف و تکمیل ہو - اس سال تک مؤلف لمبی عمر پا چکے ہوں گے کیونکہ وہ محمد حفیظ خاں کاتب متوفی ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ وہ ان کے استاد تھے - غلام محمد شاعر بھی تھے اس لیے انہوں نے اس تذکرے میں اپنے بیانات و خیالات کو نثر و نظم دونوں میں لکھا ہے -

اگرچہ بعض خطاطوں کے حالات مختصر ہیں اور ان کا زمانہ بھی متعین نہیں پھر بھی ۹۰۰ خطاطین کا ذکر آ گیا ہے - اس کتاب سے پہلے تواریخ سیاسی میں ضمناً امراء ، حکماء ، عرفاء و شعراء کے ساتھ ساتھ تذکروں میں خطاطین کا بھی ذکر آیا ہے - چنانچہ اس کتاب میں بھی 'شاہجہان نامہ' میں مذکورہ خطاطین کو من و عن شامل کر لیا گیا ہے -

کتاب میں اختصار سے خط کی ایجاد ، تاریخ و ارتقا کا بھی ذکر موجود ہے - مؤلف کے نزدیک چھ قلم مشہور تھے - نسخ ، ثلث ، محقق ، ریحان ، توقیع اور رقاع - بعد میں خط میں جو تنوع اور حسن پیدا ہوا اور نئی اقسام وجود میں آئیں ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے -

کتاب کی ابتدا میں قلم کی تعریف کی ہے اور روشنائی بنانے کے طریقے لکھے ہیں - آخر میں ترکیب ساختن ، شنگرف نوشتنی اور نسخۂ مرکب دیا ہے - تقریباً ایران و عراق کے تمام استاد خطاطین کے ناموں کا ذکر آ گیا ہے - مثلاً ابن بوآب ، ابن مقلہ ، یاقوت مستعصمی ، میر علی تبریزی ، عماد الحسینی وغیرہ - سرزمین پاک و ہند میں خطاطی کو بڑی ترقی ہوئی - سلاطین تیموری نے خود اس فن میں مہارت پیدا کی اور استاد خطاطین کی بڑی قدر افزائی کی اور انہیں شاہزادوں کا اتالیق مقرر کیا -

کتاب میں سلاطین و امراء میں سے معزالدین محمد غوری ، عبدالرحیم خانخانان اور ٹوڈر مل ، شاہجہان ، داراشکوہ ، عالمگیر ، عماد الملک غازی الدین خاں کا ذکر خوشنویسوں میں کیا ہے - ہر عہد کے سب سے نام آور خطاطین کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا ہے اور پھر آگے بہت سے شاگردوں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے آگے استادی شاگردی کا سلسلہ جاری

رکھا اور اس فن کو کمال عروج پر پہنچایا - اس سرزمین میں عموماً نسخ ، تعلیق ، نستعلیق اور شکستہ کا زیادہ رواج رہا اور انہیں کے لکھنے میں اساتذۂ فن نے اپنا کمال دکھایا - اکبر کے عہد میں عبدالصمد شیریں قلم ، محمد حسین زریں قلم ، شاہجہاں کے عہد میں عبدالرشید دیلمی ، اورنگ زیب کے عہد میں سید علی خان جواہر رقم اور عبدالباقی حداد یاقوت رقم ، ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں میر خلیل اللہ شاہ بادشاہ قلم بہت مشہور تھے -

ہندوؤں نے بھی چونکہ دیوان رسائل میں ملازمت کی اور منشی گری سنبھالی ، اس لیے لازماً انھوں نے بھی خوشنویسی میں مہارت پیدا کی - کتاب میں ایسے خوش‌نویسوں کے نام مندرج ہیں ، جنھوں نے خطوط نویسی اور خوش نویسی دونوں میں مہارت پیدا کی - ان میں سے راس منوہر ، چندر بھان ، لچھمی رام پنڈت ، امر رام پنڈت اور لچھمی سنگھ منشی زیادہ نامور ہیں -

رسالہ متضمن حالات خوشنویسان خطوط

اس رسالے کے مؤلف بھی خلیفہ شیخ غلام محمد ہفت قلم اکبر شاہی ہیں - اس تذکرے کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے مخطوطات میں موجود ہے - دیکھیے ریو ، جلد سوم ، صفحہ ۱۰۱۳ ، مخطوطہ ۵۳ سے ۸۱ اوراق پر مشتمل ہے - یہ چار فصلوں میں منقسم ہے -

۱- نستعلیق لکھنے والے -

۲- شکستہ اور شفائی لکھنے والے -

۳- نسخ اور طغرا لکھنے والے -

۴- مُہر کن یعنی Seal Engraver -

اس رسالے میں اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کے زمانے کے خطاطوں کا ذکر ہے - آخری حوالہ ۱۲۶۱/۱۸۴۵ء تک کا ملتا ہے - خاص طور پر وہ خطاط مذکور ہیں جو دہلی میں مقیم تھے -

اکبر کے عہد میں کتابوں کی تسوید و تزئین کی طرف خاص توجہ ... سازی ، جوہر سازی ، جدول کشی ، تذہیب کاری اور تصویر کشی ... ماہر فن خطاط کی خدمات حاصل کی گئیں - شاہزادے اور شاہزادیاں ... مشق کرتے اور مہارت پیدا کرتے - 'آئین اکبری' میں اکبری عہد ...

نمی گذاشتند و دران سنگر چنان آبادی دکاکین از میوه فروشان و طباخان
و رخت فروشان وغیرہ کنانیدہ بودند کہ ہرات ثانی در نظر مردم
می آمد ۔‘‘

اس فقرے سے سنگر (سندھ) کے بازار کی گہماگہمی نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ میرزا صاحب نے حالات درج کرتے ہوئے طرفداری کو فریب نہیں آنے دیا ۔ وہ ایک راست گو مؤرخ ہیں ۔ ’نوائے معارک‘ ١٩٥٩ء میں عبدالحی حبیبی افغانی کی تصحیح ، تحشیہ و تعلیق کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ کراچی نے طبع کرائی ہے ۔ میرزا عطا محمد خان کی ایک اور تصنیف ’خزائن تاریخ‘ بھی بتائی جاتی ہے ۔

اعراس بزرگان از مولوی کبیر الدین احمد و ولیم ناسولیس (W. Nassau Lee)

یہ کتاب کلکتہ سے ١٨٥٥ء میں طبع ہوئی اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی یادگار ہے ۔ اس میں اوائل اسلام سے بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) تک اکثر علمای عظام اور صلحای کرام کی تاریخ وفات درج کی گئی ہے ۔ اندراجات قمری مہینوں کے لحاظ سے کئے گئے ہیں اور چونکہ مصنف حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روز وصال سے ابتدا کرنا چاہتے تھے ، اس لیے ماہ ربیع الاول کے تحت اندراجات پہلے دیے ہیں ، کیونکہ حضور کا وصال اسی مہینے کی دوازدہم بروز دوشنبہ ہوا تھا ۔ کل ٢٥١ بزرگوں کا ذکر ہے جن میں برصغیر کے بزرگ بھی شامل ہیں ، چنانچہ ربیع الاول سے لے کر رجب تک یہاں کے مندرجہ ذیل علماء اور صلحاء کی وفات کی تاریخیں دی ہیں :

احمد بن سورتی ، علاء الدین علی بن احمد صابر کلیری ، خواجہ قطب الدین دہلوی ، سید عبداللہ بن علی سورتی ، جمال الدین محمد احمد آبادی ، احمد بن علی احمد آبادی ، شیخ بن عبداللہ دولت آبادی ، شیخ علاء الدین بنگالی ، محب اللہ صدر پوری ، محمد بن حامد ملیباری ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مصنفین کی نگاہ برصغیر کے ساحلی علاقوں کی طرف زیادہ رہی ہے حالات مختصر ہیں ، وفات کے ساتھ بالعموم ولادت کی تاریخ اور مقام کا ذکر بھی کیا ہے ۔ مقام تدفین بھی اکثر و بیشتر دیا گیا ہے ۔ دیگر ضروری حالات کے علاوہ شخصیت کی

طرف بھی اشارات کئے گئے ہیں ۔ مثلاً حضرت خواجہ فرید الدینؒ شکر گنج کے متعلق لکھا ہے :

''وفات یافت ۔ القطب الاکبر الشیخ فرید الدین مسعود شکر گنج رحمہ اللہ روز شنبہ پنجم محرم سنہ شش صد و شصت و ہشت و روایتی سنہ شش صد و شصت و نہ و مشائخ را ارکمال محبت و عرفان او اتفاق است و وی در ریاضات و مجاہدات وکشف و کرامات نظیر خود نداشت و در ذوق و شوق و تفرد و تجرید اعجوبۂ زمان بود و از بزرگترین خلفای شیخ خواجہ قطب الاسلام الاوشی بود و صاحب سیرالاولیاء از سید محمد کرمانی نقل می کند کہ سلسلۂ نسب او با فرخ شاہ سلطان کابل می رسد و نسبت او بحضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ منتہی می شود (از ترجمۂ مرآۃ الاسرار) ۔''

مآخذ کا ذکر بھی ساتھ ساتھ کیا گیا ہے ۔ کم و بیش ۱۳ کتب حوالہ کے نام لئے گئے ہیں ۔ سب سے آخری ترجمہ السید الجلیل العارف باللہ الحسین بن عبدالرحمن بن محمد العیدروس کا ہے جو ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں راز پور میں فوت ہوئے ۔

ہفت آسمان از آغا احمد علی احمد بن شجاعت علی ۔

یہ کتاب مثنوی کی تحقیق اور مثنوی گو شعراء کی تعریف میں تالیف ہوئی ۔ مثنوی کے سات اوزان کے مطابق مصنف نے اس کا نام 'ہفت آسمان' رکھا ۔ لیکن اس میں مثنوی کی تحقیق کے بعد آسمانِ اول کے عنوان کے تحت ''بحر سریع مطوی موقوف'' کی ۸۷ مثنویوں کا ذکر کر کے کتاب ختم کر دی گئی ہے ۔ اس بحر کے انتخاب کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے :

''اول کسیکہ سفینۂ مثنوی درین بحر شیرین دلآویز روان ساخت . . . شاید نظامی بود کہ نخستین نامہ از پنج گنج خود مخزن اسرار را دران منظوم کرد . . . پس آیندگان را چنان محو جمال و کمال خود گردانید کہ مدتہا سودای ہم رسانیدن جواب شائستہ آن پختند ۔''

نظامی گنجوی کی 'مخزن اسرار' کا پہلا شعر یہ ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہست کلید در گنج حکیم

اس معرکۃ الآرا افتتاحی شعر نے بہت سے شعراء کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ بھی بسم اللہ کے مصرع کے ساتھ گرہ لگائیں ۔ غالباً عرفی کی یہ گرہ بہترین ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم موج نخست است ز بحر قدم

اسی بنا پر 'ہفت آسمان' کے اختتام پر مصنف نے بسم اللہ کے چند مصرعہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے ۔ مصنف نے اس مشہور بحر میں مثنوی لکھنے والے برِصغیر کے مندرجہ ذیل شعراء کو شامل کیا ہے :

''مسعود سعد سلمان ، امیر خسرو ، عرفی ، فیضی ، زاہد ، محمد معصوم نامی ، علی احمد نشانی ، محمد حسن دہلوی ، ملک قمّی ، مُلّا شیدا ، محمد جان قدسی ، حادق بن حکیم ہمام ، ادھم ، محمد مراد لائق ، محمد علی حزیں ، میرزا اسداللہ خان غالب ، عبدالرؤف وحید ، عبدالرحیم تمنّا ، عبدالحلیم عاصم ۔''

'ہفت آسمان' ۱۸۷۳ء میں کلکتہ میں طبع ہوئی ۔

شعر العجم از مولانا محمد شبلی نعمانی

پانچ جلدوں میں ہے ۔ آغاز تصنیف کا سال ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) ہے اور 'تاریخ عجم' سے سال برآمد ہوتا ہے ۔ تاریخ اختتام ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) ہے اور مادۂ تاریخ 'تذکرہ' علی گڑھ کا سالِ طباعت ۱۹۱۰ء ہے ۔

پہلی جلد میں عباس مروزی سے نظامی تک شعراء کے کلام پر تنقید ہے ۔ دوسری میں فرید الدین عطّار سے ابن یمین تک ، تیسری میں فغانی شیرازی سے ابو طالب کلیم تک ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری جلد سبک ہندی کے شعراء کے لئے وقف کی گئی ہے ۔ چوتھی جلد کے تین ابواب ہیں : پہلے باب میں شاعری کی حقیقت اور ماہیت پر بحث کی گئی ہے اور شاعرانہ مصوّری ، تخیّل ، تشبیہ و استعارہ ، حسنِ الفاظ اور شعر کی اثر انگیزی پر عنوانات قائم کئے ہیں ۔ دوسرے باب میں فارسی شاعری کی عام تاریخ اور تمدن و معاشرت کا اس پر اثر بیان کیا ہے ۔ تیسرے باب میں فارسی شاعری پر تبصرہ ہے اور اصناف شاعری میں سے مثنوی اور بالخصوص شاہنامہ فردوسی کو تفصیلی طور پر زیرِ بحث لایا گیا ہے ۔ پانچویں جلد میں قصیدہ گوئی ، عشقیہ شاعری ، صوفیانہ شاعری

اخلاقی شاعری اور فلسفیانہ شاعری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ خود مولانا شبلی نے کہا ہے پہلی تینوں جلدیں ان دو آخری جلدوں کا دیباچہ ہیں اور ان کی تمہید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا شبلی سے پہلے اس انداز میں فارسی شاعری کا جائزہ کسی نے نہیں لیا تھا۔ شروع سے لے کر آخر تک آپ کے سامنے یہ بات رہی کہ ان عناصر کو زیرِ بحث لایا جائے جو فارسی شاعری میں تڑپ پیدا کر رہے ہیں۔ گویا اس کی روح کو بے نقاب کرنا آپ کا حقیقی مقصد تھا اور آپ نے پہلی جلد کا آغاز کرتے ہوئے بہ اندازِ تفاخر بجا طور پر شعرالعجم کی اس حیثیت کی طرف فیضی کے ذیل کے اشعار کے ذریعے اشارہ کیا:

حرم جویان درے را می پرستند	فقیهان دفترے را می پرستند
بر افگن پردہ تا معلوم گردد	کہ یاران دیگرے را می پرستند

شعراء کا تعارف کراتے ہوئے مولانا شبلی نے ارباب تحقیق کا خشک انداز اختیار نہیں کیا بلکہ حالاتِ زندگی بھی اس طرح بیان کئے ہیں کہ زبان کی لطافت اور دلکشی برابر قائم رہی ہے اور بڑے موزوں طریقے سے، ساتھ ساتھ اشعار بھی دیتے چلے گئے ہیں۔ اخلاق و عادات کا ذکر کرتے ہوئے بھی شاعر کے کلام سے پُر لطف طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ شاعری کو زیرِ بحث لاتے ہوئے وہ اس طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں کہ شاعر کی فطرت اس فنِ لطیف کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی تھی، کیونکہ اس کے لئے بنیادی شرط یہی ہوتی ہے۔ تنقید کرتے ہوئے وہ انہی اصولوں کو سامنے رکھتے ہیں جس کا ذکر انہوں نے تیسری جلد کے پہلے باب میں کیا ہے اور جن کی طرف اشارہ سطورِ بالا میں کیا جا چکا ہے۔ شاعری میں معاشی، معاشرتی تقاضوں کے اثرات کی طرف بھی وہ متوجہ ہوئے ہیں۔ مولانا کا احترام ہمارے دلوں میں بے حد بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شاعری میں فکری اثاثے کی دریافت کے لئے بھی خصوصی انہاک کا اظہار کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا تذکرہ جات کے علاوہ اس عہد کی چند اور کتب بھی قابلِ ذکر ہیں، مثلاً 'مہر منیر' از ارجمند محمد خان ابن محمد خان سلیم طبع ۱۸۹۶ء، 'تجلّیِ نور' (تذکرۂ مشاہیر جونپور) از نور الدین زیدی جونپوری، طبع جونپور ۱۹۰۰ء، 'مکاتیب سید احمد شہید'، 'مکاتیب سید حمید الدین' اور 'تقصار جیود الاحرار' از نواب صدیق حسن خان، مگر قلّت گنجائش کے باعث ہم انہیں زیرِ بحث لانے سے معذور ہیں۔

☆ ☆ ☆

پانچواں باب

لغات، زبان آموزی، زبان دانی، شروح و قواعد

تمہید

۱۸۵۷ء پر تاریخ کا یک دور (بلکہ سارا قدیم دور) ختم ہو کر نئے زمانے کا آغاز ہوتا ہے۔ انگریز اب بلا شرکتِ غیرے پورے ملک پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی علمی و ادبی اور معاشرتی نقطۂ نظر بھی بدل جاتا ہے۔

فارسی کی اہمیت کم ہو جاتی ہے --- اور اس کی جگہ انگریزی اور دیسی زبانیں لیتی جاتی ہیں۔ پھر بھی چونکہ فارسی کا تہذیبی سکہ بیٹھا ہؤا تھا اس لئے اس کا علمی اثر کچھ کچھ باقی رہتا ہے۔

لغت نگاری میں بتدریج تشریح کی زبان فارسی کے بجائے اردو ہوتی جاتی ہے لیکن بعض لغات کی زبانِ تشریح ابھی فارسی ہی ہے۔

اس دور میں ایک مرتبہ پھر جامعیت کی سعی ہوتی ہے --- تمام موجود مواد کو یک جا کر کے جامع لغات کی طرف توجہ ہے --- (مثلاً فرہنگِ آنند راج اور آصف اللغات میں)، لیکن تلخیصِ لغت اور عامی لغت نگاری خصوصاً تدریسی ضرورتوں کے لئے جاتی ہے۔

اس دور میں یورپین محبانِ فارسی بھی لغت نگاری کی طرف توجہ کرتے ہیں اور ان کے الفاظ فارسی اور شرح کوئی مغربی زبان ہے۔

کئی زبانوں کی یک جا مترادف نگاری بھی ہوئی مثلاً 'خزانۃ اللغات' از شاہجہاں بیگم اور 'تثلیث اللغات' وغیرہ۔

بعض لغات، محاورات و اصطلاحات خاص شاعری کی تعلیم کی غرض سے مرتب ہوئیں۔

اس نئے دور میں اعراب کے ضبطِ لفظی کے بجائے فتحہ، کسرہ، ضمہ کی علامتوں کا استعمال شروع ہؤا اور بعض اور جدید طریقے رائج ہوئے۔

اس دور میں پریس کی سہولت کے باعث قدیم لغات کی طباعت کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں لغت کی اہم کتابیں طبع ہو جاتی ہیں۔

مصادر و امثال کے فرہنگ بھی مرتّب ہوئے۔ درسی ضرورتوں کے لئے کتبِ لغت کی طرح کی شرحوں کی طرف خاص توجہ ہوئی۔

ان سب باتوں کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ فارسی ادب کے زوال کا زمانہ تھا اور قدرتی اس۔ ہے کہ اس میں اورمجمل تحقیق و تنقیدِ لغت کے لئے کم سے کم گنجائش تھی، اور تا دمِ تحریر یہ سلسلہ تقریباً منقطع ہے۔ اِدھر اُدھر یونیورسٹیوں میں فارسی کے سلسلے میں کچھ تنقیدی کام ہو رہا ہے لیکن اس کی نوعیّت عملی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اور اس سے کچھ قبل جدید فارسی کے کچھ لغات (اگرچہ مختصر ہی ہیں) سامنے آئے ہیں، مثلاً 'نقشِ بدیع' از عندلیب شادانی۔

پرانے ادب کی شرحوں کا سلسلہ سابقہ اثرات کے تحت اس دور میں بھی خاصی دیر چلتا رہا مگر یہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گیا، البتہ درسی ضرورتوں کے لئے کتبِ صرف و نحو اور کتبِ زبان آموزی کافی تعداد میں لکھی گئیں، اور محدود پیمانے پر اب بھی لکھی جا رہی ہیں۔

الب محقّقِ لغت کی حیثیت سے

غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ گئے تو وہاں کے ایک مشاعرے میں جب انہوں نے ایک غزل پڑھی تو اس کے بعض الفاظ و تراکیب پر اعتراض ہوا۔ اس موقعے پر جو بحث چلی اس میں غالب نے ہندی فارسی دانوں کو سند ماننے سے انکار کیا۔ اس پر خاصی دیر ہنگامہ رہا اور غالب کی مثنوی 'بادِ مخالف' اسی زمانے کی یادگار ہے۔

غالب کو آشوبِ دہلی ۱۸۵۷ء کے زمانے میں جبری تنہائی و یکسوئی میسر آئی تو انہوں نے پہلے 'دستنبو' لکھی۔ اس کے بعد 'برہانِ قاطع' کا مطالعہ کرکے اس کی اغلاط پر ایک کتابچہ لکھا جس کا نام 'قاطعِ برہان' رکھا۔ بعد میں کچھ اضافے کرکے اس کا نام

'درفش کاویانی' رکھا۔

اس کا شدید رد عمل ہوا۔ غالب کی 'قاطع برہان' کے جواب میں کئی لوگوں نے رسالے، نظمیں اور کتابیں (فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں) لکھیں [۱]۔

مخالف کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) 'محرق قاطع' از مولوی سعادت علی۔ (۲) 'ساطع برہان' از میرزا رحیم بیگ ساطع۔ (۳) 'قاطع القاطع' از مولوی امین الدین پٹیالوی۔ (۴) 'مؤید برہان' اور 'شمشیر تیزتر' از مولوی آغا احمد علی احمد۔

موافق کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) 'دافع ہذیان' از مولوی نجف علی۔ (۲) 'لطایف غیبی'۔ (۳) 'سوالات عبدالکریم'۔ (۴) 'نامہ غالب'۔ (۵) 'تیغ تیز' از غالب [۱]۔

یہاں ان سب کتابوں کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے۔ اس موقعے پر ہم غالب کی 'قاطع برہان' اور ان کے رد 'مؤید برہان' از احمد علی پر مختصر تبصرہ کریں گے کیونکہ یہی دو کتابیں بنیادی ہیں، باقی مواد جوابی اور ضمنی ہے۔

قاطع برہان

۱۸۶۰ء/۱۲۷۶ھ میں مکمل ہوئی۔ غالب کا موقف یہ تھا کہ 'برہان قاطع' میں مصنف سے طرح طرح کی فروگذاشتیں ہوئی ہیں۔ اسے نہ حسن معنی کا خیال ہے نہ جوہر

---

(۱) یہ معلومات مولانا مہر کی کتاب 'غالب' سے ماخوذ ہیں۔

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے غالب از مہر، نیز دیکھیے درفش کاویانی طبع پنجاب یونیورسٹی دیباچہ از ڈاکٹر محمد باقر، نیز ذکر غالب از مالک رام۔

مولانا مہر کے بیان کے مطابق تیغ تیز تر ایک مجموعہ منظومات ہے جس میں فدا کا قطعہ بجواب تیغ تیز از غالب، فدا کا جواب از باقر بہاری، و از خواجہ فخر، اور حسن الجواب از فدا شامل ہے۔ ایک مجموعہ ہنگامہ دل آشوب ہے جس میں غالب، فدا، باقر اور سخن کے قطعات جمع ہیں۔ یہ اس کا حصہ اول ہے۔ حصہ دوم میں قطعہ جواہر سنگھ جوہر (احمد کی حمایت میں)، قطعات از باقر و سخن بجواب جواہر، فدا کے جوابی قطعے پر دو اور قطعے از باقر و سخن، مختصر نظم اردو میں از امیر لکھنوی حمایت غالب میں ہے۔ اس سلسلے کے باقی مواد کے لئے دیکھیے غالب از مہر، ص ۵۴۴ (طبع چہارم)۔

سعظ پر لظر ہے ، زبردستی اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے کے درپے ہے ، بای عربی و کاف تازی کو بای پہلوی اور کاف فارسی کے ساتھ دوبارہ لے آیا ہے ۔ اور قلب ، امالہ ، مدّ ، قصر ، سکون ، حرکت ، تخفیف و تصحیف ، پارسی ، عربی ، مفتوح مکسور کی نشاندھی کرنے کا اہتمام نہیں کیا ۔ اس نے الفاظِ غریب شامل کرکے اپنی کتاب کو ضخیم بنا دیا ہے — گویا وہ خلّاق الالفاظ ہے ۔

غالب دیباچۂ 'برہانِ قاطع' میں لکھتے ہیں کہ لوگوں کا اس علمی تحقیق پر برہم ہونا ناروا ہے کیونکہ کتاب آسانی تو ہے نہیں کہ اس میں چون و چرا کی گنجائش نہ ہو ۔ محض "مختارِ آدمی" ہے جس کا جی چاہے اسے "میزانِ نظر" پر رکھ کر تول سکتا ہے ۔

غالب نے 'درفشِ کاویانی' کے دیباچے میں افسوس کا اظہار کیا ہے کہ بجائے اس کے کہ اہل علم شکر گذار ہوتے ، سب نے برا بھلا کہا ، یہاں تک کہ "در قلمروِ ہند کس نماندہ باشد کہ مرا بدین نیکی بد نخوانده باشد دیگر خنجر آورد کہ من قاطع قاطع برہانم گرے اخگر ے آورد کہ من محرق آنم . . . . "

غالب نے 'برہانِ قاطع' پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کی تحقیقی حیثیت کی بحث الگ ہے ۔ دراصل یہ سب کچھ ان کے اس عقیدے کے تابع ہے کہ ہندی لغت نگار بلکہ جملہ ادیب و شاعر علی العموم تحقیقِ الفاظ کے معاملے میں سند نہیں —— بظاہر وہ محمد حسین تبریزی (بقول ان کے دکنی) ، قتیل اور 'ملا' غیاث الدین ٹیک چند بہار کے خلاف کہہ رہے ہیں ۔ مگر یہ سب کچھ اپنے مذکورہ بالا عقیدے کے تحت کہہ رہے ہیں ۔

انہوں نے اپنے مکاتیب میں بھی جا بجا اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ وہ خسرو کے سوا کسی ہندی کو فارسی میں ، تسلیم نہیں کرتے (فیضی کے ساتھ کچھ رعایت ہے مگر بے دلانہ) یہ ان کا بہت پختہ عقیدہ ہے ۔ اس کے تحت انہوں نے 'برہانِ قاطع' پر جو اعتراض بھی کئے ہوں قدرتی معلوم ہوتے ہیں ۔

مرزا فرماتے ہیں کہ کسی بڑے شاعرِ فارسی نے لغت نگاری کا کام نہیں کیا ۔ (ہیچکس فرہنگ طراز نگشتہ) ۔ بعد میں جن لوگوں نے فرہنگ نگاری کی ، سب ہندوستانی تھے ، (ہندوستانی و بدروغ مدعیٔ زباندانی) ۔

یہ وہی اہلِ زبان اور زباندان کی نزاع ہے جس کے متعلق اس سے پہلے (خانِ

آرزو اور حزین کے مناقشے کے سلسلے میں) بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔

جب . مسلک اور عقیدے کا سوال ہے تو یہ چھان بین بیکار سی ہو جاتی ہے کہ غالب نے 'برہان' کی غلطیوں کی جو نشاندہی کی ہے وہ صحیح ہے یا غلط ـــــ ،

لغات پر تنقید کوئی نیا کام نہیں ۔ غالب سے پہلے جمال الدین انجو 'صاحب فرہنگ جہانگیری' ، ملاّ عبدالرشید تتوی 'صاحب رشیدی' ، سراج الدین علی خان آرزو صاحب 'سراج اللغات' اور سیالکوٹی مل وارستہ صاحب 'مصطلحات وارستہ' بھی کام کر چکے تھے ـــ ، ان سب کے خلاف کوئی خاص ہنگامہ نہیں اٹھا ۔ غالب کے خلاف یہ شکایت اس لئے پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس معاملے میں جذباتی سا رویہ اختیار کر لیا تھا ، جس کا ردّ عمل بھی جذباتی ہوا ۔

ہماری رائے میں 'قاطع برہان' بھی ایک قیمتی تنقید ہے ۔ اس کے جذباتی انداز سے قطع نظر اس میں تحقیق اللغت کے بہت سے عمدہ اصول کارفرما ہیں اور اس تنقید سے 'برہان قاطع' کی تکمیل ہوئی ہے ، تنقیص نہیں ہوئی ۔

آخری دور میں خصوصاً غالب کے زمانے میں فارسی زباندانی پر جس طرح زوال آ چکا تھا اور فارسی تعلیم کی وجہ سے ہر ابجد خواں فارسی میں دعویٰ کرنے لگا تھا ، اس کے پیش نظر غالب کی سی کڑی تنقید کی سخت ضرورت تھی ۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کئی موقعوں پر خود بھی لڑکھڑا گئے ہوں مگر تنقید کا پھر بھی جواز معلوم ہوتا ہے ۔

ہمارے نزدیک 'قاطع برہان' (درفش کاویانی) کے مفید ترین حصے وہ ہیں جو ... فایدہ کے زیر عنوان آئے ہیں ـــ اگر ان کو جمع کرکے اصول کا استخراج کیا جا... اچھا خاصا اصول نامہ تیار ہو سکتا ہے ۔ ہندی الفاظ کے بارے میں محمد حسین تبریزی واقعی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں ـــ غالب کی نشاندہی نے 'برہان قاطع' کی واقعی ... کر دی ہے ۔

مؤید برہان

'قاطع برہان' کے حق میں اور خلاف جو کچھ لکھا گیا اس کا بیشتر حصہ ... ہے اور بعض تحریریں تو سراپا شخصی بلکہ سوقیانہ ہو گئی ہیں ۔ اس سارے مواد ... آغا علی احمد (مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ) کی کتاب 'موید برہان' اس لحاظ سے قابل ... ہے کہ اس میں ایک مؤقف ہے ۔ اس کا انداز بیان نسبتاً سنجیدہ ہے اور اس میں تحقیقی ... کافی ہے ۔

'مؤیدِ برہان' ۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ میں لکھی گئی - آغا احمد علی کا یہ بیان افسوسناک ہے کہ میرزا غالب نے محمد حسین تبریزی (دکنی) پر بربنائے حسد اعتراضات کئے ہیں - انہوں نے مولفِ 'برہانِ قاطع' کو ایرانی ثابت کرنے کی بھی پوری کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ صاحبِ 'برہان' ایران سے آئے تھے اور چند روز دکن میں رہے اور یہ کتاب لکھی - ایسے ''نزیلان'' ہند کو ہندی دکنی کہنا نادرست ہے - آغا احمد علی نے غالب کی سخت گیری کی بھی شکایت کی ہے -

'مؤیدِ برہان' کے مؤلف نے دیباچے میں کتبِ لغت کی طویل فہرست دی ہے جن سے اس تحقیق میں مدد لی ہے -

آغا احمد علی کا موقف یہ ہے کہ 'برہانِ قاطع' نے جو کچھ لیا ہے 'فرہنگ جہانگیری' 'مجمع الفرس سروری'، 'فرہنگِ رشیدی'، 'کشف اللغات' عبدالرحیم بن احمد سرور وغیرہ سے لیا ہے - اس لئے اصل اعتراض ان لغات پر ہونا چاہئے نہ کہ مؤلفِ 'برہان' پر -

کتاب کے آغاز میں حروف اصلی و فرعی، و زصلی -- قاعدہ تفرسہٗ دال و ذال - غلط العام اور غلط العوام کی بحث لائی گئی ہے - اس کے بعد سب سے پہلے 'برہان' کی وہ تاریخ جسے غالب نے غلط قرار دیا ہے، پھر غالب کی تنقید، اس کے بعد آغا احمد علی کا زیرِ عنوان احمد محاکمہ ہے -

'مؤیدِ برہان' کی تائیدِ مزید میں (غالب کے رسالہ 'تیغ تیز' اردو کے جواب میں) احمد علی نے ایک رسالہ فارسی میں 'شمشیر تیز تر'[1] (۱۸۶۷ء میں) لکھا - اگرچہ ان رسائل و تصانیف کا انداز مناظرانہ ہے لیکن آج کے کسی محققِ لغت کے لئے یہ ساری بحثیں مفید ہیں اور ان سے الفاظ کی صحت کے معیاروں کے علاوہ، اس زمانے کے ادبی و

---

(۱) پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں یہ رسالہ 'مؤید برہان' کے ساتھ مجلد ہے -
اس کے ساتھ یہ رسالے بھی ہیں :
رسالہ شمشیرِ تیز تر (طبع ۱۸۶۸ء مشتمل بر قطعہ از غالب، قطعہ از فدا (بجواب غالب)، قطعہ از باقر علی باقر (بجواب فدا)، قطعہ از فخر (بجواب فدا) جواب الجواب از فدا اور شمشیر تیز تر از احمد علی احمد (۱۸۶۷ء، طبع ۱۸۶۸/۱۲۸۶ھ) بجواب تیغِ تیز غالب -

سیاسی مزاج کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

لغات

اس دور کے لغات کے سلسلے کو چند عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

(الف) باقاعدہ لغات جن کی غایت جامعیت ہے ۔

(۱) 'شمس اللغات' (۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ھ) ۔ (۲) 'ہفت قلزم' (۱۸۱۴ء/۱۲۳۰ھ)
(۳) 'غیاث اللغات' (۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ) ۔ (۴) 'برہان جامع' (۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ) ۔
(۵) 'دری کشا' (۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ) ۔ (۶) 'فرہنگ آنندراج' (۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ) ۔
(۷) 'افسر اللغات' (۱۹۰۰ء/۱۳۲۴ھ) ۔ (۸) 'آصف اللغات' (۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ و بعد) ۔
(۹) 'جامع اللغات' ۔

(ب) عام عملی اور تدریسی ضرورتوں کے لئے :

(۱) 'زبدۃ اللغات' از غلام سرور لاہوری (۲) 'نصیر اللغات' (ترجمہ غیاث اللغات)۔
(۳) 'لغات کشوری' ۔ (۴) 'لغات فیروزی' ۔

(ج) خالصتاً درسی ضرورتوں کے لئے :

(۱) 'فیروز اللغات' ۔ (۲) 'لغات المبتدی' ۔

(د) مترادفات :

(۱) 'خزانۃ اللغات' (شش زبان) (۲) 'تثلیث اللغات' ۔ (۳) 'اربع عناصر' ۔

(ہ) صرف 'مصادر و مرکبات و امثال' :

(۱) 'بحر عجم' ۔ (۲) جواہر المصادر' ۔ (۳) 'خزینۃ الامثال' ۔ (۴) 'نوادر المصادر'
(۵) شعر و شاعری کی مشق کرنے والوں کے لئے مفید : 'بحر عجم' 'ارمغان آصفی' ، 'زبدۃ اللغات' (فرہنگ سروری) ۔

(و) طب :

(۱) 'محیط اعظم' از محمد اعظم ۔

(ز) اردو سے فارسی :

(۱) 'نوادر الالفاظ' - (۲) 'نفائس اللغات' -

لغات کی تجزیاتی بحث

اس موقعے پر ان سب لغات کا تجزیہ بے ضرورت ہے اور ممکن بھی نہیں - ان میں سے سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی کتابوں پر ہم مختصر تبصرہ کرتے ہیں - اور اس میں تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں بلکہ تقدم پر بنائے اہمیت ہے -

فرہنگ آنندراج

اس دور کی اہم ترین (بلکہ تمام سرمایۂ لغات فارسی میں قابل اعتنا) کتاب لغت 'فرہنگ آنندراج' ہے - یہ کتاب سر مہاراجا مرزا آنند گجپتی راج والئی وجیانگر (ہند) کے لئے لکھی گئی تھی -

مصنف کا نام محمد بادشاہ شاد ہے - اس نے تالیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''اس کی آرزو یہ تھی کہ ایک ایسی لغت کامل تیار ہو جو جامع الفاظ تازی و فارسی ہو -''

یہ کتاب ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ میں ختم ہوئی - اس میں مؤلف کے دو بھائیوں نے بھی امداد کی - ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے--حوالے کی کتابوں کے نام اور اصل زبان کی تعیین کے لئے حروف کو علامت بنایا ہے - مآخذ میں 'برہان قاطع' ، 'جہانگیری' ، 'انجمن آرای ناصری' ، 'مؤید الفضلا' ، 'کشف اللغات' ، 'غیاث اللغات' ، 'بہار عجم' اور 'ہفت قلزم' وغیرہ شامل ہیں -

لغات فارسی کی تشریح شواہد اشعار سے کی ہے - یہ کتاب پہلے ہندوستان میں اور اب ایران میں طبع ہوئی ہے - ایرانی ایڈیشن کے مرتب محمد دبیر سیاقی کا خیال ہے کہ اس سے فارسی کا زیادہ جامع فرہنگ اور کوئی نہیں اور اس میں عربی کے الفاظ اس کی مزید فضیلت ہے -

ہندوستان والا نسخہ تین جلدوں میں ہے اور ایران والا ۷ جلدوں میں - الفاظ پر اعراب علامتوں کے بجائے الفاظ سے ظاہر کئے ہیں تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے -

جیسا کہ پہلے بیان ہؤا ہے اس کی اصل قدر و قیمت اس کی جامعیت ہے ، لیکن مصنف نے ہر ہر تشریح میں اپنی تنقیدی نظر کا ثبوت بھی دیا ہے ۔ اور اس وقت اس کی تحقیق کو علی الاطراف قابلِ اعتبار اور سند مانا جاتا ہے ۔

'**آصف اللغات** (۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ)' از نواب عزیز یار جنگ بہادر ۔

کتاب کا تعارف مصنف نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

> "جامعِ الفاظِ مفردہ و مرکبہ اصطلاحی و استعمال و امثالِ فارسی زبان و مقولہ ہائے عجم ملتزم باسناد متقدمین و متأخرین و برائے ہر یک لفظ ترجمہ با محاورہ زبان اردو مع اسنادِ کلامِ زباندانانِ ہند ۔"

اس کی جلد اول ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ میں عزیز المطابع حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی ۔ باعتبارِ حروفِ تہجی مرتب ہوئی ہے مگر افسوس ہے مکمل نہیں ہو سکی ۔

جیسا کہ تعارف میں مذکور ہؤا اس میں مفردات بھی ہیں اور مرکبات بھی ۔ مقدمے میں مصنف نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مفردات کی دو قسمیں ہیں : (۱) مصادر اور (۲) غیر مصادر ۔

پھر مرکبات کی بھی دو قسمیں ہیں : (۱) مصادرِ مرکب اور (۲) غیر مصادرِ مرکب ۔ اس کے بعد مرکبات کی باعتبارِ معنی چار قسمیں لکھی ہیں :

(۱) اصطلاحی معانی ۔ یعنی "مفاہمت کر لینا قوم کا کسی غیر لغوی معنی پر ۔"

جیسے آب آتش بودن بمعنی حلم و غضب داشتن ۔ آب برندہ = آب گوارا کہ طعام را زود ہضم کند وغیرہ وغیرہ ۔

(۲) مرکبات کی دوسری معنوی صورت یہ ہے کہ لغوی معنی کو قائم رکھ کر ، محاورے میں اس کا خصوصی استعمال کر لیا جائے مثلاً آب خوردن = نوشیدن ۔

(۳) مثل ۔ یعنی حکایت و قصہ جو مطالب کی مزید وضاحت کے لئے لایا جاتا ہے مثلاً آب آمد تیمم برخاست ۔

(۴) "مقولہ عجم کہ اگرچہ اشتقاقِ آن از مصادرِ مرکبہ باشد لیکن بالفاظِ معین

مخصوص است چنانکہ آب در جگر ندارد ۔''

ان اصولوں کے تحت تمام مفردات و مرکبات کی تشریح کی ہے اور ان استعمالات کے لئے مستند شعراء کی سند پیش کی ہے ۔ جن الفاظ کے ایک سے زیادہ معنی ہیں ان کے لئے نشان قائم کئے ہیں تا کہ معنی اور اس کی متعلقہ سند میں رابطہ قائم ہو جائے اور ایسی سند دی ہے جو بالکل مطابقِ معنی ہے ۔ جہاں لغوی اور اصطلاحی دو معنی ہیں ، وہاں دونوں کا ذکر کیا ہے ۔

لغت نگاروں کے اختلافات کی تحقیق بھی کی ہے اور آخر میں ہر فارسی لفظ کا اردو ترجمہ مع سند بھی دیا ہے اور اس کا مقصد یہ بتایا ہے ''تا فارسی دانانِ بیرونِ ہند را از محاورۂ اردو خبر سود'' ۔ اردو الفاظ کی ایک جدا فہرست بھی مرتّب کی ہے تا کہ اردو سے فارسی تک پہنچنے میں دقّت نہ ہو ۔

ان خصوصیات کی بنا پر 'آصف اللغات' کا منصوبہ ایک جامع ترین (دو زبان) قاموس کی تدوین و ترتیب تھا ۔ بنا بریں نا تمام ہونے کے باوجود تحقیق و تنقید کا یہ شاہکار ہے ۔

'ہفت قلزم' : ''در لغات و مصطلحاتِ اہلِ عجم ۔''

نواب غازی الدین حیدر والئی اودھ کے لئے مرتّب ہوئی ۔ ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ میں آغاز ہؤا ۔ مولوی قبول محمد نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ۱۸۱۵ء/۱۲۳۰ھ میں ختم ہوئی ۔ یہ کتاب سات ضخیم جلدوں میں ہے اور ہر جلد کو قلزم کہا گیا ہے ۔ اس سے نحرِ بحر ، اور نہر اور چشمہ اور آبگیر ، پایاب ، معبرِ ساحل اور موج وغیرہ سے تقسیم در تقسیم کی گئی ہے ۔

چھ قلزم حروفِ تہجی کے لغات و کنایات پر مشتمل ہیں ۔ ساتویں قلزم میں فارسی زبان کے حروفِ تہجی کی بحث ، صرف و نحوِ فارسی ، علمِ بیان ، عروض و قافیہ پر مشتمل ہے :

''اعراب ملفوظی ہیں اور انداز قدیم ہے ۔ شواہد کم لائے گئے ہیں ۔
خاتمۃ الطبع کے مطابق اس میں ۲۲۷۰۹ لغات درج ہیں ۔''

اگرچہ یہ کتاب بظاہر غازی الدین حیدر کی تالیف دکھائی گئی ہے لیکن حقیقت یہ

ہے کہ مولوی قبول محمد ہی اس کے مصنّف ہیں - مطبوعہ نسخوں کے سرِورق کی عبارتوں میں ''از تموج و تموّجِ طبع . . . مولوی قبول محمد . . . '' صاف لکھا ہے اور ساتویں جلد کے دیباچے سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے - بہر حال غازی الدین حیدر کی سرپرستی تو واضح ہے -

'ہفت قلزم' میں جامعیت کی بھی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں اوریجنل تحقیق و تنقید موجود نہیں اور ذخیرۂ الفاظ کے سوا اس کی مستقل کوئی خاص اہمیت نہیں -

یہی حال 'شمس اللغات' کا ہے جس میں تحقیقی تنقیدی مداد کم سے کم ہے - یہ کتاب ۱۸۰۳ء/۱۲۱۹ء میں جوزف بریتو جونیر کی فرمائش پر ''چند علمائے متبحرینِ ہند'' کے تعاون سے تیار ہوئی - پہلا ایڈیشن دو بڑی جلدوں میں ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں کلکتہ میں اور دوسرا ۱۸۹۱ء/۱۳۰۹ھ میں بمبئی میں چھپا - تشریح نہایت مجمل ہے اور مصنفوں کے دعوائے جامعیت کے باوجود جامع بھی نہیں ، البتہ ایڈیٹنگ کا انداز جدید (مغربی انداز کا) ہے -

دو اہم لغات

جامعیت کی غایت والی کتابوں میں قدرے محدود پیمانے پر 'برہانِ جامع' از مولوی محمد کریم تبریزی (۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ) اور 'افسر اللغات' از راجا رجیسر راؤ (۱۹۱۵ء/۱۳۳۴ھ) دو مشہور کتابیں ہیں -

لغات کی طویل فہرست میں سے اب خاص ذکر کے لائق دو کتابیں رہ گئی ہیں - 'غیاث اللغات' اور 'خزانۃ اللغات' - باقی عمومی عملی ضرورتوں کے لئے انتخابی فرہنگوں کا درجہ رکھتی ہیں - 'غیاث اللغات' کی اہمیّت اس لئے بھی ہے کہ میرزا غالب کی تنقیدوں نے اسے بقائے دوام بخش دیا ہے اور اس لئے بھی کہ یہ اپنے زمانے کی مقبول ترین کتابِ حوالہ ہے اور آج بھی اس کی مقبولیت اور افادیت باقی ہے - 'خزانۃ اللغات' نئے دور کی تمدنی ضرورتوں کی پیداوار ہے جس میں انگریزی کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے — یہ نئے میلان کا اشاریہ ہے -

غیاث اللغات

مصنف کا نام مُلاّ محمد غیاث الدین رام پوری — کتاب ۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ میں ۱۴ سال

کی محنت سے تیار ہوئی ۔ دیباچے میں لکھا ہے :

"چون بعضے از اساتذہ در تعلیم و تعلّم نظم و نثر فارسی بدریافت صحت لغات و معانی آن بتلاش کتب ہر سو می گردیدند و باوجود بہمرسیدن یک دو کتاب ہم مطلب نمی رسیدند . . . بجہت تسہیل تدریس کتب مروجہ استدعای کتاب کافی می کردند ۔"

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مُلاّ غیاث نے "اکثیر الاستعمال لغات ضروریہ عربیہ و فارسیہ و ترکیہ و کنایات و اصطلاحات و مباحث بعضے علوم و کتب" پر مشتمل یہ مجموعہ تیار کیا ہے ۔ ترتیب میں حرف اول کو باب اور حرف ثانی کو فصل مقرر کیا اور آخری حرف کا بھی خیال رکھا ہے اور سہولت کے لئے اشکال کا بھی اہتمام کیا ہے ۔ بعض بعض جگہ شواہد بھی دیے ہیں ۔ مآخذ کی طویل فہرست دیباچے میں دی ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہؤا ہے 'غیاث اللغات' اس صنف کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے ۔ غالب نے اپنے مکاتیب وغیرہ میں اس کا بڑا استہزاء کیا ہے ، مگر اس کی صحیح وجہ معلوم نہیں ہو سکی ۔ کسی کتاب میں بعض کمزوریوں کا پایا جانا ممکن ہے مگر اس سے کتاب کی مجموعی قدر و قیمت کم نہیں ہو جاتی ۔

'غیاث اللغات' کا اُردو ترجمہ بھی ہؤا ہے جس کا نام 'نصیر اللغات' ہے ۔ مصنف (یا مترجم) اس کے نصیرالدین بالوی تھے ۔

خزالة اللغات

یہ مجموعہ منشی سید جمیل سہسوانی کا مرتّب کردہ ہے ۔ اس میں اُردو ، فارسی ، عربی ، سنسکرت ، انگریزی اور ترکی -- چھ زبانوں کے مترادفات ہیں ۔ شاید پہلی مرتبہ ۱۸۸۷ء/۱۳۰۴ھ میں مطبع شاہجہانی بھوپال میں طبع ہوا ۔

اسے باضابطہ لغت کی کتاب نہیں کہا جا سکتا بلکہ فرہنگ مترادفات ہے جس کی نہایت مختصر سی تشریح صرف فارسی میں ہے ۔ زمانے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے تحت اور زبانوں کے علاوہ انگریزی کے الفاظ بھی لائے گئے ہیں کیونکہ بقول مصنف "متفرق قوموں کو اس کی ضرورت ہے ۔" مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ "عوام کے روزمرہ تعلقات میں فائدہ پہنچے ۔" اس کے علاوہ "یہ کتاب ان لوگوں کے لئے جو زبان ہائے مختلف

کا مذاق رکھتے ہیں" خصوصاً ان لوگوں کے لئے "جو فرق لفظی زبان ہائے مختلف کا دریافت کرنا چاہتے ہیں۔"

محدود پیمانے پر اس طرح کی کتاب 'تثلیث اللغات' اور 'اربع عناصر' ہے۔ سابق الذکر بہ معاونت منشی چرنجی لال و پنڈت بنسی دھر، اور بایمائے ڈائرکٹر تعلیم ممالک مغربی شمالی و اودھ مرتب ہوئی۔ اس میں فارسی، بھاشا اوو انگریزی کے مترادفات ہیں۔

'اربع عناصر' مولوی محمد ناصر علی غیاثپوری نے مدوّن کی ہے اور اس میں مختلف موضوعات سے متعلق الفاظ کو چار خانوں میں جمع کیا گیا ہے۔ خانۂ اول اُردو، خانۂ دوم فارسی، خانۂ سوم اور خانۂ چہارم انگریزی۔ لغات موضاعات کے مطابق ہیں مثلاً اعضائے حیوانات . . . اسبابِ اہلِ حرفہ، اسمائے حیوانات بے پر . . . وغیرہ وغیرہ۔

مصادر و مرکبات

مصادر و مرکباب کے سلسلے میں 'بہارِ عجم' وغیرہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس زمانے میں سب سے اہم کتاب 'بحرِ عجم'، مولوی محمد حسین رافم (افضل الشعراء) نے مرتب کی اور ۱۸۶۰ء/۱۲۷۷ھ میں مدراس کے مطبعِ غوثیہ میں طبع ہوئی۔ یہ ۳۳ نہروں میں ہے۔ شعراء کے لئے خاص طور سے مفید ہے۔ شعراء کی مشق و ریاضت کے لئے مفتی غلام سرور لاہوری کی کتاب 'زبدۃ اللغات' اور مولوی عبدالغنی غنی کی کتاب 'ارمغانِ آصفی' بھی مفید سمجھی گئی ہیں۔ مصادر کے اور بھی بہت سے مجموعے ہیں اور امثال کا قابلِ ذکر مجموعہ 'خزینۃ الامثال' ہے۔

درسی لغت

خالص (اور محدود) درسی مقاصد کے لئے 'فیروز اللغات' (مولوی فیروز الدین) ہے جو کئی بار شائع ہوئی اور ابھی حال میں وسیع اضافوں کے ساتھ فیروز سنز نے شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ 'لغاتِ فیروزی' بھی ہے جس میں فارسی، عربی، ترکی، یونانی، ہندی، سریانی، انگریزی، پرتگالی اور فرانسیسی وغیرہ کے الفاظ ہیں۔ اور 'کریم اللغات' (مولوی کریم الدین) اور قدرے وسیع تر افادہ کے لئے 'لغاتِ کشوری' (سید تصدق حسین رضوی) بھی مقبول کتابوں میں ہے، جو پہلی مرتبہ مطبع نولکشور سے ۱۸۷۲ء کے بعد کسی وقت شائع ہوئی۔ کتاب منشی نولکشور کے نام سے منسوب ہے۔

طب

طب کی خالص مصطلحات پر 'محیطِ اعظم' از اعظم رام پوری اور اردو بنیادی الفاظ سے فارسی عربی اوحد الدین بلگرامی کی 'نفائس اللغات' ہے۔ تشریح کی زبان فارسی ہے اور یہ پہلی مرتبہ شاید ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ میں مطبعِ نولکشور کانپور میں طبع ہوئی۔

یہاں اس دور کی کتبِ لغت کا جائزہ ختم ہوتا ہے۔ ہم نے اس صنف کی بہت سی کم اہمیت والی خصوصاً ابتدائی درسی مقاصد والی کتابوں کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ یہ فہرست بے فائدہ طور سے موجبِ تطویل ہو جاتی۔

۱۸۵۷ء کے بعد

قواعد اور زبان آموزی کے دوسرے سلسلے

آخری دورِ مغلیہ میں صحیح اور فصیح زبان کی دریافت اور آموزش پر خاص توجہ ہوئی۔ مغربی طریقوں کے رواج سے پہلے ان کا اسلوب قدیم تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں جو نئی سیاسی و معاشرتی فضا قائم ہوئی اس کے زیرِ اثر ''تعلیمی و تدریسی ضرورتوں نے ایک نئی صورت اختیار کی اور زبان آموزی کے علاوہ قواعدِ زبانِ فارسی کی تدوین بھی نئے اصولوں پر ہوئی۔'' اس میں انگریزی کے قائم کردہ مدرسوں اور محکمہ ہائے تعلیم نے بھی حصہ لیا۔

ہم نے اس ساری بحث کو یک جا کر دیا ہے تاکہ یہ روداد مربوط نظر آئے۔ اس میں سب سے پہلے قواعدِ فارسی (جو قواعدِ عربی کی اساس پر مرتّب ہوئے)۔ اس کے بعد دوسرے سلسلے مثلاً شرح نگاری اور فرہنگ نگاری آئے گی۔ فارسی میں صرف و نحو کی باضابطہ تدوین شاید انگریزی دور ہی میں ہوئی۔ اس سے پہلے قواعد صرف و نحو دوسری اصناف کے ضمن میں بیان ہوتے رہے۔ ان قواعد کا ایک بڑا حصہ لغات اور شروح کے ضمن میں آتا ہے۔ تاہم سابقہ دور میں بھی کچھ کوششیں نظر آتی ہیں جن کا اس باب میں تذکرہ بے محل ہوگا۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے تصنیفی سرگرمیوں میں تدریسی غرض و غایت شامل ہو جاتی ہے اور سکولوں کے طلبا کے لئے بغرضِ تسہیل کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

اس تاریخ ادبیات میں سب کا ذکر مناسب نہیں - معیارِ علمی کے لحاظ سے بھی یہ معیار شناسی کے آداب کے خلاف ہے کہ سب کا تذکرہ کیا جائے - انگریزوں کے قائم کردہ کالجوں (پہلے فورٹ ولیم اور بعد میں دوسری قائم شدہ درسگاہوں) میں چند یورپین عالم محبانِ فارسی موجود تھے جن کے ایماء اور ذاتی توجہ سے فارسی زباندانی پر انگریزی میں بھی رسالے لکھے گئے - بہت سے ملکی اہلِ علم بھی تھے جو تدریسی ضرورتوں سے کتابیں لکھتے رہے لیکن ان میں سے بہت کم علمی رتبہ حاصل کر سکیں - اس کے علاوہ اکثر صورتوں میں ذریعۂ اظہار فارسی کے بجائے اُردو تھا - بہت کم لوگوں نے فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا - مولانا اصغر علی روحی نے 'دبیرِ عجم' کے نام سے فارسی میں ایک کتاب علمِ بیان و بلاغت پر لکھی جسے ایک معیاری بلند پایہ کتاب سمجھا جا سکتا ہے - ان میں سے ان فارسی کتابوں کی ایک فہرست (جو میرے علم میں آ سکی ہے) بطورِ ضمیمہ شامل ہے - اس فہرست میں کچھ شرحیں ، کچھ کتبِ قواعد ، کچھ رہنمائے خطوط نویسی قسم کی کتابیں ہیں -

قیامِ پاکستان کے بعد اکثر تدریسی کتابیں اُردو میں لکھی گئیں - البتہ یونیورسٹیوں میں ایڈیٹنگ کا کام ہوا - ڈاکٹر محمد باقر (سابق رئیسِ قسمتِ فارسی پنجاب یونیورسٹی) نے 'مدارالافاضل' کو ایڈٹ کر کے طبع کرایا -

ضمیمہ

(اس فہرست میں صرف و نحو کی کتابوں کے علاوہ شروح ، مصدر نامے اور فرہنگ بھی شامل ہیں) ۔

صرف و نحو

۱۔ مولوی عبدالحق ، مدرسہ کلکتہ ، ضوابط فارسی (صرف و نحو) ۔

۲۔ عبدالرحیم بن عبدالکریم صفی پوری ۔ 'غایۃالبیان فی علم اللسان' ۔ (عربی صرف و نحو بزبان فارسی) ۔

۳۔ 'آمدن نامہ' ۔ بمبئی ۱۸۹۲ء ۔ (فارسی کے پرانے مروج اسلوب میں مصادر و افعال کا بیان مع انگریزی ترجمہ اور تلفظ کے) ۔ الف بائی فارسی ، دہلی ۱۸۷۵ء ۔ ابتدائی پہلی کتاب ہجا ۔

۴۔ محمد عبدالرؤف وحید ۔ 'نحو وحیدی' ، کلکتہ ۱۸۶۲ء ۔ فارسی نحو پر رسالہ بہت سی مثالوں سے مزیّن ۔

۵۔ محمد نصر اللہ خان خرجوی ۔ یمن اظفری ، لکھنؤ ۱۸۷۸ء ۔ مشرقی ترکی کے قواعد (ان تمام کتب سے عام میلان کا اظہار ہوتا ہے) ۔

شروح

۱۔ عبدالقادر معروف عندلیب گلشن راز فخری کی کتاب 'فناض معنوی' ۔ مدراس ۱۹۰۳ء/ ۱۳۲۱ھ ۔ رومی کے چند اشعار کی شرح اس کے بیٹے شاہ قادر کی مرتّب کی ہوئی ۔

۲۔ طاس ولیم بیل ۔ 'مفتاح التواریخ' (علم تاریخ گوئی بر بحساب جمل عالمانہ کتاب فارسی میں ہے) ۔

۳۔ محمد عبدالسلام کشمیری ، 'الکواکب الدریہ' فی القصیدہ القطبیۃ ، امرتسر ۱۹۰۵ء/ ۱۳۲۲ھ فارسی شرح از عربی ۔

۴۔ محمد گلوی ، 'شرح یوسف زلیخا' ، لاہور ۱۹۰۰ء ۔

۵۔ بدرالدین چاچی ، 'قصائد بدر چاچ' ، لکھنؤ ۱۸۴۵ء ۔ کانپور ۱۸۷۷ء ۔ محمد ہادی علی نے مع فرہنگ مرتّب کیا ۔

۶۔ محمد عثمان قیس ، معروف بہ عثمان خانی ، 'شرح قصائد بدر چاچ' ، رام پور ۷۳-۱۸۷۲ء ۔

۷۔ محمد غیاث الدین رامپوری ، 'شرح قصائد بدر چاچ' ، لکھنؤ ۱۸۹۱ء ۔

۸۔ عبدالمجید خان حافظ آبادی ، 'شرح قصائد بدر چاچ' ، لکھنؤ ۔

۹- احمد حسن شوکت، 'حل قصائدخاقانی'، میرٹھ ۱۹۰۶ء۔ بین السطورمیں ترجمہ اور حاشیہ۔

۱۰- ظہورالحسن بنہوری، 'شرحِ مثنوی مخزن اسرار' (نظامی) مع شرح ظہورالاسرار، لکھنؤ ۱۸۸۱ء۔

۱۱- کعب ابن زہیر، 'سرورالعباد شرحِ قصیدہ بانت سعاد'، لکھنئو ۱۸۷۰ء۔ فارسی نظم میں ترجمہ از کامی اور فارسی تشریح سرورالعباد از عبدالحافظ محمد نذیر۔

۱۲- محمد اکرم ابن عبدالرزاق ملتانی، 'شرح گلستان سعدی'، لکھنؤ ۱۸۷۳ء۔ لاہور ۱۸۸۸ء، لکھنؤ ۱۹۰۰ء۔

۱۳- محمد محی الدین منشی، 'حل المعقود'، الہ آباد ۱۸۷۹ء۔ (فرہنگ گلستان و بوستان سعدی)۔

۱۴- اعشی میمون ابن قیس کے دو عربی قصیدے مع شرح و فارسی ترجمہ از قاضی احمد شاہ رضوانی، امرتسر۔

زبان دانی اور انشا

۱- محمد عبداللہ بلگرامی، 'مفیض فارسی'، لکھنؤ ۱۸۷۴ء، فارسی قواعد کی کتاب۔

۲- محمد عبدالرؤف واحد 'نحو واحدی'۔ کلکتہ ۱۸۶۲ء۔ فارسی نحو پر رسالہ، بہت سی مثالوں سے مزین۔

۳- محمد عبدالحکیم، رئیس میرٹھ (أ) 'آغاز فارسی'، میرٹھ ۱۸۷۲ء۔ (فارسی افعال کی ابتدائی کتاب، جس میں اردو اور فارسی میں مشقیں دی ہوئی ہیں)۔ (ب) 'الف بای فارسی'، میرٹھ ۱۸۷۶ء۔ (الف بائی طرز پر فارسی افعال کی فہرست جو استعمال کرکے دکھائے گئے ہیں اور ان کی شرح اردو میں)۔

۴- محمد عبدالعزیز آوری (أ) 'عزیزالمصادر'۔ لکھنؤ ۱۸۷۷ء۔ فارسی مصادر۔

(ب) 'بہار ہند'۔ لکھنؤ ۱۸۷۰ء۔ نمونہ کے خطوط مع حواشی۔

(ج) 'رقعہ گلستان حکمت'، لکھنؤ ۱۸۷۴ء۔ سوراج کمار آرون کے مرتّب کردہ نمونے کے خطوط مع حواشی)۔

(د) 'انشای دلآویز'۔ کان پور ۱۸۷۷ء۔ نمونے کے خطوط۔

(ہ) 'نسخہ تعلیمیہ'، لکھنؤ ۱۸۷۱ء، کانپور ۱۸۸۰ء۔ فارسی بول چال کی ابتدائی کتاب۔

(ر) 'رقعاتِ عزیزی'، کان پور ۱۸۹۵ء۔ خطوط لکھنے کا ڈھنگ۔

۵- حکم چند منشی، 'انشای فارسی'، لاہور ۱۸۷۷ء۔ ابتدائی فارسی خطوط نویسی، خود آموز فارسی، بمبئی ۱۸۹۰ء۔ حکایات لطیف کی پہلی پانچ حکایتوں کو غلام احمد نے جمع کرکے پڑھنے والوں کے لئے لکھا۔

۶- عبداللہ بیگ ہوش، 'گفتگو نامہ فارسی' پانچواں ایڈیشن لکھنؤ ۱۹۰۲ء۔

۷- جے سکھ رائے، 'انشای راحت جان'، لکھنؤ ۱۸۷۹ء۔ خطوط نویسی۔

☆ ☆ ☆

چھٹا باب

دینی ادب ۱۸۵۷ء کے بعد تا ۱۹۷۱ء

۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی نے صورتِ حال میں گہری اور دور رس تبدیلیاں پیدا کیں اور پہلی مرتبہ مسلمانانِ ہند نے یہ محسوس کیا کہ انگریزی حکومت کا غلبہ اور افکار و اطوار بہرحال قابلِ اعتنا حقیقتیں ہیں . . . اس خیال کے زیرِ اثر مذہبی تفکر بھی بعض حدبندیوں کے اعتراف پر مجبور ہؤا ، جن کا ذکر آگے آئے گا ۔

با ایں ہمہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز بلکہ اس کے ربعِ اول تک قدیم دینی مباحثے اور مناظرے بھی موجود رہے ، اس اثنا میں نئے نئے دینی مدارس وجود میں آئے جن کا دینی زندگی پر گہرا اثر ہؤا ۔

دہلی اور لکھنؤ ، پورب اور بنگال ، دکن اور پنجاب ، سرحد اور سندھ میں ہر جگہ ۱۸۵۷ء کی تحریکات کے زیرِ اثر مدارس و مکاتب جاری ہوئے ۔ ان میں قدیم تعلیمی روایات ہی کی پیروی ہوئی ۔ کہیں خیرآبادی مکتبِ معقولات اور فرنگی محل کے درسِ نظامی پر اصرار ، کہیں شاہ ولی اللہ صاحب کے اسلوب پر مکتب دیوبند[1] کی مصالحتی صورتِ حال ، جس کی تاسیس و ترویج میں مولانا رشید احمد گنگوہی ، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا

---

(۱) دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء/۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو رکھی گئی ۔ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں موجود ہیں ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اس کے پہلے اور مرکزی معمار تھے ۔ ان کے علاوہ رشید احمد گنگوہی اور سید عابد تھے ۔ اس کے اساسی اصول نانوتوی صاحب نے مرتب کیے اور عملی ضوابط شاہ رفیع الدین صاحب نے ۔ ان اصولیات میں ایک امر خاص یہ نظر آیا کہ نانوتوی صاحب کے نزدیک مدرسے کے بقا و دوام کے لئے ضروری ہے کہ ''آمدنی و تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے'' اور سرکار کی شرکت اور امراء کی سرکت بھی مضر ہے ۔ اس عظیم مدرسے سے متعلق نامور بزرگوں اور اساتذہ کے لئے دیکھیے کتاب ''بیس بڑے مسلمان'' از عبدالرشید طبع ، لاہور ۱۹۶۹ء ۔

محمود الحسن وغیرہ نے بنیادی حصہ لیا ۔ کہیں ندوۃ العلماء کی صورت میں مفاہمتی پیش قدمی، جس میں شبلی کا تفکر کام کرتا رہا ۔ کہیں خالص اہلِ حدیث (جس کے بڑے نمائندے مولانا نذیر حسین محدث اور لاہور کے غزلوی علماء تھے) ۔ کہیں اس کا شدید ردِ عمل بریلوی مکتب کی صورت میں (جو بریلی کے علماء نقی علی خان اور احمد رضا خان نے قائم کیا) اور عام سطح پر شیعہ سنّی نزاع جس میں پہلے مجتہد سید دلدار علی اور پھر ان کے فرزند مجتہد العصر سید محمد لکھنوی اور سب سنی علماء نے بڑا حصہ لیا ۔

جب بہار اور بنگال اور سرحد میں برطانوی حکومت سے سید احمد شہید کے پیروکاروں اور معتقدوں کی آویزش ہونے لگی تو انگریزی حکمتِ عملی نے فرقے کی نزاع میں شدت پیدا کی ۔ اس میں شیعہ سنّی اور مقلّد غیر مقلّد (وہابی ، سنّی) کش مکش نے ہولناک صورت اختیار کر لی ۔ کچھ نئے فرقے بھی نکلے ۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی اور عبداللہ چکڑالوی کی تحریکوں نے نئے فرقوں کو جنم دیا ۔ مؤخرالذکر خود کو اہل القرآن کہتے ہیں ۔

اس کے پہلو بہ پہلو عیسائیوں اور آریا سماجیوں سے مناظروں میں وسعت اور شدّت پیدا ہوئی ۔ اس میں رحمت اللہ کیرانوی ، ڈاکٹر وزیر خان ، مولانا محمد ابوالمنصور ، مولانا

---

(۱) لفظ وہابی دراصل محمد بن عبدالوہاب سے نسبت کر کے ہندوستان میں اس گروہ کے لئے مشہور ہو گیا جو قبور و مزارات کی زیارت اور اولیاء اللہ کے وسیلے سے استعانت سے اختلاف کرتا تھا ۔ اسی طرح ان رسوم سے روکتا تھا جو ہندوستان کے خاص معاشرتی حالات کے اثر سے مسلمانوں میں پھیل گئی تھیں ۔ یہ گروہ غیر مقلد تھا ۔، ہندوستان میں اس مکتب کے لوگ خود کو اہل حدیث کہتے ہیں اور وہابی کہلوانے کو سخت ناپسند کرتے ہیں ۔ نواب علی حسین نے مآثر صدیقی (جلد سوم) میں لکھا ہے کہ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد مختلف تھے ۔ ان کے متبع حنبلی تھے اور بہت سے امور میں اہلِ حدیث کا ان سے اختلاف ہے ۔ بہرحال ہندوستان میں مخالف اہل حدیث کو بھی وہابی ہی کہتے ہیں — سرسید احمد خان نے خود کو وہابی کہہ کر ، برطانوی حکومت کی اس بدظنی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ سب لوگ انگریزوں کے مخالف اور باغی ہیں ۔ حضرت سید احمد بریلوی مجاہد نے جو سلسلۂ جہاد شروع کیا اس میں بیشتر لوگ اسی مسلک کے تھے ۔ بعد میں انگریزی حکومت کے اولین مخالفین میں یہ لوگ پیش پیش تھے — دینی دائرے میں مولوی فضل رسول بدایونی اور ان کے ہم خیال علماء نے نیز مولوی نقی علی خان اور ان کے برگزیدہ فرزند مولانا احمد رضا خان بریلوی نے اس لقب کو بہت مشہور کیا ۔

محمد قاسم نانوتوی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری نے خاص نام پایا ۔ اس دور میں دین کو آسان بنانے کی تحریکیں بھی ابھریں اور فرقوں کے اتحاد پر بھی زور دیا گیا ۔ حدیث اور انکارِ فقہ کے ساتھ ساتھ خود قرآن مجید کی متعدد مادی تعبیریں بھی ہوئیں ۔ سرسید احمد خان کے اسلوبِ فکر ، نے جس میں وکٹورین عہد کا ریشنلزم (عقل پرستی) اور نیچرلزم (فطرت اور قوانینِ فطرت پر زور) کا اصول غالب تھا ، ایک نئی آویزش کو جنم دیا ۔ مغربی افکار کے زیرِ اثر اسلاف کی تقلید سے آزادی کے عقیدے نے کئی اور راستے بھی نکال لیے ۔ حدیث کا انکار ، عقل پسندی کے تحت معجزات ، دوزخ ، جنت ، ملائکہ ، روح ، قیامت کا انکار اور اہم ارکانِ دین کے بارے میں تشکیک اس آزادی کے نتیجے کے طور پر سامنے آئے ۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک طرف تو سائنس کی مذہب پر بالادستی کا خیال اور دوسری طرف عقیدۂ جہاد کی نئی نئی تعبیریں (جن سے انگریزی حکومت کی تائید نکلتی تھی) عام ہوئیں ۔ بیسویں صدی عیسوی کے ربعِ ثانی میں عنایت اللہ خان المشرقی کی خاکسار تحریک اور طلوعِ اسلام تحریک (جسے عرفِ عام میں پرویزی تحریک کہا جاتا ہے) بھی اسی فکر کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ اس کے برعکس اثباتی فکر کی کچھ لہریں بھی سطح پر آئیں ۔ مثلاً بیسویں صدی عیسوی کے ربعِ اول میں اتحادِ اسلام تحریک (جس کے عظیم نمائندے اقبال ، شبلی ، ابوالکلام ، ظفر علی خان ، مولانا محمد علی اور شوکت علی تھے) ۱۹۱۴ - ۱۸ء کی جنگِ عظیم کے فوراً بعد تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی ہند ، اس سے متصل بعد میں مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان اور فکرِ اقبال کے تحت قیامِ پاکستان اور اس کے ساتھ ساتھ جماعتِ اسلامی کی تحریکِ اقامتِ دین ظہور میں آئی ۔ یہ تحریکیں دینی فکر کو کسی نہ کسی پہلو سے متاثر کرتی رہیں اور اب بالکل تازہ صورتِ حال کے طور پر سوشلزم اور اسلام کے معاشی نظریے کی آویزش ہمارے سامنے ہے ، جس سے اسلام کے تصوّراتِ اخوت و عدل کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور اخوت و مساوات کی بحثیں جاری ہیں ـــــ ، اگرچہ یہ سب نزاعات اردو میں یا انگریزی میں ہیں اور کسی مصنف نے فارسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بنایا تاہم یہ تاریخِ ادبیات ان کے حوالے کے بغیر نامکمل ہی ہوتی ، اس لئے یہ اشارے یہاں مجبوراً کئے گئے ہیں ۔ یوں ۱۸۵۷ء کے بعد کا سارا دور درحقیقت فارسی سے زیادہ اردو کا دور ہے اور اس کی سرگزشت کا مطالعہ اردو ادب کی اس دور سے متعلقہ جلد میں کیا گیا ہے ۔

صوفیانہ ادب کے بارے میں صرف یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ موضوعات کی زبان اب

فارسی کے بجائے اردو ہے ، اگرچہ فارسی کی تصانیف بھی موجود ہیں ۔ اردو میں صوفیوں کے بہت سے تذکرے مرتب ہوئے جن میں سندھ ، پنجاب ، سرحد ، بنگال ، دکن اور یو ۔ پی کے بزرگوں کی سرگزشتیں لکھی گئیں ۔ کچھ تذکرے اور ملفوظات بھی ہیں ۔ مگر اخلاق کے موضوع پر اس دور کا فارسی سرمایۂ عزیز صفر ہے ۔

فارسی میں صاحبِ تصنیف علماء

اس دور کے ممتاز صاحبِ تصنیف علماء کی ایک مجمل فہرست درج ذیل ہے :

۱۔ حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی (م ۔ ۱۸۹۹ء/۱۳۱۷ھ) ۔

۲۔ مولانا تقی علی خان بریلوی (م ۔ ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ) ۔

۳۔ نواب صدیق حسن خان (م ۔ ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ) ۔

۴۔ حافظ عبداللہ بلگرامی (م ۔ ۱۸۸۸ء/۱۳۰۵ھ) ۔

۵۔ مولانا عبدالحکیم لکھنوی فرنگی محلی (م ۔ ۱۸۷۱ء/۱۲۸۸ھ) ۔

۶۔ مولانا عبدالحلیم لکھنوی فرنگی محلی (م ۔ ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ) ۔

۷۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م ۔ ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ) ۔

۸۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۔ ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ) ۔

۹۔ علامہ ناصرالدین ابوالمنصور (م ۔ ۱۸۸۷ء/۱۳۰۵ھ) ۔

۱۰۔ مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۔ ۱۹۰۵ء/۱۳۲۲ھ) ۔

۱۱۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی (م ۔ ۱۸۹۰ء/۱۳۰۸ھ) ۔

۱۲۔ مولانا نذیر حسین محدث (م ۔ ۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ) ۔

۱۳۔ مولوی وحیدالزمان (م ۔ ۱۹۲۰ء/۱۳۳۸ھ) ۔

۱۴۔ مجتہد العصر سید محمد لکھنوی (م ۔ ۱۸۶۷ء) ۔

۱۵۔ مولوی امان اللہ بنارسی احمد آبادی (م ۔ ۱۸۶۰ء/۱۲۷۷ھ) ۔

۱۶۔ مولوی جلال الدین بنارسی (م ۔ ۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ) ۔

۱۷- مولانا محمد احسن نانونوی (م - ۱۸۹۵ء/۱۳۰۲ھ) -

۱۸- مولوی رحمان علی مصنف تذکرۂ علمائے ہند (م - ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ) -

۱۹- مولانا سلامت اللہ بدایونی کانپوری (م - ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ) -

۲۰- مولانا کرامت علی جونپوری (م - ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ) -

۲۱- فخرالدین احمد آبادی (م - ۱۸۸۵ء/۱۳۰۳ھ) -

۲۲- فضل رسول بدایونی (م - ۱۸۷۲ء/۱۲۸۹ھ) -

۲۳- مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی (م - ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ) -

۲۴- سید ابوالفتاح گلشن آبادی (م - ۱۸۶۷ء/۱۲۸۴ھ مابعد) -

۲۵- مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی استاد مولانا شبلی (دیکھیے حیاتِ شبلی از سید سلیمان) -

۲۶- سید نصیرالدین برہانپوری (م - ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ) -

۲۷- حافظ ولی اللہ لاہوری (م - ۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ) -

۲۸- مولوی آل حسن موہانی (م - ۱۸۷۰ء/۱۲۸۷ھ) -

۲۹- امیر حسن سہسوانی (م - ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ) -

۳۰- بشیر الدین قنوجی (م - ۱۸۶۵ء کے بعد) -

ان علماء میں ہر فکر کے حضرات شامل ہیں[1] اور اس فہرست میں ہند و پاکستان کے ہر خطے کے بزرگوں کو شامل کیا گیا ہے - ان میں وہ بھی ہیں جن کا کام تفسیر اور حدیث اور فقہ و کلام وغیرہ میں مسلّم ہے، وہ بھی ہیں جو مقلّد غیر مقلّد نزاع میں نمایاں حصہ لیتے رہے - وہ بھی جو شیعہ سنی مناقشے میں صاحبِ تصنیف ہوئے - وہ بھی ہیں جنھوں نے عیسائیوں یا آریاؤں یا مجدّددین (نیچریوں) سے مناظرے کئے - ان میں سے بعض نے تصوّف کے موضوعات پر بھی لکھا - ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر اس مجمل کتاب میں تفصیلی

---

(۱) یہ فہرست تذکرۂ علمائے ہند از رحمان علی سے لی گئی ہے -

بحث ممکن نہیں ۔ یہاں صرف ان حضرات کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی شخصیتیں خاص طور سے نمایاں ہوئیں اور جنھوں نے اپنے ماحول کو متاثر کیا ۔

یہ مسلّم ہے کہ اس دور میں شاہ ولی اللہ صاحب کے مرتبے کی ایک شخصیت بھی پیدا نہیں ہوئی مگر چند نمایاں نام اس دور میں بھی مل جاتے ہیں ۔ ان میں نواب صدیق حسن خان ، مولانا رشید احمد گنگوہی ، مولانا محمودالحسن ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا احمد رضا خان بریلوی ، مولانا نذیر حسین محدث ، مولانا سید محمد مجتہد لکھنوی ، مولانا عبداللہ غزنوی ، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق علم کی شمعیں روشن کرتے رہے ـــــ اور آخر میں سرسید احمد خان ، علامہ اقبال ، مولانا ابوالکلام اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا ۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر نے فارسی میں نہیں لکھا ۔ تاہم دینی فکری تحریک میں ان بزرگوں کا بڑا حصہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

ذیل میں ان اکابر میں سے چند خاص الخاص صاحبِ تصنیف بزرگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے :

حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی (عالمِ دین اور صوفی) :

ولادت ۱۸۱۸ء/۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ بمقام نانوتہ اور وفات ۱۸۹۹ء/۱۳۱۷ھ ۔ والد نے امداد حسین نام رکھا تھا لیکن شاہ محمد اسحاق نبیرۂ شاہ عبدالعزیز نے امداداللہ سے ملقب کیا (بقول بعض ان کا نام خدا بخش بھی تھا ، بحوالہ گلزارِ معرفت دیوان اردو ۔ حاجی امداداللہ صاحب ۔ اور عبدالکریم نام بھی خطوط میں آیا ہے) ۔

آبائی وطن تھانہ بھون اور سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے ۔ حاجی صاحب نے کئی بزرگوں سے تعلیم حاصل کی لیکن جملہ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا علمِ ظاہری کچھ زیادہ نہ تھا ۔ لیکن بقول مولانا اشرف علی تھانوی :

> ”علم لدنیؐ کے جامۂ عنبر شامہ سے آراستہ اور نورِ عرفان و ایقان کے زیورات سے سرتاپا پیراستہ تھے“ ۔ (امدادالمشتاق ، ص ۱۵)

اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا نصیر الدین نقشبندی مجددی دہلوی سے طریقۂ نقشبندیہ

میں بیعت کی ۔ مولانا نصیر الدین کی وفات کے بعد حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت کی اور چاروں سلسلہ ہائے طریقت کی تکمیل کر کے اجازت حاصل کی ۔ ان کے مریدوں میں زمانے کے بلند پایہ صلحاء اور علماء شامل تھے ۔ مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہی ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا محمد یعقوب ، مولانا فیض الحسن سہارنپوری ، مولانا ذوالفقار علی وغیرہ ۔

اول الذکر بزرگوں نے مدرسہ دیوبند قائم کیا ۔ حاجی صاحب نے شاملی ضلع مظفرنگر میں جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا ۔ اس کے بعد وہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور عمر بھر وہیں رہے ۔

حاجی امداداللہ کی اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کتابیں ہیں ۔ مثلاً 'مثنوی رومی' کا حاشیہ ، فارسی زبان میں رسالہ 'ضیاء القلوب' ، 'رسالہ وحدۃ الوجود'—اور 'مکتوبات فارسی' ۔

حاجی صاحب کو 'مثنوی رومی' سے بے حد لگاؤ تھا ۔ وہ 'مثنوی' کا درس دیا کرتے تھے اور مولانا اشرف علی کے بقول یہ درس کشفی تھا ۔ (ارواح ثلاثہ ، ص ۱۸۳)

اگرچہ ظاہری طور سے حاجی امداداللہ کا تصنیفی کام کچھ زیادہ نہیں مگر انہوں نے علماء اور مصنفین کی ایک بڑی جماعت کو متاثر کیا اور اس دور کی دینی اور صوفیانہ زندگی میں ان کا حصہ مسلّم ہے ۔ مزید حالات کے لئے دیکھیئے (۱) 'حیات امداد' از انوارالحسن شیرکوٹی ۔ (۲) 'بیس بڑے مسلمان' از عبدالرشید ۔

احمد رضا خان بریلوی (م ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ) :

والد کا نام نقی علی خان تھا[۱] ۔ نسباً پٹھان تھے ۔ ساتویں پشت میں ان کے جدّ

---

(۱) مولانا نقی علی بریلوی ۱۸۳۰ء/۱۲۴۶ھ میں بریلی میں پیدا ہوئے —، تذکرہ علمائے ہند کے بیان کے مطابق ساری عمر سنّت کی اشاعت اور بدعت کے رد میں مصروف رہے ۔ شاہ آل رسول مارہروی سے تمام سلسلوں کی بیعت کی ۔ ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ میں فوت ہوئے ۔ رحمان علی نے ان کی ۲۵ کتابوں کی فہرست دی ہے جن میں سے کچھ فارسی میں ہیں ۔

مسئلہ امتناع نظیر و مماثلت رسولؐ میں بڑا انہماک دکھایا (دیکھیے رسالہ تنبیہ الجہال) ۔ مولانا نقی علی کا کام ان کے نامور فرزند مولانا احمد رضا خان بریلوی نے آگے بڑھایا اور رد وہابیہ کے مسئلے میں بے اندازہ دلچسپی لی ۔

سعید اللہ خان ، قندھار سے مغلوں کے زمانے میں لاہور آئے ۔ پھر وہاں سے دہلی اور آخر میں روہیل کھنڈ پہنچے ۔

مولانا احمد رضا خان ۱۲۷۲/۱۸۵۵ء میں بمقام شہر بریلی پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ، علوم کی کتابیں مرزا غلام قادر بیگ سے بڑھیں ۔ علوم دینی کی تکمیل اپنے والد ماجد سے کی ۔ تیرہ برس کی عمر میں جملہ علوم فقہ ، کلام ، معانی و بیان ، تاریخ ، نجوم ، جفر ، ریاضی ، جغرافیہ ، منطق اور حکمت وغیرہ میں کامل ہوگئے ۔ سلوک و طریقت میں مولانا سید آلِ رسولؒ مارہروی سے کسبِ فیض کیا ۔ علمی اور روحانی لحاظ سے آپ کے بلند مقام اور آپ کے اثر و رسوخ کے زیرِ نظر آپ کو ''اعلیٰ حضرت'' کے لقب سے پکارا جاتا ہے ۔

آپ کی سرگرمیوں کا خاص میدان علوم دینیہ اور حنفیّت کی تبلیغ و اشاعت تھا ، تاہم مسلمانوں کی ملّی و سیاسی رہنمائی کے سلسلے میں بھی آپ کی خدمات خاص اہمیت کی حامل ہیں ۔ برصغیر پاک و ہند میں انگریز کے قدم جم جانے اور انگریزی علوم و تہذیب کے فروغ کے باعث اعتزالی تحریکوں کو تقویت ملی جس سے مسلمانوں کے دینی جذبہ و خلوص میں کمی واقع ہونے لگی ۔ مولانا بریلوی نے اس موقع پر ''محبتِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ'' کی اہمیت پر خصوصی زور دیا ۔ سیاسی تحریکوں میں جب بعض مسلم زعماء اور علماء ہندوؤں سے اتحاد اور موالات کرنے لگے تو مولانا احمد رضا خان نے اس تحریک کی سختی سے مخالفت کی اور ان لوگوں کے لئے ''فرقہ گاندھیہ'' کی سیاسی اصطلاح وضع کی ۔

تحریکِ خلافت کی سٹیج سے جب مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین شروع ہوئی اور ہزاروں مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان کی طرف جانے لگے تو مولانا احمد رضا خان نے اس ہجرت کے خلاف فتویٰ دیا اور مسلمانوں کو ہندو کی چال سے بچنے اور ہندوستان ہرگز نہ چھوڑنے کے لئے کہا ۔ مذکورہ بالا مسلک پر مولانا احمد رضا خان شدّت سے قائم رہے ۔ علمائے دیوبند اور علمائے اہلِ حدیث سے مناظرانہ انداز سے نزاع کا سلسلہ جاری رہا ۔ اس مناظرانہ انداز میں مولانا احمد رضا کی سخت گیری اور شدّت کی پالیسی بڑی شہرت رکھتی ہے ، حتیٰ کہ مولانا احمد رضا خان کی طرف بعض

ایسے عقائد[1] منسوب کر دیئے گئے ہیں جن کا انہوں نے خود اپنی تالیفات میں رد کیا ہے۔

ان کی تالیفات اور کتب دینیہ پر ان کے حواشی بڑی تعداد میں ہیں۔ لیکن دینی موضوعات پر فارسی میں ان کی کتابیں تعداد میں نسبتاً کم ہیں جن کا ذکر بعد میں آ رہا ہے۔ بیشتر دینی تصانیف عربی یا اردو میں ہیں جن کی فہرست 'حیات[2] اعلیٰ حضرت' میں دی گئی ہے۔ فارسی کی کتابیں زیادہ تر علوم ریاضی وغیرہ سے متعلق ہیں جن میں ان کی دسترس غیرمعمولی تھی۔ عربی اردو کتابیں متعدد موضوعات پر ہیں۔ مثلاً تفسیر، حدیث، حواشی بحدیث، عقائد و کلام، فقہ، تجوید، تصوف، اذکار، اوفاق، تعبیر، تاریخ، سیر، مناقب، ادب، نحو، لغت، عروض، علم زیجات، جفر، تکسیر، جبرو مقابلہ، علم مثلث، ارثماطیقی، لوگارتھم، توقیت، نجوم، حساب، ہیئت، ہندسہ، ریاضی، فلسفہ اور منطق۔

مولانا بریلوی بلند پایہ نعت گو بھی تھے۔ ان کا اردو کلام بڑا پُر تاثیر ہے۔ فارسی میں بھی منظوم کلام کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ جو قصائد، رباعیات، قطعات اور چند مثنویوں پر مشتمل ہے۔ ان کا دیوان 'حدائقِ بخشش' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، وہ مسائل جن میں انہوں نے مناظرانہ انداز اختیار کیا اور ان کی تائید و تبلیغ میں ثابت قدم رہے، ان میں وہ اہم ہیں جو اہلِ حدیث اور ان کے مسلک کے احناف کے ما بین ما بہ النزاع ہیں۔ ان نزاعی مباحث کے سلسلے میں، مولانا بریلوی کا، علمائے دینیہ، سر سید احمد خان اور علمائے ندوہ وغیرہ کے ساتھ بھی اختلاف ہوا۔ یہ مباحث و مسائل کچھ اس انداز کے تھے۔

آئمۂ فقہ سے کسی ایک کی تقلید ضروری ہے اور غیر مقلد ہونا بےنصیب ہونے کی علامت ہے۔ مولانا بریلوی، آنحضرت صلعم کے لئے علومِ غیب (علمِ ماکانَ و ما یکونُ) کے ثبوت کے قائل تھے، اور نداء ''یا رسول اللہ'' کو بھی جائز سمجھتے تھے، جب کہ

(۱) مولانا بریلوی کے افکار و نظریات اور ان کی ملی خدمات کی تفصیل کے لئے دیکھیے مقالات یوم رضا جلد اول تا جلد سوم، مرتبہ قاضی عبدالنبی کوکب، دائرہ المصنفین لاہور، نیز فاضل بریلوی اور ترک موالات، پروفیسر محمد مسعود۔

(۲) حیات اعلیٰ حضرت: ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری، مکتبہ رضویہ کراچی۔

غیر مقلدین اور علمائے دیوبند اسے شرک قرار دیتے تھے ۔ صالحین کے مزارات پر حاضری اور دعا میں ان کے توسّل کو ، اسی طرح بعدِ دفن میت کی قبر پر اذان ، اور قیامِ میلاد کو بریلوی مرحوم جائز اور موجبِ برکت تصور کرتے تھے ۔ مگر ان کے مخالف علماء کے نزدیک یہ امور مشرکانہ تھے ۔ مولانا بریلوی ، سجدۂ تعظیمی کو حرام کہنے اور غائبانہ نماز جنازہ کی ممانعت کے قائل تھے ۔ مسلمانوں میں فاتحہ ، چہلم ، سوم اور عرس وغیرہ کی جو رسوم مروّج ہیں ، مولانا بریلوی انہیں شرک و بدعت نہیں قرار دیتے تھے ۔ قرأۃ خلف الامام ، آمین بالجہر ، رفع یدین کے مسائل میں مولانا بریلوی نے حنفی مذہب کی تائید اور غیر مقلدین کی تردید کی ۔ انہوں نے اپنی کتابوں اور رسالوں میں جن بزرگوں سے مناظرانہ خطاب کیا ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ ممتاز ہیں ۔ اس سلسلے میں اہم امر یہ ہے کہ ان کی خاص دینی سرگرمیوں کی وجہ سے ہند و پاکستان میں ان کے مداحوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوگئی جو ''بریلوی'' مکتب کے نام سے یاد کی جاتی ہے ۔ احناف میں سے جن اصحاب کو آپ کے اعتقادات سے اختلاف ہے وہ دیوبندی کہلاتے ہیں ۔

آپ نے 'تزکِ مرتضوی' کے نام سے فارسی زبان میں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب و خصایل بیان کئے ہیں اور اس میں جناب امیر کے زمانۂ خلافت کے فیصلہ جات بھی شامل کر دیے ہیں ۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور تقریباً دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔ فارسی زبان میں آپ نے علم جفر پر 'جفر رضوی' ، 'جفر الرضویہ' اور 'آمال الاوفاق' تین کتابیں لکھیں ۔ مختلف علوم مثلاً زائچہ ، لوگارتھم اور ارثماطیقی وغیرہ میں بارہ کتابیں بھی آپ نے فارسی میں تصنیف فرمائیں ۔ خالص فارسی زبان میں آپ کے فتاوے چار جلدوں میں چھپ چکے ہیں ۔ ان میں سے ایک 'المحیط الرضوی' ہے اور ایک 'الحجۃ الفائحہ' ۔ تمام فتوے آپ کے اپنے حنفی عقاید کے مطابق ہیں ۔

مولانا بریلوی ، رضا تخلص کرتے تھے ۔ ان کے فارسی کلام کے موضوعات بھی دینی ہیں ۔ مثلاً ایک مثنوی میں ضعفِ اسلام اور مذہبی دنیا میں فتنہ پروروں کی صورتِ حال پر اس طرح اظہارِ رنج و الم کیا ہے :

همچو ابر اے بحر در گریہ بجوش　　　آسمانا ! جامۂ ماتم بپوش
آہ آہ از ضعفِ اسلام آہ آہ !　　　آہ آہ از نفسِ خودکام آہ آہ

مردمان شهوات را دین ساختند صد هزاران رخنها انداختند

اردو میں آپ کا نعتیہ کلام نعت گو صاحبان بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے ہیں ۔ مگر اس کا ذکر فارسی کی جلد میں بے محل ہے ۔

نواب صدیق حسن خان

مولوی صدیق حسن خان ابن مولوی اولاد حسن ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں قنوج میں پیدا ہوئے ۔ مروجہ درسی علوم مفتی صدرالدین دہلوی سے اور تفسیر و حدیث وغیرہ علوم یمن اور ہندوستان کے علماء قاضی حسین بن محسن الفاری شیخ عبدالحق ہندی اور شیخ محمد یعقوب دہلوی سے حاصل کئے ۔ انہیں ریاست بھوپال میں بڑی عزت و تکریم نصیب ہوئی اور رئیسہ بھوپال کا شوہر ہو کر آپ نے بڑا جاہ و منصب حاصل کیا ۔ علوم کی غیر معمولی خدمت کی اور خود بھی بہت سی کتابیں لکھیں جو عربی اور اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ہیں ۔ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں وفات پائی ۔ انہوں نے اپنی مختصر سوانح عمری 'ابقاءالمنن بالقاء المحسن' لکھی ہے اور 'مآثر صدیقی' کے نام سے مفصل سوانح عمری ان کے فرزند نواب علی حسن خان نے لکھی ۔

'مآثرِ صدیقی' میں ان کی ۲۲۲ کتابوں کا تذکرہ آیا ہے ، جن میں عربی اور اردو کی تصانیف کے علاوہ فارسی کی تصانیف بھی شامل ہیں جو دینی موضوعات کے علاوہ عروض ، نحو ، تاریخ ، منطق ، سوانح عمری وغیرہ پر ہیں ۔

فنِ تفسیر میں 'الاکسیر فی اصول التفسیر' بڑے معرکے کی کتاب ہے ۔ 'افادة الشیوخ بقدرالناسخ و المنسوخ' نسخِ آیاتِ قرآنی کے موضوع پر ہے ۔ حدیث میں 'الادراک فی تخریج احادیث ردّالاشراک' اور 'سلسلة المسجد فی ذکر مشائخ السند' کے علاوہ 'مسک الختام شرح بلوغ المرام' کو بڑی شہرت حاصل ہے ۔ تراجمِ صوفیہ میں 'تقصارِ جیود الاحرار من تذکارِ جنود الابرار' فارسی میں ہے اور ایک مستند کتابِ حوالہ ہے ۔ ایک اور فارسی کتاب 'جلب المنفعہ' . . . ائمہ اربعہ کے مناقب میں ہے ۔

یہ اہم فارسی کتابوں کی فہرست ہے ۔ دوسرے موضوعات پر کچھ فارسی میں اور اہم تر کتابیں عربی اور کچھ اردو میں ہیں ۔

نواب صدیق حسن خاں حنفی مسلک کے عالم تھے لیکن عملاً و اعتقاداً اتّباعِ سنّت کو مقدم رکھتے تھے ، اگرچہ جملہ ائمہ مجتہدین اور سلفِ صالحین سے عقیدت کا اظہار کرتے تھے ۔

مذاہبِ اربعہ کی نسبت ان کا خیال یہ تھا کہ ان کے اصول ایک ہیں اور فروعی اختلاف بہر حال 'فرع' سے اختلاف ہے ۔ تاہم یہ کہنا کہ حق مذاہب اربعہ میں منحصر ہے ، صحیح نہیں البتہ ان میں حق دائر ہے ۔ امام ابوحنیفہؒ کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان لوگوں کو اچھا نہ سمجھتے تھے جو امام صاحب کو قلیل النحو اور قلیل الروایت ہونے کا طعنہ دیتے تھے ۔ تقلید کے معاملے میں بھی زیادہ شدت اختیار نہیں کی ۔ 'خطیرۃ القدس' میں لکھا ہے :

> "تحقیقے نیست کہ از شائبۂ تقلید باشد و تقلیدے نیست کہ رنگے از تحقیق همراهِ خود نداشته باشد ۔"

ان کا خیال یہ تھا کہ "تقلید علمِ اصولِ فقہ کا ایک جزوی مسئلہ ہے ۔ یہ مسئلہ اس قابل نہیں کہ نوبت تضلیل و تکفیر تک پہنچائی جائے ۔" (مآثر صدیقی ، ج ۳ ، ص ۳۱) ۔

'اتقاء المنن' میں انہوں نے صاف لکھا ہے کہ "میں مذہب اصح و اقویٰ کو اختیار کرنا پسند کرتا ہوں اور اقوالِ اہلِ علم کے مقابل میں دلیل کتاب و سنت کو ترک کرنا پسند نہیں کرتا بلکہ مذہب اصح و اقویٰ کو ـــ جمع بین المذاہب کو بہتر جانتا ہوں ۔" رد و قدح اور طعن و تشنیع اور مناظرہ و مکابرہ کو پسند نہ کرتے تھے ۔ فرعی اور جزئی مسئلے کی بنا پر اہلِ قبلہ کی تکفیر کے حق میں نہ تھے ۔

توحید کے ان کے نزدیک معنی تھے "یگانہ گردانیدن دل یعنی تخلیص و تجرید او از تعلقِ ماسوائے حق هم از روئے طلب و ارادت و هم از جهتِ علم و معرفت ۔" "توحید کیا ہے ؟ ذاتِ باری میں صفاتِ کمال کی حقیقت ثابت کرنا اور ان صفات کی اضداد سے اس کی ذات منزّہ سمجھنا . . . ۔"

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ مذاہب پرانے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے حق میں بڑے بڑے علماء و صوفیہ ہیں اس لئے ان کے اثبات یا ابطال میں لب کشائی نہ کرنی چاہئے ۔

ان مسائل کے علاوہ ذات و صفات باری تعالیٰ ، اقسام شرک ، مسئلۂ سماع ، اور صدہا مسائل دینی و علمی ان کی کتابوں میں ہیں اور علم و معرفت کا سرچشمہ ہیں ، تصوف اور سلوک کی بحثیں بھی ہیں ۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے وصیت نامے کی طرح مولانا صدیق حسن خاں کے وصایا بھی عقیدہ اور اسلوب فکر و عمل کے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں ۔ یہ وصتیں ایک سچے مسلمان کے لئے صحیح عقیدہ اور نیک عمل کا بہترین دستور العمل ہیں ۔ ان وصیتوں میں کچھ ایسی ہیں جو اس زمانے کے اسلامی کردار و شخصیت کا آئینہ ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان اپنے بچوں میں کن کن فضیلتوں کے متمنی تھے اور کن کن عقیدوں کی استواری و محکمی چاہتے تھے ۔ انھوں نے فرمایا :

''ہمیشہ تحصیل علم میں سعی بلیغ کرو ــــ اور علم سے اولاً مراد علم دین ہے ــ عقائد میں مذاہب اربعہ کو در حقیقت ایک سمجھو اور نص کو ہر حال میں مقدم خیال کرو ــ مناظرے میں وقت ضایع نہ کرو ــ علم دین کو ذریعۂ دنیا اور موجب مفاخرت نہ بناؤ اور ذلّت کی روزی سے مجتنب رہنا ۔ قلیل روزی حلال جو عزت سے ملے ، اس مال سے بہتر ہے جو ذلت سے وابستہ ہو ۔ کسب رزق میں طریقۂ حلال اختیار کرنا ۔ اس امر کا احساس ہر حال میں رکھنا کہ ہم ذریّت رسول خدا ؐ ہیں ، اپنی ماں کی ہر حال خدمت کرنا ــ ہر نماز کے بعد اپنے والدین کے لئے دعاے خیر کرنا ــ ہر مشکل کے وقت اپنے خدا سے مدد مانگنا ، وہ تمہاری آرزو پوری کرے گا ۔ نتیجۂ علم نفع بخشی ہے اس لئے فیض علم سے کبھی نہ گھبرانا اور تضییع اوقات سے بچنا ۔

ہمارا مرنا جینا اسلام پر ہے ۔ اگر دین اسلام کے مقابلے میں ساری دنیا کی دولت بھی ملتی ہو تو اسے ٹھکرا دینا ۔ اصحاب آنحضرت ؐ کے بارے میں حسن اعتقاد رکھنا لازم ہے ــ اس زمانے کے مشائخ کے پیچھے نہ چلنا ، نہ ان سے بیعت کرنا ــ صوفیٔ جاہل زہر ہلاہل ہے اور عابد بے علم دلیل الحاد ۔ کسب رزق کے لئے حلال

ذرائع اور صناعات اختیار کرنا اور حلال و حرام میں فرق کرنا ۔
عرس ِ قبور اور پکی قبروں سے بچنا اور دیگر رسوم و بدعات سے
الگ رہنا ۔''

ان کے کمالات کی تفصیل اس مقالے میں ممکن نہیں ۔ مجملاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دور آخر میں اپنی تصنیف و تالیف اور علوم کی سرپرستی کے ذریعے پرانے بزرگوں کی یاد تازہ کردی اور اب یہ بھی انہی ناموں کی صف میں ہیں ۔

مولانا نذیر حسین محدث دہلوی

مولانا (میاں) سید محمد نذیر حسین محدث ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ میں انتقال کیا ۔ ان کا مولد ضلع مونگیر کا قصبہ سورج گڑھ تھا ۔ آپ کے والد کا نام سید جواد علی تھا ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وطن کو خیرباد کہہ کر پہلے پٹنہ ، پھر دہلی پہنچے اور مسجد اورنگ آبادی میں قیام کیا اور منجملہ دیگر اساتذہ کے شاہ محمد اسحٰق سے بھی کسب ِ فیض کیا ۔ انہوں نے اہل ِ حدیث مکتب کی باقاعدہ تنظیم کی اور شاگردوں کی کثیر تعداد کے ذریعے اس مسلک کو طول و عرض ِ ہند میں پھیلایا — ، ان کے شاگردوں کی طویل فہرست (جن میں مولانا عبداللہ غزنوی بھی شامل ہیں) ان کی سوانح عمری میں موجود ہے ۔ اس کتاب میں ان کی ۷۵ کتابوں کا ذکر ہے ، ان میں سے بیشتر وقت کے متنازعہ فیہ امور کے بارے میں ہیں ۔ ایک کتاب 'معیار الحق' بہت مشہور ہے جو اردو میں ہے ، اس کا انداز مناظرانہ ہے ۔ ایک کتاب 'تنویر الحق' کے جواب میں ہے — مفصل حالات کے لئے دیکھئے 'حیاہ بعد المماہ' از مظفر حسین مطبوعہ آگرہ ۔

مولانا عبداللہ غزنوی

ان کا نام محمد اعظم بن محمد بن محمد تھا ۔ مشہور نام عبداللہ غزنی تھا ۔ غزنی سے جلا وطن ہو کر امرتسر پہنچے ۔ پھر میاں محمد نذیر حسین محدث سے کسب ِ فیض کیا ۔ پنجاب میں مسلک ِ اہل ِ حدیث کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا ۔ ان کے کچھ فارسی مکتوبات پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہیں ۔ انتقال ۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ھ میں ہوا ۔ ان کے فرزند ِ جلیل مولانا عبدالجبار غزنوی نے ان کی سوانح عمری اردو میں لکھی ہے ۔ یہ دینی وعلمی خانوادہ آج تک خدمت ِ حدیث میں سرگرم ہے ۔

مجتہد العصر سید محمد لکھنوی

مجتہد سید دلدار علی کے شاگردوں نے اپنے نامور مرشد کا کام جاری رکھا ، چنانچہ مفتی سید محمد قلی کنتوری ، مرزا محمد خلیل زائر وغیرہ کے علاوہ ان کے فرزندِ اکبر سلطان العلماء سید محمد مجتہد العصر نے تصانیف وغیرہ کے ذریعے شیعہ عقائد کو پھیلانے میں بڑا حصہ لیا۔

سلطان العلماء کو سلاطینِ اودھ کے دربار میں خاص رسوخ حاصل تھا ، خصوصاً امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے زمانے میں ۔ تمام زندگی لکھنؤ میں تدریس اور تبلیغ میں گزاری ۔ ان کا انتقال ۱۸۶۷ء میں ہؤا ۔ ان کی تصانیف کی تعداد چالیس بتائی گئی ہے ۔ ان میں ایک 'تحفہ' اثنا عشریہ' کے ایک باب (اساس) کے جواب میں ہے ۔ ایک اور رسالہ 'فوائدِ نصیریہ' (احکام زکوٰۃ وغیرہ) کے بارے میں ہے ۔ فارسی میں ان کی دینی تصانیف کے نام 'طعن الرماح' اور 'تفضیل سادات' ہیں ۔ ان میں شیعہ عقاید کا ذکر ہے ۔ آپ دینی مسائل کا جواب بھی فارسی میں دیا کرتے تھے ۔ آپ کا یہ جواب :

''ہر سنی لازم نیست کہ ناصبی (معاند حضرت علی) باشد ۔''

خاص طور پر مشہور ہے کہ اس سے ان کی رواداری کا پتا چلتا ہے (تفصیلی حالات[1] کے لئے دیکھئے 'تاریخِ سلطان العلماء' از سید آغا مہدی لکھنوی) ۔

اس خاندان کے دوسرے افراد مولوی یاد علی قابلِ ذکر ہیں کہ انہوں نے 'قرآن مجید' کی تفسیر فارسی میں لکھی ۔

مولوی سلامت اللہ بدایونی

تعلیم کا مروّج درس حاصل کر چکنے کے بعد بریلی میں مولانا مجد الدین سے اعلیٰ علوم حاصل کئے اور شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ رفیع الدین سے بھی کسبِ فیض کیا اور حدیث کی تکمیل کی اور عمر بھر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے ۔ آپ شاعری بھی کرتے تھے ، تخلص کشفی تھا ۔ ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ میں انتقال ہؤا ۔

ان کی تصانیف کا اسلوب وہی ہے جو مکتبِ شاہ ولی اللہ کے بزرگوں سے مخصوص ہے ؟ تفسیر و حدیث و فقہ میں اعتدال ، اور اسرار و حقائقِ دین کا انکشاف ، ردِ شیعہ اور حکمت و تصوف ۔

---

(۱) آپ کا ذکر اِس جلد کے حصہ' اول میں بھی دیکھئے ۔

ان کی کتابوں میں 'برقِ خاطف'، 'تحریر الشہادتین'، 'حقایقِ احمدیہ'، 'رسالۂ جوازِ معانقۂ عیدین'، 'رسالۂ الوان' اور 'مجموعۂ فتاویٰ' اہمیت رکھتی ہیں ۔

فرنگی محل کے علماء

اس دور کے فرنگی محل کے علمائے کبار میں مولوی عبدالحکیم (جن کی فارسی کتابوں کی فہرست تذکرہ علمائے ہند سے مل سکتی ہے) اور مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی ہیں جن کا بیشتر کام عربی میں ہے ۔

مولانا عبدالحلیم کے فرزند مولانا عبدالحی فرنگی محلی زیادہ ممتاز ہوئے ۔ ان کی کنیت ابوالحسنات ہے ۔ ۱۸۴۸ء/۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے ۔ نہایت صاحبِ علم اور صاحبِ تصنیف بزرگ تھے ۔ 'تذکرۂ رحمان علی' میں ان کی کم و بیش چالیس اہم تصانیف اور پچاس سے زائد تلامذۂ کبار کا ذکر آیا ہے ۔ انہوں نے زیادہ تر عربی میں لکھا (نزهة الخواطر : تذکرۂ علمائے ہند انہیں کی تصنیف ہے) ۔ موضوعات میں اصولِ تفسیر، فقہ اور معقولات اور مناظرہ کو امتیاز حاصل ہے ۔ ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ میں انتقال ہؤا ۔

سید ناصر الدین ابوالمنصور دهلوی

ان کا قدیم وطن سید آباد (قنوج) تھا ۔ دہلی میں تحصیل و تکمیل کی ۔ عیسائیوں سے مناظرات میں نام پایا ۔ کچھ رسالے سر سیّد احمد خاں کے رد میں بھی لکھے ۔ ان کی تفسیر کے جواب میں 'تنقیح البیان' قلم بند کی ۔ 'تذکرۂ رحمان علی' میں ان کی ۲۸ کتابوں کا ذکر ہے ۔ ان میں سے کچھ فارسی میں اور کچھ اُردو میں ہیں ۔ ۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ میں ان کا انتقال ہؤا ۔

ضمیمہ

دینی تصانیف کی ایک فہرست

(۱) عبدالجبار غزنوی عمری و علام رسول دہلوی : مجموعہ المسمی بہ سوانح عمری و مجموعہ مکتوبات ، امرتسر ۱۸۹۵ء ۔۔ سوانح عمری اردو میں ، عبداللہ غزنوی (المعروف بہ محمد اعظم) کے کچھ مکتوبات اردو میں کچھ فارسی میں ہیں ۔

(۲) عبدالرحمن بن محمد روشن خان : ضابطہ ہلالیہ ، ۱۸۶۵ء (ہلال عید کے قواعد) ۔

(۳) قاضی عبدالرسول : مسائل عشرہ ، بمبئی ۱۸۹۳ء (مناظرانہ رسالہ در اثبات دین اسلام) ۔

(۴) احمد اللہ بن دلیل اللہ صدیقی : مائۃ مسائل ، لکھنؤ ۱۸۷۷ء ، (دینی امور کے بارے میں مع حواشی) ۔

(۵) محمد عمر ، نور اللہ ، قاضی ، حکیم : نور ظاہر ، لکھنؤ ۱۹۰۳ء ، (اللہ کے ۹۹ ناموں پر مثنوی مع "خواص اسماء حسنہ" نثر میں) ۔

(۶) مظفر علی خان اسیر : کربلائے معلی ، لکھنؤ ۱۸۸۰ء ، (کربلا اور یہاں کے شہدا کا حال) ۔

(۷) وکیل احمد اعجاز سکندر پوری : انوار احمدیہ ، دہلی ۶۳-۱۸۹۲ء ۔ (احمد سرہندی کے عقائد کی تشریح مع ہدایہ مجددیہ اس مضمون پر) ۔

(۸) مولوی امیر علی : رفع المغالطہ ، دہلی ۱۸۶۳ء ، (نجف علی فرید آبادی کے خلافت پر رسالے کا جواب) ۔

(۹) امیر حیدر بلگرامی : مقالۃ ملکیۃ ۱۸-۹۸ء ، (اسلام میں سلطنت کے حاصل اور ملکیت زمین پر مقالہ) ۔

تصوّف

پچھلے باب میں مختلف سلسلوں کے دائرہ ہائے اثر و رسوخ کی گفتگو ہو چکی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ نقشبندی ، چشتی ، قادری سلسلے خصوصیّت سے طول و عرض ِ ملک میں پھیلے اور روحانی فیض پہنچاتے رہے - اس دور کے آخر میں ان کا اثر اور بھی بڑھا اور ملک کی مختلف خانقاہوں میں مشائخ نے بیعت و ارشاد کا کام جاری رکھا - سہروردی سلسلہ بھی اپنا دائرۂ اثر بڑھاتا رہا اگرچہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں اربابِ طریقت کی کتابیں فارسی میں کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی اعلیٰ معیار کی نہیں - زیادہ تر ملفوظات ہیں یا اشغال و اوراد سے متعلق ہیں - زیرِ بحث دور میں شاہ کلیم اللہؒ دہلوی اور ان کے اکابر خلفاء شاہ فخر الدینؒ اور ان کے خلیفہ میاں نور محمدؒ مہاروی اور شاہ نیاز احمدؒ کے مریدوں اور خلفاء نے جا بجا خانقاہیں قائم کیں اور عوام میں روحانیت کا ذوق پیدا کرتے رہے -

شاہ فخر الدینؒ کے بعد ان کے فرزند غلام قطب الدینؒ سجادہ نشین ہوئے - ان کے فرزند میاں نصیر الدینؒ عرف کالے صاحب دہلی میں مقبول شخص تھے - پھر ان کی اولاد میں یہ سلسلہ چلا - اس سلسلے کے خاص بزرگ سید بدیع الدینؒ ، میر مہدیؒ صاحب مولانا ضیاء الدینؒ ، مولوی جمال الدینؒ اور مولانا حاجی لعل محمدؒ تھے (تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ مشائخ چشت ، ۵۱۸ تا ۵۲۸) -

خواجہ نور محمدؒ مہاروی کا ذکر سابقہ باب میں آ چکا ہے - یہ شاہ فخرؒ کے مریدینِ خاص میں سے تھے - پنجاب میں ان کا فیض عام ہؤا - چنانچہ تونسہ شریف ، احمد پور ، چاچڑاں ، مکھنڈ ، جلال پور شریف ، گولڑہ شریف وغیرہ میں اسی سلسلے کی خانقاہیں قائم ہوئیں - شیخ نور محمد نارووالہ خواجہ مہاروی کے خلیفہ تھے - پھر یہ سلسلہ بھی جاری رہا - اسی طرح شاہ نیاز احمد بریلوی کا سلسلہ بھی ترقی کرتا رہا - ان کے خلفاء ملک کے طول و عرض میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کرتے رہے - ان میں شاہ صاحب کے فرزند تاج الاولیا شاہ نظام الدینؒ ان کے خلیفۂ اوّل ہوئے - پھر ان کے فرزند شاہ محی الدین سجادہ نشین ہوئے - شاہ صاحب کے خلفاء میں مسکین شاہ کشمیر کے رہنے والے تھے - ہندوستان میں ان کا روحانی اثر بھی پھیلا -

خواجہ محمد عاقلؒ ، خواجہ نور محمدؒ مہاروی کے خلفائے کبار میں سے تھے - نظامیہ

سلسلے کو انہوں نے بہت ترقی دی ۔ پنجاب میں چاچڑاں ، کوٹ مٹھن ، احمد پور وغیرہ میں انہوں نے خانقاہیں اور مدرسے قائم کئے ۔ اکبر شاہ ثانی کو ان سے بڑی عقیدت تھی ۔

ان کے بعد ان کے صاحبزادے میاں احمد علیؒ سجادہ نشین ہوئے ۔ ان کے بعد میاں خدا بخشؒ نے کوٹ مٹھن کو روحانی دعوت کا مرکز بنایا ۔ پھر چاچڑاں چلے گئے ۔ ان کی وفات کے بعد کئی خلفاء ہوئے جن میں غلام فخر الدینؒ ، صاحبزادہ نصیر بخشؒ وغیرہ بہت مشہور ہیں ۔ ان کے بعد خواجہ غلام فریدؒ سجادہ نشین ہوئے اور یہ سلسلہ خواجہ گل محمدؒ احمد پوری تک چلتا رہا ۔

خواجہ نور محمدؒ مہاروی کے ایک اہم خلیفہ حافظ محمد جمالؒ تھے ۔ وہ ملتان میں سلسلۂ چشتیہ کی ترویج پر مامور تھے ۔ ملتان میں اپنا مدرسہ بھی قائم کیا ۔ ان کے ملفوظات کئی مریدین نے مرتب کئے ہیں ۔ مثلاً 'فضائل رضیہ' از مولوی عبدالعزیز ساکن بڑھیاراں ، 'انوار جمالیہ' از منشی غلام شہید ملتانی اور 'اسرار الکمالیہ' از زاہدہ شاہ ۔

١٨٤٩ء/١٢٦٦ھ میں انتقال ہوا ۔ ان کے خلفاء میں مولانا خدا بخشؒ ملتانی ، مولوی غلام حسنؒ ، صاحبزادہ غلام فریدؒ اور مولوی عبدالعزیز بڑھیاری مشہور ہیں ۔

پنجاب میں شاہ محمد سلیمان تونسویؒ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے اہم نمائندے ہوئے ۔ انہوں نے شاہ نور محمدؒ مہاروی سے فیض حاصل کر کے ، دور دور تک روحانی ہدایت پھیلائی ۔ ان کا انتقال ١٨٦٠ء/١٢٧٧ھ میں ہوا ۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کم سے کم ستر بزرگوں کو خرقۂ خلافت عنایت فرمایا ۔ ان کے ملفوظات معارفِ روحانی کا گنجینہ ہیں ۔

ان کے خلفاء میں حافظ محمد علیؒ خیر آبادی ، ان کے نقش قدم کے کامل پیرو تھے ۔ مثنوی مولانا روم پر انہیں بڑا عبور تھا ۔ ١٨٤٩ء/١٢٦٦ھ میں انتقال ہوا ۔ ان کے ایک اور خلیفہ حاجی نجم الدین شیخاوٹی کی فارسی تصانیف متعدد ہیں ۔ مثلاً 'شجرة العارفین' ، 'مناقب المحبوبین' اور 'مقصود العارفین' وغیرہ ۔ ان کا انتقال ١٨٧٠ء/١٢٨٧ھ میں ہوا ۔

حاجی نجم الدین کے خلیفہ سید محمد حسن امروہوی بڑے عالم اور مصنّف تھے ۔ ان کی فارسی تفسیر القرآن 'غایات الاسرار فی مکاشفات الاخیار' بہت مشہور ہوئی ۔ ان کی چند اور کتابوں کے نام 'تاریخ مشائخ چشت' میں درج ہیں ۔ انتقال ١٩٠٥ء/١٣٢٣ھ میں ہوا ۔

خواجہ شمس الدین سیالوی حضرت تونسوی کے خلفائے کبار میں سے تھے ۔ ان کا انتقال ۱۸۸۲ء/۱۳۰۰ھ میں ہوا ۔ آپ کے خلیفۂ اعظم پیر حیدر علی شاہ جلال پوری (م ۔ ۱۹۰۸ء) تھے ۔ آپ کے فارسی میں ملفوظات 'نفحات المحبوب' کے نام سے طبع ہوئے تھے ۔

پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی بھی حضرت سیالوی کے نامور خلیفہ تھے ۔ بڑے عالم آدمی تھے ۔ 'فصوص الحکم' کا باقاعدہ درس دیا کرتے تھے ۔ علامہ اقبال سے بھی ان کی خط و کتابت تھی (ملاحظہ ہو اقبال نامہ ، جلد اول ، ص ۴۴۲ و بعد) انھوں نے احمدیوں کے خلاف منظم کام کیا اور رسالے لکھے ۔ ان کے 'ملفوظات طیبہ' چھپ چکے ہیں ۔

اس سلسلے کے آخری نامور بزرگ خواجہ اللہ بخش تونسوی تھے ۔ ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا ۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے ۔

یہ خانوادۂ چشتیہ کے بزرگوں کی سرگزشت ہے ۔ ان میں صاحبِ تصنیف لوگ بھی ہیں لیکن یہ سب کتابیں ملفوظات اور دوسرے ثانوی قسم کے سرمایۂ ادب پر مشتمل ہیں ۔ (ان تصانیف کے لئے ملاحظہ ہو تاریخِ مشائخِ چشت از خلیق احمد نظامی) ۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس خانوادے کو پنجاب میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ۔

باقی سلسلوں کے احوال ، احمد علی نے اپنی کتاب 'قصرِ عارفان' میں لکھے ہیں ۔ اسی طرح سرور لاہوری نے 'خزینۃ الاصفیاء' میں ان بزرگوں کے حالات دیے ہیں ۔ پنجاب ، سندھ ، بنگال اور سرحد کے بزرگوں کے کوائف عبداللہ قدوسی نے جمع کئے ہیں ۔ ان سے ان کی فارسی تصانیف کا تذکرہ مرتّب ہو سکتا ہے ۔

ضمیمہ

تصوف کی کتابوں کی ایک فہرست

۱- پیر صاحب مانکی شریف ، (م - ۱۹۰۴/۱۳۲۲ھ) تصانیف : (۱) احکام المذاہب ، (۲) ہدایۃ الابرار -

۲- شیخ عبدالرحمٰن چھوہروی ، (م - ۱۹۳۹ء) تصانیف ۱۳ ہیں، جن میں سے نمایاں شجرہ طیبہ سلسلہ عالیہ قادریہ ، چہل ...، ... الاذکار ، مجموعہ قادری کبیر و صغیر ہیں (ملاحظہ ہو : اولیائے سرحد ، از عبداللہ قدوسی)

۳- خواجہ شمس الدین چشتی سیالوی : ملفوظات و حالات بزبانِ فارسی (مطبوعہ) -

۴- خواجہ پیر حیدر علی شاہ چشتی جلالپوری : ملفوظات موسومہ نفحات المحبوب بزبانِ فارسی (مطبوعہ) -

۵- پیر مہر علی شاہ چشتی گولڑوی · ملفوظات و مکتوبات بزبانِ فارسی (مطبوعہ) -

۶- قادر بخش بیدل : پنج گنج (چالیس مقالات) غیرمطبوعہ -

۷- مولانا احمد مکھڈوی : دیوان بزبان فارسی -

۸- مولانا ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ جلالپوری (م - ۱۹۶۶ء) خطبات و رسائل (مطبوعہ) -

۹- غلام علی شاہ مروی : دیوان بزبان فارسی (صوفی شعراء کا ذکر یہاں صرف بطور رجحانِ رسالہ کیا گیا ہے - ورنہ ان کا تعلق شاعری کے باب سے ہے) -

☆ ☆ ☆

ساتواں باب

متفرق

(الف) فارسی صحافت

برّصغیر پاک و ہند کی فارسی صحافت کا آغاز مطبعوں کی تاریخ اور تسلسل سے وابستہ ہے اور دوسری طرف قلمی صحافت یعنی عہدِ وقائع نگاری سے منسلک و مربوط ہے۔ وقائع نگاری کی روایت اس برّصغیر میں بہت قدیم ہے۔ صحافتِ قلمی کا رواج سلاطینِ دلی کے عہد میں بتاتے ہیں اور دورِ مغلیہ اس کی ہیئت کے عروج اور فن کے کمال کا دور ٹھہرتا ہے۔ فنِ وقائع نگاری کی ترویج اور فروغ میں صرف تسلسلِ روایت کو ہی دخل نہیں بلکہ بعض مغلیہ عہد کے شہنشاہوں کی خصوصی توجہ اور دلچسپیوں کا بھی اس میں بڑا ہاتھ ہے۔

وقائع نگاری کے عروج و فروغ میں امورِ مملکت اور رموزِ سلطنت کی غرض شامل تھی۔ اس لئے اس فن کا براہِ راست تعلّق درباری انتظام و انصرام سے رہا اور اس نہج کی درباری صحافت نے درباری سیاست کا ساتھ دیا۔ عوامی مسائل، عام زندگی کے حوادث و واقعات نظر انداز ہوتے رہے۔

اس عہد کی وقائع نگاری کا دائرہ بادشاہ یا زیادہ سے زیادہ وزراء اور امراء کی معلومات تک محدود و مخصوص تھا۔ تنظیمِ ملک اور انتظامِ سلطنت کے لئے قلمی صحافت ایک ایسا توسط تھا جس سے کسی بھی حکمران کو مفر نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ وقائع نگاری قدیم ادوار میں بھی کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتی ہے۔

برّصغیر میں فارسی وقائع نگاری کے تدریجی تسلسل کا جائزہ کسی منضبط صورت میں سامنے نہیں آیا۔ مختلف تاریخوں، تذکروں، حکایات اور ملفوظات میں تذکرے کے

طور پر وقائع نگاری کا ذکر ملتا ہے ، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلاطینِ دہلی کے عہد میں اس فن کو ایک درباری حربے کے طور پر برتا گیا ۔ مغلیہ عہد میں یہ فن اپنے عروجِ کمال تک پہنچا ۔ اس کے علاوہ ٹیپو سلطان کا اخبار اور بنگال کے چابکدست وقائع نگار بھی قلمی صحافت کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ حکومتِ اودھ میں شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ کے زمانے تک وقائع نگاری کی بڑی شاندار روایات ملتی ہیں ۔ بالخصوص آصف الدولہ ، سعادت علی خان اور غازی الدین حیدر اور پھر واجد علی شاہ کا صحافت خانہ اس فن کی تاریخ میں ایک عہد آفرین حیثیت کا مالک نظر آتا ہے ۔ منشی مہر علی نقوی کی قیادت میں پورے پانچ سو وقائع نگار قلمی صحافت کی ذمہ داریوں پر مامور تھے ۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جو اس فن کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آتی ہے ۔ وقائع نگاری کا یہ ورثہ فارسی زبان سے تعلق رکھتا ہے ۔ لیکن یہاں وقائع نگاری ابھی رائے عامہ کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے بادشاہ کے گوش گذار کرنے ہی کو اپنا مسلک جانتی ہے ، وہ بادشاہ کی مشیر اور خیرخواہ ہے ۔ خبر کی ترسیل اور ابلاغ کا عوام سے کوئی رشتہ نہ تھا ۔ یہ قلمی صحیفے رائے عامہ کو ہموار کرنے کا وسیلہ بھی نہ تھے ۔

برِ صغیرِ پاک و ہند میں نشر و اشاعت کے عوامی وسیلے کا آغاز مطبعوں کی ترویج سے ہوا ۔ ملک میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ تقریباً ١٥٥٠ء میں تامل زبان میں قائم ہوا اور کوئی بیس برس بعد ١٥٧٧ء میں ملیالم میں ۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں گجراتی رسم الخط کا ، اس کے بعد ١٧٧٠ء میں بمبئی کے مقام پر زبان انگریزی کا ، ١٧٧٨ء میں بنگلی کی سرزمیں پر بنگالی کا اور ان تمام چھاپے خانوں کے بعد فارسی رسم الخط کا ٹائپ مکمل ہوا ۔

کلکتہ کرانیکل (١٨ - مارچ ١٧٩٠ء) کے جریدے میں ایک اشتہار کا ہمیں سراغ ملتا ہے جس سے فارسی عربی رسم الخط کے ٹائپ کی نشاندہی ہوتی ہے - ٨ - جولائی ١٧٩٠ء کے کلکتہ کرانیکل میں باقاعدہ فارسی رسم الخط میں نستعلیق طباعت کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں -

انگریزوں نے چھاپے خانوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور عیسائی مشنریوں کی بھی بڑے اعلیٰ پیمانے پر اعانت کی ۔ فورٹ ولیم کالج کے ادارۂ تصنیف و تالیف نے باقاعدہ

فارسی رسم الخط میں اردو طباعت کا آغاز کیا ۔ پھر اس کے بعد فارسی اور اردو کے ٹائپ میں ، طباعتی نظام مساوی طور پر ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنے لگا ۔ فورٹ ولیم کالج کے مہتمم خاص ابراہیم لا کٹ کی کوشش سے غیر سرکاری چھاپے خانے کا اجرا ۱۸۱۰ء میں مولوی اکرام علی کی قیادت میں ہوا ۔ پھر اس کے بعد چھاپہ خانے کا سلسلہ کاروباری سطح پر عام ہو گیا ۔

نظام نشر و اشاعت کے فروغ کے ساتھ زبان فارسی میں اخبار نویسی کے دور کا آغاز کلکتے سے ہوا ۔ ہرچند کہ مغل بادشاہوں کی طرح زبان فارسی پر بھی انحطاط آ چکا تھا مگر اس کے باوجود علم و ادب کے حلقوں میں ابھی اس کی آبرو تھی ۔ زبان فارسی کے زوال کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا عروج بڑھتا جا رہا تھا ۔ زبان فارسی پر اردو کو سبقت حاصل ہو چکی تھی ۔ بول چال میں بازار سے نکل کر دربار تک اور عوام کے احاطے سے نکل کر خواص کے حلقے میں داخل ہو چکی تھی اور آہستہ آہستہ نثر میں بھی اردو نے اپنے پاؤں جما لئے تھے ۔ ٹھیک اسی چڑھتی اور اترتی ہوتی لسانی قدروں میں چھاپے خانے کے فروغ کے ساتھ صحافت کے مسائل بھی سنجیدہ صورت اختیار کر رہے تھے ۔ چنانچہ شروع شروع میں اخبار کے اجراء کے لئے زبان فارسی ہی کو منتخب کیا گیا اور فارسی رسم الخط کے ٹائپ میں پہلا اخبار نکلا

فارسی کے پہلے باقاعدہ اخبار سے قبل ۴ مارچ ۱۷۸۴ء کے کلکتہ گزٹ کے پہلے ورق پر فقط ایک کالم میں خلاصۂ اخبار ''دربار معلیٰ بہ دارالخلافہ شاہجہان آباد'' کے عنوان سے طبع ہوتا تھا اور پھر یہی سلسلہ کئی ہفتوں تک کلکتہ گزٹ میں چلتا رہا ۔ یہ اخبار خواہ باقاعدہ فارسی کا نہ ہو اور صحافتی نقطۂ نظر سے بھی اس کی اہمیت چاہے برائے نام ہی کیوں نہ ہو مگر فارسی دبستان صحافت کے جائزے میں اور تاریخی تسلسل کے سراغ میں اس نقش اول کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے ۔

۱ ۔ **فارسی کا پہلا باقاعدہ اخبار :** بعض تحقیقی شکوک کی بنا پر فارسی زبان کا پہلا اخبار 'جام جہان نما' کو تصور کیا جاتا ہے مگر جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ 'جام جہان نما' اردو کا سب سے پہلا اخبار ہے ، جس کے اجراء کی تاریخ کلکتے کے معاصر اخباروں کے حوالے سے ۲۷ مارچ یوم چہار شنبہ ۱۸۲۲ء مستنبط ہوتی ہے ۔ ۸ مئی ۱۸۲۲ء کے 'کلکتہ منتھلی جرنل' سے پتا چلتا ہے کہ 'جام جہان نما' کے کوئی دس شمارے نکلنے کے بعد گیارھواں

شمارہ فارسی میں نکلنا شروع ہوا - زبانِ اردو سے دلچسپی رکھنے والے انگریز شائقین کے لئے بعد میں اسی اخبار کے ساتھ اردو میں ضمیمہ شائع کیا جانے لگا - یہ اردو ضمیمہ عام طور پر اپنے مواد سے اور معلومات کی بنا پر فارسی اخبار سے بالکل الگ ہوتا تھا ، یہاں تک کہ فارسی کی جز بندی الگ اور اردو کی الگ ہوتی تھی - اس طرح خریدنے والوں کو بھی یہ اختیار ہوتا تھا کہ چاہے وہ فارسی اردو دونوں ایک ساتھ خرید لیں یا اپنی پسند کے مطابق کسی ایک کو خرید لیں - بہرحال دونوں اخبار اپنی اپنی جگہ پر مکمل تھے - اس کے ذیل میں یہ نکتہ خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ مواد اور مغز کے اعتبار سے بھی یہ دونوں اخبار یکساں نہیں ہوتے تھے - دونوں کی افادیت الگ الگ تھی - ممکن ہے اس لئے کہ خریدنے والا دونوں کو خریدے تو بہتر ہے -

'جامِ جہاں نما' کو اردو میں نکالنے کی کیا مصلحت تھی ؟ دراصل زبانِ فارسی کا اس ملک میں زوال شروع ہو چکا تھا ، لیکن اس کے زوال میں اردو اور فارسی کے لسانی تصادم کو اتنا دخل نہیں تھا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملک پر اقتدار مسلط رکھنے کے لئے انگریز سیاست دانوں نے اپنا ایک منشور مرتّب کیا تھا اور وہ تھا فارسی کو ختم کرنا ، اردو کو فروغ دینا اور پھر ہندی کو اس کے مساوی لانا - اسی سلسلے کی ایک کڑی اردو اخبار کا اجراء تھا - 'جامِ جہاں نما' ان کی لسانی حکمتِ عملی کا عملی اقدام تھا ، اسی لئے اس اخبار کو حکومت کی مکمل سرپرستی حاصل تھی - یہ ولیم پیرس کاپ کنس اینڈ کمپنی کی وساطت سے نکلتا تھا اور اس اخبار کے اڈیٹر منشی سدا سکھ تھے - تاریخی تسلسل کے اعتبار سے 'جامِ جہاں نما' فارسی کا پہلا اخبار نہیں ٹھہرتا کیونکہ راجا موہن رائے کے اخبار 'مرآۃ الاخبار' کو اس پر تقدّم حاصل ہے -

۲- **مرآۃ الاخبار :** ہندوستانی صحافت کی پہلی تاریخی کتاب 'اخترِ شہنشاہی' میں 'مرآۃ الاخبار' کی تاریخ اجراء ۱۸۴۷ء لکھی ہے جو غلط ہے - ممکن ہے یہ تسامح اس بنا پر ہوا ہو کہ اسی نام کا دوسرا کوئی اخبار اسی تاریخ پر نکلا ہو - انیسویں صدی عیسوی میں ایسی مثالیں عام نہیں -

'مرآۃ الاخبار' کلکتے سے ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو نکلا - راجا رام موہن رائے نے عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر اس اخبار کو نکالا تھا اور اس کا مسلک صلح کل تھا - راجا رام موہن رائے برہمو سماج کے بڑے مبلغ اور انیسویں صدی عیسوی کے جدید ترقی پسند

ہندو مصلحین میں شمار ہوتے ہیں ، جن کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ عوام اور بالخصوص ہندوؤں کی فلاح کے لئے گذرا ۔ 'مرآۃ الاخبار' کا اجراء بھی ان کے قومی نصب العین کے مطابق تھا ۔ بنگال کے عوام اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے مابین خیرسگالی کے جذبات اور مفاہمت پیدا کرنے میں اس اخبار نے اہم کردار ادا کیا ۔ یہ اخبار حکومت کا مشیر اور نقّاد تھا ۔ پھر عوام کا نقیب بن گیا اور اتنے بلند پایہ دانشور کی سرپرستی نے اس اخبار کو مقبولِ عوام بنا دیا ۔ ہندوستانی زبانوں میں نکلنے والے تمام اخباروں پر اسے اپنے مسلک اور فن کے سہارے سبقت حاصل ہوگئی ۔ راجا رام موہن رائے ایک بلند مرتبہ ترقی پسند سیاست داں ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے صحافی بھی ثابت ہوئے ۔ انگریزی کے معاصر اخباروں کے پہلو بہ پہلو 'مرآۃ الاخبار' کو لانے میں راجا رام نے اپنی صحافیانہ دانشوری سے کام لیا اور 'مرآۃ الاخبار' کو ایک مظلوم اور مقہور قوم کا علمبردار اور اپنے عصر کے تمام مسائل و مصائب کا آئینہ دار بنا دیا ۔

'مرآۃ الاخبار' سب سے پہلے مقامی خبروں کو ، اس کے بعد ملکی خبروں کو اپنے اخبار میں جگہ دیتا تھا ۔ علاوہ ازیں بین الاقوامی خبروں سے بھی اخبار کا دامن تہی نہیں تھا ۔ اس اخبار نے جدید مغربی صحافت کے فنی اسرار و رموز سے فارسی صحافت کو روشناس کرکے نہ صرف فارسی صحافت میں بلکہ بنگال کے دبستانِ صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ۔

'مرآۃ الاخبار' کے ذیل میں یہ انکشاف بھی اپنی ایک الگ قدر و قیمت رکھتا ہے کہ یہ فارسی کا اخبار نہ صرف برّصغیر پاک و ہند کا پہلا فارسی اخبار ہے بلکہ ایران کو شامل کرکے بھی فارسی تاریخِ صحافت میں اس اخبار کو اولیت حاصل ہے ۔

ایران میں سب سے پہلا اخبار محمد شاہ قاچار کے عہد میں ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ میں صالح شیرازی کی ادارت میں نکلا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برّصغیرِ پاک و ہند میں فارسی صحافت کا آغاز پندرہ سال پہلے ہو چکا تھا ۔ 'تاریخِ جرائد و مجلّاتِ ایران' (جلد اول ، تالیف محمد صدر ہاشمی) میں بتایا گیا ہے کہ صالح شیرازی کا دو ورق اخبار طہران سے مہینے میں فقط ایک بار نکلتا تھا ۔

۳- **شمس الاخبار** : 'مرآۃ الاخبار' کے ایک برس بعد ۶ مئی ۱۸۲۳ء کو کلکتے سے

ایک ہفت روزہ جریدہ 'شمس الاخبار' کے نام سے جاری ہؤا۔ ابتدا میں یہ اخبار 'جامِ جہان نما' کی وضع پر فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا مگر پھر خواندہ طبقہ کے مذاق کو مدِّ نظر رکھ کر فارسی زبان میں نکلنا شروع ہؤا۔ فاضل معاصر نادم سیتا پوری کی تحویل سے اس اخبار کے دو شمارے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پورا اخبار فارسی میں نکلتا تھا۔ خبروں کے معاملے میں اس اخبار کا بھی وہی شعار تھا جو 'مرآۃ الاخبار' کا تھا۔ مقامی خبریں، ملکی خبریں اور اس کے بعد بین الاقوامی نوعیت کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے پرنٹر منشی رام ٹھاکر اور پبلشر موہن متر کو مالی لحاظ سے اس اخبار کی خاطر بڑے نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

۴- اخبار سیرام پور: عیسائیت کی تبلیغ اور ترویج کے لئے سیرام پور کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بپٹسٹ مشنریوں کو خاص طور پر یہیں فروغ حاصل ہؤا تھا۔ یہ مذہبی جماعتیں بیشتر انگلستان سے آتی تھیں اور بڑے جوش و خروش سے شہر شہر، قریہ قریہ گھوم کر اپنے تبلیغی نصب العین کو کامیاب بناتی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ان کی سرپرستی کرتی تھی۔ ایک معقول رقم اس کے لئے مختص کی جاتی تھی جو تبلیغی مقاصد پر صرف ہوتی تھی۔ ان مقاصد کے لئے اخبار اور جرائد بھی جاری کئے گئے۔ سیرام پور کے پادریوں نے بنگلہ اور انگریزی اخبارات کے بعد اپنی تبلیغ کو ہمہ گیر بنانے کے لئے فارسی اور اُردو میں بھی اخبار اور جرائد کی مستقل اشاعت کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا اخبار سیرام پور کے نام سے ۱۸۲۶ء کے اوائل میں سیرام پور ہی سے بزبانِ فارسی نکلا۔ یہ ہفتہ وار اخبار مئی ۱۸۲۸ء تک جاری رہا — اخبار کو حکومت کی طرف سے حوصلہ افزائی حاصل تھی۔

۵- آئینۂ سکندر: ۱۸۳۱ء میں کلکتے سے مولوی سراج الدین احمد لکھنوی کی ادارت میں نکلا۔ اس اخبار کا مقصد اسلام کے خلاف مذہبی تبلیغ کا قلع قمع کرنا اور اسلام کے خلاف فاسد طاقتوں سے نبرد آزمائی کرنا تھا اور بالخصوص سیرام پور کی مشنری تحریکوں کے خلاف قلمی جہاد کرنا اس کے اولین مقاصد میں شامل تھا۔ ادھر حکومت بڑی فیاضی سے مسیحی جماعت کے پرچوں کی اعانت کر رہی تھی۔ اس کی شدید مخالفت میں سراج الدین احمد لکھنوی نے انفرادی سطح پر اسلامی محاذ قائم کیا تھا۔ تاریخِ صحافت میں یہ پہلا اسلامی اخبار تھا اور سراج الدین احمد لکھنوی پہلے مسلمان ایڈیٹر تھے جن کی

ادارت میں ایک فارسی اخبار دینی جوش و خروش کے ساتھ نکلا۔

یہ اخبار سیاسی اور مذہبی رنگ کے علاوہ اپنے عصر کے ادبی مسائل کا بھی آئینہ تھا۔ یہ انکشاف بھی دلچسپ ہے کہ مرزا غالب اس کے قلمی معاونین میں سے تھے۔

۹۔ **ماہِ عالم افروز:** مولوی وہاج الدین کی ادارت میں جون ۱۸۳۳ء میں کلکتے سے نکلا۔ اپنے میلان اور رجحان کے اعتبار سے یہ ایک ترقی خواہ اخبار تھا جو سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر کمپنی کی حکومت کے خلاف صف آرا تھا۔ اس کا مقصد کمپنی کے ظلم و استحصال کے خلاف علمِ احتجاج بلند کرنا اور عوام کو حکومت کی تدبیر و سیاست سے خبردار رکھنا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جو نمایاں کردار پاک و ہند کی صحافت نے انجام دیا ہے اس میں فارسی کے اس اخبار 'ماہِ عالم افروز' کا بھی بڑا حصہ ہے۔

پریس ایکٹ کا نفاذ

سر چالس مٹکاف (مارچ ۱۸۳۵ء) کے گورنر جنرل ہونے کے بعد پریس ایکٹ کا نفاذ ہؤا اور پچھلے قانونی اصول و قواعد یکسر کالعدم قرار دے دیے گئے۔ اس سے پہلے گورنر جنرل ولزلی اور ہیسٹنگز کے زمانے میں پریس اور اخبار پر بڑی ناروا اور ناجائز پابندیاں عاید کی جا چکی تھیں۔

۱۸۲۳ء میں جان ایڈم نے یہ پابندیاں اور بھی زیادہ سخت کردی تھیں، جن سے ملکی صحافت کی ترقی کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ سر چارلس مٹکاف نے انہیں یکسر ختم کر دیا۔ کمپنی کے ڈائرکٹر اس کے آزاد صحافت سے متعلق اس اقدام سے سخت خوفزدہ ہو گئے اور محض اسی بنا پر اسے مستقل گورنر جنرل نہ بنایا اور ایک سال کے بعد آک لینڈ کو مقرر کر دیا۔ پریس ایکٹ کے نفاذ کے بعد جو اخبارات نکلے اب ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ **سلطان الاخبار:** ۲ اگست ۱۸۳۵ء کو 'سلطان الاخبار' کلکتے سے جاری ہؤا۔ اس کے مدیر ملک و قوم کے ایک بیباک اور نڈر سیاستدان غلام رحمٰن اور مالک مشہورِ زمانہ فراستدان رجب علی لکھنوی تھے۔ فارسی کا یہ ہفتہ وار اخبار نہ صرف ملک کے مشرقی خطے میں شہرت حاصل کر گیا بلکہ اپنی ملک گیر ہر دل عزیزی کی بنا پر خاص و عام میں مقبول ہؤا۔ اس اخبار نے بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے انگریزوں کے

جبرو استبداد کا مقابلہ کیا ۔ کمپنی کی حکومت اس پر کڑی نگاہ رکھتی تھی مگر اراکین اخبار پر خوف و خطر سے بے پرواہ ہو کر حکومت کی چیرہ دستیوں پر مواخذہ کرتے ۔ ججوں کی نا انصافیوں اور انگریز حکام بالا کی رشوت ستانیوں اور حکومت کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف 'سلطان الاخبار' سینہ سپر تھا اور کسی خوف و خطر کے بغیر ان تمام زیادتیوں کے متعلق دل کھول کر لکھتا تھا ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بیشتر دیسی اخبار انگریز حکومت کی چاپلوسی اور تملق میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے اور ان اخباروں کے مدیر ضمیر فروشی کو فن صحافت کا ایک شعبہ بنا چکے تھے ۔ مگر ٹھیک اسی زمانے میں 'سلطان الاخبار' حق و صداقت کی آواز بلند کر رہا تھا ۔

اس اخبار کے مالک منشی رجب علی لکھنوی کو بعض مستشرقین اور بعض ہمارے اپنے محققین (جیسے یوسف علی) نے منشی رجب علی بیگ (مؤلف فسانۂ عجائب) سے خلط ملط کر دیا ہے ۔ 'سلطان الاخبار' والے منشی رجب علی کے تفصیلی حالات اور کوائف کے بارے میں ابھی کامل تحقیق نہیں ہوئی ۔ مگر بہرحال اتنا تو بالکل ظاہر ہے کہ موصوف کو فارسی صحافت اور ملک کی اخبار نگاری کی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے ۔

۲- مہر منیر : 'مہر منیر' یکم جنوری ۱۸۴۱ء کو کلکتے سے نکلا ۔ ہماری اخباری دنیا کا یہ پہلا فارسی اخبار ہے جو ہفتے میں تین بار شائع ہوتا تھا ۔ گویا یوں سمجھئے کہ 'مہر منیر' کی روشنی میں روزناموں کا مستقبل تابناک ہوگیا ۔ اس اخبار کے ایڈیٹر محمد علی تھے ۔ خبروں کی چھان بین اور صحت میں اس اخبار نے خصوصیت کے ساتھ شہرت حاصل کی ۔ ان خبروں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا تھا ۔ مقامی اور ملکی خبروں کے علاوہ بین الاقوامی خبریں اور معلومات بھی ہوتی تھی ۔

بہادر شاہ ظفر اور اس کی اجڑی ہوئی دلی کی خبریں بڑی تفصیل سے شائع ہوتی تھیں ۔ اس اخبار میں مرزا غالب کے سانحۂ اسیری کی خبریں بھی بڑی تفصیل سے چھپی تھیں ۔

۳- گلشن بہار : انگریزوں کی نظر میں یہ فارسی اخبار باغی تھا اور حکومت کا خاص دشمن تصور کیا جاتا تھا ۔ اس کا انداز صحافت بھی نرالا تھا ۔ اس ہفتہ وار اخبار کے مدیر عبدالقادر تھے جو فن اخبار نویسی سے پوری طرح واقف تھے ۔

'اختر شہنشاہی' کے مؤرخ نے اس اخبار کی تاریخ اشاعت ۱۸۵۴ء تحریر کی ہے۔ مولانا امداد صابری اپنی 'تاریخ صحافت اردو' (جلد اول) میں اس کے ایک معاصر اخبار کے حوالے سے تاریخ اجرا کا تعین یکم فروری ۱۸۵۱ء کرتے ہیں۔ یہ اخبار اپنے انقلابی اور قومی کردار کی بنا پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شریک ہوا اور علم حریت بلند کیا۔ جس کی سزا میں اس کو انگریز حکومت نے ضبط کر لیا اور اس کے چھاپے خانے کو بھی بحق سرکار تحویل میں لے لیا۔

شمالی پاک و ہند کے فارسی اخبارات

چھاپہ خانوں ہی کی حوصلہ افزائی اور بل بوتے پر صحافت کی ترویج اور فروغ کا دار و مدار ہوتا ہے۔ شمالی ہند میں مطبعوں کے قیام نے ملک کے شمالی خطے میں صحافت کے دور اول کا آغاز کیا۔ شمالی خطے میں ۱۸۳۶ء میں سب سے پہلا اخبار زبان اردو میں دہلی سے 'دہلی اردو اخبار' کے نام سے مولوی محمد باقر کی ادارت میں شائع ہوا۔

انیسویں صدی کے مقبوضہ پاک و ہند میں زبان کے متعلق انگریزوں کی پالیسی نے فارسی زبان کے پنپنے کے وسائل بڑے محدود کردیے۔ سابقہ حکومتوں کے عہد میں زبان فارسی کی اجارہ داری کو انگریزی حکومت بغیر کسی خرخشے کے یکسر نابود کر دینا چاہتی تھی۔ لسانی فراست کے اس چوکھٹے میں مقامی زبانوں میں زبان اردو ترویجی صلاحیتوں کی سب سے زیادہ حامل تھی۔ چنانچہ قرعۂ فال زبان اردو کے نام پڑا۔ مصلحت پرستی کے ترجیحی سلوک نے اس زبان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ۱۸۳۰ء میں فارسی زبان کی جگہ اردو کو دفتری زبان تسلیم کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی پاک و ہند میں فارسی کی دھاک اور ساکھ ختم ہوتی چلی گئی۔ اس تحریک نے فارسی اخبار نویسی کے رجحان کو بھی خاصا متاثر کیا۔ کلکتے کے دبستان صحافت میں فارسی کے زوال کا رد عمل یہ ہوا کہ بعض اخبار فارسی اردو دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع ہونے لگے اور شمالی خطے میں مخلوط زبانوں میں اردو کے ساتھ ہندی کا پیوند نظر آنے لگا۔ انہی اسباب و عوامل کا وہ پس منظر تھا جس میں بتدریج فارسی صحافت کا میلان کم ہوتا چلا گیا۔

شمالی پاک و ہند میں فارسی کا پہلا اخبار

۱۸۴۳ء کے بعد شمالی پاک و ہند میں مطبعوں کے اجرا نے قلمی صحافت کے دور کا خاتمہ کر کے باقاعدہ مطبوعہ صحافت کا آغاز کیا ۔ مشرقی پاک و ہند کی صحافت کے ورثے نے شمالی پاک و ہند کی صحافیانہ روایات کو فروغ بخشا ۔

۱۔ **لدھیانہ اخبار :** شمالی پاک و ہند کا باقاعدہ پہلا مطبوعہ اخبار لدھیانے سے 'لدھیانہ اخبار' کے نام سے شائع ہؤا ، اور توجّہ طلب نکتہ یہ ہے کہ شمال میں بھی صحافت کی بسم اللہ فارسی اخبار ہی سے ہوئی ۔ 'لدھیانہ اخبار' کا ایک دور باقاعدہ قلمی اخبار نویسی کا بھی رہا ہے جس کا سال آغاز ایک اندازے کے مطابق محققین کی نظر میں ۱۸۳۳ء ہے ۔ شمالی پاک و ہند میں چھاپے خانے کا رواج ۱۸۳۵ء میں ہؤا ۔ چھاپے خانے کے قیام کے فوراً بعد مذکورہ اخبار ٹائپ میں چھپنے لگا ۔ اس طرح 'لدھیانہ اخبار' کا سال اجرا ۱۸۳۵ء قرار پایا ۔ اس کا پہلا ایڈیٹر پاجس ، نام کا عیسائی تھا جو بیپٹسٹ مشن کا ایک سرگرم کارکن تھا اور یہ 'لدھیانہ اخبار' بھی اسی مشن کا ایک سرگرم کارکن تھا اور اسی مشن کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے شائع ہوتا تھا ۔ اس اخبار کے مقاصد میں — عیسائی مذہب کا مقبوضہ ملک میں تسلّط ، عیسائی مذہب کی ملک گیر پیمانے پر اشاعت اور ملک کے استحصال میں حکومت کے ساتھ اشتراک تھا ۔ انھیں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے ایک تبلیغی چھاپے خانے کا بھی قیام عمل میں آیا ۔ بعد میں انگریزی اسکول کا بھی منصوبہ عمل میں آیا ۔ اس کے نصاب کے لئے ایک مخصوص نظریے کے پیش نظر کتابیں چھاپی گئیں اور اس کے علاوہ اردو اور فارسی میں تبلیغی نوعیّت کی کتابیں علیحدہ طبع ہوئیں اور اس چھاپے خانے سے ہفتہ وار 'لدھیانہ اخبار' کا اجراء کیا گیا ۔ اس طرح بیپٹسٹ مشن کی ایک ذیلی شاخ لدھیانے میں قائم کی گئی جس کا مرکز سیرام پور تھا ۔

'لدھیانہ اخبار' اپنے مخصوص اشاعتی پروگرام کو حسن و خوبی کے ساتھ چلاتا رہا اور اخبار کا سلسلہ تقریباً ۱۸۴۱ء تک جاری رہا ۔

۲۔ **زبدۃ الاخبار یا آگرہ اخبار :** 'زبدۃ الاخبار' یا 'آگرہ اخبار' اصل میں یہ دونوں نام ایک ہی اخبار کے ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'آگرہ اخبار' ۱۸۳۳ء میں نکلا ۔ بعد میں اسی اخبار کا نام تقریباً ایک سال بعد ۱۸۴۲ء میں 'زبدہ الاخبار' رکھ دیا گیا ۔ یہ تحقیقی انکشاف ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنی تاریخ میں کیا ہے ۔ صحافت کے بعض محققین نے 'آگرہ اخبار'

اور 'زبدۃ الاخبار' کو الگ الگ اخبار مانا ہے - اور ایسا
ان دو میں سے پہلے کون سا شائع ہوا تھا
کی ادارت میں باقاعدگی سے نکلتا تھا -

ایک تحقیقی تسامح : شمالی ایک و ہند کی فارسی اور اردو صحافت کی تاریخ کا سب سے پہلا اخبار 'اردو اخبار' (دہلی) ثابت کیا گیا ہے اور یہی نہیں بلکہ ہمارے بعض تذکرہ لکھنے والوں نے ، مثلاً غریبی شمال و مشرق ، اسی اخبار کو تاریخ کا پہلا اخبار قرار دیا ہے - مگر اس تاریخی پس منظر میں جو ہم نے پیش کیا ہے ، یہ بات صحیح ثابت نہیں ہوتی -

۳- **سراج الاخبار** : یہ ہفتہ وار پرچہ بہادر شاہ ظفر کے دربار کا کورٹ گزٹ تھا جس میں بادشاہ کے شب و روز کے معمولات کو بطور روزنامچہ شائع کیا جاتا تھا - اس کے علاوہ اندرونِ قلعہ اور بیرونِ قلعہ شہر کی خبریں شائع ہوتی تھیں - اس اخبار کے ایڈیٹر سید اولاد علی اور اس کا سال اجرا ۱۸۴۱ء ہے - گارساں دتاسی نے اسے ملک کا سب سے قدیم اخبار تسلیم کیا ہے ، یعنی 'سراج الاخبار' کے اجراء کا دامی عہد بھی اس میں شامل کر لیا ہے - مطبوعہ صورت میں یہ مطبع سلطانی کے قیام کے بعد ہی نظر آتا ہے - یہ اخبار ہماری صحافت کی تاریخ میں اس لئے بھی اہم ہے کہ اس نے ہماری صحافتی تاریخ میں اپنی وقائع نگاری کی عمر پوری کر کے اخبار نگاری کے عہد میں قدم رکھا - کچھ صفحات وقائع نگاری کے انداز میں اور بقیہ کوئی ڈھائی صفحے جدید صحافت کے انداز کے ہوتے تھے - فنی اعتبار سے اس اخبار کو وقائع نگاری کی ایک ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے -

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ اخبار اپنے تمام معاصر اخباروں سے مختلف تھا - پنڈت دتاتریا کیفی کے قول کے مطابق 'سراج الاخبار' کی زبان بڑی پختہ ، ٹھیٹ اور منشیانہ ہوتی تھی - اسلوب فصیح اور عبارت بلیغ ہوتی تھی - زبان کے قاعدے اور آئین کی پابندی پر بڑی سختی سے عمل ہوتا تھا - اسلوب میں جگہ جگہ شاعرانہ مذاق کی جھلکیاں نمایاں تھیں -

۴- **صادق الاخبار ، دہلی** : گذشتہ صدی میں اس نام کے کئی اخبار ملک کے مختلف شہروں سے نکلتے رہے - فارسی زبان کا یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۴۴ء میں نکلا ہوگا - ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۶ء کے 'احسن الاخبار' کی وساطت سے تصدیق ہوتی ہے کہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے بموجب یہی اخبار پھر اردو میں طبع ہونے لگا -

... میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ اپنی وضع قطع
... تھا۔ نہ پریس کے مالک کا حوالہ ہوتا تھا، نہ ایڈیٹر کا نام،
... شمارہ۔ خبروں کے معاملے میں یہ اخبار خاصا مستعد اور ثقہ ثابت
... خبریں نہ چھاپتا اور خبروں کی طباعت میں ایک خاص ترتیب کو بھی ملحوظ
... پہلے بادشاہ کے متعلق خبروں کا سلسلہ، اس کے بعد قلعے کی خبریں، پھر ایسٹ انڈیا
... کے بادشاہ اخبار کی خبریں، اس کے بعد ہندوستان کے صوبوں، شہروں اور ریاستوں
... شائع ہوتی تھیں۔

۵۔ **جام جہاں نما**: یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۸۵ء میں کلکتے سے نکلا۔ محمد صدر ہاشمی کی کتاب 'تاریخ جرائد و مجلات' جلد دوم میں اس اخبار کا حوالہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید تفصیل کہیں نہیں ملی۔

۶۔ **فارسی اخبار**: 'اختر شہنشاہی' (جلد اول) سے ثابت ہے کہ یہ اخبار پشاور سے نکلا تھا۔ اس اخبار کے مہتمم محمد صادق پشاوری تھے۔ اس ہفتہ وار اخبار کا اجراء ۱۸۶۲ء میں ہؤا۔ *اس اخبار کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا۔*

۷۔ **مفید عام**: فارسی، اُردو اور انگریزی تینوں زبانوں پر مشتمل 'مفید عام' کے نام سے ایک ماہنامہ لاہور سے ۱۸۸۱ء میں جاری ہؤا۔ اس پرچے کے مالک منشی گلاب سنگھ تھے جو اپنے وقت کے ایک بہت بڑے کتب فروش اور ناشر تھے۔ اس ماہنامے کی تفصیلات 'اختر شہنشاہی' کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتیں۔

۸۔ **درفشِ کاویانی**: زبانِ فارسی کا یہ پہلا ماہنامہ ہے۔ اس کی تصدیق و تحقیق 'اختر شہنشاہی' کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اس ماہنامے کا اجراء یکم جنوری ۱۸۸۲ء میں ہؤا۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک مدرسہ' مشرقیہ فارسی کے مدرسِ اعلیٰ مولوی عبدالحکیم تھے۔ یہ ماہنامہ شہر لاہور سے مطبع گلزارِ محمدی میں طبع ہو کر شائع ہوتا تھا۔

۹۔ **فارسی اخبار**: یہ فارسی کا مذاق رکھنے والے شائقین کے لئے یکم اپریل ۱۸۸۴ء میں شہر لاہور سے طبع ہؤا۔ اس میں انگریزی اخبارات کے ترجمے، مضامین اور مشاہیرِ عالم کے سوانح اور زبانِ فارسی کی اصطلاحیں شائع ہوتی تھیں۔ یہ نیم ادبی اور نیم علمی اخبار تھا۔ ملک کی خاص خاص خبریں بھی اس میں چھپتی رہتی تھیں۔ 'اخترِ شہنشاہی' کے

اور 'زبدۃ الاخبار' کو الگ الگ اخبار مانا ہے ۔ اور اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ ان دو میں سے پہلے کون سا شائع ہؤا تھا ۔ فارسی کا یہ ہفتہ وار اخبار منشی واجد علی خاں کی ادارت میں باقاعدگی سے نکلتا تھا ۔

> ایک عقیقی تسامح : شمالی ہند و ہند کی فارسی اور اُردو صحافت کی تاریخ کا سب سے پہلا اخبار 'اُردو اخبار' (دہلی) ثابت کیا گیا ہے اور یہی نہیں بلکہ ہمارے بعض ثقہ لکھنے والوں نے ، بلاتفریق شمال و مشرق ، اسی اخبار کو تاریخ کا پہلا اخبار قرار دیا ہے ۔ مگر اس تاریخی پس منظر میں جو ہم نے پیش کیا ہے ، یہ بات صحیح ثابت نہیں ہوتی ۔

۳۔ **سراج الاخبار :** یہ ہفتہ وار پرچہ بہادر شاہ ظفر کے دربار کا کورٹ گزٹ تھا جس میں بادشاہ کے شب و روز کے معمولات کو بطور روزنامچہ شائع کیا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ اندرونِ قلعہ اور بیرونِ قلعہ شہر کی خبریں شائع ہوتی تھیں ۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سید اولاد علی اور اس کا سالِ اجرا ۱۸۴۱ء ہے ۔ گارساں دتاسی نے اسے ملک کا سب سے قدیم اخبار تسلیم کیا ہے ، یعنی 'سراج الاخبار' کے اجراء کا دامی عہد بھی اس میں شامل کر لیا ہے ۔ مطبوعہ صورت میں یہ مطبعِ سلطانی کے قیام کے بعد ہی نظر آتا ہے ۔ یہ اخبار ہماری صحافت کی تاریخ میں اس لئے بھی اہم ہے کہ اس نے ہماری صحافتی تاریخ میں اپنی وقائع نگاری کی عمر پوری کر کے اخبار نگاری کے عہد میں قدم رکھا ۔ کچھ صفحات وقائع نگاری کے انداز میں اور بقیہ کوئی ڈھائی صفحے جدید صحافت کے انداز کے ہوتے تھے ۔ فنی اعتبار سے اس اخبار کو وقائع نگاری کی ایک ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے ۔

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ اخبار اپنے تمام معاصر اخباروں سے مختلف تھا ۔ پنڈت دتاتریا کیفی کے قول کے مطابق 'سراج الاخبار' کی زبان بڑی پختہ ، ٹھیٹ اور منشیانہ ہوتی تھی ۔ اسلوب فصیح اور عبارت بلیغ ہوتی تھی ۔ زبان کے قاعدے اور آئین کی پابندی پر بڑی سختی سے عمل ہوتا تھا ۔ اسلوب میں جگہ جگہ شاعرانہ مذاق کی جھلکیاں نمایاں تھیں ۔

۴۔ **صادق الاخبار ، دہلی :** گذشتہ صدی میں اس نام کے کئی اخبار ملک کے مختلف شہروں سے نکلتے رہے ۔ فارسی زبان کا یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۴۴ء میں نکلا ہوگا ۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۶ء کے 'احسن الاخبار' کی وساطت سے تصدیق ہوتی ہے کہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے بموجب یہی اخبار پھر اُردو میں طبع ہونے لگا ۔

مولانا امداد صابری اس اخبار کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ اپنی وضع قطع سے بالکل الگ نوعیت کا اخبار تھا ۔ نہ پریس کے مالک کا حوالہ ہوتا تھا ، نہ ایڈیٹر کا نام ، نہ جلد نمبر اور نہ نمبر شمارہ ۔ خبروں کے معاملے میں یہ اخبار خاصا مستعد اور ثقہ ثابت ہؤا ۔ زیادہ خبریں نہ چھاپتا اور خبروں کی طباعت میں ایک خاص ترتیب کو بھی ملحوظ رکھتا ۔ پہلے بادشاہ کے متعلق خبروں کا سلسلہ ، اس کے بعد قلعے کی خبریں ، پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ اختیار کی خبریں ، اس کے بعد ہندوستان کے صوبوں ، شہروں اور ریاستوں کی خبریں شائع ہوتی تھیں ۔

۵۔ **جامِ جہان نما :** یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۵۵ء میں کلکتے سے نکلا ۔ محمد صدر ہاشمی کی کتاب 'تاریخ جرائد و مجلات' جلد دوم میں اس اخبار کا حوالہ ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ مزید تفصیل کہیں نہیں ملتی ۔

۶۔ **فارسی اخبار :** 'اختر شہنشاہی' (جلد اول) سے ثابت ہے کہ یہ اخبار پشاور سے نکلا تھا ۔ اس اخبار کے مہتمم محمد صادق پشاوری تھے ۔ اس ہفتہ وار اخبار کا اجراء ۱۸۶۲ء میں ہؤا ۔ اس اخبار کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا ۔

۷۔ **مفید عام :** فارسی ، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں پر مشتمل 'مفید عام' کے نام سے ایک ماہنامہ لاہور سے ۱۸۸۱ء میں جاری ہؤا ۔ اس پرچے کے مالک منشی گلاب سنگھ تھے جو اپنے وقت کے ایک بہت بڑے کتب فروش اور ناشر تھے ۔ اس ماہنامے کی تفصیلات 'اختر شہنشاہی' کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتیں ۔

۸۔ **درفشِ کاویانی :** زبانِ فارسی کا یہ پہلا ماہنامہ ہے ۔ اس کی تصدیق و تحقیق 'اخترِ شہنشاہی' کے حوالے سے ہوتی ہے ۔ اس ماہنامے کا اجراء یکم جنوری ۱۸۸۲ء میں ہؤا ۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک مدرسہ' مشرقیہ فارسی کے مدرسِ اعلیٰ مولوی عبدالحکیم تھے ۔ یہ ماہنامہ شہر لاہور سے مطبعِ گلزارِ محمدی میں طبع ہو کر شائع ہوتا تھا ۔

۹۔ **فارسی اخبار :** یہ فارسی کا مذاق رکھنے والے شائقین کے لئے یکم اپریل ۱۸۸۴ء میں شہر لاہور سے طبع ہؤا ۔ اس میں انگریزی اخبارات کے ترجمے ، مضامین اور مشاہیرِ عالم کے سوانح اور زبانِ فارسی کی اصطلاحیں شائع ہوتی تھیں ۔ یہ نیم ادبی اور نیم علمی اخبار تھا ۔ ملک کی خاص خاص خبریں بھی اس میں چھپتی رہتی تھیں ۔ 'اخترِ شہنشاہی' کے

مؤلف کے قول کے مطابق یہ اخبار طالب علموں کا استاد شفیق اور دیگر ملکی بھائیوں کا رفیق طریق تھا ۔ اس چار ورق ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر شمس الدین شائق تھے ۔

۱۰۔ آزاد : 'روزنامہ آزاد' ۱۸۸۳ء میں دہلی سے نکلا ۔ زیادہ عرصے تک یہ اخبار نہ چل سکا ۔ اپنے ایک معاصر اخبار کے ساتھ جو حیدر آباد دکن سے 'سید الاخبار' کے نام سے نکلتا تھا ، اس کی خاصی نوک جھونک رہتی تھی اور اسی بنا پر اسے شہرت حاصل ہوئی ۔ لیکن نامساعد حالات نے اسے زیادہ دنوں نہیں چلنے دیا ۔

فارسی کی تاریخ صحافت میں بعض اخبار اپنی مقامی حیثیت یا اپنے کسی خاص صحافیانہ انداز کی بنا پر مشہور ہوئے ۔ صحافت کے اعلیٰ معیار پر چاہے یہ اخبار پورے نہ اترتے ہوں مگر ہم ان کی تاریخی حیثیت سے قطعاً انکار نہیں کر سکتے ۔ اس ذیل میں ہم بعض ان اخباروں کا ذکر کرتے ہیں جو بمبئی سے نکلتے تھے ۔ بمبئی انیسویں صدی عیسوی میں اخبارات کا خاص مرکز رہا ہے ۔ ساتھ ہی ہم کراچی کے بھی بعض اخبارات کا تذکرہ کریں گے ۔

بمبئی کے اخبارات اور مجلّے

۱۔ احسن الاخبار : فارسی کا ہفت روزہ جریدہ 'احسن الاخبار' بمبئی سے ۹ نومبر ۱۸۴۴ء کو نکلا ۔ قلعۂ معلیٰ کی خبریں اس اخبار میں خاص طور پر طبع ہوتی تھیں ۔ اس اخبار کے نامہ نگار مستقل طور پر دہلی میں مقیم تھے ۔ علاوہ ازیں ملک کی دیگر اہم خبریں بھی اس میں چھپتی تھیں ۔ مرزا غالب کی اسیری کی خبر ۲۵ جون ۱۸۴۸ء کی جلد ۴ نمبر ۲۶ میں موجود ہے ۔ اِس اخبار نے مرزا غالب کے حادثۂ اسیری کی خبر کو غلط قرار دیا ہے ۔ نیز قمار بازی کو بھی غلط الزام ، دشمنوں کا شعبدہ اور افتراء بتایا ہے ۔

۲۔ جامع جمشید : بمبئی سے یہ ہفتہ وار[1] اخبار ۱۸۴۵ء میں نکلا ۔ مزید تفصیل نہیں ملتی ۔

۳۔ چابک : یہ ہفتہ وار اخبار[2] بمبئی سے ۱۸۴۶ء میں نکلا ۔ تفصیل اس کی بھی فراہم نہ ہو سکی ۔

---

(۱) کتاب مطبوعات شعر فارسی ، ص ۶۸ (ایران) ۔
(۲) ایضاً ، ص ۲۷ (ایران)

۴۔ **مدرس فارسی :** اس اخبار نے انگریزی زبان کے شائقین کے لئے انگریزی کے ذریعے فارسی اور زبانِ انگریزی کے طلباء کے لئے فارسی کے ذریعے انگریزی تعلیم گھر بیٹھے حاصل کرنے کا طریقہ نکالا تھا ۔ یہ پرچہ ماہنامے کے طور پر ۴۲ صفحات کا نکلتا تھا ۔ مالک اور ایڈیٹر مفتی حاجی غلام محمد خان بہادر تھے ۔ یہ یکم جنوری ۱۸۸۳ء کو بمبئی سے نکلنا شروع ہؤا ۔

کراچی کے اخبارات

۱۔ **مفرّح القلوب :** یہ اخبار ۱۸۵۵ء میں کراچی سے ہفت روزے کی حیثیت سے نکلا جس کے ایڈیٹر مرزا مخلص علی مشہدی اور ان کے بعد ان کے خلفِ عزیز مرزا محمد شفیع تھے ۔ آگے یہ سلسلہ ان کے فرزندان مرزا محمد جعفر اور مرزا محمد صادق تک برقرار رہا ۔ یہ اخبار ۱۹۰۶ء تک مسلسل طبع ہوتا رہا ۔ 'اخترِ شہنشاہی' کا مؤرخ اس کا سالِ اجراء ۱۸۵۶ء لکھتا ہے ۔

۲۔ **مطلعِ خورشید :** گارساں دتاسی کے خطبے مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۶۵ء سے ثابت ہؤا کہ مرزا مخلص علی کی ادارت میں دو اخبار 'مفرح القلوب' (جس کا ذکر سطورِ بالا میں کیا جا چکا ہے) اور دوسرا 'مطلعِ خورشید' بزبانِ فارسی بطور ہفت روزہ کراچی سے نکلے ۔ پھر یہ دوسرا اخبار کراچی اور سکھر سے بیک وقت نکلتا رہا ۔ بعد میں کراچی سے موقوف ہو کر سکھر سے پابندی سے شائع ہوتا رہا ۔ واضح تاریخوں کا سراغ نہیں ملتا کہ کب یہ کراچی اور سکھر سے ایک ساتھ نکلتے رہے اور کب سے کراچی سے ان کی اشاعت بند ہوئی اور پھر صرف سکھر میں اشاعت جاری رہی ۔

'مطلعِ خورشید' ۱۹۰۶ء تک برابر پابندی سے نکلتا رہا ۔ آخری دور میں اس اخبار کے مسلک میں تغیّر ہؤا اور فارسی میں اردو کا پیوند لگا ۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی آخری سانسوں میں بھی فارسی کا دم بھرتا رہا ۔ 'اخترِ شہنشاہی' کا مؤرخ 'مطلعِ خورشید' کے بارے میں درج کرتا[1] ہے کہ ۱۸۵۶ء میں اس اخبار کا اجراء ہوا تھا اور فقط چار ورق پر مشتمل یہ ہفت روزہ اخبار شہر کراچی سے نکلا تھا ۔

---

(۱) اشرف نقوی : اختر شہنشاہی ، جلد اول ، ص ۲۲۱ ۔

ایک انقلاب آفرین روزنامہ

حبل المتین : انیسویں صدی عیسوی کے غروب ہوتے ہوئے آسمانِ صحافت پر ایک انقلاب آفرین روزنامہ 'حبل المتین' کے نام سے طلوع ہؤا - پروفیسر براؤن نے اپنی 'ادبی تاریخِ ایران'[1] میں اخبار کا اجراء ۱۸۹۳ء بتایا ہے اور محمد[2] صدر ہاشمی بھی اپنی تاریخ میں رقمطراز ہیں کہ اس کا پہلا شمارہ کلکتہ سے دس جمادی الثانی ۱۳۱۱ ہجری (۱۸۹۳ء) کو چھپا - اس میں عام طور پر ۲۴ صفحات ہوتے تھے - یہ ہفتے میں ایک بار چھپتا تھا - بعد میں یہی ہفت روزہ اخبار روزنامے میں تبدیل ہو گیا - پاک و ہند کی صحافت کا یہ پہلا اہم روزنامچہ ہے جس نے برِّصغیر کی صحافت کے لئے راستہ کھول کر اخبارات کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کردیا اور نہ صرف پاک و ہند بلکہ ایران کی صحافت کو بھی 'حبل المتین' نے کئی اعتبار سے متاثر کیا -

یہ اخبار ایرانیوں کے تحفظِ حقوق اور آزادیٔ رائے کو بیدار کرنے کے لئے نکلا - قاچاری حکومت کے جور و استحصال نے ملک میں ایک بد اعتمادی کی فضا پیدا کر دی تھی - جبر و استبداد نے عوام کو جنبشِ لب سے محروم کر دیا تھا - ایران میں حکومت کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی اجازت نہ تھی - لہٰذا سید جلال الدین مؤید الاسلام ، پرنس ملکم خان اور سید جمال الدین نے ایک محاذ حکومت کے خلاف بنایا - سید جمال الدین اور پرنس ملکم خان نے انگلستان سے اور سید جلال الدین نے ہندوستان (کلکتہ) سے ایرانی حکومت کے خلاف علَمِ انقلاب بلند کیا اور اخبارات کے ذریعے ایرانیوں کے اندر جرأت ، حوصلہ اور استقلال پیدا کیا - انگلستان سے روزنامہ 'قانون' اور ہندوستان سے 'حبل المتین' اسی مقصد کی تکمیل کے لئے نکالے گئے - اس اخبار کے ہندوستان کے علاوہ تقریباً پانچ ہزار شمارے صرف ایران کے مختلف شہروں میں تقسیم ہوتے تھے - بعض محبِّ وطن اور صاحب استعداد حضرات تھوک کے بھاؤ خریدتے اور عوام میں مفت تقسیم کرتے - یہ اخبار اپنی بیباکی اور بے لاگ تنقید کی بنا پر مصر ، ترکی ، روس اور انگلستان کے علاوہ دنیا کے کئی دوسرے ملکوں میں بھی متعارف تھا اور اسی طرح دنیا کے مختلف گوشوں میں اس کے نمائندے پھیلے ہوئے تھے - حکومتِ ایران نے جب اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا تو اس کی اشاعت اور خریداری کو سیاسی چابکدستی سے قانوناً ممنوع قرار دے دیا - تقریباً چار سال

---

(1) A Literary History of Persia, Volume IV -

(۲) محمد صدر ہاشمی ; تاریخ جرائد و مجلات ایران ، جلد دوم ، ص ۲۰۱ ، ۲۰۰ -

تک اس اخبار کا ملک میں آنا ممنوع اور اس کا پڑھنا جرمِ سنگین تھا ۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کا بھی محاسبہ کیا گیا جو 'حبل المتین' کے بہی خواہ اور مداح تھے ۔ ان حالات کے باوجود یہ اخبار ملکِ ایران میں ہر جگہ پہنچتا تھا ۔

'حبل المتین' آزادی کا نقیب ، انسان دوست اور عوام پرست اخبار تھا اور ہر اس ملک میں جہاں بھی انسانیت کے نام پر استحصال کیا جاتا تھا یہ اخبار اس کے خلاف سینہ سپر ہو کر مظلوم انسانوں کی فلاح و بہبود کی حمایت میں کمر بستہ ہو جاتا تھا ۔ اسی مسلک کی بنا پر ہندوستان میں انگریزی حکومت نے نئے پریس ایکٹ کی رو سے (ترغیب جرم کی حمایت میں) اسے کئی بار ضبط کیا ۔ ایک دفعہ اسے ۱۲۹۵ ہجری سے (اوایل سال) ۱۳۰۳ ہجری تک (۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۵ء) یعنی تقریباً آٹھ برس تک بند رکھا گیا ۔ اس کے ساتھ مطبعِ 'حبل المتین' کو بھی بند کر دیا گیا ۔ اسی زمانے میں دوسرے اخبارات پر بھی اسی طرح کی پابندیاں لگائی گئی تھیں ۔ یہ تشدد جاری رہا اور اس کے خلاف مولانا ظفر علی خان نے لندن پہنچ کر اربابِ مملکت سے احتجاج کیا[1] مگر اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا ، بلکہ ستم و جور کی رسی اور دراز ہوتی چلی گئی ۔

آٹھ برس کا عرصہ گزرنے کے بعد 'حبل المتین' کے ایڈیٹر مؤید الاسلام جلال الدین نے 'حبل المتین' کو 'بشارت' کے نام سے کچھ عرصے کے لئے نکالا ۔ یہ اخبار ۱۸۸۵ء/ ۱۳۰۳ ہجری کے اوائل میں نکلا ۔

اس طرح سے 'حبل المتین' تقریباً چالیس برس تک بے حد نامساعد حالات میں نکلتا رہا اور استبدادی قوت کے ساتھ نبرد آزمائی کرتا رہا ۔ آخر ۱۸۹۱ء/۱۳۰۹ ہجری میں اخبار کے مدیر سید جلال الدین کا انتقال ہوگیا ۔ ان کے مرنے کے بعد 'حبل المتین' زندہ تو رہا مگر آہستہ آہستہ اس کی وہ دھاک اور ساکھ ختم ہوگئی ۔ سید جلال الدین کے مرنے کے بعد قلمدانِ ادارت ان کی بیٹی فرخ سلطانہ کے سپرد ہؤا ۔ لیکن یہ خدمت وہ حسن و خوبی

---

(۱) ۱۹۰۸ء میں انگریزی حکومت نے نئے پریس ایکٹ کا اجراء کیا تھا جس سے پاک و ہند کی صحافت اور آزادیٔ فکر کو خاصا نقصان پہنچا ۔ ۱۹۱۰ء میں پریس ایکٹ کی دفعہ ۴ کا اضافہ کر دیا گیا جس کے نتیجے میں ملک کے کئی اخبار اور چھاپے خانے ضبط کر لئے گئے اور اس جبر و احتساب کے خلاف محب وطن رہنماؤں نے شدید ہنگامہ برپا کیا ۔

کے ساتھ انجام نہ دے سکیں ۔ پرچہ فقط یادگار ہو کر رہ گیا اور کچھ عرصے کے بعد یہ یادگار بھی باقی نہ رہی ۔

بلا شبہہ 'حبل المتین' نے صحافت کے لئے فکر و فن کا ایک نیا نصاب قائم کیا اور نہ صرف یہ بلکہ فارسی کے زبان و ادب کی بھی گراں قدر خدمات انجام دیں ۔ ان تمام پہلوؤں کو صحافت کی تاریخ میں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

انیسویں صدی عیسوی کا آخری اخبار

آزاد : ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء کو 'روزنامہ آزاد' کلکتہ شہر سے نکلا ۔ مؤید الاسلام جلال الدین الحسنی ایڈیٹر 'حبل المتین' کی سرپرستی میں آٹھ صفحات پر مشتمل بالکل 'حبل المتین' کی تقلید میں اور اسی وضع قطع کا نکلا تھا ۔ اخبار کے ایڈیٹر مشہورِ زمانہ صحافی مرزا سید حسن کاشانی تھے ۔

محمد صدر ہاشمی نے اپنی 'تاریخِ جرائد' میں روزنامہ 'آزاد' کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ 'مفتاح الظفر' کے ضمیمے کے طور پر کلکتے سے شائع ہوتا تھا ۔

'آزاد' اخبار میں ایران اور دوسرے ملکوں کی خبروں کے علاوہ علمی ، معلوماتی اور ادبی مضامین بھی ہوتے تھے ۔

'مطبوعاتِ شعرِ فارسی'[۱] کے مؤلف نے بتایا ہے کہ مرزا سید حسن کاشانی مؤید الاسلام مدیر 'حبل المتین' کے بھائی تھے جنہوں نے 'آزاد' کو چھوڑ کر ۱۹۰۷ء میں 'حبل المتین' دوبارہ تہران سے نکالا[۲] ۔

بیسویں صدی عیسوی کے اخبارات

بیسویں صدی میں فارسی اخبارات کی اشاعت برائے نام نظر آتی ہے ۔ اکا دکا اخبارات کا سراغ ہمیں ملتا ہے ۔ البتہ اس صدی میں فارسی رسائل کی اشاعت کی طرف توجہ شروع ہوتی ہے ۔ پہلے ہم اخباروں کا ذکر کریں گے ، پھر رسائل کا ۔

---

(۱) مطبوعات شعر فارسی ، ص ۲۹ ۔

(۲) ملاحظہ ہو تاریخ جرائد و مجلات ایران ، جلد دوم ، ص ۲۰۸ ۔

۱- **تمدن :** روزنامہ 'تمدن' بمبئی سے ۱۹۰۸ء میں 'حبل المتین' کے انداز پر نکلا ۔ یہ چار صفحات کا اخبار مطبع 'حبل المتین' میں چھپا ۔ اور اس اخبار کے اجراء میں بھی مؤید الاسلام ۔دیر 'حبل المتین' کی ترغیب و اعانت شامل تھی ۔ روزنامہ 'تمدن' اپنے بے باک اور نڈر صحافیانہ مسلک کی بنا پر تاریخ صحافت فارسی میں ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ یہ اخبار ایران کے قاچاری بادشاہ اور حکومت کی بدعنوانیوں پر بے لاگ تنقید کرتا تھا اور آسان اور بامحاورہ فارسی اس اخبار کا طرۂ امتیاز تھا ۔

۲- **اصلاح :** محمد رضا بوشہری کی ادارت میں بمبئی سے روزنامہ 'اصلاح' کل آٹھ صفحات کا ۱۹۰۹ء میں جاری ہوا ۔ تقریباً دو سال کے بعد یہ اخبار طہران منتقل ہوگیا اور وہاں سے ۱۹۱۱ء میں بڑی پابندی کے ساتھ نکلتا رہا ۔

۳- **دور نمائی ایران :** روزنامہ 'دور نمائی ایران' کے ایڈیٹر عبدالحسین مہینتا تھے ۔ اس کا مرکز اشاعت بمبئی تھا ۔ تاریخ اجراء ۳۰ نومبر ۱۹۲۸ء ہے ۔ اس اخبار نے ثقہ خبروں کے علاوہ ہندوستان میں زبان فارسی کی ترویج پر بھی خصوصی توجہ دی ۔

اب ہم اس صدی کے مجّلات کا ذکر کرتے ہیں :

بیسویں صدی عیسوی میں اخبارات کی طرف سے ہٹ کر زیادہ توجہ جرائد و مجّلات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے ۔ اس ذیل میں بھی دو شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ ایک صرف فارسی کے پرچے ، دوسرے اردو کے پرچوں میں فارسی زبان و ادب پر مضامین ۔ بطور مثال دوسری قبیل کے پرچوں میں 'الناظر' ، 'الندوہ' ، 'معارف' ، 'جامعہ' ، 'علی گڑھ میگزین' اور 'برہان' ، 'اردو' ، 'اردو ادب' ، 'دہلی یونیورسٹی میگزین' ، 'نگار' ، 'نوائے ادب' ، 'اورینٹل کالج میگزین' اور 'مجلۂ علوم اسلامیہ' وغیرہ کو بطور خاص پیش کیا جا سکتا ہے ۔

جہاں تک فارسی زبان میں شائع ہونے والے رسائل کا تعلق ہے ، یہ کوشش تعلیمی مرکزوں اور درسگاہوں تک محدود رہی ہے ۔ باقاعدہ مجّلے کی شکل میں بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہمیں صرف ایک پرچہ مذہبی مسلک کا نظر آتا ہے ۔

۱- **دعوت الاسلام :** یہ پندرہ روزہ مجّلہ بمبئی سے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں سولہ صفحات کی ضخامت کا نکلا ۔ اس کے مدیر سید محمد علی داعی الاسلام تھے ۔ اس پرچے کا نام پہلے 'اسلام نامہ' اور بعد میں 'دعوت اسلام' رکھا گیا ۔ اس کی مقبولیت کو بڑھانے کے لئے

اس میں کچھ صفحات اُردو کے لئے بھی وقف کئے گئے - پھر اس کو اور ہمہ گیر کرنے کے لئے کچھ حصہ انگریزی کا بھی بڑھا دیا گیا -

یہ خالص اسلامی پرچہ تھا ، اس کا مقصد اسلام کی تبلیغ و ترویج تھا - وہ نئی نسل جو انگریزی نظامِ تعلیم کے زیرِ اثر پروان چڑھ رہی تھی ، ایک ریب و تشکیک کے عالم میں تھی - صنعتی انقلاب کے زیرِ اثر ہر شے کی حقیقت میں اسباب و علل کا تجسّس نئی نسل کا ایک ذہنی وطیرہ بن رہا تھا - ایسی فضا میں دینِ اسلام کو نئے انداز سے تبلیغ کی ضرورت تھی - جس کے پیشِ نظر یہ رسالہ 'دعوت الاسلام' معرضِ وجود میں آیا - اپنے دینی شعار کی بنا پر اس اخبار کو بڑی شہرت حاصل ہوئی - براؤن نے اپنی کتاب[1] میں اس پرچے کا ذکر 'قسیم الاخبار' کے حوالے سے کیا ہے -

۲- **ایران لیگ** : انجمنِ ایران لیگ کی طرف سے 'مجلہ ایران لیگ' بمبئی سے طبع ہوا - یہ سردینشاہ جی بائی ایرانی کی تحریک سے فارسی اور انگریزی میں مشترک نکلا - تقریباً ۱۷۰ صفحات انگریزی میں اور ۵۵ صفحات فارسی کے ہوتے تھے اور علمی ، ادبی ، معلوماتی نوعیت کے مضامین طبع ہوتے تھے - پاک و ہند اور ایران کے مناظرِ فطرت سے مزین یہ مصوّر پرچہ اپنے دلکش پیکر اور علمی افادیت کی بنا پر ایک معیاری مجلّہ تھا ، جو ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) میں نکلا - بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں 'دعوت الاسلام' اور 'ایران لیگ' کے بعد ایک مدت تک پھر کسی نئے اخبار یا مجلّے کا سراغ نہیں ملتا -

۳- **جہانِ آزاد** : دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں دہلی سے ایک فارسی رسالہ 'جہانِ آزاد' نکلنا شروع ہؤا - یہ رسالہ حکومت کے محکمۂ اطلاعات کی طرف سے شائع ہوتا تھا - دوران جنگ کے تقاضے اس کی اشاعت کا محرّک تھے - لیکن اس میں بلند پایہ علمی ادبی اور تہذیبی مضامین شائع ہوتے رہے اور انگریزی زبان کے حوالے سے جدید فارسی سکھانے کے لئے اس میں مستقل کالم لکھے جاتے رہے - ایک مدت تک یہ رسالہ جدید ایران کے چوٹی کے ادیب اور افسانہ نگار مطیع الدولہ حجازی کی ادارت میں نکلتا رہا -

۴- **ہلال** : پاکستان کے قیام کے بعد 'جہانِ آزاد' کی بجائے فارسی رسالے 'مجلہ ہلال' کی کراچی سے اشاعت شروع ہوئی جو برابر جاری ہے اور یہ رسالہ دوران جنگ کے

---

(1) Political Poetry of Modern Persia by Edward. G. Browne, Page 17 -

'جہان آزاد' سے علمی ، ادبی اور تہذیبی سطح پر کئی حیثیتوں سے آگے بڑھا ہؤا ہے اور بہت مقبول ہے - یہ رسالہ مصوّر ہے اور رنگین تصویروں اور بڑی آب و تاب اور دیدہ زیبی کے ساتھ آرٹ پیپر پر چھپتا ہے - پہلے سہ ماہی تھا ، اب ماہانہ شائع ہوتا ہے - یہ رسالہ فارسی کے ایرانی محاورے کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہے -

۵- **سروش :** یہ فارسی رسالہ پہلے پشاور سے اور پھر کراچی سے ماہانہ ایک طویل مدت تک شائع ہوتا رہا - اس کی فارسی افغانی ہوتی تھی - ایک مدّت سے بند ہے -

۶- **صدای پاکستان :** یہ ماہانہ رسالہ ریڈیو پاکستان (کراچی) کا فارسی مجلّہ ہے - برابر شائع ہو رہا ہے -

(ب) سوانح و سفرنامے ، انساب ، مناظرے ، فنون ، تراجم ، علوم

خود نوشت سوانح اور سفرنامے

۱- 'امیر نامہ'

اس دور میں بھی ذاتی سوانحِ زندگی' یا سفرنامے لکھنے کی روایت زندہ رہی - چنانچہ پٹنہ کے ایک شخص امیر علی نے 'امیر نامہ' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں ذاتی سوانح بھی بیان ہوئے ہیں اور سفر نامہ بھی قلمبند ہؤا ہے - امیر علی پٹنہ میں ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے - تعلیم کے بعد ۱۸۳۲ء میں پٹنہ کی عدالت دیوانی میں ملازمت کی - تین سال کے لئے شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کے دربار میں سفیر مولوی خرم حسین کے اسسٹنٹ رہے - ۱۸۳۷ء میں سپیشل کمشنر کلکتہ کے دفتر میں سرکاری وکیل کے طور پر دیوانی مقدمات کی پیروی کرتے رہے - ۱۸۴۳ء میں سندِ وکالت عطا ہوئی - ۱۸۵۷ء میں وہ کمشنر پٹنہ کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے - بغاوت کے زمانے میں انہوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں - اس لئے وہ حکومت کی طرف سے کلکتہ کے آنریری مجسٹریٹ اور جسٹس آف پیس بنائے گئے - ۱۸۶۴ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب ملا - ۱۸۶۸ء میں چوبیس پرگنوں کے آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے - ۱۸۶۷ء میں شاہ اودھ کے خلاف قرضوں سے متعلق دیوانی مقدمات کی پیروی کی اور کامیابی سے دفاع کیا - چنانچہ قرض کی رقم چھپن لاکھ سے سات لاکھ رہ گئی -

'امیر نامہ' ۱۸۷۰ء میں شائع ہؤا - یہ پانچ ابواب میں منقسم ہے - پہلے باب میں زمانہٴ تالیفِ کتاب تک ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تاریخ لکھی ہے - ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے شروع کر کے بنگال کے گورنر ، گورنر جنرل ، بعد میں وائسرائے اور لفٹننٹ گورنروں کا نام بنام ذکر کیا ہے - اپنے عہد کے وائسرائے لارڈ میو کا حال تفصیل سے لکھا ہے - اس کے بعد انگریزی حکومت کی ان برکات کا ذکر کیا ہے ، جن سے خلائق کی رفاہ وابستہ تھی - مثلاً ریلوے اور تارگھر کا اجراء ، ہسپتال ، سکول اور کالجوں کا افتتاح ، پولیس کا انتظام ، نوٹوں کا اجراء ، آب رسانی اور روشنی کا انتظام ، گھڑیوں ، چینی کے برتنوں اور دوسری اشیائے استعمال کی فراہمی وغیرہ - برکات گنوانے کے بعد دسمبر ۱۸۶۹ء سے مارچ ۱۸۷۰ء تک شاہزادہ البرٹ ڈیوک آف اڈنبرا کی ہندوستان میں آمد پر اس کے استقبال اور اعزاز میں جو جشن منائے گئے اور جو ضیافتیں برپا کی گئیں ، ان کا مفصّل حال لکھا ہے - بنارس ، آگرہ ، دہلی ، لاہور ، لکھنؤ ، بمبئی اور مدراس میں شاہزادہ کے سفر و سیاحت اور شکار کی تفاصیل بتائی ہیں - راجوں ، مہاراجوں اور سرداروں کی طرف سے یا شاہزادہ کی طرف سے جو دربار منعقد ہوئے ، دعوتیں ہوئیں اور پذیرائی کی محفلیں برپا ہوئیں ، ان کا مفصّل حال لکھا ہے -

دوسرے باب میں مؤلف نے اپنی زندگی کے سوانح بیان کئے ہیں - تیسرے باب میں مؤلف نے ان خدمات کا ذکر کیا ہے ، جو انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ایام میں پٹنہ میں انجام دیں - چوتھے باب میں انہوں نے اپنے سفر کے احوال و کوائف بیان کئے ہیں - وہ ۱۸۶۶ء میں دارجلنگ ، شملہ ، دہلی ، آگرہ ، کانپور ، لکھنؤ اور بنارس گئے تھے - پانچویں باب میں پینتالیس کارآمد نصیحتیں لکھی ہیں -

مؤلف کی خدمات کے اعتراف میں انگریز حکام نے مراسلات یا نگارشات بھیجیں - مؤلف نے ان کی نقول انگریزی میں مندرج کی ہیں اور فارسی میں ان کے ترجمے بھی پیش کئے ہیں -

اس کتاب کا تیسرا اور چوتھا باب اہم ہے - تیسرے باب میں انہوں نے اپنے مشاہدے کی بنا پر ان اسباب کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آغاز ہؤا - اگرچہ یہ حکومت کے ایک وفادار کا بیان ہے لیکن چونکہ حقائق پر مبنی ہے ، اس لئے یادداشت کے قابل ہے - مصنف کا خیال ہے کہ سپاہیوں کی نادانی اور

عاقبت نااندیشی کی وجہ سے یہ بغاوت شروع ہوئی - پھر عوام میں بدظنی کا باعث بنی اور آخر میں وسیع پیمانے پر وطن کی آزادی کے لئے جنگ کی صورت اختیار کرگئی -

سب سے پہلا سبب یہ ہوا کہ ہندوستانی سپاہیوں نے نیا کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا - نیا کارتوس نسبتاً لمبا اور باریک تھا اور اس کے اوپر چربی لگی ہوئی تھی تاکہ آسانی سے بندوق کی نالی میں چلا جائے - چربی کے متعلق یہ شبہہ ہوا کہ یہ گائے کی چربی ہے - اس اعتراض کے بعد حکومت کی طرف سے کلکتہ کے نزدیک دمدمہ میں یہیں کے لوگوں کی اعانت سے نئے کارتوس بنائے گئے - لیکن برہمن اور راجپوت سپاہیوں نے اس کے استعمال پر شبہات کا اظہار کیا - پھر حکومت نے چاہا کہ سپاہی کارتوس کا مسالہ خود خریدیں اور اپنے ہاتھ سے بنائیں اور جس قسم کا روغن یا چربی چاہیں استعمال کریں - لیکن سپاہی اپنی نادانی سے اس پر بھی آمادہ نہ ہوئے - اس پر ایک دو جگہ حکومت نے سختی سے کام لیا - اجتماعی نافرمانی کا آغاز برہم پور میں کمپنی نمبر ۱۹ کی نافرمانی سے شروع ہوا - حکومت نے ان سے ہتھیار چھین لئے اور ان کی باقی ماندہ تنخواہ دے کر بیوی بچوں کے ہمراہ دریائے ہگلی کے پار جانے کا حکم دیا - لیکن ایک سپاہی منگل پانڈے نے انگریز افسروں کی خونریزی کے لئے ہاتھ بڑھایا - بارکپور میں مقیم رجمنٹ نمبر ۳۴ اور اس کے دیسی افسروں نے ان کو نہ روکا اور اس طرح دوسروں کے اکسانے پر یہ بغاوت عام پھیل گئی -

دوسرا سبب جس سے انگریز حکومت کے خلاف مذہب میں دخل اندازی کا جواز پیدا ہوا ، اس قانون کا نفاذ تھا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ جو شخص مذہب تبدیل کرتا ہے وہ اپنے ورثے سے محروم نہیں ہوتا -

تیسرا سبب یہ ہوا کہ چند عیسائی پادریوں نے مباحثہ کے لئے چند سوالات ہندوستان میں بھیجے تھے - لوگوں نے خیال کیا کہ یہ بھی انگریزی حکومت کی شہ پر ہو رہا ہے اور ہندوستانیوں کو مذہب سے منحرف کرنے کی چال ہے - ۱۸۵۵ء میں لفٹننٹ گورنر کی طرف سے ایک اعلامیہ جاری ہوا جس میں یقین دلایا گیا کہ حکومت رعایا کے مذہب سے تعرّض نہیں کرنا چاہتی -

چوتھے باب کی اہمیت یہ ہے کہ مصنف نے ۱۸۶۶ء میں جن شہروں ، تاریخی عمارتوں ، مقبروں اور سیرگاہوں کو دیکھا ، ان کے متعلق جن تاثرات و مشاہدات کو

تذکرہ نگاروں نے عموماً اولیاء کے شجرہ ہائے طریقت قلمبند کر لئے تھے ۔ مشائخ خود بھی نسبی شرافت و نجابت ثابت کرنے کے لئے نسب ناموں کو محفوظ کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کے مربد نسب ناموں کو منظوم کرتے تھے تاکہ آسانی سے یاد رکھے جا سکیں ۔ صوفیہٗ متقدمین کے نسب نامے تو آسان تھے کہ آٹھ دس پشتوں کے بعد ان کا سلسلہٗ نسب رسول اکرمؐ یا ان کی اولاد ، صحابہٗ کرامؓ یا ائمہ عظامؒ تک پہنچ جاتا تھا ۔ بعدِ زمانہ کے ساتھ بعد میں بُعدِ نسب بھی ہوتا گیا اور رشتے کی کڑیوں کو جوڑنا مشکل کام ہوگیا ۔ ان تذکرہ نویسوں اور انساب نگاروں کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں ، جنھوں نے اولیائے کرام کے نسب ناموں کو محفوظ کیا تاکہ ان کے شجرہ ہائے نسب و طریقت میں کسی کو شک و گمان نہ ہو ۔ ویسے نفسیاتی طور پر بھی رسولِ خداؐ سے نسبی رشتہ تقدیس و تحریم کا باعث ہوتا ہے ۔

۱۔ کنزالانساب

زیرِ بحث دور میں انسابِ مشائخ پر ایک اہم کتاب بعنوان 'کنزالانساب' مرتّب ہوئی ، جس کے مؤلف عطا حسین بن سید سلطان احمد ہیں ۔ وہ ۱۸۱۶ء/۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے سات سال سے چودہ سال تک اپنے چچا شاہ مراد علی سے تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ پانچ سال تک اپنے دادا شاہ غلام حسین کے پاس رہ کر سلسلہٗ چشتیہ خضرویہ منعمیہ میں بیعت کی ۔ ۲۸ سال کی عمر میں پانچ سال تک سفر کیا مکہ و مدینہ کی زیارت کی ۔ ۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ میں ۳۳ سال کی عمر میں صاحب گنج میں مقیم ہوئے ۔ ۴۳ سال وہاں گزارے ۔ 'کنزالانساب' کی تالیف سے پہلے وہ مندرجہ ذیل تصانیف لکھ چکے تھے :

'دوازدہ مجلس و مولود' ۔ 'کراماتِ غوثیہ' ۔ 'انوارِ قطبیہ' ۔ 'لمعات فریدیہ' ۔ 'فیضِ نظامیہ' ۔'اسرارِ نقشبندیہ' ۔ 'چہار ملفوظِ بزرگان' ۔ 'چہار مثنوی' ۔ 'سرِ حق' ۔ 'گنجینۂ اولیا' ۔'افسانۂ دلپذیر' ۔ 'سیر عطا' ۔ 'دیوانِ فارسی' ۔ 'دیوانِ اردو' ۔ 'دقیقة السالکین' ۔ 'کیفیت العارفین' ۔ 'حقیقت العارفین' ۔ 'چہار مولود صدیقیہ و فاروقیہ' ۔ 'عثمانیہ' ۔ 'مرتضویہ' ۔ 'تذکرۃ الشہادتین' ۔ 'فوائدِ کبیریہ در معالجات' ۔

'کنزالانساب' کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ مصنف نے برِصغیر پاک و ہند کے تقریباً اکثر صوفیہٗ عظام کے نسب ناموں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ سادات عالی نسب

میں سے کون سا شخص کس شہر یا بستی میں آیا اور مقیم ہوا - پھر آگے اس کی اولاد کے سلسلے شہروں میں پھیل گئے - کتاب کے شروع میں حضرت رسالت مآب ، ان کے آباء و اجداد ، ازواج و اولاد کا مختصر ذکر کیا ہے - اس کے بعد حضرت علی کی اس اولاد کا ذکر کیا ہے جو غیر بتول سے ہوئی ، یعنی محمد حنیف بن علی - پھر بتایا ہے کہ برِ صغیر میں سید مسعود غازی اور خواجہ احمد یسوی کا سلسلۂ نسب ان سے ملتا ہے - دوسرے بیٹے عمر بن علی تھے - مصنف لکھتے ہیں کہ حافظ یعقوب کا رشتہ ان سے جڑتا ہے -

اسی طریق پر مصنف نے دوسرے عظیم سادات اور ان کی اولاد کا ذکر کرکے بتایا ہے کہ ان کی اولاد کے سلسلے برِصغیر میں کس کس شخص کے توسط سے یہاں پہنچے -

عبداللہ بن جعفر طیار کی اولاد میں سے امیر عطاء اللہ یہاں آئے اور پھلواری ضلع پٹنہ میں مقیم ہوئے - بہت سے علماء و مشائخ کی نسبت ان سے ہے -

قطب الدین بینادل ، میر سید علی قادری دہلوی ، سید عبدالرسول قادری دانا پوری ، سید قمیص قادری ، سید علی قادری ، سید حسین جموی کا نسب نامہ حضرت حسن مثنیٰ بن امام حسن مجتبیٰ سے جا ملتا ہے -

یہی حسن مثنیٰ حضرت غوث الثقلین کے جدِ اعلیٰ تھے - حضرت غوث کے تین بیٹے ہوئے : سیف الدین ، عبدالوہاب ، عبدالعزیز - ان تینوں سے آگے تین سلسلے رزاقیہ قادریہ ، وہابیہ قادریہ اور عزیزیہ قادریہ شروع ہوئے -

امام حسین کی اولاد میں سے علی زین العابدین کا سلسلۂ نسب آگے چلا - ان کے تین بیٹے (۱) محمد (۲) عبداللہ باہر (۳) ابوالحسین زید شہید رابع ہوئے - اور ان سے باہری ، زیدی اور حسینی سلسلے چلے - پاک و ہند کے اولیا میں سے محمد پیر دمڑیا ، سید محمد سہروردی ، سید شاہ یحییٰ ، سید محمد گیسو دراز ، اور سید ابوالحسین ، حضرت زید سے نسبت رکھتے تھے -

امام محمد باقر کے ہاں فردہ بنت قاسم بن محمد بن صدیق اکبر کے بطن سے چار بیٹے ہوئے ، امام جعفر صادق ، عبداللہ کتب الکریم ، اسماعیل اور ابراہیم - اسماعیل کی اولاد میں سے ایک صاحب خواجہ حسن متھرا کے موضع دیوتانہ میں مقیم ہوئے ، وہیں شادی کی - پھر ان کی اولاد دوسرے شہروں میں پھیل گئی - عبداللہ کے دو بیٹے تھے : سید ہاشم اور

سید حبیب اللہ ۔ مؤلفِ کتاب نے اپنا نسب سید ہاشم سے ملایا ہے ۔ سید حبیب اللہ کی اولاد میں سے سید عبدالقاسم سفر کرتے ہوئے دہلی آئے ۔ وہاں سے ان کی اولاد جونپور ، فریدپور اور دوسرے شہروں میں پھیل گئی ۔ حضرت امام جعفر صادقؒ کے مندرجہ ذیل بیٹے تھے ۔

حضرت موسیٰ کاظمؒ ۔ اسماعیل ۔ اسحاق ۔ محمد ۔ عباس ۔ علی ۔

حضرتِ غوث الثقلین کا نسب نامہ مادری محمد بن جعفر حضرت صادقؒ سے جا ملتا ہے ۔ حضرت شہاب الدینؒ سہروردی کا نسب نامہ مادری اسحاق بن جعفر صادقؒ سے ، حضرت معین الدینؒ چشتی کا نسب نامہ مادری اسماعیل بن جعفر صادقؒ سے ، علی بن احمد صابرؒ کا نسب نامہ محمد بن جعفر صادقؒ سے جا ملتا ہے ۔ فرید الدین عطارؒ ، مخدوم بدر عالم ، اشرف جہانگیرؒ اور سید علی ہمدانیؒ کا نسب نامہ اسماعیل بن امام جعفر صادقؒ سے جا ملتا ہے ۔

سید نظام الدین بدادونیؒ ، حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ ، خواجہ قطب الدین مودودؒ چشتی ، خواجہ محمد بہاء الدینؒ نقشبندی کے سلسلہ ہائے نسب امام محمد تقیؒ تک بیان کئے ہیں ۔

خلفائے راشدینؓ میں سے ابوبکر صدیقؓ ، عمر خطابؓ اور عثمان غنیؓ سے نسبت رکھنے والے اولیاء اللہ کے نسبی رشتے بھی بیان کئے گئے ہیں ۔ مثلاً مخدوم حسام الدین جالبی کا رشتہ نسب محمد بن ابوبکرؓ سے ، مسعود فریدؒ گنجشکر اور حسام الدین مانکپوری کا رشتہ عبداللہ بن عمرؓ سے اور جلال الدین کبیر الاولیاء ، عبیداللہ احرار ، امام محمد تاج فقیہ کا عمر بن عثمانؓ غنی سے ملایا ہے ۔ صوبہ بہار کے قصبوں منیر ، موڑوی اور دانا پور کے مشائخ مؤخرالذکر یعنی امام محمد تاج فقیہ کی اولاد میں سے تھے ۔ مؤلف نے کتاب کی تالیف میں انساب کی مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا ہے ۔

'بحرالانساب' ۔ ذکر اولاد دوازدہ امام ۔

'احتساب الانساب' ۔ ذکر اولیائے متقدمین ۔

'نسب نامہ' از شاہ وحید الدین احمد ۔ ذکر مشائخ متقدمین ۔

'نسب نامہ' بزرگان دین (منظوم) - از مخدوم بخش دانی -

۲- ریاض الانساب

'کنزالانساب' کے علاوہ اس دور کی ایک اور کتاب 'ریاض الانساب' ہے جس میں مذہبِ اثنا عشری کے گیارہ ائمہ[۳] اور ان کی اولاد کے نسب نامے قلمبند کئے گئے ہیں - کتاب کا پورا نام 'ریاض الانساب و مجمع الالقاب معروف بہ بحرالانساب' ہے - اس کے مؤلف مرزا محمد ہیں - کتاب بمبئی میں ۱۹۱۶ء/۱۳۳۵ھ میں شائع ہوئی - کتاب دو جلدوں یا دو حصوں میں ہے - پہلی جلد کے شروع میں خلقتِ آدم[۴] ، حضرتِ نوح[۴] و دیگر انبیاء ، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم اور ان کے احوالِ زندگی ، حضرت رسولِ اکرم صلعم کے چچا اور ان کی اولاد کی تفاصیل چار چمنوں میں بیان کی گئی ہے - اس کے بعد کل کتاب بارہ گلستانوں میں منقسم ہے - پہلے دو گلستان پہلی جلد میں اور باقی دس گلستان دوسری جلد میں شامل ہیں - حضرت علیؓ اور امام حسنؓ کی اولاد پہلی جلد میں اور امام حسینؓ اور ان کے اعقاب کے نسبی سلسلے دوسری جلد میں بیان ہوئے ہیں -

مؤلف نے حضرت علیؓ کی اولاد میں سے حضرات امام حسنؓ و حسینؓ کے نسبی رشتوں کے متعلق تفصیل سے حالات جمع کئے ہیں - اُنہوں نے مصر و مغرب ، عرب ، ایران اور برّصغیر پاک و ہند میں سیّد خاندانوں کے نسبی رشتے معیّن کرنے میں بڑی تحقیق و کاوش کا ثبوت دیا ہے اور اکثر مشہور و معروف تاریخوں ، تذکروں اور رجال و انساب کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے - کتاب صرف نسبوں کی فہرستیں ہی پیش نہیں کرتی بلکہ ائمہ اور ان کے اعقاب کے احوال و سوانحِ زندگی بھی فراہم کرتی ہے - مؤلف نے خاص طور پر مندرجہ ذیل کتابوں کو اپنے مآخذ میں شمار کیا ہے :

'کنزالانساب' ، 'تذکرۂ انساب سمعانی' ، 'عمدہ المطالب فی انساب آل ابیطالب' ، 'شجرہ الانساب' ، 'تذکرۃ السادات' ، 'انساب العرب' ، 'کشف الالتباس فی نسب ابن عباس' ، 'شجرۃ السادات' ، 'کتابِ سبایک الذہب فی نسل قبائل العرب' ، 'صحاح الاخبار فی نسب سادات فاطمیہ' ، 'الثمرۃ الطاہرہ من الشجرہ الزاہرہ' ، 'سبک الذہب فی شک النسب' -

سادات کے شجرہ طیّبہ کی جو شاخیں برّصغیر میں پہنچیں ، مؤلف نے ان کا جابجا تذکرہ کیا ہے - اس طرح یہاں کی سرزمین میں ان سادات کے بقیہ نقیہ خاندانوں کو اپنے

نسبی رشتے تلاش کرنے کے لئے بہت بڑا ماخذ مہیا ہو گیا ہے ۔ اختصار کے ساتھ ہم ان کو یہاں درج کرتے ہیں تاکہ ان کی اہمیت واضح ہو ۔

۱۔ عبدالرحمٰن شجری بن قاسم حسن بن زید بن امام حسنؓ کی اولاد برّصغیر میں آئی ۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے :
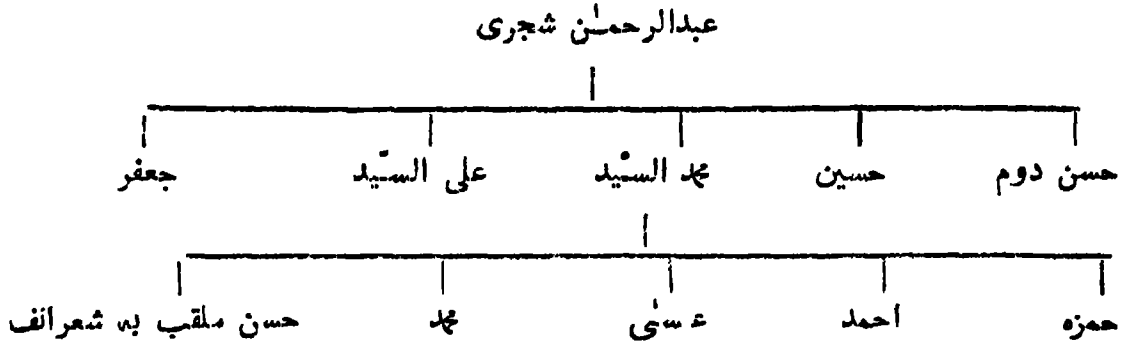
اس شعرانف کی اولاد سندھ و ملتان پہنچی ۔ (ص ۱۱۹)

۲۔ ملتان کے ملک خاندان کا نسبی تعلق ابو سلیمان داؤد بن حسن مثلث بن حضرت امام حسنؓ سے ملتا ہے ۔ ان کی اولاد میں سے حسین بن حسن محمد بن سلیمان تھے ، جنہوں نے بلادِ ملتان پر قبضہ کیا ۔

۳۔ زید بن علی النقیب جلال الدین اسامہ بن عدنان بن اسامہ ، عراق سے ہجرت کرکے اپنے بھائی ضیاء الدین ابوالقاسم علی کے ہمراہ برّصغیر پاک و ہند میں آئے ۔ جن لوگوں کا نسب نامہ ان سے ملتا ہے وہ ساداتِ رسول دار کہلاتے ہیں ۔

۴۔ سادات بارہہ کا نسب سیّد ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے جو واسط سے سرزمین پاک و ہند میں منتقل ہو گئے ۔ امام حسینؓ تک ان کا نسب نامہ یوں ہے ۔ ابوالفرج بن سید علی عراق بن حسین بن علی بن محمد بن محمد بن زید بن عیسٰی بن زید شہید بن علی بن حسینؓ ۔

۵۔ سادات مرعشی کا نام سید علی المرعش بن عبداللہ بن محمد الاکبر بن حسن بن حسین الاصغر بن زین العابدینؓ سے منسوب ہے ۔ سلطان کا داماد اور اس کا بھائی سیّد فاضلی میر قوام الدین عہدِ عالمگیر میں اس سرزمین میں آئے ۔ ان کا بیٹا صف شکن اور

دوسرا بیٹا امیر کبیر شمس الدین مخاطب بہ مخلص خان تھا ۔ پھر ان کی اولاد آگے چلی ۔

۶۔ **سادات شہر ٹھٹھہ** ۔ بنو مدائن میں سے جو لوگ حلّہ و سوراء میں مقیم تھے ، ان میں سے حافظ الدین احمد بن جلال الدین عبداللہ مداینی نے برّ صغیر پاک و ہند کی طرف سفر کیا ۔ وہ سمندر میں ڈوب گئے ۔ ان کی کنیز کی اولاد شہر ٹھٹھہ میں آباد ہوئی ۔

۷۔ سلطان محمد شاہ (آغا خان) پیشوائے اسماعیلیان کا نسب اسماعیل بن جعفرالصادقؑ سے ملتا ہے ۔ مصنف نے پورا شجرہ نقل کیا ہے (ص ۱۳۸ - ۱۳۹) ۔ انہی اسماعیل بن جعفرالصادقؑ کی اولاد میں سے سادات شمسی تھے جو سبزوار سے ہجرت کرکے ملتان میں مقیم ہوئے اور انہوں نے مذہبِ اسماعیلیہ کو رواج دیا ۔ ان کے جدِ امجد سیّد شمس الدین بن سلام الدین بن مؤمن شاہ بن خالد بن عبدالجبار بن منصور بن مسافر بن امام الدین بن نور محمد بن اسماعیل بن جعفرؑ تھے ۔ آج تک پنجاب ، سندھ اور کشمیر میں ان کی اولاد اور سجادہ نشینوں کی اڑتالیس خانقاہیں موجود ہیں ۔ ان میں سے پنجاب کی مندرجہ ذیل خانقاہیں مشہور ہیں ۔

کوٹلی میں پیر ثابت علی شاہ ، شکر گڑھ میں سیّد ثابت علی شاہ ، بھسین نواحِ لاہور میں سید پیر محمد شاہ ، محمود بوٹی باغ شالا مار کے نزدیک سید شاہ علی گوہر ، نارووال میں شاہ قمر ولی اور سید شاہ کمال کی خانقاہیں اور مزار موجود ہیں ۔

۸۔ **سادات رضوی و نقوی** کا نسب موسیٰ مبرقع بن امام علیؑ التقی تک پہنچتا ہے ۔ ان کی اولاد و اعقاب میں سے میر امان اللہ سامانہ میں ، سید مخدوم شاہ کی اولاد زید پور ، چیتاپور ، دہرپور از مضافات خیر آباد ضلع دہلی میں مقیم ہوئی ۔ کشمیر کے ساداتِ رضوی کا نسب بھی موسیٰ مبرقع تک پہنچتا ہے ۔

۹۔ ملتان ، لاہور ، دہلی اور بلوچستان کے سادات بخاری کے جدّ اعلیٰ سید جلال بن حسن بن سید علی بن جعفر بن محمد بن محمود بن احمد بن عبداللہ بن علی بن جعفر کذاب بن علی التقی ، عراق سے بخارا گئے ۔ وہاں سے کابل اور پھر کابل سے پاک و ہند میں آ گئے ۔ بخارا میں رہنے کی وجہ سے ان میں بعض اہلِ تسنّن کے مشرب پر مائل ہو گئے ۔

۱۰۔ ملتان کے سادات گردیز ، سید ہارون بن جعفر کذاب بن امام علی التقی کی اولاد میں سے ہیں ۔

۱۱- **سادات حسنی** - رودل ، جنالہ ، بہار ، مانی پور ، فتحپور منعم آباد کے سادات حسنی کا نسب قطب الدین محمد الحسنی مدنی بن محمد بن عبداللہ محض بن حسن مثنیٰ بن امام حسنؓ سے ملتا ہے -

۱۲- ٹھٹھہ ، مالوہ ، بندوارہ ، حسن پور ، حاجی پور ، جونپور کے سادات کا نسب سید محمد فسیح بن عیسیٰ بن حسین بن زید بن زین العابدینؓ تک اور محمد آباد ، رنگی پور ، جونپور اور غازی پور کے سادات حسنی کا نسب موسیٰ خضر بن حمزہ بن جعفر بن حسن اصغر بن عبداللہ باہر بن زین العابدینؓ بن حسینؓ تک پہنچتا ہے -

انساب کے علاوہ مصنف نے دو تین جگہ سادات کے ناموں کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے - مثلاً :

۱- **سادات طباطبائی** وہ ہیں جن کی نسبت ابراہیم طباطبا بن اسماعیل الدیباج بن ابراہیم عمر بن حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسنؓ سے ہے - طباطبائی کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایک مرتبہ باپ نے ابراہیم سے پوچھا - تمہارے لئے پیراہن بناؤں یا قبا ؟ چونکہ ابھی تک وہ مخارج حروف اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے تھے ، اس لئے انہوں نے قباقبا کے بجائے طباطبا کہا - بعد میں اس لقب سے معروف ہو گئے - لیکن بعض اہل علم کا خیال ہے کہ قبطی زبان میں طباطبا سید السادات کو کہتے ہیں -

۲- **سادات نور بخش کشمیر** - محمد بن جعفر بن نوح بن عقیل بن ہادی بن علی بن الحسینؓ ، اپنے بھائی محسن کے ہمراہ کشمیر گئے - ایک رات عبادت میں مشغول تھے کہ ندا آئی - ''اے ہمنام رسول خدا نور بخش بشتاب سوی ما -'' اس وقت سے نور بخش مشہور ہوگئے -

۳- رافضی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جنگ قادسیہ کے موقع پر اہل کوفہ نے زید بن علی بن حسینؓ کے ہاتھ پر بیعت کی - بعد میں بیعت توڑ دی - زید نے ان سے کہا : ''یا قوم رفضتمونی - یعنی اے قوم ترک بیعت نمودید و از راہ بیک طرف افتادید -'' اس بنا پر شیعہ کو رافضی کہنے لگے - (ج ۲ ، ص ۲۱)

متذکرۂ صدر قابل اعتنا دو کتب انساب کے علاوہ اس دور میں انساب و شجرات کے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں تالیف ہوئیں :

۱- 'شجرۃ العارفین' مؤلفہ محمد علی الفت ، مطبوعہ الہ آباد - ۱۸۸۰ء - اس کتاب میں الہ آباد کے شاہ محمد رفیع الزمان کے خاندان کی تفاصیل دی گئی ہیں -

۲- 'شجرۂ طیبہ' - مؤلفہ عبدالسلام رفیق نور پوری ، مطبوعہ لاہور ۱۸۹۹ء - سلسلۂ سہروردیہ کے حضرات رفیقیہ کا نسب نامہ دیا گیا ہے -

۳- 'تحقیق الانساب' مؤلفہ عبدالرزاق کاپانوی ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۵ء -

۴- 'شجرۂ طیبہ' از محمد علی خان - فرخ آباد ۱۸۹۶ء - اس میں حضرت موسیٰ کاظمؑ اور ان کے اخلاف کا تذکرہ ہے -

مناظرے

۱۸۵۷ء کے بعد کچھ لوگوں کو زیادہ ہی آزادی' کسار حاصل ہوئی - ملکہ' وکٹوریہ کے آزادی' مذہب کے اعلامیہ کے بعد مبلغین کو اوی علانیہ اپنا نقطہ' نظر پیش کرنے کا موقع ملا - مسیحیت کے مبلغ دو سرکارِ انگلسیہ کی سہ پر اور بھی بے باک ہوگئے تھے - انہوں نے مسلمانوں کے مذہب کے خلاف کتب و رسائل لکھے - سرِ بازار علمائے دین کے ساتھ مناظرے کئے -

ہندوؤں میں برہمو سماج کی تحریک نے بھی مذہبی آزادی کی لہر پیدا کی - آریہ سماج تحریک نے ہندوؤں کو بھی ہندومت کی تبلیغ کے لئے ابھارا اور شدھی کا ہنگامہ شروع ہؤا - ہندوؤں نے عربی پڑھ کر قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا اور علمائے دین کے مقابل میں مناظرے کے لئے آمادہ ہوئے اور مسلمانوں کی تواریخ و روایات سے خامیاں اور کوتاہیاں نکال کر دینِ اسلام کے خلاف اپنے ہم مشربوں میں ولولہ پیدا کیا - علمائے اسلام نے بھی پورے زور شور سے عیسائی مبلغین اور ہندو فضلاء کے کتب و رسائل کے مسکت جواب لکھے -

مسلمانوں کے اپنے اندر شیعہ و سنی کے اختلافی مسائل چلے آ رہے تھے - نوابانِ اودھ کے عہد میں مسربِ تشیّع کو فروغ ہؤا - اس کا اثر زیرِ بحث دور میں بھی رہا - اہلِ سنت اور اہل تشیّع کے درمیان نزاعی مسائل پر کتب و رسائل تالیف ہوتے رہے -

اس دور میں مسلمانوں کے اندر احمدیت کا نیا فرقہ وجود میں آیا - غلام احمد قادیانی نے مسیحِ موعود اور نبی ہونے کا دعویٰ کیا - ان کے خلاف بھی بہت سے تبلیغی جلسے ہوئے اور کتب و رسائل لکھے گئے -

اگرچہ اردو زبان ملک کے طول و عرض میں رواج پا رہی تھی اور اس زبان میں شعراء و ادبا کی کمی نہیں تھی، پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کو ابھی تک ایسا مقام حاصل تھا کہ علمی حلقوں میں اسے خاصی وقعت حاصل تھی۔ چنانچہ ایک ہندو عالم اندرمن مصنف 'تحفۃ الاسلام' نے اپنی کتاب کے دیباچے میں فارسی زبان میں کتاب لکھنے کی وجہ اس طرح بیان کی:

"منظورِ خاطرم بود کہ این رسالہ بزبانِ اردو ترتیب دادہ آید تا ساکنانِ این دیار بآسانی از تعقّل و تفہّم مضامینِ متینش حظِ وافر بردارند۔ لیکن چون زبانِ اردو اکثری از ہندیان مثلِ اہلِ دکن و اہلِ پنجاب و اہلِ بنگالہ و مانندِ آن بہ سہولت نمی فہمند بنابرین تحریرش در عبارتِ فارسی مناسب افتاد کہ در اکثر ممالکِ ہند شیوع دارد۔"

اس تمہید کے بعد ہم مناظرے کی ان کتابوں کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں تا کہ ادبیاتِ فارسی کا یہ گوشہ بھی واضح ہو جائے اور ساتھ ہی اس دور میں مباحثِ مذہبی اور مسائلِ نزاعی میں علماء کا کردار روشن ہو جائے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مناظرے

ہندوؤں کی طرف سے فارسی زبان میں کرپا رام کی کتاب 'مدینۃ التحقیق' اور اندرمن کی کتاب 'تحفۃ الاسلام' شائع ہوئی۔ مسلمانوں کی طرف سے مؤخرالذکر کتاب کے جواب میں 'خلعت الہنود' ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اپنا قلمی نام بت شکن رکھا تھا۔ ان کتابوں سے ظاہر ہے کہ دونوں قوموں کے علماء کو ایک دوسرے سے دینی علوم پڑھنے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ ہندوؤں نے عربی سیکھی اور مسلمانوں نے سنسکرت پڑھی اور اس طرح وہ پوری تیاری سے ایک دوسرے کے اعتراضات کے جوابات دینے کے لئے مستعد ہوئے۔

'خلعت الہنود' کے مندرجہ ذیل اقتباس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہندوؤں کی طرف سے کس قسم کے اعتراضات کئے جاتے تھے اور انہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علمائے اسلام نے ان کے مدلّل جوابات دینے میں کس نوعیّت کا استدلال کیا ہوگا۔ اس قسم کے

اعتراضات پر جوابی اعتراض بھی کئے جاتے تھے یا معترضین کی کتابوں سے اسی قسم کے واقعات کی نشاندہی کر کے ان کے دلایل کاٹے جاتے تھے:

''در قرآن نسبتِ اغوا بغیر است ، پس معلوم شد کہ قدرت او تعالیٰ منحصر در خیر است و اگر خدای عالی عالمِ ازلی است ، آزمودنِ بندگان چیست ؟ قدوس را نباید سحر الله فرماید و اذنِ مباشرت زنان در شبہائی رمضان دہد و صحبتِ کنیزان باوجودِ حیاتِ شوہران ایشان روا گرداند و خود را بایجاد خیر و شر وصف کند و فاش گوید کہ ہدایت و اضلال در اختیارِ من است و شیطان را من مہلت دادہ ام ـ چہ این ہمہ امور از تقدّس دور است ـ اگر غیر متغیّر است نسخ چرا کرد ـ اگر صادق است ، اجازت سوگند شکنی چرا داد ـ اگر قدیم است برای خود دست و روی چرا ثابت کردہ است ـ اگر عادل است ، در قرآن چرا گفت کہ ہر کرا خواہم بہ بخشم و ہر کرا خواہم بگیرم ـ عقیدۂ مسلمانان آنست کہ ہمہ پیغمبران از شرک و گناہ پاکند ، حال آنکہ آدم باغوای شیطان دانہ گندم خورد و ابراہیم سہ بار دروغ گفت ـ یوسف قصدِ زلیخا کرد ـ موسیٰ قبطی را بی گناہ کشت ـ خضر کشتی شکست ـ اگر خدا رحیم بودی ، ذبحِ جانوران را روا نفرمودی ـ فرشتگان را معصوم شمردن چگونہ روا باشد حالانکہ ہاروت و ماروت فسق و فجور کردند '' وغیرہ ـ

مصنف نے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا ہے ـ پہلے اندرمن کے نام پر سوال لکھا ہے ، پھر بت شکن کے نام سے جواب تحریر کیا ہے ـ

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مناظرے

عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب میں رحمت اللہ نے ایک مفصل کتاب 'ازالۃ الاوہام' کے نام سے لکھی جو مطبعِ سیّد المطابع ، شاہجہان آباد میں ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی ـ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے ـ دوسرے باب میں دو فصلیں ہیں ـ باقی ابواب میں تین تین فصلیں ہیں ـ عیسائیوں کی طرف سے مندرجۂ ذیل موضوعات پر اعتراض

کئے جاتے تھے :

"نسخ تورین و انجیل ، شق القمر ، پردۂ زنان ، وجود جنات ، جوازِ طلاق ، خالقِ شر بودنِ خدا ، ہدایت و اضلال بسوی خدا ، تخالفِ آیات قرآنی باعتبارِ نسخ ، اثباتِ بے اعتباری احادیث ، بخششِ گناہ از توبہ ۔"

رسول اکرم کے خلاف اعتراضات : کثرتِ ازدواج ، نکاحِ زینب ، ماریہ قبطیہ ، عدم معجزۂ رسول ، نبودن طاقت پیشگوئی در آنحضرت ، طرفداری کردن در کلام آنحضرت ۔"

مصنف نے ان اعتراضات کے جوابات دینے کے علاوہ مندرجہ ذیل موضوعات پر عالمانہ بحث کی ہے :

اثباتِ انسانیت و نبوت ، وحدانیت و صفاتِ الٰہیہ ، تاویل در کلامِ خداوندی ، تثلیث و توحید ، الوہیت و انسانیتِ مسیح ، ابطالِ ادلہ الوہیت مسیح ، اثباتِ نبوت آنحضرت از صحفِ انبیاء ، تحقیقِ الفاظ روح الحق و روح اللہ ۔

مسیحیت اور اسلام کے نزاعی مسائل کے متعلق ایک اور معرکۃ الآرا کتاب 'مباحثہ مذہبی' کے نام سے ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ میں اکبرآباد سے شائع ہوئی ۔ کتاب پہلے اردو میں تھی ، پھر سید عبداللہ اکبر آبادی نے اسے فارسی میں لکھا ۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے ؛ پہلے حصے میں مولوی رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے درمیان سرِ عام مناظرے کی روداد ہے ۔ اس میں صرف نسخ و تحریفِ انجیل کے موضوع پر بحث ہوئی اور مباحثہ ختم ہوگیا ۔ دوسرے حصے میں پادری فنڈر اور ڈاکٹر محمد وزیر خان کے علمی مناظرے کی روداد ہے ۔ مناظرین نے خطوں میں ایک دوسرے پر اعتراض کیے ہیں اور پھر جواب لکھے ہیں ۔ ان خطوط میں خاص موضوع کی قید نہیں رہی ۔ بات سے بات بڑھتی گئی ہے ۔ آخر میں پادری نے خط لکھنا بند کر دیا تو ڈاکٹر صاحب نے پادری صاحب کے اعتراضات کو "قولہ" لکھ کر اور اپنے جوابات کو "اقول" کہہ کر شروع کیا ۔ اکثر زیرِ بحث موضوع تحریفِ اناجیل ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے یونانی ، لاطینی ، فرانسیسی اور عبرانی و انگریزی کتابوں کے حوالے دیے

ہیں ۔ عیسائیت کے خلاف ایک کتاب عربی میں لکھی گئی جس کا فارسی ترجمہ نصرت علی خاں نے ''معیار'' کے نام سے دہلی میں شائع کیا ۔

اہلِ سنت و اہلِ تشیّع کے مناظرے

حافظ غلام حلیم المشتہر بہ شاہ عبدالعزیزؒ کی مشہور کتاب 'تحفہ' اثنا عشریہ' کے جواب میں مندرجہ ذیل کتابیں لکھی گئیں :

'جواہر عبقریہ فی رد تحفہ' اثنا عشریہ' از سید عباس ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ ۔

'نزہۃ اثنا عشریہ' از مرزا محمد کامل ، مطبوعہ ۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ ۔

'طبقات الانوار فی امامۃ الائمۃ الاطہار' ۴ جلد ، مؤلفہ سید حامد حسین ۔ لکھنؤ ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ ۔

'تشیید المطاعن و کشف الصفائن' از محمد قلی خان ، ۲ جلد ، مطبوعہ ۱۸۶۵ء/۱۲۸۲ھ ۔

'تحفہ' دستگیریہ جواب اثنا عشریہ' از غلام دستگیر ہاشمی قریشی ، ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ ۔

سید دلدار علی مجتہد اول نے مندرجہ ذیل چھ رسالے لکھے :

'صوارم الالٰہیات' ، 'حسام الاسلام' ، 'احیاء السنۃ' ، 'ذوالفقار' ، 'خاتمہ' کتاب صوارم' ، 'رسالہ' غیبت' ۔ 'مثنوی دمغ الباطل' تصنیف امام بخش صہبائی ، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ کے جواب میں سید محمد عباس نے 'مثنوی خطابِ فاعل' لکھی جو مطبع البحرین لودھیانہ میں ۱۸۶۹ء/۲۸۶ ؛ ھ میں شائع ہوئی ۔

اہلِ تشیّع کی حمایت میں ایک کتاب بعنوان 'ازالۃ العلہ و اراحۃ الاختلاف ملقب بہ جوابِ باصواب' ۱۸۷۸ء/۱۲۹۶ھ میں عظیم آباد سے شائع ہوئی ۔ اس کے مصنف سید علی محمد شاد ہیں ۔ یہ کتاب 'ایک رسالہ مسمی بہ اثبات الخلافہ بالقرآن و اسکات المنکری بالبرہان' کے جواب میں لکھی گئی ۔ کتاب دو ابواب میں منقسم ہے ۔ موضوعِ سخن و بحث متعہ' زنان اور غصبِ خلافت و امامت ہے ۔

اہلِ تشیع کی طرف سے ایک اور جامع کتاب بعنوان 'استقصاء الافحام و استیفاء الانتقام' ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ۔ اس کے مصنف سید حامد حسین ہیں ۔

اہلِ سنت کی احادیث و روایات کی جرح و قدح کی ہے۔ اہلِ تشیع و اہلِ تسنن کے مابہ النزاع بنیادی مسائل مندرجہ ذیل ہیں :

تفضیلِ علیؓ بر صحابہؓ ثلاثہ ، تفضیلِ اہلِ بیت ، عصمت ائمہ ، غصبِ خلافت ، مسئلہ فدک ، متعہؑ زنان ، تعیینِ حضرت علیؓ از حیث وصی و خلیفہ ، تقیہ ۔

مسلمانوں اور احمدیوں میں مناظرے

عقایدِ احمدیہ کے خلاف فارسی میں صرف ایک جامع مبسوط کتاب بعنوان 'غایۃ المقصود' چار حصوں میں لکھی گئی ۔ اس کے مصنف اہلِ تشیع کے مشہور عالم ابوتراب علی حائری ہیں ۔ کتاب ۱۸۹۹ء میں لاہور سے شایع ہوئی ۔ بنیادی نزاعی مسئلہ ختمِ نبوت اور ختمِ وحی ہے ۔

فنون

مسلمانوں نے برصغیر کو علم و حکمت کے خزانوں سے مالا مال کیا ۔ لوگوں کے اخلاق و عادات کو سنوارا ۔ نئی قسم کی بزم آرائیوں اور جشنوں سے آشنا کیا ۔ ان کے رہن سہن اور گفتار و کردار کو متاثر کیا ۔ ان کے کام و دہن کو لذتوں سے آشنا کرنے کے لئے گوناگوں کھانے مہیا کئے ۔ ہمارے مصنفین بھی اس طرف سے غافل نہیں رہے ۔ انہوں نے کتابیں مدون کیں اور ان میں نئی نئی قسم کی غذاؤں کے اجزائے ترکیبی اور ان کے بنانے کے طریقے بیان کئے تاکہ دوسرے بھی خود پکا کر ان سے لذت اندوز ہو سکیں ۔ اس قسم کی ایک کتاب 'خوانِ نعمت' ہے جو ۱۸۷۹ء میں مطبعِ نولکشور کی طرف سے شائع ہوئی ۔ یہ کھانے نواب قاسم علی خان بہادر قیام جنگ کے مطبخِ خاص میں تیار ہؤا کرتے تھے ۔ چاولوں میں یخنی پلاؤ ، مزعفر پلاؤ ، مطنجن پلاؤ ، گوشت میں کبابِ خطائی ، کبابِ مرغ ، کبابِ ماہی ، روٹی میں شیر مال ، نانِ تافتان ، نانِ خطائی اور باقر خوانی ، شیرینی میں نور بادام اور حلوائے زردک —— مربّوں میں مربّائے انبہ اور مربائے سیب ۔ ترشیوں میں اچار لیموں و چٹنی قابلِ ذکر ہیں ۔ یہ سب چیزیں دسترخوان کی زینت ہؤا کرتی تھیں ۔

'خوانِ نعمت' کے ساتھ ایک اور کتاب 'شکرستانِ خیال' کے نام سے شائع ہوئی ۔ اس کے مصنف ذوق بلگرامی ہیں جنہوں نے تخلص کی مناسبت سے شیرینیؑ سخن و دہن

کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے فصیح و بلیغ اشعار میں ان تمام شیرینیوں کا ذکر کیا ہے جو عموماً عوام میں مرغوب تھیں اور خاص طور از مصنف تو ان پر دل و جان سے فدا تھے۔ کتاب میں مذکورہ مٹھائیوں، میٹھی چیزوں اور میٹھے پکوانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ کیا کیا مزے لے کر متنوع شیرینیاں بناتے تھے اور زندگی کی بھرپور لذتوں سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ کیسی کیسی چاشنیوں کا اہتمام کرتے تھے۔ بعض ایسی چیزیں ہیں جو آج کل پاکستانی علاقوں میں رائج نہیں۔ مثلاً چوبہ، کافوریان، قلیہ، ماٹھ، حلوائے مقراضی، شکربورہ، جھنجلہ، پواد وغیرہ۔

بعض ایسے کھانے اور مٹھائیاں ہیں جو مسلم اور غیر مسلم دونوں میں مقبول ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ مثلاً حلوائے نجیب اللہ، حلوائے سیف اللہ۔ اب دوق کی زبانی ان تمام شیرینیوں کی تعریف سنیے اور اس کے ذوق شیرینی کے ساتھ اس کے ذوق سخن کی داد دیجئے:

قیمۂ چوبہ کجا و من خراب کجا	ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
دل شتابی میکند حلوا و نان قسمت کنند	زینہار ای دوستان جان من و جان شما
ماٹھ برخوانیم می بینند یاران ماٹھ نیست	آفتابی جلوہ گر شد در لباس مہتاب
صبحدم چون بسم آوردند حلوای نجیب	قال قلبی ایہا المشتاق قد جاء الحبیب
غرض ز موسم برسات اولہ و پوریند	وگرنہ انہمہ تمہید ابر و باران چیست
ہمیں بتاشہ ز محبوب برگزیدۂ ماست	چو قند قوت دل و جان و نور دیدۂ ماست
لذت خوردن جغرات و رساول بخدا	خوش بود ایہمہ درموسم سرما و دم صبح
من ازدن حلوائے مقراض نبودم آشنا	ہادیٔ این نعمت اکنون شیخ سیف اللہ شد
بند بندم نسکر شد در خیال نیشکر	چیست آخر اینکہ میجویم وصال نیشکر
بفرض قند سیہ کی رسد اگرچہ نبات	معزز آمد و با امتیاز در جمہور
دل از نزاکت فرنی ست آنچنان محظوظ	کہ از لطافت فالودہ است جان محظوظ
بمدح کھاجا یقین دان کرشمہ ای باشد	ہزار نسخہ اگر طبع من کند تصنیف
چہ نعمت است اگر قلیہ چاشنی دار است	کہ باشد از ہمہ شایان انتخاب ہمین
صدر نشین ہمہ شاہد کافوریان	غیرت موزون قدان قامت با شان او
بوندی و گنتۂ قنوج بیادم آمد	شب بچرخ انجم و مہ را چو تماشا کردم

مسلمانوں نے ہندوؤں کے دال بھات اور روٹی شکر کے ساتھ کبھی دل سے سمجھوتا نہیں کیا۔ چنانچہ ذوقی لکھتے ہیں . . . :

خشکہ چون دید روی دال بگفت زینہار از قرینِ بد زنہار
شکر از نانِ گرم می گوید وقنا ربّنا عذاب النار

تراجم

اگرچہ اس دور میں اردو انگریزی دونوں زبانیں اچھی خاصی مقبول ہو چکی تھیں اور سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتی تھیں، چنانچہ غیر زبانوں سے اور خاص طور پر انگریزی سے اردو میں بہت سے ترجمے ہوئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً انیسویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں فارسی بھی گنتی شمار میں آتی تھی۔ اس لئے اکاً دکاً عربی سے فارسی ترجمے ہوتے رہے۔ تراجم کے موضوعات اکثر و بیشتر اخلاق و حکمت اور سیرت و تاریخ سے متعلق رہے ہیں۔ تراجم سے غایت و مقصود استفادہ و تبلیغ تھا۔

اخلاق کے موضوع پر عبد الرحمٰن خان کابانی نے 'کنزالاخلاق لاہل الآفاق' کا ترجمہ کیا جو مراد آباد میں ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔

سیرت کے موضوع پر دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں :

'زبدۃ الاسرار' مصنفہ عبد الحق دہلوی کا ترجمہ ابو محمد امانت خان نے کیا، جو دہلی سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے ترجمہ شدہ حصوں کا موضوع حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے احوال و تعلیمات ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اقوال و احکام کے متعلق فیض محمد خان نے 'فیض المحمدی' کے نام سے ۱۸۷۰ء میں کتاب شائع کی۔ کتاب میں عربی کے ساتھ ساتھ فارسی ترجمہ دیا گیا ہے۔

حکیم آصف بن برخیا کی نامعروف عربی تصنیف کا فارسی ترجمہ تعجب انگیز ہے۔ اس کتاب کا موضوع سحر و ساحری ہے۔ یہ ترجمہ محمد بن سعد (ابنِ ساوجی) نے 'اساطیر الاولین' کے عنوان سے ۱۸۹۲ء میں بمبئی سے شائع کیا۔

علوم

ذریعۂ تدریس کی حیثیت سے تقریباً فارسی کا استعمال ختم ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود فارسی سخت جان تھی کہ اس دور میں علوم پر فارسی میں کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔ حیدرآباد دکن میں ایک ریاضی داں حافظ احمد بن محمد معربی انصاری تھے جنھوں نے علم الحساب پر مندرجہ ذیل کتابیں تالیف کیں:

'علم الحساب'، مرآۃ العالم' اور 'زبدۃ الحساب' جو ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ میں شائع ہوئی۔

ایک اور صاحب ماہر ریاضی ابوالحسن ارجمند ساوجی تھے جن کی دو کتابیں 'حساب علمی و عملی' اور 'الجبرا' ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ میں لاہور سے شائع ہوئیں۔

علمِ رمل پر ایک مبسوط کتاب 'اسرار النکات' کے نام سے مرزا محمد بن محمد رفیع نے لکھی اور ۱۸۹۳ء میں بمبئی سے شائع کی۔

علمِ طب[1]

۱۸۵۷ء کے بعد ہر طرف انگریزوں کا عمل دخل ہو گیا اور لازماً ان کی وجہ سے طبِ قدیم کی بجائے ایلوپیتھی کا رواج بڑھا۔ علاوہ بریں تصنیفات بھی زیادہ تر اردو زبان میں ہوئیں۔ تاہم طب کے موضوع پر فارسی زبان میں بعض نئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ طباعت کی سہولتوں کے باعث فارسی کی پرانی طبّی تالیفات بھی بڑی تعداد میں چھپیں۔ طبِ قدیم کو فروغ دینے میں شریفی خاندان نے نمایاں کردار انجام دیا۔ طبیہ کالج دہلی کے سند یافتہ برصغیر کے گوشے گوشے میں نظر آنے لگے۔ حکیم محمد اجمل خاں مسیح الملک کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ حکیم نابینا اور حکیم محمد احمد خان نے بھی بڑی شہرت پائی۔ مسیح الملک کی وفات کے بعد حکیم محمد جمیل خان نے اس فنِ شریف کی خدمات انجام دینے کا بیڑا اٹھایا۔ تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان میں بالخصوص حکیم محمد سعید دہلوی کی مساعی کے باعث طبِ قدیم کو نئی زندگی حاصل ہوئی۔ اس پس منظر کو پیش کرنے کے بعد ہم ذیل میں طبّی تصنیفات کا ذکر کرتے ہیں۔

---

(۱) علمِ طب پر یہ شذرہ ادارہ کی طرف سے شامل کیا جا رہا ہے۔

طبّی تصنیفات

۱- حکیم محمد شریف خان دہلوی ۱۸۱۵ء میں وفات پا گئے تھے - ان کی تالیفات ۱۸۵۷ء کے بعد طبع ہوئیں - 'تالیفِ شریفی' ۱۸۶۳ء میں دہلی میں چھپی - اس کا تعلق علم الادویہ سے ہے - حاشیے پر قیمتی پتھروں کے بارے میں 'رسالہ خواص الجواہر' کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں - 'علاج الامراض' دہلی سے ۱۸۸۶ء اور لکھنؤ سے ۱۸۷۹ء میں چھپی - 'عجالۂ نافعہ' جو الفبائی ترتیب سے فہرستِ ادویہ ہے ، لکھنؤ سے ۱۸۷۳ء میں چھپی -

۲- حکیم ارزانی کی 'میزان الطب' اور 'طبِ اکبر' وغیرہ بھی طبع ہوئیں - ان کا اُردو میں ترجمہ بھی ہؤا -

۳- 'علاج الابدان' - عبد الحق بن شاہ ابی الحسن مونگیری کی تصنیف ہے - لکھنؤ میں ۱۸۷۳ء میں چھپی -

۴- 'مخزن الاکسیر' - علم الادویہ پر امام الدین ابن محمد حکیم پاک پٹنی کی تصنیف ہے - سالِ طباعت امرتسر ۱۸۹۱ء -

۵- 'کنز الاسرار' - عربی کتب کی بنیاد پر فارسی میں ادویات کا ذکر بطرزِ سوال و جواب از محمد ہادی حسین مراد آبادی ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۱ء -

۶- 'تریاقِ خواجہ' - زہریلے سانپوں اور زہر کے علاج کے متعلق محمد نصر اللہ خان عبدالعلیم احمدی خرجوی کی تالیف - میرٹھ سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی -

۷- 'تکشیف الحکمہ' - علم الطب پر از محمد سلیم خان ابن محمد عظیم خان -

۸- 'مخازن التعلیم' از محمد صادق علی خان ابن محمد شریف خان - یہ ادویات کی کتاب ہے جسے مصنف کے بیٹے غلام مرتضیٰ نے مرتّب کیا - کانپور سے ۱۸۸۲ء اور دہلی سے ۱۹۰۵ء میں طبع ہوئی -

ان کے علاوہ اس دور کی مندرجہ ذیل طبّی تالیفات بزبانِ فارسی بھی قابل ذکر ہیں :

نام کتاب	مصنّف	سالِ تالیف	موضوع
۱- انتخاب کتابِ مخزن	حکیم محمد سراج الدین	۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ	ادویہ
۲- جامع الادویہ	حکیم محمد سراج الدین	۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ	ادویہ
۳- سرقات الدرجات	غلام احمد مسیح الدولہ	۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ	کلیاتِ ادویہ
۴- شفاء الاطفال	محمد صادق بن کاظم	۱۸۶۱ء/۱۲۷۷ھ	امراض الاطفال
۵- شرحِ رسالہ حفظ الصّحت	حکیم محمد افضل لکھنوی	۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ	حفظِ صحت
۶- مقراض الامراض	شیخ احمد متخلص عبرت	۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ	معالجات
۷- معیار الاطباء	حکیم احمد سعید امروہوی		تحقیق و تنقید طب
۸- کامل التشخیص	حکیم احمد سعید امروہوی		تشخیص
۹- اکسیرِ اعظم	حکیم محمد اعظم خاں		معالجات

(یہ تالیف بڑے سائز کی چار ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی ۔ علمِ طب پر بڑی جامع کتاب ہے) ۔

نام کتاب	مصنّف	سالِ تالیف	موضوع
۱۰- قراباً دینِ اعظم	حکیم محمد اعظم خاں		ادویہ مرکبہ
۱۱- محیطِ اعظم	حکیم محمد اعظم خاں		ادویہ مفردہ
۱۲- عجائب الاتفاق	کاشف الدین محمد اعظم شاہ		تاریخِ طب

☆ ☆ ☆

آٹھواں باب

۱۹۴۷ء کے بعد کا فارسی ادب

پس منظر

۱۹۴۷ء کے بعد جو فارسی ادب معرضِ ظہور میں آیا اس میں ایک نیا عزم ، نئی زندگی ، نئی تڑپ اور ایک نئے ملک کی تعمیر و تزئین کے ولولے جا بجا نظر آتے ہیں - دراصل آج کا شاعر اور ادیب ماضی کے شاعر اور ادیب سے زیادہ حساس اور خارجی عوامل سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے - اس کے احساسات میں شدت اور سرعت اس لئے پائی جاتی ہے کہ دنیا بڑی تیزی کے ساتھ تغیرات و انقلابات کے مراحل سے گزر رہی ہے - نفسیاتی یعنی جذباتی کشمکش میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور اطلاعات و معلومات کے وسائل اس قدر عام ہو گئے ہیں کہ دنیا کے گوشے گوشے کے واقعات و حادثات براہِ راست فنکار کی فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں -

شاعر ہو یا ادیب ، مصور ہو یا موسیقار ، کوئی بھی فنکار ہو وہ اپنے ماحول کی عکاسی اپنے فن میں کرتا ہے - اس کا فن اس کے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا ہے - چونکہ اس دورِ جدید میں فارسی کے شاعر اور ادیبوں نے اپنے افکارِ تازہ کے اظہار کے لئے ادب میں نئی راہیں ایجاد کیں ، نئے افق دریافت کئے ،چنانچہ ماحول کا نیا پن ، فکر کی ندرت اور طریقۂ اظہار کی جدت ، یہ خصوصیات پاکستان میں ایک نئے شیوۂ بیان کی موجد بن گئیں - جس کو اگر ''سبکِ پاکستانی[1]'' کے نام سے تعبیر کیا جائے تو درست ہے - علامہ اقبال جس طرح فکرِ پاکستان کے مبتکر ہیں اسی طرح فارسی شاعری میں ''سبکِ پاکستانی'' کے موجد ہیں اور ان کے بیشتر معاصرین نے اسی سبک میں شاعری کی ہے - اس سبک کی ابتداء بیسویں صدی کے آغاز سے تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ ہو چکی تھی ، کیونکہ یہ دور برصغیر

---

(۱) عربی میں سبک کے معنی سونے چاندی کے پگھلانے کے ہیں لیکن ایک مدت سے فارسی میں یہ لفظ ادب کی ایک اصطلاح بن گیا ہے اور برسبیلِ مجاز اس کو طرز ، انداز ، شیوہ اور طریقہ کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں - (سبک شناسی از ملک الشعراء بہار) -

میں ہر شعبۂ حیات میں گوناگوں تبدیلیوں کا دور ہے ۔

عصرِ حاضر میں فارسی شعر و ادب جن مرحلوں سے گزرا ہے اس کو تین حالتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلی حالت میں ادیبوں اور شاعروں نے سبکہای متقدمین و متاخرین کی پوری پوری تقلید کی ۔ دوسری حالت میں یہ صاحبان زمان و مکان کے تقاضوں کے پیش نظر کچھ کچھ نئے موضوعاتِ سخن کی طرف متوجہ ہوئے ۔ لیکن شیوۂ بیان گذشتہ لوگوں کی طرح ہی رہا اور تیسری حالت میں یہ صاحبان افکار تازہ اور خیالاتِ جدیدہ کے ساتھ ساتھ اظہارِ بیان کے نئے نئے طریقوں کی طرف بھی مائل ہوئے اور ان تینوں حالتوں کے تدریجی اور متوازن امتزاج سے جو ''سبکِ تازہ'' وجود میں آیا ، اس کو بجا طور پر ''سبک پاکستانی'' کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ تحریکِ پاکستان کے آغاز ، ارتقاء ، عروج اور تکمیل کے ساتھ یہ سبک بھی اپنی ارتقائی منازل سے گذرتا ہؤا نقطۂ کمال پر پہنچتا ہے اور اس سبک کے بہترین نمایندے علامہ اقبال ہیں ۔

بیان کے اعتبار سے اس سبک کی خصوصیات میں سادگی ، روانی ، سلاست اور فصاحت کو بڑا دخل ہے اور ابہام ، پیچیدگی ، ژولیدہ بیانی اور نامانوس و عجیب و غریب تراکیب کے استعمال سے اجتناب پایا جاتا ہے اور معانی کے اعتبار سے اس میں مقصدیت ، فکر انگیزی ، خیال آفرینی ، جوش و جذبہ ، ولولہ ، عزم ، امنگ اور آہنگ موجود ہے ۔ اس سبک کے مخصوص موضوعات میں اسلام دوستی ، بشر دوستی ، وطن دوستی ، مضامینِ دینی و ملی و عشقی ، تصوف و عرفان ، جدوجہدِ حیات کی تشویق اور درخشاں مستقبل کی تعمیر و تعبیر شامل ہیں ۔

اصنافِ سخن میں قصیدہ اور غزل کی جگہ نظموں نے لے لی ہے جس کو متقدمین کی اصطلاح میں قطعہ کہا جا سکتا ہے اور اگر قصائد لکھے بھی گئے ہیں تو حاکمانِ وقت کی مدح میں نہیں بلکہ ملک و ملت اور قوم کے سچے اور مخلص خدمتگذاروں ، قائدوں اور مجاہدوں کی تعریف میں لکھے گئے ہیں ۔ اسی طرح غزلوں میں بھی محبوب کا تصور بڑی حد تک وسیع ہو گیا ہے ۔ اب محبوب اور معشوق کے زمرے میں وطن ، اہلِ وطن ، محنت کش دہقان ، عوام سب کا شمار ہونے لگا ہے اور چونکہ شاعر اور ادیب کے افکار آج کل تمام طبقاتِ معاشرہ کے حرکات و سکنات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے مختلف طبقوں کے افراد کو اپنی فکر کا محور و مرکز بنا کر ان صاف اور صریح حقائقِ زندگانی کو

بےنقاب کیا ہے جو اس سے پہلے اس بے باکی اور وضاحت سے بیان نہیں کئے گئے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے شعر و ادب ایک مخصوص حلقے تک محدود تھا ۔ لیکن عصرِ حاضر میں یہ عام لوگوں کے لئے بھی وسیلۂ ابلاغ اور تفریحِ طبع کا ذریعہ قرار پایا ہے ۔ پرانے اصنافِ سخن کے علاوہ اظہارِ بیان کے لئے نئے پیرائے بھی ایجاد کئے گئے اور دیگر زبانوں سے بھی اصناف مستعار لئے گئے ۔ چنانچہ اس دور کی شاعری میں نظم ، غزل ، قصیدہ ، رباعی ، دوبیتی ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مستزاد اور مسمط کے علاوہ سہ حرفی ، ترانہ ، شعرِ آزاد (شعرِ سپید) ، سوانٹ اور ماہیا کے نمونے بھی فارسی شاعری میں نظر آتے ہیں ۔

فارسی نثر بھی اس تحریکِ نشاۃِ ثانیہ سے متاثر ہوئی ۔ اس دور میں نثرِ فارسی کی دو طرح کی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں ۔ ایک تو اسلاف کی وہ کتابیں جو ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوئی تھیں ، جیسے 'تذکرۂ مخزن الغرائب' اور 'مثنوی وامق و عذرا' وغیرہ ۔ اور دوسری نئی تصنیفات جیسے 'سفینۂ دانش' اور 'تاریخِ زبان و ادبیاتِ فارسی در پاکستان و ہند' وغیرہ جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں درسی کتابوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ۔ اس کے علاوہ فارسی کی بہت سی لغتیں بھی لکھی گئیں جن میں فیروز الدین رازی کی لغت مشہور ہے ۔ علاوہ مستقل تصانیف کے فارسی میں مقالات بھی بڑی کثرت سے لکھے گئے جو پاکستان و ہند کے مختلف علمی و ادبی جرائد میں چھپے اور بعض صاحبانِ قلم کے مضامین ایران و افغانستان کے مؤقر رسالوں میں بھی طبع ہوئے ۔ حکومتِ پاکستان کی وزارتِ اطلاعات نے 'ہلال' اور 'سروش' اور ریڈیو پاکستان نے 'صدای پاکستان' کے عنوان سے فارسی کے رسالوں کا اجراء کیا ۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کی میگزینوں میں بھی فارسی میں استادوں اور طالب علموں کے مضامین بالالتزام شایع ہونے لگے ۔ بعض ادبی کتابوں اور شعراء کے دیوانوں کے ساتھ مقدمات اور دیباچے بھی فارسی زبان میں لکھے گئے ۔ ان فارسی متون کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ شعر کی طرح نثر بھی سادہ ، رواں اور سلیس ہوگئی ۔ اب مقفیٰ اور مسجّع عبارات کا دور تمام ہو چکا تھا ۔ نثرِ متکلّف اور مرصّع کا زمانہ نہ رہا تھا ۔ سیدھی سادی باتیں صاف اور سلیس نثر میں لکھی جانے لگیں ۔

تاسیسِ پاکستان کے بعد پاکستان کے مختلف شہروں میں فارسی کی انجمنوں کا قیام

بھی نظم و نثر فارسی کے فروغ میں بہت کچھ ممد و معاون ثابت ہوا ۔ ان ادبی انجمنوں کے جلسوں میں فارسی میں مقالات اور اشعار پڑھے جانے لگے ۔ کراچی کی انجمن ادبی فارسی ، حیدر آباد کی بزم سعدی ، لاہور کی بزم حافظ اور انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان ، راولپنڈی کی سازمان فارسی اور پشاور کی بزم ادب کی اس سلسلے میں بڑی خدمات ہیں ۔

اس دور میں برصغیر اور ایران کے روابط از سر نو مستحکم ہوئے ۔ مملکت پاکستان کو سب سے پہلے ایران نے تسلیم کیا اور سب سے پہلے شاہنشاہ ایران وہ سربراہ مملکت تھے جو پاکستان کے سرکاری دورے پر یہاں آئے ۔ جو روابط پچھلے ڈیڑھ سو دو سو سال سے اغیار کی کوششوں سے کمزور ہو چکے تھے وہ پھر استوار ہوگئے ۔ افراد کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ ، شعر و ادب اور کتابوں کا تبادلہ بھی ہوا ۔ ترجموں کا دور شروع ہوا چنانچہ علامہ اقبال کی دو کتابوں کا فارسی میں ایران میں ترجمہ ہوا جو انگریزی میں تھیں ۔ ایک تو 'احیای فکر دینی در اسلام' اور دوسرے 'سیر فلسفہ در ایران' ۔ مولانا مودودی کی بھی آٹھ اردو کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ایران میں کیا گیا ۔ شبلی نعمانی کی 'شعر العجم' کا ترجمہ ایران میں اس سے پہلے فارسی میں ہو چکا تھا ۔ اہل کابل نے پنجاب یونیورسٹی کا ڈاکٹریٹ کے لئے بیدل پر انگریزی میں منظور شدہ مقالہ فارسی میں ترجمہ کرایا ۔ ان ترجموں کی وجہ سے بیرون پاکستان کے فارسی جاننے والے ، مسلمانان پاکستان کی معاصر ادبی خدمات سے روشناس ہوئے ۔ اسی طرح پاکستان میں بہت سے ایرانی دانشوروں کی علمی اور ادبی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا جیسے سید غلام رضا سعیدی کی کتاب 'اقبال شناسی' کا ترجمہ صوفی تبسم نے اردو میں کیا ۔ ڈاکٹر نذیر میرزا برلاس نے ڈاکٹر صفا کی کتاب 'تاریخچہ مختصر ادبیات فارسی' کا ترجمہ اردو میں کیا ۔

اس سلسلے میں سندھ اکیڈیمی ، پنجابی اکیڈیمی ، پشتو اکیڈیمی ، اقبال اکیڈیمی ، بلوچی اکیڈیمی اور بنگالی اکیڈیمی کا ذکر لازم ہے ، جنھوں نے فارسی کی بہت سی نادر کتابوں کو طبع کرانے کا اہتمام کیا اور فارسی سے متعلق کتابیں اردو میں بھی طبع کرائیں ۔ اس ضمن میں اقبال اکیڈیمی کراچی کے ممتاز حسن ، سندھ اکیڈیمی کراچی و حیدر آباد کے پیر حسام الدین راشدی ، پنجابی اکیڈیمی لاہور کے ڈاکٹر محمد باقر کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں جن کی کوشش ، تشویق ، ترغیب ، تحقیق اور رہنمائی سے بہت سے چھپے ہوئے ادبی خزانے ظاہر ہوئے اور فارسی نظم و نثر میں بہت سی نایاب کتابیں ان اداروں کی طرف

سے طبع ہوئیں - حکومتِ پاکستان اور دولتِ ایران نے ان علمی اداروں کی جو سرپرستی کی ، اس سے بھی ان ادیبوں ، دانشوروں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور گذشتہ ۲۴ سال (۱۹۴۷ - ۱۹۷۱ء) کے عرصے میں بہت سی تصانیف اور تالیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں - اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کا تاریخِ ادبیاتِ پاکستان و ہند کی تسوید کا منصوبہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے - گروپ کیپٹن سید فیاض محمود کے زیرِ ہدایت و ادارت پاکستان و ہند کی 'تاریخِ ادبیاتِ فارسی' تین ضخیم جلدوں میں مرتب ہوئی جس میں عربوں کی آمد کے وقت سے لے کر ۱۹۷۲ء کے آغاز تک یہاں کے جمیع ادبیات فارسی کا عہد وار اس طرح تذکرہ کیا گیا ہے جس سے پاکستانی معاشرے کی تہذیب و ثقافت کی کامل آئینہ داری ہوتی ہے -

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں جشنِ ایران کے سلسلے میں نظم و نثرِ فارسی میں بہت سی کتابیں اور رسالوں کے مخصوص شمارے پاکستان کے مختلف شہروں میں مختلف علمی ، ادبی اور فرہنگی اداروں کی طرف سے شائع کئے گئے - لاہور سے 'راوی' ، 'ایران نامہ' ، 'ارمغانِ ایران' ، 'اورینٹل کالج میگزین کا خصوصی نمبر' ، 'فارسی در پاکستان' ، 'تاثیرِ معنوی ایران در پاکستان' اور پشاور سے 'سبدِ گل' اور حیدر آباد سے 'آموزگارِ فارسی' ، ملتان سے 'جشنِ شاہنشاہیٔ ایران' ، راولپنڈی سے 'ارمغانِ سازمان' وہ کتابیں ہیں جو اس جشن کے سلسلے میں چھاپی گئیں -

۱۹۴۷ء کے فارسی شعر و ادب کے موضوعات

مندرجہ بالا تمہیدی کلمات کے بعد یہاں ہم ۱۹۴۷ء کے بعد کے فارسی شعر و ادب (دور معاصر) کے چند خاص موضوعات کے ذیل میں برِصغیر کے مسلمانوں کا کلام بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان رجحانات کی نشاندہی ہو سکے جو اس عہد کے لگ بھگ فارسی ادبیات میں پیدا ہوئے -

(الف) دینی رجحانات

پاکستان کا قیام مسلمانانِ برِصغیر کی ان تھک کوششوں سے اور بڑی قربانیوں سے عمل میں آیا تھا ، مقصد یہ تھا کہ یہاں ایک آزاد اسلامی مملکت کی تاسیس کے بعد مسلمان آزادانہ طور پر اپنے دینی عقاید کے مطابق زندگی بسر کریں اور اپنے دینی افکار کی

تعبیرِ نو سے ایک جدید اسلامی معاشرہ قائم کریں جو پوری طرح سطوتِ ماضی کی آئینہ داری کرتا ہو ۔ چنانچہ فارسی زبان میں بھی شاعروں اور ادیبوں نے دینِ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اپنے آثار و اشعار میں روشنی ڈالی ۔ اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے اس دور میں جو شعر کہے گئے ان کا یہاں انتخاب پیش کیا جاتا ہے :

ناموس و ملک و قوم بہ قرآن برابر است　　قرآن گواہ حرمتِ قرآنم آرزوست

(اختر شیرانی)

راہی کہ بہ منزل نرساند کفر است　　طاعت کہ بہ حکومت ندہاند کفر است
ہر عسر کہ یسرش نہ ہویداست خطاست　　اسلام کہ غالب نکناند کفر است

(علامہ مشرقی)

مسلمانی و ایمانی نداری　　چہ دریائی کہ طوفانی ندارد

(ضیاء جعفری)

بحمداللہ بپاکستان شد آغاز حریت　　مسلمان را خدا دادست این انعامِ آزادی
درودِ پاک بر روحِ جناح تا آخرت بادا　　کہ کرد آن پاک تعمیری کہ گشت ابرامِ آزادی
جگر دستِ دعا بردار و از خالق طلب خیری　　برای مسلمِ عالم پیٔ اسلام آزادی

(جگر کاظمی)

زالِ دنیا ہم رسید اما فریب او نخورد　　قائد ما تنگ در بر شاہدِ دین را کشید

(تمنا عمادی)

اسلام را بہ شوکتِ قاہر عیان نگر　　ہم زور او کسی بزمین و زمان نماند

(مظہر)

حسن پری و حور نہ ارزد بہ ہیچ شئی　　انسانم و محبتِ انسانم آرزوست

(برق پشاوری)

حکایت از غمِ جانان ندارم　　شکایت از غمِ دوران ندارم
زغمہای دگر وارستہ ام من　　کہ در دل جز غمِ انسان ندارم

(ضیاء کنجاہی)

(ج) وطن دوستی

تو پاک مردی و ہستی ز ملکِ پاکستان — ہمیشہ پاسِ وطن دار و پاکبازی کن
(برگ)

وجودش ہست بردلہای ہستی داغِ رسوائی — کسی کاندر دلِ او جذبۂ عشقِ وطن میرد
(ضیاء گنجاہی)

حبِ وطن نہادہ قضا در سرشتِ خلق — ویرانہ ام بہ خلّخ و کشمر برابر است
(جگر)

عاشقِ گلہائی رعنای توام — خاکِ پاکستان شیدای توام
(کوکب شادانی)

صد آفرین بتوای شہسوارِ میہنِ ما — ز آبداریٔ تیغت بہارِ گلشنِ ما
(انوار)

(د) ایران دوستی

باشد زبانِ خوب نہ مانندِ پارسی — در شرق و غرب ہست سمر ، قندِ پارسی
(ادیب فیروز شاہی)

آن سوزِ عشق و شورِ محبت کہ داشتیم — در اصفہان و مشہد و تہران فروختیم
(شاد)

فرہنگِ ما کجا و زبانہایٔ ہند کو — اُردو مذاقِ لطفِ سخن یافت از دری
(سالک)

فرستاد ہر سو عجم نورِ علم — منوّر جہان گشت از طورِ علم
(عطا)

آسیا را شبِ تاریک پدید آمد چون — تاگہ از مطلعِ ایران سحری پیدا شد
(رزی)

خاکِ شیراز و مشهد و تبریز　　　سرمهٔ نور جیرِ چشمانم
(عرفانی)

ایران که سرِ مکتبِ تادیبِ جهانست　　　لاریب که گهوارهٔ تهذیبِ جهان است
(ناصر)

(ه) تصوف و عرفان

یک حرفِ شوقِ روزِ نخستین شنیده بود　　　دارد دلم هنوز بمن گفتگوئی تو
(محشر)

دلم دلداده ام دردم امید و یاس و حرمانم　　　سرودِ خلوتِ وصلم ، شرارِ آه مهجورم
(تمیز)

نرسد خرد بذاتت مگر آنکه عشق باشد　　　که ز دیده در حجابی وز دل تو بی حجابی
(حر)

محملِ لیلی و لیلی این دل و عشق ایست و بس　　　آنچه می جست از بیابان قیس اندر خانه داشت
(رعنا)

حیف از کوریٔ خود نشناختم　　　پیشِ من دلدار آمد بار ها
(فاضل)

این عالم آب و گل بی رنگِ حقیقت نیست　　　دنیای سراب آسا در مغزِ فلاطون به
(ایوب)

گہی بجلوہ گہِ آب و گل نیاسودیم　　　چه طائریم که عرش است آشیانهٔ ما
(ذہین)

ای اسیرِ آرزو در آرزو　　　ای شهیدِ جستجو در جستجو
خویشتن را بین درونِ خویشتن　　　تا نه بینی مرگ، اندر زیستن

(عارف)

صد بار ترا دیدم و دیدم نہ دوبارہ   ہر مرتبہ دیدارِ تو دیدارِ نخست است
(تمنا)

چو عکسِ آئینہ از خود رمیدنم بنگر   بیا و جامۂ ہستی دریدنم بنگر
(ضیا جعفری)

(و) اخلاقیات

ازان بسیار می خندند بر من   کہ من بر دیگران خندیدہ بودم
(زیب)

ز دوستانِ منافق مدار چشمِ وفا   میانِ پیکرِ اسلام رُوحِ بولہبی است
(اختر شیرانی)

منہ ہرگز بفردا کارِ امروز   کہ فردا سازگار آید کہ ناید
(قمر)

بر آب و نانِ غیر توان زیست تا بکی   این زیستن بہ لقمۂ بیگانگان غلط
(عطا)

تملّق پیشگی از من نمی آید نمی آید   کہ از دستِ قضا ثبت است بی باکی بہ تقدیرم
(ایوب)

بیانِ کفر چنین دلنشین نماید و ہست   حدیثِ شیخِ حرم دلنواز باید و نیست
(تبسم صوفی)

بنوش بادہ و رندی کن و بعیش گذار   مگر بہ پیشِ حریفان مشو ضمیر فروش
(سالک)

(ز) شکوۂ قدر ناشناسی

قدرِ جوہر نیست باقی در جہان ای ناصحا   خوان بر سر چون گہر پوشیدہ در ویرانہ باش
(ناصح)

درین زمانهٔ ناقدریٔ کمالِ عشقی — ہزار حیف بر آنکس کہ آرزومند است
(عشقی)

وای قسمت جنسِ ناپرسان شدم — من کہ بودم رونقِ بازار ہا
(فاضل)

وای از بیمہریٔ اہلِ وطن — قدرِ من تا زیستم نشناختند
چون بمردم از وبالِ زیستن — گنبدی بر تربتم افراختند
(عطا)

(ح) تشویق بہ کار و کوشش

شیرانِ جنگ پیشہ بمکتب ہمیروند — اختر بیار توسن و تیغ و سنان کجاست
(اختر)

بیا بزورِ عمل آدمِ دگر سازیم — کہ حسن حسنِ عمل را ثبات بخشیده است
(حزین)

ماتمِ درماندگی ، درمانده تر سازد ترا — وقتِ بہکار است این وقتِ فغان و آه نیست
(ایوب)

بتاز توسنِ تازی و ترکتازی کن — بکار زارِ جہان کارِ مردِ غازی کن
(برگ)

قصہ جمشید و کی را تابکی خوانی فضول — داستانِ اجتہادِ خویش را دولت شمار
(لطف)

کاروان جز عزمِ صد ہمکار نیست — منزلی جز طاقتِ پرواز نیست
(عارف)

(ط) امیدواری

خزان گزیده جوانانِ باغ برخیزید — کہ برقِ ابرِ سیہ مژدهٔ نمو آورد

مایوس مشو ہمدم از قافلۂ ملت — گم کردۂ راہی ہست ، درماندۂ راہی نیست
(ایوب)

آفتابیم که در این تیره شبی — قاصدِ عصرِ جوانِ آمده ایم
(ضیا جعفری)

از عصرِ جوانست نمودِ بشرِ ما — خون میچکد امروز ز جیبِ سحرِ ما
(ضیا جعفری)

ظلمتِ یاس چو بر قلبِ من آورد ہجوم — شمعِ امید ز مہرِ تو فروزان کردم
(سلیم)

(ی) اظہارِ فروتنی

دعوئ ہمنوائی غالب کنی قمر — زاغی کجا بہ بلبلِ بستان برابر است
(قمر)

این نوای درد آمد برلبش بی اختیار — ورنہ ایوب از رسومِ شاعری آگاہ نیست
(ایوب)

مرا حقیر مدان زانکہ عجز خوی من است — ز داغِ سجدہ جہان را تہِ نگین دارم
(برگ)

از بردنِ صدف بہ عدن زشت تر بود — در پارس از "ادیب" گر آرند پارسی
(ادیب فیروز شاہی)

(ک) تفاخر

بعد از غنی قمر بہ چمن زارِ کاشمر — آوازۂ سخن ز سخندانئ من است
(قمر)

لیفگندہ بمیدانِ سخن کس پنجہ با عرفی — فقط فکرِ عظامی دیدہ ام دست و گریبانش
(عظامی)

(ل) اشعارِ عشقی و متفرقات

غریبِ عشق سامانی ندارد — جنون دارد بیابانی نہ دارد
(ماہر القادری)

دستِ دعا کہ عرش بود در تصرفش — بشکن اگر بگوشۂ دامان نمیرسد
(سلیم)

جہان ز حسنِ تو ہمواره گلشن آباد است — چہ خوش بود کہ یکی نوبہارِ من باشی
(تبسم صوفی)

غنچہ ہای حسرت آوردیم از گلزارِ حسن — تانگوید کس کہ دامن را تہی داریم ما
(تاثیر حفیظ)

ز طرفِ باغ چو گلہای آتشین برخاست — ہزار کوکبِ رخشنده از زمین برخاست
(رعنا)

ساقیٔ ما شراب میریزد — آفتاب آفتاب میریزد
(جیش)

ہر شب بیادِ شاہدِ رعنا گریستم — روشندلم کہ در دلِ شبہا گریستم
(شاد)

زندگی با غمِ ایامِ جہان مشکل بود — عشق ورزیدم و برخود ہمہ آسان کردم
(سلیم)

زنم چہ طعنہ بہ کافر کہ دین بدنیا داد — مرا ببین کہ نہ آن دارم و نہ این دارم
(برگ)

میان بادہ گساران ہجومِ تفرقہ ہاست — کہ پیرِ میکده دانای راز باید و نیست
(تبسم صوفی)

۱۹۴۷ء سے بعد کے فارسی گو شعراء

اب ہم ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۲ء کے درمیان زندگی بسر کرنے والے فارسی کے چند شاعروں کا ذکر کرتے ہیں ۔ ان کے اشعار و افکار پر جن داخلی اور خارجی عوامل نے اثر ڈالا ہے ، اس کا تفصیلی ذکر ہم اس باب کے شروع میں کر چکے ہیں ۔

(الف) جگر کاظمی

سید لعل شاہ کاظمی متخلص بہ جگر ۱۸۷۷ء میں پشاور میں پیدا ہوئے ۔ ان کے اجداد مشہد سے قندھار اور وہاں سے پشاور آئے تھے ۔ گیارہ سال کی عمر میں باپ کا سایہ جب سر سے اٹھا تو تعلیم جاری رکھنے کے لئے اپنے ماموں امیر احمد شاہ کے پاس کلکتہ گئے ، جہاں مدرسۂ عالیہ میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہم جماعت تھے ۔ بعد ازاں وہ کشمیر گئے جہاں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور اب اس پیرانہ سالی میں بھی پشاور میں محافلِ شعر و سخن کی رونق بنے ہوئے ہیں ۔ انہوں نے زیادہ تر قصائد اور غزلیں لکھی ہیں اور قطعاتِ مادۂ تاریخ لکھنے میں مشہور ہیں ۔ فارسی کلام میں انوری و خاقانی اور سعدی کا رنگ پایا جاتا ہے ۔ ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

دی رفت و گل دمید چو از خاور آفتاب — یعنی زدہ بہ بُرجِ حمل لنگر آفتاب
در نامیہ بپا شدہ شور قیامتی — ہم زد بموجِ خون شررِ محشر آفتاب
بہر نظامِ موسم گل در چمن نگر — زاوراقِ گل کشودہ ز سر دفتر آفتاب
کردہ است ریشہ دانہ تاکی بجامِ می — یا از فلک فروشدہ در ساغر آفتاب

۲۔ امین حزین

خواجہ محمد مسیح پال ، جو فارسی میں حزین اور اردو میں امین تخلص کرتے ہیں ، ۱۸۸۴ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے عربی فارسی کی تعلیم مولوی سید میر حسن سے حاصل کی جو علّامہ اقبال کے استاد تھے ۔ اردو اشعار کے دو مجموعے 'گلبانگِ حیات' اور 'اوراقِ گل' چھپ چکے ہیں ۔ ان کے فارسی کے چند اشعار بطور نمونہ یہاں پیش کئے جاتے ہیں :

دلم را محرمِ رازِ جہاں ساز — کلیدِ قفلِ گنجِ کن فکاں ساز

الٰہی انشراحِ صدر خواہم | درونم پاک از وہم و گماں ساز
الٰہی پای چوبین حاجتم نیست | ہوای شہپرِ جبریل دارم
نوای عندلیبان در خورم نیست | کہ ذوقِ صورِ اسرافیل دارم
الٰہی قسمتِ شمعم عطا کن | کہ سوزم نور بخشد کوکبی را
ہمین یک آرزو چون مہر دارم | کہ تابان چون سحر سازم شبی را

۳- رضا علی وحشت

کلکتہ میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ کالج کلکتہ میں فارسی کے استاد ہوگئے ۔ تقسیمِ ہند کے بعد ڈھاکہ چلے گئے اور وہیں ۱۹۵۶ء میں وفات پائی ۔ جگر کاظمی کی طرح یہ بھی شمس کلکتوی شاگردِ داغ دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے ۔ بعد میں عبدالغفور خان نساخ کے شاگرد ہوئے ان کے کلام کا مجموعہ 'ترانۂ وحشت' کے نام سے شائع ہؤا ہے جس میں ان کا فارسی کا کلام بھی شامل ہے ۔ ان پر حافظ ، قآنی اور غالب و شبلی کا بہت اثر ہے ۔ زیادہ تر غزلیں ہیں ۔ چند قصائد بھی منقبت رسولؐ پاک میں موجود ہیں ۔ نمونۂ کلام :

نہ گوشِ کس بر آوازم نہ چشمِ کس بر احوالم
نمی دانم چرا در بزمِ بی دردان ہمی نالم
حریفِ گل نیم اما کشم جورِ جہانی را
درین گلشن برنگِ سبزۂ بیگانہ پامالم
اگر بنگالہ قدرِ من نمیداند چہ غم وحشت
صدای میدہد از گوشۂ پنجاب اقبالم

۴- عزیزالدین احمد عظامی

۱۸۹۸ء میں ہوشیارپور کے قریب پیدا ہوئے ۔ گرامی کے شاگرد تھے ، خود گرامی کہتے ہیں :

ستارہ سفتہ گوش و چرخ پابوسِ زمین آمد
تعالی اللہ گرامی را عظامی جانشین آمد

تعلیم کو مکمل کر کے ادارۂ تعلیم میں فارسی کے معلّم ہو گئے اور جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا تو جالندھر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور ساہیوال میں مقیم ہو گئے - ۱۹۵۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور چودہ فروری ۱۹۵۸ء کو اس دنیا سے رحلت فرمائی - مولانا عبدالرشید نسیم ملتانی نے تاریخِ وفات اس شعر سے نکالی :

سال فوتش ''عطائی مرحوم''   آنیؑ بود چون بہ ''آنی'' شد
۱۳۷۶ھ

چند متفرق اشعار بطور نمونۂ کلام درج کئے جاتے ہیں :

درگہِ عشق عجب شانِ خدائی دارد
آنکہ سلطانِ جہانست غلام است اینجا
اے بختگانِ عقل بہ سنید خامیم
دعوای عشق دارم و فرزانہ ام ہنوز
در شہر جفا دیدم از دستِ ستم کیشان
نادان بہ سرِ منبر ، دانا بسرِ داری
ورای حمدِ کبریا ، ورای نعتِ مصطفیٰؐ
زبانِ خود عطامیا کنیم تر غلط غلط
خرد از سر ، شکیب از دل ، سرشک از چشم ، روح ازتن
دوید امشب ، رمید امشب ، چکید امشب ، پرید امشب

د- عطاء اللہ شاہ بخاری المتخلص بہ ندیم متوفی ۱۹۶۲ء

۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے - ابتدائی ایام عظیم آباد میں بسر ہوئے - پھر امرتسر چلے آئے اور خطیبِ بے مثال اور مقررِ شعلہ بیان کی حیثیت سے معروف ہوئے - سیاست کے میدان میں تحفظِ دین و شریعت کے لئے داخل ہوئے اور کئی مرتبہ قید ہوئے - اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ان کا مجموعۂ کلام 'سواطع الالہام' کے نام سے ملتان سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہؤا تھا - یہاں ان کے چند مقطعے نمونتاً پیش کئے

جاتے ہیں :

به تو ندیم بسبه رو چه ماجرا گوید
جز این که از سر هر مو گاه می چکدش

پارسایان همه نازند بزهد و طاعت
یک ندیم است که بر دامن تر می نازد

به ذره ذره سجودی نصیب ما شده است
بگو ندیم که اکنون به برهمن چه رسد

باغ و بهار ما ندیم یعنی که جنت النعیم
روی خوش است و خوی خوش ، بوی خوش و گل ہای خوش

۶- سردار میر گل محمد خان تمندار زیب مگسی (۱۸۸۳ء - ۱۹۵۳ء)

زیب بلوچوں کے ایک متمول سردار کے گھر 'جھل' میں پیدا ہوئے لیکن مزاج قلندرانہ پایا تھا جیسا کہ کہتے ہیں :

چو ابراہیم ادہم ملک و سامان دادم و رفتم
مواد سلطنت را ترک کردم بہر درویشی

کاین بیوفا پذیرد ہر روز تازہ شوئی
مہر عروس دنیا از سینہ ات برون کن

یہ اور ان کے بھائی سردار یوسف علی خان عزیز مگسی وطن پرستی ، آزادی خواہی اور سخنوری میں مشہور ہیں ۔ ان کے کلام کے دو مجموعے بنام 'پنج گلدستہ زیب' اور 'خزینہ الاسعار' چھپ چکے ہیں اور ایک مجموعہ بنام 'ارمغان عاشقان' جو نہ چھپ سکا ان کے صاحبزادے میر عطاء اللہ خان مگسی کے پاس محفوظ ہے جو ۳۴۶ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ آپ صنائع اور بدائع کے استاد تھے :

درین دنیا اگر ماندیم روزی چند لیک ای دل
چو آن شخصی که ماند میہمان در خانۂ دشمن (تشبیہ)

فیاض فرق اسفل و اعلی نمی کند
در خانۂ خدیو و گدا نور مه یکیست (حسن تعلیم)

ماجرای لیل فرقت را چه می پرسی ز ما
ماهِ روشن بر سرِ ما آفتابِ محشر است (حسنِ مبالغہ)

از درختی دید موسیٰ ذاتِ حق را جلوه گر
نورِ حق را ما نہ بینیم از رخِ خوبان چرا (شوخی)

شود نہ سترِ عیوب تو در جہان چیزی
جز آن لباس کہ محتاج را بپوشانی (اخلاقیات)

۷- صوفی تبسّم

غلام مصطفیٰ تبسّم ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے - تعلیم لاہور میں پائی اور وہیں فارسی کے استاد ہوئے - ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پھر پنجاب یونیورسٹی اور خانۂ فرہنگِ ایران لاہور سے وابستہ رہے - فارسی ، اُردو اور پنجابی میں شعر کہتے ہیں اور غزل ان کی محبوب صنف ہے - فارسی کے مشہور شاعر حکیم فیروز الدین طغرائی (متوفی ۱۹۳۱ء) کے شاگرد ہیں - ان کے مجموعۂ کلام 'انجمن' میں ان کی فارسی کی غزلیں شامل ہیں جو طبع ہو چکا ہے - ایران کے مشہور دانشور آقای استاد مجتبیٰ مینوئی کی کتاب 'اقبال لاہوری' کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے - درجِ ذیل غزل میرزا تورسن زاده کی تالیف 'مشاعره' سے نقل کی جاتی ہے جس میں اس تاجیکستانی دانشور نے تمام دنیا کے فارسی گو معاصر شاعروں کا انتخاب جمع کیا ہے[1] :

خوشا نصیب کہ زیبِ کنار من باشی — قرار جان و دلِ بے قرارِ من باشی
غرور و ناز بیک سونہی و از رہِ لطف — نیازمند شوی غمگسار من باشی
ز التفاتِ نگہ ہا و لطف و خندۂ لب — الم ربائی دلِ سوگوار من باشی
بساطِ عیش بچینی و بادہ پیمائی — بہ مستی آئی و اندر کنارِ من باشی
سحر بدامنِ شامِ سیاہِ من ریزی — فروغِ طالعِ لیل و نہارِ من باشی
جہان ز حسنِ تو ہموارہ گلشن آباد است — چہ خوش بود کہ یکی نوبہارِ من باشی

(۱) مشاعره تالیف میرزا تورسن زاده جو دوشنبہ مرکز تاجکستان میں بین الملی مجلسی مذاکره کے موقع پر طبع ہوئی - یہ مذاکره نظم معاصر فارسی گویاں کے عنوان سے ۱۹۶۷ء میں منعقد ہوا تھا -

درج ذیل غزل حالاتِ حاضرہ کی کس قدر بھرپور عکاسی کرتی ہے :

دلِ تو معرکہ سوز و ساز باید و نیست
لبِ تو زمزمہ پیرای راز باید و نیست
شد است حسن ز چشمِ جہانیان مستور
کہ عشق را نگہِ پاکباز باید و نیست
بیانِ کفر چنین دل نشین نباید و ہست
حدیثِ شیخِ حرم دلنواز باید و نیست
میانِ کعبہ و بتخانہ فرق می ورزند
میانِ عشق و ہوس امتیاز باید و نیست
نگاہِ من بہ ثریا رسیدہ است چہ سود
کہ بر درِ تو جبینِ نیاز باید و نیست
میانِ بادہ گساران ہجومِ تفرقہ است
کہ میرِ میکدہ دانای راز باید و نیست

(۸) الیاس عشقی

محمد الیاس خان عشقی ۱۹۲۰ء میں جے پور راجپوتانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد اسمٰعیل شان زری فارسی کے مشہور شاعر ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں عشقی اپنے خاندان کے ساتھ واپس آ گئے اور ۱۹۵۰ء سے اب تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہیں۔ دس سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ پاکستان کی فارسی شاعری میں انہوں نے نظم معریٰ (شعر نو یا بقولِ ایرانیان شعرِ سپید) اور سونٹ کا اضافہ کیا ہے۔ ایک سونٹ بتقلید سونٹِ کلاسیکِ ایتالیائی ملاحظہ ہو :

فریاد خموش

گر زیادم برود نرگسِ خواب آلودہ
چہ کنم زین دلِ وحشی کہ حزین است ملول
لمحۂ ہجر چو عمریست بسختی و بہ طول
از کجا آورم آن کیف شراب آلودہ
یاد ایام کہ بودش نہ سر رد و قبول
بر دلم بود نہ از حسرت و اندوہ نزول

سوی من بود نہ آن چشمِ عتاب آلودہ

ای خوش آن روز کہ آہو زختن باز آید
بوی پیراہن یوسف سوی کنعان برسد
مژدۂ وصل بہ خو کردۂ ہجران برسد
کاش آن سروِ خرامان بہ چمن باز آید
کس چہ داند کہ ہر لمحہ چسان یاد کنم
از خموشی چقدر نالۂ فریاد کنم

(۹) زبیدہ صدیقی

پٹیالہ کے مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور علم دوست تاجر مولوی محمد صدیقی کے

گھر میں ۲۲ فروری ۱۹۳۲ء کو زبیدہ پیدا ہوئیں ۔ ذوقِ شعر و ادب والد بزرگوار سے ورثے میں پایا ۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں آپ والد اور بھائیوں کے ساتھ بڑی مشکل سے پاکستان آئیں اور ملتان میں قیام کیا ۔ لاہور میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد تہران گئیں اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ زبیدہ درویش صفت ، حساس اور قلندرانہ مزاج کی مالک ہیں ۔ ان کی فارسی نظمیں ایران کی محافلِ ادبی میں بہت پسند کی گئیں ہیں :

لاہور ای آیہ ی فرہنگ و زندگی
نیمہ خدای عشق و زیبائی و سرور
ہر یادگار جاذبِ رشد و شبابِ من
در خاطرات دلکش حسن گم شدہ است
ای مرز و بوم آرزو و قلب زندہ ام
آن روزہای ابروشبانِ سیاہ باد
کز التہابِ شوق
فرمان ہرزہ گردی و آوارگی بداد
زندہ است در دلم
راہہای نیلگون تو کز مہر نیمروز
میسوخت کفش رہروان وپای رہروان
سوزندہ کوچہ ہای و خیابانہای تو
از نقش ناپدید قدمہای من پر است
لاہور ای تو مایہ ی الہام و شعرِ من
"می بینمت[1] ہنوز"
با شالیمار و قلعہ و لارنس و شملہ ات
شبہا خیال میکشد دیگر بسوی تو
دیگر بسایہ ہای درختانِ کہنہ ات
میخوانم از رہی و فریدون و شہریار[2]

---

(۱) مصرع نادر پور شاعر معاصر ایرانی ماخوذ از نظم و نیز (Venice) ۔
(۲) رہی معیری ، فریدون تولّلی و شہریار تبریزی شاعران معاصر ایران ۔

یا از کلامِ حافظ و اقبال و مولوی
آن سایہ ہای دیخ ترا یاد میکنم
دیگر امید درد تو ایجاد می کنم
لاہور ای خزانِ تو سرمایہ ی بہار
از بادِ برگ زرد تو در دامنِ خیال
صد غنچہ گل شود
صد نیاز وا شود
تا یک نگاہِ شوق نثارِ رخت کند

(۱۰) منظور حسین منظور

میانوالی وطن ہے۔ پہلے پڈالی ضلع سرگودھا میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں عرصۂ ملازمت ختم ہؤا تو اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ شعر گوئی کا ذوق فطری ہے۔ میانوالی نے دو شاعر پیدا کئے ہیں۔ ایک ناوک چند محروم اور دوسرے منظور حسین منظور۔ محروم اس ریگستانی علاقے کے حسن و جمال کے ترجمان ہیں اور منظور شوکت و جلال کے۔ منظور رزم آرائی کے دلدادہ ہیں چنانچہ اردو نظم میں انہوں نے مسلمانوں کی رزمیہ داستانیں بیان کی ہیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کے کلام پر اقبال کا رنگ غالب ہے۔ وہ غیور و جسور پاکستانیوں کو مسلمانوں کے پرانے جاہ و جلال کا وارث دیکھنا چاہتے ہیں۔ وزیرِ ملتِ پاکستان کے نام ایک پیام میں کہتے ہیں :

ای وزیرِ ملتِ آزاد ما	یاد کن آن سنتِ اجداد ما
کوز دلداری دلِ عالم ربود	کو ز دینداری وقارِ ما فزود
گلشنِ مغرب کہ از جوش بہار	می نماید آبدار و تابدار
چون نہالش صورتِ زیبا گرفت	رنگ و بو از بوستانِ ما گرفت
از سلف گنجِ گران دارم ما	این غلط حرفی کہ محتاجیم ما

۱۱۔ غلام محی الدین خلوت

۱۸۹۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ میاں فیروز الدین مرحوم کے فرزند ہیں۔ گورنمنٹ کالجوں میں اردو اور فارسی کے استاد رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اسلامیہ کالج آف کامرس

لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے - اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں - نعتِ سرور کونین ان کا مرغوب موضوع ہے - اس ضمن میں ان کا ایک شعر ہے :

ز نمودِ صبح سعادتش ، ز شعاعِ مہرِ منورش
شده سرد شعلهٔ آذری ، بشکست جادوی سامری

غزل بھی کہتے ہیں ، نمونہ پیشِ خدمت ہے :

بوی گل از خلوتِ غنچہ پریشان میشود　　بامدادان از ترانہ ریزیٔ مرغِ سحر

اس شعر سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ نوزائیدہ مملکتِ خداداد پاکستان کی برکات کو بڑے روح پرور انداز میں عام ہوتے دیکھ رہے ہیں اور مستقبل کے متعلق پر امید ہیں - اسی لئے قائداعظم محمد علی جناح (م - ۱۹۴۸ء) کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

حیاتِ جاودان را ضامن است این شاہکارِ تو　　دمیدی روحِ تازه در تنِ ما قائداعظم

۱۲- حافظ مظہر الدین مظہر

آپ صاحبِ طرز نعت گو ہیں - والد ماجد خواجہ نواب الدین مشرق پنجاب کے مشہور عالمِ دین اور شیخِ طریقت تھے اور عربی ، فارسی ، اردو اور پنجابی کے شاعر بھی تھے - حافظ صاحب گورداسپور کے ایک گاؤں میں ۱۹۱۳ء/۱۳۳۲ء کو پیدا ہوئے - فقر و تصوف اور شعر و نغمہ کا ماحول ملا اور انہی عناصر نے ان کی شخصیت کی تعمیر کی - ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ملک کے بعد راولپنڈی چلے آئے اور اب وہیں رہتے ہیں - فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں - 'شمشیر و سنان'، 'حرب و ضرب'، 'نور و نار' اور 'تجلیات' ان کے کلام کے مختلف مجموعے ہیں - 'نور و نار' میں فارسی اور اردو کی صرف غزلیات ہیں اور 'تجلّیات' میں ان دونوں زبانوں میں کہی ہوئی نعتیں ہیں - ان کی نعت میں تغزل بڑی رنگینی اور روح پروری کے ساتھ موجود ہے - نمونہ ملاحظہ ہو :

ز روئی تو گلستان آفریدند　　ز حسنت ماہِ کنعان آفریدند
جہانی تا شود نورٌ علی نور　　جمالت را فروزان آفریدند

ختن از بوی تو یک خونچه نی | ز خون تو بهاران آفریدند
قربان بر خدای که جانِ تو آفرید | صد جلوه ها ز طلعت و رخسارِ تو آفرید
آن صاحبِ حضور که جبریل نام اوست | او را خدا ز روح روان تو آفرید
به مقامِ مصطفائی ، به مقامِ مجتبائی | نه خیال من نه گنجی نه گمانِ من نه آئی
مگر از نگاهِ خواجہ شادی فیض یابد مظهر | همه ذوق و شوق و مستی همه سوزِ آشنائی

۱۳ - محمد اکرم شاہ اکرام

عصرِ حاضر کے مشہور ایرانی ادیب اور نقاد آقای سعید نفیسی[1] کی رائے ہے کہ پاک و ہند کے صاحبِ طرز شعراء کا جو سلسلہ مسعود سعد سلمان لاہوری سے شروع ہوا تھا اور کم و بیش ایک ہزار سال تک اپنی ان و داں دکھاتا رہا اور خیال کیا جاتا تھا کہ شاید شبلی ، گرامی اور اقبال پر آ کے ختم ہو گیا ہے ، وہ محمد اکرم شاہ اکرام کی بدولت بدستور جاری ہے ۔ آپ لاہور کے فارسی کے جوان سال شاعر ہیں اور یہاں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں فارسی کے استاد ہیں ۔ لاہور کے قریب ایک دوں سونگماں والے میں ۹ دسمبر ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے ۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم ۔ اے کا امتحان اعزاز سے پاس کرنے کے بعد تہران گئے اور نصابِ ڈکٹری کی تکمیل کی ۔ غزل کہتے ہیں ، ان کی غزلوں کا مجموعہ 'پروانۂ پندار' کے نام سے تہران سے طبع ہوا ہے ۔ فطرت میں درد اور سوز ہے ۔ طبیعت پاکیزہ احساسات اور جذبات سے لبریز ہے ۔ ان کے اسلوب سخنگوئی میں صراحت اور تازگی پائی جاتی ہے ۔ اس پر سبکِ ہندی کا کوئی اثر نہیں ۔ یہ ان کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ حافظ شیرازی سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

این چه سوری است که از عشقِ تو در جان من است
وین چه عشقی است که افسانۂ ہر انجمن است
عالم از فتنه و آشوب نخواهد آسود
حسن اگر حسن تو و عشق اگر عشقِ من است
تا بود سینۂ اکرام پُر از آتشِ عشق
کارِ دل تا بسحر سوختن و ساختن است

---

(۱) دیکھئے پروانۂ پندار کا مقدمہ از آقای سعید نفیسی ۔

جذبے کی بلندی ان اشعار سے ظاہر ہے :

در درونِ من تلاطمہا بپاست　　قطرہ ام ، پہلو بعمان میزنم
باکم از طوفانِ شہر آشوب نیست　　خیمہ در صحرای امکان میزنم
در دلم تاب و تبِ پروانہ ای است　　وقتِ رقص آتش بدامان میزنم

ان کے جذبۂ غم کے انداز کچھ فلسفیانہ سے ہیں ۔ وہ اپنے اس جذبے کی دلربائی اور عظمت میں ڈوب جاتے ہیں :

بدان مناز کہ گیسوی درہمی داری　　کہ من ہم از غمِ تو فکر درہمی دارم
شبِ فراقِ تو از لالہ ہای حسرتِ دل　　میانِ سینۂ خود باغِ خرمی دارم
گدای کوچۂ رندانِ دُرد آشامم　　شکوہِ خسروی و شوکت جمی دارم

معاصر شاعرہ زبیدہ صدیقی کی طرح انہیں بھی شہر لاہور کی اداؤں سے وابستگی ہے :

جلوۂ خلدِ برین است بہارِ لاہور　　صد ارم بستہ بہر راہگذارِ لاہور
اثرِ آب حیاتست بہ رودِ راوی　　خضر گم کردہ مگر رہ بجوارِ لاہور
مرہمِ زخمِ جگر خار و خسِ صحرایش　　سرمۂ دیدۂ دل گرد و غبارِ لاہور

۱۹۴۷ء کے بعد نثرِ فارسی

۱۹۴۷ء کے بعد جس قدر زیادہ فارسی آثار ہم کو نظم میں ملتے ہیں وہ نثر میں نہیں ملتے کیونکہ فارسی کی جگہ اردو اور انگریزی نے لے لی ۔ پھر بھی اس دور میں جو کتابیں نثر میں لکھی گئیں وہ اپنے طرز کے اعتبار سے ایک نئی نوعیت کی مالک ہیں اور دورِ حاضر کی نثر کو بھی اگر ہم ''سبکِ پاکستانی'' کی نثر کہیں تو مناسب ہوگا کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس میں سادگی ، روانی اور سلاست پائی جاتی ہے اور زبان بہت عام فہم اور آسان ہے جو فارسیٔ امروزِ ایرانی کے قریب تر ہے اور جس میں قدیم پُرتکلف اور پیچیدہ فقرات و عبارات نہیں ہیں ۔

ذیل میں چند مشہور و معروف ادیبوں اور دانشوروں کا ذکر کیا جاتا ہے جنہوں نے فارسی نثر میں بعض بلند پایہ تصانیف و تالیفات کا اضافہ کیا ہے ۔

۱- مولوی محمد شفیع

قصور میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے - عربی اور فارسی میں ایم - اے کرنے کے بعد انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر جب واپس آئے تو پنجاب یونیورسٹی میں پہلے عربی کے استاد ہوئے اور پھر اورینٹل کالج کے پرنسپل ہو گئے - ۱۹۳۲ء میں یونیورسٹی سے سبکدوش ہو کر علمی اور تحقیقی امور میں مشغول ہوئے - پھر 'دائرۃ المعارف اسلامیہ' کی تدوین میں مصروف ہوئے - پاکستان کے ادبی وفود کے صدر کی حیثیت سے کئی بار ایران اور انگلستان گئے - ۴ مارچ ۱۹۶۳ء کو لاہور میں وفات پائی - فارسی کی بعض تالیفات درج ذیل ہیں :

(۱) 'تذکرہ میخانہ' عبد النبی فخرالزمانی قزوینی - متن فارسی و حواشی -

(۲) 'ترجمہ فارسی تتمہ صوان الحکمہ' از علی بن زید بیہقی موسوم بہ 'درہ الاخبار' -

(۳) 'مطلع السعدین' عبدالرزاق سمرقندی - متن فارسی با حواشی و فرہنگ -

(۴) 'مکاتیب رشیدی' از رشید الدین فضل اللہ طبیب - متن فارسی اور حواشی -

(۵) 'وامق و عذرا' از ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری با مقدمہ و تصحیح و تحشیہ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء (یہ کتاب ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند احمد ربانی صاحب کے تعاون سے پنجاب یونیورسٹی نے شائع کی) -

۲- مولانا محمد ابراہیم سندی متخلص بہ ناظم

۱۸۸۹ء میں ضلع سکھر میں پیدا ہوئے - اپنے والد محمد ہاشم سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی - والد کی وفات کے بعد اپنے بھائی علامہ مولانا محمد قاسم المعروف بہ ''بحرالعلوم'' کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور ادبیات عربی و فارسی ، فقہ ، حدیث ، تفسیر اور فلسفے میں مہارت حاصل کی اور پھر خود بساط ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوئے - کچھ عرصے کے لئے سندھ اور بلوچستان کے قاضی رہے اور مفتیٔ اعظم کا لقب پایا - سندھی ، فارسی اور عربی میں کتابیں لکھیں اور شاعری بھی کی ہے - ۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء کو رحلت پائی - چند تصانیف یہ ہیں :

(۱) 'آداب الرسول للنظم المقبول' فارسی ، مطبوعہ -

(۲) 'دامریدان' فارسی ، مطبوعہ۔

(۳) 'رسالہ الحجۃ الکافیہ فی جواز جماعت الثانیہ' فارسی ، غیر مطبوعہ ۔

(۴) 'رسالہ جمع القرآن فی زمان سید الانسان' فارسی ، غیر مطبوعہ ۔

(۵) 'رسالہ تواریخ' فارسی و عربی ، غیر مطبوعہ۔

(٦) 'دیوان ناظم' فارسی و عربی و سندھی ، غیر مطبوعہ۔

۳۔ دکتر غلام سرور

۱۹۰۹ء میں جہلم کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم چکوال میں حاصل کی ۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں ''تاریخِ شاہ اسمعیل صفوی'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹرٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان واپس ہوئے اور پہلے اردو کالج اور پھر کراچی یونیورسٹی میں فارسی کے شعبہ کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں تحقیقی مواد کی فراہمی کے لئے اور پھر ۱۹۵۳ء میں ثقافتی وفدِ پاکستان کے رکن کی حیثیت سے ایران گئے ۔ ادبیاتِ فارسی کے متعلق کئی کتابیں لکھنے کے علاوہ آپ نے بہت سے مقالات ریڈیو اور رسالوں کے لئے بھی لکھے ۔ آپ کی فارسی کی چند تصانیف یہ ہیں :

(۱) 'تاریخ زبان و ادبیات فارسی در پاکستان و ہند' ۔ ۳ جلد۔

(۲) 'شرحِ حالِ ملک الشعراء بہار' ۔

(۳) 'فرہنگِ مبسوط فارسی معاصر' ۔

۴۔ دکتر خواجہ عبدالحمید عرفانی

۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو سیالکوٹ کے نزدیک مغلاں والی گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں انگریزی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۹ء میں پریس اتاشی ہو کر ایران گئے ۔ ۱۹۵۵ء میں واپس ہوئے تو 'مجلہ ہلال' فارسی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور دوبارہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک پریس اتاشی کی حیثیت سے سفارت خانہ پاکستان تہران میں کام کرتے رہے۔ فرائضِ منصبی

انجام دینے کے علاوہ ایران میں علمی اور تحقیقی کام بھی کرتے رہے اور بہت سی کتابیں فارسی میں لکھ ڈالیں۔ ان کی طبیعت بچپن ہی سے فارسی شعر و ادب کی طرف مائل تھی۔ ایران میں طویل قیام سے یہ شوق اور بھی نکھر گیا۔ اسی لئے ان کی نظم اور نثر دونوں آج کل کی ایرانی فارسی سے بہت نزدیک ہیں۔ ان کی تحریروں میں اور ان کی نظم میں سبکِ پاکستانی کی خصوصیات موجود ہیں۔ اقبال شناسی، ایران شناسی اور ایران دوستی ان کے آثار نظم و نثر سے نمایاں ہے۔ چند تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) 'رومی عصر' (علامہ اقبال) مطبوعہ تہران ۱۹۵۱ء۔

(۲) 'انتخاب شعر معاصرِ فارسی'، شامل تذکرہ ۱۷ شاعر معاصر ایران۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۳ء۔

(۳) 'اقبال ایرانیوں کی نظر میں'، اقبال اکاڈمی مطبوعہ کراچی ۱۹۵۵ء۔

(۴) 'شرحِ احوال و آثارِ ملک الشعراء بہار'، مطبوعہ ابن سینا تہران ۱۹۵۵ء۔

(۵) 'فارسی امروز'، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء۔

(۶) 'ایرانِ صغیر'، تذکرہ شعرای پارسی زبان کشمیر، مطبوعہ تہران ۱۹۵۷ء۔

(۷) 'ترجمہ فارسی ضرب کلیم اقبال'، اقبال اکیڈمی، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء۔

(۸) 'داستانہای عشقی پاکستان'، مطبوعہ تہران ۱۹۶۱ء۔

(۹) 'سرور سرمد'، مطبوعہ تہران ۱۹۶۳ء۔

۵۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی

امروہہ میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان آئے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے فارسی میں کیا اور پھر تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ زبان و ادبیات کے ساتھ ساتھ قانون کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ پہلے سندھ مسلم کالج کراچی میں اور پھر لاکالج تہران یونیورسٹی میں اس مطالعہ کو پایۂ تکمیل پر پہنچایا۔ ۱۹۶۴ء سے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے منسلک ہیں۔ فارسی نثر میں آپ کا اپنا منفرد انداز ہے جو آج

کل کے ایرانی سبکِ نثر سے بہت قریب ہے ، تالیفات درج ذیل ہیں :

(۱) 'پیالیا' ۔ جدید اردو شاعری کے منتخب کلام کا فارسی ترجمہ ، مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء ۔

(۲) 'تذکرہ نویسیٔ فارسی در ہند و پاکستان' جس کو ۱۹۶۴ء میں بہترین کتاب کا سلطنتی انعام ایران میں ملا ، مطبوعہ تہران ۱۹۶۴ء ۔

(۳) دستگاہ قضائی پاکستان ترجمہ فارسیٔ کتاب Judicial System of Pakistan ۔

(۴) 'حقوق عائلی ایران' ۔

۶۔ پیر حسام الدین راشدی

پاکستان کے معاصر محققین میں آپ کا شمار ہوتا ہے ۔ صوبۂ سندھ کے ایک علم دوست اور بزرگ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور تقسیم برِصغیر کے بعد احیاء علوم و ادبیات کے سلسلے میں بڑی زحمتیں اٹھائی ہیں ۔ فارسی اور سندھی کی بہت سی نادر کتابوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا ہے اور ان کی تصحیح اور تحشیہ میں بڑی دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے اور ان پر تحقیقی دیباچے رقم کئے ہیں ۔ چند ایسی کتابوں کے نام یہ ہیں :

(۱) 'مثنوی مظہر الآثار' تالیف شاہ جہانگیر ہاشمی کرمانی مطبوعہ سندھ ادبی بورڈ کراچی ، حیدر آباد ۱۹۵۷ء ۔

(۲) 'مثنویات و قصائد قانع' ، از میر علی شیر قانع تتوی ,, ,, ۱۹۶۱ء

(۳) 'تاریخ مظہر شاہجہانی' ، از یوسف میرک امیر خانی ,, ,, ۱۹۶۲ء

(۴) 'مثنوی چنیسر نامہ' ، از ادراکی بیگدری ,, ,, ۱۹۵۶ء

(۵) 'مقالات الشعراء' ، از سلطان محمد فخری بن محمد امیری ہروی ,, ,,

(۶) 'تحفۃ الکرام' ، از امیر علی شیر قانع تتوی ,, ,,

(۷) 'حدیقۃ الاولیاء' ، از سید عبدالقادر تتوی ,, ,, ۱۹۶۷ء

(۸) 'مکلی نامہ' ، از میر علی شیر قانع تتوی ,, ,,

(۹) 'تذکرہ شعرای کشمیری' ، از اصلاح (چہار جلد) اقبال اکادی کراچی ۔

۸۔ ڈاکٹر محمد باقر

اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے سابق صدر نے فارسی زبان و ادبیات کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ۔ ایک طرف تو انہوں نے مختلف علمی تحقیقاتی اداروں کی طرف سے بہت سی پرانی اور نئی کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کا اہتمام کیا اور دوسری طرف اپنے شاگردوں میں تحقیق کا جذبہ اور ادبی خدمات کا ذوق پیدا کیا جس سے زبان فارسی کی روایت اور ادبیات میں اضافہ ہوا ۔ علاوہ ان کتابوں کے انگریزی ، اردو اور فارسی میں بے شمار مقالات ملک کے مشہور جرائد اور اخبارات میں شائع کئے ہیں اور بعض بیرونِ ملک کے موقر رسالوں میں بھی چھپے ہیں ۔ یہاں آپ کے زیرِ اہتمام طبع ہونے والی چند کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے :

(۱) تذکرہ 'مخزن الغرائب' تالیف شیخ احمد علی خان ہاشمی سندیلوی انتشارات دانشگاہِ پنجاب ۱۹۶۸ء ۔

(۲) 'کلیات جویا تبریزی' ،، ۱۹۵۹ء

(۳) 'درفش کاویانی' تالیف میرزا اسد اللہ خان غالب مجلس یادگار غالب ۱۹۶۹ء

(۴) 'فارسی نامہ' پنجابی ادبی اکادمی

(۵) 'عبرت نامہ' تالیف مفتی علی الدین لاہوری ،،

(۶) 'تاریخ کوہ نور' تالیف سید نور الدین ،،

(۷) 'پنجابی قصے' فارسی زبان میں جلد اول و دوم ،،

(۸) 'مدار الافاضل' تالیف اللہ داد فیضی سرہندی سہ جلد ، انتشارات دانشگاہِ پنجاب ۶۰ - ۱۹۶۹ء

۸۔ سید وزیر الحسن عابدی

۱۹۱۵ء میں بجنور میں ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو علم و ادب میں

مشہور تھا ۔ لکھنؤ اور دہلی جیسے مراکز علوم و ادب میں تعلیم حاصل کی ۔ تاسیس پاکستان کے بعد لاہور آئے ، وہاں سے تہران یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے ، جہاں پانچ برس آپ نے ایران کے بڑے بڑے استادوں سے کسب فیض کیا ۔ ۱۹۵۲ء سے پنجاب یونیورسٹی میں فارسی زبان و ادب کی تدریس و ترویج میں مشغول ہیں ۔ سادہ مزاج ، درویش صفت ، منکسر المزاج اور معارف دوست ہیں ۔ آپ کا شمار ملک کے چند مایہ ناز محققین میں ہوتا ہے ۔ ایرانی اساتذہ بھی آپ کی ٹھوس علمیت اور تحقیق میں دقّت نظر کے معترف ہیں ۔ چند تالیفات یہ ہیں ۔ اُردو اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں :

(۱) 'دستورِ زبانِ فارسی' ۔

(۲) 'دبستانِ عجم' ، دو جلد ۔

(۳) 'کلیاتِ فیضی' مرتبہ ا ۔ د ۔ ارشد ، ادارۂ تحقیقات پاکستان ۱۹۶۷ء

(۴) 'فہرست مخطوطات شیرانی ، جلد اول ۱۹۶۸ء

(۵) 'غزلیات فارسی' ۔ میرزا اسداللہ خان غالب ، مجلس یادگار غالب ۱۹۶۹ء

(۶) 'مقالاتِ منتخبہ مجلہ دانشکدہ خاور شناسی' ، جلد اول و دوم ، دانشگاہ پنجاب ۱۹۶۷ء

ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے فارسی نثر نگار ہیں جن کا ذکر کئے بغیر یہ باب تشنۂ تکمیل رہے گا ۔ ان میں دکتر عبدالشکور احسن ، دکتر بشیر حسین ، دکتر محمد اکرم ، دکتر خ ۔ ب ۔ نسیم ، دکتر انعام الحق کوثر ، دکتر محمد ظفر خان ، دکتر یمین خان ، دکتر یٰسین رضوی ، دکتر صغریٰ بانو شگفتہ ، بنت زہرہ ، سید مرتضیٰ موسوی ، سرہنگ خواجہ عبدالرشید ، دکتر محمد ریاض خان وغیرہ شامل ہیں ۔

۱۹۴۷ء سے بعد کی نظم و نثر فارسی کا مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی طرف انگشت نمائی کر رہا ہے کہ پاکستان میں فارسی زبان اب روز مرہ کی زندگی کے زیادہ قریب آ چکی ہے ۔ اب یہ حقایقِ زندگی کی ترجمان بنتی چلی جا رہی ہے ۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں فارسی نے یہاں کی عوامی زندگی اور مقامی حالات کو اپنا موضوع بنا لیا تھا ۔ اگر اب بھی اس نے یہاں کی حقیقی زندگی کی ترجمانی کی اور نظم و نثر میں تابندہ خیالات اور زندگی سے معمور کردار پیش کئے تو اس کا مستقبل بڑا شاندار ہوگا ۔

☆ ☆ ☆

فهرست شاعرانِ پارسیگوی پاکستان (۱۹۴۷-۱۹۷۲ء)

۱- احسن ، ممتاز حسن -
۲- احسن الهاشمی -
۳- احمد ، خالد عمر -
۴- احمد ، قلندری -
۵- اختر ، خواجه عبادالله -
۶- اختر شیرانی -
۷- اخضر ، خادم علی خان -
۸- ادیب فیروز شاهی -
۹- ارزش ، ظهور حسن -
۱۰- اسد ملتانی -
۱۱- اسمٰعیل پهل آبادی -
۱۲- امام انصاری -
۱۳- اسلم ، محمد اسلم خان -
۱۴- اشک ، واحد علی رامپوری -
۱۵- اعظم دریای -
۱۶- اکرام ، محمد اکرم شاه -
۱۷- الطاف احقر -
۱۸- امانت -
۱۹- امداد ، امداد حسین -
۲۰- امیر -
۲۱- امین ، محمد طیب -
۲۲- انوار -
۲۳- انور ، علی بخش -
۲۴- انور فیروز پوری -
۲۵- اولاد ، سید محمد اولاد گیلانی -
۲۶- آه جالندهری -
۲۷- ایوب ، محمد ایوب -
۲۸- بانو ، قمرالقادری -
۲۹- بانو ، نواب صدیق علی خان -
۳۰- بدر ، مولانا محمد افضل -
۳۱- برق کوہاٹی -
۳۲- برق پشاوری -
۳۳- برہان ، احسان الدین -
۳۴- بسمل بخاری -
۳۵- بسمل ، عبدالله -
۳۶- بہائی ، بہاءالدین -
۳۷- بیدل ، دلاور خان -
۳۸- بضاعت روزی -
۳۹- بیگم نیازی -
۴۰- پطرس ، احمد شاه بخاری -
۴۱- تاثیر ، محمد دین -
۴۲- تاثیر ، عبدالحفیظ -
۴۳- تبسم ، صوفی -
۴۴- تبسم قریشی -
۴۵- تپش ، عبداللطیف -
۴۶- تمنا عمادی -
۴۷- تمیز ، محمد رحمٰن -
۴۸- جگر کاظمی -
۴۹- جمیل نقوی -
۵۰- جمیل واسطی -
۵۱- حر ، امیر امام -
۵۲- حزین امین -
۵۳- حفیظ ہوشیار پوری -
۵۴- حمید عظیم آبادی -
۵۵- حسی -
۵۶- خالد صدیقی -

۵۷- خلوت ، محی‌الدین ۔
۵۸- خواجہ دل محمد ۔
۵۹- خیالی ، محمد بخش ۔
۶۰- دانش ، سید صفی حیدر ۔
۶۱- ذوالفقار بخاری ۔
۶۲- ذہین تاجی ۔
۶۳- رازی ، فیروز الدین ۔
۶۴- راحل ، قاضی غلام کبریا ۔
۶۵- رزی ، محمد اسمعیل حے پوری ۔
۶۶- رضا ہمدانی ۔
۶۷- روحی پشاوری ۔
۶۸- روحی لاہوری ۔
۶۹- رئیس امروہوی ۔
۷۰- ریاض چشتی ، ریاض الدین ۔
۷۲- زاہد حیدری ۔
۷۳- زبدہ صدیق ۔
۷۴- زیب مکسی ۔
۷۵- سالک ، عبدالمجید ۔
۷۶- سراجی ، محمد اعظم ۔
۷۷- سرور جالندھری ۔
۷۸- سلیم ، محمد سلیم ۔
۷۹- سلیم ، حضور احمد ۔
۸۰- سلیم ، واحد سلیم ۔
۸۱- سلیمی ، چودھری ۔
۸۲- شاد ، سید انور علی محمد منشا ۔
۸۳- شاد ، محمد حسنین کاظمی ۔
۸۴- شامی ، محمد امیر حمزہ ۔
۸۵- شایق ، مولوی سلام اللہ ۔
۸۶- شجر تہرانی ۔
۸۷- شوکت ہاشمی ۔
۸۸- شور ، منظور حسین علمگ ۔
۸۹- صابر آفاقی ۔
۹۰- صابری ، چودھری غلام محمد ۔
۹۱- صادق ، آغا صادق ۔
۹۲- صبغۃ اللہ جالندھری ۔
۹۳- صمدانی ۔
۹۴- صہبائی ، عبدالعزیز ۔
۹۵- ضیاء الاسلام ۔
۹۶- ضیا جعفری ۔
۹۷- ضیا ، محی‌الدین ضیا ۔
۹۸- ضیا کنجاہی ۔
۹۹- ظفر ۔
۱۰۰- عابد ، سید عابد علی ۔
۱۰۱- عابد شاہ ۔
۱۰۲- عابدی ، سید وزیر الحسن ۔
۱۰۳- عارف ، احمد عبدالقیوم ۔
۱۰۴- عارف ، دوست محمد ۔
۱۰۵- عارف ، شاہ جیلانی ۔
۱۰۶- عاصم ، محمد عبدالوہاب خان ۔
۱۰۷- عاصی ، نجف علی ۔
۱۰۸- عرشی ، محمد حسین ۔
۱۰۹- عرفانی ، خواجہ عبدالحمید ۔
۱۱۰- عزیز ، سردار عزیز جاوید ۔
۱۱۱- عشرت ، اکرام حسین ۔
۱۱۲- عشقی ، الیاس عشقی ۔
۱۱۳- عطا ، عطاء اللہ خان عطا ۔
۱۱۴- عطا ، قاضی عطا محمد گجراتی ۔
۱۱۵- عظامی ، عزیزالدین احمد ۔
۱۱۶- علوی ، میر علی نواز ۔
۱۱۷- علی عباسی ۔

۱۱۸- عندلیب شادانی -
۱۱۹- عیسٰی ، کریم داد -
۱۲۰- علام رسول مہر -
۱۲۱- فاصل ، سید محمد عبدالرشید -
۱۲۲- فیضی ترمذی ، سید فیض الحسن -
۱۲۳- فیضی ، ایک عالم -
۱۲۴- قمر ، قمر رامی -
۱۲۵- کامل یثربی -
۱۲۶- کرم حیدری -
۱۲۷- کوکب تبریزی -
۱۶۸- کوکب شادانی -
۱۲۹- گل محمد باوچ -
۱۳۰- گلبن کرمانی -
۱۳۱- لطف بدوی ، لطف اللہ بدوی -
۱۳۲- ماہر افغانی ، ماہر علیشان -
۱۳۳- ماہر القادری ، منظور حسین -
۱۳۴- مخزون شریف -
۱۳۵- محشر ، نثار احمد رسول نگری -
۱۳۶- مشتاق ، مشتاق احمد ریٹائرڈ کرنل -
۱۳۷- مشرقی ، علامہ مشرقی -
۱۳۸- مصحفی ہمدانی -
۱۳۹- مظہر ، حافظ محمد مظہر الدین
۱۴۰- مظہر ، محمد احمد -
۱۴۱- مہجور کشمیری -

۱۴۲- منیر گجراتی -
۱۴۳- مہر ، ولی اللہ -
۱۴۴- میکش ، محمد مرتضٰی خان -
۱۴۵- نازش رضوی -
۱۴۶- ناصر الملک جترانی -
۱۴۷- ناصح رضوی -
۱۴۸- ناصر ، ناصر علی خان -
۱۴۹- ناظم نسرین -
۱۵۰- نامی ، غلام دستگیر -
۱۵۱- ندیم ، عطاء اللہ شاہ بخاری -
۱۵۲- ندیم ، عباد اللہ فاروق -
۱۵۳- نشتر ، سردار عبدالرب -
۱۵۴- نعمانی ، منظور احمد خان -
۱۵۵- نواز ، اللہ نواز خان -
۱۵۶- نواز ، سردار نواز درانی -
۱۵۷- نواز ، سید محمد نواز ملتانی -
۱۵۸- نیازی ، عبدالرحیم -
۱۵۹- ندیر واسطی -
۱۲۰- واصف ، محمد بخش -
۱۶۱- وحشت ، صبا علی -
۱۶۲- وحشی خان -
۱۶۳- وقار انبالوی -
۱۶۴- ہادی ، سید محمد ہادی مچھلی شہری -
۱۲۵- یعقوب -

فہرست نویسندگان فارسی ۱۹۴۷-۱۹۷۲ء

۱- احسن ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن -
۲- احسن ، ممتاز حسن -
۳- اکرام ، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام -
۴- اکرام الحق -
۵- اکرام ، ڈاکٹر سید محمد اکرم -
۶- اللہ بخش راجپوت -
۷- اللہ دتہ چودھری ، ڈاکٹر -
۸- انعام الحق کوثر ، ڈاکٹر -
۹- اولس ، ڈاکٹر محمد اولس صالح صدیقی -
۱۰ بانو ممتاز شیرین -
۱۱ برق ، ڈاکٹر غلام جیلانی برق -
۱۲- بشیر حسین ، ڈاکٹر -
۱۳- بنت زہرہ -
۱۴- ثریا فخرت -
۱۵- جعفری ، سید محمد جعفری -
۱۶- جعفری ، ڈاکٹر سید مرتضی جعفری -
۱۷- حضور احمد خان -
۱۸- حمید احمد خان -
۱۹- خانم ممتاز -
۲۰- خ - ب نسیم ، ڈاکٹر -
۲۱- خلوب ، محی الدین -
۲۲- خلیفہ عبدالحکیم -
۲۳- رازی ، فیروز الدین رازی -
۲۴- راشدی ، پیر حسام الدین -
۲۵- رحمن ، جسٹس س - ا - رحمن -
۲۶- ریاض ، ڈاکٹر محمد ریاض -
۲۷- شاہ حسن عطا -
۲۸- شمیم ناصر زیدی ، ڈاکٹر ، خانم -
۲۹- صابر آفاقی -
۳۰- جعفری بانو شگفتہ ، ڈاکٹر ، خانم -
۳۱- ضیاء الحسن ضیا -
۳۲- طاہرہ صدیقی ، ڈاکٹر ، خانم -
۳۳- عابد علی خان ، ڈاکٹر -
۳۴- عابد علی عابد -
۳۵- عابدی ، سید وزیر الحسن -
۳۶- عبدالرشید ، خواجہ ، کرنل -
۳۷- عبدالغنی ، ڈاکٹر -
۳۸- عرفانی ، خواجہ عبدالحمید ڈاکٹر -
۳۹- عفان سلجوق ، ڈاکٹر -
۴۰- غلام ربانی عزیز -
۴۱- غلام رسول مہر -
۴۲- غلام سرور ، ڈاکٹر -
۴۳- فیضی ، سید فیض الحسن -
۴۴- کلیم ، ڈاکٹر محمد کلیم سہسرامی -
۴۵- گلشن بتول -
۴۶- لطف اللہ بدوی -
۴۷- محمد اقبال ، ڈاکٹر ، پروفیسر -
۴۸- محمد باقر ، ڈاکٹر ، پروفیسر -
۴۹- محمد حسین کاظمی شاد -
۵۰- محمد ریاض خان ، ڈاکٹر -
۵۱- محمد شریف چودھری -
۵۲- محمد صدیق ، ڈاکٹر -
۵۳- محمد ظفر خان ، ڈاکٹر -
۵۴- محمد شفیع ، مولوی ، پروفیسر -
۵۵- محمد وحید مرزا ، ڈاکٹر -
۵۶- محمد یسین رضوی ، ڈاکٹر -
۵۷- محمد یامین خان ، ڈاکٹر -
۵۸- مطیع الامام ، ڈاکٹر -
۵۹- منظور الحق عثمانی -
۶۰- منیر گجراتی -
۶۱- محمد عابد شبر -
۶۲- مرتضی موسوی سید -
۶۳- سید عبداللہ ، ڈاکٹر -
۶۴- سید علی رضا نقوی ، ڈاکٹر -
۶۵- ناظر حسن زیدی ، ڈاکٹر -
۶۶- سید قیوم ، ڈاکٹر -
۶۷- وحید قریشی ، ڈاکٹر -

☆ ☆ ☆

نواں باب

اس دور کے فارسی ادب کا مجموعی جائزہ

یہ دور مغل شہنشاہیت کے زوال اور اختتام ، برطانوی شہنشاہیت کے خروج و عروج اور ان کے بعد مملکت پاکستان کے ظہور کا دور ہے ۔ اس لئے ان ڈھائی سو سالوں سے کچھ زیادہ عرصے میں مختلف النوع انداز فکر ، اسالیب انتظار اور موضوعات بحث کا نشان ملتا ہے ۔ اگرچہ مغل شہنشاہیت کا زور اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں رو بہ انحطاط تھا ۔ انگریز ، مرہٹے ، سکھ اور افغان سبھی اس لٹی ہوئی شہنشاہیت کو آزار پہنچانے کے درپے تھے اور سطوت و شوکت ، دولت و عزت ہند و پاکستان کے مسلمان معاشرے سے رخصت ہوتی نظر آتی تھی اور درد ملت کے باعث شعراء خاص طور پر ایک غم انگر نوا بلند کر رہے تھے ، تاہم اس صدی کو مسلمانوں کے فکری زوال اور ذہنی انتشار یا ادبی ابتذال کا دور نہیں کہا جا سکتا ۔

اسی صدی میں شاہ ولی اللہ اسلامی فکر کی شیرازہ بندی کر رہے تھے اور مذہب کو خانقاہوں سے نکال کر معاشرے کے میدان کارزار میں ایک مثبت پالیسی کے ماتحت فعّال بنانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ شاہ صاحب نے مذہب کو پھر سے سیاست ، معیشت اور معاشرتی تقاضوں سے لا ملایا ۔ قرآن مجید کی تفہیم کی کوششوں میں وہ اور ان کا پورا خاندان ایک صدی تک منہمک رہا ۔ فارسی میں ان کا ترجمہ اور اردو میں ان کے فرزندوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم اور ان کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیز کا حدیث سے شغف اور رسول اللہ صلعم کے اقوال و احادیث اور اسوۂ حسنہ کو مسلمانوں کے لئے مثالی حیثیت سے پیش کر کے ایک باعمل زندگی بسر کرنے کی کوشش ، بعد میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے جہاد پر منتج ہوئی ۔ یہ اصلاحی کوششیں مسلمانان پاکستان و ہند کی تعمیر و تشکیل نو میں ایسی معنی خیز حیثیت رکھتی ہیں کہ ان کے اثرات بیسویں صدی عیسوی تک جاری رہے ۔ گویا اس پورے دور میں

اسلامی فکر کی نشاۃِ ثانیہ کی بنا پڑی ۔

اسی طرح تعلیم میں بھی ملاّ قطب الدین اور ان کے فرزند ملاّ نظام الدین کا نظامِ تعلیم و تدریس جس میں منقولات اور معقولات کا امتزاج قائم رکھا گیا تھا ، ایک طرح سے ان کوششوں میں شمار ہوگا جن سے مسلمانوں کی زندگی کو نئے سانچوں میں نہیں تو صحیح راستوں پر ڈھالنے کی کوشش ضرور کی گئی ۔ یہ نظامِ تعلیم جس کی اکثر و بیشتر درسی کتابیں فارسی میں تھیں ایسا مقبول ہؤا کہ جب انیسویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں دیوبند اور اس کے بعد ندوۃ العلماء قائم ہؤا تو ان میں بھی اسلامی علوم ہی درس کی اساس قرار پائے اور آج بھی ہمارے دارالعلوموں میں تقریباً یہی نصاب رائج ہے ۔ یہ درست ہے کہ زمانے کے تقاضے کو پہچانتے ہوئے سرسید احمد خاں نے جدید تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف کرائی مگر انہوں نے اسلامی روایات سے کبھی گریز نہیں کیا ۔ وہ فقط مشرق و مغرب دونوں کا صحیح عرفان اور ان کی اقدار سے صحیح استفادہ کے خواہش مند تھے ۔ توہمات سے وہ ایسے ہی گریزاں تھے جیسے شاہ ولی اللہ کا خاندان ۔ توہّم پرستی اور شرک کے خلاف شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب 'تقویۃ الایمان' (زبان اُردو) اس بات کی شاہد ہے کہ توہّم پرستی اور غیر اسلامی روایات کا جو دخل ہماری فکری زندگی میں ہو چکا تھا سرسید کی جدّدیت ایک طرح سے اس کا بھی توڑ تھی ۔

اٹھارھویں صدی عیسوی ، جسے سیاسی زوال کی صدی کہا جاتا ہے ، ایک طرح سے مسلمانوں کے لئے چیلنج تھی اور مرکز کی کمزوریوں کے باعث برِصغیر کے مختلف علاقوں میں مغلیہ تہذیب اور اسلامی روایات کا عمل دخل بہت دیر تک رہا ۔ اودھ میں اسلامی علوم اور خصوصیت سے شیعہ مذہب پر بہت کام ہؤا ۔ مجتہدِ اول سید دلدار علی کی 'اساس الاصول' اور 'عماد الاسلام' اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ سید صاحب موصوف کے علاوہ ان کے عظیم فرزند مجتہد العصر سید محمد اور ان کے رفقاء اس کام میں تقریباً ایک سو سال تک مشغول رہے اور انہوں نے شیعہ فرقے کے اعتقادات کی تقویم و تشریح کے متعلق بڑا قابلِ قدر کام کیا ۔

چونکہ اس دور میں لکھی جانے والی کتبِ تاریخ کا مرکزی موضوع شہنشاہیت یا ملوکیت نہ تھا اس لئے ان میں مرکزیت کا فقدان ہونا لازمی تھا ۔ موضوعِ بحث ایک صوبہ یا صوبے کا حاکم رہ گیا ۔ مثلاً قانع کی 'تحفۃ الکرام' میں کوئی آفاقی نقطۂ نگاہ کارفرما نہیں ۔ توجہ کا مرکز ایک مقام ہے ۔ عام طور پر سیاسی قوت کے زوال نے ذہنوں

کو پریشان کر رکھا تھا اس لئے سیاسی حالات کے بیان میں بھی دنیوی جاہ و جلال کی بے مائگی کا اظہار جابجا ہوتا تھا ۔ ان سب میں سب سے جامع تاریخ غلام حسین کی 'سیر المتاخرین' ہے ۔ خوافی خان کی 'منتخب اللباب' جو عہدِ عالمگیر کی غیر جانبدار تاریخ کہی جا سکتی ہے، محمد شاہ کے دور تک ختم ہوتی ہے ۔ بعض تاریخوں میں جغرافیائی حالات بھی ملتے ہیں جیسے 'جامِ جہان نما' ۔ غرض یہ کہ تاریخ نویسی میں بھی کشادگیٔ نظر کے آثار نظر آتے ہیں ۔

شعراء کے تذکروں کی بھی یہی کیفیت ہے ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ادب کوچوں اور بازاروں میں پہنچ گیا ہے، کیونکہ اس دور کے تذکرے عوامی ذوق کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں ۔ ان میں زمانے کے عام تہذیبی اور مجلسی حالات کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں بلکہ شعراء کے اخلاق و عادات پر بھی ایک نظر ڈالی گئی ہے اور تاریخی واقعات سے بھی تذکرہ نگار چشم پوشی نہیں کرتے ۔ سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ اس دور میں مختلف علاقوں کے شعراء کے علیحدہ تذکرے لکھے گئے، مثلاً 'انیس الاحبا' میں لکھنؤ اور اس کے مضافات، 'گلدستۂ کرناٹک' میں کرناٹک، 'صبحِ وطن' میں مدراس اور 'مردمِ دیدہ' میں پنجاب کے شعراء کا حال ملتا ہے ۔ اسی طرح خاص گروہوں کے تذکرے بھی الگ مل جاتے ہیں ۔ مثلاً 'انیس الاحبا' میں مسلمان شعراء اور ہندو شعراء کے الگ الگ حالات درج ہیں ۔ 'خزینۃ الشعراء' میں خوب اللہ اور محمد الہ آبادی کے شاگردوں ہی کا ذکر ہے ۔ معاصرین کے تذکروں کا رواج بھی اسی دور میں پڑا، جن سے شعراء کے پیشوں کا علم بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً یہ کہ صیقل گر، حجام، جرّاح، سقّے بلکہ خاکروب بھی شاعری کر رہے تھے ۔ ان کا کلام بھی ان تذکروں میں مل جاتا ہے، مگر ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کی صحیح اقدار قائم نہیں رہی تھیں اور عام طور پر معیار پست ہو گیا تھا ۔ اسی طرح ایرانی اور ہندوستانی تعصّبات کا نشان بھی ان تذکروں میں ملتا ہے بلکہ بعض تذکرے علاقائی تعصّب سے بھی خالی نہیں ۔ یہ بات البتہ خوش کن ہے کہ ہندو شعراء اور ہندوؤں کے لکھے ہوئے تذکرے بھی اس دور میں ملتے ہیں مثلاً 'سفینۂ خوشگو' ۔ اور اسلامی تہذیب کا اثر اتنا گہرا ہے کہ ہندو تذکرہ نگار بھی اپنے تذکروں کا آغاز حمد و نعت سے کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر کشن چند اخلاص کے تذکرہ 'ہمیشہ بہار' کا ابتدائیہ دیکھیے ۔

ایک اور قابلِ ذکر بات اس دور میں مختلف علوم و فنون میں لوگوں کا شغف ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں فارسی زبان میں موسیقی ، خطاطی ، طب ، حساب ، نجوم و ہیئت ، سیاق و ہندسہ ، زیج و تقویم ، فنِ اصطرلاب ، علمِ رمل ، قیافہ شناسی ، جفر و رمل ، فنِ حرب و سپہ گری ، تیر اندازی ، فن شکار ، باز نامے ، علمِ مساحت ، علمِ فلاحت و فنِ باغبانی ، جواہر شناسی اور علمِ تعبیر خواب ، اوزان و مقادیر ، آش پزی و طباخی ، عطریات و رنگریزی ، آہنگری و کشتہ سازی وغیرہ ، غرض یہ کہ بہت سے علوم سے لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی ۔ ظاہر ہے یہ دور ذہنی طور پر انحطاط کا دور نہیں کہا جا سکتا ۔

رہا فارسی زبان کا معاملہ ، اس میں بھی برصغیر کے فارسی داں بالآخر اپنے محاورے کو سند منوانے پر تل گئے ۔ اس سلسلے میں خانِ آرزو اور حزین کے معرکے سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں ۔ یہ بحث اقبال کے دور تک جاری رہی ۔ اسی مباحثے میں 'توافقِ لسانین' کا اصول بھی زیرِ بحث آیا ۔ جیسے شاہ ولی اللہ نے دینِ اسلام کے اختلافات میں مقامِ اتصال دریافت کیا تھا ، اسی طرح خانِ آرزو نے زبانوں کے درمیان بھی لغوی اتصال کو نمایاں کیا ۔ حتٰی کہ مرزا غالب ، جو ایرانی اسلوب پر اتنا زور دیتے ہیں ، بنیادی طور پر ہندی اندازِ فکر کے پیرو کار تھے ۔ اسی لئے وہ ابھی تک ایران میں مقبول نہیں ہو سکے ۔

سب سے آخر میں ہم اس دور کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے ۔ اس دور کے تین بڑے شاعر بیدل ، غالب اور اقبال ہیں ۔ ان تینوں میں ہم ایک قدرِ مشترک دیکھتے ہیں اور وہ ہے انسانی عظمت کا احساس ، انفرادیت پر زور اور فعّالیت ۔ اس سے پہلے کے شعراء میں کائناتی یا آفاقی نقطۂ نظر ضرور ہوتا تھا مگر انسان کی اندرونی قوتوں کے ادراک اور ان کے عرفان کے بعد ان کو اجاگر کر کے ان کی بدولت عظمتوں سے دوچار ہونے یا زندگی کے آلام و مصائب یا متلاطم حالات سے عہدہ برآ ہونے کی سعی پر زور نہیں دیا جاتا تھا ۔ ان تینوں شعراء کا زورِ فکر اندرونی دنیا پر ہے ، انسانی صلاحیتوں پر ہے ، اور انسانی زندگی کے امکانات پر ہے ۔ بیدل کہتا ہے :

چیست آدم تجلیٔ ادراک   یعنی آن فہمِ معنیٔ لولاک
آفتاب است و خاک می مالد   آسمان دارد و نمی بالد

مشتِ خاکی دایں بسیطیہا قطرہ آبی و ایں محیطیہا

یا انسان سے خطاب کرتے ہوئے یہی شاعر کہتا ہے :

ای شمعِ بزمِ قدس ندانم چہ مظہری کز وہم گاہ روشن و گاہی مکدری
کون و مکان گلی سب بداماں شکست خود را زگرد احاطہ کہی چرخِ دیگری

اور پھر ایک اور موقع پر بڑے اصرار کے ساتھ اعلان کرتا ہے :

سازِ آفاق جملہ خاموش است ایں ہمہ شورِ زیر و بم ماییم

اسی طرح غالب کہتا ہے :

کفِ خاکِ من زاں صبا کسمرست کہ چوں ریگِ رخشاں بہ انجم گریست

اپنے بارے میں یوں رقم طراز ہے :

در بادۂ اندیشہ ما دُرد نہ بینی در آتشِ ہنگامۂ ما دُود نیابی

یا

زآفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست بگردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

اور انسانی دیدہ وری کے بارے میں اس کا موقف تو اس مشہور شعر سے ظاہر ہوتا ہے :

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بشمارِ دلبری در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

فکرِ انسانی اور امکاناتِ ذہنی کے بارے میں اپنی مثنوی 'ابرِ گہر بار' میں ایک پورا 'معنی نامہ' لکھ دیتا ہے - یہی شاعر ہے جو قاعدۂ آسمان کو بدلنے کا دعویٰ رکھتا ہے اور جو اپنی مثنوی 'رنگ و بو' میں یہ کہتا ہے :

پشہ اگر بال کشائی کند صعوہ تواند ہمائی کند

اور اقبال تو 'پیامِ مشرق' (۱۹۲۳ء) میں ہی 'تخلیقِ آدم' کے زیرِ عنوان کہہ دیتا ہے :

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گری، خود شکنی، خود نگری پیدا شد

جو خدا سے اس بات کا متقاضی ہے کہ :

در سینۂ من دمی بیاسای از محنت و کلفتِ خدائی

جو یہ شکوہ کرتا ہے :

نقشِ دگر طراز دہ ، آدمِ پختہ تر بیار لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدای را

جو اپنے بارے میں ، گویا عظمت انسانی کے بارے میں ، یہ کہہ سکتا ہے :

در دشتِ جنونِ من جبریل زبون صیدی یزدان بکمند آور ای ہمت مردانہ

جو انسان کو مشیّتِ خداوندی کے پورا کرنے کا آلہ کار سمجھتا ہے اور انسان ہی کو مرکزِ کائنات تصور کرتا ہے :

ز انجم تا بہ انجم صد جہان بود خرد ہر جا کہ پر زد آسمان بود
و لیکن چون بخود نگریستم من کرانِ بیکران در من نہان بود

غرض یہ کہ اس دور کے ان تینوں عظیم شعرا میں انسانی عظمت کا احساس اور اس کی صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کا شعور اتنا قوی ہے کہ یہ پاکستان و ہند کے تمام گذشتہ شعرا سے اپنے فعّال تخیّل ، اپنے حرکی تصوّر اور شوق انگیز کلام کے لحاظ سے دنیا کے عظیم شعرا کی صف میں شمار کئے جا سکتے ہیں ۔

انہی باتوں نے اس دور کے فارسی ادب کو پہلے ادوار کے ادب سے ممتاز کر دیا ہے ۔

مدیر عمومی

☆ ☆ ☆

صحت نامہ

فارسی ادب - جلد سوم (۱۷۰۷ء - ۱۹۷۲ء)

اندرونی سرورق کی آیت کی عبارت یوں ہے :

وَ مَنْ يُؤْتَ الحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيرًا كَثِيرًا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۲۰	اس لیے مجموعی طور پر	اس لیے مجموعی طور پر اس کا عہد سلطنت کامیاب رہا ۔
۶	پاورق سطر ۳	حکام عالمگیری	احکام عالمگیری
۱۷	۲ - ۳	آئین اکبری مذکور	آئین اکبری میں مذکور پھولوں پھلوں کے علاوہ انہوں
۱۷	۳ - ۴	اور انہوں نے	اور انہوں نے ساتھ ہی
۱۷	۴	ذکر کیا ہے	ذکر علحدہ علحدہ کیا ہے ۔
۱۸	۳	غواص	غواص
۱۹	۸	حشان	چسان
۲۷	۲۰	طرح	مصرعہ طرح
۲۹	۱	نہر کہ	کہ
۳۰	۱۸	سلطان مؤرخ	سلطانی مؤرخ
۳۴	۲	مثلا ! پارسی	مثلاما پارسی
۳۸	پاورق سطر ۳	۱۶۵۲	۶۵۲
۳۹	۳	۱۸۵۰ء	۱۸۰۵ء
۵۳	۷	مان	ما
۶۱	۱۵	فاخر کمین	فاخر مکیں

معذرت : پوری کوشش کی گئی ہے کہ اغلاط درست کر دی جائیں ۔ مگر تحقیقی کتب میں غلطیاں پھر بھی رہ جاتی ہیں ۔ امید ہے قارئین کرام ان اغلاط کو محض ہماری فرو گذاشت پر محمول نہیں کرینگے ۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۰	۱۱	مخالف	مختلف
۷۱	آخری	سلجھے الداز	سلجھے ہوئے انداز
۷۳	۱	نوٹ : یہاں نعمت خان علی کا سال وفات ۱۷۱۵ء دیا گیا ہے۔ مگر اس سے پہلے کی جلد میں (ص - ۳۱۶) ۱۷۰۹ء اور ۱۷۱۱ء بھی بتایا جاچکا ہے۔ تحقیق کی گنجائش ہے	
۷۳	۱۳	۱۲ - ۱۷۱۶ء/۱۱۲۹ھ	۱۷ - ۱۷۱۶ء/۱۱۲۹ھ
۸۱	۷	سار ما	ساز ما
۱۰۲	آخری	زو	رو
۱۰۸	۳	دوسرا مصرعہ یوں پڑھیے : بندۂ ساقی شووگردن ز آرایش مپیچ	
۱۳۳	۱۸	فرخ سیر کے عہدِ حکومت	عالمگیر کے عہد حکومت
۱۶۳	۳	۱۷۱۷ء - ۱۷۱۸ء/۱۲۳۳ھ	۱۸۱۷ء - ۱۸۱۸ء/۱۲۳۳ھ
۱۸۹	۲۱	۱۶۹۷ء/۱۰۹۹ھ	۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ھ
۱۹۳	۹	تذکرۂ نصیر آبادی	تذکرۂ نصر آبادی
۱۹۶	۸	۱۷۵۰ء/۱۱۷۳ھ	۱۷۶۰ء/۱۱۷۳ھ
۱۹۷	۱۷	۱۷۰۸ء/۱۱۰۲ھ	۱۶۹۰ء/۱۱۰۲ھ
۱۹۸	۲۱	نبابر ضروت	بنابر صرورت
۲۲۸	۶	پھلاتے	پھیلاتے
۲۳۴	۱۱	ممالک	مسالک
۲۳۹	۱۹	نلامزے	تلازمے
۲۴۱	۵	محمد حسین قتیل	محمد حسن قتیل
۲۴۲	۲۰	۱۸۵۷ء	۱۷۵۷ء
۲۴۵	۱۵	یافتن	نافتن
۲۵۰	۳	وبہانم	ومن بہام
۲۵۳	۱۹	نوٹ : ڈاکٹر ناظر حسن زیدی نے محمد حسن قتیل کا سال وفات یہاں ۱۸۱۶ء درج کیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے صفحہ ۶۲ پر ڈاکٹر عبدالغنی نے ۱۸۲۳ء لکھا ہے۔ غالباً یہ اختلاف مآخذ کا نتیجہ ہے۔	
۲۵۴	۱	النہی	الٹی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵۹	۱۱	دیر باز	دیر باز
۲۵۹	۱۲	درگرو فراہم آمدن	درگرد فراہم آمدن
۲۸۷	۳	کلیات طبیات	کلیات طیبات
۲۸۷	پاورق سطر ۲	الشاطین	الشیاطین
۲۹۱	۱۵	مصنف امامت	منصب امامت
۲۹۶	۵	۱۸۱۹ء/۱۲۳۱ھ	۱۸۱۵ء/۱۲۳۱ھ
۳۲۹	۱۵	۴۰ - پہلوی	۳۰ - پہلوی
۳۴۷	۲۳	۱۸۶۷ء	۱۷۶۷ء
۳۴۹	۸	۱۱۶۶ء	۱۷۵۲ء/۱۱۶۶ھ
۳۵۲	۱۹	۳۳	۴۳
۳۵۵	۱۲	۱۸۸۶ء/۱۲۹۳ھ	۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ
۳۵۸	۲۶	۱۷۱۰ء/۱۲۶۵ھ	۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ
۳۶۰	۱۶	۱۸۲۱ء/۱۲۲۷ھ	۱۸۱۲ء/۱۲۲۷ھ
۳۶۴	۲۰	صفیحہ	صحیفہ
۳۶۴	۲۳	۱۸۸۲ء/۱۲۶۹ھ	۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ
۳۷۰	۴	۱۷۱۹ء/۱۱۶۲ھ	۱۷۴۸ء/۱۱۶۲ھ
۳۷۰	۷	یوں پڑھیے : بعہد فرخ سیر ۱۷۱۷ء/۱۱۳۰ھ میں ترتیب دیا ۔	
۳۷۳	۱۲	زیست البساطیں	زینت البساتین
۳۷۴	۱	زینب البساطیں	زینت البساتین
۳۷۶	۵	۱۰۶۰ھ - ۱۰۳۵ھ	۱۰۲۰ھ - ۱۰۳۵ھ
۳۷۶	۱۵	۱۷۸۳ء/۱۱۸۶ھ	۱۷۷۲ء/۱۱۸۶
۳۸۰	۲۵	۱۸۷۶ء/۱۲۶۴ھ	۱۸۴۷ء/۱۲۶۴ھ
۳۸۳	آخری	اوحدین بلگرامی	اوحدالدین بلگرامی
۳۹۹	۱۴	دستوری مقالہ	دکتوری مقالہ
۳۹۹	۱۸	نوٹ : محمد حسن قتیل کی تاریخ وفات کے متعلق صفحہ ۲۵۳ کی تصحیح زیر نظر رہے ۔	
۴۰۰	۷	آہ	آئی
۴۰۶	۲	۱۲۵۹ھ (۱۸۷۸ء)	۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء)
۴۰۸	۱۵	طوفان قری بارو	طوفان قوی بازو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱۰	۱۰	مہارت	مہابت
۳۱۷	آخری	۱۳۲۰ھ (مطابق ۱۸۰۲ء)	۱۳۲۰ھ [مطابق ۱۹۰۲ء]
۳۱۹	۱۴	ماہ طعلت	ماہ طلعت
۳۲۵	۲۲	ہندوستا	ہندوستانی
۳۳۸	۶	نوٹ : احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کی تیسری لڑائی جنوری ۱۷۶۱ء میں ہوئی ۔ یہاں ڈاکٹر وحید مرزا سہواً ۱۷۵۷ء لکھ گئے ہیں - دراصل اس سال (۱۷۵۷ء) احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو لوٹا تھا ۔	
۳۵۲	۱۱	ذاتـ	ذاتی
۳۵۷	آخری	انصار	انحصار
۳۶۵	۱۳	اماء	ایماء
۳۷۸	۲۲	انگلستان کے جانے سے	انگلستان جانے سے
۵۰۵	۱۷	گلِ خندن	گلِ خندان
۵۱۲	۲۰	شکوۃ الفاظ	شکوہ الفاظ
۵۱۷	۲۲	۲۳۶	۶۶۳
۵۱۸	۹	۱۸۱۳ء	۱۸۲۳ء
۵۲۳	۱۱	۱۷۸۲ء/۱۱۸۷ھ	۱۷۷۳ء/۱۱۸۷ھ
۵۲۳	۱۵	۱۷۸۷ء/۱۱۹۸ھ	۱۷۸۳ء/۱۱۹۸ھ
۵۲۴	۹	پش قدمی	پیش قدمی
۵۲۴	۱۰	ان کا حملے	ان کے حملے
۵۲۴	۱۲	میسور علاقوں	میسور کے علاقوں
۵۲۷	۱۷	۱۱ مئی ۱۸۵۸ء	۱۱ مئی ۱۸۵۷ء
۵۲۹	۱۹	نتوسانتمی	نتوانستمی
۵۳۰	۱۸	نکوید	نگرید
۵۳۱	۱۸	لال قعلہ	لال قلعہ
۵۳۶	۱۳	۱۸۵۹ء/۱۶۷۶ھ	۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ
۵۳۷	۵	(۱۸۶۸ء - ۱۸۶۹ء)	(۱۸۴۸ء - ۱۸۴۹ء)
۵۴۰	۳	London 1835 - 39	London 1935 - 39
۵۴۶	۱۹	۱۸۸۸ء/۱۳۰۲ھ	۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۴۷	۴	۱۳۰۲ھ	۱۳۰۶ھ
۵۵۱	۲۲	پشارو	پشاور
۵۵۳	۱۲	شعراء کا انتخاب	اشعار کا انتخاب
۵۵۶	۲۴	۱۱۸۲ھ - ۱۱۹۴ھ	۱۱۷۶ھ - ۱۱۹۴ھ
۵۶۰	۶	۱۳۴۴ھ	۱۲۴۴ھ
۵۶۴	۱۶	تبخر	ابجر
۵۶۶	۲۱	۱۷۴۵ء/۱۲۶۱ھ	۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ
۵۷۰	۳	دوسرا مصرعہ یوں پڑھئیے : موجِ نخست است زبحرِ قدیم	
۵۷۴	۱۵	۱۸۶۰ء/۱۲۶۷ھ	۱۸۵۰ء/۱۲۶۷ھ
۵۷۵	۳	تحمیف	تحفف
۵۷۵	۲۳	ہندوستا'	ہدوستانی
۵۸۰	آخری	اشقاق	اشتقاق
۵۸۴	۵	اوو	او ر
۵۹۳	۲۰	مجدددین	مجددین
۶۰۰	۱۰	نقلید باشد	نقلید نباشد
۶۰۸	۳	یوں پڑھئیے : (م-۱۹۰۸ء) تھے جن کے فارسی میں ملفوظات . . .	
۶۱۸	۲۲	اُردر	اُردو
۶۲۱	۴	زیادہ خبریں ہر چھاپتا	زیادہ سے زیادہ خبریں چھاپتا
۶۳۲	۹	ہر قد	ہر قدر
۶۳۸	۱۷	ابوالفرح واسطی	ابوالفرج واسطی
۶۶۹	۱۶	حزین است ملول	حزین است و ملول
۶۷۶	۱۶	بہار	بہار
۶۸۳	۱۱	۱۶۸ - کوکب شادانی	۱۲۸ - کوکب شادانی
۶۸۳	۱۹	۱۲۰ - واصف محمد بخش	۱۶۰ - واصف محمد بخش
۶۸۳	آخری	۱۲۵ - یعقوب	۱۶۵ - یعقوب
۶۸۴	۱۳	۳۶ - لطف اللہ بدوی	۴۶ - لطف اللہ بدوی
۶۸۴	۲۱	۰۲ - خ - ب - نسیم ڈاکٹر	۲۰ - خ ب - نسیم ڈاکٹر
۶۸۴	۲۷	۶۲ - ریاض ، ڈاکٹر محمد ریاض	۲۶ - ریاض ، ڈاکٹر محمد ریاض
۶۸۴	۲۹	۲۶ - مرتضیٰ موسوی سید	۶۲ - مرتضیٰ موسوی سید